اودھ پنچ کا دور

فتنہ اور عطر فتنہ کا دور

شیرازہ کا دور

طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور

طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر

مزاحیہ کردار

مزاحیہ کالم

لطائف

محمد طفیل ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ ، لاہور سے شائع کیا

میں اپنی اس ناچیز کوشش کو پطرس مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں جن کی زندگی کا آفتاب ڈوبا ہے ۔ محمد طفیل

طلوع

خاکساری برتتے برتتے بال سفید ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا "خوب ہے آپ کا نمبر" تو ہمارے انکسار کے کہتے ہیں "جی کس قابل ہیں!" غرض مجبوراً بولتے بولتے یہ دن آ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمیں اب لاکھ برا بھلا کہے ہم بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیں ——— "جی ہاں! ہم نے خوب نمبر نکالا ہے!" تکلف سے بازا نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کسی ایسی بات پر بگڑے جائیں جس پر سچ ہی سچ کا اطلاق ہو اور مبالغہ سے بھی بات ہی کوئی نہ ہو۔ ہم اپنے نمبروں کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ کہنا ہے تو صرف یہ کہ ——— اب تک کسی نے کیا نہیں۔

اچھے رسالوں نے بے شک اچھے نمبر نکالے ہیں مگر ان کے موضوعات محدود رہے، جیسے کسی ایک شاعر پر، ایک ادیب پر، یا پھر کسی بھی مختصر موضوع پر، اس کام کی افادیت سے انکار مجھے بھی نہیں مگر یوں کسی ایک بڑے موضوع کو چن کر آئینے شیشے میں کسی نے نہیں اتارا۔ اقرار کرتے ہی چلیں تاکہ یہ الزام عائد نہ ہو کہ ہم کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ نگار، مخزن، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ہمایوں، ساقی، عالمگیر اور ادب لطیف نے اپنی اپنی جوانی میں کام کے نمبر نکالے ہیں اور ان سب کا باوا آدم ہے نگار ——— یہ ہماری رائے ہے ——— آپ کو اختیار ہے مانیں نہ مانیں ——— ان میں سے اگر کسی سے ڈر لگتا بھی ہے تو مدیر نگار ہی سے ممکن ہے وہ یہ کہہ دیں کہ نکالیے تو جناب! آپ نے میرے پایہ کے کون کون سے نمبر نکالے ہیں ——— ؟

بزعم خود، یہ نمبر بھی ایک طرح سے طنز و مزاح کی تاریخ ہے۔ جب سے اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا اس وقت سے لے کر اس کی جوانی تک کا تمام کچا چٹھا ——— کچا چٹھا کا لفظ زیادہ تر ہمیں سودا، جرأت، رنگین، انشا اور مصحفی کے ساتھ ریختی گو شعرا کی وجہ سے لکھنا پڑا ہے ورنہ یہ موضوع بذات خود شریفانہ بھی ہے اور صحت بخش بھی۔

طنز یہ و مزاحیہ چیزیں پڑھتے پڑھتے خواہ مخواہ کچھ شوخ قسم کے فقرے قلم کی زبان پر آ گئے ہیں ورنہ مجھ ایسا انکسار مآب یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہیں ہوا۔ ہاں اتنی دعا آپ بھی کریں کہ میں ان موضوعات پر بھی کام کر سکوں جن کے لیے میرا دل انگڑائیاں لیتا رہتا ہے تاکہ اس وقت کی چھوٹی بات کل کلاں کو سچی ہو جائے۔

جب سے دنیا بنی ہے پریشانیوں سے چھٹکارا کوئی نہیں پا سکا۔ بادشاہ ہو تو، فقیر ہو تو، وزیر ہو تو، غریب ہو تو، کوئی سلطنت کے عشق میں

بھتا ساکہ کوئی اپنی والدہ کے غم میں۔ یہ سب کچھ ازل سے چلا ہے ابد تک چلے گا۔ ایسے میں انسان اگر اپنے بے بسی خوشی کے چٹکلے بھی نہ نکال سکتا تو پھر کیا ہوتا۔ سوچیے نہیں غش آ جائے گا۔

ہمارے لیے یہی مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جھٹ پٹ لغوانہ قسم کی باتیں چھوڑ اصل موضوع پر آ جائیں ورنہ کہیں واقعی وہ بات دہرا جو اوپر لکھ آئے ہیں۔

لیجیے جناب! یہ نمبر ۱۲ عنوانات کے تحت مکمل ہوا ہے۔ اب اس کی ترتیب کے بارے میں حسب وعدہ جلدی جلدی باتیں سن لیں اور میں چھٹی دیں۔

۱۔ مضامین ۔ اس عنوان کے تحت اب تک جتنے بھی کارآمد مضمون چھپے تھے وہ سب بر آمد کیے۔ جو گوشے تشنہ تھے ان پر نئے مضامین لکھوائے۔ اب یہ حصہ اتنا مکمل ہے کہ اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ کیا ہوتا۔ اس حصہ میں کلیم الدین احمد جیسے بڑے لکھے انتہا پسند بھی ہیں جو میں نہ مانوں قسم کی تنقید کے امام ہیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام ایسے نکتہ شناس بھی اور ڈاکٹر اعجاز حسین ایسے اعتدال پسند بھی اور پروفیسر محمد علم الدین سالک ایسے عالم بھی۔ غرض اس حصہ میں جتنے بھی مقالہ نگار ہیں انھوں نے اس موضوع کو پانی کر دیا ہے۔ واضح رہے ہم نے پانی پھیر دیا ہے، نہیں کہا۔

۲۔ دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب ۔ ہمارے بعض مزاح نگار بدنام ہیں کہ انھوں نے فلاں انگریز مصنف کا ترجمہ اپنے نام سے کر ڈالا۔ فلاں نے فلاں فرانسیسی ادب کی تخلیق کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا۔ فلاں فارسی کے مصنف کا لفظی ترجمہ فلاں صاحب نے کر ڈالا۔ یہ باتیں سچی ہیں یا جھوٹی اس بحث میں خواہ مخواہ الجھ کر کیوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ٹھانیں۔ ہمیں عرض صرف یہ کرنا ہے کہ انگریزی اور فارسی کا اردو مزاح نگاری پر بڑا اثر ہے ——— بڑا ہی اثر ہے ——— ہمارے ادیب ان زبانوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے انگریزی، فارسی اور فرانسیسی کے علاوہ دنیا کی دیگر بڑی بڑی زبانوں کے بھی تراجم پیش کر دیے ہیں تاکہ یہ تراجم پس منظر کا کام دیں یا نہ دیں دنیا کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا تو ہلکا سا تصور سامنے آ جائے۔

۳۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے ۔ یوں تو شروع سے لے کر اب تک سینکڑوں ہی مزاحیہ پرچے نکلے ہیں بلکہ ایک علامہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اودھ پنچ سے بھی پہلے ڈیڑھ سو سے زیادہ پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے بھی محنت سے کچھ ابتدائی نمونے اکٹھے کیے ہیں۔ ان سے بس اتنا ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے پہل نثر میں کس معیار کی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو نمونے اودھ پنچ سے پہلے کے ہیں، کچھ اسی دور کے۔

۴۔ اودھ پنچ کا دور ۔ اودھ پنچ سے اردو مزاح نگاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جس معیار کا مزاحیہ پرچہ تھا اس معیار اور انداز کا کوئی دوسرا پرچہ اب تک نہیں نکلا۔ اس پرچے کا کام لوگوں کو صرف ہنسانا ہنسانا نہ تھا بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی بیدار کرنا تھا۔ ہمارے نزدیک تو اس پرچے کا زیادہ تر مقصد سیاسی بیداری ہی تھا مگر اس نے اُٹھلی طنز و ظرافت کی۔ اودھ پنچ کے اب تک جتنے انتخابات چھپے ہیں ہم نے ان سے مدد لی۔ اس کے علاوہ خود بھی اودھ پنچ کی فائلوں میں غوطہ زن رہے۔ ہمارے اس انتخاب میں دوسرے انتخابات سے زیادہ مواد ملے گا اور پھر مختلف۔ ہم نے انتخاب ہی انتخاب پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس پر کہ معلوم ہو سکے کہ اس پرچے کا عام معیار اور انداز کیا تھا۔ اس میں کیا کچھ چھپتا تھا اس کمی کو ہمارے علاوہ اب تک کسی نے پورا نہیں کیا ——— اس اخبار کے بارے میں اودھ پنچ ہی کے شاعر کا کہنا، یہ بھی ہے ؎

مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورت طفل　　جواں و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

۵۔ فتنہ اور عطر فتنہ ۔ یہ پرچے ریاض خیر آبادی نے نکالے اور اودھ پنچ کے زمانے ہی میں نکالے۔ یہ پرچے اودھ پنچ کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر [illegible]

کی شگفتہ بیانیوں نے اس کی حیثیت کو منوا ضرور لیا۔ اودھ پنچ کے مقالہ نویسوں اور لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ٹیم تھی ابھی اس کی حیثیت بھی تھی
ورنہ اکیلے سجاد حسین کیا کرتے۔ مگر ابعد قریب قریب ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش رہی کہ ان
پرچوں کے انتخابات سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے۔ بہرحال طنز و مزاح کے سلسلے میں ان پرچوں کو کوئی
بھی نظرانداز نہیں کر سکتا ——— جب خضر صورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی نوبت ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے
ریاض کی تصویر دیکھی ہے تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

بڑے نیک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

۶۔ **شیرازہ** ۔ اودھ پنچ سے زیادہ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ فتنہ اور عطر فتنہ میں تھا اور فتنہ، عطر فتنہ سے زیادہ شیرازہ میں۔ چراغ حسن حسرت جیسے
باغ نظر اور بذلہ سنج اس کے مدیر تھے۔ یہ پرچہ اودھ پنچ کے کوئی نصف صدی کے بھی بعد نکلا۔ اتنا نکھار اور بانکپن کچھ تو زیادہ وقت نے
اور کچھ حسرت صاحب کی جودت نے۔ اس پرچے میں زیادہ تر حسرت صاحب ہی چھائے رہے۔ اگر فتنہ، عطر فتنہ ریاض کی وجہ سے
مقبول ہوا تو شیرازہ حسرت صاحب کی وجہ سے۔ بہرحال اسے یہ امتیاز ضرور حاصل رہا کہ اس کی ہر بات میں وقار اور اس کی ہر چیز میں فنی
اور علمی شان تھی۔ حسرت صاحب نثار کی حیثیت ہی سے زیادہ ابھرے مگر جب کبھی وہ نظم میں کچھ کہہ گئے ہیں تو وہ بھی مزے کی چیز ہو گئی۔ مثلاً
اتحاد پارٹی کی شان میں ؎

تیرے گورے گورے گال — اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال — اتحاد پارٹی ——— وغیرہ

۷۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور** ۔ جس ادیب نے بھی نثر میں لکھا ہے اس کے ہاں ڈھونڈے سے شگفتہ طنزیہ اور مزاحیہ چیزیں مل ہی جاتی ہیں،
جب مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے ہاں بھی اس نوع کی چیزیں مل جاتی ہیں تو پھر بھلا اور کون پیچھے رہا ہوگا۔ ہم نے اس سلسلے کو غالب سے شروع
کیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ جن کی تحریروں میں اس موضوع سے متعلق نمایاں حصہ ہو صرف انہی کو لیا جائے۔ اس حصے میں بڑے بڑے ادیبوں
کے نام سامنے آتے ہیں مگر سب کے سب باقاعدہ قسم کے طنز نگار یا مزاح نگار نہ تھے۔ اگر ہم ان میں سے کچھ کو چھوڑ دیتے تو اس موضوع کی زنجیر کی
کڑیاں ملانے میں دشواری ہوتی۔ بہرحال اس حصے میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تبرک نہیں ہے کام کی چیزیں ہیں۔ انہی سے بعد کے مزاح نگاروں کو
نئی راہیں ملی ہیں۔

۸۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور** ۔ ہم چونکہ خود اس دور سے گزر رہے ہیں، یہی وجہ ہے شاید کہ ہم اپنے سے ذرا پہلے دور ہی کو طنزیہ و مزاحیہ
ادب کا زریں دور سمجھتے ہیں۔ جب اس دور میں پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک،
امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی ہوں تو ہم کیوں نہ اس دور کو زریں دور کہیں۔ یہ حصہ پطرس سے شروع ہو کر زمانہ حال کے لکھنے والوں تک
آ جاتا ہے۔

۹۔ **اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر** ۔ حصہ نظم کے بارے میں فاضل مقالہ نگار محمد عبداللہ قریشی نے ابتدا ہی میں اس کی ترتیب کے بارے میں
سب کچھ لکھ دیا ہے اس لیے یہاں چپ بھی رہوں تب بھی حرج کچھ نہیں۔ اُردو نثر سے پہلے اُردو نظم میں ہی طنزیہ و مزاحیہ چیزیں لکھی گئیں

اتنی طرح جو شاعروں نے گل کھلائے وہ سب ہم پیش کر دیتے تو ڈر یہ تھا کہ بعض نستعلیق قسم کے دوست کہہ دیتے "ہائے شاعر تھے بدمعاش سے تھے" ہم نے حتی الامکان تُبک، پوچ اور لغو شعروں سے اس حصّہ کو بچایا ہے اور پھر زمانہ حال کے شاعروں سے زیادہ پرانے شعرا کو ترجیح دی۔ موجودہ شعراء پر غیر جانبداری سے کام کرنے کا یہ موقع ہے بھی نہیں۔ کون بُری بھلی باتیں سُنے ——— آخر میں اس حصّے کے بارے میں یہ بات اور سُن لیں ——— خوب ہے یہ چیز!

۱۰۔ مزاحیہ کردار۔ جب تک کوئی بڑا لکھنے والا نہ ہو وہ کسی کردار کو زندہ جاوید بنا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں مزاح نگار رہے، اُنہوں نے سینکڑوں زندہ کردار نہ دے سکے۔ کھینچ تان کر آپ زیادہ سے زیادہ چھ سات کردار پیش کر سکتے ہیں جیسے خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، پیزاجی اور قاضی جی، بس! ——— مجید لاہوری نے کئی کرداروں کو روشناس کرانا چاہا مگر وہ زیادہ کردار روشناس کرانے کی دُھن میں مارے گئے۔

۱۱۔ مزاحیہ کالم۔ شروع سے لے کر اب تک اخباروں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس کا ایک کالم تو ضرور مزاحیہ ہو۔ بے شمار اخبار نکلے، بے شمار ہی مزاحیہ کالم لکھے گئے۔ اگر ان سب کے مزاحیہ کالموں کو یہاں درج کر دیتے تو وہ بھی ہزاروں صفحوں میں پھیلتے۔ ہم نے صرف چند نمایاں اخباروں کے مزاحیہ اور طنزیہ کالموں کو یہاں جگہ دی ہے۔ یہاں ایک بات کہنے کی ہے، نہ کہیں تو کوئی گڑبڑ بھی نہ ہوگی، وہ یہ کہ یہ کالم بڑے بڑے ادیب ہی لکھتے رہے ہیں۔ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی نہ ہے۔

۱۲۔ ادیبوں کے لطائف۔ یہ موضوع بھی بڑا لمبا چوڑا ہے مگر فاضل مضمون نگار شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تو نمایاں ادیبوں کے اچھے اچھے لطیفے جمع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارا پرچہ پہلے ہی زیادہ ضخیم نہ ہو جاتا تو اس موضوع پر اور بھی کچھ پیش کرتے۔

آخر میں مجھے ان چیزوں کے انتخاب کے بارے میں یہ اعتراف کرنا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں نے جتنی چیزیں چُنی ہوں وہ سب اس موضوع پر لکھے والوں کی شاہکار ہی ہوں۔ میں نے انھیں صرف اپنی عینک سے دیکھا ہے ——— اگر میری عینک کا نمبر ٹھیک نہیں ہے تو اس پر آپ بے شک ماتم کر لیں ——— بہرحال یہ چیزیں مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند ضرور ہیں۔ پسند کے علاوہ ایک مجبوری کو اور بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لکھنے والوں کی سب کی سب تخلیقات میرے سامنے نہ تھیں۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ اللہ کی شان! یوں ٹھوکر کھانا بھی میری ہی نالائقیوں میں شمار ہوگا۔

کچھ نام ایسے ضرور نکل آئیں گے جن کا اس نمبر میں آنا ضروری ہو مگر میں کیا کروں اس نمبر کی ضخامت کے ہاتھوں موجودہ صورت میں بھی پریشان ہوں، جب تو اور پریشان ہوتا ——— اور تو اور میں نے خود اس نمبر کے لیے ایک بڑا "معرکۃ الآرا" مضمون لکھا تھا مگر وہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے روکنا پڑا۔ اور تو کسی کا ذکر ہی کیا ——— پنجابی میں ایک مثل ہے "ملّاح وا حقہ سدا ای تُنگا![1]"

محمد طفیل

---

[1] ملّاح کا حقّہ پانی سے محروم ہی رہتا ہے

ادارۂ نقوش، "پطرس کی یاد" میں آئندہ شمارہ پیش کرے گا

ہنسنے کی ابتدا اور اہمیت

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

قدرت کا کرم سمجھیے یا ستم کہ ہر آدمی رونے یا ہنسنے پر مجبور ہے۔ زندگی کے لیے دونوں ازبسکہ ضروری ہیں۔ ان دونوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلے کون پیدا ہوا اور بعد میں کون؛ اس کا فیصلہ کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے جھگڑے سے بچنے کے لیے میر درد کی طرح کہہ دیا ہے کہ ؎

شادی و غم جہاں میں توام ہے

موضوع کے اعتبار سے فی الحال ہم اپنے لیے بھی یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ تقدیم و تاخیر کی بحث سے الگ ہو کر اہمیت پر غور کریں حالانکہ یہ گفتگو بھی الجھن اور دماغ ریزی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ لیکن یہ عام خیال کہ رونے کے لیے بھی خوش دلی کی ضرورت ہے مسئلہ کو سلجھانے میں بڑی مدد کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر خوش دلی کے گریہ و بکا بھی تشنہ رہ جاتا ہے اور اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ دنیا زیادہ تر خوشی کی طالب ہے۔ ہنسنے کے مقابلے میں رونے سے گریز کرتی ہے اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جذبات کے لحاظ سے ہنسنے کی اہمیت زیادہ اور اتنی عظیم ہے کہ اگر خوشی دنیا سے اُٹھ جائے تو غالباً محفلِ عالم کو پہچاننے میں فرشتوں کو بھی تکلف ہو۔ انسان کا جینا دوبھر ہو جائے اور خدا جانے کیا کیا ہو جائے۔

ہنسنے کی اہمیت مسلّم مان کر آئیے اس پر غور کریں کہ اس کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم کو اس دور کی زندگی پر نظر ڈالنی ہوگی جس کی تاریخ پر نامعلومیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بقول مومن ؎

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں
دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں

انسانی حالات و واقعات پردۂ خفا میں ہیں۔ قیاس و خیال آرائی کے سوا کوئی تحریری ثبوت نظر نہیں آ سکتا مگر یہ خیال آرائی بے بنیاد نہیں؛ اس کے پسِ پشت عقل و نفسیات کا شائبہ بھی ہے چنانچہ بغیر تاریخ و تحریر کے بھی یہ بات قابلِ قبول نظر آتی ہے کہ ہنسنے کی ابتدا آدمی نے اس وقت کی جب وہ تہذیب و تمدن سے بیگانہ تھا۔ ہنوز وہ عہدِ حجری میں بھی قدم نہ رکھ سکا تھا۔ بال و ناخن بڑھائے لحیم شحیم پیکر کے ساتھ بغیر قیام گاہ کے جنگل جنگل تلاشِ معاش میں پھرتا تھا، اپنی حفاظت کے لیے برق و باراں سے لڑتا تھا، خونخوار جانوروں سے مقابلہ کرتا تھا، اپنے ہم جنسوں سے بھی نبرد آزما ہوتا تھا اور جب دشمن پر فتح پا جاتا تھا تو جیسا ہے اس کے پاس معنی خیز الفاظ نہ تھے ہول

؎ اس مضمون کی تیاری میں مغرب کے بعض ممتاز مصنفین مثلاً برگساں، جیمس سلی، البرٹ راپ وغیرہ کے خیالات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یاد ہے جب وہ خوشی کے نعرے لگاتا تھا اور جانی حیثیت کر دشمن کو مغلوب اور اپنے کو غالب دیکھ کر شادمانی کے عالم میں زور زور سے ہنستا تھا۔ مقابلے میں اپنی فتح مندی کا اعلان کرتا تھا۔ احساس برتری کے نشے میں سرشار ہو کر پوری فضا کو شاداں و خنداں محسوس کرتا تھا خود بھی ہنستا اور دوسروں کو بھی ہنسا کر داد اور ہمت افزائی کا حوصلہ پاتا۔

اس ہنسی کے پس پشت غرور، تذلیل، تضحیک وغیرہ کے ملے جلے جذبات ہوتے گویا ہنسنے کی ابتدا وحشیانہ، جارحانہ اقتدار پر قائم ہوئی جو صدیوں بعد شائستہ تہذیب ہوئی۔ بالکل اسی طرح معاشرہ نے اس ہنسی کی تربیت کی جس طرح وحشی ہاتھی گھوڑوں کو رفتہ رفتہ انسان نے محنت کر کے کار آمد خوبصورت بنایا اسی نہج اس وحشیانہ فعل کو بھی مدتوں کے ریاضت خاصے کی چیز بنا دیا۔ ہر مہذب سوسائٹی کے لیے ہنسنا ہنسانا ضروری سا ہو گیا یہاں تک کہ خندہ کا دہن کی پسندیدگی کا باعث ہوا چنانچہ "مزاح المومنین" ایک مخصوص و مقبول ذہنیت و ذکاوت کی علامت سمجھی گئی۔

ہنسنے کے ارتقا میں جو کچھ انسان نے محنت کی وہ تمدن کا قابل قدر کارنامہ ہے لیکن اگر ہنسی میں بذات خود ترقی کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اس کی گیرائی اس پایہ کی نہ ہو سکتی کہ اس کو آدمی کا جوہر خاص سمجھا جاتا اور دوسری مخلوق سے تمیز کرنے میں انسان کی شناخت یہاں تک کی جاتی کہ وہ صرف حیوان ناطق نہیں بلکہ ہنسنے والا جانور بھی ہے۔ علاوہ اور خصوصیات کے ہنسی ایک فن متعدی کی صفت سے متصف تھی کسی کو ہنستے دیکھ کر دوسرا شخص بھی ہنسنے لگتا اور اس ہنسی میں کچھ دیر کے لیے سہی غم دنیا بھول جاتا۔ ذہنی خلفشار کی شدت خود بخود محو ہو جاتی، کشاکش سے نجات کا احساس ہوتا بلکہ کچھ ویسی ہنسی اس کو ایک ایسی توانائی بخش دیتی کہ غم دنیا کو برداشت کرنے کی از سر نو قوت آ جاتی۔ وہ اپنی الجھنوں کو حال کی وقتی مسرت سے مستقبل قریب میں ہموار اور برداشت کرنے کی طاقت محسوس کرتا۔

جس ہنسنے کی بنیاد غیر مستحسن جذبات پر سمجھی گئی ہے اسی کے بطن سے ظرافت اور اس سے متعلق جملہ اجزاء کی پیدائش بھی ہوتی رہی ہے۔ طنز، ہزل، پھبتی، پھبتی، فقرے بازی وغیرہ سب اسی ہنسنے ہنسانے کی مختلف صورتیں یا علامتیں ہیں گویا ہنسنا ایک برگد کا درخت ہے جس کی جٹائیں زمین پر خود ایک درخت بن گئیں۔ سایہ کی لطافت و نزاکت کا مزا پا کر اہل علم و طبیعت سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تمام متمدن و مہذب معاشرے کچھ دیر اس کی چھاؤں میں آرام کر لینا ضروری تصور کرنے لگے لیکن باوجود نفاست و دلکشی کی صیقل و جلد کے اصل سے فروع کی نسبت باقی رہی۔ اس خندہ دندان نما کے خمیر میں دل آزاری شامل تھی وہ کسی نہ کسی تناسب و صورت میں غور کرنے پر اب بھی نظر آتی ہے۔ ظرافت کتنے ہی معصوم انداز میں کیسے مگر عموماً کسی ذات کا ہنسنا مقصود ہوتا ہے۔ ہنسنے والے خوش ہوتے ہیں مگر جس پر مذاق کا نشتر لگایا جاتا ہے اس کے دل سے پوچھیے تو ہا وجود ظاہری اظہار مسرت کے بہ باطن وہ روتا ہو گا گویا اس ترقی یافتہ صورت میں بھی ظرافت دل آزاری سے باز نہ آ سکی۔ اب یہ اور بات ہے کہ جارحانہ انداز نے شرافت کا بھیس بدل لیا ہو اور دل شکنی جمہوری شعور اور مذاق عام میں شدت سے محسوس ہونے دے۔ دکھ درد کے باوصف مجروح شخص اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اپنے کو مجلسی ہونے کا ثبوت دے۔

ہنسی کی ابتدا جیسے بھی ہوئی ہو لیکن قرینہ یہ کہتا ہے کہ اس کا دائرہ اور بنیاد دونوں ارتقائی منازل میں متغیر ہوتے رہے۔ صرف دشمن پر کشت و خون سے فتح یابی ہنسی کا واحد سبب نہیں رہا بلکہ مختلف و متعدد وجوہات نئے نئے بھیس میں ہنسنے ہنسانے کا سرمایہ بنتے رہے اور پر کہا گیا ہے کہ اس کی بنیاد تضحیک و تذلیل پر قائم ہوئی لیکن تدریجی نشو و نما سے بعد میں ہنسنا اصلاح و تربیت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ اکثر مقامات پر ہمدردی اور خیر خواہی کی جھلک ہنسی میں نظر آنے لگی۔ اسی ہنسی کو برقرار رکھنے کے لیے تقریر، تحریر، عمل، صورت، الفاظ، حرکات و سکنات وغیرہ کا سہارا لیا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ فنون لطیفہ کی حد میں داخل ہو گیا چنانچہ طربیہ بن کر ڈرامہ کی جان بن گیا اور ادب کے محاسن میں شمار ہونے لگا۔

ہنسنے ہنسانے نے انسان کے جس شعور کو بلندی عطا کی اس کا تقاضا تھا کہ اس کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے ظرافت کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا جائے۔ موقع و محل کے لحاظ سے الفاظ و لہجہ اس طرح پیش کرنا کہ مجلس ہنس پڑے اور بے ادبی کو دور چھوڑتے ہوئے اپنا پہلو بھی سے سرسبز ہو جائے مستقل ایک فن بن گیا۔ مواد و ہیئت کے لحاظ سے مذاق کے مختلف پہلو ہو گئے۔ امتیازی خصوصیات کی بنا پر اہلِ علم نے ظرافت کو سمجھ بوجھ کر خانوں میں بانٹ دیا چنانچہ ہجو سے لے کر طنز تک اسی کی بکھری ہوئی شکلیں ہیں۔ ان میں سے بعض اجزا اپنے اصل سے زیادہ قریب ہیں یعنی ان کی سرشت میں دلچسپی سے زیادہ دل آزاری ہے مثلاً ہجو، طنز، پھبتی وغیرہ ان کا مقصد کسی کو زک پہنچانا ہوتا ہے۔ برخلاف ان کے مزاح کے پیش نظر زیادہ تر ہمدردی و اصلاح کا جذبہ ہوتا ہے۔ البرٹ راپ نے مزاح (HUMOR) کے سلسلے میں جو لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے[۱]:

"مزاح کے تبسم میں ترحم شامل ہوتا ہے جس پر طنز کرتا ہے اس سے اس کو محبت ہو جاتی ہے"۔

یہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ مزاحیانہ ہنسی میں محبت کے جزو کو غالب ہونا چاہیے مگر کچھ مصنفین ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مزاح بھی اپنے اصل کی خصوصیات سے مبرا نہیں یعنی اس میں بھی کچھ نہ کچھ قابلِ گرفت خرابیاں موجود ہیں مثلاً اور کچھ نہ سہی مزاح میں احساسِ برتری کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ بہرحال صدیوں کی محنت و ترقی کے باوجود ظرافت میں کثافت کا پرتو شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جیسے جیسے انسانی تہذیب بڑھتی گئی سماج نے اپنے طور پر ظرافت کو حسبِ توفیق ایسی فنکاری سے سنوارا کہ اکثر اوقات وہ کثافت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار کلیتاً نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنا ہے کہ جب اس کے خمیر میں خرابیاں موجود تھیں تو معاشرہ نے اس کو قائم رکھنے کی ہزار ہا سال سے جد و جہد کیوں کی؟ اس کے وجود میں تھوڑی سی بھی کثافت تھی تو ختم کرنے کی فکر کیوں نہ کی گئی۔ غالباً اس میں فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ خفیف سے نقصان کو برداشت کرنا دنیا نے گوارا کر لیا۔ آیئے فرداً فرداً اس کے فوائد پر بھی نظر کریں اور یہ بھی سوچیں کہ سماج میں اس کی گیرائی کے اسباب کیا ہیں اور ممکن ہو تو یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ فوائد جذباتی تصورات کے نتائج ہیں یا سچ مچ ان سے دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔

سفرِ زندگی میں ہنسنا ہنسانا ایسا ہی ہے جیسا کڑی دھوپ کے بعد شجرِ سایہ دار کا میسر آ جانا۔ تلخیٔ غم جب لذتِ حیات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے تو تھوڑی دیر کی خوش دلی از سرِ نو تازگی عطا کر دیتی ہے۔ نہ صرف سفر کی تکان دور ہو جاتی ہے بلکہ جن حادثات و واقعات کو بوجھ سمجھ کر راہرو اپنی زندگی سے پریشان تھا اس کو پھر ایک نئی قوت سے اٹھانے کی ہمت اپنے میں پاتا ہے۔ جتنی دیر وہ ہنسنے ہنسانے میں رہتا ہے اتنا وقت وہ روزمرہ کے غموں سے الگ ہو کر زندگی کی بھیانک تصویر کے بجائے اس کے حسین و دلکش رخ کو دیکھتا ہے اور خوشی خوشی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے گویا اسے ایک ایسی مقوی دوا مل گئی جس کے سہارے وہ غمِ فردا کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا ہے اس لیے کہ اس کو ایک تبدیلی ملی جو بجائے خود چاہے تفریح ہی ہو مگر اس تفریح میں اور بھی لوگ شامل تھے جو کسی نہ کسی غم سے چھٹکارا حاصل کرنے یا زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے کی فکر میں تھے سو وہ ان سب کو ہم جماعت اور ساتھی سمجھ کر تنہائی و کس مپرسی کے پنجہ سے اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی اپنے کو ہنسنے پر مائل پاتا ہے علاوہ اور باتوں کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہنسی بذاتہٖ ایک کشش ہے یا یوں سمجھیے کہ اس میں وہ مقناطیسی اثر ہے کہ دوسروں کو بے تحاشا اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ حاصل اس سے کہ سننے والا راز کو سمجھ کر ہنس رہا ہے یا بے سمجھے بوجھے شریکِ بزم ہو گیا ہے، دوسروں کو ہنستے دیکھ کر اس طرح ہنسنے لگتا ہے گویا سب کچھ بھول کر وہ صرف ہنسنا ہی جانتا ہے۔ جملہ اہلِ محفل

---

[۱] ORIGIN OF WIT AND HUMOR

ایک دوسرے کو اپنا ہم نوا خیال کرنے لگتے ہیں اب معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش دل جماعت میں امتیاز و اختلاف سب مٹ گئے ہیں۔ ہنسنے والے ایک دل ایک خیال ایک رائے ہیں۔ اس طرح گویا ہنسی ہی متحد و منسلک کرنے کی بے نظیر صلاحیت ہے اس لحاظ سے ہنسنا لاشعوری طور پر مجلسی ہوا کیونکہ یہ وقفہ مختصر ہونے کے باوجود بھی اتفاق و اتحاد کا ایک مستقل رابطہ بن جاتا ہے۔

ہنسنے کا دوسرا سماجی پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کسی مجلس میں کسی فرد پر ہنسنا دل آزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یقیناً ہنسے جانے والے پاس لحاظ سے ظلم ہوتا ہے کہ اس کی دل شکنی ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ہنسنا اتحاد و اتفاق کی جگہ نفرت و اختلاف کا باعث ہے لہٰذا وہ غیر سماجی فعل ہے لیکن غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل آزاری کے پس پشت اصلاحی و تعمیری خصوصیات لے کر ہنسی آتی تھی۔ عموماً ان ہی لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے جو بر خود غلط یا گندم نما جو فروش ہوتے ہیں جس کی مثالیں آپ کو سودا کی ہجو سے لے کر اکبر کی مزاحیہ شاعری تک میں ملتی ہیں مثلاً اکبر ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اب کہاں تک تنگ ہے میں عرض ایماں کیجیے

تا کجا عشق بتاں میں سست پیماں کیجیے

ہے یہی بہتر علی گڈھ جا کے سید سے کہوں

مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

اکبر ایک زمانے تک سر سید کو بر خود غلط انسان سمجھتے تھے اگرچہ ان کی خدمات کے قائل بھی تھے اس لیے ہمدردی بھی تھی چاہتے بھی تھے کہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔

سودا کے زمانے میں ایک بر خود غلط مولوی نے "حلت غراب" کا فتویٰ دے دیا تھا۔ سودا کہاں ضبط کر سکتے تھے ایک مخمس اس کی ہجو میں کہہ کر عوام و خواص کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک بند اس مخمس کا یہ ہے ؎

بگڑا ہے آج مجتہدوں بیچ کیا یہ فیل ⠀⠀ ملا لطیف بولے کہ کھانا روا ہے چیل

کہتا ہے چاند خاں کیا کن نے حرام فیل ⠀⠀ حلت پہ مینڈکی کی میاں جی کی سو دلیل

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

اس طرزِ عمل میں جس کو بظاہر دل آزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے حقیقتاً ایک غلط کار کی اصلاح کرنے کا بھی جذبہ ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو متنبہ کرنے کا بھی خیال رہتا ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ نہ پکڑے۔ اس بات کو جب ہم سوچتے ہیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسی دل آزاری جو اتنے فوائد پر مشتمل ہے اس خاموشی سے بہتر ہے جو کسی ایک فرد کو اور اس کی تقلید سے ایک بڑی جماعت کو نقصان پہنچانے والی ہے۔

ہنسی اور سماج کا تعلق ایک اور معرکے میں نمایاں ہوتا ہے زندگی کے نقشہ میں جب کبھی نئے حالات، جدید رسوم یا فیشن نے رنگ آمیزی کی ہے تو ہنسنے نے سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیا ہے اس نے نئی باتوں کا مذاق اڑایا ہے، مخالفت میں قہقہے بلند کیے ہیں لوگوں کو کورانہ تقلید سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ڈارون کے عظیم و اہم نظریہ کو کہ انسان آدمی ہونے سے پہلے بندر تھا کی منزل میں بندر تھا، ابتداً مشرق میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، تحریر و تقریر سے اس مسئلہ کی اتنی مخالفت نہ ہوئی ہوگی جتنا ہنس ہنس کر لوگوں نے اسے

چنانچہ اس ضمن میں متعدد گوشے نظر انداز کر دیے گئے ہیں کیونکہ اگر وضاحت کے ساتھ پیش کیے جائیں تو ایک پورا کتاب کی ضخامت درکار ہوگی۔
اب اور باتوں کو چھوڑ کر یہ دیکھنا ہے کہ ہنسنے سے دماغی اور جسمانی فوائد بھی ہیں یا نہیں؟ کہا یہ جاتا ہے کہ ہنسنا صحت کے لیے مفید ہے اس سے جسم پر صحت مند اثر پڑتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں مختلف نظریے پیش کیے جاتے ہیں اور تجربہ کرنے سے واضح ہے کہ دلیل کی حد سے نکل کر ہم لحاظ سے اس کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو مسلم ہے کہ تردد، کشمکش، غیظ و غضب اور خوف کے جذبات معدہ تک ہاضم رطوبت کو پہنچنے نہیں دیتے جس کی کمی انسان کو نحیف و مجہول بنا دیتی ہے۔ برخلاف اس کے ہنسنا ان تمام مخالف صحت جذبات کو درہم برہم کر دیتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ غذا اپنے راستے صالح اجزا کے ساتھ معدہ تک پہنچ جاتی ہے۔ نشوونما کے مراحل طے کر کے انسان کو صحت مند جسم و دماغ کا مالک بنا دیتی ہے ڈاکٹر جیمس کا کہنا ہے کہ:

”ہنسنا ایک طرح کی مالش ہے جس سے پھیپھڑے، دل، جگر، آنت وغیرہ سب متاثر و متحرک ہو جاتے ہیں چنانچہ اکثر ادھیڑ عمر کے آدمی کم ہنستے ہیں اس لیے بھی ان کی صحت خراب رہتی ہے۔“

اسی ڈاکٹر کی رائے ہے کہ یہ مالش ایسے لوگوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے جو ورزش وغیرہ نہیں کرتے یا کاہل رہتے ہیں لیکن ہنسنے میں جو مالش ہوتی ہے وہ سب ہی کے لیے مفید ہے کیونکہ ہاضمہ کی راہ میں جو رکاوٹیں جالے کی طرح پھیلی رہتی ہیں ان کو نہ صرف یہ صاف کر دیتی ہے بلکہ ان گوشوں تک صالح اجزا پہنچا دیتی ہے جو کسی وجہ سے اب تک محروم تھے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی ہنسنا اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی فوائد حاصل ہوتے ہیں بلکہ دماغ کی بھی حالت بہتر ہو جاتی ہے، احساسِ کمتری کو برتری میں تبدیل کرنے کے لیے ہنسنا جتنا کارآمد ہے شاید ہی کوئی تحریک اتنا اثر کرتی ہو۔ منجملہ دیگر وجوہ کے ایک بات یہ ہوتی ہے کہ ہنس کر آپ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم احساسِ کمتری کا شکار نہیں اور اسی اعلان کے پردے میں آپ اپنی عزت و وقار کا لحاظ لے کر پھر راہِ اعتدال پر آ جاتے ہیں۔ ذہنی کمزوریوں کی تلافی خودداری کے احساس سے ہو جاتی ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے عالم میں ہنسی فرار و خود فریبی کی دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اعتراض صحیح ہو لیکن باوجود اس کے بھی نتیجہ اچھا ہوتا ہے ہنسنے سے احساسِ کمتری تو دور ہو جاتا ہے چاہے راستے اس نے کوئی بھی اختیار کیے ہوں۔ بقول غالب ؏

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اس سے بحث نہیں ہے کہ آپ میں احساسِ کمتری پیدا کرنے والے کو شکست ہوئی یا نہیں! انجام یہ ضرور ہوا کہ ہنسنے ہنسانے میں آپ کا جذبۂ خود اعتمادی برقرار رہا، آپ کے دل و دماغ کو مجہول و مرعوب ہونے سے اس نے بچا رکھا، آپ کی انفرادیت کو ابھرنے کا موقع دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ خودداری کے ساتھ خطرناک راستوں سے بچتے ہوئے اپنے ارادوں اور حوصلوں کی بھیڑ میں آگے بڑھتے چلے گئے!

طنز و ظرافت

ڈاکٹر خورشید الاسلام

"میرے لیے ایمان میں ملی کشش ہے مگر میں کفر کو بھی نگاہ سے نہیں دیکھتا، عمل کرتا ہوں مگر کاہلی کو عزیز رکھتا ہوں۔ اپنے نفس [illegible] احترام کرتا ہوں مگر آپ ہنستے ہیں ہوں تو آپ کی مخالفت کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ اور آپ پر قہقہہ لگانے میں کوئی تامل [illegible] مجھے اپنے ماحول سے محبت ہے لیکن میں اپنے ماحول پر حکمران نہیں ہوں۔ میں دنیا کی مسلمہ قدروں کو نہیں مانتا مگر پھر بھی میری [illegible] میں کوئی شبہ نہیں۔ میں عام طور سے بزدل ہوں لیکن ہمت اور جواں مردی سے یکسر محروم بھی نہیں ہوں۔ یہ دونوں حا[illegible] منحصر ہیں۔ میں چور نہیں ہوں لیکن کبھی کبھار کوئی چیز چرا لینے میں بھی مجھے عار نہیں۔ میں زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہوں لیکن [illegible] مستقیم کے مقابلے میں پُرپیچ راہیں مجھے زیادہ پسند ہیں۔ میں جنوب کی سمت چلتا ہوں تو مجھے فوراً شمال کا خیال آتا ہے اور [illegible] کی طرف جاتا ہوں تو دفعتاً میرا رُخ جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔

"ایماں مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر"

کچھ اس قسم کے تضاد میری شخصیت کی سرشت میں ہیں۔ میں شیکسپیئر کا ظریف کردار فالسٹاف ہوں۔ اگر آپ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں تو آپ ظرافت اور ظرافت کی شریعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ نے ڈان کوئزو کا نام بھی سنا ہوگا۔ اس میں اور مجھ میں بین فرق ہے۔ میں ظریف کردار ہوں وہ ظریفانہ کردار ہے جو بات میری فطرت ہے وہ اس کی فضا ہے اور یہی بات خوبی میں بھی ہے۔ میں فریب میں مبتلا نہیں ہوں یہ دونوں فریب میں مبتلا ہیں۔ یہ خود ظریف نہیں ہیں اپنے خالقوں کی بدولت ایک خاص فضا میں پہنچ کر ظرافت کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ میں واقعات پیدا کرتا ہوں یہ واقعات میں محصور ہیں۔ میں بھی ایک حد تک غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہوں لیکن میرے مبالغے میں فنی واقعیت ہے۔ یہ دونوں بھی ایک حد تک غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں لیکن ان میں فنی واقعیت کی کمی ہے اور اسی لیے کچھ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ باتیں میں نے فالسٹاف کی زبانی ادا کی ہیں۔ اب آپ تھوڑی دیر کے لیے فالسٹاف کو غائب اور مجھے حاضر ناظر مان لیں تو مشکل آسان ہو جائے۔ ہمارے ادب میں اور بالخصوص نثر میں طنز و ظرافت کی روایت پرانی نہیں اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارا ادب [illegible] نہیں۔ اُردو نثر نے اپنے فنی شعور کے ساتھ انیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا

اس کا جنم ہنگامی دور میں ہوا لیکن اس کو جنم دینے والے وہ لوگ تھے جو مے و نغمہ کو "اندوہ ربا" کہتے تھے۔ ان کے خیالات اور جذبات میں قدیم معاشرت کی آسودگی تھی۔ زمانہ واقعیت، تجزیہ اور استدلال کا تھا۔ مغرب کا اثر غیر شعوری طور پر زندگی کے ہر گوشے پر چھا رہا تھا لیکن چونکہ ابھی تک قدیم اور جدید متوازی چل رہے تھے اس لیے نثر بھی کچھ عرصہ تک قدیم اور جدید کے دام میں گرفتار رہی جس کی بہترین مثال "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" ہیں لیکن آہستہ آہستہ مغرب کا اثر دل و دماغ تک پہنچ گیا۔ سیاست بدلی تو اخلاق اور عقاید میں بھی تزلزل پیدا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور معاشرت کے اندر جو یہ تصادم رونما ہوا جو طنز و ظرافت کا اصل الاصول ہے۔ غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی "مراۃ العروس" شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ "اودھ پنچ" مشرق و مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں چار حضرات کے نام سر فہرست ہیں۔ رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، نواب آزاد اور اکبر الہ آبادی۔ ان سب کی منزل ایک ہے اور وسیلہ سفر بھی ایک ہے لیکن صلاحیت اور موضوع کے حدود میں فرق ہے اسی لیے ان کے تخلیقی کارنامے بھی ہیئت مجموعی اثر اور رنگ و جہات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اودھ پنچ کے بارے میں رشید صاحب کا خیال ہے کہ وہ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اس تنقید کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کے نصب العین میں توازن کی سخت کمی تھی۔

بہر حال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اور یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بحیثیت مجموعی "اودھ پنچ" کی ظرافت میں گہرائی اور طنز میں گیرائی کی کمی ہے۔ لیکن ہمیں زمانہ کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کر دینا چاہیے۔ "اودھ پنچ" کی ظرافت بھی ہے مگر رنگ سے خالی نہیں۔ کہیں کہیں عریاں ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ الفاظ کی بازی گری ہے لیکن اس میں فطری روانی بھی ہے۔ وہ قہقہوں سے فروغ پاتی ہے لیکن بدسلیقہ نہیں۔ اس کا طنز تیز ہے لیکن زہرناک نہیں۔ اس میں یکسانیت ہے مگر ہر ایک انداز کے بعد فضا کچھ اس طور سے بیدار ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں یک بیک جگنو جاگ اٹھے ہوں۔ "اودھ پنچ" کے صفحات میں آپ کو موضوعات کی رنگا رنگی، الفاظ کی کثرت، خیالات و جذبات کی بے جا فراوانی، کہیں مسکراہٹوں اور بیشتر قہقہوں کی وہ طغیانی نظر آئے گی کہ الامان، اور ایسا معلوم ہوگا کہ فطرت نے خزانوں کے در کھول دیئے ہیں اور یہ ساری دولت بے ضرورت اور بے خیال لٹائی جا رہی ہے۔

سجاد حسین کا سیاسی طنز دلچسپ ہے مگر سطحی ہے۔ وہ محاورات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں، واقعہ اور خیال سے کم، مگر کہیں کہیں ان کی طبعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور جدت پیدا کر دیتی ہے کہ دھوپ میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دے جاتا ہے۔ ان کی شہرت کا دارومدار ان کے ناول "حاجی بغلول" پر ہے جو ڈکنس کے پک وک ابراڈ (PICK WICK ABROAD) کا چربہ ہے۔ ڈکنس کی بساط بہت وسیع ہے۔ سجاد حسین کی بساط محدود ہے۔ ڈکنس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کردار زندہ اور واضح ہے، یہ بات سجاد حسین کو نصیب نہیں پھر بھی اس میں شگفتہ ظرافت ہے۔

"اودھ پنچ" کے دوسرے کامیاب رکن نواب آزاد ہیں جن کے متعلق رشید صاحب کی رائے یہ ہے کہ:

"نواب آزاد نے جس دل نشین اور معقول پیرایہ میں طنز کی ہے اس کا جواب
بحیثیت مجموعی اردو ادب میں نادر شمار ہے۔"

یہ رائے قطعی طور پر آخری ہے۔ ان کے طنز میں گہرائی بھی ہے اور شگفتگی بھی ہے۔ اس میں ظرافت ہے، بزرگی کا احساس

لیکن بدقسمتی سے نامعلوم حد تک کم ہیں۔ ان کے وہ خطوط جو لندن سے لکھے گئے ہیں "بہت رواں، سادہ اور خیال انگیز ہیں۔ یہ سطور دیکھئے ہیں:-

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں، کوئی آن، کوئی وقت، کوئی محفل بھی تو آئینۂ خیال کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگن کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ نفرت سے یاد آجاتا ہے۔"

آزاد نے تعریفات کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جس میں ہیبیڈز اکانی اور ڈاکٹر جانسن کا تتبع کیا گیا ہے لیکن ان کا سا ایجاز و اختصار پیدا نہیں ہو سکا۔ بعض تعریفیں دلچسپ ہیں مثلاً:

تعلیم نسواں = عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا

یا پارلیمنٹ = وہ پالی جہاں کے اصیل اور ٹینی دونوں کرٹے

سجاد حسین اور نواب آزاد نے جو کچھ لکھا ہے نثر میں لکھا ہے، اکبر نے نظم میں لیکن اکبر کی وسعتِ نظر، فنی شعور اور جذبہ کی شدت ان میں سے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ان عناصرِ اربعہ میں رتن ناتھ سرشار ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی مشہور داستان "فسانۂ آزاد" تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسے دیوزاد کا کارنامہ ہے جس سے دنیا نے انکار کر دیا جس نے خود بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا اور جو اپنے افسانہ کے ہیرو کو بھی نہ سنبھال سکا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آزاد رتن ناتھ سرشار کی مخلوق ہے لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خالق و مخلوق میں پردے حائل نہ تھے۔ آزاد مشرقی ہے لیکن مغرب کی ہر چیز کا استعمال کرتا ہے۔ اس میں خیال اور عمل کی بے پناہ قوتیں ہیں۔ لیکن چونکہ ماحول میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے وہ لاابالی ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور بیشتر تعمیری تنقید کرتا ہے اور اس تنقید میں صحت مند طنز بھی رہتا ہے لیکن چونکہ اس کو خود پر قابو حاصل نہیں ہے اس لیے الفاظ اور جذبات دونوں کو فراخ دلی سے لٹاتا ہے۔ وہ مذہب، مکتب، میکدہ اور مجلس آرائی کے ہر گوشہ کو چھو کر دیکھتا ہے اور دیکھ کر چھیڑتا ہے اور جب لکھنؤ کی محدود معاشرت میں اس کی قوتِ عمل کا اظہار نہیں ہو پاتا تو وہ عشق کر بیٹھتا ہے اور گرفتارِ بلا رہنے کے بعد روم و روس کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور آخر میں پرانی داستانوں کے ہیروؤں کی مثال ہو جاتا ہے جس کے معنی خیال کی وسعت اور میدان کی تنگی کے ہیں۔ آزاد اس زمانے کی معاشرت کا دماغ اور رتن ناتھ سرشار کا ہمزاد ہے۔ خوجی ظریفانہ کردار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ خاص واقعات میں محصور ہو کر ہی ظریف معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ ظریف ثابت نہیں ہو سکتا۔

میری رائے میں خوجی لکھنؤ کی وہ قدیم معاشرت ہے جو اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی ہے۔ اس میں روحانی قوت کا فقدان ہے جس کی کمی تو ہم پرستی سے پوری ہوتی ہے۔ اعتماد کی کمی ہے جس کی تلافی بے جا فخر سے ہوتی ہے۔ وہ صحت مندانہ محنت سے محروم ہے اس لیے افیون کا استعمال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے گزرا ہوا زمانہ چاند کا غار، حال صبح کاذب اور مستقبل ٹوٹا ہوا ستارہ ہے اس لیے زندگی خود فریبی کے سہارے گزرتی ہے۔ سرشار نے خوجی کا کردار بڑی خوبی سے تراشا ہے۔ ڈان کوئکزوٹ سے ملتا

محض کھوکھلی ہے، کبھی کام نہیں آتی، کہ پن چکی پر نیزہ سے حملہ کرے۔ خوجی ذرا ذرا سی بات پر اپنی قرولی مانگتے ہیں جو لکڑی کی ہے
ہمیشہ ادھر اُدھر چھوڑ جاتے ہیں اور وقت پڑنے پر زور سے پکارتے ہیں لانا میری "قرولی"۔ وہ کبھی نہیں لائی جاتی، اس سے کبھی وار نہیں
ہوتا، وہ محض واہمہ ہے۔ خوجی حرکات اور سکنات سے الفاظ اور مبالغے سے اور کبھی کبھی معصومیت کا لباس پہن کر ظرافت پیدا کرتا
ہے لیکن اس کے ظریف ہونے کا راز اس کی خود فریبی اور اس کے احول ہی سے ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لبِ چشمہ سار ایک پیالی میں افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت
کی طرف نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔
غور کرکے دیکھتا ہوں تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت ہے مگر دم کے دم میں
ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے"۔

بہرحال فسانۂ آزاد کے حدود افق سے جا ملتے ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا رشتہ انسان، خدا اور ماحول سے
ہے لیکن اس میں کچھ واضح اور جاندار ہے اور بہت کچھ دھندلا اور بے جان ہے۔
۱۹۱۳ء میں پنچ بند ہو گیا، دو سال بعد شیخ ممتاز حسین نے اسے پھر زندہ کیا۔ اس بار لکھنے والوں میں صرف ایک شاعر
کا نام یاد رکھنا چاہیے اور وہ سید مقبول حسین ظریف ہیں جنھیں محاکات میں کمال حاصل ہے۔
ریاض الاخبار کے ساتھ ریاض خیر آبادی نے دو مزاحیہ رسالچے "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" کے نام سے نکالنے شروع کیے،
جن کا مقصد انقلاب یا اصلاح نہیں آسودگی تھا۔ ان کے بارے میں یہ تبصرہ کافی ہے ع

بلبل چہک رہا تھا ریاضِ جمال میں

آپ چاہیں تو اس جمال کو فریب بھی کہہ سکتے ہیں۔
مغربی تعلیم اور مغربی ادب کا اثر بڑھتا رہا اور روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ انقلابِ فرانس کی تاریخ اور روسو اور والٹیر کی تحریریں
خواص میں عام طور سے مقبول ہوئیں۔ قومیت کا وہ جذبہ جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے اوائل میں دنیا کی سیاست اور قوموں
کے اخلاق کا محرک تھا تعلیم یافتہ طبقے کا دین و ایمان ہو گیا۔ آزادی اور جمہوریت کے تصورات ٹام پین، گوڈون اور اسپنسر اور مل
کے واسطے سے درس گاہوں میں نفوذ کر گئے۔ ذہنی آزادی اور قومی تشخص اور اپنے تہذیبی سرمائے کو کھنگالنے پرکھنے اور پیش کرنے
کا حوصلہ اور تصور پیدا ہوا۔ طنز و ظرافت میں ایک بنیادی تبدیلی یہ ہوئی کہ خیال جائز طور پر طنز و ظرافت کی بنیاد متصور کیا جانے لگا دوسرے
یہ کہ طنز و ظرافت کا دائرۂ عمل پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو گیا۔ اب معاشرت اور سیاست ہی نہیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی
قدریں بھی طنز و ظرافت کا مواد اور نشانہ بن گئیں۔ تیسرے یہ کہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب کے اسالیب اور موضوعات سے
ہمارا ادب متاثر ہونے لگا۔ چوتھے یہ کہ ایک عام آفاقی نقطۂ نظر بھی پیدا ہونے لگا۔ اس پیچیدہ تحریک کو سمجھنے کے لیے جنگِ عظیم
تک لکھنے والوں کے تین گروہ ذہن میں رکھیے۔ سجاد انصاری، مہدی افادی اور قاضی عبدالغفار، دوسرے میر محفوظ علی اور [illegible]
تیسرے ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں۔
سجاد انصاری اور مہدی افادی کی تحریروں میں اگرچہ اتنا ہی فرق ہے جتنا فلسفہ اور شاعری میں لیکن ان کے یہاں [illegible]

[illegible] ہیں، یہ کسی محدود نقطۂ نظر کے قائل نہیں، امارت کے خلاف ہیں، وہ امارت عقیدے کی ہو، علم کی ہو یا پرہیزگاری کی۔ [illegible] حسن کی امارت کے قائل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سجاد انصاری کے خیال میں قرۃ العین کو شہید نہ کرنا چاہیے تھا اور مہدی [illegible] خیال میں عورت چھونے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ایک طنز نگار ہے دوسرا بذلہ سنج اور خوش مذاق۔ دونوں نفاست کے [illegible] اور مولوی کے دشمن۔ دونوں کے یہاں تشکیک ہے، دونوں چھوٹے پیمانہ پر تصویریں بناتے ہیں اور اپنے فن میں کمال [illegible] ہیں۔ سجاد مشرق اور مغرب دونوں کی شراب ملا کر پیتے ہیں۔ مہدی مشرق کے آب و انگور سے پرتگالی شراب بناتے ہیں غرض کی آزادی، عقیدہ کی آزادی اور حسن پرستی ان کی بہترین قدریں ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے وہ ان کے طنز و ظرافت کا نشانہ ہے۔

قاضی عبدالغفار کا طنز مغرب کی سیاست اور مشرق کے اخلاق پر ہے لیکن ان کے طنز میں تبلیغ کم اور ترغیب زیادہ ہے۔ خطابت نہیں ہے، دلآسائی ہے۔ ہیجان نہیں ہے ضبط ہے اور طنز نگار کی حیثیت سے انھیں عبدالماجد اور ظفر علی خاں پر ترجیح حاصل ہے۔ "نقش فرنگ" میں طنز کا موضوع وہی مغرب کی سیاست اور مشرق کا اخلاق ہے۔ سیاست کی ریاکاری اور اخلاق کی زبوں کاری ہے لیکن "لیلیٰ کے خطوط" میں وہ سجاد انصاری اور مہدی الافادی کے ہم جلیس ہو جاتے ہیں اور ان چیدہ شعورا اور چھپتے ہوئے اسلوب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا طنز آفاقی ہے۔ وہ بھی حسن پرست ہیں، نفاست پسند ہیں، عقیدہ، زہد، علم اور دولت کی امارت کے خلاف ہیں۔ مشرقیت اور مغربیت کا خوشگوار امتزاج چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی طوائف کی تصویر کھینچی ہے جو ماں، بہن اور بیوی بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے وہ ہمیں "یاما دی پٹ" (YAMA THE PITT) کی جینی (JENNY) سے خیال کے لحاظ سے بلند اور کردار کے لحاظ سے کچھ پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں محدود معاشرتی اور اقتصادی حد نظر نہیں ہے اور اس لیے قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی اور عبدالماجد سے برتر ہیں۔ یوں ان سب حضرات کے طنز کا نشانہ انگریز، مغربیت، مغربی سیاست اور وہ یگانے ہیں جو بیگانوں سے بدتر ہیں۔

میر محفوظ علی کا طنز مویدانہ ہے اور مقصد بھی وہی ہے۔ ان کے یہاں زاویۂ نظر محدود، واقفیت سطحی اور جذبات کا تنوع مفقود ہے۔ "شیخ سعادت اللہ کی صاحبزادیاں" کامیاب نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں اس ویرانہ میں جو ثقیل الفاظ اور غیر ضروری اظہار علمیت کے بگولوں کی زمین ہے شگفتہ طنز نظر آ جاتا ہے۔

ظفر علی خاں، صحافی ہیں۔ ان میں وہ ہمدردی نہیں جو وسعت علم سے پیدا ہوتی ہے۔ مغرب کی سیاست پر انھوں نے چند کامیاب طنزیہ عبارتیں لکھی ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کے طنز میں خشونت بھی ہے اور گرمی بھی خشونت تیور میں پائی جاتی ہے اور گرمی تہہ میں۔ ان کا طنز انتہائی سطحی، انتہائی محدود اور انتہائی بے جان ہوتا ہے۔ ان کے طنز کے بارے میں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی تینت تکبیر ہے۔ دیکھیے میں نے نیت شب تکبیر نہیں کہا ہے، ممکن ہے آپ غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

ابوالکلام آزاد کی معلومات میں شبہ نہیں، شخصیت کی عظمت میں شبہ نہیں، ان کی زبان میں کلام نہیں۔ ان کی زبان عہد نامۂ عتیق کی زبان ہے، ان کا طنز بھی عہد نامۂ عتیق کا طنز ہے جس میں ہیجان، خطابت اور ظاہری شان و شوکت سبھی کچھ ہے۔ وہ اعصاب پر مسلط ہو جاتے ہیں، مرعوب کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں تیزی بھی ہے اور تلخی بھی۔ ان میں آفاقیت بھی ہے اس لیے وہ اپنے

مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ علی گڑھ، شملہ کانفرنس اور اس قسم کی دوسری تحریریں زبان و بیان کی چٹانیں ہیں جن میں طنز کا لہو گردش کر رہا ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر ہم ان ظرافت نگاروں کے قبیلے پر ایک نظر ڈال سکتے ہیں جو ہم سے قریب ہیں اور جن میں سے بعض نے صحیح معنی میں اُردو کو ظرافت، ظرافت کو ادبی رنگ اور ادبی رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں غلط بحث نہ ہو جائے اس لیے ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی پر ایک نظر ڈالتے چلیے اور فرحت اللہ، رشید صدیقی اور پطرس کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ دیجیے۔

• ملا رموزی خیالات کے لحاظ سے قدامت پرست اور زبان کی لحاظ سے ازل پرست ہیں۔ گلابی اُردو لکھتے ہیں لیکن لکھنے میں روانی اور اسلوب میں جان ہوتی ہے۔ کچھ مضامین گلابی اردو سے بچ کر بھی لکھے ہیں۔ وہ بیشتر زبان سے، کنز واقعہ سے اور رشتہ و نادر خیال سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کا موضوع وہی پامال مشرقیت ہے جنھیں ان کی نظر میں مذہب کا درجہ حاصل ہے۔ مغربیت کی سطح پر نظر ڈالتے ہیں اور کائنات کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ الفاظ بنانے اور ترکیبیں وضع کرنے پر کافی توجہ صرف کرتے ہیں مگر بیشتر ایجاد بندہ کی مثل صادق آتی ہے۔ ان میں فنی ضبط کی شدید کمی ہے ورنہ بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی ظرافت ادب میں اچھی جگہ پاتی۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "زندگی" ہے جس میں بیوی، مشاعرہ، ریل کا سفر اور کئی مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بعض اچھے ہیں۔ ان کا طنز ضرورت سے زیادہ واضح اور ان کی ظرافت زبان کی بدولت فطری ہونے کے باوجود مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کھلنڈرے ہیں۔ انھیں ہر بات میں ہنسی کا پہلو اور ہر واقعہ میں مضحک بات نظر آجاتی ہے خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خیال کی آفت سے بری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذہنی کاوشوں کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھتے۔ واقعہ میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو اناطول فرانس کے لیے مذہب میں اور مولوی کے لیے شیطان میں ہے۔ ہلکی پھلکی چیزیں لکھتے ہیں۔ لیکن ان میں جوانوں کی زندگی اور زندگی کی جوانی کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ کولتار، چمکی، فل بوٹ، کھرپا بہادر اور اس قسم کی دوسری کتابیں اور مضامین ان بالغوں کے لیے لکھے ہیں جو بلوغت کی حسرت میں مر گئے یا پھر ان لوگوں کے لیے جنھیں پیر نابالغ کہتے ہیں۔ بہر صورت ریل کے سفر میں وقت گزارنے کے لیے اچھے ہیں۔

شوکت تھانوی نام سے پیرزادے، صورت سے نوجوان اور تحریر سے کبھی کبھی افتاں و خیزاں اور کہیں کہیں بدھو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان کا مزا بھی ہے، واقعہ کا بھی اور خیال کا بھی۔ ان میں برتری کا وہ احساس بھی نہیں جو ملا رموزی کی دنیا اور آخرت ہے۔ نہ وہ اصلاحی جذبہ ہے جو پڑھنے والے کو دنیا اور آخرت دونوں سے بیزار کر دیتا ہے، نہ خیال کی وہ پیچیدگی ہے جو رشید صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ روزانہ کے معاملات، اشخاص کے کردار اور واقعات کے توڑ کے انتخاب سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ طنز پیدا کرتے ہیں جس میں ظرافت ہوتی ہے اور وہ ظرافت جو محض دل بہلانے کے لیے ہوتی ہے۔ "بڑے بھلے" اور "شیش محل" ان کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

فرحت اللہ بیگ ماضی کو حال میں تبدیل کر سکتے ہیں، حال میں مستقبل کا جلوہ دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں، وہ

حقیقت کے دلدادہ ہیں۔ وہ اشخاص سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن ہمدردی میں شگفتہ تنقید کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان کی زبان ظرافت کی جان ہے۔ فرحت اللہ محاوروں سے وہی کام لیتے ہیں جو رشید صدیقی قولِ محال (PARADOX) سے لیتے ہیں۔ ان کی مرقع نگاری اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ "نذیر احمد کی کہانی" "پھول والوں کی سیر" "آخری وصیت" ان کے نمایاں کارنامے ہیں۔

پطرس روزمرہ زندگی کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں، وہ تماشا دیکھتے ہیں خود کبھی تماشہ نہیں بنتے۔ ان کے یہاں ذہنی کش مکش کا عنصر بہت کم ہے لیکن ان کی ظرافت میں خوشگوار طنز اور ان کے طنز میں گہری انسانیت ہے۔ انھوں نے استاد، طالب علم، دوست، بیوی، سیاست اور شہریت پر انتہائی لطیف انداز میں تنقید کی ہے جو عام انسانی تجربوں پر مبنی ہے اور اس کے باوجود خاصہ کی چیز ہے۔ ان کی سادگی میں کبھی کبھی سعدی کی گلستاں کا مزا آجاتا ہے۔

"کتے" "سائیکل" "استاد" اور "لاہور کا جغرافیہ" ان کے اچھے مضامین ہیں۔ لیکن ہر مضمون واقعیت، حسنِ تعبیر اور صحیح ظرافت کی بدولت ہزار ظریفانہ مضامین کا حریف ہے۔ غالب کے بعد زیرِ لب تبسم کی شانِ محبوبی پطرس کا حصہ ہے۔

رشید احمد صدیقی کے فن اور ان کے خیال میں پیچیدگی ہے۔ لیکن ان کا مطالعہ غیر ضروری نہیں۔ ان کے طنز میں پہلی نظر میں ظرافت کا، دوسری میں بلاغت کا اور تیسری میں انفرادی اور اجتماعی شامت کا احساس ہوتا ہے اور بعد میں یہ تینوں مل کر آسیب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

رشید صاحب میں "سوئفٹ کی تیزی، اناطول فرانس کا کنایہ اور ڈکنس کی خوش طبعی" نہیں ہے۔ البتہ قولِ محال کی برجستگی ان کا حصہ ہے، بات میں سے بات نکالنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ ہارنے کے باوجود زندگی گزارنا اور خوش دلی سے زندگی پر فتح پانا، رشید صاحب کے بہترین مضامین کی بہترین قدریں ہیں۔ وہ ہر اس چیز پر طنز کرتے ہیں جو فرد کی آزادی، سکون اور آسودگی کو تباہ کرتی ہیں۔ وہ پولیس ہو یا گواہ، ڈپٹی کلکٹر ہو یا مزدور، مولوی ہو یا سیاست داں، ایڈیٹر ہو یا استاد، فن کار ہو یا روشن خیال بیوی، شاعری ہو یا عدم تعاون اپنی کمزوری ہو یا دوسروں کی حماقت۔ ان کی بہترین کتابیں "مضامینِ رشید" اور "گنجہائے گرانمایہ" ہیں۔

رشید صاحب کا صرف ایک جملہ یاد رکھیے:

"اس زمانے میں لوگ اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی بیویوں کو آرٹ سمجھتے ہیں۔"

اس ایک جملہ میں ان کی شخصیت، بصیرت اور فن سب کچھ ہے۔

چچا چھکن امتیاز علی تاج کے قلم کا رہینِ منت ہے یہ K. JEROME کی مخلوق کا چربہ ہے۔ یہ مضامین گاہے گاہے شائع ہوئے ان کا مکمل مجموعہ ابھی تک پردۂ غیب میں ہے۔ یہ مرقعے ہلکی پھلکی، رواں اور شگفتہ زبان میں لکھے گئے ہیں اور بقول سرور صاحب اگرچہ دوسروں نے بھی اور یہاں دوسروں سے مراد اغیار نہیں ہیں، اس کردار کے خاکے اڑائے مگر مولوی مدن والی بات کسی کو نصیب نہ ہوئی۔

تاج کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کردار کو ہندوستانی فضا، ہندوستانی لباس اور ہندوستانی مزاج میں ڈھال دیا ہے۔ چربہ اتارنے کا فن محمد حسین کے بعد اگر کسی کے حصے میں آیا ہے تو وہ امتیاز علی تاج ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اظہارِ کمال کے لیے نئی وادیاں تلاش نہیں کیں۔

بہر حال ہمارے طنز و ظرافت پچھلے اسّی برس میں نشوونما کی بہت سی منزلوں سے گزر رہے۔ چند لکھنے والوں نے ان میں اپنے ماحول کی بیدار، بے باک اور بے لوث ترجمانی کی۔ رتن ناتھ سرشار کے زمانے میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اکبر نے اسے فنی نقطۂ نظر سے معراجِ کمال کو پہنچایا۔ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا — فرحت اللہ نے اسے پیار کیا، پطرس اور رشید احمد صدیقی نے اسے خوش سلیقگی سے برتا۔

لیکن ابھی تک ایک مربوط اور عظیم کارنامے کی کمی ہے۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی خواہش ہو جو مولانائے روم کو تھی ؎

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مزاح اور مزاح نگاری

وزیر آغا

سنجیدگی کائنات کی ازلی و ابدی خصوصیت ہے اور اس کے تمام اجزا میں ایک برقی رَو کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ نتیجتہً کائنات کا ہر واقعہ کسی مجبور ستارے کی اٹھان سے لے کر مکڑی کے جالے کی تعمیر تک اور زندگی کی ہر روِ جنسی کشش کی پُراسرار تپش سے لے کر بیج کی حرارتِ پنہاں تک ایک عجیب سی سنجیدگی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی مجموعی طور پر ایک تیز رَو ہوا کی طرح دشت و جبل اور بحر و بر کو عبور کرتی کسی نامعلوم منزل کی طرف اس والہانہ انداز سے بڑھ رہی ہے کہ ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی سنجیدہ کائنات اور ایسی منہ زور زندگی کے زیرِ سایہ انسان کا سنجیدہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں میں یکسر منہمک ہو جانا ایک بالکل فطری امر ہے تاہم یہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ سنجیدہ زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ جزو ہونے کے باعث اس کی انفرادیت کہیں یکسر ختم نہ ہو جائے اور وہ محض ایک مشین کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتا نہ چلا جائے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت بھی بخشی ہے جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی صبر آزما کشمکش پر ہنس سکتا اور یوں مسکرا کر بلکہ قہقہہ لگا کر اپنی اس دیوانہ وار پیش قدمی میں دھیما پن پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

چنانچہ زندگی کی بے رحم سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس مادیت جو قریب قریب ہر شے کو اپنے فولادی بازوؤں میں جکڑے ہوئے ہے! انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر لچکیلی اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ احساسِ مزاح ماں کے اس لطیف و دلنواز تبسم کی طرح ہے جو بچوں کی طفلانہ کاوشوں اور "ٹھوس تعمیری کارناموں" کے پیشِ نظر نمودار ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماں کا تبسم تو بچوں کو مزید انہماک کی ترغیب دیتا ہے لیکن احساسِ مزاح کے طفیل انسان ایک لحظہ رُک کر اپنی سنجیدہ کاوشوں اور جذباتیت سے سینچی ہوئی قدروں پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اسے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ لامحدود و لازوال کائنات میں یہ کاوشیں اور قدریں کتنی معمولی حیثیت کی حامل اور کتنی طفلانہ صورت کی امین ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ کسی نے ہائیڈروجن بم کے بارے میں پروفیسر آئن سٹائن سے اس کے خیالات دریافت کیے تو آئن سٹائن نے مسکرا کر جواب دیا:

"ہائیڈروجن بم سے ہماری زمین کے تباہ ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں اور بالفرض
اگر یہ تباہ ہو بھی گئی تو اس سے اتنی بڑی کائنات میں قطعاً کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

یہ احساسِ مزاح اور اس کے مظہر یعنی تبسم، ہنسی اور قہقہے ہی دراصل ہیں اس سنجیدہ کائنات میں زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور انہی کے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مگر ایک اور طرح بھی یہ احساسِ مزاح انسانی زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا ذمہ دار ہے وہ اس طرح کہ انسان کائنات میں سب سے بڑا خواب پرست ہے اور اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے تانے بانے سے ایک ایسا رنگ محل تیار کرتا رہتا ہے جس کی اساس محض خوابوں پر قائم ہوتی ہے اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو ایک سپاٹ اور ٹھوس حقیقت ضرور ہے چنانچہ جب اس کی امنگوں اور آرزوؤں کے رنگ محل اس کرخت اور خوفناک حقیقت سے زود یا بدیر ٹکراتے ہیں تو وہ کائنات کی سب سے زیادہ بے بس اور رحم زدہ ہستی بن جاتا ہے اور کبھی کبھی خودکشی کے ذریعے اپنی غمگین زندگی کا خاتمہ کرنے پر بھی تل جاتا ہے۔ احساسِ مزاح کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی بے لگام آرزوؤں، منہ زور امنگوں اور پُراسرار خوابوں پر تبسم انداز سے تنقید کرے اور یوں اسے حقائق کی کرخت اور خوفناک صورت دکھا کر اس شدید مایوسی سے بچا لے جو اس کی خوابوں کی منزل پر ہمیشہ سے اس کی منتظر ہے اور جس سے اس کا نکلنا ایک امرِ محال ہے۔ دیکھا جائے تو احساسِ مزاح کا یہ کارنامہ ایک بہت بڑی انسانی خدمت ہے۔

زندگی کی کرخت سنجیدگی سے انسان کو بچانے اور اسے شکستِ خواب سے پیدا ہونے والے ناقابلِ برداشت صدموں کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساسِ مزاح کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ وہ مثل کہ "ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا ——— بیٹھ اکیلے رونا ہوگا" اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مزاح کے طفیل انسان اور انسان کے مابین ایک ناقابلِ شکست رشتہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے کہ ہنسی ایک متعدی بیماری کی طرح پھیلتی ہے اور جہاں چند لوگ ہنس رہے ہوں وہاں راہگیر بے جانے بوجھے بھی ان کی ہنسی میں شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانہ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو مزاحیہ کردار صرف اس لیے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں مثلاً اگر ایسا کردار چچا چھکن کی طرح اپنی اس عینک کی تلاش کرے جو اس نے اپنی ناک پر لگا رکھی ہو تو خواہ مخواہ اس پر ہنسنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ قدیم قبائل میں اجنبیوں کے لباس، گفتار اور عادات و اطوار کو نشانہ تمسخر بنانے کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں وہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔ دراصل ہنسی اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کے لیے تو باعثِ انبساط ہوتی ہے لیکن اس فرد کو رنج و ندامت سے ضرور ہم کنار کر دیتی ہے جس کے خلاف یہ عمل ہی آئے بہرحال یہ بات طے ہے کہ ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض غیر شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلے سے علیحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے ——— یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے۔*

(Henry Bergson — "Laughter P. 177.) ہنری برگسان۔ لافٹر صفحہ ۱۷۷۔

اس کے ضابطۂ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی ان تمام بیرونی لیکن سطحی ارتعاشات سے محفوظ رہتی ہے جن کو یہ نشانۂ تمسخر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی ان تمام اندرونی نقائص کے استیصال کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے ہاں مزاح کا جو افادی پہلو بڑے نمایاں انداز میں کارفرما نظر آتا ہے وہ ہنسی کے اسی اصلاحی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کائنات پر سنجیدگی مسلط ہے اور یہاں ہر فرد روحِ سنجیدہ زندگی کے بڑا سرار اشاروں پر گرمِ عمل ہے۔ انسان کی امتیازی خصوصیت البتہ یہ ہے کہ وہ اس سنجیدگی کو چند لمحات کے لیے ہی سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینکتا ہے اور ہنسی جیسے خالص حیاتیاتی تعیش (Biological Luxury) سے زندگی کے کھردرے کناروں کو ہموار کر لیتا ہے مگر ہنسی سے جو مسرت اسے حاصل ہوتی ہے وہ آرٹ اور فلسفے سے حاصل شدہ مسرت سے اس حد تک مختلف ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ عضویاتی مظاہر بھی شریکِ کار ہوتے ہیں۔ آرتھر کوئسلر کے الفاظ ہیں:

"خیالات و احساسات ایک خوبصورت تصویر کو دیکھ کر یا ایک اعلیٰ نظم پڑھ کر ہمارے دلوں میں ضرور متحرک ہوتے ہیں لیکن ایسا خاص عضویاتی مظاہرہ پیدا نہیں ہوتا جو ہنسی کے وقت معرضِ وجود میں آتا ہے اور یہ چیز محض ہنسی سے مخصوص ہے کہ انسان ایک لطیفے کو سن یا پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کا اتنے نمایاں انداز میں اظہار کرتا ہے۔"[1]

ہنسی کے اس عضویاتی مظاہرہ کی تشریح کرتے ہوئے چارلس ڈارون رقم طراز ہے:

"ہنسی کے دوران میں منہ کھل جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے پیچھے اور اوپر کی طرف ہٹ آتے ہیں اسی طرح اوپر والا ہونٹ قدرے اوپر کو اٹھ جاتا ہے اور شدید ہنسی کے دوران میں تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے، سانس میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے اور آنسو بہہ نکلتے ہیں۔"[2]

اسی طرح پروفیسر سلی نے اپنی کتاب "انجوائمنٹ آف لافٹر" میں ہنسی کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور خفیف تبسم، مسکراہٹ اور قہقہے کا ایک ہی کیفیت کے تین مختلف مدارج قرار دیا ہے لیکن اس سلسلے میں جی وائی۔ ٹی گریگ نے جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ گریگ لکھتا ہے:[3]

"دروازہ پر سے چھلانگ لگانے یا بندوق کی لبلبی دبانے سے ذرا قبل آپ ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے سینے میں روک کے رکھتے ہیں ہنسی کے وقت

---

[1] Arthur Koestler—Insight & Outlook, P. 3 & 4.

[2] Charles Darwin—Expression of Emotions, P. 208, 214.

[3] J.Y.T. Greig—The Psychology of Laughter & Comedy, P. 214

بھی آپ اسی طرح ایک لمبا سانس لیتے ہیں مگر اسے روکنے کی بجائے آواز کے چھوٹے
چھوٹے تیز دھماکوں کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔"

ہنسی کے اس عضویاتی مظاہرے کے پس پشت ان تحریکات کا مطالعہ بھی از بس ضروری ہے جن سے احساسِ مزاح کو تحریک ملتی ہے اور ہنسی کا سیلاب پھوٹ بہتا ہے چنانچہ یہ سوال کہ ہنسی کیوں پیدا ہوتی ہے ایک خاصا اہم سوال ہے اور ازمنۂ قدیم سے مفکرین کے لیے بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا ہے۔ گریگ نے مزاح پر اپنی مشہور کتاب میں تین سو سے زیادہ (۳۶۳) ایسی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن میں اس موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے مگر اس سب کے باوصف یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابھی تک ہنسی کے مسئلے کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اگر ہنسی کے موضوع پر پیش کردہ اہم نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تو اس سے مسئلہ زیر بحث کا ایک سرسری جائزہ لینے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل انسانی فکر کی تاریخ میں مزاح کے مسئلے پر دو نہایت دلچسپ نظریے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ تو یونان کے مفکر اعظم ارسطو اور سترھویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابز کا ہے اور دوسرا نظریہ جرمن فلاسفر امانوئیل کانٹ کا جسے بعد ازاں شوپنہار نے اپنے نظریے میں سمویا ہے۔ پہلے نظریے کے خالق ارسطو نے ہنسی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہنسی کسی کجی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو۔ اسی طرح سترھویں صدی عیسوی میں ہابز نے یہ نظریہ پیش کیا کہ:

> "ہنسی کچھ نہیں سوائے اس جذبۂ افتخار یا احساسِ برتری کے جو دوسروں کی کمزوریوں یا
> اپنی گزشتہ خامیوں سے تقابل کے باعث معرضِ وجود میں آتا ہے۔"[1]

بنیادی طور پر ارسطو کے نظریہ کجی اور ہابز کے نظریہ برتری میں بہت کم فرق ہے کیونکہ ہنسی چاہے دوسروں کی بدصورتی یا کمزوری سے تحریک پائے یا اس بدصورتی اور کمزوری کے طفیل ایک احساسِ برتری کی صورت میں وارد ہو، بہر حال وہ دوسروں کی خامیوں ہی سے تحریک پائے گی۔ ہابز کا نظریہ دراصل ایک اخلاقی نظریہ تھا جس کا سہارا لے کر اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر وہ ہنسی غیر اخلاقی ہے جو دوسروں کی توہین کرے اور جس میں تحقیر کا عنصر موجود ہو۔ یہاں اگر ہابز کے نظریے پر تنقید کریں اور کہیں کہ گدگدی سے پیدا ہونے والی ہنسی یا بچوں کے معصومانہ قہقہوں میں جذبۂ افتخار کہاں؟ تو بحث طول پکڑ جائے گی۔ یہاں محض اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہابز کا نظریہ اس زمانے کے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے جب اچھی سوسائٹی میں بلند آواز سے ہنسنا ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ہنسی کے متعلق دوسرا نظریہ ایمونیل کانٹ کا ہے جس کے مطابق ہنسی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک بلبلے کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں۔ کانٹ کے اس نظریہ کی توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہماری توقعات ایک غبارے کے اندر ہوا کی مانند لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہوتی ہیں اور ہم کسی خاص نتیجے پر بڑی بے تابی سے پہنچ رہے ہوتے ہیں کہ اچانک غبارے میں ایک سوراخ پیدا ہو جاتا ہے اور ہماری توقعات کا سارا دباؤ غبارے کو پھیلانے

---

[1] Hobbes—Human Nature in Works (Molesworth 1840) Vol. IV, P. 46

کی بجائے اس سوراخ کے راستے پھوٹ نکلتا ہے ۔۔۔۔ یہ پھوٹ نکلنا ہی ہنسی کہلاتا ہے۔

قریب قریب اسی نظریے کا دوسرا علمبردار شوپنہاور ہے جس کے مطابق ہنسی تخیل اور حقیقت کے مابین ناہمواری کے وجود کو اچانک محسوس کر لینے سے جنم لیتی ہے[۱]۔ اس کی دانست میں جتنی خلاف توقع یہ ناہمواری ہوگی اتنی ہی شدید طور پر ہنسی بھی نمودار ہوگی۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میکس ایسٹ مین نے ارسطو اور کانٹ کے ان بظاہر متضاد نظریات کی ایک بڑے اچھوتے انداز سے توضیح کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ ہنسی کو سمجھنے میں ہمارے معاون ہیں۔ ایسٹ مین نے لکھا تھا کہ بچے کو ہنسانے کے دو آسان طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ آپ ہنسیں اور جب بچہ آپ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اپنے چہرے کے خطوط کو یوں سکیڑیں کی آپ کی صورت خوفناک دکھائی دے اس پر بچہ ہنس دے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز پکڑ کر بچے کے قریب لے جائیں جسے وہ پسند کرتا ہو اور جب بچہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے لگے تو مسکرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ بچہ اسے زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دے گا۔

ایسٹ مین کی رائے میں بچے کو محظوظ کرنے کے یہ دونوں طریقے ارسطو اور کانٹ کے نظریات سے شدید مماثلت رکھتے ہیں چنانچہ ارسطو کا نظریہ کہ ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصورتی سے نمودار ہوتی ہے جو درد انگیز نہ ہو اس چہرے کی طرح ہے جس کے خطوط کو سکڑا کر خوفناک بنا لیا جائے اور کانٹ کا نظریہ کہ ہنسی توقع کے پیدا ہونے اور پھر اچانک ختم ہو جانے سے نمودار ہوتی ہے اس ہاتھ کی طرح ہے جو کسی شے کو اٹھانے کے لیے بڑھے اور پھر دیکھے کہ وہ شے وہاں نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو سرکس کا مسخرہ بھی ان دونوں طریقوں ہی سے تماشائیوں کو ہنسانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ پہلے تو اپنے چہرے پر سفید اور سرخ رنگ مل کر اور ایک بیہودہ سا لباس پہن کر آتا ہے اور پھر جب کوئی شہ زور کسی وزنی شے کو اٹھانے کا مظاہرہ کر چکتا ہے تو یہ مسخرہ بڑے اہتمام سے اسی شے کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور پھر اچانک اسے ہاتھ لگا کر پیچھے ہٹ آتا ہے اور لوگ مارے ہنسی کے بے حال ہو جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل مزاح کے مسئلے پر جن اور مفکرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer)، جوزف ایڈیسن (Joseph Addison)، الیگزنڈر بین (Alexander Bain) اور پروفیسر لپس (Lipps) کے نام خاصے اہم ہیں لیکن دراصل اس طویل دور میں مذکورہ بالا دو نظریے ہی ایسے تھے جو دو مختلف اسالیب فکر کے طور پر قائم ہوئے اور مفکرین کے مابین بحث و تمحیص کا موجب بنے۔

بحث و تمحیص کا یہ سلسلہ نہ جانے کتنا عرصہ جاری رہتا کہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی پروفیسر سلی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف An Essay on Laughter میں نہ صرف ان دونوں نظریوں کو یکجا کر دیا بلکہ چند نئے قابل قدر نکات بھی پیش کیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مذکور نے ہنسی کی وجوہ میں گدگدی، انتہائی مسرت اور عملی مذاق وغیرہ کو خاصی اہمیت دی اور قابل تمسخر اشیاء اور واقعات میں

---

۱ Kant—Critique of Judgment, 2nd ED. 1914. P. 223.

Schopenhauer—The World as Will & Idea, P. 130.

Eastman—Enjoyment of Laughter, P. 25

اخلاقی عیوب، اکھڑپن، جسمانی نقائص، بے قاعدگی، پھبتی اور بے حیائی وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا۔ مجموعی طور پر پروفیسر سلی نے ہنسی اور کھیل میں قرابت پر خاصا زور دیا اور ہنسی کے اجزا میں بچے کی سی مسرت آمیز حیرت اور کھیل کی طرف نمایاں رجحان کو مقدم جانا۔

ہنسی کے محرکات کے ضمن میں پروفیسر مذکور نے لکھا کہ ہنسی مسرت کے اس اچانک سیلاب سے معرض وجود میں آتی ہے جو کسی بیرونی دباؤ کے ہٹ جانے یا کسی غیر متوقع شے کی اچانک آمد سے پیدا ہوتا ہے اور جو ہمیں یکایک زندگی کے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو پروفیسر سلی نے یہ لکھ کر بیسویں صدی سے پہلے کے نظریات کو انتہائی خوبی سے مربوط کیا اور اپنے اعلیٰ تجزیاتی مطالعے سے ہنسی کے سلسلے میں نہایت قیمتی اضافے کیے۔

لیکن شاید یہ زمانہ مزاح پر نت نئی تحقیقات کا زمانہ تھا کیونکہ پروفیسر سلی کی معرکۃ الآرا کتاب کے فوراً بعد مزاح پر دو نہایت گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ان کی بدولت مزاح کے مسئلے پر اس قدر روشنی پڑی جو اس سے قبل کئی صدیوں کی تحقیقات سے بھی نہیں پڑی تھی۔ یہ کتابیں تھیں ——— ہنری برگساں کی کتاب "ہنسی" (Laughter) اور سگمنڈ فرائڈ کی کتاب
Wit & Its Relation to The Unconscious

برگساں نے لکھا کہ زندگی لچک اور تحرک سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسے صبا رفتار گھوڑے کی مانند ہے جو افق کی تلاش میں سرگرداں کسی مقام پر ٹھہرے بغیر بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ برگساں کے مطابق زندگی کسی مقام پر ٹھہرنا یا پلٹ کر دیکھنا یا مکررانداز میں کسی شے کو پیش کرنا جانتی ہی نہیں لیکن یہی زندگی جس کی خصوصیت تحرک اور لچک ہے جب کسی مقام پر ٹھہراؤ، جمود اور میکانکی عمل کا نقشہ دکھاتی ہے تو بے اختیار ہماری ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سرکس کا مسخرہ جو بحیثیت انسان زندگی کا مظہر ہے جب کسی جامد شے کا تصور پیش کرتا ہے اور کسی فرضی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھڑام سے فرش پر گر پڑتا ہے تو ہم بے اختیار ہنس دیتے ہیں ——— برگساں کے الفاظ میں "ہر بار جب کوئی شخص کسی جامد شے کی طرح خود کو پیش کرے وہ مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتا ہے۔"

ہنری برگساں نے ہنسی کو خالص ذہنی عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جذبات مثلاً رحم کے جذبات کی ہلکی سی رو بھی اسے ختم کر دیتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ ہم کبھی اشیاء پر نہیں ہنستے۔ حیوانوں پر صرف اس وقت ہنستے ہیں جب ان کی حرکات بعض انسانی حرکات سے مشابہت پیدا کر لیتی ہیں اور انسانوں پر ہم اس وقت ہنستے ہیں جب وہ اشیاء کے مانند خود کو پیش کرتے ہیں یعنی جب ان کی لچک میکانکی عمل میں مبتدل ہو جاتی ہے۔

برگساں کی رائے میں ہنسی نہ صرف سوسائٹی کے ہر اس عمل کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے جو میکانکی صورت اختیار کرنے اور جمود کو مسلط ہو جانے میں مدد بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس کا کام فراریت کے ان تمام رجحانات کا قلع قمع کرنا بھی ہے جن کے زیر اثر فرد سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے بھٹکتا نظر آتا ہے دوسرے لفظوں میں، ہنسی فرد کو دوبارہ "کل" میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

اسی زمانے میں مزاح کے مسئلے پر قلم اٹھانے والا دوسرا شخص مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ تھا جس نے وٹ (WIT) کو اس لیے تجزیاتی مطالعے کے لیے منتخب کیا کہ اس کے باعث اس کے نظریۂ لاشعور پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ضمناً اس عظیم مفکر نے مزاح کے مسئلے پر بھی گہری نظر ڈالی اور ایک ایسا نظریہ پیش کر دیا جس کی بنیادوں پر آج بھی افکار کے نئے نئے محل استوار کیے جا رہے ہیں۔

فرائڈ نے مزاح کی چار صورتیں پیش کیں۔ بے ضرر لطایف، افادی لطایف، مضحک اور خالص مزاح۔ بے ضرر لطایف کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ الفاظ یا افکار کی جادوگری سے سامانِ انبساط بہم پہنچائیں۔ دوسری طرف افادی لطایف وہ ہیں جو طریق کار تو وہی اختیار کرتے ہیں جو بے ضرر لطایف کا ہے لیکن جو ساتھ ہی ساتھ کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بھی تسکین کرتے ہیں نتیجتاً یہ لطایف کسی نہ کسی کے خلاف ضرور صف آرا ہوتے ہیں۔

فرائڈ کے مطابق بے ضرر لطایف سے حصولِ مسرت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں کھو کر انسان واپس اپنے بچپن کے ماحول میں پہنچ جاتا ہے اور وہی طریقِ فکر و استدلال اختیار کرتا ہے۔ یوں عام زندگی بسر کرنے کے لیے جو ضروری قوت درکار ہوتی ہے اس میں ایک بچت (Economy) پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

اس کے برعکس افادی لطایف ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کو آزاد کرتے ہیں جو عام زندگی میں ماحول اور سوسائٹی سے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ خواہشات افادی لطایف کا خوش نما لباس زیبِ تن کیے اور پولیس سنسر کے پہرہ والوں کو دھوکا دے کر اپنے قید خانہ میں سے اس دیدہ دلیری کے ساتھ باہر نکل آتی ہیں کہ باہر کی پبلک کو بھی ان کے قیدی ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ لطایف کے ذریعے ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کی تسکین اس دبا دینے والی قوت (Repressive Energy) میں بچت پیدا کرتی ہے جو ان خواہشات کی عدمِ تسکین کی صورت میں انتہائی ضروری تھی اور یہی بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

مزاح کی تیسری صورت مضحک سے متعلق ہے۔ مضحک سے حصولِ مسرت کے متعلق فرائڈ نے لکھا ہے کہ یہاں مسرت قوتِ تخیل (Imaginative Energy) میں بچت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ مضحک تحریک ہمیں یقین دلاتی ہے کہ ایک خاص کام کی تکمیل کے لیے ہمیں اس قدر قوت کی ضرورت ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کام تو اس سے بہت کم قوت کے صرف سے بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فاضل قوت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" اس کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں فرائڈ نے خالص مزاح کا ذکر کیا ہے اور اس سے حصولِ مسرت کو قوتِ جذبات (Emotional Energy) میں بچت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر الف ایک مصیبت میں گرفتار ہے اور ب کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن الف کی کسی بات سے ب کو محسوس ہوتا ہے کہ الف اپنی مصیبت کا مذاق اڑا رہا ہے تو ب بھی الف کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ یوں ب کی جمع شدہ ہمدردی میں ایک بچت پیدا ہوتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

اوپر ہنسی کے بارے میں فرائڈ کے نظریات کو نسبتاً تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ اگرچہ اس نصف صدی میں ہنسی کے بارے میں کئی نئے نظریات پیش ہوئے ہیں تاہم دراصل اس ضمن میں فرائڈ کے نظریات ہی نے اکثر و بیشتر بنیاد کا کام دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ فرائڈ کے بعد آج تک مزاح کے مسئلے پر جو تین نہایت قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئیں (ہماری مراد گریگ[1] ایسٹ مین[2] اور آرتھر کوئسلر[3]

---

[1] I.Y.T. Greig --The Psychology of Laughter & Comedy

[2] Max Eastman—Enjoyment of Laughter

[3] Arthur Koestler—Insight & Outlook

کی کتابوں سے ہے، ان میں سے کم از کم دو یعنی گریگ اور کوئسلر کی کتابوں میں فرائڈ کے نظریات ہی نے بنیادی کام سر انجام دیا ہے۔
گریگ نے جہاں فرائڈ کے بنیادی نظریوں سے اتفاق کیا وہاں اس نے مزاح کے پس پشت فرائڈ کی پیش کردہ جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بجائے محبت یا نفرت کے جذبات کو نمایاں جگہ دی اور کہا کہ چونکہ عام زندگی میں ہم ان رجحانات کی کھلے بندوں تسکین نہیں کر سکتے لہٰذا یہ مزاح کے ذریعے اس انداز سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ سوسائٹی کی اقدار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا مجموعی طور پر گریگ نے فرائڈ کے نظریے میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

البتہ ایسٹ مین نے اس مسئلے کو ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھا اور مزاح کو ایک قطعاً علیحدہ انسانی جبلت (Instinct) قرار دے دیا۔ اس نے لکھا کہ مزاح کھیل کی جبلت (Play Instinct) ہے اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمے یا مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔

اس سلسلے میں ایسٹ مین نے مزاح کے مندرجہ ذیل چار اصول پیش کیے ہیں[1]:

الف: اشیاء صرف اس وقت مزاحیہ رنگ اختیار کرتی ہیں جب ہم خود مزاح کے موڈ میں ہوں۔ اگر ہم بہت سنجیدہ ہوئے تو مزاح کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔

ب: جب ہم مزاح کے موڈ میں ہوتے ہیں تو خوشگوار چیزوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

ج: ہنسی کھیل کا رجحان بچپن کا امتیازی نشان ہے اور بچوں کی ہنسی مزاح کو اس کے سادہ ترین انداز میں پیش کرتی ہے۔

د: بالغوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے لہٰذا وہ ناخوشگوار اشیاء کو مزاحیہ رنگ میں دیکھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

فرائڈ کے بعد مزاح کے مسئلے پر گریگ اور ایسٹ مین کے علاوہ جس تیسرے مصنف نے طبع آزمائی کی اس کا نام آرتھر کوئسلر ہے۔ ضمناً یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آرتھر کوئسلر کے نظریات مزاح پر جدید ترین تحقیقات کا حکم رکھتے ہیں۔

آرتھر کوئسلر کے نظریات کے مطابق[2] انسانی زندگی پر دو رجحانات مسلط ہیں۔ تشدد اور مدافعت کا رجحان جسے اس نے Self Assertive کا نام دیا ہے۔ پھیلاؤ اور آفاقیت کا رجحان جسے اس نے Self—Transcending سے معنون کیا ہے۔ تشدد اور مدافعت کے رجحان کے زیر سایہ انسان برتری، جنسی تشدد اور خود غرضی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور آفاقیت کے رجحان کے تحت ہمدردی، محبت اور بے غرضی کا ——— آرتھر کوئسلر کے مطابق اول الذکر طربیہ اور موخر الذکر المیہ کی تخلیق کا ضامن ہے مگر ان دونوں کی آمد کا راستہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک سا طریق اختیار کرتے ہیں۔

اس طریق کار کو مصنف مذکور نے "عملِ رابطہ" (Bisociation) کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح مزاح کی تخلیق دو مختلف ذہنی منازل کے مابین ایک ربط کی رہین منت ہے اسی طرح آرٹ بھی ایک عملِ رابطہ سے معرض وجود میں

---

[1] Eastman—Enjoyment of Laughter, 1937 ED, P. 19

[2] Arthur Koestler—Insight & Outlook, 1949 ED.

[illegible] استعارہ یا آرٹ کی ہوا ہے جو محض دو اشیا کے مابین ایک ایسے ربط کا نام ہے جو اس [illegible] یہ ربط مزاح اور لطیفے کی بنیاد ہے جس کی مدد سے ہمارا تخیل (جو بالعموم جذبات سے ہم آہنگ رہتا ہے) ایک [illegible] سے الگ ہو جاتا ہے اور جذبات کے مد و جزر کو ایک تماشائی کی طرح دیکھنے لگتا ہے ——— یہی ہماری ہنسی کی [illegible] ہے۔

سطور بالا میں ہم نے ہنسی کے مسئلے پر مفکرین کے خیالات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ہنسی کا یہ مسئلہ بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ دورِ جدید میں اس کی وسعتوں کو سمیٹنے کے لیے اہلِ فکر کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اس ضمن میں پروفیسر سلی، فرائڈ، ایسٹ مین اور آرتھر کوئسلر کے نظریات خاص طور پر ہنسی کے مسئلے کے بیشتر پہلوؤں اور زاویوں کو زیرِ بحث لانے میں کامیاب ہوئے اور ہمیں محسوس ہوا کہ وہ مسئلہ جس کی طرف قدیم مفکرین نے محض چند جملوں میں اشارہ کیا تھا آج ایک باقاعدہ مطالعے کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے چھپے ہوئے پہلو یقینی طور پر ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔

مگر جہاں مزاح کے پس پشت مختلف تحریکات کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں ضروری ہے کہ مزاح کے تدریجی ارتقاء کو بھی زیرِ بحث لایا جائے تاکہ مزاح کی ارتقائی کیفیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

مزاح کے تدریجی ارتقاء کو اس طوفانی ندی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو پتھروں اور چٹانوں سے سر پٹکتی شور مچاتی اور جھاگ اڑاتی آخر کار ایک وسیع کشادہ اور پرسکون دریا کی صورت اختیار کر لے اور پھر وسیع و بے پایاں سمندر میں مل کر ابدیت سے ہم کنار ہو جائے لیکن چونکہ اس کی کشادگی اور وسعت کا صحیح اندازہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اس کے طوفانی آغاز کا جائزہ لیا جائے لہٰذا ہم مزاح کو اس کے اوّلین ماحول، اس کی جنم بھومی میں دیکھنے پر مجبور ہیں۔

غور کریں تو بچے یا وحشی کے پاس بلند بانگ قہقہوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن اس کے مزاح میں وسعت اور گہرائی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کا مزاح محض اس طوفانی ندی کی طرح ہے جو معمولی پتھر سے بھی ٹکرائے تو شور مچاتی ہے۔ چنانچہ وہ ایسی باتوں پر بے اختیار قہقہے لگاتا ہے جو بالغ نظر انسانوں کے ذوقِ مزاح سے کافی پست ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وحشی انسان کا وہ اوّلین قہقہہ جو اس نے دشمن کی کھال ادھیڑتے وقت لگایا تھا آج کی مہذب دنیا میں قطعاً ناقابلِ قبول ہے لیکن چونکہ ساری تاریخ انسان کی مختصر سی زندگی میں خود کو کلیۃً دہرا دیتی ہے لہٰذا وحشی انسان کے ان قہقہوں کی صدائے بازگشت بچوں کے ان قہقہوں میں سنائی دینے کی جو وہ کسی شے کو ٹوٹتے یا گرتے یا بدشکل ہوتے دیکھ کر لگاتے ہیں۔

بہرحال انسانی مزاح کے نشو و نما میں ایک تدریجی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو یوں دیکھیے کہ قہقہے کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب انسان نے حیوان کی میکانکی زندگی سے نجات پائی۔ حیوانی زندگی کا مابہ الامتیاز جبلت اور طبعی رجحان کا تسلط تھا۔ یہاں [illegible] محض جبلت کے سانچے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے [illegible] نے طبعی رجحان سے اپنا دامن چھڑا کر علیحدہ کر لیا اور طبعی رجحان کے میکانکی عمل کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے [illegible]۔ اس عمل سے انسان کو اس حقیقت کا اچانک احساس ہوا کہ اس کی زندگی مہمل اور بے معنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس احساس نے

اس کے قہقہے کو تحریک دی۔

مگر جب کناو "پروکرسپا" "اوڈیسی" انسان کے اس قہقہے میں شدت اور گونج تو بہت تھی لیکن گہرائی اور لطافت کا فقدان تھا اس کا مزاح زیادہ تر عملی مذاق تک محدود تھا یا پھر وہ ان باتوں کو نشانۂ تمسخر بناتا تھا جو اس کے اپنے ماحول سے مختلف تھیں۔ آج بھی اجنبیوں اور خاص طور پر سفید رنگ کے لوگوں کے لباس، چال ڈھال، بول چال اور عادات و اطوار کی نقلیں کرنا وحشی قبیلوں میں بہت عام ہے اور ان پر دل کھول کر قہقہے لگائے جاتے ہیں ـــــ نہ صرف قہقہے بلکہ بعض اوقات تو یہ لوگ مارے ہنسی کے تالیاں بجانا اور پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹخنا بھی شروع کر دیتے ہیں ـــــ دور کیوں جائیے یہاں پنجاب کے دور دراز دیہات میں آج بھی جب کوئی نووارد سر پر سولا ہیٹ رکھے نظر آتا ہے تو دیہاتیوں کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ ضرور کھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔

دراصل وحشی انسان کا ذوقِ مزاح ہمارے ہاں کے اسکول کے بچوں کے ذوقِ مزاح سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ وہی عملی مذاق اور تخریبی انداز لیکن ہمدردی کی افسوسناک کمی دراصل مزاح میں ہمدردانہ پہلو کی نمود بہت بعد کی بات ہے جب کہ وحشی قبیلوں کی تنگ اور گھٹی ہوئی فضا نے ہر لحظہ وسیع ہوتے ہوئے سوشل نظام کے لیے جگہ خالی کر دی۔ چنانچہ سوسائٹی میں طبقاتی حد بندی مزاح کے نشو و ارتقاء کے لیے از بس ضروری ہے اور چونکہ وحشی قبائل میں اس طبقاتی حد بندی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا للذا وہ زیادہ سے زیادہ اجنبیوں ہی کو نشانۂ تمسخر بناتے اور دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔

طبقاتی کشمکش کے علاوہ ہمارے سوشل ارتقاء کی ہر نہج ذہنی وسعت، اخلاقی اقدار، سیاسی اور سماجی آزادی اور دولت کے تصور نے بھی ہمارے ذوقِ مزاح پر بڑے نمایاں اثرات مرتسم کیے ہیں۔ اب ہمارا مزاح یقینی طور پر گروہ کی ہنسی Choral Laughter سے ترقی کر کے فرد کی ہنسی Individual Laughter تک جا پہنچا ہے۔ دراصل سوشل ارتقاء نے کہیں صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد جا کر ایسی فضا پیدا کی ہے جس میں انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لیے ہیں اور فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی اور انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے بلکہ اس کے مزاح میں بھی پہاڑی ندی کی پُرشور راگنی کی بجائے پُرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔

پس آج ہمارا مزاح ان مدارج تک جا پہنچا ہے جہاں سے پلٹ کر ہم اپنی سنجیدہ زندگی پر اس بے نیازی سے نگاہیں دوڑا سکتے ہیں جس طرح کوئی بوڑھا اپنے شباب کی ان داستانوں پر نظریں دوڑائے جو ایک وقت اتنی سنجیدہ اور جذباتی تھیں لیکن جو آج اسے محض حماقتیں نظر آتی ہیں اور جن پر وہ اب آسانی سے قہقہے لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آج مزاح ایک ایسے مقام پر بھی جا پہنچا ہے جہاں اس نے یاس کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ اب جہاں یاس مزاح کو بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے سے باز رکھتی ہے وہاں مزاح بھی یاس کو ہچکیوں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ "ان دو دھاتوں کا یہ حیرت انگیز ملاپ ہے ـــــ ایک بہت سخت دوسری بہت نرم۔ دنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے لیکن یہ کتنی خوفناک جگہ ہوتی اگر یہاں آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا"[1]

---

[1] Stephen Leacock – Humour & Humanity, P. 233

(۲)

گزشتہ فصل میں احساسِ مزاح کی اہمیت ہنسی کے پس پشت مختلف تحریکات اور وحشی سے مہذب انسان تک مزاح کے تدریجی ارتقاء کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہم مزاح نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ مزاحیہ اور طنزیہ ادب جن کیفیتوں مثلاً خالص مزاح Humour طنز Satire تحریف Parody رمز (Irony) وغیرہ سے اپنی بقاء کے لیے خونِ گرم حاصل کرتا ہے وہ خود کن عناصر کے امتزاج سے مرتب ہوتی اور کس انداز سے مزاحیہ و طنزیہ ادب کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خالص مزاح کو لیجیے جس کی تعریف اسٹیفن لی کاک (Stephen Leacock) نے ان الفاظ میں کی ہے:-

"مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔"[1]

مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے متعلق ہے اور اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہِ دوربین سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردِ عمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا اور اس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویۂ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے "تجربے" کے اظہار میں فنکارانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اسے سپاٹ طریق سے پیش نہیں کرتا۔ لیکوک کی رائے میں خالص مزاح کی پیش کش ان تینوں عناصر کی رہینِ منت ہے۔

جیسا کہ لی کاک کی توضیح سے معلوم ہوا مزاح نگار اس فرد کے ساتھ جس کا وہ مضحکہ اڑاتا ہے ایک "ذہنی کھیل" میں شریک ہو جاتا اور اس سے محظوظ ہونے لگتا ہے لیکن طنز نگار کا معاملہ اس سے کچھ جدا ہے۔ دراصل طنز کے پس پشت مرکزی خیال یہ ہوتا ہے کہ خود طنز نگار ان تمام حماقتوں سے محفوظ ہے جن کا وہ خاکہ اڑا رہا ہے۔ نتیجتاً اسے اپنے نشانۂ تمسخر سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اگر رونالڈ ناکس (Ronald Knox) کا ایک فقرہ مستعار لیا جائے تو ہم کہہ سکتے کہ "مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔"[2] چنانچہ جہاں مزاح نگار کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے وہاں طنز نگار ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا اور انھیں خندۂ استہزا میں اڑا دینے کی طرف ہر دم مائل رہتا ہے۔ البتہ طنز کے کئی ایک مدارج ضرور ہیں۔ چنانچہ کبھی تو یہ محض ایک فرد کو نشانۂ تمسخر بناتی ہے اور کبھی ان ارتقائی منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی اور انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے۔

---

1. Stephen Leacock—Humour & Humanity, P. 11
2. Ronald Knox—Essays on Satire, P. 31

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری اور مناسب ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی افادیت کے باعث مزاح پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی دانست میں طنزیہ ادب ایک مستقل اقدار کی حامل ہے۔ لیکن درحقیقت یہ نظریہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزا زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقع افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غمگسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔ پس اپنی تحقیقات کے دوران میں ہم اسی درمیانی راستے کو اختیار کریں گے۔

مزاح نگاری اپنے نمو کے لیے جن عناصر کی رہین منت ہے ان میں سے ایک موازنہ (Comparison) ہے۔ دو چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ مزاح نگار بالعموم مزاح کی تخلیق کے لیے اس حربے سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھاتا ہے۔ عام زندگی میں موازنہ کی مثال کسی شریر آئینے کا وہ عکس ہے جو کسی فرد کے حلیے کو مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ یہ عکس بیک وقت اس فرد کا اصلی عکس بھی ہے اور اس سے قطعاً مختلف بھی اور اسی لیے یہ ہنسی کو بیدار بھی کرتا ہے۔ اردو ادب میں کنہیا لال کپور کی کتاب "چنگ و رباب" کا ایک جملہ "شیخ سعدی سے لے کر شیخ چلی تک" اس کی نمایاں مثال ہے کہ اس کی تخلیق میں اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود نے حصہ لیا ہے۔ شیخ سعدی اور شیخ چلی میں "شیخ" کا لفظ مشترک ہے لیکن اس وقت چلی اور سعدی کا تضاد ایک ایسی شدید ناہمواری پیدا کرتا ہے کہ ہم بے اختیار ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی طرح پطرس کے مشہور مضمون "کتے" کے آغاز میں بھی مزاح کو تحریک اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود سے ملی ہے جو مشاعروں اور کتوں کے ہنگامے کے مابین ہے۔

مزاح نگاری کا دوسرا کارآمد حربہ زبان و بیان کی بازیگری ہے۔ لفظی بازیگری سے مزاح پیدا کرنے کے کئی ایک طریق ہیں جن میں شاید سب سے پرانا طریق تکرار (Repetition) ہے مگر اس ضمن میں جس طریق کو از منۂ قدیم سے اہمیت ملی ہے رعایت لفظی (Pun) کے نام سے مشہور ہے۔ رعایت لفظی کا مقصد یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ ناظر کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو، چنانچہ اس کی مدد سے بالعموم ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو عام انداز سے کہی جاتی تو ایک شدید بدتر رد عمل کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے لیکن رعایت لفظی کے لیے جدت شرط ہے ورنہ تکرار سے بالعموم اس کی مزاحیہ کیفیت انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ لفظی بازی گری کا اور نمونہ مضحکہ خیز املا سے مزاح کی تخلیق ہے۔ لیکن اس کا افق اس وجہ سے محدود ہے کہ یہاں مضحک پہلو تک صرف انسانی آنکھ ہی رسائی حاصل کر پاتی ہے۔ ان کے علاوہ بذلہ سنجی سے پیدا ہونے والا مزاح بھی بڑی حد تک الفاظ ہی کا رہین منت ہوتا ہے کہ یہاں الفاظ کی بچت (Economy) سے مضحک نکات کو بڑی تیزی اور شدت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی لفظی بازیگری کے یہ تمام ترکیبے لیکن مضحک نکات بذلہ سنجی Wit کے زمرے میں شامل ہیں۔ بذلہ سنجی کو مزاح سے بہ آسانی تمیز کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ مزاح ایک کیفیت ہونے کے باعث سارے کے سارے ادب پارے میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور ہم جب تمام

ست جاتی ہے یہ شدت بڑی صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مزاح کو علیحدہ کرکے دکھانا بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف اگرچہ بذلہ سنجی زبان و بیان سے متعلق ہے اور اسی لیے مزاح نگار اسے حربے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ تاہم بذلہ سنجی کا رشتہ الفاظ کے ساتھ اس قدر شدید ہے کہ مزاح کے برعکس یہ علیحدہ کرکے بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ اس گذارش کو زیادہ واضح طور پر اشکال الف اور ب کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(ا) م۱ م۲ ج

(ب) م۱ م۲

ان دونوں اشکال (ا اور ب) میں م۱ اور م۲ ہمارے تصورات کے دو میدان ہیں۔ شکل ا لطیفے سے متعلق ہے اور بتاتی ہے کہ لطیفہ کس طرح سے ہنسی کو بیدار کرتا ہے۔ اس شکل کے مطابق جب دو مجرد تصورات (جن میں سے ایک م۱ اور دوسرا م۲ کا تصور ہے) ج کے نقطے پر جا کر ملتے ہیں تو ایک ایسا برقی جھٹکا لگتا ہے جو لطیفے کی جان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ لطیفہ لیجیے:۔

"گورنر کو پاگل خانے کا ملاحظہ کرنا تھا چنانچہ پاگل خانہ میں بڑے انتظامات کیے جا رہے تھے ایک پاگل نے جو دیر سے کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ایک آفیسر سے پوچھا۔

پاگل : کیوں جی کون آ رہا ہے؟

آفیسر : گورنر!

پاگل : کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جب آیا تھا تو وائسرائے تھا۔"

یہاں تصورات کے دو میدان موجود ہیں — گورنر کی پاگل خانہ میں آمد برائے ملاحظہ (م۱) اور گورنر کی پاگل خانے میں آمد بطور پاگل (م۲)، چنانچہ جب ان دو تصورات کا مقام ج پر ٹکراؤ ہوتا ہے اور ہم پاگل کے یہ الفاظ پڑھتے ہیں کہ وہ بھی شروع شروع میں خود کو وائسرائے سمجھتا تھا تو ہنسی کا ایک شرارہ پیدا ہوتا ہے۔

دوسری شکل یعنی ب میں ایسا کوئی خاص شرارہ موجود نہیں۔ یہ شکل مزاح سے متعلق ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مزاح م۱ اور م۲ کی حد انضمام کے ساتھ ساتھ چلتا اسے قدم بقدم پر کاٹتا اور اپنے سفر کے دوران میں ہلکے ہلکے شرارے پیدا کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ مزاح کی امتیازی کیفیت یہ ہے کہ اس کے باعث جو تبسم معرض وجود میں آتا ہے وہ ایک نمایاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر دیکھتے دیکھتے قہقہہ بن جاتا ہے اور پھر بجھتے بجھتے سنجیدگی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے لیکن یہ سنجیدگی ابدی نہیں ہوتی، اگلے ہی موڑ پر اسے پھر سے تبسم کی رفاقت میسر آ جاتی ہے اور یوں یہ چکر برقرار رہتا ہے۔ مغربی ادب میں ڈان کوائکزوٹ Don Quixote اور مسٹر پکوک Mr. Pickwick اور ہمارے اپنے ادب میں خوجی اور چچا چھکن کے مطالعے سے مزاح کی یہ کیفیت بڑی واضح ہے۔

مزاح نگاری کا تیسرا حربہ مزاحیہ صورت واقعہ (Humorous Situation) ہے۔ یہ صورت واقعہ تین اہم عناصر کی مرہون منت ہوتی ہے — ناہمواریوں کی اچانک پیدائش، الجھن میں اسیر انسان کے مقابلے میں ناظر کا احساس برتری اور یہ احساس کہ اس حادثے میں صدمے یا دکھ کا پہلو موجود نہیں۔ یہی بات ایک مثال سے اس طرح واضح ہو سکتی ہے:

"اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری چنانچہ اس میں یکلخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے رہا تھا لیکن میرا تمام جسم بائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کرنے لگا تو میرے گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ گئے۔"

(مرحوم کی یاد میں" ——— پطرس)

یہاں زندگی کی روانی میں دفعتاً ناہمواری سی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک بھلا چنگا آدمی دیکھتے دیکھتے عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا ہے ——— ایک ایسی الجھن جس نے چند لمحوں کے لیے اس کے عام انسانی وقار کو ختم کر کے ہمارے احساسِ برتری کو تحریک دے دی ہے لیکن چونکہ ظاہر ہے کہ یہ شخص کسی سخت چوٹ یا شدید ذہنی صدمے سے محفوظ ہے اس لیے اگر اس کی ہیئت کذائی ہماری ہنسی کو بیدار کر دیتی ہے تو یہ حالات کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس اگر یہی شخص سائیکل سے گر پڑتا ہے اور اس کی ایک ٹانگ سخت مجروح ہو جاتی ہے تو ایک وحشی انسان تو شاید بے اختیار ہنس دے لیکن ایک مہذب انسان کے ہونٹوں پر خفیف سے تبسم کا نمودار ہو جانا بھی بعید از قیاس ہے۔

صورتِ واقعہ سے پیدا ہونے والا بہترین مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا رہینِ منت نہ ہو بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہو جائے۔ چنانچہ صورتِ واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاقِ وقت (Coincidence) سے بھی کام لیتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ عملی مذاق (Practical Jokes) سے بہت کم مدد طلب کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عملی مذاق مزاح کی ایک کھردری صورت ہے اور چونکہ اس کی تعمیر میں ٹھٹھا کرنے تک شعوری کاوش کو دخل حاصل ہے لہٰذا اس سے پیدا ہونے والے مزاح میں وہ گہرائی اور لطافت موجود نہیں ہوتی جو صورتِ واقعہ کے مزاح کا مابہ الامتیاز ہے۔

مزاح نگاری کا چوتھا حربہ مزاحیہ کردار (Humorous Character) ہے۔ وہ مزاحیہ کردار جس کی بدولت تمام کا تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بے شک مزاحیہ کردار کو نمایاں کرنے کے لیے پہلے ایک مناسب ماحول پیش کرنا از بس ضروری ہے تاہم جب ایک بار اس انوکھے کردار کی تخلیق ہو جاتی ہے تو پھر اس کا سرسری سا تذکرہ ہی ماحول کی ساری سنجیدگی کو انحطاط پذیر کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈان کوکزوٹ (Don Quixote) یا خوجی کا نام ہی لیا جائے تو ہم ہنسنے کے لیے غیر ارادی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے کہ مولویوں، فلاسفروں یا سکھوں کے متعلق لطائف محض مولوی، فلاسفر یا سکھ کے لفظ ہی سے ایک غیر سنجیدہ فضا کی تعمیر کر لیتے اور ناظر کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر پیدا کر دیتے ہیں۔

جہاں تک مزاحیہ کردار کی پیش کش کا تعلق ہے ایک کامیاب مزاح نگار کردار کے مختلف اجزاء یا عناصر کے مابین اس خلیج کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے جس سے ناظر کو کردار کی ناہمواریوں کا احساس ہو سکے۔ چنانچہ مزاح نگار کی نظرِ انتخاب ایک ایسے کردار پر پڑتی ہے جس میں لچک کا فقدان ہوتا ہے اور جو ایک نارمل انسان کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں

کرتا۔ یہی ایک مکمل مزاحیہ کردار کو قدم قدم پر ان کے واقعات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ واقعے کی نوعیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کردار اصلی کی اپنی ایک تبدیلی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ ایسے موقعوں پر مزاحیہ صورتِ واقعہ اور مزاحیہ کردار ایک ہو جاتے ہیں اور اعلیٰ مزاح کی تخلیق میں مدد بہم پہنچانے لگتے ہیں۔

مزاح نگاری کا آخری حربہ پیروڈی یا تحریف ہے لیکن پیروڈی صرف مزاح سے ہی متعلق نہیں بلکہ طنز نگار بھی اس حربے سے خاصا استفادہ کرتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تحریف ایک علیحدہ صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور نتیجتاً ایک علیحدہ مطالعے کی طالب ہے ——— پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ اپنے عروج پر اس کا منتہا ادبی یا نظریاتی خامیوں کو منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے لیکن اس سے دوسرے بہ حالات زمانہ کا کھوکھلا پن اخلاقی کسی بلند پایہ مضمون کو خفیف مضمون میں تبدیل کرتی یا محض لفظی تبدیلیوں سے تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے چنانچہ تحریف کے مقصد کا تعین کرنے والوں میں خاصا اختلاف باہم ہے۔ بعض کے نزدیک تحریف کا مقصد نہ صرف معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے بلکہ زندگی کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنانا بھی ہے۔ دوسروں کے نزدیک تحریف صرف تفریح پر مبنی ہے اور اس کا مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر داؤد رہبر کی یہ رائے بڑی وزنی ہے کہ ان دونوں گروہوں کو ایک طرح کا سمجھوتہ کر لینا چاہیے ——— وہ یوں کہ گروہِ اول اصلاحی تنقید کی شرط چھوڑ دے اور گروہِ ثانی تفریحِ محض کی[1] ——— پیروڈی کے ساتھ چند الفاظ تقلیبِ خندہ آور Burlesque کے بارے میں بھی لکھنے انتہائی ضروری ہیں۔ تحریف کی طرح تقلیبِ خندہ آور بھی لفظی نقالی ہے لیکن جہاں تحریف کے پیشِ نظر بالعموم اصل کی تضحیک ہوتی ہے وہاں تقلیبِ خندہ آور کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ کسی ادب پارے کو دوبارہ اس انداز سے لکھا جائے کہ مزاح کی تخلیق ہو سکے[2] نیو آکسفورڈ ڈکشنری میں لکھا ہے کہ پیروڈی کو مصنف کی کسی خاص تخلیق تک محدود ہونا چاہیے۔ اس طرح کہ اس کے پیشِ نظر اصل کی مزاحیہ انداز میں تنقید ہو لیکن تقلیبِ خندہ آور ایک وسیع تر چیز ہے جو کسی مصنف کے عام انداز یا کسی جماعت کی خاص نہج کی نقل اتارتی ہے محض اس لیے کہ ہنسی مذاق کو تحریک ہو[3]۔

اور اب طنز ——— طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردِ عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہو۔ اردو ادب میں طنز کا عروج بھی بڑی حد تک اسی ردِ عمل کا رہینِ منت ہے جو ایک غیر ملکی حکومت کے تشدد، مسلسل سماجی الجھنوں اور فرد کی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کے باعث پیدا ہوا اور جس نے طنز نگار یعنی ایک حساس اور دردمند انسان کو اپنے ماحول کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ اس ردِ عمل کے زیرِ اثر طنز نگار نے ان تمام ناسوروں پر تیز تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا جو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی پیداوار تھے

---

1. "فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور" از ڈاکٹر داؤد رہبر (ادبی دنیا ستمبر ۱۹۴۶ء)
2. "To Burlesque anything means to make fun out of it, not of it"—Stephen Leacock (Humour & Humanity) P. 65
3. New Oxford Dictionary XXII. Introductions.

اور یہی کے باعث معاشرہ مسلسل کہ دم توڑ رہا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ طنز کا استعمال تخریب پسندی کی علامت ہے۔ دراصل طنز کی تخریبی کارروائی صرف ناسور پر نشتر چلانے کی حد تک ہے۔ اس کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا اور فرد یا سوسائٹی کا اپنے مرض سے نجات حاصل کر لینا یقیناً اس کا بہت بڑا تعمیری کارنامہ ہے لیکن طنز کے لیے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے دوسرے پردہ دری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فن کارانہ پیرایۂ اظہار اختیار کرے اور تیسرے کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنائے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز، طنز نہیں رہتی۔ محض پھبتی، استہزا یا ہجو کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شاید اسی لیے اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر اس خارزار میں جا نکلتی ہے جہاں تخریب کا مجرب تخریب سے ملتا ہے اور نشانۂ تمسخر وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی بجائے غضب ناک ہو کر جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

طنز کے بارے میں آرتھر کوئسلر[۱] کا خیال ہے کہ ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انھیں مبالغہ آمیز انداز سے پیش نہ کرے۔ ہماری نگاہیں ان پر جمنے ہی نہیں پاتیں۔ پس طنز نگار کی جیت اسی میں ہے کہ وہ زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو یوں بڑھا چڑھا کر اور ایسے مزاحیہ انداز سے پیش کرے کہ ہم ان ناہمواریوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی بات بری بھی نہ لگے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مزاح کی طرح طنز بھی موازنہ، مبالغہ، لفظی بازیگری اور تحریف وغیرہ کے حربے استعمال کرتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مزاح کے برعکس طنز میں "نشتریت" کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے اور یہ اپنے نشانۂ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور کرتی ہے۔

مزاح اور اس کے اماثل کی یہ بحث طنز و مزاح کے قبیلے کے ایک آخری رکن کا تذکرہ کیے بغیر شاید تشنہ رہ جائے ہماری مراد اس صنفِ ادب سے ہے جسے اصطلاحِ عام میں رمز (Irony) کہتے ہیں اور جو تحریف کا کامیاب حربہ یعنی "مبالغہ" کے برعکس کم بیانی (Under statement) کا سہارا لے کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ آج رمز ادب میں ایک مستقل اور اہم مقام حاصل کر چکی ہے اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ مخالف کے دلائل، نظریات اور طریقِ استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے یوں بیان کیا جائے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ بظاہر یہ کسی شے کا نہایت سنجیدگی اور عقیدت سے ذکر کرتی ہے اور اس سے مکمل اتفاق کرتی ہے۔ لیکن درپردہ اس کی جڑیں بڑی تیزی سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی پیٹو شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس بیچارے کو تو آج بھوک ہی نہیں لگی۔ اس نے صرف دس انڈوں، پانچ پراٹھوں اور دودھ کے آٹھ گلاسوں کے ساتھ ناشتہ کیا، تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ نہیں جو بیان ہوا بلکہ

---

[۱] Arthur Koestler—Insight & Outlook, P. 95

اس کو [illegible] دوسرے لفظوں میں رمز کرنے والا Ironist یا مخالف کے لفظ استعمال کر کے [illegible] سے بیان
کرتا ہے کہ [illegible] ایک کمل صورت اختیار کر جاتا ہے اور دراصل اسی میں رمز کی [illegible]

(۳)

اہم مزاح اور اس کے اماثل (طنز، تحریف، رمز وغیرہ) کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ
اظہار و بیان کے یہ مختلف انداز کیونکر طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اب ہم اردو ادب کی طرف
متوجہ ہوں گے اور یہاں معلومات کی روشنی میں جو اب تک حاصل ہوئی ہیں اردو ادب میں طنز و مزاح کے ارتقاء کا ایک تاریخی اور
تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے لیکن اس سے قبل کہ ایسا کیا جائے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اردو ادب کی نشو و نما
میں دو غیر ملکی ادبیات نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ انگریزی اور فارسی۔ چنانچہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ لینے
سے قبل یہ نہایت ضروری ہے کہ انگریزی اور فارسی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی اہم ترین خصوصیات کا بھی مختصر سا جائزہ لیا
لیا جائے تاکہ آگے چل کر یہ معلوم ہو سکے کہ طنزیات و مضحکات کے میدان میں ہماری اپنی نگارشات نے کہاں کہاں سے
اثرات قبول کیے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے انگریزی ادب کو لیجیے جس کی نمایاں ترین خصوصیت "خالص مزاح" کی ابتدا اور اس کا
تدریجی ارتقاء ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں طنز کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ انگریزی ادب میں
بھی طنز کے اچھے نمونے ملتے ہیں تاہم یہ بات شاید انگریزی ادب ہی سے مخصوص ہے کہ یہاں مزاح طنز کا لبادہ اوڑھے بغیر
نمودار ہوا اور ادب اور معاشرے میں ایک مخصوص مقام حاصل کرتا چلا گیا۔ انگریزی ادب میں خالص مزاح کی اس بہتات
آمد کی پہلی وجہ تو انگریزی فضا کا وہ گھریلو پن ہے جو اس ملک کی ہر شے پر ایک لطیف دھند کی طرح مسلط ہے۔ دوسری وجہ
انگریزی کردار کی وہ انفرادیت اور غیر ہمواری ہے جو انگریزی فضا، انگریزی خاندان اور نتیجتہً انگریزی ادب میں ایک مزاحیہ کردار
کی صورت میں بڑے بھرپور انداز میں موجود ہے اور تیسری وجہ سکون اور عافیت کی وہ فضا ہے جو بیرونی حملوں اور ملکی انقلابوں
سے بڑی حد تک محفوظ رہی اور جس کے باعث انگریزی خاندان کے حلقے میں بھی سکون و عافیت کا دور دورہ رہا۔

لیکن انگریزی ادب کا خالص مزاح آغاز کار ہی سے انگریزی ادب کا طرۂ امتیاز نہیں رہا۔ دراصل یہاں "خالص مزاح"
کا عروج نسبتاً ایک جدید تر واقعہ ہے اور انیسویں صدی سے قبل اس کا وہ مخصوص رنگ غائب ہے جو انیسویں صدی کے
نصف اول میں ڈکنز کی تحریروں سے نمودار ہوا اور جو کمال درجے تک پہنچتے پہنچتے بمشکل اپنے بھرپور انداز سے ظاہر ہو
سکا۔ مگر یہ بات مستثنیات کے تابع ضرور ہے۔ چنانچہ مزاح کے ہلکے رنگوں کو شیکسپیئر، مسٹرن، شیریڈن اور ایڈیسن کی تحریروں
میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے تاہم مجموعی طور پر اس طویل دور میں طنز، تحریف اور رمز ہی کا تسلط نظر آتا ہے۔

انگریزی ادب میں طنزیات و مضحکات کا آغاز چاسر سے ہوا۔ چاسر کے اشعار میں بلند بانگ قہقہوں کے پہلو بہ پہلو
لطیف مزاح کے بھی خاصے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ وہ ہم پر بھی ہنستا ہے اور خود پر بھی اور بہ حیثیت مجموعی زندگی کی طرف

اس کا ردِ عمل ہمدردانہ ہے۔

چاسر کے بعد انگریزی ادب میں اگلا اہم نام شیکسپیئر کا ہے۔ دراصل شیکسپیئر ہمارے انگریزی ادب میں ایک روشنی کے مینار کی طرح سربلند کھڑا ہے اور جس صنفِ ادب میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے اس کے نقوش ابدی طور پر ثبت ہو گئے ہیں چنانچہ طنز و مزاح کے ضمن میں بھی شیکسپیئر کے ہاں ایک انفرادی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اگر عیب جوئی بھی کرتا ہے تو اس مقصد کے ساتھ نہیں کہ کسی کا مضحکہ اڑایا جائے بلکہ اس لیے کہ محظوظ ہوا جائے۔ اس کی دنیا میں تحمل، حسنِ سلوک اور ہمدردی کے عناصر بکثرت ملتے ہیں اور یہی چیزیں دراصل مزاحیہ ادب کی جان ہیں۔

شیکسپیئر کا دور انگلستان کی عظمت کا دور ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے ایک ایسا انحطاط پذیر زمانہ آتا ہے جس میں مذہبی جنون اور ریا کاری ہوئے سماج نے زندگی کو نئے نئے رنگ تفویض کر دیے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں یا تو ملٹن Milton جیسے بے حد سنجیدہ فن کار ملتے ہیں یا ڈرائیڈن Dryden پیپس Pepys اور بٹلر (Butler) جیسے طنز کے گرویدہ۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ادب میں طنز اور رمز ہی کی فراوانی ہے۔

یہ دور سترھویں صدی اور ریسٹوریشن کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں طنز کے لیے جو میدان تیار ہوا وہ اس سے اگلی صدی میں کچھ اور بھی وسعت اختیار کر گیا۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں شعر کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طنز، تحریف اور رمز کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں شعری تخلیقات میں پوپ Pope کی تیز طنز اور نثر میں سوئفٹ (Swift) کی شدید رمز کے نمونے بکثرت ملتے ہیں وہاں ڈراموں میں ہم شیریڈن (Sheridan) اور گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے پُر لطف قہقہوں اور ناول میں فیلڈنگ کی سنجیدہ رمز اور اسٹرن (Sterne) کے ہمدردانہ مزاح سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت انگریزی مضمون نگاری Essay-Writing کا وہ عروج بھی ہے جو ایڈیسن (Addison) اور اسٹیل (Steele) کی تحریروں کا رہینِ منت ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں نے نہ صرف انگریزی نثر میں سادگی اور جاذبیت پیدا کی بلکہ اسے وہ خوشگوار اور پُرلطف انداز نگارش بھی بخشا جو آگے چل کر خالص مزاح کی نمو میں ایک بنیادی عنصر ثابت ہوا۔

انگریزی ادب میں اٹھارویں صدی کا ربعِ آخر اور انیسویں صدی کا خمسِ اول اس لحاظ سے خاصے اہم ہیں کہ اس عرصے میں دو ایسے فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادب میں خالص مزاح کے نقوش کو نمایاں کرنے میں ایک اہم حصہ لیا۔ ان میں سے ایک مرد تھا، چارلس لیمب (Charles Lamb) اور دوسری عورت، جین آسٹن (Jane Austen)۔ چارلس لیمب کے مضامین ایڈیسن اور اسٹیل کی سی خوشگوار لطافت کے حامل ہیں لیکن یہاں مزاح نسبتاً زیادہ لذیذ ہے۔ چارلس لیمب کی اپنی زندگی ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو آزادی اور مسرت سے محروم کسی تنہا سڑک پر بڑھتا چلا جائے اور سڑک کے اختتام پر ایک تاریک کنواں منہ کھولے اس کا منتظر ہو۔ لیکن اس کی تصانیف میں بلا کی زندگی اور زندگی سے انتہائی شغف کی ایک داستانی عنصر ہے اور اسی چیز نے اس کے مزاح میں بھی توانائی پیدا کر دی ہے۔

اس دور کی ناول نگار جین آسٹن کے ناولوں میں پہلی بار خالص مزاح کا نکھرا ہوا رنگ ملتا ہے۔ وہ رنگ جس کو بعد ازاں شورخ ہو کر انگریزی میں خالص مزاح کی تکمیل یافتہ صورت میں نمودار ہونا ہے۔ جین آسٹن کے مزاح کا مزاج انتہائی ٹھنڈا ہے اور یہ مزاح

بیشتر اوقات محض کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ انگریزی کے مخصوص مزاح سے قریب تر ہے۔

انگریزی ادب میں انیسویں صدی ناول کے آغاز و عروج کا زمانہ ہے اور ناول کی وساطت سے مزاحیہ کردار کی تخلیق کا بھی زور ہے۔ چنانچہ جین آسٹن کے مزاحیہ کرداروں کے فوراً بعد چارلس ڈکنس کے بے شمار ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنی کسی نہ کسی ناہمواری کے باعث مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتے ہیں۔ ڈکنس کردار نگاری کا بادشاہ ہے اور اس کے ناولوں میں جو کم و بیش ایک ہزار نوسو (۱۹۰۰) کردار ملتے ہیں ان میں سے بیشتر مزاحیہ کرداروں کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کردار اس شدید ہمدردی اور شفقت کی غمازی کرتے ہیں جو ان کی تعمیر میں صرف ہوتی ہے اور جو بالعموم صحیح مزاحیہ کردار کی تخلیق کی ضامن ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈکنس کے ناولوں میں واقعے سے پیدا ہونے والا مزاح کردار کے مزاح سے ہم آہنگ بھی نظر آتا ہے اور یہی وہ انفرادی انداز ہے جس نے ڈکنس کے مزاح کو تقویت بخشی ہے۔

اسی دور میں ڈکنس کے ساتھ ساتھ تھیکرے (Thackery) کا نام بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ تھیکرے کے مزاح کا مخصوص رنگ یہ ہے کہ وہ مسکراتا ہے، پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے، پھر مسکراتا ہے۔ اپنے شانوں کو جھٹکتا ہے اور زندگی کی بوالعجبیوں کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ تھیکرے کے آرٹ میں بڑی حقیقت نگاری ہے اور یہی چیز اسے زندگی کے بہت بڑے محتسب کا درجہ بخش دیتی ہے۔ علاوہ ازیں تھیکرے ہی نے پہلی بار نثر میں تحریف کے رنگ کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

انیسویں صدی میں چارلس ڈکنس کے علاوہ پی کاک (Peacock) کے ناولوں میں بھی مزاح کی کارفرمائی نظر آتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پی کاک کے ناول دس میں سے نو حصے محض مزاح ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

اسی دوران میں شاعری کے ضمن میں جن شعراء نے مزاح نگاری کو پروان چڑھایا ان میں کالورلے (Calverley) سٹیفن (Stephen) اسکوائر (Squire) اور سون برن (Swinburne) کے نام خاصے اہم ہیں۔

اور اب ہم اس رہگذر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انگریزی مزاح نے اپنے قدم پوری طرح سے جما لیے ہیں اور اس میں تنوع، گہرائی اور نکھار پیدا ہو چکا ہے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے طویل عہد حکومت کا وہ درمیانی زمانہ ہے جب انگریزی مزاح ایک ایسی نئی روش اختیار کرتا ہے جسے بے معنی مزاح (Nonsense Humour) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بے معنی مزاح ایک پُراسرار طریق سے انگریزی ادب کی دونوں ممتاز خصوصیات کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح کا فرار ہے جو ناظر کو عقل و خرد کے جہان سے رخصت دلا کر ایک نسبتاً پاگل دنیا میں لے جاتا ہے —— ایک ایسی دنیا میں جہاں حماقت (Absurdity) نے شاعرانہ لباس پہن لیا ہے اور بے ڈھنگا پن اُبھر کر یوں نمایاں ہو گیا ہے کہ قہقہے ہونٹوں کے قفل توڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور ساری فضا بہت سے لبریز ہو گئی ہے۔ اس مزاح کو عام کرنے والوں میں ایڈورڈ لیئر (Edward Lear) لیوس کارول (Lewis Carroll) اور گلبرٹ (Gilbert) کے نام خاصے اہم ہیں۔

اور اب بیسویں صدی —— وہ صدی جس کے انگریزی ادب میں خالص مزاح کا رنگ دن بدن نکھرتا چلا جا رہا ہے اور مزاح طنز کی نشتریت سے آزاد رہ کر ایک بالکل نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ جیکب (Jacobs) جیروم کے جیروم Jerome—K—Jerome

ہم نے امریکی اور انگریز مزاح نگاروں کو یہاں ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ سب جدید انگریزی مزاح کے نمائندے ہیں ویسے انگریزی اور امریکی مزاح کے رنگوں میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے لیکن یہاں اس فرق کو زیر بحث لانا مسئلے کو غیر ضروری طور پر طول دینے کے مترادف ہوگا۔

سٹیفن لی کوک (Stephen Leacock) ووڈ ہاؤس (Woodehouse) اور مارک ٹوئن یہ سب اس نئے مزاح کے نمائندے ہیں۔

انگریزی ادب کے برعکس فارسی ادب میں طنز و مزاح کی داستان ایک تشنہ اور نامکمل سرگزشت کی حیثیت رکھتی ہے فارسی ادب میں نہ صرف طنز و مزاح کے تدریجی ارتقاء کا قطعی فقدان ہے بلکہ یہاں وہاں ایسے طنز نگار اور مزاح نگار بھی نظر نہیں آتے جن کا زور دار الفاظ میں ذکر کر دیا جائے۔ ایران میں طنز کے فروغ نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ طویل اسلامی عہد کی ثقاہت ہزل آمیز پیرایۂ اظہار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے طنز اغماض و درگزر کی طالب ہوتی ہے اور سرزمین ایران کے ارباب اور عوام میں وہ فراخ حوصلگی موجود نہیں تھی جو اس کے فروغ میں مدد دیتی۔ جہاں تک مزاح کا تعلق ہے اس کے فقدان کا باعث یہ ہے کہ ایران کی مجلسی اور سماجی زندگی مسلسل انتشار اور افراتفری، پیہم قتل و غارت گری اور یکے بعد دیگرے چنگیزی و تیموری حملوں سے اس درجہ متاثر رہی کہ سکون و عافیت کا وہ طویل دور اسے نصیب ہی نہ ہو سکا جو مزاح کے نشو و ارتقا کے لیے ازبس ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ فارسی ادب میں جو تھوڑا بہت مزاح پیدا ہوا وہ کچھ تو محض "ہنگامی فرار" کی حیثیت رکھتا تھا اور باقی ماندہ نے گالی گلوچ، پھکڑپن اور ہجو کی صورت اختیار کی اور یوں مزاح کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

پس جس وقت فارسی زبان میں طنز و مزاح کا ذکر آتا ہے تو لامحالہ ہم فارسی طنز و مزاح کے تدریجی ارتقا کی بجائے ان طنز یہ و مزاحیہ روشوں کے تذکرے کی طرف مائل ہوتے ہیں جو فارسی زبان کے طویل دور میں اُبھری ہیں اور جو بلاشبہ اُردو شاعری میں طنز و مزاح کے پہلے دور پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔

ان میں سے پہلی رَو ہجو کی رَو ہے۔ ہجو کی اس رَو کا آغاز فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی سے ہوتا ہے لیکن رودکی کے کلام میں ہجویہ اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ پھر بھی رودکی کی ہجو میں متانت اور واقعیت ضرور ہے۔ ہجو کے سلسلے میں اگلا نام فردوسی کا ہے اور اگرچہ فردوسی کو بھی ہجو گو شاعر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تاہم فردوسی کے نام کے ساتھ محمود غزنوی کی جو ہجو وابستہ ہے وہ اس قدر زبان زدِ خاص و عام ہو چکی ہے کہ اس ضمن میں اسے نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اس ہجو کے یہ اشعار خاص طور پر مشہور رہیں ؎

یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بپے افگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی
اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر برنہادے مرا تاج زر
وگر مادرِ شاہ بانو بدے — مرا سیم و زر تا بہ زانو بدے
ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند — کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاہ ہجو رنجد بگویدہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا

فارسی زبان میں ہجو دراصل پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی اور سلجوقیہ کے زمانہ عروج میں نمودار ہوئی۔ بقول شبلی نعمانی ——"شاعری کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے جس کے چمن آرا انوری اور سوزنی ہیں"[1] لیکن انوری اور سوزنی کے ہاں ہجو کا مزاج بہت تیز ہے

---

[1] شبلی نعمانی۔ شعر العجم جلد اوّل صفحہ ۱۸۱۔

اور یہ بیشتر اوقات فحش گوئی اور گالی گلوچ کی سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ انوری کے متعلق تو یہ بات خاص طور پر مشہور ہے کہ ذرا کسی سے رنجیدہ ہوا اور اسی کی ہجو لکھ ڈالی۔ اُردو شاعری کے سوداؔ نے تو خاص طور پر انوریؔ سے اثر لیا چنانچہ نہ صرف یہ کہ سوداؔ کی گھوڑے کی ہجو انوریؔ کے گھوڑے کی ہجو کی صورت میں نمودار ہوئی بلکہ انوریؔ کے پست ہجویہ انداز کو بھی سوداؔ نے تقلید کے قابل سمجھا اور ایسی بہت سی ہجویں لکھیں جو آج کے زمانے میں قطعاً ناقابلِ قبول ہیں۔

فارسی ہجو کے مزاج میں تبدیلی کمال اسمٰعیل خلاق المعانی اصفہانی کی رہینِ منت ہے۔ ہجو جو سوزنیؔ اور انوریؔ کے ہاں اوباشوں کی زبان کا درجہ اختیار کر گئی تھی کمال نے اس میں اعتدال اور توازن پیدا کیا اور اسے اس درجہ قابلِ قبول بنایا کہ جس شخص کی ہجو کی جاتی تھی وہ خود بھی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ چنانچہ کمالؔ کو یہ کمال حاصل ہے کہ اس کی ہجو کے ڈانڈے ابتذال اور فحش گوئی سے کٹ کر مزاح اور سچی ظرافت کی سرحدوں سے جا ملتے ہیں۔ کمالؔ کے ہجویہ انداز کی قدر و قیمت کا ہلکا سا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے جس میں کمالؔ نے ایک بخیل کی ہجو کی ہے:۔

وے مرا گفت دوستے کہ مرا ۔۔۔ با فلاں خواجہ از پئے سرکار

پختنے سپند ہست و او از پئے آں ۔۔۔ خلوتے مے بباید م ناچار

خلوتے آں چناں کہ اندر وے ۔۔۔ ہیچ مخلوق را نباشد بار

گفتم ایں فرصت از تو انی یافت ۔۔۔ وقت نان خوردنش نگہ مے دار

کمال اسمٰعیل کے زمانے میں ان کے معاصر سلمان ساوجی نے بھی ہجویات لکھیں لیکن ان ہجویات میں کمالؔ کی سی بات کہاں؟

فارسی ادب میں طنز و مزاح کی دوسری رَو زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور رندی و سرمستی کے اشعار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نام عمر خیام کا ہے جس کے کلام میں رندی و سرمستی کے عناصر کی فراوانی ہے۔ عمر خیام نہ صرف مئے ارغواں اور ساقی گلفام کا دلدادہ ہے بلکہ وہ بالعموم زندگی کی تباہی انتشار اور بدمزگی کو "غرقِ مئے ناب" بھی کرتا ہے۔ پھر خیام کے ہاں زندگی کی مسلمہ اقدار کو ایک ایسے نئے زاویے سے دیکھنے کا رجحان بھی ملتا ہے کہ ان اقدار کے مضحکہ خیز پہلو اُبھر کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں خدا کے ساتھ شریر لڑکوں کا سا برتاؤ اس کے بہت سے اشعار میں موجود ہے اور غالباً یہی شریرانہ انداز ہے جس سے خیامؔ نے زاہد کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں خیامؔ کی یہ رباعی بہت مشہور ہے:۔

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتہ مستی ۔۔۔ بگذر ز کہ بگسستی و چوں پیوستی

زن گفت چنانکہ مے نمایم ہستم ۔۔۔ تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

لیکن اگرچہ زاہد سے چھیڑ چھاڑ کا رجحان خیامؔ کے ہاں موجود ہے تاہم دراصل اس ضمن میں اوّلیت کا سہرا سعدیؔ شیرازی کے سر ہے اور وہ اس طرح کہ خیامؔ نے جو بات اپنی رباعیوں میں صاف صاف اور کھلے انداز میں کہی سعدیؔ نے اسے ذرا چھپا کر پیش کیا اور یوں بالواسطہ انداز اختیار کر کے طنز کے ایک اہم اصول کی پیروی کی۔ سعدیؔ کا مشہور شعر ہے:

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خوردہ مگیر

کیں گناہ ایست کہ در شہر شما نیز کنند

طنز میں ایک نئے رجحان کی عکاسی کرتا ہے چنانچہ یہاں بات کو کھلے بندوں اور سپاٹ انداز سے پیش کرنے کی بجائے بالواسطہ طریق سے پیش کرنے کی کوشش صاف ظاہر ہے۔

رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی اس رَو کے ترجمان خیام اور سعدی کے علاوہ خسرو اور حافظ بھی ہیں لطفِ ادا اور جدتِ اسلوب کے مرشد سعدی تھے لیکن اس ضمن میں امیر خسرو نے بھی اسلوب کے سینکڑوں نئے پیرایے پیدا کیے خسرو کا مشہور شعر

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

اس کے اسلوب کی جدت کا نمایاں ثبوت ہے۔

لیکن فارسی ادب میں رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں سب سے اہم نام حافظ شیرازی کا ہے حافظ کے کلام میں مسرت و بہجت کا عام انداز ان کے بات کرنے کا انوکھا ڈھنگ اور ان کی زاہد اور محتسب پر برجستہ اور مہذب چوٹیں اپنی مثال آپ ہیں ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را   خاک بر سر کن غمِ ایام را

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند   قولِ ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست

گر ز مسجد بخرابات شدم عیب مگیر   مجلسِ وعظ دراز است و زمان خواہد شد

طنزیات و مضحکات کی تیسری قابلِ ذکر رَو پیروڈی یا تحریف کی رَو ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایران میں ایسے تحریف نگار پیدا ہوئے جن کی تحریفیں پیروڈی کے معیار پر پورا اترتی ہیں بلکہ صرف یہ کہ فارسی زبان کے محدود طنزیہ و مزاحیہ ادب میں یہ رَو موجود ضرور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں اسے وہ فروغ حاصل نہیں ہوا جو اس کا فطرتی حق تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ ایران کی فضا تحریف کے لیے بے حد سازگار تھی اور تحریف نگاری کے بیشتر عناصر بھی ایرانی معاشرت میں موجود تھے تاہم جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ایک تو بعض مذہبی قیود نے طنز و تحریف کو پنپنے کا موقع نہیں دیا اور دوسرے ایرانی عوام اور ادباء میں اغماض و درگزر کی وہ جملہ خصوصیات بھی موجود نہیں تھیں جو طنز و تحریف کے فروغِ بے مثال کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ چنانچہ فارسی ادب میں طنز کی طرح پیروڈی کے فروغ کی ممکنات بھی دب کر رہ گئیں۔

لیکن اس سب کے باوجود فارسی ادب میں تین ایسے تحریف نگار ضرور ملتے ہیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری ہے ـــــ عبید زاکانی، ابو اسحاق اطعمہ اور نظام الدین محمود قاری یزدانی البسہ۔ ان میں سے عبید زاکانی اپنی تحریفات کے علاوہ نظم و نثر میں طنزیہ طریقِ کار کے لیے بھی بہت مشہور ہیں۔ جہاں تک تحریفات کا تعلق ہے عبید زاکانی نے زیادہ تر ان کا سہارا لے کر بعض فارسی شعراء کے کلام کا اس طریق سے مضحکہ اڑایا ہے کہ خود ان شعراء کی تضحیک ہو سکے۔ براؤن[1] کے قول کے مطابق ان تحریفات میں سے بیشتر نچلے درجے کی ہیں اور

---

[1] Browne—Literary History of Persia, Vol III, P. 299

ایرانی انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ البتہ طنزیات و مضحکات کے ضمن میں عبید زاکانی کی بعض تصنیفات یقیناً قابلِ قدر
ہیں۔ مثلاً "اخلاق الاشراف" میں انھوں نے اپنے زمانے کے پست اور غیر اخلاقی رجحانات پر زوردار طنز کی ہے۔ اسی طرح
انھوں نے "تعریفات" میں بعض چھپی ہوئی بے اعتدالیوں کو منظرِ عام پر لانے اور سماج کے بعض مخصوص میلانات کو ہدفِ طنز بنانے
کی کوشش کی ہے۔ عبید کی دوسری تصانیف "ریش نامہ" اور "موش و گربہ" بھی طنز و مزاح کے سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان کے دوسرے اہم تحریف نگار ابو اسحاق اطعمہ ہیں۔ اطعمہ نے بہت سے فارسی شعراء کا کلام تحریف کیا ہے
اور اپنی تحریفات میں التزاماً کھانوں کے نام گنوائے ہیں۔ اطعمہ کی تحریفوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اور اصل کلام میں
اگر کوئی ربط ہے تو صرف اس قدر کہ اصل کلام اور تحریف دونوں کی زمین ایک ہی ہے۔ چنانچہ یہ تحریفیں پیروڈی کا کوئی بلند نمونہ
پیش نہیں کرتیں۔ اطعمہ کی تحریف کا انداز کچھ اس قسم کا ہے۔ شاہ نعمت اللہ کا ایک قطعہ تھا ؎

گوہرِ بحرِ بے کراں ماییم — گاہ موجیم و گاہ دریاییم
ما بدین آمدیم در دنیا — کہ خدا را بخلق بنماییم

اطعمہ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاک معرفت ماییم — گہ خمیریم و گاہ بغراییم
ما ازاں آمدیم در مطبخ — کہ با ما بچہ قلیہ بنماییم

اطعمہ کی بیشتر تحریفات ان کی کتاب "کنز الاشتہا" میں موجود ہیں۔ یہ کتاب پہلے نایاب تھی لیکن ۱۸۸۵ء میں مرزا حبیب
اصفہانی نے اس کا ایڈیشن نکالا اور عوام پہلی بار اس سے متعارف ہوئے۔

ابو اسحاق اطعمہ نے تو پھر بھی ایک نیا راستہ نکالا۔ لیکن فارسی زبان کے تیسرے تحریف نگار یعنی البسہ نے محض اطعمہ کی
نقل پر ہی اکتفا کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہاں ابو اسحاق اطعمہ تحریف کرتے ہوئے مختلف کھانوں کے نام لیتا تھا وہاں البسہ نے
ان کی جگہ مختلف لباسوں کے نام لینے شروع کیے اور اسی نسبت سے اپنا تخلص البسہ رکھا۔ ان کے علاوہ فارسی زبان میں اور
کوئی قابلِ ذکر تحریف نگار نہیں۔ البتہ جدید ترین فارسی ادب میں صحیح پیروڈی کی طرف رجحان عام ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میرزا ابوالحسن
خندق یغما، مرزا جلال الدین اور ذبیح اللہ بہروز کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان و ادب میں طنز و مزاح کی آخری رَو وہ ہے[1] جو ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۹ء کے انقلابات کے بعد نمودار ہوئی اور
جو آج بھی سرزمینِ ایران میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ طنز و مزاح کی اس رَو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے
کہ اس پر پہلی بار ایران کی سیاسی بیداری نے نمایاں اثرات مرتسم کیے ہیں چنانچہ اس کا مزاج بھی زیادہ تر صحافتی ہے دوسری خصوصیت
اس رَو کی یہ ہے کہ اس پر پہلی بار طنز و مزاح کے مغربی نظریات نے اثر ڈالا ہے بنتیجۃً ایرانی ادباء کے ہاں طنز و مزاح کے مغربی

---

[1] اس سلسلے میں "نخستین کنگرہ نویسندگانِ ایران" تیرماہ ۱۳۲۵ مطبوعہ تہران میں ڈاکٹر پرویز خانلری کے مقالے "نثر فارسی
در دورۂ اخیر" کا مطالعہ ضروری ہے۔

حربوں کے استعمال کی طرف ایک تازہ رجحان بھی ملتا ہے۔

آج کے فارسی ادب اور صحافت میں طنز و مزاح کے سلسلے میں مرزا علی اکبر دہخدا کا نام قابلِ ذکر ہے کہ روزنامہ "صور اسرافیل" کا فکاہی کالم "چرند و پرند" ان ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ویسے دہخدا نے اپنے ملک کے ان طبقات کو زیادہ تر ہدفِ طنز بنایا ہے جو ایران کی ترقی میں سدِ راہ تھے۔ اسی طرح صادق ہدایت اور مسعود فرزاد نے سیاست اور سماج پر نکتہ چینی کے سلسلے میں نام پیدا کیا ہے — اور فریدوں تولّلی نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے طنز کا وسیع استعمال کیا ہے۔ ان کے علاوہ طنز و مزاح کے سلسلے میں ابوالقاسم حالت اور مہدی سہیلی کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

جدید فارسی دور کی ایک یہ خصوصیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں بعض خالص مزاحیہ روزنامے مثلاً "حاجی بابا" "باباشمل" "توفیق" اور "چلنگر" بھی منصۂ شہود پر آئے لیکن اب ناگزیر حالات کے باعث یہ سارے روزنامے بند ہو چکے ہیں۔

اُردو ادب میں طنز و ظرافت

کلیم الدین احمد

(۱)

زندگی درد و غم کا دوسرا نام ہے۔ ہماری زندگی ہی ہماری مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ستائے جانے کے لیے لائے گئے ہیں۔ انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول لاپروا۔ انسان حساس ہے اس لیے اس کا دل بہ آسانی رنج و الم کا نشانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں فطرت نے ایسی امنگیں، ایسی تمنائیں ڈال دی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں، ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن جہاں اس کی تمناؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اس کی تکلیفوں کی داستان شروع ہو گئی۔ کیونکہ جس دنیا میں اسے لایا گیا ہے وہ اس کی تمناؤں کی مطلق پروا نہیں کرتی۔ یہ دنیا نہ اس کی تمناؤں سے آگاہ ہے اور نہ ان سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ کمزور لیکن حساس انسان اس بے حس لیکن طاقتور دنیا سے ٹکراتا ہے اور تکلیفیں سہتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن یہ پوری حقیقت نہیں۔ اگر یہی پوری حقیقت ہوتی تو شاید زندگی دشوار ہو جاتی۔ زندگی میں ایسے واقعات، ایسے مناظر، ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب انسان اس تلخ حقیقت کو ذہنی طور پر بھول جاتا ہے۔ پس منظر میں ہمیشہ یہی تلخ حقیقت ایک مہیب دیو کی طرح موجود رہتی ہے لیکن پیش منظر میں اکثر ایسے واقعات، ایسے مناظر، ایسے متبسم لمحے بھی ملتے ہیں کہ انسان اس خوفناک اور تاریک پس منظر کے باوجود بھی مسکرا اٹھتا ہے یا قہقہہ بلند کرتا ہے۔ یہ واقعات، مناظر اور لمحے بھی زندگی کے اجزا ہیں اور جو حضرات انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ یونان کے گریاں فلسفی کی طرح زندگی سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے۔

کہا گیا ہے کہ انسان ہنسنے والا جانور ہے۔ یہ پوری حقیقت نہیں لیکن اس مقولے میں انسان کی ایک اہم خصوصیت کا انکشاف ہے۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہم ہنستے ہیں جیسے ہم غصہ کرتے ہیں، نفرت یا محبت کرتے ہیں، جاگتے یا سوتے ہیں اور ہنسی ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کر لیا جائے اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ ہو جائے لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں اور نہ ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شے مکمل، موزوں و مناسب ہو وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی عموماً عدم تکمیل یا بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جسے اس کا احساس نہیں یعنی جسے ہنسی نہیں آتی اسے ہم انسان شمار نہیں کریں گے۔ ادب میں انسان کے تمام دماغی اوصاف، اس کے سارے

حواس کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے۔ ادب زندگی، زندگی کے ہر شعبے، زندگی کے نشیب و فراز، زندگی کے جملہ محاسن و معائب کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اس لیے ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے۔ زندگی کے تمسخر انگیز پہلو کی عکاسی ادب میں اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے رقت انگیز پہلو کی۔ زندگی میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ ہم روتے بھی ہیں اور پھر ہنستے بھی ہیں۔ ادب اس روشنی اور تاریکی، اس خوشی اور غم، اس ہنسی اور آنسو کا آئینہ ہے۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا وہ حصہ جو ہنسی کا ترجمان ہے زیادہ اہم نہیں، یہ محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور بس۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ سنجیدہ، متین زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر وقت اہم، پیچیدہ اور گہرے امور میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس لیے اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے تفریح طبع کی، دل بہلانے کی، دماغ میں شگفتگی پیدا کرنے کی۔ جس طرح ہم روزانہ کام کی تھکن، یک رنگی، دشواری سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لیے سنیما چلے جاتے ہیں بجنسہٖ اسی طرح ہم سنجیدہ مشکل تحریروں کے مطالعہ سے تنگ آجاتے ہیں تو ان ہلکی، لطیف تحریروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے سنجیدہ تحریروں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط ہے۔ موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل ہو یا ہلکا، دشوار ہو یا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادہ، غرض ہر قسم کا موضوع محض خام مواد ہے جس سے ادیب مصرف لیتا ہے، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو وہ ہر قسم کے موضوع پر اپنے آرٹ کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے اور پڑھنے والا دونوں قسم کی تحریروں (سنجیدہ اور مزاحیہ تحریروں) کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ موضوع مزاحیہ سہی لیکن اگر ادیب نے اپنے موضوع پر بحث کرنے میں صنعت کارانہ سنجیدگی سے کام لیا ہے تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اردو انشا پرداز اس حقیقت سے واقف نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے اس لیے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت مسلّم ہے۔ ہم محض اس ناتمامی کے احساس کا اظہار کر سکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے احساس میں پہلے احساس کا وجود ضروری ہے لیکن پہلے احساس کے ساتھ دوسرے احساس کا وجود لازمی نہیں۔ پہلے قسم کے احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے، دوسرے کا نتیجہ ہے طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہشمند نہیں۔ ہجوگو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص و ناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیل، حسن، موزونیت، انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبے سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ اور منزلیں جدا جدا ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ کرنا عموماً دشوار ہے۔

خالص ظرافت نگار ہو یا ہجوگو، دونوں صناع ہیں۔ دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا۔ وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بارِ دگر کرتا ہے اور اسے دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع اور بوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لیے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ

ست نظر ضروری ہے۔ وہ دنیا کے ہر گوشے، زندگی کے ہر شعبے سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کا مواد ہر جگہ ہے اور اگر اسے
تک احساس ہے تو وہ کسی چیز سے قصداً احتراز نہیں کرے گا: وہ اپنا مواد کاوش کے ساتھ جمع کرتا ہے، اس پر
وہ کی کو یا بصری کو رنگین تخیل، رعنائی خیال کی مدد سے پیدا کرتا ہے اور دیکھی ہوئی یا تصور کی ہوئی چیزوں کو صنعت کارانہ
سے پیش کرتا ہے۔ اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا۔ وہ صناع ہے حامی اصلاح نہیں۔ اس کے
ع معنوں میں تخلیقی ہوتے ہیں۔ یہ کارنامے ہماری تفریح کا باعث ہوتے ہیں لیکن تفریح اصل مدعا نہیں۔ اس کا مقصد ایک حسین،
ارنامے کی تخلیق ہے۔ جو تفریح ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ ایک حد تک اتفاقی ہے۔

ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے لیکن اور کسی قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجوگو
الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجوگو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بے رحمی، ریاکاری
کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کی ہجویں انہی جذبات
تی ہیں۔ وہ بھی صناع ہے اس لیے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے
کے باوجود علیحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر انھیں اپنے قابو میں لا کر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا
ں صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔ ہجوگو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے
ے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن ہجوگو انسان ہے اور انسانی
ھرا ہوا ہے اس لیے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی ہجووں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت
ں ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبہ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے
جوگو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف، فیاضی کے جذبات
ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا
ع وکشادہ ہے۔

(۲)

ہجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ نظم و نثر۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور جو فرق ہے تو
ب لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی وزن۔ اگر وزن نہ ہو تو پھر ہجو یہ نظم و نثر میں تمیز ممکن نہیں۔ شاعر اور نثر نگار دونوں ہجو کے میدان
ب ہی مقصد لے کر گامزن ہوتے ہیں۔ دونوں کی راہیں اور منزلیں ایک ہیں۔ صرف ایک اشہبِ وزن پر سوار اور دوسرا پا پیادہ
یہ طرزِ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شعر اور نثر میں اہم اور بنیادی فرق ہے۔ وزن شعر میں ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں۔ دورِ حاضر میں بعض
راء نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وزن شعر کی لازمی خصوصیت نہیں۔ وہ ایک مخصوص صورت میں اپنے احساسِ شعری کی ترجمانی کرتے
ے نظم معریٰ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نثر کے جملہ کو وزن کے جامہ سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ شعر کے زمرہ میں داخل
ہو سکتا۔ شعر ہمارے تجربات، حسین و بیش قیمت تجربات کا حسین و موزوں اور کامل ترجمان ہے۔ نثر میں ہمارے خیالات کا صاف

حواس کو بروئے کار لایا جاتا ہے ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے۔ ادب، زندگی، زندگی کے ہر شعبے، زندگی کے نشیب و فراز، زندگی کے جملہ محاسن و معائب کی ترجمانی کرتا ہے، ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اس لیے ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے۔ زندگی کے تمسخر انگیز پہلو کی عکاسی ادب میں اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے رقت انگیز پہلو کی۔ زندگی میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی، ہم روتے بھی ہیں اور پھر ہنستے بھی ہیں۔ ادب اس روشنی اور تاریکی، اس خوشی اور غم، اس ہنسی اور آنسو کا آئینہ ہے۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا وہ حصہ جو ہنسی کا ترجمان ہے زیادہ اہم نہیں، یہ محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور بس۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ سنجیدہ، متین زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر وقت اہم پیچیدہ اور گہرے امور میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس لیے اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے تفریح طبع کی، دل بہلانے کی، دماغ میں شگفتگی پیدا کرنے کی۔ جس طرح ہم روزانہ کام کی تھکن، یک رنگی، دشواری سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لیے سینما چلے جاتے ہیں بجنسہ اسی طرح ہم سنجیدہ مشکل تحریروں کے مطالعہ سے تنگ آجاتے ہیں تو ان ہلکی، لطیف تحریروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے سنجیدہ تحریروں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط ہے۔ موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل ہو یا ہلکا، دشوار ہو یا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادہ موضوع ہر قسم کا موضوع محض خام مواد ہے جس سے ادیب مصرف لیتا ہے، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو وہ ہر قسم کے موضوع پر اپنے آرٹ کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے اور پڑھنے والا دونوں قسم کی تحریروں (سنجیدہ اور مزاحیہ تحریروں) کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ موضوع مزاحیہ سہی لیکن اگر ادیب نے اپنے موضوع پر بحث کرنے میں صنعت کارانہ سنجیدگی سے کام لیا ہے تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اردو انشا پرداز اس حقیقت سے واقف نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ہنسی عدم تکمیل، اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی بہی ناتمامی ہے اس لیے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت مسلم ہے۔ ہم محض اس ناتمامی کے احساس کا اظہار کر سکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے احساس میں پہلے احساس کا وجود ضروری ہے لیکن پہلے احساس کے ساتھ دوسرے احساس کا وجود لازمی نہیں۔ پہلے قسم کے احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے، دوسرے کا نتیجہ ہے طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہشمند نہیں۔ ہجوگو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص و ناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیل، حسن، موزونیت، انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبے سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ اور منزلیں جدا جدا ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ کرنا عموماً دشوار ہے۔

خالص ظرافت نگار ہو یا ہجوگو دونوں صناع ہیں۔ دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا۔ وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بارِ دگر کرتا ہے اور اسے دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع اور بوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لیے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ

اس حسنِ صورت کا وجود لازمی ہے۔ سوداؔ اس حسنِ صورت سے واقف نہ تھے۔ ان کے تخیل کی سبک روی اور بلند پروازی نے اور تخیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ان کی نظموں کو ضرورت سے زیادہ طویل اور ڈھیلی بنا دیتی ہے۔ اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو ان کے مخمس میں اضافہ ممکن تھا۔ اس فراوانی کے ساتھ سوداؔ ضرورت سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا بڑا عیب ہے لیکن مبالغہ بجائے خود کوئی بری شے نہیں۔ یہ شاعری اور دوسرے فنون کے لیے ضروری بھی ہے اور حسین بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کہتا ہے کہ مبالغہ آرٹ کی جان ہے۔ یہ سب صحیح لیکن مبالغہ جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اہم ترین عیب بن جاتا ہے مثلاً اس گھوڑے کی ہجو میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں ؎

کہتا تھا کوئی ہے یہ کوہی نہیں یہ اسپ | کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ | کتوال نے گدھے پہ مجھے کیوں کیا سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز | فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دو چار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم | اس ماجرے کے مُسن کیا دونوں نے اس کو ذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر | پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دُم کمہار
بدشیمی اس کی دیکھ کے کر خر کس کا خیال | لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بے شمار

پہلے دو شعر تک مضائقہ نہ تھا۔ یہاں جائز حد تک اس گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے لیکن بقیہ اشعار میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلے شعر میں کہنے والے واقعی گھوڑے کو "یرکوہی" یا ولایت کا حمار نہیں سمجھتے۔ دوسرے شعر میں بھی کہنے والے نے محض ظرافت، اچھی ظرافت سے کام لیا ہے لیکن بعد کے شعروں میں اس گھوڑے کو واقعی گدھا تصور کیا گیا ہے اور پھر اسے خرس بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ذوقِ لطیف کے لیے بے لطفی کا سبب ہوتا ہے پھر یہاں تکرار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ گھوڑے کو گدھے سے تشبیہ دی جا چکی ہے پھر بار بار اسی تشبیہ کی تکرار مذاقِ صحیح پر گراں گزرتی ہے۔ تکرار بھی سوداؔ کا ایک عام نقص ہے۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار مختلف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو دلچسپ ضرور ہے لیکن اپنی دلچسپی کے باوجود بھی یہ بلند پایہ ہجویہ شاعری کی مثال نہیں، یہاں موضوع اہم نہیں، جذبات کی شدت بھی نہیں اور نہ مختلف عناصر کی شدت کے ساتھ آمیزش ہوتی ہے۔ غرض یہاں ایک بھی ایسا عنصر نہیں جو بلند پایہ شاعری کے لیے ضروری ہے۔ یہی کمی دوسری نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ دوسری ہجووں میں فدوی، ضاحک، حکیم غوث، شیدی فولاد خاں کوتوال، دولت مند بخیل وغیرہ کو طنز کا شکار بنایا گیا ہے۔ "قصیدہ شہر آشوب" اور "مخمس شہر آشوب" میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ زیادہ اہم امور کی طرف توجہ کی گئی ہے لیکن ان سب نظموں کو پیشِ نظر رکھ کر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سوداؔ کا میدان تنگ ہے۔ وہ جملہ انسانی نقائص، سماج کی نا انصافیوں، مختلف طبقوں اور پیشوں، کل انسانیت کو حلقۂ ہجو میں داخل نہیں کرتے۔ سوداؔ میں سنجیدگی و متانت موجود تھی۔ اگر وہ سنجیدگی و متانت کو اپنی سب نظموں میں برقرار رکھتے، اگر وہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ اہم انسانی اور سماجی نقائص کا انکشاف روا رکھتے تو ان کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی۔ بہرکیف سوداؔ نے اچھی ہجویں لکھی ہیں۔ شیدی فولاد خاں کوتوال اس طرح اپنی لاچاری کا اظہار کرتا ہے ؎

خلق جب دیکھ کے یہ بیداد	کہتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار	گرم ہے جوتیوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول	میری پگڑی کا ہے سر پہ مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور	دیکھو لوٹنگ کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل	ہے امیروں کے گھر میں پر رحمل
دیکھیے گربناں کو بھی بخدا	ہاتھ میں ہے انھوں کے دُزدِ حنا
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی	چوری کرنے سے کون ہے خالی

یہ طنز کی عمدہ مثال ہے اور یہاں طنز ظرافت کے دوش بدوش ہے ؎

دیکھیے گربناں کو بھی بخدا
ہاتھ میں ہے انھوں کے دُزدِ حنا

سودا میں ظرافت کا مادہ طنز پر غالب ہے۔ غالباً اسی ظرافت کی ہمہ گیری کی وجہ سے ان نظموں میں شدتِ جذبات کی کمی ہے۔ "مخمس شہر آشوب" کے علاوہ شاید ہی کہیں پُر اثر اور شدید جذبات کی مثالیں مل سکیں۔ سودا ایسے شگفتہ طبیعت واقع ہوئے ہیں کہ وہ غصب، نفرت، حقارت اور اسی قسم کے تیز و تند جذبات سے آشنا نہ تھے۔ وہ غصے ہوتے تھے لیکن ہجو لکھ کر اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے یعنی غصہ انھیں ہجو گوئی پر آمادہ کرتا لیکن جہاں انھوں نے قلم اٹھایا جہاں ان کا تخیل مائل بہ پرواز ہوا تو پھر غصہ فرو ہو جاتا اور رہا سہا کے بدلے ان کے دماغ میں نئے نئے مضامین، انوکھے خیالات، دلچسپ، رنگین، جاذبِ نظر تصویروں کی آمد سے انھیں ایک قسم کی مسرت ہوتی اور ان کی نظم غضب کے بدلے اس مسرت کا اظہار ہوتی۔ وہ مسرت جو ایک صناع کو اپنے کارنامے کی تخلیق میں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قاری کبھی غضب ناک اور برہم نہیں ہوتا بلکہ قوتِ ایجاد اور اس کے حسین و دلکش نتائج کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ مثل روزِ روشن ہے کہ سودا کی ہجویہ شاعری کے نقائص و حدود کے باوجود اردو میں اس وقت تک سودا سے بہتر کوئی دوسرا ہجوگو شاعر نہیں پیدا ہوا۔

تعجب ہے کہ شعراء مابعد پر سودا کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ سودا کے بعد اکبر کا نام آتا ہے لیکن اکبر نے سودا سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ وسعت اور تنوع مضامین کے لحاظ سے اکبر کو سودا پر فضیلت حاصل ہے لیکن اس فضیلت کا ذمہ دار اکبر کا عہد ہے اس عہد کی تصویر عبدالماجد صاحب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے :-

"اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامتِ اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے، اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے...... نفاق، خود غرضی و غداری، نفس پرستی اور

عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا
ہے۔ دادخواہی کے لیے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں۔ سفر
کے لیے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لیے انگریزی شفاخانے ہیں۔۔۔ عزت و شکوہ
کے لیے انگریزی عہدے ہیں۔ حصولِ معاش کے لیے انگریزی پیشے ہیں، زینت و آرائش
کے لیے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں غرض جس طرف بھی رُخ پھرتا۔ حدِ نظر
تک ایک غیر محدود و لامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا۔۔۔۔۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیارِ کمال یہ قرار پایا کہ
انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت
ہو جائے۔ تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے لباس
انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندانی مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف
والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا فیصلہ یہ خیال
یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کیے جائیں۔۔۔۔ عقل و دانش
کا یہ مفہوم قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے
اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقاید و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب
دے کر انگریزیت کے صنمِ دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ یہ فضا تھی جس میں
اکبر نے آنکھیں کھولیں۔"

یعنی وہ زمانہ تھا جب دو مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا اور اس تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دلفریبی کا سکہ لوگوں پر جما رہا تھا، اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور حسنِ غیر میں نگاہیں محو تھیں۔ اکبر پرانے تمدن، پرانے نظام کے پرستار تھے اور وہ نئے تمدن، نئے نظام کے نقائص کا انکشاف کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کی طنز کے سامنے ایک نامحدود میدان نظر آیا کیونکہ انگریزی تمدن کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ سودا کے سامنے یہ نامحدود نہیں تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے لیکن انگریزی تمدن نے اپنا جادو شروع نہیں کیا تھا۔ سودا زیادہ سے زیادہ مٹنے والی تہذیب، لٹتی ہوئی شان و شوکت، گذری ہوئی عظمت کو حسرت بھری نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف زمانے میں انتشار کی صورت نمایاں تھی۔ پراگندگی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہ پراگندگی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ سودا اسی پراگندگی کا ماتم اپنے مخمس "شہر آشوب" میں کرتے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں سماج کی وہ طنز یہ تنقید ممکن ہی نہ تھی جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ اکبر کا قدم پرانی تہذیب پر جما ہوا تھا اور وہ اس محفوظ و مثبت مقام سے نئی تہذیب کی بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں اور تن تنہا اس یلغار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد میں اپنی فطری طنز و ظرافت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی تیز اور باریک بیں نگاہیں دشمن کی کمزوریوں کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ ان کمزوریوں کی اپنی طنز و ظرافت سے قلعہ و برید کرتے ہیں۔

مضامین کی وسعت اور تنوع مسلّم ہے لیکن اکبر سودا کے مرتبہ تک نہیں پہنچتے کیونکہ ان کا آرٹ سودا کے آرٹ سے بنیادی طور پر کم مرتبہ ہے۔ سودا اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ضرورت سے زیادہ طولانی اور تفصیلی ہیں پھر بھی وہ نظمیں ہیں۔ اکبر نہایت مختصر قطعے، رباعیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جس قسم کی ہجویں اکبر لکھتے ہیں ان کے لیے یہ مختصر سانچے زیادہ موزوں ہیں۔ اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی جس قسم کے سانچے اکبر کی نظموں میں ملتے ہیں وہ سانچوں کی حیثیت سے نسبتاً کمتر ہیں۔ ان سانچوں میں وسعت پیچیدگی ممکن نہ تھی۔ ان کی تنگ دامانی ان کا اصل نقص ہے۔ اکبر کا آرٹ مختصر تصویریں یا نقشے بنانے کا ہے اور یہ مختصر تصویریں حسین بھی ہیں اور موثر بھی اور اپنے مقصد میں کامیاب، ملاحظہ ہو؂

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور — بھینس کو کون بہا دیجیے عاشق ہو جائیں

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلۂ من — کچھ حدیثیں ہیں ایک ٹنٹا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس — ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی — چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر — پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

یہ ہے اکبر کا آرٹ مختصر پیمانہ میں وہ ایسی ہجویں لکھتے ہیں جو تیر بہدف ہو جاتی ہیں وہ ایسے ایسے شعر تراشتے ہیں جو نشتر کی طرح دلوں میں چبھتے ہیں۔ وہ ان شعروں کے تراشنے میں کاوش سے صرف لیتے ہیں اور جانفشانی کے ساتھ ان کی جلا، تیزی، کاٹ کو حدِ کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ اکثر یہ اشعار یا مختصر قطعے دماغ میں ہیجان برپا کرتے ہیں اور ایک وسیع منظر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور قاری اس منظر کے پھیلتے ہوئے دامن میں گم ہو جاتا ہے؂

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں — گفتنی در رنج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

یہ مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئی ہیں۔ ان شعروں میں محض ایک مختصر خیال کا اظہار نہیں۔ ہر شعر گویا ایک تنگ رستہ ہے جس سے گزر کر ہم کسی وسیع میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ جو بات ان شعروں میں کہی گئی ہے وہ بجائے خود زیادہ اہم نہیں اصل اہمیت ان باتوں کی ہے جو کہنے میں نہیں آئی ہیں جنھیں قاری اپنے ذہنِ رسا کی مدد سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ آرٹ سودا کی نظموں میں نہیں ملتا، سودا سب باتیں تفصیل سے کہہ ڈالتے ہیں۔ اکبر کچھ کہتے ہیں اور باقی خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن سب کچھ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور کہیں بھی خیالات مبہم اور غیر متعین نظر نہیں آتے۔ بہرکیف سودا کی نظموں میں یہ آرٹ نہیں ملتا اور نہ سودا کو اس آرٹ کی ضرورت تھی۔ جن سانچوں کا استعمال سودا کرتے تھے وہ تنگ داماں نہ تھے ان میں ہر قسم کی وسعت،

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں ‏ مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے ‏ واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ‏ ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر ‏ وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین ‏ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں ‏ مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف ‏ پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

صاف ظاہر ہے کہ ان شعروں میں اقبال نے اکبر کا تتبع کیا ہے۔ سطحی نظر غالباً ان میں اور اکبر کے شعروں میں تمیز بھی نہیں کر سکتا
خیالات، طرز بیان، اب و لہجہ، اختصار غرض سبھی خصوصیات وہی ہیں جو اکبر کی ہجووں میں ملتی ہیں لیکن دوسرے اشعار سے پتہ چلتا ہے
کہ یہ رنگ اقبال کے لیے فطری نہ تھا اور وہ طبیعت پر زور دے کر اس قسم کے اشعار موزوں کرتے ہیں۔ اقبال میں وہ شوخی تو تھی
شگفتہ مزاجی نہ تھی جو روز ازل سے داتا اور اکبر کو فطرت نے ودیعت کی تھی۔ ان کا دل کنول کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ و متین طبع
ہوتے تھے اس لیے جب وہ ہنسنے ہنسانے پر اتر آتے ہیں تو ان کی ہنسی مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ان کی ظرافت میں آورد کی
جھلک ہوتی ہے ـــ

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصد خودکشی کیسا
یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ اے جان جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرایے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

یہاں وہ سبکی، وہ تیزی نہیں جو اکبر کے شعروں میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش طبعی پر آمادہ ہے۔ غالباً
اقبال نے خود محسوس کیا کہ اس رنگ میں وہ نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اس لیے انھوں نے اس راہ کو جلد ترک کر دیا لیکن ان
کی دوسری نظموں میں جو قصداً متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان میں وہ اکثر قصداً یا بلاقصد طنز سے مصرف
لیتے ہیں۔ ان نظموں میں وہ اکبر یا کسی دوسرے شاعر کی تقلید نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم کر لیا ہے۔ بعیت
"ایک بحری قزاق اور سکندر" "موسولینی" "اجتہاد" "جہاد" "پنجابی مسلمان" یہ چند مثالیں ہیں جو "ضرب کلیم" میں ملتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر
ہم ہنستے نہیں زیادہ سے زیادہ متبسم ہوتے ہیں۔ اکثر تبسم کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں طنز خالص طنز ہے اور یہ طنز اقبال کی
سنجیدگی و متانت کی کامیاب ترجمان ہے۔ "نفسیاتِ غلامی" ملاحظہ ہو ـــ

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی ‏ خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ظاہر ہے کہ یہ طنز زیادہ رنگین اور متنوع نہیں لیکن یہاں کسی کی تقلید نہیں۔ یہ رنگ انفرادی ہے اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر شعرا سیاست، مذہب اور مذہبی پیشوا، مروجہ اخلاق کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ یہ سب بلاواسطہ یا بالواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال سے متاثر ہوئے ہیں لیکن جوش کے علاوہ کوئی ذکر کا مستحق نہیں۔ جوش میں ایک حد تک طنز و ظرافت کا مادہ موجود ہے۔ "مولوی" "خانقاہ" "شیخ" میں یہ مذہب کی بعض صورتوں کی ہجو کرتے ہیں۔ اس طرح اکثر سیاست کے میدان میں بھی جا نکلتے ہیں لیکن جوش کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو (اور یہ خیالات نئے، انفرادی نہیں) بہت اہم سمجھتے ہیں اس لیے وہ ان سے اپنی شخصیت کو علیحدہ نہیں کر سکتے یعنی ان کے خیالات ذاتی رہتے ہیں عالمگیری اختیار نہیں کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الاماں! خانقاہ کی دنیا — معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا — کام لیتے ہیں سکہ سازی کا
ہر ادا میں ہے ناجرانہ کمال — ہر نفس مو ہے ایک دستِ سوال
کون بہتر ہے ابرِ دریا باری — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

یہ خانقاہ کی دنیا کی ہجو نہیں اپنی عذر داری ہے۔ قاری شاید وقتی طور پر متاثر تو ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔

جوش مسلسل اشعار یا نظمیں لکھتے ہیں وہ اکبر کی طرح مختصر نظموں یا دو تین شعروں پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کی نظموں میں تکرار و مبالغہ کی وہ زیادتی نہیں جو سودا کا مخصوص عیب ہے۔ یہ سب سہی لیکن جوش کی ہجویہ نظموں میں اس دلچسپی کی کمی ہے جو سودا اور اکبر کی نظموں کی خصوصیت ہے اور دلچسپی کی کمی یا فقدانِ آرٹ میں سب سے زیادہ اہم عیب شمار کیا جاتا ہے۔

اس مختصر سی تنقید سے ظاہر ہو گیا کہ اردو میں صرف اکبر اور سودا ہجویہ شاعری کے میدان میں مستقل عزم کے ساتھ گامزن ہوئے اور اس میدان میں آگے بڑھے لیکن یہ دونوں بھی ایسے کارنامے نہیں پیش کر سکے جن کا مغرب کے اعلیٰ ہجویہ کارناموں کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ اس میدان میں سودا اور اکبر کی کاوشوں کے باوجود بھی لامحدود گنجائشیں باقی ہیں اور اگر اردو شعرا اس طرف توجہ کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن محض توجہ کافی نہیں۔ ہجو ایک فن، ایک اہم فن ہے، ہجویہ نظم ایک صنفِ شاعری، ایک دلچسپ اور اہم صنفِ شاعری ہے اور اس صنف میں بھی بلند پایہ شاعری ممکن ہے۔ اگر شعرا اس فن کے امکانات و مقاصد کو سمجھیں، اسے فن کی حیثیت سے برتیں اور جو خصوصیتیں ایک ہجوگو شاعر کے لیے ضروری ہیں انھیں بہم پہنچائیں تو ترقی ممکن ہے ورنہ نہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس سے اس صنفِ شاعری کی ترقی کی امیدیں وابستہ ہوں۔

(۳)

اُردو نثر میں طنز و ظرافت کی وہ کمی نہیں جو نظم میں ملتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نسبتاً نثر میں طنز و ظرافت کی افراط ہے اور اس
افراط میں بیسویں صدی کے مصنفین کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حضرات کی کافی تعداد ہو گئی ہے جو طنزیہ اور ظریفانہ مضا[illegible]
صرف لکھتے ہی نہیں بلکہ لکھنے پر مُصر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کمی کے الزام سے اُردو کے
دامن کو پاک کر دیا جائے۔ ان کے قلم سے مضامین کا سیلاب جاری ہے۔ وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ مضامین معیاری ہیں یا نہیں
وہ کیفیت کو کمیت پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ بہرکیف ان مصنفین اور انشا پردازوں کو تین گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے
پہلے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی [illegible]
نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ پُر مقصد ہے جو نقائصِ انسانی، سماجی، تمدنی
اخلاقی و سیاسی غرض ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے یا کم سے کم ان نقائص کو دیکھ کر برافروختہ ہو جاتا ہے۔ اس گروپ کے
انشا پرداز کا جذبۂ غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبۂ غضب کی اپنی ہجووں میں ترجمانی کرتا ہے۔ اس قسم کے انشا پرداز خالص
طنز کے عوض ظرافت اور تمسخر زیادہ تر طنز سے صرف لیتے ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ان کا نصب العین نہیں ہوتا لیکن اکثر وہ اس میں بھی کا[illegible]
ہوتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد کسی نقص کو رفع کرنا یا اپنے جذبۂ نفرت، غضب و حقارت کی ترجمانی ہے۔ تیسرا گروپ وہ ہے جن [illegible]
ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفۂ زندگی کی یا ان مشاہدوں کی جن پر اس فلسفہ کی بنیاد [illegible]
ظرافت آمیز نقاشی ہے۔

(۱) پہلے گروپ میں سب سے پہلا نام غالب کا ہے۔ غالب کی طرزِ تحریر کی خصوصیتوں کے بارے میں حالی لکھتے ہیں

"وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے
وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو
سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا
ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور مرزا
کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے
مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے
ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ
سے وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثرِ اُردو میں
بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹیکل، سوشل اور ریلجس مضامین
کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں۔ بائیوگرافی اور ناول میں متعدد کتابیں نہایت ممتاز
لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی

اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔"

میں تو یہ لکھوں گا کہ مرزا کی تحریر صرف خط و کتابت کے دائرے ہی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی بلکہ اس وقت تک بھی کوئی اُردو انشا پرداز بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے غالب کی تحریر کی مثال نہیں پیش کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کے بعد نثرِ اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹیکل، سوشل اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں۔ بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ غالب کی نثر ہر قسم کے موضوعات کے لیے موزوں و مناسب نہیں۔ اس کا دائرہ کسی حد تک محدود ہے اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ اکثر غالب اپنے خطوط میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ابھی تک اُردو میں جو خالص ظرافت کے نمونے، ایسے نمونے جو ادبی معیار پر بھی پورے اترتے نظر آتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں! اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں اس طرف توجہ کی گئی ہے اور متعدد مصنفین اس میدان میں اترے اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی غالب کی بلند مرتبت شخصیت کا حامل نہیں۔ کسی کا تخیل بھی غالب کے تخیل کی باریکی، تیزی، ندرت، بلند پروازی کو نہیں پہنچا۔ ان کی ذہنیت میں وہ گہرائی اور رنگینی نہیں جو غالب کی ذہنیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کہیں غالب کی شوخی، رنگینی، بے ساختگی، بوقلمونی، قوتِ ایجاد کی مثال بھی نہیں ملتی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی کی انشا ادبی معیار کے لحاظ سے غالب کی انشا کو نہیں پہنچتی۔

غالب کی زندگی میں ان کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگرچہ وہ عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن دنیا کی دولت و حشمت سے انھیں اس قدر میسر نہ تھا جتنا وہ چاہتے تھے۔ پھر بھی ان کی طبیعت میں غضب کا ابھار تھا جو کبھی انھیں نچلے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ان کی طبیعت کا ابھار ان کے ہر ہر لفظ، ہر ہر جملے سے ٹپکتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی وہی اُبھار ہے۔ اصل یہ ہے کہ ظرافت ان کی فطرتِ ثانی تھی۔ جہاں قلم اٹھایا اور ظرافت کے پھول جھڑنے لگے:-

"میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو۔ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے، یہاں ان کی سسرال میں قصّے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں اور بی بی نے افسوس کے دریا بہا دیے۔ خوشامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانندِ دیوار چپ، جی چاہتا ہے پھٹنے کو مگر ناچار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آئی۔ امام ضامن علیہ السلام کی نیاز کا روپیہ بازو پر باندھا، ۵۰ روپے خرچ راہ دیے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے عہد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب یہ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔"

یہاں صرف ظرافت ہی موجود نہیں بلکہ گویا غالب نے ایک زندہ سین پیش کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی قوتِ غالب

ہیں موجود تھی۔ وہ محض کسی شئے، کسی واقعہ، کسی سین کا بیان ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ پوری تصویر
صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ شوخی سے تو خطوط بھرے پڑے ہیں۔

"موسم بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی کوئی
ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب
فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا
اور بات ہے۔"

اس شوخی کے ساتھ متانت و سنجیدگی بھی موجود ہے لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثلاً جب یوسف مرزا
کو ان کے باپ اور ان کے بیٹے کی تعزیت میں خط لکھتے ہیں تو اس میں لہجہ سنجیدہ و متین ہو جاتا ہے اور الفاظ میں ایک خاص قسم کا اثر
آ جاتا ہے۔ شوخی و بذلہ سنجی سے وہ قطع نظر کرتے ہیں۔ تکلفات سے یک قلم کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور سیدھے سادے مؤثر
پیرایے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مثالوں اور ان جیسی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب صرف ہنسنے ہنسانے پر
قادر نہ تھے۔ وہ رونے رلانے کی بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس طرف انھوں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ غالباً ان کی شوخ طبیعت اور
ان کا فلسفہ "مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو" دونوں مانع آئے ورنہ اس قسم کی عبارتیں بھی بے مثل ہوتے:-

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، گرانی رکاب
میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے، زاد راہ موجود نہیں، خالی
ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اور اگر بازپرس ہوئی تو دوزخ جاوید ہے اور ہم
ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے"

اگر اردو انشا پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف
پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کر سکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جن میں فحش نہ ہو تو پھر وہ اپنی
راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔

غالب کے خطوط کے بعد "اودھ پنچ کی زعفران زار نظم و نثر" سامنے آتی ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں ہر قسم کے لوگ
تھے وہ مختلف مذاق بھی رکھتے تھے ...... اودھ پنچ کے مضامین کے متعلق چکبست نے یوں اظہار خیال کیا ہے:-

"قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم
اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت
اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف اور پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے
تو اردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیے ...... اودھ پنچ کے

ظریفوں کی شوخی و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی
ہیں جیسے کمان سے تیر...... ان کا ہنسنا غالب کی زیرلب مسکراہٹ سے الگ ہے۔
یہ خود بھی نہایت ہی بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر
مجبور کرتے ہیں۔"

کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن مجھے عسکری صاحب سے کامل اتفاق ہے کہ "اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔" بلکہ میں تو کہوں گا کہ بحیثیت مجموعی اودھ پنچ کی ظرافت کو ادبی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ "بذلہ سنجی و تمسخر" اور ظرافت کے ادبی مفہوم میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ جو طنز اور ظرافت اودھ پنچ کے مضامین میں ملتی ہے وہ کچی، خام، ناقص اور طفلانہ ہے۔ ان مضامین کی یہ خامی نہیں کہ ان میں غالب کی زیرلب مسکراہٹ نہیں ملتی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اودھ پنچ کے ظریف خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ زیرلب مسکراہٹ اور بے تکلف قہقہہ دونوں میں ادبی شان نمایاں ہو سکتی ہے۔ اودھ پنچ نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا تھا۔ یہ کام ایک حد تک ضروری بھی تھا اور مستحسن بھی لیکن پنچ نے جو خدمتیں انجام دیں وہ وقتی تھیں۔ ان کی اہمیت تاریخی ہے ادبی نہیں۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں ادبی شان کی نمایاں کمی ہے۔ جو ظرافت یہاں ملتی ہے وہ ادبی نہیں بازاری ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"وہ مارا۔ کیوں جی۔ تم لاکھ شور و غل مچایا کیے، ہم نے اپنی تہذیب کا لگا لگا ہی دیا۔
جڑے ہوئے کٹھل میں لگا لگا ناکیسا ہم سے کہیے تو بڑے بڑے بانس لگا دیں لیکن
یہ اتنی لمبی چوڑی باتیں ری کا ہے پر ہیں ذرا ہم بھی تو سنیں، آپ نے ابھی تک سنائی نہیں
ابھی بی زہرہ کا نکاح ہو گیا، مشتری کے بھی کوئی خریدار پیدا ہوتے ہیں۔ اب تو سب کی
سب رنڈیاں بقر نقرا کے بیٹھنے کو ہیں۔ خیریت سے ذرا نانی گڑھیا میں منہ دھو رکھیے،
خدا نخواستہ نہ اور رنڈیوں کو مراق نہ خفقان نہ آنو جی کی ری طبیعت ایسی نہ ٹھایاں گھر نہ
پڑیں تو کیا کریں۔"

اودھ پنچ کے پہلے دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین، سرشار، ظریف، ہجر، آزاد، شہباز، برق، شوق، اکبر کا نام خصوصیت
سے لیا جاتا ہے اور اس کے دوسرے دور میں سب سے ممتاز نام سید محفوظ علی صاحب کا شمار کیا جاتا ہے۔ میں خالص ظرافت
کے سلسلے میں سجاد حسین، سرشار اور محفوظ علی صاحب کا ذکر کافی سمجھتا ہوں۔ سجاد حسین اور سرشار دونوں نے اردو میں غالباً پہلی مرتبہ ایک
ظریف کردار پیش کیا ہے۔ حاجی بغلول اور خوجی کے کیرکٹر اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہی حقیقت کہ اردو ادب ابھی تک
کیرکٹر پیش نہ کر سکا اردو ادب کی ایک سنگین تنقید ہے۔ رشید احمد صاحب فرماتے ہیں:۔

"حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے "پک وک ابراڈ" کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص
چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حاجی بغلول اردو ظریفات، ظرافت
میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آیا۔"

اگر کوئی شے کسی خاص ادب میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو تو اس سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ حاجی بغلول اور پک وک میں وہی فرق ہے جو ایک مدھم شمع اور آفتاب میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حاجی بغلول کا کیریکٹر اُردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن جہاں کسی دوسرے ادب سے مقابلہ کیا پھر اس کیرکٹر کی تہی مائیگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حاجی بغلول صرف "ایک طور پر" اور "ایک حیثیت سے" ہی پک وک کا مکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ حاجی بغلول سراسر نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کی اہمیت یہی ہے کہ اس سے ایک نئی راہ کھلتی ہے۔ خوجی کا کردار حاجی بغلول سے بہتر ہے۔ یہاں کسی کا مکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ یہ ایک تخلیقی کام ہے کافی رنگین اور متنوع۔ خوجی خود ظریف ہیں اور اس ظرافت کا سبب ہیں جو دوسروں میں ہے۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور لوگوں کو ہنساتے بھی ہیں اور لوگ ان پر ہنستے بھی ہیں۔ وہ ایک منفرد ہستی رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت مختلف عناصر سے بنی ہے۔ خوجی کا کردار کسی ایک خصوصیت یا کسی خاص طرزِ گفتار پر مبنی نہیں اور ان کی شخصیت ان کے گفتار و کردار سے جھلکی پڑتی ہے۔ ان کے کردار پر دوسروں کے الفاظ اور اعمال سے مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت دوسروں کی شخصیتوں سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم کی وجہ سے ان کی ہستی پر نت نئی روشنی پڑتی ہے۔ خوجی کے کمالات کی فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں، فرماتے ہیں:-

"شنو میاں! خواجہ بدیع ہفت زبان ہے، وہ کون سی زبان ہے جس سے یہ واقف نہیں۔ فرمائیے — عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی سب میں عبور، انگریزی زبان کا بادشاہ۔"

پھر فرماتے ہیں:-

"حضرات سنیے آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم آدمی مستغنی ہوتا ہے اور میری استغنا سے بھی آپ خوب واقف ہیں۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا شاق گذرتا ہے اور وجہ کیا کہ ہم کسی سے دب نکلیں۔ جب طمع ہمارے مزاج میں چھو نہیں گئی۔ لالچ سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ حرص کے قریب نہیں جاتے ہیں پھر ہمارے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور امیر اور غریب اور مفلس سب یکساں۔"

خوجی نے دنیا دیکھی ہے۔ ان کے ساتھ مختلف و متنوع قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ساری دنیا نے ان کی قدر کی ہے۔

"مصر میں وہ اعزاز ہوا کہ سبحان اللہ! استنبول اور قسطنطنیہ میں تو وہ قدر افزائی ہوئی کہ زمانہ واقف ہے۔"

ہم خوجی کے اور محاسن کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن ان کی قوتِ ایجاد کی ضرور قدر کرتے ہیں ان کی قوتِ ایجاد بلا کی ہے بات کی بات میں وہ ایک ایک مرتب کر سکتے ہیں۔ "صف شکن علی شاہ" کی داستان ملاحظہ ہو:-

"حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لبِ چشمہ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم! یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے! یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ غور کر کے دیکھا تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت مگر دم کے دم میں چلے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے...... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چھوٹا سا

دریا تھا اِس طرف ہم اُس طرف غنیم، لب دریا مورچہ بندی ہوگئی اور گولیاں چلنے لگیں دفعتاً
بس خدا دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک کنکری لے کر
کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ اور ہزار ٹکڑے ہوگئی ......
ہیں مزے مزے افیون گھول رہا تھا اور افسر اور سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام
میں مصروف تھے کہ پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی - ہیں! یا الٰہی یہ تالیاں کس نے بجائیں
سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے - پیالی لبوں تک لے ہی گیا تھا کہ اوپر کور وسیوں
نے باڑھ ماری، کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح اور
مقتول ہوئے مگر واہ رے میں خدا گواہ ہے، پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی اب سُنیے کہ فوراً
صف شکن علی شاہ موجود اور میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ افیون سے تر کی اور زور سے چونچ
کھولی تو وہ قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو پھٹا تو ارارا دھوں اور لطف یہ کہ
اِدھر کا ایک آدمی ضائع نہ ہوا بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا - بٹیر کیا خدا جانے وہ
کون چیز بابا ب شے ہے۔"

خوجی کے کیرکٹر میں تین کیرکٹر پنہاں ہیں - خوجی جیسا وہ اپنے کو سمجھتے ہیں، خوجی جیسا انھیں ناول کے دوسرے کردار سمجھتے ہیں، خوجی جیسے وہ پڑھنے والوں کو نظر آتے ہیں - اس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے - پڑھنے والا اپنے زاویۂ نظر کے ساتھ ساتھ اور دونوں زاویوں سے بھی واقف ہے - ان سب خوبیوں کے باوجود بھی خوجی کا کیرکٹر ناقص ہے اور یہ نقص وہی ہے جو فسانہ آزاد کا عام نقص ہے یعنی تکلف اور اس تکلف کا لازمی نتیجہ ضرورت سے زیادہ طوالت اور خانہ پُری - بقول عبدالباری آسی صاحب :-

"نگاہِ خوردہ بین طوالتِ کلام کی وجہ سے ہر داستان کو لندھور بن سعدان کی داستان خیال
کرنے لگتی ہے ۔"

بہرحال خوجی اُردو میں ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

سجاد حسین اور سرشار نے زندہ کردار کی تخلیق کرنے کی کوشش، کم و بیش کامیاب کوشش کی تھی - سید محفوظ علی صاحب تمثیلیہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں - تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی نہایت دشوار ہے اس میں کامیابی کے لیے طاقتور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے - سید محفوظ علی میں یہ اوصاف موجود نہیں - "شیخ سماد اللہ صاحب کی صاحبزادیاں" تمثیلیہ کی صنف میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں - یہ ایک حد تک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا حُسن سطحی ہے - خیالات معمولی ہیں - اس میں نہ خطیبانہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف :-

"آسیہ (آہ سرد بھر کر) ہاں بہن سچ کہا، خدا کی شان کبھی ہم اس پڑوس میں تمیز والے سمجھے
جاتے تھے - سینا پرونا ہم جانتے تھے، کھانا پکانا ہم جانتے تھے آج پھوہڑ ہم، بدتمیز ہم،
گندے ہم مگر اس کی وجہ جانتی ہوں - آیا پیسہ آئی مت، گیا پیسہ گئی مت، گانٹھ میں دام تو
سب کریں سلام۔"

جن کی نگاہوں کے سامنے تمثیلیہ کی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں وہ اس قسم کی مثال سے مرعوب و متاثر نہیں ہو سکتے۔ میں نے
کہا ہے کہ یہ آرٹ نہایت دشوار ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس آرٹ کے جاننے اور برتنے والے اردو میں کوئی
نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محفوظ علی صاحب نے "پنچانہ رنگ" کو ترک کر کے اسپکٹیر سے قریب ہونے کی کامیاب اور مستحسن کوشش کی
خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں :-

"نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب ہی۔ اے ساکن بدایوں
ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور راز سر تا پا مرصّع ظرافت کوئی نہیں لکھتا
یا میرے علم میں نہیں ہے "

یہ تنقید نہیں تعریف ہے اور اس تعریف میں صحت صرف اس قدر ہے کہ محفوظ علی صاحب کا لب و لہجہ اودھ پنچ کے
مقابلہ میں زیادہ متین و سنجیدہ ہے۔ وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے
قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے سنجیدہ خیالات کا اظہار کرتے
ہیں لیکن ان کے خیالات میں گہرائی نہیں اور ان کی تنقیدی قیمت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدگی، سبکی، لطافت، باریکی کی
منافی ہے اور اکثر تو یہ ناقابلِ برداشت بے رنگی کا سبب ہو جاتی ہے :-

"میرے تجربہ میں صاحبِ دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے۔ تفصیل اس کی
یہ ہے کہ ایک صاحبِ دین کا مزاج کسی دوسرے صاحبِ دین کے مزاج کے ساتھ
تو ہمیشہ گرم تر رہتا ہے مگر غیر صاحبِ دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریل
کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحبِ دین
کے لیے جو چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یا دعوت چلائے ایک صاحبِ دین
ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحبِ دین کے لیے چاہے وہ خفیف درخواست ہی
لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم "

محفوظ علی صاحب کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کی رائے تسلیم کرنے کے قابل نہ تھی لیکن انھوں نے
اپنی ظرافت پر نہایت جامع تنقید کی ہے :-

"میری طبیعت کی افتاد شوخی و ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ تر غم و
درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں . . . . جس قدر جی کا ہماؤ گھرکی جانب
ہے تسکھ کی جانب نہیں مگر جناب اکبر کی ہم نشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ
نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اردو کے اس میدان میں
طبع آزمائی کر دں . . . . میری ظرافت . . . . درحقیقت ظرافت نہیں ہے بلکہ میں نے
خود اقرار کیا ہے کہ یہ اردو ہے اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق

پیدا کرنے کو یہ طومار تیار کیا ہے...... اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیشِ نظر
ہے۔ وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا
کیا ہے۔ بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی، بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے
مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے۔ دانستہ بھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت
میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اُڑھا دی ہے...... ہنسی مذاق میرا کام
نہ تھا مگر میں نے محض زبانِ اُردو کی خاطر اس میں دخل دیا ہے..... گو میں جانتا ہوں کہ
لطافت و ظرافت جس کا نام ہے وہ ان مضامین میں نہیں ہے تاہم نہ ہونے کے مقابلے
میں کچھ ہونا بہتر تھا۔"

خواجہ صاحب کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ قدم سنبھل سنبھل کر رکھتے ہیں
وہ ہمیشہ اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے ذرا تصنع اور آورد کا شبہ
ہے "مقتول کا رقص":۔

"کل میدانِ جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو زانو پر رکھا اور اس
رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ ملک الموت نے کہا اس کو میری گود میں دے دو، میں نے کہا
ٹھہرو! اس کے رقص کی سیر تو کر لوں۔ فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے
آپ کو اس میں مزا آتا ہے۔ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف
ہے۔ صوفی باطنی تلوار سے مجروح ہو کر ناچتا ہے اور غازی ظاہری تیغ سے۔ دونوں میں
ایک ادا ہے۔ مرنے والے نے کہا ناچنے کا لفظ صوفی کی توہین ہے۔ میں بولا سب
مہذب ناچتے ہیں ـــــ بادشاہ اور بیگم تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں پھر صوفی کو رقص
میں کیا عار ہے۔ تہذیب مادی ہو یا روحانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے......"

یہ ہے خواجہ صاحب کا رنگ۔ خواجہ صاحب کی اصل اہمیت ان کی انشا ہے۔ وہ نہایت ہی آسان، سادہ، پُر لطف
میں لکھتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ رعایتِ لفظی کے دام میں نہیں جا پھنستے اور ہمیشہ سنجیدگی و متانت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ
ان کی پاکیزہ اُردو سے اگر نوجوان انشا پرداز استفادہ کریں تو بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی انشا کو بہت سے نقائص سے پاک کر
ہیں۔ خواجہ صاحب کی پاکیزہ اُردو کی ایک مثال ملاحظہ ہو، ایسی مثال جس میں ظرافت مطلق نہیں:۔

"دیوانی اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آ کر جل جاتا ہے، کہیں بلبل
پھولوں کو گلے سے لگاتا ہے، لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو
بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے، تنکا کہربا پر فریفتہ ہے، دیدار پاتا ہے تو لپک کر
سینہ سے چمٹ جاتا ہے مگر چکورے چکوری کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔

وہ آپس میں مل نہیں سکتے ساری عمر ترستے ہیں اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوا چکوی کو نہ ستاؤ
وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں ۔"

مزاح نگار کی حیثیت سے اس وقت پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کافی شہرت رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ ان دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے اور یہ ذہنیت، وہی ہے جسے "انڈر گریجویٹ" ذہنیت کہتے ہیں۔ دونوں استعداد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ شمار کیا جائے تو ان کی تحسین ہے اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاقِ صحیح پر دانستہ ظلم کرنا ہے۔ ان کی خامی کا الزام ایک حد تک پڑھنے والوں پر بھی عاید ہوتا ہے۔ ان کے مضامین اس قدر مشہور ہوئے، ان کی اس قدر مانگ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ تصنیف کی دشواریوں پر انھوں نے کامل اختیار حاصل کر لیا ہے اس لیے مزید کاوش کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو شروع سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامن گیر تھی حالانکہ ان کی کھیتی میں خود رو گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ انھیں لازم تھا کہ جو کچھ وہ لکھتے اسے محض مشق سمجھتے۔ لکھتے اور لکھ کر پھاڑ دیتے، اور آہستہ آہستہ مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر میں وسعت، باریکی اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ دونوں کو شوخی ضرور ہے لیکن جو کچھ سوجھتی ہے وہ محض سطحی قسم کی چیز ہے۔ بذلہ سنجی اور تمسخر، لطیف ظرافت کا بدل نہیں ہو سکتے اس کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی کی گنجائش نہیں ان کا رنگ اپنی جگہ پر پختہ ہو گیا ہے۔ دونوں کے مضامین سے ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

"ہندوستان کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اس کے سر پر گود میں آگے پیچھے اِدھر یا اُدھر ہانپتا ہوا زبان نکالے دم ہلاتا ہوا کتا ضرور ہو اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو یونہی سا ہے۔ مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کتے کے ان کو لطف زندگی ہی حاصل نہیں ہوتا جب تک ان کے نرم و معطر آغوش میں ایک پلا نہ دبا ہو وہ اپنے عدم و وجود کو یکساں سمجھتی ہیں اور اگر پلا دبا ہوا ہے تو اس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے، اسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دلارتی ہیں کہ ان کے عشاق کتا بن کر نہ پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کتا بن جانے کے لیے دست بدعا ہوتے ہیں .... قدرِ سگ انگریز داند یا بداند اس کی میم۔"

"چودھری صاحب نے اب وہاں دہائی دینا شروع کر دی اور یہیں پڑے پڑے ان کی کوششوں کی داد دے رہا تھا وہ چلا رہے تھے ابے نالائق شیخ بے نمک ......

اشندۃ المن الرقص ...... ارے اخرج من الگرداب، ارے موذی ناؤ نکال "ہچکولا کر
وہ پھر بھیرے اوپر گرے میں نے آنکھ کھول کر دیکھا ساری دنیا گھوم رہی تھی چودھری صاحب
نے بڑے بڑے دھاڑ کر کہا "یا ایہا الشیخ ...... ابے اُلّو ...... ابن الالو والخنزیر
...... قسم خدا کی ...... واللہ ..... ارے بھائی شیخ ارے اشندۃ المن الرقص ....
ارے مرے ..... ابے روک .... روک .... ارے نکال ..... یا اللہ
..... ابے ایہا الشیخ من الموذی اخرج من الماء گرداب ...... نالائق .... بدمعاش
...... واللہ بھائی شیخ ..... مگر توبہ کیجیے بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ نکلنے والی تھی۔"

ان مثالوں سے دونوں کی شخصیت اور ذہنیت نمایاں ہے اور دونوں کی ترقی بھی کچھ رُک سی گئی ہے۔ شوکت تھانوی
سارے کارنامے پر ان کے اس مصرع سے روشنی پڑتی ہے ؎

قدرِ سنگ اگر بزدانا یا بداند اس کی بیم

یا اس دوسرے مصرع سے ؎

تو مشقِ ناز کر سارا اندھیرا میری گردن پر

جو شخص ایسے مصرعے موزوں کرکے سمجھے کہ اس نے ظرافت کا ایک شاہکار پیش کر دیا ہے اسے ظرافت سے
سے کوئی شناسائی نہیں ہو سکتی۔ شوکت تھانوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ ان مصرعوں میں ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں حقیقی انداز
ذہنیت ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہی انداز گر بجویٹ ذہنیت اس دوسری مثال میں بھی نظر آتی ہے۔ اشندری کسی طرح
کا شاہکار ہو سکتا ہے۔ پورے افسانے ساری جزئیات سے مصنف کی کمزوری اور خامی ظاہر ہوتی ہے۔ جب میں اپنے طالب علموں
کو کبھی کہتا ہوں کہ کوئی دلچسپ مقالہ لکھو اور اس میں جس قدر ممکن ہو طنز و ظرافت سے مصرف ہو تو وہ اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں
میں پطرس کو شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی دونوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترجیح دینے کی وجہ یہی ہے کہ پطرس کی ذہنیت
زیادہ پختہ ہے۔ اس میں وہ سطحیت نہیں۔ پطرس غلط اردو لکھتے ہوں، ان کی ظرافت اکتسابی ہو لیکن ان نقائص کے باوجود محض
شخصیت کی گہرائی کی وجہ سے شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی ایک اچھی مثال یہ ہے :-

"علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے
رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے، دودھ دیتی ہے۔
بکری کو لیجیے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ
کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات
بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے
گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے
ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع

دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے
مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے
چولھے میں سے باہر نکلے اور دبتا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پیشانی مشرق
کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ
گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی
ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا
ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن
ایسے موقع پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔"

یہ ایک مشاعرہ کا بیان دلچسپ بیان تھا۔ اب ایک دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

"جلسہ شروع ہوا۔ ایک نے مصرع اٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے
آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی کے بٹے ہوئے منہ زور بے لگام
ریڈیو سٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے
ایک صاحب کی باری آئی جن کا لحجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی
پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے
سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر
سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے
تمام اندراجات فوتی و پیدائش موجود ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند
ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا، دوسرے نے شامیانے کی طنابیں
کاٹ دیں جناب صدر سیکرٹری مشاعرہ مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے
گل حکمت ہو گئے"

جو فرق ان دونوں مثالوں میں نظر آتا ہے۔ وہی فرق پطرس اور رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس میں وہ بے ساختگی،
وہ آمد، وہ جوش نہیں جو رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس کی انشا بھی نسبتاً پھیکی اور بے جا اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔ رشید احمد صاحب
کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک ادبی شان ہوتی ہے جو شوکت تھانوی عظیم بیگ چغتائی اور پطرس کی تحریروں
میں نظر نہیں آتی۔ مزاح نگار ایک ادیب ہے۔ اس کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہیں۔ وہ محض مشاہدہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر صرف
ایسے واقعے ایسے کردار کی تخلیق نہیں کرتا جس سے بے اختیار ہنسی آجائے۔ وہ اس واقعہ یا کردار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا
ہے اس لیے اسے الفاظ کی جستجو اور انتخاب میں کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی واقعہ یا کردار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اگر اسے
حسین اور موزوں الفاظ کے ذریعہ پیش نہ کیا جائے تو دنیائے ادب میں اس کی وقعت نہیں ہو سکتی۔ عموماً اردو مزاح نگار اس حقیقت

کو فراموش کرتے ہیں۔ انھیں سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے لیکن جب تک ان کی سوجھ میں بوجھ اور خصوصاً ادبی حسن کی جلا نہ ہو تو ایسی
وہ کسی مصرف کی نہیں۔ رشید احمد صاحب کی سوجھ میں ہمیشہ بوجھ کا عنصر بھی غالب رہتا ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ مزاح نگاری
کو بھی ادب کی ایک صنف سمجھتے ہیں اس لیے اپنی تحریروں میں ادبی محاسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی ذہنیت عام ہے۔ رشید احمد صاحب کی شخصیت اور ذہنیت
دونوں اس الزام سے پاک ہیں۔ وہ محض مصنف بننے کی تمنا نہیں رکھتے۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی و متانت ہے۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور ان کی ظرافت میں
خیالات کی گہرائی ہوتی ہے یعنی وہ محض اپنی ظرافت سے ہمیں محظوظ ہی نہیں کرتے بلکہ ہمیں غور و فکر بھی دیتے ہیں۔ قہقہہ کے بعد طبیعت اس سنجیدہ معنی کی طرف رجوع کرتی ہے
جو عموماً ان کی تحریروں میں موجود رہتا ہے یعنی ان کی ظرافت محض سطحی نہیں، اس میں کچھ اور بھی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے خیالات سے اتفاق کریں لیکن ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور وہ چند واضح متعین خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں:۔

"آئیے لگے ہاتھوں میں آپ کو چوری کے صحیفۂ اخلاق کا مطالعہ کرا دوں۔ گو زمانہ
ایسا آ گیا ہے کہ دوسرے معاملات کی مانند چوری کے صحیفۂ اخلاق اور چوروں میں بہت
بڑا تفاوت پیدا ہو گیا ہے۔ شاعروں کی مانند چوروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔
لیکن ذرا توقف فرمائیے۔ یہ ریڈیو ہے۔ ممکن ہے ہماری آپ کی برادری میں بعض ایسے
تنگ نظر اور بے وقوف چور بھی ہوں جو میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں کہ
میں نے ان کو شاعروں سے کیوں تشبیہ دی لیکن ان کے اطمینان کے سلسلے میں یہ عرض
کرتا ہوں کہ میری نیت چوروں کی دل آزاری نہیں ہے شاعروں کی ہمت افزائی ہے
اس لیے کہ بغیر چوری کے شاعری ناممکن ہے۔ چوری کے فروغ سے شاعری کا فروغ
ہوتا ہے جیسے بیروزگاری کا فروغ بیداری ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کسی ملک و
قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی بیروزگاری ہے غیر متمدن اقوام میں بے روزگاری نہیں
پائی جاتی۔"

رشید احمد صاحب کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بہک جاتے ہیں "آپ معاف فرمائیں میں یقیناً
موضوعِ گفتگو سے دور جا پڑا ہوں" اس قسم کے جملے اکثر لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی کمزوری کا احساس ہے۔
اگر یہ بہکنا ارادی ہو اور اسے جائز حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن رشید احمد صاحب ضرورت سے
زیادہ بہک جاتے ہیں اس لیے اکثر پڑھنے والے کی طبیعت میں الجھن سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھی بسیار نویسی
کے دام میں جا پھنسے ہیں جو الفاظ انھوں نے عظیم بیگ چغتائی کے متعلق لکھے ہیں وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں:۔

"امید ہے کہ رسالوں کے مختلف اور بے شمار اڈیٹر صاحبان بھی ان پر رحم فرمائیں گے
کیونکہ مرزا صاحب کی مروت ان کو بسیار نویسی پر مجبور کرتی ہے اور بسیار نویسی کا
دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں مغویت بھی ہے۔"

بسیار نویسی کا لازمی نتیجہ ہے غور و فکر کی کمی۔ نیاز فتحپوری نے ٹھیک کہا ہے :۔

"لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے "

موجودہ مزاح نگاروں میں رشید احمد صاحب سب سے زیادہ فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش وہ مختصر تحریروں کے علاوہ بسیط، پیچیدہ، زیادہ اہم ظریفانہ کارناموں کی طرف بھی توجہ کرتے۔

(۲) دوسرے گروپ میں وہ ظرافت نگار آتے ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے جو بعض چیزوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں یا جو کسی خاص مشاہدہ سے متاثر ہو کر اپنے جذبۂ غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس گروپ میں پنچ کے لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے انھوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بھی مغربیت کے خلاف تھے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے لیکن انھیں اردو نثر میں اتنی ممتاز کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی اکبر کو نظم میں میسر ہوئی۔ آزاد میں نہ وہ زورِ تخیل ہے، نہ وہ قوتِ ایجاد جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ ان میں وہ شوخی اور شگفتگی بھی نہیں اور ان کی طنز کے تیر اس قدر کارگر بھی نہیں ہوتے۔ ان کی طنز کا نمونہ یہ ہے :۔

"یہاں ہوٹلوں اور مکانات عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت طرح دار، زیبت یافتہ، چست کمسن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کے کام دن کو اور رات کو دیتی اور کرتی رہتی ہیں اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سر مبارک کی قسم میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے "

آزاد میں وہ تنوع نہیں جو اکبر میں نظر آتا ہے۔ ان کی طنز زندگی کے ہر رخ پر حاوی نہیں۔ اس طنز کی کاٹ گہری نہیں۔ اکبر کے مقابلہ میں آزاد کی طنز بہت سطحی معلوم ہوتی ہے۔ جوشش و ہیجان، نفرت و غضب کے محرکات بھی موجود نہیں۔ طنز سیدھا سادا اور دھیما ہے :۔

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتابیں دیکھوں۔ کوئی آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینہ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹرسلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ کس قدر سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ جب کسی معزز

دیڑی کو بیف کے ٹکڑے سے پانو صاف کرتے دیکھتا ہوں تو تمہاری چپاتیوں کو سوکھی
انگلیوں سے کھٹکنا یاد آتا ہے اور کبا جی گھبراتا ہے۔"

آزاد کے زمانے کا لحاظ کر کے اور یہ بھی پیشِ نظر رکھ کر کہ ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ اُردو میں موجود نہ تھا ان کی کوششیں
لائقِ تحسین ہیں لیکن ان کی اہمیت تاریخی ہے اور ان سے ادب وانشا، لب ولہجہ کے متعلق موجودہ زمانے کے نوجوان مزاح نگار بہت کچھ
سیکھ سکتے ہیں۔

آزاد کے بعد موجودہ طنز میں تین نام سامنے آتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، ملا رموزی۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو
اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان میں وہ شے موجود ہے جو دوسرے رہروانِ راہِ طنزیات میں مطلق نہیں۔ اردو انشا پرداز کسی مسئلہ یا واقعہ یا
خیال کو ظریفانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں وہ اس مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو طنزیہ طور پر بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن عموماً یہ مسئلہ یا واقعہ یا خیال ان کے
دلوں میں زبردست ہیجان نہیں پیدا کرتا۔ اس سے ان کے دماغ میں ایک محشر بپا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زیادہ حصہ اُردو طنزیات کا
سطحی، سرد و بے جان معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے طبیعت حساس پائی ہے وہ صرف حس ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے احساسات
شدید ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات اُبلنے لگتے ہیں، ان کے خیالات میں بلا کا طوفان برپا ہوتا ہے ان جذبات و خیالات اور ان کی شدت
سے وہ خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں:-

"جو تاریکی چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جبکہ اسلام کا ظہور ہوا تھا
ویسے ہی تاریکی آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام اپنی
غربت اولیٰ میں مبتلا ہے۔ اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بت پرستی تھی تو
اس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا
اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے۔ خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے
آج بھی نہیں۔ دنیا کی وہ کونسی پرانی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی؟ جبکہ وہ بیماری تھی
تو کیا اس کی حالت ویسے ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے۔ پہلے وہ پتھر کی چٹان پر بیماری
کی کروٹیں بدلتی ہوگی اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے لیکن بیمار
کے بستر کے بدل جانے سے بیماری کی حالت نہیں بدل سکتی۔"

دیکھا اس قسم کی شاندار، پُر زور، زندہ تحریر کے سامنے جملہ طنزیہ تحریریں بے رنگ و بے اثر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وجہ
یہ ہے کہ یہاں ہر ہر لفظ خلوص سے پُر ہے، جو کچھ کہا گیا ہے وہ پہلے دل میں محسوس کیا گیا ہے۔ ہجو گو بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے
اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوری، بدتمیزی، بے رحمی، ناانصافی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدہ سے اس کا دل بیتاب
ہو جاتا ہے وہ شدتِ احساس سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ ان چیزوں کو کچل ڈالے، بدی کے اس پھولتے پھلتے درخت کو بیخ و بن سے
اکھاڑ کر پھینک دے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات کے اٹھتے ہوئے طوفان کو ایک زبردست طوفان بنا دیتا ہے
ایسا طوفان جو اپنی فوق الفطری طاقت سے ساری گندگیوں کو پاک صاف کر دیتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فوق فطری زور

اور اس نور کی وجہ سے ان کی انشا محض انشا یعنی لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار ایک بڑھتا ہوا سیلاب ایک اٹھتا ہوا طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے یہ ایسا عصائے موسوی ہے جو افعی بن کر ہر شے کو نگل جاتا ہے ملاحظہ ہو:۔

"لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت و
ہلاکت پھیلانے کی ایسی شدید البہیمیت تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی زمین کی پشت
پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی زندگی
ابھی تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک دنیا
سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسا کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے نگلنے
اور چیرنے پھاڑنے کے لیے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں پھر اس اژدہے کو دیکھو جو
جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے
چنگھاڑتا ہوا اٹھتا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روسو کی سرزمین میں خون
اور گوشت کے لیے پلا ہے۔ یہ کیسے عجیب ہیں! یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں!
ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا کیسا ہولناک بھونچال
جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہیں ہوئی اور
خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی زمین پر نہ ہوا۔"

اگر اردو ادب اس قسم کی طنز کی زیادہ مثالیں پیش کر سکتا تو پھر وہ طنزیات کے میدان میں دوسرے ادبوں کے مقابلہ میں اس قدر پیچھے نہ رہتا۔ اس قسم کی مثالیں ابوالکلام آزاد صاحب کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ تحریر زندہ ہے اور اس کا ہر ہر لفظ زندگی کا حامل ہے اور ہر لفظ بولتا چالتا متحرک نظر آتا ہے۔ یہ طرزِ تحریر مولانا ابوالکلام کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ ان کی شخصیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اپنے طور پر بالکل منفرد ہے۔ مولانا ابوالکلام کی عبارت سلیس یا محدود نہیں ہوتی۔ ان کی روش عام روشوں سے یک قلم علیحدہ ہے اور یہ ایک حد تک اجنبی بھی معلوم ہوتی ہے اس میں شان ہے، رعب و دبدبہ ہے۔ زور ہے اور کہیں کہیں ثقالت بھی ہے۔ اس میں وہ سبکی، باریکی، سلاست، روانی نہیں جو دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مولانا ابوالکلام نے عام طرز سے علیحدہ ہو کر، شاہراہِ اردو سے دور ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں لیکن ان کی شخصیت کو اس نئی راہ کی ضرورت تھی اور اگر وہ عام روش اختیار کرتے تو شاید اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا مخصوص رنگ ہے۔ وہ ہر کام، ہر موقع کے لیے موزوں بھی نہیں۔ اس قسم کی انشا کا دائرہ محدود ہے یہ خاص خاص موضوعات کے لیے مناسب ہے اور اس کا بے موقع و بے محل استعمال مضحک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے موقع و محل سے استعمال کیا ہے اور جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہایت موزوں و کامیاب ہے۔

جو خطیبانہ ہیجان اور جوش مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے وہ مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں میں موجود نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی آواز بلند آہنگ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی دھیمی ہے۔ مولانا ابوالکلام میں بے پناہ جوش ہے مولانا ظفر علی خاں

میں خلوص کے باوجود وہ بے پناہ جذبات کی شدت نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی انشا ایک زندہ متحرک قوت ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی انشا نسبتاً سرد و ساکت نظر آتی ہے لیکن صرف نسبتاً ہی ورنہ ان کی تحریر میں بھی زور ہے ایک ایسی قوت ہے جو اسے عام سطح سے بلند کرتی ہے۔

"آج دنیا کا نظام حکومت جن اخلاقی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے وہ غرق آہن جہاز ہیں، اژدر [illegible] تو پیں ہیں فلک پرواز طیارے ہیں، قطار اندر قطار عسکریوں کی جگر گداز سنگینیں ہیں صف اندر صف پولیس کی جمعیت فرسا لاٹھیاں ہیں جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیردستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے یہ کیفیت کا یہ عفریت جس نے عنکبوتی کی گود میں پرورش پائی ہے آج ربع مسکون پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ مغرب اس کا گہوارہ اور یورپ کا زاد بوم تھا۔ کاش یہ اپنے وطن میں رہتا مگر اس نے ایشیا کو بھی اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرق اقصیٰ اس کی بہیمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔"

اس مثال میں ظفر علی خاں کی انشا اپنے بلند ترین مقام پر ہے لیکن یہ بلند ترین مقام بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا کے معمولی مقام سے بہت نیچے واقع ہوا ہے۔ دونوں خلوص کے حامل ہیں، دونوں سیاسی طنز کی راہ میں گامزن ہیں لیکن جو بیداری ابوالکلام آزاد کی تحریر کا حصہ ہے وہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، نسبتاً ظفر علی خاں کی تحریریں ہنگامی سی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دلچسپ ہیں، اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتی ہیں لیکن انھیں بقائے دوام نہ حاصل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان کی سیاسی کشمکشوں نے موجودہ ادب پر اثر ڈالا ہے اور برابر ڈال رہی ہیں۔ ان کشمکشوں کا اثر آئینہ ادب میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ایک طرف تو ہمارے ترقی پسند شعرا اور ادیب ہیں جو اپنے ترقی پسند خیالات سے دنیا کو بلند آہنگ آواز میں مطلع کر رہے ہیں۔ انہی کا ایک نتیجہ وہ ہجویں یا ہجویہ تحریریں ہیں جن کی مثالیں ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار وغیرہ کے ہاں ملتی ہیں عموماً جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ نئے نہیں، جن چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ وقتی چیزیں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کے گزر جانے کے بعد ان کی محض تاریخی اہمیت باقی رہے گی اس لیے عموماً یہ نظمیں اور ہجویں بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور آئندہ دور کا مورخ ان کی مدد سے اس زمانے کی تصویر مرتب کرنے میں کامیاب ہوگا۔ عموماً وقتی، جلد گزر جانے والے موضوعات پر لکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ تصنیف کی اہمیت محض تاریخی باقی رہ جاتی ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مصنف اپنی کبھی نہ مٹنے والی انشا کی مدد سے ان وقتی دلچسپی رکھنے والے موضوعات کو بقائے جاودانی عطا کرتے ہیں لیکن ایسے مصنف بہت کم ہوتے ہیں اور ابوالکلام آزاد اس قسم کے ایک انشا پرداز ہیں۔ ظفر علی خاں اس گروہ میں داخل نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا دائرہ محدود ہے۔ ملا رموزی کا موضوع محض سیاسیات ہی نہیں اس لیے ملا رموزی میں تنوع مضامین زیادہ ہے۔ مجھے ملا رموزی کی گلابی اردو سے بحث نہیں۔ "گلابی اردو" غالباً اپنے نیاپن کی وجہ سے مشہور ہو گئی لیکن اس کی ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ اس قسم کی چیز وقتی طور پر اور کم خوراک میں اچھی لگتی ہے لیکن زیادہ مقدار میں ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

گلابی اردو" بالکل قابلِ اعتنا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ "نکات" کی کیا اہمیت ہے۔ ملا رموزی اپنے نکات کے مقصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

"بہرہ نکات یا نکات کے عنوان سے جو کچھ لکھا جائے گا اس کا پہلا مقصد تو یہ ہوگا کہ رسالہ "بیدار" کے پڑھنے والوں میں جو حضرات ہنسی، مذاق، تفنن، خوش دلی کی نعمت سے ابداً محروم رہتے ہیں یا ...... جن کے دماغوں سے تفریح و ظرافت کی تازگی ضائع ہو چکی ہے .... انھیں گدگدایا جائے اور بتلا دیا جائے کہ رات دن کے جو ہمیں گھنٹوں میں ہر لحمہ روحانی بنے رہنا ہی متانت نہیں بلکہ کسی وقت مسکرا دینا، کھلکھلانا یا قہقہہ لگانا بھی طبی اصول سے مفید صحت ہے۔

دوسرا مقصد اس عنوان سے یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے باریک نکتے سمجھا دیے جائیں گے جن کا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر ظرافت اور دل لگی کے علاوہ انتہا کی متانت و سنجیدگی اختیار کی جائے کیونکہ بعض مواقع پر نری ظرافت بھی خطاب و بیان کی تاثیر و اہمیت کو کم کر دیتی ہے مگر ایسے سنجیدہ نکات پر آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ نکات کا لکھنے والا ملا رموزی بھی کسی مہاجن کی باسی کڑھی بن گیا ہے جس میں کوئی چٹپٹا اُبال بھی نہیں آتا بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ہماری ظرافت کی ایک ایک سطر میں بھی کام کی باتوں کو تلاش کرتے رہیے وہ ملیں گی اور بکثرت ملیں گی انشاءاللہ۔"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملا رموزی نے ظریف طبیعت پائی ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نکات میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے نکتوں سے بحث کی گئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت اور ان کے منتخب نکات کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے یہ ہے:-

"ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول مدِنظر رکھا گیا ہے۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہیں وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں۔ جو باتیں مصلحین کی زبان پر بھی نہیں آتیں وہ ان کی زبانِ قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی ادرا کی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔

غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے جس کا راستہ

میں نظر آ سکتی اور جو چیز بطور مستند تفریح برکار رہے گی وہ ہمیشہ مقبول و محبوب ہوگی۔ ملا رموزی صاحب نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے:

ملا رموزی انتخاب، انتخاب موضوعات اور انتخاب الفاظ سے کام نہیں لیتے۔ انھیں موقع و محل تناسب و موزونیت کا دھیان نہیں رہتا اور انھوں نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے۔ یعنی ان میں وہ علیحدگی جو ایک کامیاب ادیب کے لیے ضروری ہے موجود نہیں۔ ان سب باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ ملا رموزی میں صناعی، ایسی صناعی جو پائدار ہو اس کی کمی ہے۔

"خدا جانے یہ کنک پر اثر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں اور تو کچھ نہیں لباس ہی اس یگانگت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہہ گذرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجیے میں ہندو ہوں کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اس وقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے لیے قصائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے سبب پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ انھوں نے ڈبہ ذرا خالی پا کر ایک سیٹ پر نیا انگریزی وضع کا بستر بچھایا اور یہ کوٹ پتلون اس پر لیٹ گئے اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ہاتھ ڈال لیا گویا مسٹر اسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ و کنٹرر یہ اسٹیشن لندن سے جمعیۃ الاقوام کی شرکت کے لیے اپنے خانے کے اسپیشل میں جنیوا جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی معاہدے کو ملاحظے سے حل فرما رہے ہیں۔"

تصویر کافی صاف کھینچی ہے اور بس۔ اس میں کوئی صاف بات نہیں کوئی انفرادیت نہیں کوئی پائداری نہیں۔

(۳) تیسرے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے جو اپنے فلسفۂ زندگی کو ظرافت اور طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتی۔ ان کی مختلف ہجویں منتشر نہیں ہوتیں وہ گویا ایک سلسلہ میں منسلک ہوتی ہیں اور سب مل کر مصنف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی ہجووں میں ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے جس کی وجہ سے اس کے حسن میں ایک حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ کم از کم انتشار و پراگندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس گروہ میں سلطان حیدر جوش اور سجاد علی انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ سلطان حیدر جوش مغربی خصوصاً انگریزی مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں اور ان مصنفین کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اور ایک حد تک اس تقلید میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے ان کی ظرافت میں گہرائی آ جاتی ہے۔ یہ رنگ سلطان حیدر جوش کی تخلیق ہے اور غالباً انھی پر ختم ہو گیا ہے:

"معلوم نہیں نیچر کو اپنی ترقی کرنے والی مخلوق کے ساتھ کہاں کا بیر ہے کہ جس قدر مشکلات سے یہ پیچھا چھڑاتی ہے اسی قدر وہ اور زیادہ مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ جب انسان نے

پیدل چلنے سے قدم آگے بڑھا کر زین سواری شروع کی تو نیچر نے محض لڑھک کر گر جانے
سے آگے بڑھ کر گھوڑے پر سے گر کر مرجانا پیدا کر دیا۔ پھر انسان نے گاڑی بنائی تو اس
کا الٹ جانا اور زیادہ مہلک چیز وجود میں آئی، جب ریل نے دنیائے وجود میں قدم رکھا تو
ریل سے لڑ جانے کا سخت مہلک حادثہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انسان جس قدر
اپنے آرام و آسائش حاصل کرنے کے زور میں آگے بڑھتا جاتا ہے نیچر اسی قدر تکلیف
اور مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ یہی حالت سوسائٹی کی ہوئی وہ جس قدر آگے بڑھتی گئی
پابندی اور دھوکے سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکی مگر اس کی ترقی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ابھی
وہ سلسلہ اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں اس کا پہنچنا مقصد تھا۔ ..... اگر فرض کر لیا
جائے کہ دنیا اس حد تک پہنچ بھی گئی تو اس کو فی الواقع آگے بڑھنا کہیں گے یا پیچھے ہٹنا۔
سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ ترقی کرے گی یا پھر اسی پہلے وحشی انسان کے بین بین ہو جائے
گی اور کچھ عجیب نہیں کہ اس مرتبہ پھر وہ انسان سے بندر کے قالب میں پہنچ جائے کیونکہ
بندر کو انسان سے بدرجہا بے فکری، مساوات اور مسرت حقیقی حاصل ہے۔"

یہ ہے سلطان حیدر جوش کا رنگ اور اس رنگ میں گہرائی اور پختگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریروں میں بے ساختگی اور برجستگی کی کمی ہے لیکن کہہ سکتے ہیں کہ بے ساختگی اور برجستگی اس قسم کی فلسفیانہ ظرافت کے لیے موزوں بھی نہیں۔ جو بات ان کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود، خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ و متین لب و لہجہ ہے۔ سلطان حیدر جوش ایک مخصوص شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے الفاظ سے عیاں ہے۔ وہ نوجوان مزاح نگاروں کی طرح غیر ذمہ دارانہ طور پر محض ہنسنے ہنسانے کے لوازمات کی تلاش نہیں کرتے اور انھیں تلاش کر کے قارئین کے سامنے پیش نہیں کرتے، وہ سستی شہرت کے طلبگار نہیں اس لیے وہ عام فہم اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں اور سطحی رنگینی، سطحی رعنائی خیال کبھی ان کا مطمح نظر نہیں۔ یہی وجہ ہے اس لیے ان کے مضامین کبھی شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی کے مضامین کی طرح عام پسند نہیں ہو سکتے لیکن ان کے مضامین شاید اس وقت پڑھے جائیں گے جب شوکت تھانوی وغیرہ کے نام سے بھی لوگ واقف نہ رہیں گے۔ ان کے مضامین کا حلقۂ اثر لازمی طور پر محدود ہے۔ یہ مضامین ان ہی لوگوں کو متاثر و محظوظ کر سکتے ہیں جنھیں خود غور و فکر کی عادت ہے، جو خیالات کی کشمکش سے بچنا نہیں چاہتے ہیں، جو ادب کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ان سب اوصاف کے باوجود سلطان حیدر جوش کے مضامین میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں ان کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے تخیل میں غیر معمولی باریکی، بلند پروازی اور فراوانی نہیں ہے۔ ان کی انشا غیر معمولی دلچسپیوں کی حامل نہیں ہے:

"آہ دنیا، ترقی یافتہ دنیا، تمام تمول، تمام قابلیت، تمام سائنس، تمام قوت ایجاد و اختراع صرف
اس بات پر صرف کر رہی ہے کہ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں گروہ کے گروہ نیست و نابود
ہو جائیں، خوبصورت اور قد آور نوجوان عین عالم شباب میں اسی پرانی خیالی عزت کے

پیچھے اپنی بیش بہا جانوں کو قربان کر رہے ہیں اور سونے کے بڑے بڑے انبار لوہے کی
گولیوں اور چیزوں کے لیے لٹائے جا رہے ہیں۔ صدیوں پرانی صناعی کی قابلِ قدر یادگاریں
اور اس کے ساتھ ہی نیچر کی خانہ ساز بھولی بھالی سرزمین اسی طوفان بلاخیزی کی رَو میں بہی
چلی جاتی ہیں۔"

اس میں ایک زور ہے، ایک روانی ہے، ایک اثر ہے لیکن یہ زور یہ روانی یہ اثر فطری نہیں بلکہ سلطان حیدر جوش کے قصد و ارادہ کا نتیجہ ہے، اس وجہ سے اس میں سبکی اور لطافت نہیں بلکہ ایک قسم کی گرانی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ یکسر مصنوعی نہیں یہ غور و فکر کا مادہ سجاد علی انصاری میں بھی موجود تھا، نوجوانی کا تقاضا تھا اس لیے ان کے الفاظ میں نرمی کے عوض تیزی تھی۔ ان کی طنز میں کاٹ بھی زیادہ تھی لیکن وہ سلطان حیدر جوش کی طرح پختہ کار انسان نہ تھے اس لیے ان کے خیالات میں وہ گہرائی وہ تسلسل نہ ہو جایت نہیں۔ انھیں اپنی ذمہ داری کا اس قدر احساس بھی نہیں۔ بظاہر سجاد علی انصاری کو ذمہ داری کا زیادہ احساس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ سرشاری اس قسم کی نیاشتی کی حامل ہے جو عموماً ان نوجوانوں میں نظر آتی ہے جو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہتے ہیں اور اس احساس میں غلو سے مصرف لیتے ہیں اس قسم کا غلو ان میں نظر آتا ہے لیکن اس غلو اور صحیح ذمہ داری کے صحیح احساس میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ بہرکیف نسبتاً سجاد علی انصاری میں ذمہ داری کا مادہ دوسرے نوجوان انشاپردازوں سے زیادہ ہے:۔

"فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے، ایک حقیقت جب ختم ہے دوسری حقیقت
ہو جاتی ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا۔ اس وقت تخلیقِ شیطنت
کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصرِ شیطنت مضمر ہیں سلسلۂ ارتقا سے
شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر مکمل
ہو چکے تھے جو تخلیقِ شیطنت کے لیے لازمی تھے۔ فطرتاً اس کے لیے یہ محال تھا کہ ایک
لمحہ کے لیے بھی اپنی ملکوتیت پر قانع رہے۔ وہ شیطنت پر مجبور ہو گیا۔ اس کے سامنے
ایک نئی حقیقت کی وسعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ کسی طرح فرشتہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

یہ ہے سجاد انصاری کا رنگ۔ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہے۔ وہی رنگ جو سلطان حیدر جوش میں بھی موجود ہے لیکن یہاں وہ پختگی نہیں، وہ گہرائی نہیں، متانت و سنجیدگی بہرحال موجود ہے۔

اس قسم کی طنز اور عام پسند طنز میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن یہ کچھ دوسری چیز ہے، اس سے بالکل مختلف جس کی مانگ اخبارات و رسائل کے اڈیٹر کیا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ ظرافت میں بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ سلطان حیدر جوش صاحب نے اس کی ابتدا کی ہے۔ سجاد انصاری میں اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن اس رنگ کی ابھی ابتدا ہے اور اس کی وسعتیں منتظر ہیں کسی ایسے رہرو کی جو اس راہ میں جرأت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔

(۴)

طنز و ظرافت کے میدان میں رہرو تو بہت ہیں لیکن شاید پانچ نام ایسے ہیں جو بقا کے ذمہ دار ہیں۔ سوداؔ، اکبرؔ، غالبؔ،

اُردو شاعری میں طنز

شوکت سبزواری

طنز اور ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں شاید اس لیے عام طور سے ان دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنز پر مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا ظرافت سے تعلق ہے اور یہ تعلق بہت شدید اور گہرا ہے۔ لیکن طنز کا مفہوم کچھ اور ہے۔ ظرافت کم سے کم اس کی حقیقت میں داخل نہیں۔ طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ ایک قسم کا عملِ جراحی ہے۔ تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ طنز شدید، تیز اور [illegible] قسم کی تنقید ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ایک قسم کا عملِ جراحی کہا۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ جہاں برے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں اچھے پہلوؤں کو بھی اجاگر کرے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ طنز میں چیز کے برے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں تنقید کا اعتدال قائم رکھنا اس لیے دشوار ہوتا ہے کہ یا تو چیز کے اچھے پہلو خود بخود نظر انداز ہو جاتے ہیں یا برے پہلو اس قدر رنگ کر پیش کیے جاتے ہیں کہ اچھے پہلو ماند پڑ جاتے ہیں اور ایک عام قاری کی نظر ان تک نہیں پہنچتی۔ طنز کا یہ رخ ہے جو بے دردی لیے ہوئے ہے۔ طنز میں شدت اور تیزی ضروری سی ہے۔ اس کے نشتر کسی قدر نوکیلے ہوتے ہیں۔ طنز میں جتنی شدت ہوتی ہے اتنا ہی وہ کامیاب اور بھرپور سمجھا جاتا ہے لیکن طنز کی یہ شدت، تیزی، بیدردی اور تلخی ایک اچھے اور بڑے مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ طنز کی ادب میں اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے اور یہی مقصدیت ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارا کر لی جاتی ہے۔ بقول غالب لب کی شیرینی کا کرشمہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے ہم بے مزا نہیں ہوتے۔ لب کی یہ شیرینی طنز کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے۔ تنقید کا مقصد ہے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور ادب میں اس کی حیثیت کی تعیین، طنز کا مقصد ہے اصلاح۔ تنقید احتساب ہے اور طنز تحسین۔

طنز کی کئی شکلیں ہیں جن میں وہ رونما ہوتا ہے۔ طنز میں تلخی اور شدت ہے اس لیے ادب میں اس کے لیے خاص خاص اسالیبِ بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ طنز کی کڑوی کسیلی گولیاں ان اسالیب کے لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اتاری جاتی ہیں۔ مزاح ان میں سب سے اچھا اور پُرلطف پیرایۂ بیان ہے جو طنز کی روح کے لیے مناسب ہے اور اس کے مزاج کے لیے سازگار بھی ہے انشا پردازوں نے طنز کے نشتروں کو ان کی ظاہری تیزی اور زہرناکی کا اثر ہلکا کرنے کے لیے ہی مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ مزاح طنز کے عملِ جراحی کے لیے سُنگھنی دوا کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاح کے زیرِ اثر قاری پر ایک نیم شگفتگی کی حالت میں خاموشی کے ساتھ طنز کا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے۔

سودا کے ہجویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزاء، تمسخر، مضحکہ، پھکڑپن، گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں اس لیے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاخر مکیں یا میر ضاحک کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخر کی حد میں آتی ہیں۔ چند ایسی بھی ہیں جو ہیں شکایت روزگار، یا اہل روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدف مطاعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا اور شاید سودا کو اسی کلام کی وجہ سے اس کو اردو کے طنز نگار شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔

لیکن سودا فطرتاً ہنسوڑ تھے۔ ان کے یہاں ہنسنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ان کے فن کی روح تضحیک ہے۔ طنز کے لیے جذبے کی جس شدت اور نظر کی جس دقت کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں کی طرح ان کی ہجویات بھی مانگے کی ہیں۔ ان میں جدت یا تازگی نہیں۔ سودا مضمون پیدا کرنا خوب جانتے تھے۔ ان کی ہجویات بے بات کی بات سہی لیکن ان میں تفکر و شعور پیدا کرنے والی کیفیت نہیں۔ مریل گھوڑے اور سٹریل ہاتھی کی انھوں نے جو ہجو لکھی ہے اس میں فن کی بلندی ہے، نادر تشبیہیں ہیں، نازک خیالی ہے، الفاظ کی دروبست ہے لیکن طنز کی شدت اور ظرافت کی شگفتگی سے یہ خالی ہے۔ میرے خیال میں ندرت خیال کی شاید ہی اس سے بہتر کوئی مثال پیش کی جا سکے ؎

ہوتی ہے ناتوانی اس کے کہ در پے — کہ وہ ڈیل اب سوئی کی سی گرہ ہے
گھٹا فیل اسے دیوانہ پن ہے — کسی مدت کا یہ بابا کہن ہے
اٹھے ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر — کہیں یہ اس کو ہاتھی یہ ہے اندھیر

یا ع — نہیں ہاتھی صعوبت کی ہے یہ رات

لیکن اس کے باوجود یہ فن کی جادوگری معلوم ہوتی ہے جو کرتب دکھانے سے آگے نہیں بڑھی۔ گھوڑے کے متعلق کہتے ہیں ؎

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار

بالکل یہی بات راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کے بارے میں کہی گئی ہے ؎

جو بیٹھے یہ تو اٹھنا اس سے ہے دور
لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور

سودا کی غزلوں میں شگفتگی کی جو ایک لہر ہے اس میں کہیں کہیں طنز کی آمیزش بھی ہے۔ یہ نازک اور لطیف قسم کا طنز ہے۔ میں سودا کے ان اشعار کو اس کی ہجویات کے مقابلے میں زیادہ طنزیاتی سمجھتا ہوں ان میں فکر کی روشنی اور بصیرت ہے جو طنز کی جان ہے لیکن ان اشعار کا موضوع خاص ہے اس لیے ان کا طنز محدود ہے۔ ان میں زندگی کی سی بے پایانی ہے اور نہ کائنات کی سی وسعت۔ چند شعر دیکھیے ؎

سجدہ کب صنم کو میں دل کے کنشت میں — کہہ اس خدا سے شیخ جو ہے سنگ و خشت میں

جن نے سجدہ کیا نہ آدم کو — شیخ کا پوچھتا ہے پایاں پاؤں

سنگ سے بیت الحرم کی شیخ اٹھاتا ہے بنا — آئینہ دل کا مجھے اس گھر میں بٹھلانا نہیں

کیا شکوہ کیا شکایت اپنی ہے شکل یکساں
دونوں سے آپ ہی کو مقصود جانتے ہیں

(۳)

اُردو کا دوسرا طنز نگار شاعر نظیر اکبر آبادی ہے جس کا نام ہمارے تذکرہ نگاروں نے شعراء کی فہرست ہی سے خارج کر دیا تھا۔ نظیر غزل کے شاعر نہیں۔ غزل کے لیے دل کا خون کرنا پڑتا ہے۔ ہماری غزل کی روایت کا خالق میر ہے۔ میر جیسی غزل وہی کہہ سکتا ہے جس کی ہڈیوں تک کو تپ عشق نے گھلا دیا ہو۔ نظیر بقول نیاز فتح پوری "چھنگلہ باز" تھے۔ دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اُردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو عامی بھی ہیں۔ انھیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے۔ اچھا اس لیے کہ اس میں تیز قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاقِ صحیح کو ناگوار نہ ہو بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فنکار کی طرح اس نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اُردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ اس کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں حکیمانہ گہرائی ہے۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انھیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں، شاید اسی لیے فساد پہ ان کی نظر پڑ جاتی ہے تو زندگی کی رنگا رنگی کو انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعراء نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا۔ نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لیے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ ننگا کر سکتے ہیں، تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انھیں گوارا نہیں۔

یہ کام سودا کے بعد اُردو شعراء میں انشا نے کیا اور سودا سے بڑھ چڑھ کر کیا۔ سودا اور انشا میں کئی اعتبار سے مناسبت ہے۔ دونوں کا مزاج ایک جیسا تھا۔ دونوں خوش باش، لاابالی اور منہ پھٹ قسم کے انسان تھے۔ دونوں نڈر اور بے باک تھے لیکن سید انشا مقابلتاً زیادہ بیباک ہیں اور زبان پر انھیں قدرت بھی زیادہ ہے۔ نظر میں گہرائی اور جذبے میں گرمی انشا سے زیادہ سودا میں ہے۔ انشا کا فن لطائف کا فن ہے اور جہاں تک ہجوگوئی کا تعلق ہے سودا ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ مصحفی کی پگڑی اچھالنے میں انشا نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے۔ جلوس نکالے اور سوانگ رچائے لیکن اس کے باوجود وہ ان کو رسوا نہ کر سکے۔ انشا کی ہجو میں فن کی بلندی، پاکی اور صفائی نہیں، غم و غصہ اور زہرناکی ہے۔ پھبتیاں کسے ہیں۔ ٹھینگے دکھانا اور انگلیاں نچانا ہے۔ انشا کی ہجویات کا طنز سے دور کا تعلق بھی نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کو اچھے ظرافت نگاروں میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ میاں بیتاب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو

مانند ہے۔ وہ سودا اور انشا کے سلسلے میں نہیں آتے۔ غالب کے طنز و ظرافت کی بنیاد نظر و خبر اور بصیرت و بصر پر ہے۔ غالب کے یہاں سلیقہ بڑی چیز ہے اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔ ان کے فن کا یہ سلیقہ ان کے فکر کی روشنی سے ہے۔ اسے اگر ہم انہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ "بقدر رنگِ گلستاں" ہے۔

غالب کے طنز کی کئی خصوصیات ہیں۔ ایک تو بقول رشید احمد صدیقی وہ براہِ راست نہیں، اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور عجب بات ہے کہ جس پر وہ وار کرتے ہیں اسے اوّل تو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکتا ہے۔ طنز کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے۔ غالب کے لفظوں میں یہ ایک ادا ہے ؎

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

غالب کے طنز میں شوخی کا رنگ ہے اور اس لحاظ سے وہ سودا اور نظیر کے طنز سے مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہاں طنز و شوخی میں کچھ عجیب انداز کی ہم آہنگی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ہم آہنگی میں بھی طنز غالب ہے۔ اس لحاظ سے غالب طنز نگار زیادہ اور ظریف کم ہیں۔ حالی نے غالب کے شایستہ شگفتہ اور باغ و بہار اندازِ تحریر یا ان مکاتیب کی وجہ سے جو زعفران زارِ ادب ہیں، ان کی ظرافت کو اہمیت دی اور ان کو حیوانِ ظریف کہا لیکن مجھے غالب کے کلام میں طنز نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لیے میں انھیں 'ظریف' سے زیادہ طنّاز یعنی طنز نگار سمجھتا ہوں۔

غالب کا عقیدہ طنز کے بارے میں یہ ہے کہ وہ جتنا خم دار ہو اچھا ہے۔ ویسے تو رسم پرستی سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی اور پامال راہوں پر چلنا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن ان کا طنز بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور اس میں انفرادیت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ وہ شیریں، خوشگوار اور مؤثر ہے اور شاید اس لیے مؤثر ہے کہ خوشگوار ہے۔ وہ بڑا ہی سادہ اور پُرکار ہے۔ سادگی فن کی ہے اور پُرکاری فکر کی۔ تضاد کاری ہی میں غالب کی انفرادیت کا راز ہے۔ غالب کے طنز میں جھلاہٹ، زہرناکی اور تلخی نام کو نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے لب و لہجے کی تلخی سے اس کو تلخ نہیں بنایا ویسے ہر صحیح اور سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی ادب و انشا کے اثر سے اس طنز کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو نوں کی پھوار بھی ہو اور تلوار کی دھار بھی۔ سوئفٹ انگریزی کا مشہور طنز نگار ہے جس کے طنز میں تیزی اور گرمی دونوں اعتدال سے زیادہ ہیں۔ تیزی، وحشت اور بربریت کا رنگ لیے ہوئے ہے اور گرمی ہیجان اور غضب تک پہنچ گئی ہے لیکن طنز کی تیزی جب حد سے گزر جاتی ہے تو اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر ہلاکت بار ہو سکتے ہیں لیکن اصلاح کار ان سے ممکن نہیں۔ غالب کا طنز شوخ و شنگ ہنستے ہوئے بھی دھیما ہے۔ اس میں چابک دست نشتر زن کے ہاتھ کی صفائی، نرمی اور گداز ہے۔ غالب نے طنز کے لیے تعریض کا پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ طنز میں تلخی اور ناگواری آنے نہ پائے اور تاثیر سے پہلے مخاطب کو یہ احساس نہ ہو کہ اس پر عمل جراحی کیا گیا ہے۔ غالب کے طنزیہ انداز کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے بعض نکتہ رس نقاد بھی اس چھپے ہوئے طنز کا پتہ نہ چلا سکے اور ذیل کے شعروں کا رخ انھیں غالب کی طرف نظر آیا ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ　　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

دیکھ سکے اور پکار اُٹھے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس شعر کا لب و لہجہ ہی طنزیہ نہیں بلکہ اس کا ہر لفظ طنز کی تیزی اور تلخی لیے ہوئے ہے "گستاخیٔ فرشتہ" اور "جناب" کیسے برمحل اور بامعنی الفاظ ہیں۔ ان کی داد کچھ اہلِ ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ چند شعر سناتا چلوں ؎

دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا　　ڈر جاتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا　　کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا　　حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ

پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا یہ کوئی پیدا نہ ہو　　در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسایہ نہ ہو

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا　　پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر　　گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر　　نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی　　خلد میں کہیے تو دوزخ بھی ملا لیں یارب

یہ اشعار یونہی روا روی میں محض یادداشت سے نقل کر دیے گئے۔ غالبؔ کے مختصر سے دیوان میں ایسے نشتر اور بھی ہیں جن کی چبھن ہمیں پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جاتی ہے۔

(۵)

اس اجمالی جائزے میں جن اُردو شعراء کا ذکر ہوا وہ محض ظریف اور طنز نگار نہ تھے اس کے سوا بھی بہت کچھ تھے بلکہ بہت کچھ زیادہ تھے اور ان میں سے قریب قریب ہر شاعر کی عزت، شہرت اور ادب میں اس کا مقام طنز و ظرافت کا شرمندۂ احسان نہیں، دوسری خصوصیات کا رہینِ منت ہے۔ یہ خصوصیات ان کے بقائے دوام اور شہرتِ عام کا سبب بنیں۔ غالبؔ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ اس کے پورے آٹھ سال بعد ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ نکلا جس کا مقصد اُردو میں ظرافت کو فروغ دینا تھا۔ پنچ کے مضمون نگاروں میں بڑے بڑے سحر کار اہلِ قلم

شامل تھے۔ اکبر الہ آبادی کے سوا سب نے نثر میں ظرافت کے پھول کھلائے۔ اکبر نے طنز و ظرافت کو فن کی حیثیت سے شعر میں برتا اور اس کے لیے قطعہ کا فارم اختیار کیا۔ اکبر کی شاعری میں ظرافت کا ایک خاص مقام ہے۔ اُردو میں اکبر کی اہمیت ظرافت کی وجہ سے ہے۔ اکبر پہلے ظریف ہیں، اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے۔ یہ میں اوپر نہیں لکھ آیا ہوں کہ طنز کی روح اس کا مقصد ہے۔ اکبر کے یہاں مقصد کی لَو بہت بڑھی ہوئی ہے۔ مقصد طنز کو بلند اور معیاری بنانے کا ضامن ہے لیکن اکبر کے یہاں وہ اتنا بڑھا کہ اس نے طنز کے جادو کو بے اثر بنا دیا۔ اکبر کا طنز اس لحاظ سے سیدھا اور براہِ راست ہے۔ وہ طنز میں ایما، اشارے اور تعریض کے قائل نہیں۔ وہ سامنے سے وار کرتے ہیں۔ اکبر کے فن میں ایک طرح کی چمک اور ان کی ظرافت میں ایک قسم کی عریانی ہے۔ فن میں یہ ٹیک زبان و بیان پر قدرت سے آئی۔ اُردو کے قادر الکلام شاعروں میں تو اور بھی ہیں لیکن نظیر اور اکبر کے درجے کو کوئی نہیں پہنچا۔ نظیر کی قدرت مشاہدے کی وسعت لیے ہوئے ہے جزئیات نگاری سے نظیر کی قدرت اور مشاہدے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر کی قدرت رعنائی اور گہرائی میں ہے جس کا اظہار ندرتِ بیان اور لطفِ زبان سے ہوا ہے۔ ظرافت میں عریانی میرے خیال میں اکبر کے جنسی میلانات کی غماز نہیں بلکہ اس زمانے کی سوسائٹی کو بے نقاب کرتی ہے۔ اُس زمانے میں عام سیاسی پستی کا اثر اخلاق پر بھی پڑا تھا اور شعر، شباب، شاہد، شراب کے گرد زندگی گردش کرنے لگی تھی۔

اکبر کی ظرافت فقرہ بازی کا رنگ لیے ہوئے ہے اور غالب کے برعکس یہ فقرہ بازی رعایتِ لفظی اور صنعت گری کی پیداوار ہے۔ اکبر لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نغمہ سنجی کا آغاز لکھنؤ کے بگڑتے ہوئے مذاقِ شعری کے زیرِ اثر ہوا۔ سرسید کی تحریک کی مخالفت میں جب انھوں نے پرانی روش ترک کر کے طنز و ظرافت کی راہ اختیار کی تو وہ پوری طرح لکھنؤ کے اثر سے اپنے کو پاک نہ کر سکے۔ لفظوں کا کھیل اس کے بعد بھی ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ اکبر کے اشعار کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے ان کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت کا تعلق تمام تر الفاظ کی نشست اور در و بست سے ہے۔ اکبر کی ظرافت میں زبان و بیان کی چاشنی اور محاورے کا چٹخارا ہے جس سے صرف اہلِ زبان ہی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں شگفتگی، بانکپن، رعنائی ہے لیکن گہرائی، گرمی اور تیزی نہیں۔ یہ ہنساتے ہنساتے لوٹن کبوتر بنا سکتا ہے لیکن سوچنے پر آمادہ کرنے اور خوابیدہ شعور کو بیدار کرنے کے جوہر سے خالی ہے اور اس کی وجہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ اس میں اس عہد کے عام مذاق کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس کرا دیا گیا ہے کہ اس کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ اس قسم کا مذاق مجلسوں کو گرما سکتا ہے لیکن اچھے اور بلند طنز کی پہچان یہ ہے کہ وہ دلوں کو گرمائے اور خون کے دوران کو تیز کرے۔

اس لحاظ سے اکبر پوری طرح "اودھ پنچ" حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا کام ہی لوگوں کی پگڑیاں اُچھالنا اور ان کی بھدی اور بدنما تصویریں بنانا تھا۔ اکبر اس حلقے سے نہ نکل سکے اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کا طنز ظرافت سے نہ اُبھرا اور ان کی ظرافت سستی قسم کی فقرہ بازی سے آگے نہ بڑھی اس لیے اس میں ابدیت کا رنگ نہ آ سکا لیکن اس کے باوجود اُردو ادب میں اکبر کے طنز و ظرافت کا ایک درجہ ہے۔ اس نے اُردو ادب کی فضا کو رنگینی اور خوشگواری دی اور زندگی سے اس کا رشتہ مضبوط کیا۔ غالب سے پہلے طنز و ظرافت کی حدیں ابتذال اور تمسخر سے ملی ہوئی تھیں۔ غالب نے اس کو فن کی لطافت اور حسن سے آشنا کیا لیکن تنگنائے غزل میں محصور رہنے کی وجہ سے غالب اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے طنز کا موضوع و محل نہ بنا سکے۔ اکبر نے اس کام کو انجام دیا اس لیے اکبر اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ جس طنز کا آغاز سودا سے ہوا اکبر تک پہنچتے پہنچتے وہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔

گرمی، تیزی اور تلخی اچھے طنز کے تین عنصر ہیں۔ مقصد اس کی روح ہے۔ اکبر کے یہاں گرمی اور تیزی نہیں لیکن تلخی ہے اور یہ تلخی غالب سے زیادہ ہے۔ غالب کے یہاں تیکھا پن ہے۔ اکبر کے طنز کی تلخی کہیں کہیں زہرناکی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اکبر کا وہی طنز مؤثر اور کامیاب ہے جو ہلکا اور لطیف ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا مقصدیت کے غلبہ نے اس کو بھی بے اثر بنا دیا ہے۔ اکبر بڑے فن کار ہیں اور جہاں تک مہارتِ فن کا تعلق ہے وہ مغرب کے بڑے سے بڑے فن کار کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ شعر کا لہو جذبہ ہے۔ اکبر کا جذبہ پست قسم کا ہے۔ فن کا حسن سلیقہ شعاری ہے۔ اکبر سلیقہ بھی بہت اچھا رکھتے ہیں۔ اس کا آب و رنگ لطفِ زبان و بیان سے وابستہ ہے۔ اکبر کو اس میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اکبر کے فن کی عظمت کیسے گھٹائی جا سکتی ہے۔ اکبر نے بقول آل احمد سرور تاریخی حقائق اور فطری طاقتوں کا مذاق اڑا کر اپنی جرأت کا ثبوت دیا۔ میں اسی جرأتِ رندانہ پر عظمتِ فن کی بنیاد رکھتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اکبر کا طنز ظرافت سے نہیں ابھرا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اکبر نے جن چیزوں کا مذاق اڑایا ان کو سب نے دیکھا لیکن ان میں دبا ہوا طنز بہت کم لوگوں کو نظر آیا۔ اکبر کے طنز کا نشانہ نہ تاریخی حقائق ہیں نہ فطری طاقتیں بلکہ قوم کا وہ کردار ہے جس نے اس کو "نقل انگریز" پر ابھارا، وہ بے بصری ہے جس کی وجہ سے وہ مغربی تہذیب کی شمع پر پروانہ کی طرح ٹوٹ کر گری، وہ قصورِ نظر ہے جس نے اپنی ہر چیز کو حقیر و صغیر بنا کر دکھایا۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

مال وہ ہے بنے جو یورپ میں — بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

اے خدا کر دے مجھ کو صاحب لوگ — دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالبِ مغربی — بھول جاؤں زبان بھی اپنی
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں — سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

گھر بجا ایٹ ہیں کھاتے ہیں اور تنتے ہیں
بناتے اپنے کو ہیں دوسروں میں بنتے ہیں

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

اسی نقطہ کو سامنے رکھ کر ہی میں نے عرض کیا تھا کہ اکبر پہلے ظریف ہیں، اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ طنز نگار ہیں اور میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ ظرافت سے زیادہ طنز کی ان کے یہاں اہمیت ہے۔ اکبر نے اپنی ظرافت کی طنزیاتی روح

ی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

باطل پہ نہ جاؤ حق کو سُن لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چُن لو

لیکن یہ رُوح اتنی دبی دبی اور گھٹی گھٹی ہے کہ اس کی تڑپ، گرمی اور حرکت ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے میرے خیال میں سب سے پہلے اس رُوح کی حرارت محسوس کی اور اوّل اوّل خود انھوں نے اس پر ظرافت کا ہلکا سا پردہ ڈالنا چاہا لیکن اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور یہ رُوح تڑپ کر اس پردے سے باہر نکل آئی۔

غالب کے بعد اکبر آئے لیکن اکبر کے بعد اقبال کا ظہور ہوا، شاید اس لیے اُردو میں طنز اکبر کے فن سے آگے نہ بڑھا۔ طنز کی رُوح نے اقبال کے یہاں حکمت، متانت اور روشن بصیرت کا روپ اختیار کر کے اچھی اور معیاری ظرافت کا گلا گھونٹ دیا۔

ہجوگوئی کی تاریخ

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی

اکثر صاحبانِ فن میں چشمک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض میں تو منافست ہوتی ہے اور بعض میں نفسانیت [illegible]
ہے۔ قسم اوّل کا معاملہ تو اشاروں کنایوں اور دور کی نوک جھونک پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے خفیف معاملات ہوتے ہیں کہ ان کو اکثر مورخ اور [illegible]
بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قسم دوم کا معاملہ طوالت پکڑ جاتا ہے۔ اوّل نوک جھونک ہوتی ہے پھر ہجوِ ملیح، پھر ہجوِ قبیح، پھر سب و شتم [illegible]
نوبت پہنچ جاتی ہے ؎

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم تم سے تو ہونے لگی

بعض دفعہ ہاتھا پائی بھی ہو جاتی ہے بلکہ خون خرابے بھی ہوئے ہیں۔
ہجو گلستانِ سخن کا ایک خاردار جھاڑ ہے۔ گل کی قدر افزائی میں خار کو بڑا دخل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مکمل زبان کو [illegible]
کے الفاظ و محاورات اور صحت کے ساتھ ان کے استعمال کی ضرورت ہے۔ اگر ہجو وغیرہ نہ ہو تو زبان فحش، نجس اور غلیظ الفاظ [illegible]
تصحیح سے محروم ہو جائے۔ نوک جھونک، چھیڑ چھاڑ، مدح و ذم سے شاعر کی طبیعت میں جولانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا [illegible]
نے ایک شاعر سے جو ان کا شاگرد ہونے آیا تھا کہا کہ ہجو لکھا کیجیے۔ اس نے کہا کہ کس کی ہجو لکھوں۔ مرزا نے کہا کہ آپ میری ہجو [illegible]
میں آپ کی لکھوں گا۔ ہجو میں یہی دو صورتیں ہیں۔ ایک اصلی دوسرے فرضی۔ اصلی یہ کہ واقعی طور پر کسی سے مخالفت ہو جائے، اس کی [illegible]
جائے۔ فرضی یہ کہ طبع آزمائی کے لیے کسی فرضی شخص یا ایسی شے کی ہجو کی جائے جو جواب نہ دے سکے۔ جو جوش و خروش قسم [illegible]
میں ہوتا ہے وہ قسم دوم میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اساتذہ نے مکھی مچھر وغیرہ کی ہجویں لکھی ہیں اور روکھی پھیکی ہیں۔
ہجو سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں۔ عربی میں بھی ہجویں ہیں۔ آج کل ملک میں انگریزی کا بڑا رواج ہے اس لیے یہ بتانا [illegible]
ہے کہ انگریزی میں اول ہجو کا معیار پست تھا۔ ڈرائڈن نے نظم میں سوفٹ نے نثر میں اس کا معیار بلند کیا۔ فارسی کے بڑے بڑے [illegible]
نے ہجویں لکھی ہیں اور اس پر فخر و ناز کیا ہے۔ خاقانی ابوالعلا گنجوی کا شاگرد تھا۔ ہجو گوئی میں بڑا مشاق تھا اور وہ اس کمال پر نازاں [illegible]
استاد پر بھی ہاتھ صاف کر گیا۔ کہتا ہے ؎

بینی سگ گنجہ را دریں کو ہم زرد و قفا و ہم سیہ رو

ہمارے نزدیک اردو میں ہجو گوئی کے موجد امیر خسرو ہیں اور انھوں نے اس کی بنیاد ہجو ملیح یعنی ایسی ہجو پر رکھی ہے کہ جس سے بظاہر مدح کا مفہوم ہو لیکن اس میں ذم کا بھی پہلو ہو۔ دلی میں ایک ہجو سا فن مشہور تھی۔ اس کا گھر شہر کے بھنگڑوں کا مرکز تھا جو بھنگ بانے میں مشہور تھی۔ شہر کے دور دور محلوں سے بھنگڑ اس کے ہاں آتے تھے اس لیے تقریباً ہر وقت اس کے یہاں بھنگ گھٹتی رہتی تھی۔ اس کی شان میں خسرو فرماتے ہیں ؎

اوروں کی چوپہری باجے ہجو کی اٹھ پہری

باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری

صاف صوف گر آگے رکھے جس میں ناہیں تو سُل

اوروں کے جہاں سینگ سمائیں ہجو کے یہاں تو سُل

چونکہ دلی میں ہجو کا سنگ بنیاد دلی کے اردو شاعری کے موجد اور ایک بزرگ نے رکھا۔ شاید اسی وجہ سے شاعری کی یہ قسم اہل دہلی کو بہت مرغوب ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کا دامن ان کانٹوں میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ اس کا جدا کرنا ناممکن ہے۔ دلی کے مقدسین بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ تک نے اپنے ہم عصر شاعر آبرو پر ایک نہایت فحش چوٹ کر دی تھی اور آبرو نے بھی اس کا جواب دے ڈالا تھا۔

اساتذۂ دہلی کو اس قدر دلچسپی ہجو سے تھی کہ اگر کوئی اور ہاتھ نہ لگا تو مچھر اور مکھی وغیرہ ہی کی ہجو لکھ ڈالی۔ امرا کو ہجو سننے کا ایسا شوق تھا کہ جب مصحفی اور انشا کی چلی جس میں نہایت فحش الفاظ استعمال کیے گئے تھے تو شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم ثانی فریقین سے ہجویں ننگا ننگا کر سنتے تھے اور انھیں انعام دیتے تھے۔ بعض دفعہ اپنی درباری عظمت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ضاحک اور سودا اور سکندر حاضر دربار تھے۔ شہزادے نے سودا سے کہا کچھ سنائیے۔ سودا نے عرض کیا میں نے فواح کل کچھ لکھا نہیں۔ سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے کچھ کہا ہے۔ شہزادہ نے کہا سناؤ۔ سودا نے سکندر کے نام سے ضاحک کی جو ہجو لکھی تھی پڑھی۔ ابھی دو تین ہی شعر پڑھے تھے کہ ضاحک اٹھ کر سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ نہ شاعروں نے دربار کا کچھ خیال کیا نہ شہزادے نے اپنی شان کا خیال کیا۔ بس شاعروں کی ہاتھا پائی دیکھ دیکھ کر مزا لیتے رہے۔

جب اساتذہ دہلی اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے تو یہاں بھی آکر وہی اودھم مچایا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ خواجہ میر درد کے شاگرد محشر اور جرأت کے شاگرد مہلت میں نوک جھونک ہوتے ہوتے تلوار چل گئی۔ محشر مارا گیا، مہلت فرار ہو گیا۔ کئی برس کے بعد مہلت پھر پہنچا تو محشر کے رشتہ داروں نے اس کو مار ڈالا۔ غرض اہل دہلی میں نوک جھونک اور ہجو کے ۴۸ معرکے ہوئے۔ ان میں کچھ معرکے وہ ہیں جو استاد و شاگرد میں ہوئے۔ ان میں بعض معرکے ایسے بھی ہوئے جن میں مورخین کو اختلاف ہے اور بعض نے ان کو فرضی قرار دیا ہے لیکن ایسے صرف دو تین ہی ہیں۔ چونکہ ہجو کی بنیاد نوک جھونک سے قائم ہوتی ہے اس لیے میں ان کا یہاں ایک ہی جگہ ذکر کرتا ہوں۔ میں اس امر کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ باوجود جد و جہد کے میں اس دلچسپ مضمون کو کما حقہٗ مکمل نہ کر سکا ضرورت ہے اور امید ہے کہ تاریخ ادب اردو کے شائقین و مصنفین میں سے کوئی اہل قلم اس کی تکمیل کی کوشش کریں گے ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

احسن دہلوی نے آبرو پر چوٹ کی، غالباً آبرو نے جواب نہیں دیا ۔

غزل اس طرح سے کہنی بھی احسن تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضموں بہتر ہوں

حاتم نے ناجی کے متعلق کہا ۔

سخن میں فخر اپنا بن کہے ۔ بتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کر

حاتم نے نعیم پر چوٹ کی ۔

جس دن سے کوئی یار کا حاتم مقیم ہے
بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

نعیم نے جواب دیا ۔

طلب سنو جو سلیماں کی کچھ تو خاتم ہے
لب سوال نہ ہوئے تو تیغ حاتم ہے

میر اور سودا میں چلی ۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ	ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف	(سودا)
طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں	یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے	(میر)
نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے	وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے	(سودا)

سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ میر نے اس کی ہجو میں کہا ۔

دلی میں سے کے کتیاں کئی اس نے پالیاں
ہمسایوں کی جھولی نے کئی کھائیں گالیاں

میر صاحب پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ ان کے نانا نانبائی تھے ۔ اس لیے سودا نے کہا ۔

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر	کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
بیری سے کل تو سارے مصالحوں میں مجتمع	بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو لکھ میر

سودا اور ضاحک میں ایسی چلی کہ توبہ توبہ، ضاحک کا کلام نہیں ملتا ۔ سودا نے جو کچھ لکھا ہے وہ کلیات سودا میں موجود ہے
سودا کی ہجویں فحش بھی ہیں ۔ ہم مہذب نمونے لکھنا چاہتے ہیں ۔

کیجیو میری ہجو تو اے بھڑوے نٹ
تو بھی دوں بانس سے تجھ کو الٹ

فدوی اور سودا میں ہجو بازی ہوئی ۔ سودا نے کہا ۔

شاعر ہوا ہے ندوی کیا شاعروں کو ملا — مادہ وہ زن تخلص یاروں کا مسخرلا
کوئی بااسم اوس کے گھر کا پتہ نہ پاوے — اڑ جو کہہ کسے پوچھ بتلاوے سب محلا

ندوی نے جواب دیا ؎

کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دمدار سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا
بھڑوا ہے مسخرا ہے
سودا اسے ہوا ہے

بقا کی میر و مرزا دونوں سے چلی تھی۔ بقا نے کہا ؎

مرزا و میر دونوں باہم لگے تھے ملا — فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا ہو ٹکڑوں کی ریساں ہیں — دونوں کو باندھ ہم نے اب کر دیا ہے پورا

قائم نے بھی میر کی ہجو کی تھی اور ردی سودا والا مضمون لیا تھا ؎

ردی کیسے لیے کہا ہے تم میر جی بہر — کہیے تو بجا ہے آپ کو میر خمیر
پھر میر ہوئے یہ اس طرح کیسے — راگوں میں ہے کو تقسیم راگوں میں ہمیر

نواب ظہور اللہ خاں نوا اور جرأت میں چلی۔ جرأت نے کہا ؎

ظہور حشر نہ کیوں ہو کہ کل چھٹری گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

نوا نے کہا ؎

رات کو کہنے لگے جورو کے منہ پر ہاتھ پھیر
قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

عظیم تلمیذ سودا نے ایک غزل کہی جو بحر رجز میں تھی۔ اتفاقاً دو ایک شعر بحر رمل میں ہو گئے۔ ان کا احساس نہ ہوا۔ اس پر انشا نے ایک مخمس کہا ؎

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے — کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے — پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

اس مشاعرے میں جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی مگر چند صلح جو اشخاص نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ انشا نے ایک یہ چال چلی کہ شاہ عالم ثانی سے چغلی لگائی کہ فلاں فلاں شعرا آپ کی غزل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بادشاہ ناراض ہو گئے اور غزل بھیجنا بند کر دی۔ اس پر ب نے یہ قطعہ کہا ؎

مجلس میں جس کے چاہیے جگہ شعرا کا — ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
پر بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قصایا — اکبر نہیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

لکھنؤ میں شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم کے دربار میں مصحفی نے غزل پڑھی، مقطع یہ تھا ؎

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفی چلے گئے تو شہزادے کے ایما سے انشا نے اس غزل کے اشعار کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور تمسخر آمیز الفاظ مضامین شامل کر دیے۔ مقطع کو اس طرح مسخ کیا ؎

تھا مصحفی کا ناجو چھپانے کو پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

پس اس پر جو دونوں میں چلی ہے تو بقول آزاد وہ خاک اڑا کہ کبھی تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ایسے اشعار یہاں رکھنے کے قابل بھی نہیں ہیں اور ان کی نوک جھونک کی داستان بھی اس قدر طویل ہے کہ اس کے بیان کے لیے ایک رسالہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال کچھ مہذب اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ مصحفی نے ایک غزل میں انشا کی طرف اشارہ کیا ؎

مدت سے ہوں میں سرزنش صد بلائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے — سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

مشاعرے میں ایک طرح ہوئی۔ اس پر مصحفی و انشا نے غزلیں لکھیں۔ مصحفی کا مطلع تھا ؎

سر مشک ہے تیرا تو ہے کافور کی گردن
نے موسے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر انشا نے کچھ اعتراضات کیے لیکن اہل نظر کا اتفاق ہے کہ انشا کے اعتراضات لچر اور فضول تھے۔ انشا نے اپنی غزل میں مصحفی کے بڑھاپے کا مذاق اڑایا ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے — سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن
حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشا — تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

انشا کی غزل میں انگور، حور، منصور، نور، سقنقور، منظور، لنگور، عصفور، مخمور، مغفور، مجبور، چور، کافور، دیجور، مغرور، فغفور، بلعم باعور یہ قافیے تھے۔ مصحفی کی غزل میں کافور، حور، ماہی، عصفور، مخمور، مغرور، رنجور، مجبور قافیے تھے۔ مصحفی نے انشا کی غزل پر کئی اعتراض کیے جن کا کوئی صحیح جواب نہیں ہو سکتا۔ مصحفی نے اسی زمین میں سوال و جواب کیے۔ انشا کو

اعتراضِ انشا

کیا لطف ہے کہ گردنِ کافور باندھ کر
کھلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے

ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں
دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

کافور کو نجس و کثیف کہنا کس قدر لغو ہے حالانکہ خود بھی اس شعر میں باندھا ہے ؎

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم
پگھلی پڑی ہے اس پہ کافور کی گردن (انشا)

جوابِ مصحفی

یہ لفظ مشتبہ بھی درست آیا ہے تجھ سے
خم ہوتی ہے کوئی کرے بلور کی گردن

ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح میرے قلم سے
جاتی ہے بچک شاعر مغرور کی گردن

انشا

ماہی کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا
سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے

نخرے میں آپ ہی کے یہ آئی ہے شاعری
بس منہ ہی منہ میں اٹھلی ایسے مت شرمائیے

استاد گرچہ لکھتے ہیں صلعب یونہی سہی
لیکن ڈھکی ہی اٹھی اسے بس چھپائیے

انشا نے دلی میں عظیم کے مقابلے میں ایک جلوس مرتب و مسلح کر کے نکالا تھا جس میں ایک ہاتھی پر ایک شخص ہاتھ میں ایک گڑیا اور ایک گڈا لیے ہوئے بیٹھا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے پر مارتا اور یہ شعر پڑھتا تھا ؎

رنگ نیا لایا ہے چرخ کہن
لڑنے بھڑنے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفی کے ساتھ بے گناہ مصحفن کی بھی اسی طرح گت بنائی جس طرح سودا نے ضاحک کی بیوی کی بنائی تھی لکھا تھا ؎

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر بجایا
گا گا کے رات ساری ہمسایوں کو جگایا

انشا کے جلوس کے جواب میں مصحفی کے دو شاگردوں گرم و منظر نے جلوس نکالنا چاہا لیکن چونکہ شہزادہ سلیمان شکوہ انشا کے طرفدار تھے ان کے ایما سے کوتوال نے اس جلوس کو روک دیا۔ انشا نے جب مشاعرہ میں مصحفی پر یہ چوٹ کی ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

تو سرِ مشاعرہ مصحفی کے شاگرد منظر نے جواب دیا ؎

لنگور کا وہ قافیہ ایسا تھا کہ جیسے
باندھے دم لنگور میں لنگور کی گردن

یہ چوٹ اس وضع پر تھی کہ سید انشا گلے میں ایک دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کا ایک سرا آگے اور ایک پیچھے رہتا تھا۔ سید انشا کا دارے کا ہتھیار یہ تھا کہ ایک تو وہ لوگوں کو اپنے شرفِ سیادت سے مرعوب کرتے تھے کہ سید کو برا کہنا عاقبت کو خراب کرنا ہے۔ دوسرے وہ مسخرگی کی وجہ سے حکام کے منہ چڑھے رہتے تھے اس اثر سے بھی لوگوں کو دباتے۔ یہی چال انھوں نے دہلی میں چلی اب لکھنؤ میں بھی یہی کیا کہ اول شہزادے سے کہا کہ مصحفی نے ہجو میں آپ کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر مصحفی نے شہزادے کے حضور میں قطعہ پیش کیا اور کہا ؎

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ رزم و بزم میں ہے پایہ تخت کا وہ شبیر
سو ستم مجھے ناداں نے ہجو نسبت کیا
قباحت اس کی جو سمجھے نہ اس کی دے تعزیر

اور اسی داؤں سے گرم و منظر کو دبانا چاہا اس پر منظر نے کہا ؎

مت خوفِ سلاطیں سے تو مجھ کو ڈرا لے
وہ تو ہے کہ جس کو کوئی ڈانٹے کوئی منالے
دہشت کی تو مرنے نہیں تو باتیں نہ سنائے
کی ہجو اگر میں نے تو کیا قہر کیا ہے
نے دین مرا اس سے نہ دنیا گئی بگڑ رہے

مہر سجاد سے بھی انشا کی چلی۔ سجاد نے جو کچھ کہا وہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ سجاد معمار کے بیٹے تھے، انشا نے اس پر طنز کیا ؎

وہ جو معمار کا اکڑ کے تنا — میں نے پتھر بھی دھوئے پر نہ بنا
تب تو بنا تھا میرے دل میں ٹھنا — راج اٹھائے یہ جس بنا کی بنا
منہدم آخرش کرے ہے فنا

کوئی شاعر بیکس تھا اس نے سید انشا کے متعلق کہا ؎

ظاہر میں تو ایسے ہیں کہ ماشاء اللہ
سب کہتے ہیں ایک ہو گئے انشاء اللہ
باطن میں جو دیکھا انھیں اتنے ہیں یہ ہیچ
لاحول و لا قوۃ الا باللہ

میر اور مصحفی میں بھی چلی تھی۔ کچھ زیادہ تحقیق نہیں ہو سکا مصحفی نے کہا تھا ؎

آتیں تو کریں مجھ سے فنِ شعر میں پنجہ
سودا نہیں بیٹھے تو ہیں سودا کی جگہ میر

نواب آصف الدولہ نے اپنی غزل میں یہ مقطع کہا ؎

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

اس پر شمس النساء بیگم شرم تلمیذ مصحفی نے کہا ؎

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ — نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

معروف دہلوی نے رنگین کی ہجو لکھی مجھے اس کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے نہ اس معروف کے حالات معلوم ہو سکے بس اتنا پتہ چل سکا کہ یہ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی نہیں ہیں اور کوئی شاعر ہے۔ رنگین نے کہا ؎

معروف تو سُن بات یہ اس احقر کی — کیوں تو نے زباں ہجو میں اس کی تر کی
سوسن کے نری ایک کسے گا رنگیں — زرگر کی جو سو تو ایک آہن گر کی
معروف کی رنگیں نے سُنی تقریر — تقریر کی موجب نہیں اس کی تحریر
لوگوں سے کہا اس نے کہ سچ کیا — دیوان گدڑی ہے اس کا ہے وہ فقیر

لکھنؤ والوں میں بھی معرکے ہوئے مگر بہت کم۔ آزاد نے بھی اس معاملہ میں اہلِ لکھنؤ کو سراہا ہے۔ لکھنؤ کے مجھے صرف سات آٹھ معرکوں کا پتہ چلا ہے، ان میں نہ سانگ اور جلوس ہوئے نہ گالی گلوچ ہوئی نہ لٹھ بندی ہوئی، بس مہذب چوٹیں ہوئیں۔ ناسخ اور آتش میں چلی، ناسخ نے ایک غزل میں یہ شعر فخریہ لکھا، اس میں اپنے نام امام بخش کی رعایت رکھی ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہِ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

آتش نے اسی وقت کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

ناسخ ایک شخص کے پروردہ مشہور ہیں۔ مصرعہ ثانی میں اس طرف اشارہ ہے مگر اسی وقت ناسخ کے ایک شاگرد نے جواب دیا اور خوب دیا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

آتش نے ناسخ کی غزلوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں تو ناسخ نے کہا ؎

ایک جاہل لکھ رہا ہے میرے دیوان کا جواب
بوسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

سلیس نے اس شعر کی تضمین کی اور انیس کے خاندان پہ الٹ دیا ؎

نہ مونس کی باتیں تھیں ایسی نفیس ‏ ‏ نہ تھی انس کی نظم ایسی سلیس
یہ کہتے ہے بقول انیس اے سلیس ‏ ‏ خواسنجیوں نے ترقی اے انیس

ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

مونس اور انس انیس کے بھائی تھے نفیس ان کے بیٹے تھے۔ انیس نے ایک سلام کہا اس میں یہ اشعار تھے ؎

سدا ہے فکر ترقی مآل بینوں کو ‏ ‏ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ مہرباں ہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے ‏ ‏ چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

یہ قافیہ ایسا مقبول ہوا کہ واجد علی شاہ نے بھی اس کو باندھا ؎

جہاد نفس عبادت میں ہے مجھے منظور
وضو کے وقت الٹتا ہوں آستینوں کو

اسی زمانے میں مرزا دبیر کے فرزند اوج نے سلام لکھا اور آستینوں کے قافیہ پر بہت زور دیا ؎

الٹ گیا در خیبر سے پہلے قلعہ چرخ ‏ ‏ خدا کے ہاتھ نے الٹا جو آستینوں کو
یہ دست برد خزاں کا بہار میں ڈر ہے ‏ ‏ کہ غنچے تھامے ہیں پھولوں میں آستینوں کو

اس پر انیس کی طرف سے جواب ہوا ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کا پھر انبار ‏ ‏ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل ‏ ‏ اٹھا چکے ہیں زمیندار جو زمینوں کو
مزا یہ طرفہ ہے مضموں تو دستیاب نہیں ‏ ‏ مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اس پر دبیر کے شاگرد مشیر نے کہا ؎

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی ‏ ‏ تو پھونک دوں گا میں خرمن میں خوشہ چینوں کو
ہزار بار سزا پا کے منہ پہ چڑھتے ہیں ‏ ‏ مشیر کیا کہوں ان احمق الذہنوں کو
اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر ‏ ‏ نیا سمجھتے ہیں یہ لوگ ان زمینوں کو

اور نظر برادر دبیر نے کہا ؎

طعنہ زن ہوتے ہیں جو کہ دبیر پہ نظر
کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں لوہی ہیں

رشک شاگرد ناسخ نے یہ غزل کہی ؎

یار کو ہم سے کوئی لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

اس پر کسی شاعر نے کہا ؎

دور سے سر پھیر کے دکھاؤ تس — رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ تس

شاہ نصیر نے مولوی قدرت اللہ قاسم تلمیذ ذوق پہ چوٹ کی ؎

پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاض گردان
سن اسے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

قاسم نے کہا ؎

واسطے انسان کے انسانیت اول ہے شرط — میر ہو یا میرزا ہو خان ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں — گر نہ خم تعظیم کو پہلے سر محراب ہو

صمصام الدولہ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کو بادشاہ کے حضور میں بڑا دخل تھا۔ شاہ نصیر کسی معاملہ میں ان سے کھٹک گئے اور یہ شعر کہا ؎

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا
جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نصیر اور ان کے شاگرد ذوق میں بگاڑ ہو گیا تین مشاعروں تک ایک دوسرے کی ضد پر ایسی طرحیں ہوئیں جن کا قافیہ مگس بس اور ردیف تیلیاں تھیں۔ شاہ نصیر ہر مرتبہ ساٹھ ستر شعر کا دو غزلہ پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انیس بیس شعر کی غزل پڑھتا تھا۔

دوسرے مشاعرے میں ذوق نے جو غزل پڑھی ان میں یہ شعر تھا ؎

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

تیسرے مشاعرے میں گھنشام داس عاصی شاگرد نصیر نے کہا ؎

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے — قافیے میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب فہم راہ خدا — یار کی چلمن میں ہوں پائے مگس کی تیلیاں
شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ — باندھیے گر ہو سکے تار نفس کی تیلیاں

اس کے بعد نصیر کے بیٹے شاہ وحید الدین نے کہا ؎

گرچہ قندیل سخن کو پا لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس مشاعرے میں باہم کچھ گفتگو بھی ہوئی اس پر مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا سوال و جواب ہو کر کچھ بے لطفی ہو جائے۔

غالب نے دو ایک مشاعروں میں غزل نہ پڑھی تو ذوق نے کہا ؎

رکا وہ خوب نہیں طبع کی روانی میں — کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

غالب نے جواب دیا ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

غالب کا دیوان طبع ہو کر آیا تو عبداللہ خاں آوج نے کہا ؎

ڈیڑھ جزو پر بھی تجھے ہے مطلع و مقطع غالب
غالب آساں نہیں صاحب دیواں ہونا

مرزا غالب کے دو شعروں پر ایک شاعر نے اس طرح تضمین کی کہ ہر بند میں ان پر چوٹ کی ہے ؎

دی ہے اسے توفیق نے فن خدا نے — جاتا ہے ہر اک کوچے میں یہ شعر سنانے
گھر پر بھی بلا لیتا ہے دعوت کے بہانے — ایسا بھی کوئی ہے کہ جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یہ شخص وہ ہے کوئی اس کو پیٹ بھی جاتا — تو مہر بہ ہستی کے ہرگز فریب میں آتا
تھا کل تلک تو رقیبوں کی جھڑکیاں کھاتا — ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

جعفر دہلوی نے مرزا غالب کے متعلق کہا ؎

سب اسے جانتے ہیں وہ ہے اکالی مذہب
کوئی لالچ اسے دے گا تو وہ ڈھل جائے گا

مرزا غالب نے منشی سعادت علی خاں مصنف کی ہجو لکھی ؎

اے منشی خیرہ سر سخن ساز نہ ہو — عصفور ہے تو مقابل باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ — لاٹھی وہ لگے جس میں کہ آواز نہ ہو

غالب سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ غالب نے معذرت میں ایک قطعہ لکھا، اس میں کئی شعروں میں در پردہ ذوق پر چوٹ کی ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یعنی میں ایسے خاندان سے نہیں ہوں جس کا ذریعۂ اعزاز صرف شاعری ہو۔ یہ ذوق کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک غریب آدمی شیخ محمد رمضان کے فرزند تھے۔ آزاد نے شیخ رمضان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی، مرزا فرحت اللہ بیگ کو استرا نظر آیا۔ خیر مجھے اس سے غرض نہیں، وہ شمشیر نواز جنگ کے پسر ہوں یا مقراض الدولہ کے فرزند ہوں، ہم تو یہ جانتا ہوں کہ ہزاروں کی اصلاح بنا گئے۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

اس میں دونوں کے سیہ فام ہونے پر چوٹ ہے۔ مومن شاعر بھی تھے، حکیم بھی تھے، منجم بھی تھے لیکن انھوں نے کبھی ان فنون کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ راجہ اجیت سنگھ نے ان کو ایک ہتھنی ہدیہ دی۔ اس پر اوج نے کہا ؎

جنھوں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

حکیم آغا جان عیش مشہور شاعر تھے، ظفر بادشاہ کے درباری تھے۔ انھوں نے ایک سادہ لوح مُلا کو جو تکبندی کر سکتا تھا ہدہد تخلص کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے کچھ آذوقہ مقرر کر دیا اور منقار جنگ خطاب دیا۔ ہدہد تک بندی کر لاتا حکیم جی اصلاح کر دیتے۔ دوسرے درباریوں نے ہدہد کے مقابلہ پر باز لا کر چھوڑ دیا۔ ہدہد اور باز میں خوب چونچیں ہوئیں۔ افسوس مجھے باز کا کوئی شعر نہیں ملا۔ ہدہد کی گل افشانیاں کچھ دستیاب ہوئی ہیں ؎

گر اب کے باز ری میداں میں آئے سامنے میرے
تو دم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے
ارے روئے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اس کی
کہ ہدہد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

کچھ دنوں کے بعد باز تو اڑ گیا یار لوگوں نے ایک کوا لا کر پالی میں چھوڑ دیا۔ ہدہد نے اس کے بھی خوب ٹھونگیں ماریں۔ کوا کچھ کائیں کائیں غائیں غائیں کر کے اڑ گیا ایسا غائب ہوا کہ کچھ نشان تک نہ چھوڑا۔

ہدہد نے کہا ؎

جوان آیا ہے بدل اک عدد کتے کی
اس کی ہے باتوں سے ظاہر بری خو کتے کی
پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوا ہوگا
پر جو معلوم کیا یہ ہے بہو کتے کی

مرزا داغ دہلوی سانولے رنگ کے آدمی تھے، رام پور میں داروغہ اصطبل مقرر ہوئے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

شہر دہلی سے آیا اک مسکیں
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

حالی پر ایک دہلوی نے اعتراض کیا تم اہلِ زبان نہیں ہو، پانی پتی ہو۔ حالی نے کہا ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالی کی ہجو میں ایک شاعر نے کہا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

پیروڈی، اُردو ادب میں

ظفر احمد صدیقی

آپ کے حلقۂ تعارف میں ایسے بہت سے اصحاب ہوں گے جو عام نظروں کو بالکل معقول اور ہموار معلوم ہوتے ہوں لیکن کوئی نقال ان کے لہجہ کی غیر معمولی سی اجنبیت یا ان کے انداز کا معمولی سا بے تکا پن پا لیتا ہے اور اس کی مبالغہ آمیز نقل آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تو آپ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال پیروڈی کا ہے۔

پیروڈی وہ صنفِ ظرافت ہے جس میں کسی کے طرزِ نگارش کی تقلید کر کے اس کے اسٹائل یا خیالات کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُردو میں یہ صنفِ ظرافت نسبتاً کمیاب ہے۔ تنقید میں بھی اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کا کوئی ایک لفظ ہمیں ایسا نہیں ملتا جو اس کے مفہوم کو پورا پورا ادا کر سکے۔ مضحک نقالی، ہجو یہ تقلید یا 'خاکہ اڑانا' جیسے الفاظ سے اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ الفاظ اوّل تو پیروڈی کے تمام تر مفہوم پر حاوی نہیں دوسرے ان کے مطالب اور رجحانات ذہنوں میں متعین نہیں اس لیے زیرِ نظر مضمون میں ہم انگریزی لفظ پیروڈی کے استعمال ہی کو ترجیح دیں گے۔۔

پیروڈی کسی ادبی تحریر یا اسٹائل کی تقلید ہوتی ہے لیکن ہر تقلید کو پیروڈی نہ کہیں گے۔ اگر کسی طرزِ نگارش کو قابلِ تعریف سمجھ کر اس کی پیروی کی جائے تو وہ پیروڈی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی ادبی نمونہ کو اچھا سمجھ کر اس کی نقلید کی کوشش کی جائے مگر نقل میں اصل کے محاسن پیدا نہ ہو سکیں اور نتیجۃً مضحک ہو جائے تب بھی اس پر پیروڈی کا اطلاق نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر امین حزیں سیالکوٹی کی اقبال کے تتبع میں بعض نظمیں یا بعض اُردو شعراء کی غالب اور داغ وغیرہ کے رنگ کو اپنانے کی کوششیں اس دعوے کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پیروڈی کا اطلاق صحیح طور پر اس ادبی تقلید پر ہوگا جس میں مصنف کسی طرزِ نگارش یا طرزِ فکر کی کمزوریوں کو یا ان پہلوؤں کو جن کو وہ مضحک یا لغو سمجھتا ہے نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے مگر بعض اعتبارات سے عام تنقید سے زیادہ مؤثر اور کارگر۔ بعض ادبی کمزوریاں اتنی باریک ہوتی ہیں کہ عام نظریں ان پر نہیں پڑتیں یا بار بار کے مشاہدے سے ان کی عادی ہو جاتی ہیں۔ پیروڈی کے آئینہ میں یہی کمزوریاں اتنی بڑی ہو کر نظر آتی ہیں کہ ان سے کسی کا نگاہ چرانا ممکن نہیں ہوتا۔ پیروڈی کرنے والا ان کو اس پس منظر سے نکال کر جہاں نظریں ان کی عادی ہو چکی ہیں ایسے سلسلے میں پیش کرتا ہے جہاں ان کا بے تکا پن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ظرافت کی چاشنی تنقید کے پھیکے یا کڑوے گھونٹوں کو گوارا بنا دیتی ہے۔

اب یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیروڈی میں ظرافت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ کیوں ہم اس پر ہنسنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا

اگر ہم یہاں ہنسی کے متعلق بعض فلسفیانہ یا نفسیاتی نظریوں کا مختصراً ذکر کر دیں۔

ہربرٹ اسپنسر کا خیال ہے کہ ہنسی زائد قوت کے چھلک جانے کا نام ہے (OUTFLOW OF SURPLUS ENERGY) یہی وجہ ہے کہ تندرست و توانا آدمی اکثر بات بے بات ہنسنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

بعض فلسفیوں کے نزدیک ہنسی سماجی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔ جن لوگوں کو ہم وضع قطع یا چال ڈھال وغیرہ میں روشِ عام سے ہٹا ہوا دیکھتے ہیں ان پر ہنس کر ان کو سماجی معیار کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میکڈوگل کا نظریہ ہے کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مدافعت ہے۔ انسان اپنی سوشل فطرت اور جبلی ہمدردی کی وجہ سے مجبور ہے کہ دوسروں کی مصیبت اور غم سے متاثر ہو۔ اب اگر وہ ہر شخص کی معمولی پریشانی اور سراسیمگی (جیسے کیچڑ میں پھسل جانے یا کرسی سے گر پڑنے) کا اثر لینے لگے تو زندگی دشوار ہو جائے۔ اس لیے نیچر ہنسی میں اس اثر کو اڑا دیتی ہے۔

اسی سے ملتا جلتا خیال لارڈ بائرن نے اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے:-

"AND IF I LAUGH AT ANY MORAL THING, ITS THAT I MAY NOT WEEP."

(یعنی میں اگر کسی فانی چیز پر ہنستا ہوں تو یہ اس لیے ہے کہ کہیں میں رو نہ دوں)

نیٹشے لکھتا ہے کہ "صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ ا… کو ہنسی کو ایجاد کرنا پڑا۔"

برگساں ہنسی کو زندگی کی تخلیقی قوت کا میکانکی مظاہر کے خلاف ردِ عمل قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کے تکیہ کلام پیہم موقع بے موقع ایک… ہی جملہ دہرانے پر ہمیں اس لیے ہنسی آتی ہے کہ ہم اس سے اس میکانکی طرزِ عمل کی بجائے تخلیقی عمل کی توقع رکھتے ہیں۔

تھامس ہابز کے نزدیک ہنسی کا راز دوسروں کی کمتری کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تصور پر ایک فوری احساسِ عظمت میں پوشیدہ…

اسٹیفن لی کاک اپنی تصنیف 'ظرافت اور انسانیت' میں اسی نظریہ کی تائید کرتا ہے اور ہنسی کی اصل وحشی انسان کی اپنے دشمن کو… دیکھ کر فتح و مسرت کی چیخ ہا۔ ہا۔ کو قرار دیتا ہے۔

ہنسی کا ایک عام فہم نظریہ یہ بھی ہے کہ ہمیں عدم ہم آہنگی (INCOUGRUITY) یا تضاد (MALADYUS TWENT) پر ہنسی آتی ہے۔ رندوں کے مجمع میں کوئی مقطع بزرگ آن پھنسیں یا کسی بہت لمبے آدمی کے ساتھ کوئی پست قد جا رہا ہو تو ہمیں ہنسی آ جائے گی۔

ان تمام نظریوں میں کچھ نہ کچھ صداقت نظر آتی ہے لیکن کسی ایک کو ہنسی کے ہر مظاہرے کی تشریح کے لیے سمجھنا مشکل معلوم ہو…

اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے حسن و قبح سے بحث کی جائے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان سے پیروڈی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ زائد قوت کے چھلک جانے کا نظریہ بعض صورتوں میں خواہ صداقت رکھتا ہو لیکن اس سے اس بات کی تشریح نہیں ہوتی… پیروڈی ہی پر کیوں ہنسی آتی ہے۔

میکڈوگل کا نظریہ بھی کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف فطرت کی مدافعت ہے، پیروڈی کی تشریح میں کچھ زیادہ مددگار نہیں ہوتا۔ کھینچ تان ہی سے اس کی تاویل کرنا پڑتی ہے۔

باقی نظریے کافی حد تک پیروڈی پر چسپاں ہو جاتے ہیں اور مختلف زاویوں سے اس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پیروڈی اصلاح کا ایک کامیاب حربہ ہے اس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مسلمہ ادبی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو ادیبوں کو راہ پر لانے کے لیے اکثر پیروڈی کو استعمال کیا جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہمیشہ ایک اعلیٰ اصلاحی مقصد ہی پیروڈی کا محرک ہوتا ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کی تذلیل اور کمتری ہمارے جذبۂ خود پسندی کو تسکین دیتی ہے اور پیروڈی میں ہمارے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہنسی کی اکثر صورتوں میں یہ جذبہ شعوری یا غیر شعوری طور پر کام کرتا ہو لیکن ہر پیروڈی کا محرک اس کو قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کسی شاعر کے سامنے اس کے اشعار ہی کی پیروڈی پیش کیجیے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہنس سکنے کی عالی ظرفی رکھتا ہے تو وہ ضرور اس سے لطف اندوز ہوگا۔ حالانکہ اس میں دوسرے کی تذلیل یا خود پسندی کی تسکین کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

عدم ہم آہنگی یا تضاد کا نظریہ اگرچہ کسی گہری حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا لیکن ایک عام اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہنسی کی کوئی صورت بھی ہو اس کے موضوع میں عدم ہم آہنگی اور تضاد کا ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مضحک (LUDICAROUS) کا اطلاق ہی اس چیز پر ہوگا جس میں کچھ بے تکاپن یا بہ الفاظِ دیگر عدم ہم آہنگی پائی جائے۔ پیروڈی بھی جو ایک مضحک ادبی تقلید ہے ان ہی خصوصیات سے متصف ہوتی ہے۔ پیروڈی کرنے والے کا آرٹ ہی یہ ہے کہ وہ اس تضاد اور عدم ہم آہنگی کو جو اصل مصنف کے یہاں بہت باریک اور مبہم سی ہوتی ہے نقل کے ذریعے سے نمایاں کر دیتا ہے۔ کبھی یہ اثر بہت پرشکوہ الفاظ اور غیر اہم معانی کے امتزاج سے پایا جاتا ہے جیسے مضحک رزمیہ شاعری (MOCK HEROIC POETRY) میں۔ کبھی کسی نظریہ یا فلسفہ کا تضاد اس کو اور زیادہ مہمل اور بے ربط بنا کر دکھایا جاتا ہے جیسے چسٹرٹن یا برنرڈ شا کے بعض ناولوں میں۔

برگساں کا ہنسی کے متعلق نظریہ اس کے "تخلیقی ارتقا" کے فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اس فلسفہ کی باریکیوں میں پڑے بغیر اس کے ہنسی کے نظریہ کی تائید میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پیروڈی پر سب سے زیادہ یہی چسپاں ہوتا ہے۔ زندگی کی قوت اپنے تخلیقی کارنامے کے انسان تک پہنچنے کے بعد اپنے اظہار کی نت نئی شکلیں ڈھونڈھتی ہے ــــ

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

نقل میں اس تخلیقی رجحان کے خلاف ایک میکانکی مظاہرہ ملتا ہے اس لیے ہنسی اس میکانکی مظاہرے کے خلاف زندگی کا ردِ عمل ہے۔ اس لحاظ سے ہر نقل فی نفسہ ہمارے لیے ہنسی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ایک بہروپیا جب ہو بہو کسی کی شکل بنا کر ہمارے سامنے آتا ہے تو چاہے اس شکل میں کچھ بے تکاپن نہ ہو ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص جو مختلف لوگوں کا مکمل چربہ اتار لیتا ہے ہمیں ہنسا دیتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے (AS YOU LIKE IT) میں ہیروئن اور اس کے بھائی کا ہم شکل ہونا سامانِ ظرافت فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی تحریر میں اپنی انفرادیت اور قوتِ جدت کا اظہار کرنے کی بجائے کسی دوسرے کے اسٹائل کی نقل پیش کرتا ہے تو اس پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نقل میں اصل سے جتنی مشابہت ہوگی اتنی ہی وہ ہمارے لیے مضحک ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ معمولی مشابہتیں تو حقیقی زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن کسی نقل میں تقریباً سو فی صدی مشابہت ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ زندگی کا تخلیقی عمل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک میکانکی مظاہرہ ہے۔ اس اصول میں ایک استثنا بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر اوقات نقل کا مبالغہ آمیز ہونا بھی اس کو ہماری نظر میں مضحک بنا دیتا ہے حالانکہ اس

مبالغے سے اصل سے اس کی شباہت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن غور کیجیے تو یہ استثناء ہمارے نظریہ کی تردید نہیں کرتا۔ مبالغہ آمیز نقل اس سے قابل مضحک ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ یہ جامہ، نقل کرنے والے پر راس نہیں آ رہا ہے اور یہ اسٹائل اس کی شخصیت کا فطری تخلیقی اظہار نہیں۔

پیروڈی کی مختلف شکلوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیروڈی کے محرکات عموماً تین قسم کے مقاصد ہو سکتے ہیں:

۱۔ اصلاحی اور تنبیہی

۲۔ تفریحی

۳۔ تخریبی

ان ہی عنوانات کے ماتحت پیروڈی کی تمام اقسام آ جاتی ہیں لیکن یہ سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ ان اقسام کے درمیان کوئی منطقی حدِ فاصل ہے۔ اکثر ایک ہی پیروڈی تفریحی اور اصلاحی یا تفریحی اور تخریبی مقاصد کی جامع ہوتی ہے۔ کبھی اصلاحی مقصد کے ساتھ صحیح بصیرت اور توازن نہ ہونے کی وجہ سے تخریبی پہلو آ جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔

پیروڈی کے لیے ایک زرخیز میدان وہ روایات اور قدریں فراہم کرتی ہیں جو ماحول کے بدل جانے سے اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ یہ روایتیں سماجی ہوں یا ادبی پیروڈی ان کا مذاق اڑا کر ان کے ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ادب کے ور سنٹے وی ساودرا کی تصنیف ڈان کوگزوٹ لامنشا (DON QUIXOTE DELA MANCHA) کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کو سرشار نے "خدائی فوجدار" کی شکل میں اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ اس ناول میں کسی ایک ادیب کا نہیں بلکہ ہیرو ازم اور بہادری (CHIVALRY) کی ان روایات کا خاکہ اڑایا گیا ہے جن سے سولھویں سترھویں صدی کے ناول بھرے ہوئے تھے۔ اردو میں اس قسم کی مستقل تصانیف تو نہیں ملتیں لیکن شفیق الرحمٰن کے مضامین میں کہیں کہیں یہ رنگ جھلک جاتا ہے مثلاً قصہ چہار درویش جس میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار کا کچھ ماحول لے کر عہدِ جدید کے چار نوجوان طالب علموں کو چار درویشوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا مقصد اس پیروڈی میں زیادہ تر تفریحی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی پیروڈی کی ایک قسم ہمیں ملا رموزی کی نثر میں ملتی ہے۔ مولویانہ اردو جس کے نمونے ہمیں عربی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں ملتے ہیں اپنے زمانے میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ رکھتی ہو لیکن زبان کی ارتقا اور صفائی میں ایک ایسا دور آنا ضروری تھا جب اس کی اجنبیت مذاقِ سلیم پر بار گزرنے لگے۔ معلوم نہیں ملا رموزی نے اس طرزِ بیان کی اصلاح کے لیے اس کو تحریروں میں اپنایا یا اس کی ظرافت آمیز اجنبیت کی وجہ سے اس کو محض ایک ذریعہ تفریح کے طور پر استعمال کیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے ملا رموزی کی نثر مولویانہ اردو کی پیروڈی پیش کرتی ہے۔ البتہ اس میں ذہانت کا فقدان اور سستی ظرافت کی بہتات نظر آتی ہے۔ اگر ایک آدھ مضمون ہی اس رنگ میں لکھ کر چھوڑ دیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا لیکن ملا صاحب نے ستم یہ کیا کہ اس کو اپنے مستقل رنگ کی حیثیت سے اختیار کر لیا جیسے کوئی شخص کسی کا منہ چڑانے کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے خد و خال کو مسخ کر لے۔

بعض اوقات تجدد کے ضرورت سے زیادہ تیز دھارے کو روکنے یا نئی تحریکوں کی بے راہ روی کو اعتدال پر لانے کے لیے پیروڈی ایک مؤثر ذریعہ کا کام دیتی ہے۔ اودھ پنچ کے دور میں پنجابی اردو کی ناہمواری اور ادبِ لطیف کی بے اعتدالیوں کے خلاف اچھے اچھے مضامین نکلے جو پیروڈی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ابھی قریبی زمانہ میں فرقت کاکوروی کی تصنیف "ماوا" ایک نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے مشہور ترقی پسند شاعروں کے کلام کے نمونے دے کر ان ہی کے رنگ میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ صاحب "ماوا" کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر شاعر کی انفرادیت اور خصوصی طرز کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے رنگ کو اتنا تیز کر کے پیش کیا ہے کہ مہملیت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے REDUCTIVE AD ABSURDUM. لیکن "ماوا" کی کمزوری یہ ہے کہ اس کا موضوع کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس پر پیروڈی کے وار اوچھے ہی پڑتے ہیں۔ نئی پسند شاعری خود مسلمہ قدروں سے بغاوت کرنے میں کبھی پیروڈی کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اگر اس کی پیروڈی کی جائے تو اس پر سنجیدگی سے نئی شاعری کا دھوکہ ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیب جنھوں نے ترقی پسند شاعری کی پیروڈی سے ابتدا کی، آخر میں اپنی ترقی پسند شاعری کی علامتوں پر ایمان لا کر سنجیدگی سے اسی رنگ میں کہنے لگے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض بڑے ادیب اور شاعر اپنے زمانہ سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ وہ مروجہ قدروں کے خلاف نئی اور جدید قدریں ادب میں پیش کرتے ہیں۔ بکا اپنے زمانہ سے آگے نہ دیکھ سکنے والے مصنف ان ادیبوں اور شاعروں کی روح تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے ان کو اپنی پیروڈی کا نشانہ بناتے ہیں۔ غالب، حالی اور اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر اپنے اپنے زمانوں میں اسی مذاقِ عام کی کج روی کا شکار رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام ادیب یا مصنف جن کی تصنیفات آج پیروڈی کو دعوت دیتی ہیں کل غالب اور اقبال کی جیسی شہرت اور ہر دلعزیزی کے متوقع ہو جائیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ بعض اوقات پیروڈی کے تیر بے محل بھی صرف کیے جا سکتے ہیں۔

بعض اوقات کسی نمایاں اخلاقی یا اصلاحی مقصد کا حامل ہونے کی بجائے پیروڈی ایک اور اہم غرض کو پورا کرتی ہے یعنی زندگی کو توازن بخشنا۔ جب ہم جذباتیت کی رو میں بہتے ہوتے ہیں اپنے رجحانات اور میلانات کے یک طرفہ پن میں کھو جاتے ہیں، اپنے خیالات اور جذبات کی شدت پسندی میں اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی اور نقطۂ نگاہ کا تصور بھی نہیں کرتے۔ ایسے میں پیروڈی ہمارے جذبات کی تقدیس پر ضرب لگاتی ہے۔ ہمارے معتقدات کے اصنام کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ ہماری اہمیتوں کے مقابلہ میں نہایت ہی غیر اہم چیزیں پیش کر کے ہمارے نقطۂ نظر کی شدت پسندی کا مذاق اڑاتی ہے۔

فارسی میں اس قسم کی پیروڈی کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کی پیروڈی ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے ؎

من آں رستمِ وقت روئیں تنم — بنا شہ بگرز گراں بشکنم
بپوشم اگر جوشنِ جنگ را — ہزیمت دہم پشۂ تنگ را

(جعفر زٹلی)

عبید زاکانی کا "موش و گربہ نامہ" بھی اسی قسم کی پیروڈی ہے۔

جعفر زٹلی کی اردو شاعری میں بھی اس قسم کی پیروڈی کی جھلک ملتی ہے لیکن اس کی اخلاقی اور ذہنی سطح بہت پست ہے۔

میرا گمان ہے کہ اردو شاعری کی بعض بدنام اصناف کی ابتدا غالباً پیروڈی سے ہوئی ہوگی مثلاً "ریختی" یا "چرکینیات"۔ بہت ممکن ہے ان شاعروں نے ابتدا پیروڈی سے کی ہو لیکن بعد کو اپنی فطرت کی کج روی کا خود شکار ہو گئے ہوں۔

زندگی کو توازن بخشنے اور مذاقِ عام کو اعتدال پر لانے کے ساتھ ساتھ پیروڈی خود اپنے ہدف کے لیے بعض اوقات بڑے مصلح کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنی شدت آمیز تنقید سے ادیبوں کو خود نگری پر مائل کر کے ایک معتدل سطح پر لے آتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

(SENSE OF HUMOUR)

ی کوشش کی گئی ہے محض اپنی اجنبیت کی وجہ سے ایک سستی ظرافت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ۔

محمد حسین آزاد کے مقدمہ آبِ حیات میں البتہ اُردو انشا پردازوں کی نثر کے خاکے ایک واضح تنقیدی مقصد کی خاطر پیش کیے گئے

ہیں۔ لیکن ان میں ظرافت کا عنصر اس قدر کم ہے کہ ان پر صحیح معنی میں پیروڈی کا اطلاق ہونا مشکل ہے ۔

معنوی اور ظاہری پیروڈی کا دلچسپ امتزاج ظریف لکھنوی کی بعض طویل نظموں میں نظر آتا ہے مثلاً میونسپل الکشن اور مشاعرہ۔ ان نظموں

میں ایک طرف الکشن اور مشاعرے کے اداروں کی نہایت ظریفانہ مصوری کی گئی ہے، دوسری طرف ضمنی طور پر بعض اشخاص کے مخصوص طرزِ گفتگو

کی پیروڈی ۔ مثلاً میونسپل الکشن کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اب مجتہدانہ گفتگو کی آب و تاب ملاحظہ ہو

ووٹ دے دیں گے عوض میں آپ کو خمسین کے	اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے
حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے	اس سے کم لینا مرادف ہے مری توہین کے

ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجیے

ہے یہ کارِ خیر بس تعجیل فرما دیجیے

شاعری میں لہجوں اور بولیوں کی پیروڈی کے سلسلہ میں بھی اولیت کا سہرا انشا ہی کے سر ہے ۔ یہ ہمہ رنگ شاعر اپنی نادرالکلامی اور ظرافت

میں کبھی جاہل ہندی عورتوں کی بولی بولتا نظر آتا ہے ؎

بھر بھر جھاجوں برست نور

رو بلبتاں وستن دور

کبھی کشمیری اُردو کا یوں خاکہ اُڑاتا ہے ؎

کشمیری معلم کو جو اک طفل نے ناگہ	انگور کے دانے
لا کر دیے اور ساں سے کہا کھا مجیے میرا	ہے قسم ولایت
تجھے ہیں کشمیر کے متصل ہو نہ بولے	شاگردسے اپنے
چل سامنے سے میرے بتا کر نہیں لے جا	ین میں نہیں لذت

ملی جلی (تفریحی اور مقصدی) پیروڈی کی دلچسپ مثال الہ آباد کے ایک ریختی گو شاعر مرحوم کی ایک نظم سودا کے قصیدے کی تشبیب

میں نظر آتی ہے ۔ اس میں ایک طرف سودا کے پُرشکوہ انداز کی پیروڈی ہے دوسری طرف بعض پُرانے رنگ کے معلموں کا خاکہ ۔ چند اشعار

پیش کیے جاتے ہیں ؎

شیدا	بیٹھی کیا تکتی ہے منہ کھول کتاب آگے چل	وہی سودا کا قصیدہ جو پڑھایا تھا کل
سودا	اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل	تیغ اردی نے کیا باغِ جہاں مستاصل
شیدا	بینی ہا منہ کا نہیں ہندی اب کوئی عمل	ملک اپنا ہے اُردو کھا تیرو پیو گنگا جل
سودا	سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک	دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم عزّ و جلّ
شیدا	شکر کے سجدے میں سر پھل سے ہے تا تو ڈالی	دیکھ کر باغ کو یوں اپنے کرم پر مت جل ،

سودا	بخشی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی	پوشش چھینٹ قلمکار بہ ہر دشت و جبل
شیدا	راستہ میں وہ کھلا گل وہ دکھا رنگینی	چھینٹ کے کپڑے پہ آؤں کو بنا دیں جنگل
〃	چھینٹ کو کیسے یہ مرزا نے اضافت دے دی	زیر کاتب کے قلم سے نہ گیا ہو یہ نکل

فارسی اور اردو میں پیروڈی کا ایک کامیاب طریقہ رائج ہے۔ وہ یہ کہ کسی شاعر کے کسی مشہور شعر کو لے کر جزوی تصرف اور کبھی ایک مصرعے کی تبدیلی سے مضحکہ خیز رنگ دے دینا۔ مثلاً خاقانی کا شعر ہے:

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ سلطانیست درویشی و درویشی ست سلطانی

اس پر ابواسحٰق اطعمہ یوں تصرف کرتا ہے:

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

اردو شعرا میں اکبر الہ آبادی کے یہاں کہیں کہیں یہ طرز ملتا ہے مثلاً:

[illegible] لے سایہ مری جاں آثار کر شوراز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

یا حافظ کے شعر کو اس طرح پیروڈی کے سانچے میں ڈھالا ہے:

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناول ہا — کہ علم آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

اکبر کے ان اشعار میں ایک مشہور شعر یا مقولہ کو اس کے سنجیدہ محل سے ہٹا کر بے محل چسپاں کیا گیا ہے اس لیے پیروڈی کا رنگ [illegible] ہو گیا۔ ان مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اکثر پیروڈی دو پہلو دار بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقل کسی کی کی جائے اور نشانہ کسی کو بنایا جائے [illegible] بیک وقت کئی طرف پیروڈی کا اشارہ ہو۔ اسی قسم کی ایک دلچسپ پیروڈی علیگڑھ کے ایک نوجوان شاعر حبیب احمد صدیقی نے اپنی ایک [illegible] میں پیش کی تھی۔ غزل یونین کے ایک طرحی مشاعرہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ غالب کی زمین میں تھی اور غالب کے مصرعوں ہی میں پیوند لگا کر تیار کی گئی تھی [illegible] چند اشعار یادداشت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ تقابل کے لیے غالب کے اشعار بھی جن کی تحریف کی گئی ہے نقل کر دیے ہیں:

غالب	بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل	جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حبیب	اس مس سے شیک ہینڈ کی ہے دل کو آرزو	جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
غالب	چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی	کیا فائدہ حبیب کو رسوا کرے کوئی
حبیب	پیسہ ہی جب نہ پاس ہو رکھنے کے واسطے	کیا فائدہ حبیب کو رسوا کرے کوئی
غالب	لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل	تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
حبیب	غازہ لگا کے اس رخ بے نور پر حبیب	تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی

ان اشعار میں شاعر کا مقصد غالب کی شخصیت کو گرانا نہیں بلکہ پیروڈی کے تفریحی امکانات کو پیش کرنا ہے۔ لیکن کبھی کبھی [illegible] عمل سے کسی شاعر کے خلاف زہرناکی کا مظاہرہ بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً اودھ پنچ کے کسی شاعر نے اصغر مرحوم کی ایک غزل [illegible]

پیروڈی کی محرک ہمیں بیں محض تفریح مقصد نہیں بلکہ جذبۂ عناد ہی کارفرما نظر آتا ہے ؎

اصغر	رکھ نہ کسی کا بھی خیال جلوہ گہِ نیاز میں	بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں
نامعلوم	رکھ نہ کسی کا بھی خیال سلسلۂ دراز میں	بلکہ پدر کو بھول جا حجرۂ خانہ ساز میں
اصغر		دونوں نے خاک جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
نامعلوم	زلف جہاں کٹی ہوئی مونچھ یہاں منڈی ہوئی	دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
اصغر	اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقشِ پا کہوں	برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں
نامعلوم	ٹیپ جو اس نے جھاڑ دی ایک غرور ناز میں	برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

بعض اوقات تضمین کے ذریعہ سے کسی شاعر کے سنجیدہ اشعار کو پیروڈی کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ اس کا محرک بھی کبھی محض تفریحی جذبہ اور کبھی تعصب اور عناد ہوتا ہے۔ بوم میرٹھی کی اکثر تضمینیں اگرچہ پست اور رکیک ہوتی ہیں لیکن ان میں شخصی عناد کی تنگ نظری نہیں ہوتی مثلاً غالب کے مشہور شعر کی تضمین جنھوں نے بوم کی زبان سے سنی ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے ؎

برہزار ما غریباں سے چراغ ہے نہ گلے ——— نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

تعصب اور تنگ نظری پر مبنی پیروڈی کی مثال ہمیں پیراوداد بیگ کے کارناموں سے پیش کرنا پڑے گی۔ اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ——— عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس کو یوں پیروڈی کا ہدف بنایا گیا ہے ؎

کبھی بندوق میں عشق اور کبھی بارود میں عشق
مبتلا روزِ ازل سے ہے اکھیل کود میں عشق ——— عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تذکرۂ سطورِ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ پیروڈی فطری طور پر ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی اور جاذبیت رکھتی ہے۔ یہی دلچسپی اور جاذبیت پیروڈی کرنے والے پر بڑی ادبی اور اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ چونکہ ہر فعل ایک حد تک مضحک اور دلچسپ ہو سکتی ہے اس لیے پیروڈی کا یہ ادب کے صحت مند عناصر کے خلاف بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور غیر صحت مند عناصر کے خلاف بھی۔ اس کا صحیح فیصلہ تو وقت ہی کر سکتا ہے کہ کسی پیروڈی کا استعمال بجا تھا یا بے جا، لیکن پیروڈی کرنے والے کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ انتہائی احتیاط سے اس راہ میں قدم رکھے تاکہ ادبی ترقیوں کی راہ میں روڑا نہ ثابت ہو۔ بہرحال اگر کسی ادیب یا صاحبِ طرز میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ باقی رہے گا اور اس کی پیروڈی گمنامی کے آغوش میں دفن ہو جائے گی لیکن اگر ادیب یا شاعری میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تو اس کی شہرت کا آفتاب رفتہ رفتہ غروب ہو جائے گا اور اس کے ساتھ پیروڈی بھی اپنا مقصد پورا کر چکنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ پیروڈی کسی دیرپا یا مستقل ادبی قدروں کی حامل نہیں ہو سکتی۔ کچھ زمانہ گزرنے پر اس کو اپنی قدر و قیمت کھو دینا ضروری ہے۔ یا تو وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کام آ جاتی ہے یا حریف کو ختم کر کے خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

فارسی ادب میں طنز و مزاح

پروفیسر محمد علم الدین سالک

ایرانی فطرتاً ظریف ہوتا ہے، وہ مزاح کو پسند کرتا اور زندگی ہنسی خوشی گزار دیتا ہے۔ ایرانیوں کی زبان اور تہذیب بہت پرانی ہے۔ ان کی روایات بھی زبان کی طرح صدیوں سے چلی آتی ہیں اور کیا مجال کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو جائے۔ ہر ایرانی تجدد پسندی کے باوجود اپنی روایات پر قائم ہے اور اسی کو اپنی قومی زندگی کی اساس سمجھتا ہے۔

روایات کا تسلسل اور پابندی ہی ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ایران کی آزادی کو برقرار رکھا ہے۔ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ایرانی وقتی طور پر محکوم ہو گئے مگر ان کا جذبۂ آزادی پھر ابھرا اور اس نے حاکموں کو اپنا محکوم بنا لیا۔ وہ بھی ان کے رنگ میں رنگے گئے اور ایرانی رسم و رواج کی پابندی کرنے لگے۔ آج وہ بھی اپنے آپ کو ایرانی کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اوپر لکھا گیا ہے کہ ایرانی طبعاً ظرافت کو پسند کرتے ہیں اس لیے ان کے ادب میں یہ عنصر خاصا پایا جاتا ہے۔ ظرافت جب مزاح کے درجے سے گر جاتی ہے تو ہجو یا ہزل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بعض اوقات تو اس سے بھی گر کر محض فحاشی بن کر رہ جاتی ہے

فارسی شاعری کا آغاز رودکی سے ہوا۔ وہ اپنے زمانے کا نابغہ تھا مگر افسوس کہ اس کا بیشتر سرمایۂ کلام ضائع ہو چکا ہے اور اس کے کلام سے مزاح، ظرافت یا ہجو کے نمونے تلاش کرنے مشکل ہیں۔

رودکی کے بعد دوسرا نامور شاعر دقیقی ہے۔ اس کے کلام کا فقط وہی حصہ محفوظ ہے جو شاہنامہ کا جزو بن چکا ہے۔ باقی کلا کہیں کہیں تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی چند اشعار سے زیادہ نہیں اس لیے دقیقی کی ہجویات کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہے۔

یہ دونوں شاعر دورۂ سامانی سے تعلق رکھتے ہیں جس کے زوال پر دورۂ غزنویہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں فارسی شاعری نے کروٹ لی اور عنصری، فرخی، عسجدی، منوچہری اور اسدی طوسی کے علاوہ فردائے سخن فردوسی جیسے نغز گو شاعر اور قادر الکلام استاد پ ہوئے۔ یہ ایسے اساتذۂ فن ہیں کہ آج تک ہر معاصر اور ہر شاعر ان کی استادی کا لوہا مانتا ہے اور ان کے کلام کو نہایت مستند سمجھا اس دور میں ابھی تک شعرا میں رشک و رقابت کے جذبات کچھ ایسے نمایاں نہ ہوئے تھے کہ اس کی وجہ سے ہجویات کو فروغ حا ہوتا۔ البتہ ایک ہجو فردوسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے مگر جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کی کوئی کہی۔ یہ نام نہاد ہجو دراصل ان لوگوں کا کارنامہ ہے جو سلطان محمود غزنوی کو سیاسی وجوہ کی بنا پر بدنام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شا کے مختلف مقامات سے اشعار جمع کر کے ایک ہجو مرتب کر لی جس کے اشعار کی تعداد زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔

شاہنامہ ایک بہت بڑی کتاب ہے اور رزمیہ شاعری کا شاہکار۔ اس میں نفرت و محبت کے جذبات جا بجا ملتے ہیں۔ کئی ایسے مقامات آئے کہ فردوسی نے ایرانی قوم کی بُرائی بیان کرتے ہوئے دوسری قوموں کی تحقیر کی مثلاً قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ فردوسی نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا وہاں اہلِ عرب کی ہجو بھی کی وہ کہتا ہے ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہ جذبات ایک سچے محب وطن ایرانی ہی کے ہو سکتے ہیں اور فردوسی نے ان کا اظہار بلا کم و کاست کر دیا ہے۔

دورۂ غزنویہ کی ایک اور ممتاز شخصیت شیخ الرئیس ابوعلی سینا ہیں جو فلسفہ اور طب میں بے مثال ہونے کے علاوہ مذہبی لحاظ سے آزاد خیال تھے اس واسطے علماء کا طبقہ انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔ شیخ نے اس جماعت کے طعن و تشنیع سے تنگ آ کر اپنی رباعیات میں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ وہ ایک رباعی میں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

با ایں دو سہ ناداں کہ چناں می دانند	از جہل کہ دانائے جہاں ایشاں نند
خر باش کہ ایں جماعت از فرطِ خری	ہر کو نہ خر است کافرش می خوانند

دورۂ غزنویہ کے بعد دورۂ سلجوقی آتا ہے۔ یہ فارسی ادب کا دورِ زریں ہے۔ اس میں ہر صنفِ سخن کو فروغ حاصل ہوا۔ زبان میں وسعت اور بیان میں شیرینی بھی پیدا ہوئی۔ شاعری نے سادگی کی بجائے رنگینی اختیار کی اور شعراء نے جولانیٔ طبع کے لیے نئے نئے میدان تلاش کیے۔ اس دور میں ہجو، شوخی اور ظرافت وغیرہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہزل اور اس سے بڑھ کر فحش نگاری بھی خوب پنپی۔ انوری، خاقانی، سوزنی خاص طور پر اس کے لیے مشہور ہیں، ویسے تو کسی شاعر کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔

مولانا شبلی کے خیال میں "انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو کی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا" مگر مولانا کا یہ بیان بہت حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ انوری کی کلیات چھپ چکی ہے۔ اس کی ورق گردانی سے مولانا کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کے ہاں کہیں کہیں ظرافت، طنز اور ہجو ملتی ہے۔ بعض ہجویں بڑی کثیف ہیں لیکن مضامین اچھوتے ہیں۔ چند ایک میں لطافت بھی پائی جاتی ہے مثلاً ان ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں کا ایک عہدہ دار بوعلی آبی تھا انوری کی اس سے کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ بوعلی کی ناک جسمانی تناسب سے کسی قدر بڑی تھی اور تمام چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ انوری نے اس ناک کو ہجو کا نشانہ بنایا اور یہ رباعی کہی ؎

با بوعلی آبی ار بہم بہ نشینی	شخصے بینی شش جہتش زو بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی	چنداں کہ ازو بینی بینی بینی

اس زمانہ میں شعرا کی بے حد قدر و منزلت تھی لیکن درباری رقابتوں کی وجہ سے اکثر شعراء کو تلخ زندگی بسر کرنی پڑتی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاعر بعض حالتوں میں بے حد ذلیل ہوتا تھا۔ اس بنا پر انوری شاعری کو خاکروبی کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف سمجھتا تھا اس کے دیوان میں ایک خیالی واقعہ ملتا ہے جس میں اس نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس فنِ لطیف کی اصل حقیقت کو واضح کیا ہے۔

وہ کہتا ہے ؎

با یکے مردک کناس ہمی گفتم دوش | تو چہ دانی کہ زفعل تو دلم چوں خستہ است
صنعت و پیشہ ما ہر دو بہم دانی چیست | آں چہ آئینہ رود آوریم زچہ رہا بستہ است
گفت از عیب تو دو واز ہنر ما تشناسس | زیں کہ ما را زچنار آتش واز نے بجستہ است
کار فرمائے مرا رونق کار من و تو | واند آں کس کہ دمے با من و تو بنشستہ است
کار فرمائے مرا پایہ من معلوم ست | لاجرم کار من از بند تقاضا رستہ است
کہ چناں ظن برد او کانچہ تو ترتیب کنی | کردہ و دائم و پرداختہ پیوستہ است
یا چناں داند کایں عمر عزیز علما | ہمچو روز و شب جہاں تاریخ رستہ است
او چہ داند کہ دراں شیوہ چہ خوں باید خورد | کہ ترا از سر بیداد دراں پے خستہ است

انوری ہم ز تو ترسست کہ بر شاخ درخت
عقل داند کہ ستمہائے تیر از دستہ است

یعنی ایک دن میری ملاقات حلال خور سے ہوئی۔ میں نے کہا بھائی! میرا اور تیرا پیشہ جیسا کچھ ہے اس سے سب واقف ہیں مگر عجیب بات ہے کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام۔ حلال خور نے جواب دیا کہ تمھاری ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ میں تم سے زیادہ باکمال ہوں بلکہ [illegible] ہے کہ قدر دانوں میں فرق ہے۔ میرے آقا کو ہنر کی قدر ہے اس لیے میرے کام کو فروغ حاصل ہے۔ اس کے خلاف تمہارا آقا تمھارے [illegible] کی قدر و منزلت نہیں جانتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ تمھارا کام بڑا معمولی ہے۔ روز ازل سے جیسا چلا آتا ہے ویسا ہی چل رہا ہے۔ اس کے علا[وہ] اسے یہ بھی خیال ہے کہ عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس ہیں جو بڑی فراوانی سے بازار میں موجود ہیں، اس علم کے بعد وہ تمھاری قدر کیوں [illegible] اور اسے تمھاری محنت کا احساس کیوں ہو؟

سرخس میں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی۔ انوری نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر ابوعلی آبی کی ہجو میں یہ رباعی کہی ؎

سرخس از رنج بے آبی و آبی | دریغا روئے دارد در خرابی
ز بے آبی خلاصی یافت امسال | خداوندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس آبی اور بے آبی (خشک سالی) کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ اس سال اسے خشک سالی سے تو نجات مل گئی ہے مگر خدا [illegible] اسے آبی (ابوعلی آبی) سے بھی نجات دے۔

انوری کے زمانے میں خواجہ ابوالفتح بخل میں مشہور تھا۔ انوری نے اس کے بارے میں یہ شعر کہے ؎

خواجہ بوالفتح از کمال حرص و بخل | سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہمی گوید زنش | ربنا انزل علینا مائدۃ

اسی طرح ایک بدخواہ قاری کی ہجو میں لکھتا ہے ؎

روشنی در خواب می بیند مرا | دیدہ‌اش کو زامت آزردہ است

گفتمش اے بزنگ جہت بردہ است | طبع پاک تو از چہ پژمردہ است
گفت زیں مقریک ہمی جوشم | رونق دین ایزدی بردہ است
آنچہ ایں زن بہ مردمی خواند | جبرئیل آں بہ مو نیاوردہ است

انوری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے قاضی طوس سدید الدین بیہقی اور عمر الدین محمد نادار [illegible] ہروی کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

چار کس یابی کہ در ہجو من اند | گر بہ جوئی از ثریا تا ثری
قاضئ طوس و سدید بیہقی | تاجک عمزادہ کانی [illegible]

بہرحال انوری نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں شدت اور زہرناکی بہت کم ہے۔
اسی زمانے میں حکیم کوشکی ایک نہایت مشہور ہزال ہوا ہے۔ اس نے سلطان سنجر کے درباریوں کے خلاف کئی نظمیں لکھیں جن میں اکثر فحش ہیں۔ ان میں سے سب سے بے ضرر بند حسب ذیل ہے ؎

ایا شمشیر زن ترکان پر دل | پر نسبت از فی و تاتار و کاشاں
بیکایک در خراساں پروریدہ | بہ ناز و نعمت و دولت تن آساں
شمارا پادشاہ ہفت کشور | رسانیدہ بہ پیری از نخاساں
بروز کودکی شفقت کردہ | بسے درپیش [illegible] رواساں
بہ شہرے زنام غز شنودن | شدہ چوں دیو از آہن ہراساں
فلک کفران نعمت ہائے سنجر | طلب کرد از شما ناحق شناساں
نہ ہے درماندگان بے حمیت | نہے خر بندگان ناسپاساں
کسے خود زاد و بوم و ملک و اقطاع | چنیں بیروں دہد از دست آساں
مسلم ہیں کہ چوں بیروں کشیدند
بشمشیر از ..... زن تان خراساں

قاضی حمید الدین ابوبکر اپنے زمانے کے فاضل، بلخ کے قاضی القضاۃ اور انوری کے ممدوح تھے انھوں نے ایک نہایت لطیف ہجو سلطان سنجر کے سپاہیوں کی لکھی ہے جو غزوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے آگے مارے مارے پھرتے تھے ؎

حکیم کوشکی را بخواب دیدم دوش | زباں کشادہ بمدح مبارزان سپاہ
ز راہ طعنہ و طنز و تماخرہ می گفت | نمے گزاردہ ہر یک حقوق نعمت شاہ
فسوس زیر رکاب شما کمیت و سمند | دریغ بر سر و فرق شما قبا و کلاہ
ز پیش کافر کفران نعمت آوردہ | گریختند چو از پیش توبہ خیل گناہ

نہ دیدہ گرد سپاہ سیاہ پوش ہنوز   کہ گشت صبح سپید مثنا چو شام سیاہ
زبس تعجب کعت رجبلہ می گفتند   زہے جماعت نعوذ لا الہ الا اللہ

عمر خیام پہلا شاعر ہے جس نے ریاکاری کی مذمت کی اور رباعیات کے ذریعے شوخی اور ظرافت کو روشناس کرایا مثلاً وہ
شیخ کی پردہ دری کرتا ہوا کہتا ہے ؎

اے خواجہ یکے کار روا کن ما را   دم در کش و در کار خدا کن ما را
ما راست رویم و تو کج بینی   او بچارۂ دیدہ کن رہا کن ما را

ایک اور رباعی میں وہ کہتا ہے ؎

آباد خرابات نہ مے خوردن ماست   خون دو ہزار توبہ در گردن ماست
گر من بد نکنم رحمت چہ کند   آرائش رحمت ز گناہ کردن ماست

ما ئیم طلبگار مے کہنہ و نو   وانگہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت   مے پیش بیار و ہر کجا خواہی برو

یعنی ایک شخص اس خوف سے دبا ہوا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور ہم کہاں جائیں گے۔ وہ عمر خیام سے اس بار[illegible]
میں سوال کرتا ہے۔ خیام کہتا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شراب ہمارے لیے لے آؤ اور تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔
عمر خیام چاہتا ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔ وہ اسے ظریفانہ انداز میں یوں کہتا ہے ؎

زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی   ہر لحظہ بدام دیگرے پا بستی
گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستم   اما تو چناں کہ می نمائی ہستی

یعنی ایک نے فاحشہ عورت سے کہا کہ تو ہر گھڑی ایک نئے آشنا سے تعلق جوڑتی ہے۔ اس نے کہا اے شیخ تو جو
کہتا ہے میں وہی ہوں لیکن کیا جو کچھ تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے کیا تو وہی ہے؟
عربی میں ایک مقولہ ہے کہ الحق مُر۔ یعنی سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ عمر خیام اس سے کتنا ظریفانہ مضمون شراب کے بار[illegible]
میں پیدا کرتا ہے ؎

وقتے کہ طلوع صبح ازرق باشد   باید بکف جام مروق باشد
گویند کہ حق تلخ بود در ہمہ حال   باید کہ بایں دلیل مے حق باشد

ایک اور مقام پر وہ ریاکاری کی مذمت یوں کرتا ہے ؎

گر مے نخوری طعنہ مزن مستاں را   گر دست دہم توبہ کنم یزداں را
تو فخر بایں کنی کہ من مے نخورم   صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

اسی مضمون کو ایک اور کھلے انداز میں یوں بیان کرتا ہے ؎

در مسجد اگرچہ بہ نیاز آمدہ ام   حقا کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
سجادہ از مسجدِ ما دزدیدیم   آں کہنہ شدہ است باز باز آمدہ ام

خاقانی فارسی زبان کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے۔ وہ حسان العجم کہلاتا ہے۔ ہر شاعر اس کا نام ادب اور احترام سے لیتا ہے۔ وہ شاعری میں ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد ہے جس نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کی شادی بھی اس سے کر دی تھی۔ بعد میں حالات نے پلٹا کھایا اور استاد شاگرد میں چل گئی۔ یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ تحفۃ العراقین میں خاقانی نے اپنے حج کے حالات لکھے ہیں لیکن وہاں بھی وہ اپنے استاد پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

بینی رنگ گنجہ را دریں کوی   ہم زرد رخا و ہم سیاہ روی

رشید الدین وطواط، خاقانی کا ہم عصر اور دوست تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ خاقانی نے اس کی مدح میں ایک زبردست قصیدہ لکھا جس میں اس نے کہا ؎

اگر بکوہ رسیدے رسالۂ سخنت   زہے رشید جواب آمدے بجائے صدا

لیکن آخر میں اس سے بھی ان بن ہو گئی اور خاقانی نے اس کی بھی ہجو لکھی مگر خاقانی سے کسی کو کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ اس کی افتادِ طبیعت ہی ایسی تھی۔ وہ خود اپنی مدح میں کہتا ہے ؎

شبہت حوا نویسم تہمت ہاجر نہم
چادر مریم ربایم پردۂ زہرہ درم

ایک تذکرہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ خاقانی کسی امیر کی محفل میں پہنچا۔ امیر نے اس کے شایانِ شان تکریم و تحریم نہ کی بیٹھنے کو بھی کوئی موزوں جگہ نہ دی۔ یہ بات خاقانی کو بہت ناگوار گزری اس نے وہیں کھڑے کھڑے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا۔ اسی محفل میں پڑھا اور چلا آیا ؎

گر فروتر نشست خاقانی   نہ ور اننگ نہ ترا ادب است
قل ہو اللہ کہ وصفِ خالقِ ماست   زیرِ تبت یدا ابی لہب است

اسی عہد میں حکیم سوزنی بہت بڑا ہزال اور ہجو گو ہوا ہے۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ ہجو گوئی میں بسر کیا اور نہایت کثیف اور فحش ہجویں کہیں۔ آخری عمر میں وہ اس سے تائب ہوا اور کئی قصیدے لکھے جن میں وہ اپنے گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرتا اور آئندہ نیک رہنے کی دعا کرتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

چوں بر گرفتہ دل تن من گشت پادشاہ   آمد بہ پیش سینہ ام از سقر سپاہ
لشکر گہ سفاہت من عرض دادہ بود   من ایستادہ ہمبر عارض بعرض گاہ
دیو سفیہ گلیم براں بود تا کشد   ہمچوں گلیم خویش لباس دلم سیاہ
بنمود خیل خیل گنہ پیش چشم من   تا در کدام خیل کنم بیشتر نگاہ

سوزنی کے بعد کمال اصفہانی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ ہجو کو شاعر کے لیے لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا ایک قطعہ ہے ؎

ہجا گفتن ہر چہ پسندیدہ نبود   مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کو نہ باشد ہجا گو   چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خداوند را پاک راست و ردے   کہ الا ہجا ہیچ درماں ندارد
چو نفرین بود بولہب را یزد   مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
اگر ہجو گوئی تو در گردن من   کہ ہرگز زیاں نفسہ ایماں ندارد

اس کی کلیات میں ہجو کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں، ایک بخیل کی مذمت کرتا ہوا کہتا ہے ؎

اے زناہیچ گشتہ در رہ آز   ہمتو کوتہ و امید دراز
ہمہ دنداں ز حرص ہچوں سیر   ہمہ مغز تو پوست ہچو پیاز
دست تو چوں دہان گرسنگاں   ہر چہ وردی نگی نیابی باز
چوں گلوی قدری ہمہ چیز   وز تو ناید بروں مگر آواز

اسی طرح ایک مزوقانی کی داڑھی کی ہجو میں ایک طویل نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

آں ریش فلاں مزوقانی   ریشست عظیم پاستانی

ایک مثنوی لبنان کے رئیس کی ہجو میں ہے، اس کے بعض بعض شعر نہایت لطیف ہیں، ابتدا کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تا زبانم بکام جنبان است   در ہجائے رئیس لبنان است
چہ رئیس آں خسیس پر تلبیس   مایۂ ظلم و سایۂ ابلیس
آنکہ نامش ز شرم پیدا نیست   در بدی و دوش ہمتا نیست
آں کہ او پیشوائے دزداں است   سرو سر خیل زن بمزدانست
طبع او لوم و شکل نامعلوم   صحبتش شوم و سیرتش مذموم

کمال اصفہانی نے اپنے زمانے کی ایک مشہور شخصیت ضیاء الدین کی ہجو میں ایک زبردست نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

تیزے کہ مغز چرخ ز بانگش فغاں کند
تیزے کہ روزگار بدو امتحاں کند

ایک بخیل کی ہجو کتنے لطیف پیرایہ میں کہتا ہے ؎

خواجہ در ماہتاب ناں می خورد   در سرائے کہ ہیچ خلق نبود
سایۂ خویش را کسے پنداشت   کاسہ از پیش خویشتن بر بود

یعنی خواجہ چاندنی میں ایسے مقام پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے جہاں کوئی نہ ہو۔ وہ اپنے سایہ کو بھی غیر سمجھتا ہے اور اس ڈر سے کہ کوئی ہے کھانے کا برتن چھپا لیتا ہے۔

کمال اصفہانی کا بڑھاپا بڑی تلخی میں گزرا۔ اس عہد کے حاکموں نے اس پر بڑی بڑی سختیاں کیں۔ شہاب الدین جس کی مدح میں اس کے کئی قصیدے ملتے ہیں اس سے ناراض ہوا اور اس پر کچھ جرمانہ کر دیا۔ ضیاء الدین جو اس کا افسر ماتحت تھا اس جرمانے کی وصولی میں جبر و تشدد پر اتر آیا۔ کمال الدین نے اس رویّہ کے خلاف احتجاج کیا اور کئی قصیدے لکھے مگر حکومت کے رویے میں فرق نہ آیا، وصولی میں زیادہ سختی ہونے لگی۔ اس کے گھر پر سپاہی متعین کر دیے گئے۔ کمال نے ایک قصیدے میں درخواست کی کہ اس ناروا پابندی کو اٹھا لیا جائے۔ جب اس کا بھی اثر نہ ہوا تو اس نے ایک نہایت شاندار ہجو ضیاء الدین کی لکھی جس میں اسے چوہا قرار دے کر عجیب و غریب مضمون پیدا کیے۔ ابتدائی اشعار چھوڑ کر ہم صرف اس کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس میں موش کی ہجو ہے:-

آدم باحدیث موش کراو — کرد نہمت درون خود اظہار
خود ببیند از ہم از بغل گربہ — کنم از ماجرائے موش اظہار
گربہ روزہ دار بود آہنش — ہم فریبندہ ہم سبک طرار
موش چوں منقلب شود شو دست — شومی او از کسد ناچار
ظلم آں بد کہ شیر مرداں را — بشکم پنجہ حنجر در پیکار
در جہالم نہ بد کہ خیرہ مرا — قصد موشی چنیں کند افگار
ہر کجا موش اژدہا گردد — عندلیباں شوند بوتیمار
خور گرفتم کہ فارۃ المسک است — کہ زعجاز لیش نیاید عار
ہم بباید شگافتن شکمش — تا بروں او فتد ازو اسرار
بخدا آنکہ او زعطسۂ خوک — موش را کرد در جہاں دیدار
واجب القتل کرد موشاں را — در بر دوشاں درون کعبہ قرار
برسولے کہ فتویٰ شرعش — موش را کرد ہم طویلہ مار
کانچہ گفتند مفسداں بغرض — در ضمیر رہی نہ کرد گزار
بشنو از بندہ نکتۂ شیریں — کہ خلندہ است در دلم چو خار
گرچہ دنداں موش بس تیز است — تیز تر زاں زبان من صد بار
تو بحق نائب سلیمانی — حق ہر یک بجائے خود بگزار

کار موشاں بر آسماں بردی
جانب بلبلاں فرو مگزار

کمال کو مدد معاش کے طور پر سرکار سے غلہ ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسے گلا سڑا غلہ ملا۔ اس نے طیش میں آکر یہ قطعہ لکھا:-

غلۂ امسال خواجہ داد مرا — گر سبد بحر بود اکثر خاک
خاک مردم خورندہ استم — کہ نخورد مردم است بداور خاک

کردم اندیشہ تا چرا فرمود | خواجہ با گندم برابر خاک
آدمی را چو خاک سیر کند | کرد وجہ غذائے من بر خاک

اس کے کلیات میں شہاب الدین کے فوجیوں کی ہجو کی ہجویں ملتی ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے انھیں چھوڑے دیتے ہیں۔

کمال کے بعد خاک ایران نے عبید زاکانی سے بڑھ کر ہزال پیدا نہیں کیا۔ وہ علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا۔ ایک معمولی واقعہ سے اس کی طبیعت میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ اس نے علوم و فنون کو ترک کر کے ہجو اور ہزل گوئی کا پیشہ اختیار کر
چنانچہ وہ ایک جگہ کہتا ہے ؎

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم | کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز | تا داد خود از مہتر و کہتر بستانی

کہا جاتا ہے کہ جب عبید کو مجلس شاہی میں باریابی کی امید نہ رہی تو اس نے یہ رباعی کہی ؎

در علم و ہنر مشو چو من صاحب فن | تا نزد عزیزان نشوی خوار چو من
خواہی کہ شوی پسند ارباب زمن | کنگ آور و کنگری کن و کنگ زن

کنگ امرد قوی جسہ کو کہتے ہیں۔ کنگر ایسا بھک منگا ہوتا ہے جو گھر کے باہر کھڑا ہو کر ناقابل برداشت شور مچاتا ہے۔ صاحب
اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کو کچھ بھیک دے دیتا ہے۔ کنگر ہندوستانی ساز کا نام ہے۔
عبید زاکانی نے اپنے زمانے کے معاشرے کے خلاف طنز بھی کی ہے اس کی اکثر تصنیفات میں بڑی لطیف اور بالاقت
واضح طنزیں پائی جاتی ہیں۔ اخلاق الاشراف، ریش نامہ، تعریفات اور قصہ موش و گربہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں۔ رسالہ موش و گربہ ریاکار زاہد
ایک بڑی کامیاب طنز ہے۔ یہ نظم ایک سو چوہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک پرغرور تیز نگاہ اور شیر شکار بلی کا نقشہ ہے جس کی آنکھیں
پلکیں نہایت تیز، پاؤں بچھو جیسے، پیشانی عقاب کی سی، پیٹ طبل جیسا، سینہ قاقم ایسا، دانت تیز اور ابرو کمان کی مانند ہیں ؎

از قضائے فلک یکے گربہ | بود چوں اژدہا بکرمانا
گربہ دوربین و شیر شکار | کہربا چشم و تیز مژگانا
پائے کژدم عقاب پیشانی | بود پر مکر و پر ز دستانا
شکمش طبل و سینہ اش قاقم | ابرو اش قوس و تیز دندانا

بلی بھوک سے بیتاب ہوتی ہے اور ایک میکدہ کا رخ کرتی ہے۔ ایک خم کی آڑ میں گھات لگا کر بیٹھ جاتی ہے
چوہا نکلتا ہے۔ پھدکتا کودتا ایک خم کے دہانے پر جا بیٹھتا ہے۔ وہاں شراب پیتا ہے اور بدمست ہو کر
میں اس کا سر کاٹ لوں اور میدان میں گھسیٹ کر لے جاؤں۔ احسان کے روز جب میں
مہرے مقابلے کو آئے تو وہ میرے نزدیک کتا ایک کتا ہے ؎
[illegible]

سر بسر گربہ را ببخشم من — گاہ بخشش برو باحسانا

گربہ در پیش من چو سگ باشد — گر شود زور برو میدانا

اسے کیا خبر تھی کہ اس کا حریف خم کے آڑ میں اس کی ڈینگیں سن رہا ہے۔ یکایک بلی جھپٹی، اسے پنجوں میں دبوچ لیا اور کہا اب کہاں جائے گا۔ چوہا اب ہوش میں آیا۔ بہت گڑگڑایا، کہا میں مست تھا اور مستی میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ بک گیا، میں تو نیز انعام [illegible] مگر بلی پر اس کی ان التجاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اسے مار کر کھا گئی۔ فارغ ہو کر وہ مسجد کی طرف روانہ ہوئی تاکہ اس گناہ سے توبہ کرے۔ وہ رو رو کر کہنے لگی ؎

بار الٰہا کہ توبہ کردم من — ندرم موش را بدندانا

گربہ می کرد توبہ در مسجد — یا کریم و قدیر و سبحانا

توبہ بخشی گناہم اے غفار — از گناہ گشتہ ام پشیمانا

در مکر و فریب باز نمود — تا بحدیکہ گشت گریانا

ایک چوہا مسجد کے منبر کے پیچھے بیٹھا اس کی گریہ و زاری سن رہا تھا۔ وہ بلی کی توبہ سن کر دوسرے چوہوں کو یہ مژدہ سنانے کے لیے بھاگا ؎

مژدگانے کہ گربہ عابد شد — زاہد و مومن و مسلمانا

چوہے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ بلی کے پاس شربت، شیرینی، پھل، شراب کباب کے تحفے بھیجے جائیں۔ یہ تحفے سات چوہے لے کر بلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بلی نے انھیں پاس بلایا اور موقع پا کر پانچ چوہوں کو پکڑ لیا۔ باقیماندہ چوہے بھاگ نکلے اور یہ بری خبر چوہوں کو سنائی۔ ایک ہفتہ ماتم کرنے کے بعد تین لاکھ تینتیس ہزار چوہے اپنے بادشاہ کی سرکردگی میں بلیوں سے لڑنے کے لیے نکلے۔ خونریز جنگ ہوئی، بلیاں شکست کھا گئیں، سرغنہ بلی گرفتار ہو کر چوہوں کے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئی، اسے پھانسی کا حکم دیا گیا مگر بلی نے اپنے آپ کو چھڑا کر چوہوں کے بادشاہ کو مار دیا اور کچھ چوہوں کو زخمی کر دیا۔ باقی چوہے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ عبید اس قصے کو اس شعر پر ختم کرتا ہے ؎

ہست این قصہ عجیب و غریب — یادگارِ عبید زاکانا

عبید زاکانی کی دوسری کامیاب تصنیف تعریفات ہے جس میں اس نے اس زمانے کے معاشرہ کے مطابق لوگوں کے اخلاق کا تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ظریف ہی نہ تھا بلکہ اسے اپنے زمانے کے انسانوں کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی پورا پورا علم تھا۔ اس میں سے چند نمونے درج ذیل ہیں:

فصل اوّل (در دنیا و مافیہا)

الدنیا: [illegible] — ایسی جگہ جہاں کسی مخلوق کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہو

فصل سوم (قاضی اور اس کی صفات)

القاضی — آنکہ همه او را نفرین کنند — جسے تمام لوگ بُرا کہیں

فصل چہارم (شیوخ اور ان کے مریدین)

الشیخ — ابلیس — معلم الملکوت

فصل پنجم (شرفا اور ان کی عادات کے متعلق)

اللاف الزفاحۃ — مایۂ ایشاں — بے باکی و شیخی شرفا کی تجارت کا سرمایہ ہے

فصل ششم (پیشہ ور اور صنّاع)

البازاری — آنکہ از خدا نہ ترسد — دکاندار وہ ہے جسے خوف خدا نہ ہو

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازم کے بارے میں)

الشراب — مایۂ آشوب — بے چینی اور اضطراب کا سرچشمہ

فصل ہشتم (بھنگ نوشی کے متعلق)

البنگ — آنچہ صوفیاں را بوجد آورد — بھنگ وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کر د

فصل نہم (صاحب خانہ اور اس کے متعلقین)

المجرد — آنکہ بر ریش دنیا خندد — نوجوان یا کنوارا وہ ہے جو دنیا کی داڑھی پر ہنسے

فصل دہم (مرد عورت کی حقیقی فطرت کے متعلق)

الخاتون — آنکہ معشوق بسیار دارد — خانم کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواست

عبید زاکانی لاکھ پھکڑ اور مسخرا سہی مگر اس کے کلام کی بے باکی اور طبیعت کی اُپج ایسی صفات ہیں جن کی بنا پر اس کی
خاص مطالعہ کی محتاج ہیں۔ اس کی تصانیف اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں کہ اس زمانے کے فاسد اخلاق پر وہ کافی روشنی ڈالتی ہیں
کے تسلط کے دور میں ایران کی عوامی اور خانگی زندگی پستی کے عمیق ترین گڑھوں میں گر چکی تھی۔ اس نے اس کا تجزیہ ظریفانہ انداز

تاکہ ابنائے وطن اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کریں۔

شیخ سعدی بہت بڑا مصلح قوم اور ملک ہے۔ وہ ان حدود کو پھاند کر اکثر مقامات پر آفاقی رنگ اختیار کرتا ہے۔ اس کی تصانیف خاص کر گلستان اور بوستان اس قابل ہیں کہ ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اس میں طنز کے نشتر بھی ہیں، ظرافت کی پھلجڑیاں بھی اور کہیں کہیں نہایت لطیف چٹکلے اور لطیفے بھی ہیں جن کے پڑھنے سے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے۔ مثلاً استقلال اور پامردی کے جوہر نمایاں کرنے کے لیے وہ یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

شبے یاد دارم کہ چشمم نخفت	شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت
کہ من عاشقم گر بسوزم رواست	ترا گریہ و سوز بارے چراست
بگفت اے ہوادار مسکین من	برفت انگبین یار شیرین من
تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام	من استادہ ام تا بسوزم تمام
ترا آتش عشق اگر پر بسوخت	مرا بین کہ از پائے تا سر بسوخت

غیبت کی برائی بیان کرنے کے لیے سعدی یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

طریقت شناسان ثابت قدم	بخلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میاں غیبت آغاز کرد	در ذکر بیچارۂ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ	تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش	ہمہ عمر ننہادہ ام پائے پیش
چنیں گفت درویش صادق نفس	ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر ز پیکارش ایمن نشست	مسلماں ز جور زبانش نرست

یعنی چند آدمی ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی۔ ایک نیک نفس نے پوچھا۔ کیوں یار کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ نیک نفس نے کہا، سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملے سے محفوظ رہے لیکن مسلمان آپ کی تیغ زبان سے نہ بچ سکے۔

شیخ سعدی مذہبی لوگوں کی تنگ نظری پر طنز کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ ان کی طرح تنگ ہے اور نہ اس کی رحمت کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے ؎

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید	بہ مقصورۂ عابدے بر دوید
بنالید بر آستان کرم	کہ یارب بہ فردوس اعلیٰ برم
مؤذن گریباں گرفتش کہ ہیں	سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں
چہ شائستہ کردی کہ خواہی بہشت	نمی زیبدت ناز بر روئے زشت

بگفت این سخن پیر بگریست مست — کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست
عجب داری از لطف پروردگار — کہ باشد گنہگارے امیدوار
ترا می نگویم کہ عذرم پذیر — در توبہ باز است و حق دستگیر
ہمی شرم دارم زلطف کریم — کہ خوانم گنہ پیش عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لے جانا۔ مؤذن نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا کہ او پلید کتے! مسجد میں تیرا کیا کام؟ تو نے کونسا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعوےٰ کرتا ہے؟ مست رو پڑا اور بولا کیا آپ کو خدا کے لطف عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو۔ میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خدا دستگیر ہے۔ مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں۔

شاہانِ شام میں ملک صالح ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ ایک دن وہ بھیس بدل کر شہر کی گشت کو نکلا۔ اس نے ایک مسجد میں دو درویش لیٹے ہوئے دیکھے۔ بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ آخر قیامت میں کوئی تو حساب کم ہوگا۔ اگر بادشاہ لوگ جو دنیا میں عیش و عشرت کر رہے ہیں، غریبوں کے ساتھ بہشت جائیں گے تو میں قبر سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔ بہشت ہمارا حصہ ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں طرح طرح کے دکھ جھیل رہے ہیں۔ دوسرا بولا کہ اگر ملک صالح وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آگیا تو میں جوتوں سے اس کا سر کچا کر دوں گا۔ ملک صالح ان کی باتیں سنتا رہا۔ دوسرے دن ان درویشوں کو اپنے حضور طلب کیا۔ ان پر عنایات کی بارش برسائی۔ ان کی دلجوئی کی، ان کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ میں آج آپ لوگوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کر کے تواضع سے پیش آ رہا ہوں۔ آپ بھی قیامت کے روز مجھ پر مہربانی کیجیے اور مجھ کو بہشت میں داخل ہونے سے نہ روکیے۔ اس روایت سے شیخ سعدی یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ دولت مندوں کو غریبوں کے حال سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اس جلن کو جو غریبوں کے دل میں مصیبت کی وجہ سے امیروں کی دولت وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے وقتی طور پر روپے پیسے کی بارش برسا کر بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حکایت کے آخری چند شعر یہ ہیں:

رواں ہر دو کس را فرستاد و خواند — بہیبت نشست و بحرمت نشاند
بریشاں ببارید باران جود — فروشست شاں گرد ذل از وجود
شہنشاہ ز شادی چو گل بر شگفت — بخندید و در روئے درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور حشم — ز بیچارگاں روئے درہم کشم
من امروز کردم در صلح باز — تو فردا مکن در بروئم فراز

سعدی اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے غیبت کرنے والوں پر نہایت لطیف طنز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب مجھے نماز روزہ کے مسائل سکھایا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے فرمایا کہ روزہ میں [illegible] منع ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان مسائل کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ [illegible] رئیس نے جب یہ سنا تو مولوی صاحب کو کہلا بھیجا [illegible]

در مسالک مسواک در رمضان گفتی خطا است　　بنی آدم مردہ خوردن روا است

یعنی تم نے یہ تو بتا دیا کہ روزے میں مسواک کرنا منع ہے لیکن مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) کیسے جائز ہو گیا۔
غرض سعدی کے ہاں طنز اور ظرافت کے بے شمار نمونے موجود ہیں گلستان اور بوستان سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

سعدی کے بعد سلمان ساوجی، ناصر بخاری اور اس زمانے کے دیگر شعراء میں ہجو اور ہزل پائی جاتی ہے لیکن ان سب میں کوئی خاص بات نہیں نہ اس وقت ان کے دیوان موجود ہیں اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہوئے حافظ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حافظ شیرازی کو جو مقام فارسی شاعری میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایران اور فارسی زبان اب تک ان کے پایہ کا شاعر پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی شاعری سحر حلال ہے، ان کا میدان غزل ہے۔ غزلوں ہی میں انھوں نے دنیا بھر کی باتیں کہہ دی ہیں۔ ان کے ایک معاصر خواجہ عماد فقیہ تھے۔ انھوں نے ایک بلی پال رکھی تھی جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز کے انداز میں ساتھ ساتھ جھکتی اور سر اٹھاتی۔ حافظ نے اس زمانے میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا ؎

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد
بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں عماد فقیہ کی ریاکاری پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

علماء سوء اور واعظین کی پردہ دری بھی حافظ کا خاص موضوع ہے جس کی ابتدا خیام نے کی۔ سعدی نے کچھ اور فروغ دیا مگر حافظ نے اسے شراب دو آتشہ کر دیا اور بڑی دلیری، بے باکی اور آزادی سے اس ریاکار گروہ پر چوٹیں کیں مثلاً ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند
گوئیا باور نمی دارند روز داوری　　کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور می کنند

غلام ہمت دُردی کشان یک رنگم　　نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیاہ اند

[illegible] گناہ ز اغیار در حجاب　　بہتر ز طاعتے کہ بروے و ریا کنند

مے خورند شیخ و حافظ و قاضی و محتسب ‏ ‏ چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیاں جملہ حریف اند و نظر باز ولے ‏ ‏ زاں میاں حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

زاہد شہر چوں مہر ملک و شحنہ گزید ‏ ‏ من ہم از مہر نگارے بگزینم چہ شود

یعنی زاہد نے اگر حکومت پرستی اختیار کر لی ہے تو ہم کسی معشوق سے دل لگا لیں تو قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ گویا شاہد پرستی حکومت پرستی سے بہتر ہے۔

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے ‏ ‏ دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد ‏ ‏ وائے گر در پس امروز بود فردائے

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ‏ ‏ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند ‏ ‏ قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست

یعنی شہر کے واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، ہمارا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے (پھر وہ کیا ہے؟ فرشتہ یا شیطان؟ یہ آپ خود فیصلہ کر لیں)

کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

آدم از خاک و سید از نور است ‏ ‏ آدمیت ز سیداں دور است

گر ز مسجد بخرابات شدیم عیب مگیر ‏ ‏ مجلس وعظ دراز است و زماں خواہد شد

اسی مضمون کو اردو زبان کے مشہور شاعر قائم چاندپوری نے یوں ادا کیا ہے ؎

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم ‏ ‏ یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

محتسب خم شکست و بندہ سرش ‏ ‏ سن بالسن والجروح قصاص

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت ‏ ‏ ناخلف باشم اگر من بجوے نفروشم

حافظ کے بعد فارسی شاعری میں ایک سکون سا پیدا ہوگیا۔ ان کے بعد آنے والے شاعر ان کی تقلید کرتے رہے مگر حافظ جیسی بات پیدا نہ ہوئی البتہ دو شاعروں نے ہزل ہجو اور ظرافت کے میدانوں میں خوب جولانیاں دکھائیں۔ انھوں نے تحریف کو جسے پیروڈی کہتے ہیں اپنایا اور جو کچھ کہنا تھا اسی رنگ میں کہا۔

تحریف کی ابتدا عبید زاکانی سے ہوئی۔ اس نے اپنے زمانے کے اخلاقِ فاسدہ پر فقرے کسے اور رباعیات پیدا کی۔ عبید زاکانی کے بعد نویں صدی ہجری کے آغاز میں ابواسحاق اطعمہ شیرازی پیدا ہوا۔ اس کی شاعری کا موضوع کھانا پینا ہے۔ طعام ہی کی رعایت سے اس نے اپنا تخلص اطعمہ اختیار کیا۔ اس نے اپنی تحریفات میں نہایت اچھوتے انداز میں پچھلے شعرا اور صوفیا پر چوٹیں کی ہیں۔ اس کا کلام اکثر اوقات براہِ راست فلسفہ کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ہے۔ رضا قلی ہدایت لکھتا ہے کہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی کا مرید تھا مگر اس کے باوجود اس نے ان کے کلام کی بھی تحریف کی۔ شاہ نعمت اللہ کا مشہور قطعہ ہے ؎

گوہرِ بحرِ بیکراں مائیم	گاہ موجیم گاہ دریائیم
ما بریں آمدیم در دنیا	کہ خدا را بہ خلق بنمائیم

اطعمہ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاکِ معرفت مائیم	گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ	کہ بہ ما ہیچہ قلیہ بنمائیم

جب پیرِ طریقت نے اس سے پوچھا کہ کیا تو رشتۂ لاکِ معرفت ہے تو اس نے جواب دیا۔ جب میں اس قابل نہیں کہ اللہ کی باتیں کروں تو پھر میں نعمت اللہ (رزق) کی باتیں کیوں نہ کروں؟

بہرحال حالات کچھ ہوں خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اطعمہ میں روحانیت کی بلندیٔ فکر نہ تھی یا وہ صوفیاء پر چوٹیں کرنی چاہتا ہو۔ اس کے کلام میں ظرافت اور طنز کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اس نے چھبیس کے قریب شعراء کے کلام کی پیروڈی کی ہے اور ایسے ایسے کھانوں کا ذکر کیا ہے جن سے ہمارا تو کیا موجودہ دور کے ایرانیوں کا کام و دہن بھی ناآشنا ہے۔ ہم اس کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے رسالہ اُردو بابت جولائی ۱۹۴۶ء میں محمد داؤد رہبر کا مضمون "فارسی اور اُردو میں پیروڈی کا تصور" ملاحظہ فرمائیں۔

فردوسی رزمیہ نگاری کا بادشاہ ہے۔ اطعمہ نے فردوسی کے اسلوب کی تحریف کرتے ہوئے ایک "جنگ نامۂ مزعفر و بغرا" لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

بہ نام رواں بخش روزی رساں	کہ رزق آفرین ست بیش از رواں
مرتب کن قوت قبل از وجود	پیاپے دہ لقمہ از خوانِ جود
خورانندۂ مرغ و ماہی و نان	رسانندۂ دست با در دہاں
چنانش بہ روزی وہی اہتمام	بود از سرِ لطف و انعامِ عام

کہ چوں طفل آمد ز مادر پدر
عسل در دہاں دید و روغن بہ سر

اس کے بعد مزعفر کے میدانِ جنگ میں جانے کا قصہ ہے ؎

در آمد مزعفر بہ میداں دلیر — بہ شہدی چو شیرہ بہ رنگی چو سیر
ز خوفِ گزند و زبیم ضرر — زناں کردہ بریاں بہ پیشِ سپر
دراں جمع مدح خود آغاز کرد — سرِ سفرۂ فضل را باز کرد
بگفتا منم سفرہ آرا بعید — کہ باو از رحم زخم کاچی بعید
اگر مرغم از بیضہ آید بدر — رواں بر کشد اچشم لبغرا ز سر
اگر از ہری لشکر آرد نخود — دگر از خراساں بخواہد مدد
چنانش فرستم بہ ریستاں — کہ گریند بروی ہمہ دوستاں

حافظ کے کلام کی بھی اس نے پیروڈی کی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

حافظ

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
فغاں کیں لولیانِ شوخِ شیریں کارِ شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

اطعمہ

بہ پیشم چوں خراسانی گر آری صحنِ لبغرا را
بہ بوئے قلیہ اش بخشم سمرقند و بخارا را
چہ آرائی بہ مشک و زعفراں رخسار پالودہ
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
جمالِ برۂ بریاں و حسنِ دنبۂ کشکک
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
درمیاں گیر دنیاز و عجب با حسنِ دوست
خرم آں کز نازنیناں بختِ برخوردار داشت

مخلفی سنبوسہ پر قیمہ در منقار داشت
درمیان جوشش روغن نالہائے زار داشت
من ز مرغ و حلقہ چی گفتا ز دارم درد من
خرم آں کز نازنیناں بختِ برخوردار داشت

دلِ من بہ دور رویت زچمن فراغ دارد
کہ چو سرو پائے بندست و چو لالہ داغ دارد

دلِ من بہ دور بورک زعدس فراغ دارد
کہ بہ [illegible] بندست و زہر کہ داغ دارد

سعدی کے مشہور بہاریہ قصیدہ کی پیروڈی ملاحظہ ہو ؎

سعدی

بیری و خلعی و نیلوفر بستاں افروز
نقش ہائے کہ دراو خیرہ بماند [illegible]

اطعمہ

[illegible]

سعدی

آں کہ باشد کہ نہ بندد کمرِ طاعت او

جائے آں ست کہ کافر بگشاید زنار

باد گیسوئے درختانِ چمن شانہ کند

بوئے نسرین و قرنفل بردد در اقطار

ارغواں ریختہ بر درگہ خضرائے چمن

ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار

اطعمہ

کافر از جوشش زناج ببیند در روشی

جائے آں ست کہ در دم بگشاید زنار

ایں چنیں مرغ مسمن چہ تو از ہم بدری

بوئے نسرین و قرنفل بردد در اقطار

اندراں لحظہ کہ ناں کردہ بسر سفرہ نہند

بہ از آں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار

خیام کی رباعی کی تحریف کتنی شگفتہ ہے :-

خیام

اے در رہ بندگیت یکساں کہ و مہ

در ہر دو جہاں خدمت درگاہ تو بہ

نکبت تو ستانی و سعادت تو دہی

یارب تو بہ فضلِ خویش بستاں و بدہ

اطعمہ

اے بر سرِ سفرہ ات صلائے کہ و مہ

در خوانِ تو گشتہ مرغ و ماہی فربہ

کاچی تو ستانی و مزعفر بدہی

یارب تو بہ فضلِ خویش بستاں و بدہ

اطعمہ کے بعد البسہ کا نمبر آتا ہے۔ اس کا نام نظام الدین محمود قاری یزدی ہے۔ اس نے لباس اور پوشاک کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس میں اطعمہ جیسی جدت طرازی اور رنگینی بالکل نہیں۔ اس کے اکثر اشعار پھیکے، بے جان اور بے مزا ہیں۔ ذیل میں اس کے کچھ اشعار درج ہیں :-

سعدی

ارغواں ریختہ بر درگہ خضرائے چمن

ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار

باد گیسوئے درختانِ چمن شانہ کند

بوئے نسرین و قرنفل بردمد در اقطار

آنکہ باشد کہ نہ بندد کمرِ طاعت او

جائے آں ست کہ کافر بگشاید زنار

البسہ

کلہ ہائے کہ براں بالشِ زر دوزافتاد

ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار

گر سر بستۂ والا بہ کشاید خاتون

بوئے نسرین و قرنفل بردد در اقطار

کافر ار دامک شلوار زر افشاں بندد

جائے آں ست کہ در دم بہ گشاید زنار

حافظ

[illegible]

[illegible]

البسہ

[illegible]

[illegible]

حافظ

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

البسہ

ز نبر یزار گلیمی نازک آری در برم ما را
بہ نقش آورہ اش بخشم سمرقند و بخارا را
ز سرِ بقچۂ الباس اہلِ بخل کمتر پرس
کہ کس نہ کشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

گر من آلودہ دامنم چہ عجب — قاری آں دم کہ رختِ نو پوشید
ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست — ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

بر سرِ تربتِ ما چوں گزری ہمت خواہ — بر سرِ قبر فدک صوف مربع فگنید
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود — کہ زیارت گہِ حاجاتِ من آں خواہد بود

اطعمہ کی تقلید میں البسہ نے بھی "جنگ نامۂ صوف و کم خا" لکھا ہے۔ اس کے یہ شعر دیکھیے ؎

بنامِ خطا پوش امرزگار — کہ ستار عیب ست بر جرم کار
فگندہ قبا کحلیِ آسماں — ز فضلش بہ بر خلعتِ زرفشاں
بہ کوہ از کرم رختِ خارا دہد — پر از موجِ جری بہ دریا دہد
یکے را کند صوف و اطلس لباس — یکے را دہد پوستک با پلاس
گر آں ست تشریف احسانِ اوست — ور انیست بد رخت و عریانِ اوست

پس آں گہ مقرر شد از داوری — برافراد ایں خامۂ لشکری
کہ از جنس موئینہ و آستر — بود زیر شاں ابہا سر بسر
ازیں رخت ہائے کہ ما را بر زیر — بُدندی نشوند ایں زماں بارگیر
نہ گیرند ازیں جملہ با خویشتن — دو توئی و یکتائی و پیرہن

نکلتو چنیں گفت با جُل بہ راہ
کہ آمد کنوں نوبت پائے گاہ

اسی دور میں خواجہ عصمت بخاری نے گھوڑے کی ظریفانہ تصویر کھینچ کر کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جدت اور لطافت کے عناصر موجود ہیں۔ نظم بڑی جاندار ہے ؎

روزے بہ بارگاہِ سلیمانِ روزگار — رفتم کہ قبلہ بہ اذاں آستاں نبود

کردم ادا بمدح و ثنائش قصیدۂ — کاں نوع در بہ مخزن آخر زماں نبود
اسپے کہ کم نمود کز جنس وحش و طیر — چوں او ضعیف جانورے در جہاں نبود
اسپے کہ چوں کمان شکستہ وجود او — سرتاقدم بغیر رگ و استخواں نبود
از بسکہ گشتہ بود ز غمخوارگی چو روح — یک احتیاج قالب او را بجاں نبود
لب واکشادنش کہ بہ دنداں نظر کنم — چیزے بجز آب سر لشش اندر دہاں نبود
گفتم دریں زمانہ بدور کہ آمدے — گفت آں زماں کہ آدم و عالم نشاں نبود
ناگاہ مش از وزیدن باد ی میاں شکست — بیچارہ را تحمل بار گراں نبود
چوں عاقبت براہِ عدم رفت عقل گفت — مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

دورۂ صفویہ میں ہجو کی خوب گرم بازاری رہی۔ اس دور کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جن کا دامن اس خارزار میں نہ الجھا ہو مگر ان کی ہجویات اکثر فحش کی سرحدیں پھاند جاتی ہیں۔ حکیم شفائی نہایت فاضل اور متین شخصیت تھے مگر وہ بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں آلِ بابر کی سرپرستی میں جو ادب پیدا ہوا اس میں فحاشی بہت کم ہے۔ عرفی نے گھوڑے اور رشال کی ہجو لکھی ہے مگر کیا مجال کہ اس میں کوئی فحش بات ہو۔ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوا، کچھ مخلص اور غیر مخلص دوست اس کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ منافقین جس انداز سے اس کی عیادت کرتے تھے اس سے عرفی کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے ایک قطعہ میں یہ سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ تصویر نہایت عمدہ اور کثافت سے پاک ہے مگر اس وقت کلام سامنے نہیں۔

شیدا فتح آبادی نے ہجوگوئی اور طنز نگاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ اس نے قدسی کے ایک قصیدہ پر اعتراضات کیے۔ انھیں نظم میں بیان کیا اور کہیں کہیں پھبتیاں بھی کسیں مگر یہ پھبتیاں بھی ایسی ہیں کہ ان پر اخلاق کے نقطۂ نظر سے حرف گیری نہیں ہو سکتی مثلاً ؎

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ لسیج — نقد بہ حرف بہ میزان خرد بے کم و کاست
نالہ در سینہ ہوا ئیست کہ بے قصد رود — چونکہ از سینہ ہوا گیر شد از جنس ہواست
عالم از وے فشو تنگ ولیکن ز ملال — خلق عالم گر از و تنگ نشینند بجاست
خود گرفتم کہ جہاں تنگ شد از نالۂ تو — کہ ز تنگیٔ نظر از چشم نیسار در بر خاست
نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر — کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست
تنگیٔ عالم از نالہ نہ کیفیت او ست — کہ جہاں تنگ ز اندوہ شدہ بر دلہاست
تنگیٔ جا ز کجا تنگیٔ اندوہ کجا — بیشتر از تن و جاں تفرقہ ہم پیداست

یہ اعتراضات قدسی کے اس شعر پر ہیں ؎

عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست
کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

طالب آملی کی ہجو میں شیدا کہتا ہے: ؎

شب و روز مجذوب ناطالبا — پئے جیفۂ دنیوی در تگ است
مگر قول پیغمبرش یاد نیست — کہ دنیاست مردار طالب سگ است

اس دور میں نعمت خان عالی بہت بڑا ہزال پیدا ہوا۔ وہ ہجویات و طنزیات میں بڑا بلند مقام رکھتا ہے۔ وقائع نعمت خان عالی اس کا شاہکار ہے۔ اس کی کلیات میں ہجو، طنز اور تحریفات کے بڑے نادر نمونے مل سکتے ہیں۔ نعمت خان عالی پر ایک علیحدہ مضمون ہی انصاف ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب اضداد کا مجموعہ تھی۔

نعمت خان عالی ہی کے زمانے میں جعفر زٹلی اور میر اٹل پیدا ہوئے۔ جعفر زٹلی کی کلیات تحریف اور ہجو سے بھری پڑی ہے۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے اپنے کلام میں ظرافت پیدا کرتا ہے اور بسا اوقات ہندی الفاظ فارسی کلام میں استعمال کر کے شعر کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ جیسے: ؎

کشتیٔ جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است
ڈگمگو ڈگمگو می کند از یک توجہ پار کن

یا اس کا یہ رجز: ؎

منم آں رستم وقت روئیں تنم — کہ وہ پاپڑ از مشت خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر — بر آرم دمار از سر موز تیر
کشم گردن پشہ را در کمند — مگس چند را من در آرم بہ بند
بپوشم اگر جوشن جنگ را — ہز لبت دہم پسوے لنگ را
بہ صد حملہ بال مگس بر کنم — قطار دو صد مور برہم زنم
اگر بر زنم پنجہ در دال بھات — فتد ہیبت و خوف من در چہات
دریں دور ثانی رستم منم — بتاسا بہ گرز گراں بشکنم
بہ ہنگام خشم و تردد تلاش — کنم غرق انگشت در دال ماش
من آں شہسوارم کہ روز نبرد — بر آرم بہ یکشت از پنبہ گرد
چناں بشکنم رشتۂ خام را — کہ سازم خجل رستم و سام را

من آنم کہ گر اسپ جولاں کنم
چہل خانۂ موش ویراں کنم

طنز و ظرافت کے سلسلے میں قاآنی شیرازی کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی [illegible]

اس کے کلام میں جو سلاست، روانی اور موسیقی ہے وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹا واقعہ اس انداز سے بیان کرتا ہے جیسے وہ بے تکلف دوست بیٹھے گپ باتیں کر رہے ہیں۔ "پریشان" اس نے گلستان کے جواب میں لکھی۔ اس کے مطالعے سے اس وقت کے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اس میں طنز و ظرافت کے نمونے ملتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ اس کا بیشتر حصہ فحش ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔

قاآنی نے قصاید میں جا بجا منظر کشی کی ہے۔ کہیں بہار و خزاں کے نقشے ہیں، کہیں ایرانی حمام کا ذکر ہے اور کہیں واعظوں پر چوٹیں ہیں۔ کہیں عشق و عاشقی کی بزم آرائی ہے اور کہیں دیگر واقعات بیان کیے ہیں۔ ان سب میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ظرافت کے ہلکے ہلکے چھینٹے ملتے ہیں۔ اس کی ایک طویل مشہور نظم ہے جس میں اس نے ایک ہکلے بوڑھے اور ہکلے لڑکے کی باہمی پرلطف گفتگو کا چربہ اتارا ہے۔ یہ نظم قاآنی کی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسے پڑھتے پڑھتے انسان خود ہکلانے لگتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے:

پیر کے لال سحرگاہ بطفلے الکن   می شنیدم کہ بدین نوع ہمی راند سخن

کہ از زلفت صصصبحم شاشاشام تاریک   وے ز چہرت شاشاشامم صصصبح روشن

تتترپاکیم و بے ششششہد للبت   صصصبر و تا تا تابم ررررفت از تتتن!

طفل گفتا ممن را تتو تقلید مکن   گگگم شو ز برم اے گگگتر از زن

مممیخواہی مشتی بکلکلت بزنم   کہ بیفتد مممغزت ممیان دو دہن

پیر گفتا وو واللہ کہ معلوم است این   کہ کہ زادم من بیچارہ ز مادر الکن

ہہہفتاد و ہہشتاد و سہ سال است فزون   گگگنگ و لالالالم بخلاق زمن

طفل گفتا خخدا را صصصد بار شششکر   کہ برستم بجہان از ملال و محن!

ممن ہم گگگم ممثل تو تو تو

تو تو تو ہم گگگنگی ممثل ممن

ایران میں ہجو نگاری کا نیا انداز دورِ جدید میں پیدا ہوا۔ جدید شعراء نے سیاسیات اور وطنیات کو موضوع بنا کر بڑی بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں۔ کہیں کہیں وہ انہی موضوعات پر ظریفانہ انداز میں معاشرے کی کمزوریوں کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید اشرف الدین نسیم شمال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ جدید فارسی میں وہی مقام رکھتے ہیں جو اردو زبان میں حضرت اکبر الہ آبادی کو حاصل ہے۔ ان کے کلام میں ایک نظم "خطاب بہ فرنگیان" ہے، اس میں وہ مسلمانوں کے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پر طنز کرتے اور فرنگیوں کی عملی زندگی سے سبق لینے کی تلقین کرتے ہیں:

اے فرنگی ما مسلمانیم جنت مالِ ماست!

در قیامت حور و غلمان ناز و نعمت مالِ ماست

اے فرنگی از شما باد آں عمارات قشنگ — افتتاحِ کارخانہ اختراعات قشنگ
با ادب تحریر کردن آں عبارات قشنگ — جہلِ بیجا شور و غوغا فحش و تہمت مالِ ماست
خوابِ راحت، عیش و عشرت ناز و نعمت مالِ ماست

گر زنی بے سیم از دریا بساحل تلگراف — گرگئی غلق غراما فون و سیماتوگراف
ور نمائی بہر خود از اطلس و مخمل لحاف — سندس و استبرق اندر باغِ جنت مالِ ماست
خوابِ راحت، عیش و عشرت ناز و نعمت مالِ ماست

اے فرنگی کشتیِ جنگی و دریائی ز تو — راہِ آہن علم طے الارض صحرائی ز تو
در ہوا باز و ر زبلین عرش پیمائی ز تو — در زمیں بیکاری و جہل و فلاکت مالِ ماست
استراحت، خوابِ راحت عیش و عشرت مالِ ماست

اختراعاتِ جدید و علم و صنعت زانِ تو — از زمیں بر آسماں رفتن زہمت زانِ تو
مکتب و تشویق بر اطفالِ ملت زانِ تو — غوطہ خوردن اندریں دریائے ذلت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت، جہل و غفلت مالِ ماست

شیخ عبدالقادر از ما شافعی از ما بود — مالک از ما حنبل از ما یافعی از ما بود
بو حنیفہ بو ہریرہ رافعی از ما بود — اختلافِ اعتقاداتِ جماعت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت، ناز و نعمت مالِ ماست

شیخی از ما بابی از ما پطرو ناپلیون ز تو — دہری از ما صوفی از ما مکتب و قانون ز تو
خرقہ و عمامہ از ما کشتی و بالون ز تو — گم شو اے احمق مجاز از تو حقیقت مالِ ماست
حور و غلماں باغِ رضواں عیش و عشرت مالِ ماست

آں شنیدستم حسین کرد با جنگ نبرد — شد رواں از اصفہاں ہندوستاں را فتح کرد
در فرنگستان کجا دارد چنیں شیرانِ مرد — رستم و گودرز و زال با آں شجاعت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت ناز و نعمت مالِ ماست

گرچہ در ظاہر مسلمانیم باطن کافریم — منکرِ حق، خصمِ دیں غافل ز روزِ محشریم
مالِ موقوفات را چوں شیرِ مادر می خوریم — با وزیراں گفتگوئے رمز و خلوت مالِ ماست
باغِ رضواں، حور و غلماں ناز و نعمت مالِ ماست

فکاہیات میں میرزا غلام رضا خاں روحانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے تحریف کے علاوہ بعض نہایت عمدہ ظریفانہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً وہ اہلِ ایران کی کاہلی کے بارے میں کہتا ہے ؎

اروپائی اگر از صفحۂ خاک — رود با آسماں چہ با افلاک

از و گم نیست ایرانی که دائم — کند سیر فلک با چرس و تریاک
ز حال کشور ایران چه گویم — چه می پرسی ازیں وضع اسفناک
ستم کش را بود خونابه در دل — ستمگر را بود در شیشه کنیاک
زند غلس لب را از دست منعم — کند زارع فغاں از ظلم ملاک
نشانی از درفش کاویاں نیست — که گیرد داد مظلوماں ز ضحاک
اثاثی در سرائے کشور جم — نماند از غارت دزدان چالاک
ندانم از جبین شیخ و زاہد — چه وقت ایں داغ رسوائی شود پاک
سخن از فضل و دانش چند گوئی — بقومے بے خبر از عقل و ادراک
لب از گفتار روحانی فرو بند
دہانت را بزن مہر و بکن لاک

اہلِ ایران میں افیون خوری کی عادت عام تھی۔ روحانی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے ظریفانہ انداز میں کہا ؎

مردیم از خماری ہمشیرگاں خدا را — از یک دو لست شیرہ سازید نشہ ما را
ده روزه مهر گردوں افسانه است افسوں — مرفین بجائے افیوں تزریق ساز یارا
آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است — با شیرهٔ مروّت با الکلی مدارا
قلیان چرس بر کش آنگه سکندری خور — تا بر تو عرضه دارد احوال ملک دارا
من مست بودم از مے کردم بدامنت قے — اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را
از دود وحدت ما گر جرعهٔ ننوشند — در رہ جبرہ حالت آرد زندان با صفارا
چوں لست گندهٔ ستی فوری بزن دو دستی — کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را
ما را قضا کشانید پائے چراغ شیره — گر تو نمی پسندی تغییر دہ قضا را
اے منعمی که داری در خانه چرس و افیوں — روزے تفقدی کن درویش بے نوا را
افیونیان برنا بخشندگان عمر اند — ساقی بشارتے ده پیران پارسا را
چوں شد لبشیره معتاد لاغر شود چو موئی — دلبر که در کف او موم است سنگ خارا
دو شنبه با حسن لات رفتیم در خرابات — باشد که باز بینیم دیدار آشنا را
رندی به آه و زاری میخواند در خماری — ہات الصبوح و ہبوا یا ایہا السکارا
در موقع خماری کیفیت نگاری — اسقنے لنا و احلی من قبلة العذارا
رندی بیار گندم پنهاں نمود تریاک — ورد اکه راز پنهاں خواهد شد آشکارا
آں یار را مفتش بو برده کرد توقیف — چوں بهر کشف قاچاق می گشت بار ہا را

ملک الشعراء مرزا محمد تقی بہار مشہدی جدید ایران کے زبردست انقلابی شاعر ہیں۔ آپ کا دیوان ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں قصاید، غزلیات، مثنویات، رباعیات و قطعات سب موجود ہیں۔ آپ نے ایک نظم "گل" (کیچڑ) کے بیان میں لکھی ہے۔ اس نظم کے ذریعے انھوں نے بلدیہ کی توجہ شہر کی صفائی کی طرف دلائی ہے۔ نظم کا انداز پرلطف ہے اور ہر شعر بلدیہ کے لیے نیز و نشتر ہے

افتادہ ایم سخت بدام بلائے گل　　یارب چو ما مباد کسے مبتلائے گل
گل مشکلے شدہ است بہر معبر و طریق　　گام رونگان شدہ مشکل گشائے گل
ہر گہ کہ ابر تیرہ زند در فضائے شہر　　بر بام ہر سرائے برآید لوائے گل
گل دل نمی کند ز خراسان و اہل او　　اے جان اہل شہر فدائے وفائے گل
گر صد ہزار کفش بدرد بپائے خلق　　ہرگز نمی رسد بہ کف غطائے گل
با خضر اگر روند بہ ظلمات کوچہ خلق　　اسکندری خورند در آن چشمہ ہائے گل
اول قدم کہ بوسہ زند گل بہ پائے ما　　رقصیم بر زمین و ببوسیم پائے گل
گلہا تقسیل و درہم و کوچہ خراب و تنگ　　آہ از جفائے کوچہ و داد از جفائے گل
گل ہر چہ را بہ پنجہ در آورد دل نکرد　　صد آفرین بہ پنجہ معجز نمائے گل
از گل زبس کہ خاطر و دلہا فسردہ است　　گل نیز بعد ازین نہ دمد از فضائے گل
بر روزگار خویش کنم گریہ بامداد　　چون بنگرم بخندہ دندان نمائے گل
از پشت تا بہ شانہ و از پیش تا بہ ریش　　ہستند خلق یکسرہ غرق غطائے گل
امروز در قلمرو طوس از بلند و پست　　آنجا کجا کجاست کہ خالی ست جائے گل
آید اگر جہانہ زرہ پوشن نہ انگلیند　　حیران شود ز لجبش بے منتہائے گل
گر لای و گل تمام نگردد ازین بلد　　اہل بلد تمام بمانند لائے گل

شرم آیدم ز گفتن بسیار ور نہ بانہ
چندین ہزار مسئلہ باشد ورائے گل

جدید شعراء میں اور بھی کئی ایسے ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر اس وقت ان کا کلام سامنے نہیں۔ اس لیے مجبوراً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ورنہ ان میں بعض بڑے کام کی چیزیں ہیں جن میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

جدید فارسی شاعری میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کا ایرانی اس قدر وطن پرست بن چکا ہے کہ وہ ایران ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ایرانی عصبیت کا شکار ہو کر ایران کے قدیم مشاہیر کی عظمت کے ترانے گاتا ہے۔ قدیم ایران کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ رشتے جوڑتا ہے۔ کہیں وہ خاکِ ایران کے عنوان پر نظم لکھتا ہے اور آوستا اور ایرانی آتشکدوں کے مٹ جانے پر آنسو بہاتا ہے اور بسا اوقات اعتدال کی حد سے تجاوز کر کے عربوں کی ہجو پر اتر آتا ہے۔ مثلاً

فرخی عراقی ایک قطعہ میں کہتا ہے ؎

یارب عرب مباد و دیار عرب مباد

ایں ارض شوم و مردم دور از ادب مباد

ایں قوم رو بہ دزد گدا را ذکر و کار

جز لعنت و عذاب و وبا و غضب مباد

تنہا نہیں عراق نہ ہر جا عرب کدہ

نجد و حجاز و تونس و مصر و حلب مباد

یہ ایران کی ظریفانہ شاعری کا مجمل سا خاکہ ہے جو بڑی عجلت میں تیار کیا گیا ہے۔ جن شاعروں کا بیان اجمالاً ذکر آیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ مقالہ لکھا جائے۔ پھر کہیں جا کر فارسی زبان کے طنز و مزاح کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہے۔

(بڑی)

بروبڈنگ نیگ کا سفر

مصنف:- جوناتھن سوئفٹ

مترجم:- شاہد احمد دہلوی

دوسرا باب

کسان کی لڑکی کا بیان۔ مصنف کو منڈی والے شہر لے جایا جاتا ہے اور پھر راجدھانی میں۔ اس کے سفر کے حالات۔

میری مالک کی ایک لڑکی نو سال کی تھی، یہ بچی اپنی عمر سے زیادہ مستعد تھی، سوزن کاری میں بڑی چابکدست، اور اپنے بچے کو [illegible]ے پالنے میں نہایت ہوشیار۔ میرے رات کو سونے کے لئے ماں بیٹی نے بچے کا ایک پالنا جوڑ جاڑ کر ٹھیک کر دیا۔ ایک الماری کے [illegible] خانے میں اس پالنے کو رکھ دیا، اور چوہوں کے ڈر سے اس خانے کو ایک چھینکے پر رکھ دیا۔ جتنے عرصے میں ان لوگوں کے ہاں [illegible] میرا بستر تھا، اور جیسے جیسے میں ان کی زبان سیکھتا گیا اور اپنی ضروریات انھیں بتاتا گیا میرا بستر زیادہ آرام دہ ہوتا گیا۔ یہ کم عمر لڑکی اس قدر [illegible] تھی کہ مجھے دو ایک دفعہ کپڑے اتارتے دیکھ کر خود ہی مجھے کپڑے پہنانے اور اتارنے لگی، حالانکہ میں نے اس کام کی اسے [illegible] نہیں دی تھی اور خود ہی اپنے کپڑے پہنتا اور اتارتا تھا۔ اس نے مجھے سات قمیصیں بنا کر دیں اور سوتی کپڑے کی چند اور چیزیں بھی۔ [illegible] باریک سے باریک دیکھ کر لائی تھی مگر دراصل یہ ٹاٹ سے بھی زیادہ موٹا تھا۔ اور میرے یہ کپڑے ایک ساں اپنے [illegible] سے دھوئے جاتی تھی۔ ساتھ کے ساتھ وہ میری استانی بھی تھی اور مجھے اپنی زبان سکھایا کرتی۔ جب میں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا [illegible] کا نام اپنی زبان میں مجھے بتاتی۔ یوں تھوڑے ہی دنوں میں مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی نام لے کر مانگنے لگا۔ یہ لڑکی بڑی اچھی [illegible] کی تھی، اور چالیس فٹ سے زیادہ اس کا قد نہیں تھا، جو عمر کے لحاظ سے کم تھا۔ اس نے میرا نام گرل ڈریگ رکھا۔ [illegible] میں میرا یہی نام پڑ گیا اور پھر ساری مملکت میں بھی یہی مشہور ہو گیا۔ اس لفظ کے معنی وہی ہیں جو لاطینی میں نانن کیولس [illegible] اطالوی میں ہومن سی لیطینو کے اور انگریزی میں انسانچہ کے۔ اس ملک میں میری حفاظت بیشتر اسی لڑکی نے کی۔ [illegible] تک میں وہاں رہا ہم دونوں کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے اپنی گلم ڈل کلیچ یا چھوٹی دادا کہا کرتا تھا۔ اگر میں اس کی توجہ [illegible] محبت کا تذکرہ اعزاز کے ساتھ نہ کروں تو میں ایک بڑی احسان ناشناسی کا خطاوار ہوں گا۔ کاش یہ میرے اختیار [illegible] ہوتا کہ اس کا صلہ اسے دے سکتا، جس کی وہ مستحق تھی، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بجائے میں نادانستہ طور پر اس کی بدنامی [illegible] افسوس ناک ذریعہ بنا۔

اب پاس پڑوس میں چرچا ہونے لگا کہ میرے آقا کو کھیت میں سے ایک عجیب جانور ملا ہے، قد و قامت میں سپلاک نک سے
برابر، لیکن سارے اعضا انسانوں جیسے، اور تمام کاموں میں انسانوں ہی کی نقل کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنی زبان بھی بولتا ہے
ہمارے بھی کئی لفظ سیکھ گیا ہے، دو پاؤں پر چلتا ہے، مسکین ہے اور ہل گیا ہے، بلانے سے آ جاتا ہے، حکم کی تعمیل کرتا ہے، ہاتھ پاؤں
بڑے سڈول اور خوشنما، رنگ کسی نجیب کی سہ سالہ لڑکی سے زیادہ اجلا۔ ایک کاشتکار جو قریب ہی رہتا تھا اور میرے آقا کا خاص دوست
تھا۔ اس کہانی کی تصدیق کرنے بالقصد آیا۔ مجھے فوراً لا کر ایک میز پر رکھ دیا گیا، میں حسب الحکم چلتا پھرتا رہا، اپنا تیغچہ سونت کر دکھایا اور
اسے پھر نیام کیا، اپنے آقا کے مہمان کی خدمت میں آداب بجا لایا، اسی کی زبان میں مزاج پرسی کی، اسے خوش آمدید کہا، بالکل اسی طرح
جس طرح میری چھوٹی دادا نے مجھے بتایا تھا۔ یہ شخص بڈھا تھا اور اسے دھندلا نظر آتا تھا، مجھے اچھی طرح دیکھنے کے لئے اس نے اپنی
عینک لگائی، اس پہ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور خوب ہنسا، کیونکہ اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کسی کمرے کی دو کھڑکیوں میں سے
پورا چاند جھانک رہا ہو۔ ہمارے گھر کے لوگوں نے میری ہنسی کی وجہ کو تاڑ لیا اور لگے میرے ساتھ ہنسنے۔ اس پر کم عقلی سے وہ بڈھا ناخوش
ہو گیا اور اس کا منہ بگڑ گیا۔ وہ بڑا خبیس آدمی تھا اور اس مضحکہ کا سزاوار تھا، اس وجہ سے بھی کہ اس نے میری بدنصیبی دیکھئے، میرے آقا کو
مشورہ دیا کہ برابر والے شہر میں جب بازار لگے تو وہاں میری نمائش کرے۔ گھوڑے پر وہاں جانے میں آدھ گھنٹہ لگتا تھا۔ کوئی دو سو میل
کا فاصلہ ہوگا ہمارے گھر سے۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے آقا اور اس کے دوست میں سرگوشیاں ہو رہی چلی جا رہی ہیں اور کبھی کبھی
طرف اشارہ بھی کیا جا رہا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا، اور میرے اندیشوں نے مجھے سمجھایا کہ میں نے ان کے چند الفاظ سن لئے ہیں اور سمجھ لئے
ہیں۔ لیکن اگلے دن صبح کو میری چھوٹی دادا گلم دل کلچ نے سارا ماجرہ مجھ سے بیان کیا۔ اس نے اپنی چالاکی سے پوری بات اپنی ماں سے پوچھ لی تھی
بچاری لڑکی نے مجھے اپنے سینے پر لٹا لیا اور مارے شرم اور رنج کے رونے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ بیہودہ اور جاہل لوگوں سے مجھے دکھ پہنچے گا
وہ شاید مٹھی میں مجھے بھینچ کر میرا دم ہی نہ نکال دیں یا ان کے ہاتھوں میں پڑ جانے کے بعد میرا کوئی ہاتھ پاؤں ہی نہ ٹوٹ جائے۔ اس نے
خوب جانچ لیا تھا کہ میں فطرتاً کس قدر شرمیلا ہوں، اپنی عزت کا مجھے کتنا پاس ہے۔ اور جب گھٹیا سے گھٹیا لوگوں کے سامنے پیسے کمانے
کی غرض سے مجھے تماشہ بنایا جائے گا تو میں کس قدر پیچ و تاب کھاؤں گا۔ اس نے کہا امی ابی اور امی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گرل ڈریگ
تمہارا ہوگا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مجھ سے وہی چال چلی جو پچھلے سال چلی تھی کہ بھیڑ کا بچہ مجھے دینے کا وعدہ کیا مگر جب وہ خوب
موٹا تازہ ہو گیا تو اسے قصائی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے متعلق اتنا پریشان نہیں تھا جتنی چھوٹی دادا میرے لئے پریشان تھی
مجھے ہمیشہ یہی امید رہی کہ ایک نہ ایک دن مجھے دوبارہ آزادی مل جائے گی۔ رہی یہ ذلت کہ مجھے ایک عجوبہ بنا کر جگہ جگہ میری نمائش کی جائے
تو میں اس ملک میں بالکل اجنبی تھا، اور اگر میں کبھی انگلستان واپس پہنچ سکا تو میری اس بدنصیبی کو میری کوتاہی قرار دے کر مجھے متہم نہیں کیا جائے گا
کیونکہ اگر میرے بدلے برطانیہ عظمیٰ کا بادشاہ خود بھی ہوتا تو ان حالات میں اسے بھی اسی اذیت سے گزرنا پڑتا۔

میرے آقا نے اپنے دوست کے مشورے کے مطابق مجھے ایک بکس میں رکھا اور بازار لگنے والے دن برابر والے شہر کو لے چلا۔
اپنے پیچھے کاٹھی پر اپنی بیٹی میری چھوٹی دادا کو بٹھا لیا۔ بکس چاروں طرف سے بند تھا، میرے اندر جانے اور باہر نکلنے کے لئے اس میں ایک دروازہ
تھا، اور اس کے چند سوراخ ہوا کے لئے تھے۔ لڑکی نے اتنی احتیاط برتی کہ اس میں اپنے بچے کا نالچہ بچھا دیا تاکہ میں اس پر پڑا رہوں۔ یہ سفر
اگرچہ صرف آدھ گھنٹے کا تھا لیکن میری چول چول ہل گئی، کیونکہ گھوڑا ایک قدم میں کوئی چالیس فٹ نکال جاتا اور دلکی چلنے میں اتنا اچھلتا کہ اس

کے فاصلہ پہ میرے آقا نے اپنی بیٹی گلم ڈال کلیچ کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ اس نے میرا بکس اپنی گود میں رکھ لیا اور بکس کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ لڑکی نے اس بکس میں چاروں طرف نرم سے نرم کپڑے کی تہ لگا دی تھی اور نیچے روئی کا گدا رکھ دیا تھا اور اوپر اپنے بچے کا بستر لگا دیا تھا۔ میرے لئے کپڑے اور ضروریات کی دوسری چیزیں ساتھ لے لی تھیں اور جہاں تک ممکن تھا میری آسائش کا انتظام کر لیا تھا۔ ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا، بس گھر کا ایک چھوکرا تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے گھوڑے پر سامان لادے چلتا تھا۔

میرے آقا کا ارادہ مجھے ان تمام شہروں میں دکھانے کا تھا جو راستہ میں آتے تھے، بلکہ شاہراہ چھوڑ کر سو پچاس میل اندر کسی دیہات کے رئیس کے ہاں بھی پہنچ جانا، بشرطیکہ اسے وہاں سے رقم ملنے کی توقع ہوتی۔ ہم آسانی سے سوا سو ڈیڑھ سو میل روزانہ طے کر لیتے تھے گلم ڈل کلیچ مجھے تکلیف سے بچانے کے خیال سے شکوہ کرنے لگتی کہ گھوڑے کی دلکی نے مجھے تھکا دیا۔ میری خواہش پر مجھے اکثر میرے بکس میں سے ہوا کھلانے کے لئے نکالتی اور مجھے ملک کی سیر کراتی، لیکن میرے کمربندوں کو مضبوطی سے تھامے رہتی۔ ہم نے پانچ یا چھ دریا عبور کئے جو نیل اور گنگا سے کہیں گہرے اور چوڑے تھے، اور شاید ہی کوئی ندی اتنی چھوٹی ہمیں نظر آئی ہو جتنی لندن کے پل کے قریب ٹیمز دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے سفر میں دس ہفتے گزر گئے اور بڑے دیہاتیوں اور رئیسوں کے علاوہ اٹھارہ بڑے شہروں میں میری نمائش کی گئی۔

اکتوبر کے چھبیسویں دن ہم دارالحکومت میں پہنچے جسے وہ اپنی زبان میں لوربرل گرہ دیا فخر کائنات کہتے ہیں۔ میرے آقا نے خاص بازار میں رہنے کی جگہ لی۔ یہاں سے شاہی محل زیادہ دور نہیں تھا۔ حسبِ معمول اشتہار جلدی کئے جن میں میرا پورا حلیہ درج کیا۔ تین چار سو فٹ چوڑا سا کمرہ کرایہ پر لیا۔ میری اداکاری کے لئے ساٹھ فٹ قطر کی اس میں ایک میز لگائی اور اس کے کنارے سے تین فٹ اندر کی طرف تین ہی فٹ اونچا کٹہرا لگایا تاکہ میں میز پر سے گرنے نہ پاؤں۔ روزانہ دس مرتبہ میری نمائش کی جاتی۔ لوگ حیرت سے دیکھتے اور خوش ہو کر جاتے۔ میں اب ان کی زبان اچھی خاصی بولنے لگا تھا اور جو کچھ مجھ سے کہا جاتا اس کا ایک ایک لفظ سمجھ لیتا۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے حروف تہجی سیکھ لئے تھے اور فقرے لکھنے لگا تھا، کیونکہ گلم ڈل کلیچ مجھے گھر پر بھی پڑھاتی رہی تھی اور دورانِ سفر فرصت کے اوقات میں بھی۔ اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی کتاب رہتی تھی، ہمارے ہاں کے سان سن کے نقشوں کے مجموعہ کے برابر، کم عمر لڑکیوں کے لئے یہ ایک عام کتابچہ تھا جس میں ان کے مذہب کا مختصر بیان درج تھا۔ اس میں سے اس نے مجھے حروف سکھائے اور الفاظ کے معنی بتاتی رہتی۔

(انگریزی)

للی پٹ کا سفر

مصنفہ:- جوناتھن سوئفٹ

مترجمہ:- شاہد احمد دہلوی

چھٹا باب

للی پٹ کے باشندوں کے متعلق، اُن کی تعلیم، قوانین، اور
رسم و رواج۔ بچوں کا طریقۂ تعلیم۔ اس ملک میں مصنف کا
طرزِ زندگی۔ اس کا معزز خاتون کو الزامات سے بَری
ثابت کرنا۔

میرا ارادہ اگرچہ یہ ہے کہ اس مملکت کا حال ایک علیحدہ کتاب میں لکھوں تاہم پڑھنے والوں کے اشتیاق کی تسکین کے لئے میں
فی الحال چند عام باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہاں کے باشندوں کا قد چونکہ عموماً چھ انچ سے کم ہی ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے جانور،
پودے اور درخت بھی قد و قامت میں ٹھیک اسی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اونچے سے اونچے گھوڑے، اور بیل چار اور
پانچ انچ کے درمیان ہوتے ہیں، بھیڑ کم و بیش ڈیڑھ انچ کی۔ ان کی قازیں تقریباً گھریلو چڑیا کے برابر، اور اسی تناسب سے گھٹتے گھٹتے
جب چھوٹے جانوروں پر نوبت پہنچتی تو وہ اتنے چھوٹے دکھائی دیتے کہ ان میں سے اکثر تو مجھے دکھائی بھی نہ دیتے۔ لیکن قدرت نے
للی پٹ والوں کی آنکھوں کو تمام چیزیں مناسب شکل و صورت میں دیکھنے کی صلاحیت دے رکھی تھی۔ وہ بہت صحیح دیکھتے ہیں مگر بہت دور
تک نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی قریب کی چیزوں کی باریک بینی کا یہ ثبوت دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ ایک باورچی ایک چنڈول کے پر نوچ رہا
تھا، اور چنڈول اتنا بڑا بھی نہیں تھا جتنی ہماری مکھی۔ اور ایک کم عمر لڑکی کو دیکھا کہ سوئی میں دھاگہ پرو رہی ہے مگر مجھے نہ تو سوئی سوجھی اور
نہ دھاگہ۔ ان کے اونچے سے اونچے درخت، کوئی سات فٹ کے ہوتے ہیں، میرا مطلب ان درختوں سے ہے جو شاندار شاہی باغ میں ہیں،
جن کی چوٹیوں تک میرا مٹھی بند ہاتھ پہنچتا تھا۔ ترکاریاں بھی اسی تناسب سے ہیں، لیکن انھیں اب میں پڑھنے والے کے تصور پر چھوڑتا ہوں
جملہ علوم ان میں صدیوں سے پھیل رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں لیکن اس وقت میں ان کا تفصیلی بیان نہیں کروں گا۔ مگر ان کا لکھنے کا انداز بڑا
عجیب و غریب ہے کہ نہ تو بائیں سے دائیں کو ہے جیسا کہ یورپ والوں میں ہے، نہ دائیں سے بائیں کو، جیسا کہ عرب والوں میں ہے؟
نہ اوپر سے نیچے کو، چینیوں کی طرح، نہ نیچے سے اوپر کو، کاسکاجیوں کی طرح۔ بلکہ آڑا، کاغذ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک،
انگلستان کی خواتین کی طرح۔

یہ لوگ اپنے مُردوں کو سر کے بل دفن کرتے ہیں، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب گیارہ ہزار چاند پورے ہو جائیں گے تو سارے مُردے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اس عرصہ میں دنیا (جو ان کے نزدیک چپٹی ہے) الٹ جائے گی، اور یوں دوبارہ اٹھائے جانے پر وہ اپنے آپ کو اپنے پیروں پر کھڑا پائیں گے۔ ان میں جو پڑھے لکھے ہیں اس عقیدے کو مہمل قرار دیتے ہیں، لیکن دفن کا کرنے کا یہ دستور اب بھی جاری ہے کیونکہ جہلا اسی روایت پہ قائم ہیں۔

اس مملکت میں چند قوانین اور رسوم بڑی عجیب ہیں۔ اور اگر میرے پیارے ملک کے دستور اور رواج کے یہ اس قدر خلاف نہ ہوتے تو ان کے جواز کے حق میں کچھ کہنے کو میرا جی چاہتا۔ کاش ان پہ اسی عمدگی سے عمل بھی کیا جاتا۔ ایک جس کا ذکر میں پہلے کروں گا مخبروں کے متعلق ہے۔ ریاست کے خلاف تمام جرائم کی سزا نہایت سخت دی جاتی ہے۔ لیکن مقدمہ میں اگر ملزم اپنی بے گناہی ثابت کر دے تو الزام لگانے والے کو ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اسکے سامان یا زمینوں سے بے گناہ شخص کی چارگنی تلافی کی جاتی ہے اس کے وقت کے ضائع ہونے کی، اس کے خطرے میں پڑ جانے کی، اس کی قید و بند کی سختیوں کی، اور ان کل اخراجات کی جو اسے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے انگیز کرنے پڑے۔ اگر زر تلافی کم رہ جائے تو اس کا بیشتر حصہ حکومت ادا کرتی ہے۔ شہنشاہ اسے کوئی نشان عاطفت بھی از راہِ نوازش عطا کرتا ہے، اور سارے شہر میں اس کی بے گناہی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ بے ایمانی کو چوری سے بڑا جرم سمجھتے ہیں، اور شاذ ایسا ہوتا ہے کہ بے ایمان کی سزا موت نہ ہو۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ادنیٰ فہم کا آدمی بھی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنا مال و اسباب چوروں سے بچا سکتا ہے، لیکن دیانتدار شخص بے ایمان کی مکاری سے نہیں بچ سکتا۔ اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ خرید و فروخت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے اور اعتبار پر لین دین ہوتا رہے، اگر بے ایمانی کو روا رکھا گیا، یا فریب دہی سے چشم پوشی کی گئی، یا اس کی سزا کا کوئی قانون نہیں بنایا گیا تو ایماندار ہمیشہ مارا جائے گا اور بے ایمان مزے اڑائے گا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے بادشاہ سے ایک مجرم کو بچانا چاہا جس نے اپنے آقا کی رقم اڑا لی تھی، یہ رقم ایک گاہک نے دی تھی جسے لے کر ملازم بھاگ گیا، تو اس کا جرم ہلکا کرنے کے لئے میں نے کہا کہ یہ تو محض اعتبار کھونے کی بات ہے، تو شہنشاہ نے اسے میری ایک نہایت وحشیانہ حرکت تصور فرمایا کہ اتنے بڑے جرم کا بچاؤ کر کے میں نے جرم کی شدت کو بڑھا دیا۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ میرے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس عام عذر کے کہ مختلف قوموں کے مختلف دستور ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔

اگرچہ ہم جزا اور سزا کو عموماً وہ دو چولیں کہتے ہیں جن پر پوری حکومت چلتی ہے لیکن اس اصول کو میں نے عملی صورت اختیار کرتے کسی قوم میں نہیں دیکھا، سوائے للی پٹ کی قوم کے۔ جو کوئی بھی اس امر کا کافی ثبوت مہیا کر سکتا ہے کہ اس نے تہتر چاند اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنے میں پورے کر لئے تو اسے اس کی زندگی کے معیار اور حالات کے مطابق چند مراعات حاصل ہو جاتی ہیں، اور اسے ایک مناسب رقم اس سرمایہ میں سے بھی دی جاتی ہے جو اس مد کے لئے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ کے ساتھ اسے "اسنل پال" یعنی قانونی کا خطاب بھی مل جاتا ہے جو اس کے نام کے ساتھ لگ جاتا ہے، لیکن یہ خطاب وراثت میں اس کی اولاد کو نہیں ملتا۔ اور ان لوگوں نے میرے یہ بتانے پر اسے حکمتِ عملی کا ایک بہت بڑا سقم قرار دیا کہ ہمارے قوانین میں صرف سزائیں شامل ہیں، جزاؤں کا کوئی مذکور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عدالتوں میں انصاف کا جو بت ہوتا ہے۔ اس کی چھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو سامنے، دو پیچھے، اور ایک ایک ادھر ادھر

ان سے خبرداری کا اظہار مقصود ہے۔ اس بت کے دائیں ہاتھ میں سونے کا ایک منہ کھلا توڑا ہوتا ہے اور بائیں ہاتھ میں نیام کی ہوئی تلوار۔ اس سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انصاف کی دیوی سزا سے زیادہ جزا کی طرف مائل ہے۔

کل ملازمتوں کے لئے جو لوگ انتخاب کئے جاتے ہیں ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے حسن اخلاق کو دیکھا جاتا ہے، کیونکہ حکومت تو انسانوں کے لئے بہرحال ضروری ہے، اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کی فہم کسی نہ کسی ملازمت کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ عوام کے معاملات کو قدرت نے ایسا سربستہ راز بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی جسے صرف چند اعلیٰ قابلیت کے افراد ہی سمجھ سکیں، ایسے افراد جو سارے زمانے میں تین سے زیادہ پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صداقت، انصاف، رواداری، اور اسی طرح کے حسنات ہر شخص کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ان حسنات پر اگر عمل کیا جائے اور تجربہ اور نیک نیتی بھی اس کے ساتھ ہو تو ہر شخص اپنے ملک کی خدمت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے، سوائے اس خدمت کے جس کے لئے تربیت خصوصی درکار ہو۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اخلاق حسنہ کے فقدان کی تلافی اعلیٰ ذہنی ودیعتوں سے اس درجہ بعید ہے کہ ملازمتیں ایسے خطرناک لوگوں کے سپرد نہیں کی جاسکتیں۔ جو محض ذہنی قابلیتوں سے متصف ہوتے ہیں۔ اور کم از کم وہ غلطیاں جو نیک فطرت لوگوں سے لاعلمی میں سرزد ہو جائیں، عوام کی بہبودی کے لئے اس قدر مہلک نتائج پیدا نہیں کریں گی۔ جتنی اس شخص کی حرکات پیدا کریں گی جس کے رجحانات اُسے برائیوں پر مائل کریں، اور وہ ان برائیوں کو پروان چڑھانے اور ان کا تحفظ کرنے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہو۔

اسی طرح ربانی قوت کے تسلیم نہ کرنے والے کو بھی ملازمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ بادشاہ قوتِ ربانی کے نائب ہونے کا حلف اٹھاتے ہیں اس لئے للی پٹ والے سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بے معنی بات اور کیا ہوگی کہ کوئی بادشاہ ایسے لوگوں کو ملازمتیں سونپے جو سرے سے اس حاکم ہی کو نہ مانتا ہوں جس کے احکام کی تعمیل خود بادشاہ کرتا ہو۔

جو دستور میں نے بیان کئے ہیں اور آگے چل کر جن کا ذکر کروں گا ان سے میری مراد اصلی قوانین ہیں، وہ رسوا کن خرابیاں نہیں ہیں جن میں یہ لوگ انسانی پست فطرت کی وجہ سے مبتلا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ رسوں پر ناچ دکھا کر یا بانسوں پر کود کر یا ان کے نیچے سے نکلنے کے کرتب دکھا کر اونچی ملازمتیں حاصل کر لینا یا شاہی نوازشوں کے تمغے اور نمایاں حیثیت حاصل کر لینا، ایسی خرابیاں ہیں جنھیں موجودہ شہنشاہ کے دادا نے پہلی بار داخل ہونے دیا، اور فرقہ بندی اور دھڑا بندی نے انھیں موجودہ بلندی پر پہنچا دیا۔

احسان فراموشی کو ان لوگوں میں واجب القتل سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے بعض اور ملکوں میں بھی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے محسن کا بدلہ برائی سے دیتا ہے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ضرور دشمنی کرے گا کیونکہ ان کی طرف سے تو کوئی احسان کی زیر باری بھی اس پر نہیں ہوتی، للذا ایسا شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ زندہ رہے۔

والدین اور بچوں کے فرائض کا تصور ہم سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ نر اور مادہ کے میل کی بنیاد قدرت کے نسل کشی کے عظیم قانون پر ہے للذا للی پٹ والے اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ مرد اور عورت بھی دوسرے حیوانوں کی طرح نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے یکجا ہوں، اور اسی قدرتی اصول کے تحت انھیں اپنے بچوں کی مامتا ہوتی ہے۔ اسی باعث وہ اسے قطعی گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی بچہ اپنے باپ کا اس لیے احسان مند ہو کہ وہ اس کی پیدائش کا ذمہ دار ہے یا اپنی ماں کا اس لیے احسان مانے کہ وہ اسے دنیا میں لائی۔ کیونکہ انسانی زندگی کے مصائب کے پیشِ نظر یہ فعل نہ تو بجائے خود مستحسن ہے اور نہ والدین ہی کا یہ منشا تھا۔ وہ تو

اپنی محبت کی پینگوں میں کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ ان اور ایسی ہی دلیلوں سے انھوں نے رائے قائم کی ہے کہ جب کھانے اور انتظام ہو ہی نہ سکتا ہو تو والدین کو ان کے بچوں کی تعلیم پہ مامور کیا جائے۔ اسی وجہ سے ان کے ہر شہر میں عوامی بچہ خانے کھلے ہوئے ہیں جہاں تمام والدین کو ماسوائے کسانوں اور مزدوروں کے، اپنے بچوں اور بچیوں کو بیس چاند کے ہوتے ہی پالے جانے اور تعلیم پانے کیلئے جبراً بھیج دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ اس عمر میں ان میں تربیت پذیری کی چند مبادیات رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ مدرسے مختلف نوعیتوں کے ہیں، جو دونوں صنفوں اور مختلف اوصاف کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے استاد ہوتے ہیں جو بچوں کو ایسی زندگی کی تربیت دینے میں مہارت رکھتے ہیں جو ان کے والدین کے معیارِ زندگی کے شایاں ہو، اور خود بچوں کی اپنی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق بھی۔ میں پہلے مردانہ بچہ گھروں کا مختصر ذکر کروں گا اور اس کے بعد زنانہ بچہ گھروں کا۔

اونچے گھرانوں کے بچوں کے بچہ گھروں میں سنجیدہ اور عالم استاد اور ان کے کئی کئی معاون ہوتے ہیں۔ بچوں کے لباس اور کھانے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ دیانتداری، انصاف، ہمت، حیا، حلم، مذہب، اور حب الوطنی، کے اصولوں کے مطابق ان کی تربیت ہوتی ہے۔ بچے کسی نہ کسی کام میں ہمیشہ مصروف رکھے جاتے ہیں، سوائے کھانے اور سونے کے اوقات کے جو بہت مختصر ہوتے ہیں، اور دو گھنٹے تفریح کے جن میں انھیں جسمانی ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ چار سال کی عمر تک انھیں مرد کپڑے پہناتے ہیں، اس کے بعد وہ چاہے کتنے ہی عالی نسب کیوں نہ ہوں انھیں خود اپنے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ خادمائیں جن کی عمر ہمارے پچاس سال کی نسبت سے ہوتی ہے۔ صرف نہایت ادنیٰ درجے کے کام انجام دیتی ہیں۔ بچوں کو نوکروں سے باتیں کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی تفریح کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بڑے گروہ بنا کر جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ ایک استاد یا نائب استاد ہوتا ہے۔ اس احتیاط کی وجہ سے وہ بیوقوفی اور بدی کے ان ابتدائی برے اثرات سے بچ جاتے ہیں جن کے شکار ہمارے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے والدین کو سال میں صرف دو دفعہ ان سے ملنے دیا جاتا ہے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ آنے اور جانے پر انھیں اپنے بچوں کو پیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن ان مواقع پر جو استاد ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ انھیں کانا پھوسی کرنے نہیں دیتا، نہ لاڈ پیار کی باتیں کرنے دیتا ہے، اور نہ کھلونے، مٹھائیاں وغیرہ بطور تحفہ دینے دیتا ہے۔

بچے کی تعلیم اور تفریح کے اخراجات والدین ادا کرتے ہیں۔ اگر وقت پر ادا نہ کئے جائیں تو شہنشاہ کے افسر وصول کر کے دیتے ہیں معمولی حیثیت کے لوگوں مثلاً تاجروں، دوکانداروں، اور دستکاروں کے بچہ گھروں کا انتظام بھی نسبتاً اسی ڈھنگ سے کیا جاتا ہے۔ وہ بچے جو مختلف کاروباروں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں کار آموزی کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں، مگر اونچے خاندانوں کے بچے پندرہ سال کی عمر تک تربیت، پاتے رہتے ہیں، ہمارے حساب سے انھیں اکیس[21] سال کے سمجھنا چاہئے لیکن کڑی پابندیاں آخری تین سال میں رفتہ رفتہ کم کر دی جاتی ہیں۔

لڑکیوں کے بچہ خانوں میں اونچے گھرانوں کی بچیوں کی تعلیم بچے ہی کی طرح ہوتی ہے، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ انھیں خادمائیں کپڑے پہناتی ہیں، لیکن ہمیشہ استاد یا نائب استاد کی موجودگی میں، یہاں تک کہ خود کپڑے پہننے سیکھ لیتی ہیں، یہ عموماً پانچ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خادمائیں بچیوں کو خوفناک یا بیوقوفیوں کی کہانیاں سنا کر ان کا دل بہلایا کرتی ہیں، یا وہ حماقتیں کرتی ہیں جو ہمارے ہاں کی ملازمائیں کرتی ہیں تو سارے شہر میں انھیں گھما کر تین دفعہ کوڑے مارے جاتے ہیں، ایک سال قید رکھا جاتا ہے، اور شہر بدر کر کے عمر بھر کیلئے

ملک کے کسی ویران ترین حصے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی نوعمر لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح بزدلی اور بیوقوف ہونے پر شرمندہ ہوتی ہیں، اور جسمانی آرائش کے تمام ساز و سامان کو نفاست اور ستھرے پن کے خلاف سمجھ کر حقارت سے دیکھتی ہیں۔ برہنانے اختلافِ صنف میں نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی بھی فرق نہیں دیکھا، سوائے اس کے کہ لڑکیوں کی ورزشیں اتنی سخت نہیں ہوتیں جتنی لڑکوں کی، اور کچھ اصول و ضوابط گھریلو زندگی کے بارے میں انھیں بتائے جاتے ہیں اور ان کی تعلیم کا پھیلاؤ لڑکوں کی نسبتاً کچھ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اونچے درجے کے لوگوں میں بیوی کو ہمیشہ ایک معقول اور خوشگوار ساتھی ہونا چاہئے، اس وجہ سے کہ وہ سدا جوان نہیں رہ سکتی۔ جب لڑکیاں بارہ سال کی ہو جاتی ہیں تو بر ان کے ہاں شادی کرنے کی عمر سمجھی جاتی ہے، اس لئے ان کے والدین یا سرپرست آ کر انھیں گھر لے جاتے ہیں اور استادوں کے بہت شکر گزار ہوتے ہیں۔ اس موقع پر شاذ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں اور ان کی ہمجولیاں رو نہ پڑتی ہوں۔

ادنیٰ درجے کی بچیوں کے بچہ گھروں میں بچیوں کو ان تمام کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جو ان کی صنف کے مناسب حال ہوں اور ان کے متعدد طبقوں کے مطابق۔ جنھیں کار آموز بنانا ہوتا ہے انھیں نو سال کی عمر میں رخصت کر دیا جاتا ہے۔ باقی کو تیرہ سال کی عمر تک رکھا جاتا ہے۔

غریب گھرانوں والے جن کے بچے ان بچہ گھروں میں داخل ہوتے ہیں مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے سالانہ وظیفوں کے علاوہ، جو کم سے کم ہوتے ہیں، اپنی ذاتی ماہوار آمدنی کا بھی کچھ حصہ اپنے بچے کے اخراجات کے لئے بچہ گھر کے منتظم کو پہنچاتے رہیں۔ لہٰذا تمام والدین کے اخراجات قانونی طور پر محدود کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ للی پٹ کے باشندے سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کیا نا منصفی ہوگی کہ لوگ اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لئے بچے تو پیدا کر دیں مگر ان کی پرورش کا بوجھ عوام پر ڈال دیں۔ رہے عالی نسب لوگ، تو ہر اپنے ہر بچے کے لئے حسب حیثیت ایک مناسب رقم بطور ضمانت جمع کرا دیتے ہیں۔ ان جمع شدہ رقوم کا نہایت اچھا انتظام رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بالکل صحیح انصاف برتا جاتا ہے۔

کسان اور مزدور اپنے بچوں کو اپنے گھروں پر رکھتے ہیں کیونکہ ان کا کام صرف زمین کو جوتنا اور بونا ہے، اس لئے ان کی تعلیم عوام کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ان میں جو بڈھے اور بیمار ہوتے ہیں انھیں ہسپتالوں سے امداد ملتی ہے۔ کیونکہ بھیک منگنا ایک ایسا پیشہ ہے جسے اس مملکت میں کوئی نہیں جانتا۔

یہاں شاید پڑھنے والوں کو خیال آئے گا اور یہ جاننے کا اشتیاق ہوگا کہ میرے گھریلو حالات کیا تھے، اور میں نے جو اس ملک میں نو مہینے اور تیرہ دن قیام کیا تو میرا طرزِ زندگی کیا تھا؛ میرا دماغ چونکہ مشینوں کی طرف راغب ہے اور کچھ ضرورت کا بھی اقتضا تھا، اس لئے میں نے اپنے لئے ایک میز اور کرسی شاہی باغ کے بڑے بڑے درختوں سے خاصی آرام دہ بنائی تھی۔ میرے لئے قمیص اور میرے بستر اور میز کے لئے ادونچہ اور میز پوش بنانے کے لئے دو سو درزنیں لگائی گئیں۔ کپڑا مضبوط اور موٹے سے موٹا مہیا کیا گیا، لیکن اسے بھی تہ در تہ رکھ کر جوڑنا پڑا کیونکہ موٹے سے موٹا کپڑا بھی ململ سے باریک تھا۔ ان کا سوتی کپڑا عموماً تین انچ عرض کا ہوتا ہے اور تھان تین فٹ کا۔ میں زمین پر لیٹ گیا تو درزنوں نے میرا ناپ لیا۔ ایک میری گردن پر کھڑی ہو گئی اور دوسری میری ٹانگ کے بیچ میں۔ دونوں نے ایک مضبوط ڈوری سرے سے پکڑ کر تان لی اور تیسری درزن نے ایک انچ لمبے رول سے ڈوری کی لمبان ناپنی شروع کر دی۔ اس کے بعد انھوں نے میرے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کو ناپا، بس اور کچھ نہیں۔ کیونکہ ایک حساب کے قاعدے سے کہ انگوٹھے کے دو پھیر برابر ہوتے ہیں۔ کلائی کے ایک پھیر کے

دربار میں گشت کرتی رہی کہ بیگم ایک دفعہ چھپ کر میرے گھر بھی آئی ہے۔ میں نہایت سنجیدگی سے اعلان کرتا ہوں کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ جس کی اس سے زیادہ کوئی بنیاد نہیں کہ معزز بیگم مجھ سے معصومانہ بے باک اور دوستی سے پیش آتی تھیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ وہ اکثر میرے گھر آتی تھیں مگر کھلے بندوں، چھپ چھپا کر نہیں۔ اور ہمیشہ ان کے ساتھ دو تین اور خواتین ہوتی تھیں، ان میں عموماً ان کی بہن اور کم عمر بیٹی شامل ہوتی تھی اور کوئی مخصوص وقت یا طریقہ اور بھی کئی درباری خواتین کا تھا۔ اس پر بھی میں اپنے ملازموں سے گواہی دلوا سکتا ہوں کہ کسی وقت بھی کوئی ایسی سواری انھوں نے میرے دروازے پر آتے نہیں دیکھی جسے پہلے انھوں نے معلوم نہ کر لیا ہو؛ ایسے موقعوں پر جب کوئی ملازم مجھے کسی کی آمد کی اطلاع دیتا تو میرا یہ دستور تھا کہ فوراً دروازے پر جاتا اور آداب بجا لانے کے بعد گاڑی اور دونوں گھوڑوں کو نہایت احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا (کیونکہ اگرچہ گھوڑے ہوتے تو گھڑ سوار کوچوان ان میں سے چار کھول لیتا) اور انھیں میز پر رکھ دیتا جس کے کنارے پر میں نے ایک کھسکنے والا کٹہرا پانچ انچ اونچا لگا دیا تھا تاکہ کوئی سانحہ نہ ہونے پائے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں میری میز پر چار چار گاڑیاں اور گھوڑے جمع ہو جاتے اور خوب دل لگی رہتی۔ میں اپنی کرسی میں جھک کر اپنا چہرہ ان کی طرف بڑھا دیتا۔ جب میں ایک ٹولی سے باتیں کرنے لگتا تو کوچوان باقی گاڑیوں کو میز پر آہستگی سے چلاتے رہتے۔ میں نے اکثر دوپہریں ان سے باتیں کر کے بڑی خوش دلی سے گزاری ہیں لیکن میں داروغۂ خزانہ کو جھٹلاتا ہوں اور اس کے کوئندوں (میں ان کے نام بتاتا ہوں، وہ اپنی سی کر لیں) کلسٹرل اور ڈرنلو کو بھی۔ وہ ثابت کریں کہ کبھی بھی کوئی شخص بھیس بدل کر میرے پاس آیا، سوائے ناظم رلڈریسال کے جسے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، بادشاہ سلامت نے بحکم خاص بھیجا تھا۔ میری بات چھوڑیئے۔ اگر اس سے ایک معزز خاتون کی عزت خطرے میں نہ پڑتی تو میں اس بات کو اتنا طول نہ دیتا۔ حالانکہ مجھے بھی اس وقت ایک ناردا کی ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ مرتبہ داروغۂ خزانہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک گلم گلم ہے۔ یہ خطاب ایک درجہ نیچا ہے جیسا کہ انگلستان میں مارکوئس ڈیوک سے ایک درجہ نیچا ہوتا ہے۔ یہ البتہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملازمت کے لحاظ سے وہ مجھ سے اونچا تھا۔ ان اطلاعات نے، جن کا مجھے ایک ناقابلِ بیان اتفاق سے بعد میں علم ہوا، داروغۂ خزانہ فلم ناپ کو اتنا ورغلایا کہ بیوی کی طرف سے اس کا منہ عرصے تک چڑھا رہا، اور میری طرف سے اور بھی زیادہ، کیونکہ بعد میں جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ اس کی بیوی نے اُسے دھوکہ نہیں دیا تو اس نے اپنی بیوی سے دل صاف کر لیا، لیکن میں اس کی نظروں سے گر گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ شہنشاہ بھی میری طرف سے بدظن ہوتا جا رہا ہے کیونکہ داروغہ اس کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا اور شہنشاہ کو چلاتا رہتا تھا۔

(فرانسیسی)

کینڈائڈ

مصنف :- والٹیر

مترجمہ :- شاہد احمد دہلوی

کینڈائڈ کے دل کی گہرائیوں میں کیونی گوندی سے شادی رچانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی۔ لیکن نواب نے
انتہائی گستاخی کا جو مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر اس نے فیصلہ کر لیا کہ شادی کر ہی لے، اور کیونی گوندی نے اتنے خلوص سے اس پر
زور دیا تھا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس نے پینگلوس، مارٹن، اور معتمد کاکیمبو سے مشورہ کیا۔ پینگلوس نے اعلیٰ درجے کی
یادداشت مرتب کی جس میں اس نے ثابت کیا کہ نواب کو اپنی بہن پر کوئی حق حاصل نہیں تھا، اور حکومت کے تمام قوانین کے
مطابق وہ چاہے تو کینڈائڈ سے الٹے ہاتھ سے شادی کر لے۔ مارٹن کہتا تھا کہ نواب کو سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ کاکیمبو
کی رائے یہ تھی کہ سب سے اچھا یہ ہے کہ اسے لی ونٹ کپتان کے پاس واپس بھیج دیا جائے اور اسے کشتی کھینے والے غلاموں
میں شامل کر دیا جائے۔ یہ مشورہ ٹھیک سمجھا گیا۔ بڑھیا نے اسے منظور کر لیا، اور اس کا کوئی ذکر اس کی بہن سے نہیں کیا گیا۔ تھوڑی
سی دولت حاصل کرنے کے لئے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا، اور یوں ایک جرمن نواب کے غرور کو نیچا دکھانے کی مسرت
انھیں حاصل ہوئی۔

یہ تصور کرنا بالکل فطری امر ہے کہ اتنی ساری مصیبتیں جھیلنے کے بعد جب کینڈائڈ کی شادی اپنی محبوبہ سے ہو گئی، فلسفی
پینگلوس، فلسفی مارٹن، شائستہ مزاج کاکیمبو، اور بڑھیا کے ساتھ اس کا رہنا سہنا تھا، اور خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ
قدیم انکاز کے ملک سے اتنے سارے ہیرے لے آیا تھا، تو دنیا بھر میں اس سے اچھی زندگی اور کوئی شخص بسر نہیں کر رہا
ہوگا۔ مگر اسے یہودیوں نے ایسا دھوکہ دیا تھا کہ سوائے ایک چھوٹے سے کھلیان کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ تھا۔ اس
اس کی بیوی دن بہ دن زیادہ بدشکل ہو کر چڑچڑی اور بار خاطر ہوتی جا رہی تھی۔ بڑھیا بہت کمزور اور کیونی گوندی سے بھی زیادہ بدمزاج
ہو گئی تھی۔ کاکیمبو جو باغبانی کرتا قسطنطنیہ جا کر باغ کے پھل بیچا کرتا۔ محنت کرتے کرتے نڈھال ہو گیا اور قسمت کو کوسنے لگا تھا
پینگلوس اس غم میں گھلا جا رہا تھا کہ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں سر دانش گاہ کیوں نہ چمکا۔ رہا مارٹن، سو اُسے یقین تھا کہ سارے
جہان میں یکساں خرابی پھیلی ہوئی ہے، اس لئے وہ صبر سے ساری باتیں گوارہ کئے جاتا تھا۔ کینڈائڈ، مارٹن، پینگلوس کبھی
کبھی مابعدالطبیعات اور اخلاقیات پر بحث مباحثہ کرتے۔ اپنے کھلیان گھر کی کھڑکیوں میں سے آفندیوں، پاشاؤں اور
قاضیوں سے بھری کشتیاں گزرتے دیکھتے، جنھیں جلاوطن کر کے لمنوس، متی لین، اور ارض روم بھیجا جاتا۔ وہ دیکھتے کہ دوسرے

قاضی، دوسرے پاشا، ان جلاوطن کئے جانے والوں کی آسامیوں پر آجاتے، صرف اس لئے کہ جب ان کی باری آئے تو انھیں بھی جلاوطن کر دیا جائے۔ وہ لوگوں کے کٹے ہوئے سر دیکھتے جو باب عالی میں پیش کئے جانے کے لئے نفاست سے جڑے جاتے۔ اس نوع کے مناظر ان کے مباحثوں میں اضافہ کرتے۔ اور جب وہ مباحثہ نہ کرنے ہوتے تو ان کی بے شغلی اس قدر عذاب جان ہوتی کہ بڑھیا ان سے اکثر کہہ بیٹھتی "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ان میں سب سے برا کیا ہے: حبشی سمندری ڈاکوؤں سے سو بار زنا بالجبر کرانا، بلغاریوں کی قطاروں میں سے کوڑے کھاتے ہوئے بھاگنا، کوڑے کھا کر پھانسی پانا، اپنے بدن کے پرزے اڑوانا، غلاموں کے ساتھ کشتیوں میں جوتا جانا، مختصر یہ کہ جو جو عذاب ہم نے جھیلے ہیں وہ یا یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا؟" کینڈائڈ کہتا "یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔"

بحث مباحثہ میں نئے نئے تصورات کی راہیں کھل گئیں، اور آخر میں مارٹن نے نتیجہ نکالا کہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ یا تو اضطراب کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا پھرے یا نفرت کی غنودگی میں ڈوبا رہے۔ کینڈائڈ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اور بیچ بیچ میں پڑ گیا۔ پینگلوس نے اقرار کیا کہ "میں تو ہمیشہ شدید تکلیفوں ہی میں مبتلا رہا" لیکن ایک بار یہ طے کر لینے کے بعد سارے کام حیرت انگیز طور پر ٹھیک چلتے رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے مفروضہ پہ قائم رہا، اگرچہ یہ مفروضہ اس کے حقیقی احساسات کے قطعی خلاف تھا۔

ان کے پڑوس میں ایک بہت مشہور درویش رہتا تھا جو ترکی میں سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب اس سے دریافت کرنے گئے۔ پینگلوس کو نمائندہ چنا گیا، اور اس نے درویش سے کہا "آقا، ہم یہ خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں انسان جیسا عجیب و غریب حیوان کیوں پیدا کیا گیا تھا؟"

درویش نے کہا "تمھیں اس سے کیا؟ یہ معلوم کرنا کیا تمہارا کام ہے؟" کینڈائڈ نے کہا "لیکن میرے محترم باپ دنیا میں بے انتہا بدی ہے۔" درویش بولا "یہ کس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیکی ہے یا بدی؟ جب اعلیٰ حضرت ایک جہاز مصر روانہ فرماتے ہیں تو کیا انھیں اس کی پریشانی ہوتی ہے کہ جہاز میں جو چوہیاں ہیں وہ آرام سے ہیں یا نہیں؟" پینگلوس نے پوچھا "اچھا تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ انسان کیا کرے؟" درویش نے کہا "اپنی زبان کو لگام دو۔" پینگلوس بولا "میں نے اپنے آپ سے اس مسرت کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ آپ سے علت و معلول، اچھی سے اچھی دنیا، بدی کے آغاز، روح کی کیفیت، پہلے سے قائم شدہ ہم آہنگی ——" یہ باتیں سن کر درویش نے دروازہ بند کر دیا اور یہ کھڑے منہ دیکھتے رہ گئے۔

اس گفت و شنید کے دوران خبر آئی کہ دو وزیروں اور ایک مفتی کا گلا گھونٹ دیا گیا، ان کے بہت سے دوستوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اس آفت کا شور کئی گھنٹے بجتا رہا۔ پینگلوس، کینڈائڈ اور مارٹن جب اپنے کھلیان کی طرف واپس چلے تو راستہ میں انھوں نے ایک اچھی صورت شکل کے بڑے میاں کو اپنے دروازے میں سنتروں کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے ہوا کھاتے دیکھا۔ پینگلوس، جسے اتنی ہی کرید رہتی تھی جتنی فلسفہ کو، ان بڑے میاں سے اس مفتی کا نام پوچھنے لگا جس کا ابھی گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ بھلے آدمی نے کہا "مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر میں مجھے ایک بھی مفتی یا ایک بھی وزیر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ جو کہانی سنا رہے ہیں میں نے کبھی نہیں سنی، اور سمجھتا ہوں کہ عام طور سے جو لوگ

ریاست کے معاملات میں سرگرداں رہتے ہیں۔ بعض اوقات بڑی عبرت ناک موت سے ہم کنار ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس کے سزاوار نہیں تھے۔ لیکن میں اپنے سر کو یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں دیتا کہ قسطنطنیہ میں کیا ہو رہا ہے۔ میں جو پھل اپنے ہاتھوں سے اس باغ میں کاشت کرتا ہوں انھیں وہاں بھیجنے پر قناعت کرتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر اس نے اجنبیوں کو اپنے گھر میں لاکر گھر والوں سے متعارف کرایا۔ اس کی دو بیٹیوں اور دو بیٹوں نے کئی قسم کے شربتوں سے ان کی تواضع کی جو انھوں نے خود بنائے تھے۔ ان کے علاوہ انھیں مربّے کھلائے، ترنج، سنگترے، لیموں، کیلے اور پستے کھلائے اور موچا کی کافی پلائی جس میں بٹیویا اور انگلستان کی بڑی کافی کی آمیزش نہیں تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس اچھے مسلمان کی دونوں بیٹیوں نے کینڈائڈ، پینگلوس اور مارٹن کی ڈاڑھیوں میں عطر لگایا۔

کینڈائڈ نے ترک سے کہا "آپ کی ضرور بہت بڑی اور زرخیز املاک ہوگی"۔ ترک نے کہا "میرے پاس صرف بیس ایکڑ زمین ہے۔ اس میں مَیں اور میرے بچے کاشت کرتے ہیں۔ محنت ہمیں تین سب سے بڑی خرابیوں سے بچائے رکھتی ہے: بے لطفی، بدی، احتیاج"۔

جب کینڈائڈ اپنے کھلیان کو واپس چلا تو اس نے ترک کی گفتگو پر غور کیا۔ پینگلوس اور مارٹن سے بولا "اس اچھے بوڑھے آدمی کی حالت اُن چھ بادشاہوں پر فوقیت رکھتی ہے جن کے ساتھ کھانے کی عزت ہمیں حاصل ہوئی ہے"۔ پینگلوس نے کہا "فلسفیوں کی رائے میں بادشاہت کی شان و شوکت بڑی پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ مختصراً کہتا ہوں موابیوں کے بادشاہ ایگلون کو ایہود نے قتل کیا۔ ابسلوم کو سر کے بالوں سے لٹکایا گیا اور تین تیر اسکے جسم میں سے پار کیے گئے۔ جیروبوام کے بیٹے بادشاہ ناداب کو باشا نے مار ڈالا۔ بادشاہ ایلہ کو زمری نے، احازیہ کو جیہو نے، عتالیا کو جیہوئیدع نے جیکونیاس اور زیدکیاس، شاہان جواشم قید و بند میں ڈالے گئے۔ کروسس، استیاگیز، دارا، سائراکیوز کے ڈائیونی سیئس، فائرس، پرسیوس، ہنی بال، جغرطہ، اریوستوس، سیزر، پامپی، نیرو، اوتھو، وتیلیوس، دومی شیئن، رچرڈ دوم، ایڈورڈ دوم، ہنری ششم، رچرڈ سوم، میری اسٹوارٹ، انگلستان کا چارلس اوّل، فرانس کے تینوں ہنریوں، اور شہنشاہ ہنری چہارم، ان سب کا جو انجام ہوا تم جانتے ہی ہو۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو ـــــ" "ہاں میں جانتا ہوں" کینڈائڈ نے بات کاٹ کر کہا "کہ ہمیں اپنے باغ کی دیکھ بھال کرنی چاہیے"۔ پینگلوس بولا "تم ٹھیک کہتے ہو، کیونکہ جب انسان کو جب باغ عدن میں رکھا گیا تھا تو اس لئے رکھا گیا تھا کہ باغ کی کاشت کرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اسلئے پیدا نہیں کئے گئے کہ بے کار رہیں"۔ مارٹن نے کہا "بحث مباحثہ کئے بغیر ہمیں کام کرنا چاہیے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا"۔

اس چھوٹے سے معاشرہ کے تمام افراد اس مستحسن ارادے پر اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کاربند ہوگئے۔ ان کے مختصر سے قطعۂ اراضی میں بہت سی فصل ہوئی۔ کیونی گونڈی بڑی گھریلو عورت تھی، لیکن وہ نہایت عمدہ کھانے پکانے لگی۔ پے کیوئیٹا نے سوزن کاری شروع کر دی، اور بڑھیا نے کپڑے لتّے کی نگرانی اپنے ذمّے لے لی۔ اس گروہ میں اب کوئی بیکار نہیں تھا، جروف فلی بھی نہیں، وہ بڑا اچھا بڑھئی بن گیا اور نہایت دیانتدار انسان بھی۔

مہا پینگلوس، اسے بظاہر اس کا پوشیدہ احساس تھا کہ اپنے نظریہ کی تکمیل کے لئے اسے مسلسل محنت کرنی چاہئے اور اس کی ساری خوش تدبیری اسی میں صرف ہونی چاہئے۔ وہ اپنی دھن میں لگا رہا، اس کی فکری اور تکلمی صلاحیتیں پاس انہماک سے ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدہ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ جب بھی موقع ملتا وہ کینڈائڈ سے کہتا "اس احسن ترین دنیا میں تمام واقعات بطریق احسن مربوط ہیں۔ اگر سلسلۂ عظیم کی ایک کڑی بھی چھوٹ جائے تو کل کائنات کی ہم آہنگی برباد ہو جائے گی۔ اگر تم اُس حسین محل سے مس کیونی گونڈی کی محبت میں بے رحم لاتیں کھا کر نہ نکلتے، اگر عدالتی تحقیقات میں تمہیں سزائے قید نہ ہوتی، اگر تم امریکہ کا بڑا حصہ پیدل طے نہ کرتے، اگر تم نواب کو اپنی تلوار بھونک کر نہ مار دیتے، اگر تمہاری تمام بھیڑیں جو تم اس عمدہ ملک ایلڈوریڈو سے لائے تھے گم نہ ہو جاتیں، اور وہ کل دولت جو ان پر لدی تھی ضائع نہ ہو جاتی، تو آج تم یہاں بیٹھے ترنج کا مربہ اور پستے نہ کھاتے ہوتے۔"

کینڈائڈ نے کہا "خوب بات کہی تم نے اور ہو سکتا ہے کہ سچی بھی ہو، مگر ہمیں اپنے باغ کی سیوا کرنی چاہئے۔"

فرانسیسی:

لغاتِ فلسفہ

مصنفہ :- والٹیئر

مترجمہ :- شاہد احمد دہلوی

مساوات

ایک کتے کا دوسرے کتے پر کیا واجب ہے اور ایک گھوڑے کو دوسرے گھوڑے کا کیا دینا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ کوئی جانور اپنے جیسے جانور کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن انسان جس نے خدا سے وہ شے پائی ہے جسے شعور کہتے ہیں۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کرۂ دنیا میں ہر جگہ غلام ہے۔

اگر دنیا درحقیقت ویسی ہی ہوتی جیسی کہ فرض کیا جاتا ہے، ہونی چاہئے ــــ اگر انسانوں کو اس میں ہر جگہ آسانی اور یقین کے ساتھ روزی مل جایا کرتی، اور مزاج کے موافق موسم میسر آجاتا تو ظاہر ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو محکوم بنانا ناممکن ہوتا۔ اگر دنیا خوش ذائقہ پھلوں سے لد جائے، اگر وہ ہوا جس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے ہم تک امراض اور قبل از وقت موت نہ پہنچائے، اگر انسان کو ہرنی اور ہرن کی طرح کی مسکن کی ضرورت نہ ہو، تو اس صورت میں چنگیز خانوں اور تیمور لنگوں کے پاس سوائے ان کے اپنے بچوں کے اور کوئی خدام نہ ہوں گے، اور یہ بچے بڑے سعادتمند ہوں گے اور بڑھاپے میں بڑی محبت سے ان کی خدمت کریں گے۔

قدرت کی اس کیفیت میں جس سے بے خانماں چوپائے، پرندے، اور حشرات الارض لطف اندوز ہوتے ہیں، انسان بھی اسی قدر خوش و خرم رہتے جتنے کہ یہ جانور۔ ایک کا دوسرے پر غلبہ محض ایک خیالی خوف ہوتا ــــ ایک ایسی مہمل بات جس کا کسی کو خیال بھی نہ آتا، کیونکہ جب خدمت ہی درکار نہ ہو تو خدمتگاروں کی تلاش کیوں ہو؟

اگر کسی اعصابی بازو اور جابر مزاج فرد کے دل میں سما جائے کہ اپنے کم طاقت پڑوسی کو زیر کرلے تو اس کی کامیابی ناممکن ہوگی۔ اس سے پہلے کہ والکا پر ظالم اپنی تیاری مکمل کرے مظلوم ڈینیوب پر جا پہنچے گا۔

اگر احتیاجیں ساتھ نہ لگی ہوتیں تو کل انسان ضرور برابر ہوتے۔ یہ فلاکت ہی ہے جو نوعِ انسانی سے وابستہ ہے جو ایک انسان کی محکومی میں دے دیتی ہے۔ اصل شکایت عدم مساوات کی نہیں بلکہ محتاجی کی ہے۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ حضرت کہلاتا ہے تو کیا؟ اور اگر کوئی اور تقدس مآب کہلاتا ہے تو کیا؟ مگر میرے لئے یہ ناگوار ہے کہ میں کسی کا ملازم ہوں۔

ایک بڑے خاندان نے اچھی زمین کاشت کی ہے، پڑوس میں رہنے والے دو چھوٹے خاندان بنجر زمینوں پر گزر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان دو غریب خاندانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ امیر خاندان کی ملازمت کریں، یا اُسے تباہ کر دیں۔ یہ کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ مفلس خاندانوں میں سے ایک خاندان امیر خاندان کے پاس جاتا ہے اور روٹی کے عوض اپنی خدمات پیش کرتا ہے، دوسرا خاندان جا کر اس پر حملہ کر دیتا ہے اور مغلوب ہو جاتا ہے۔ خدمت گزار خاندان آغاز ہے خدمتگاروں اور مزدوروں کا، جو مغلوب ہو گیا آغاز ہے غلاموں کا۔

ہماری غمناک دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم ہونے سے روکا جائے۔ ایک امیر جو حکم دے اور دوسرا غریب جو حکم مانے۔ اور یہ دونوں اور کئی طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اپنے فرق کے درجے ہوتے ہیں۔

کل غریب ناخوش نہیں ہوتے۔ بیشتر تعداد اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے اور مسلسل محنت انھیں اپنی کیفیت پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتی۔ اور جب وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں تو لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، جیسے روم میں عوامی پارٹی اور مجلس عمائدین، اور جرمنی، انگلستان اور فرانس کے دیہاتیوں میں۔ یہ ساری لڑائیاں دیر سویر ختم ہو گئیں اور انجامِ کار عوام غلامی میں پڑ گئے، کیونکہ بڑوں کے پاس دولت ہے، اور دولت کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے۔ یہ کیفیت میں نے ریاست کی بیان کی ہے، کیونکہ قوموں قوموں کے درمیان صورتِ حال دوسری ہوتی ہے۔ وہ قوم جو لوہے کا سب سے صحیح استعمال کرتی ہے اُس قوم کو ہمیشہ دبا لے گی جس کے پاس سونا زیادہ اور ہمت کم ہو۔

ہر شخص قوت، دولت، اور عیش کا رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے، اور آرام طلبی کی زبردست خواہش بھی۔ نتیجتاً ہر شخص آرزومند ہوتا ہے کہ دوسروں کی دولت اور بیویوں اور بیٹیوں پر قابض ہو جائے، ان کا آقا بن جائے تاکہ انھیں جس طرح بھی چاہے اپنا غلام بنائے رکھے، اور کوئی کام نہ کرے، یا کم از کم کوئی ایسا کام نہ کرے جو ہر لحاظ سے دل آویز نہ ہو۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایسی لطیف طبیعتیں ہوں وہاں یہ ناممکن ہے کہ انسانوں میں مساوات ہو، بالکل اسی طرح جیسے دو واعظ یا مذہب کے استاد کر رقابت سے باز رہ ہی نہیں سکتے۔

نسلِ انسانی، جیسی کچھ بھی ہو اس کی تشکیل ہوئی ہے، قائم نہیں رہ سکتی جب تک اس میں بے شمار افراد ایسے نہ ہوں جن کے پاس کوئی ملکیت نہ ہو، کیونکہ جو شخص آرام کی زندگی گزار رہا ہو اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی زمین چھوڑ کر آپ کی زمین کاشت کرنے آ جائے؟ اور اگر آپ کو جوتی چاہیئے تو کوئی وکیل تھوڑی آپ کو بنا کر دے گا۔ لہٰذا مساوات ایک ہی وقت میں سب سے فطری چیز بھی ہے اور سب سے موہوم بھی۔

اگر اختیار میں ہو تو لوگ ہر چیز کو اس کی انتہا کو پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح مساوات کو بھی حد کو پہنچا دیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ کسی باشندے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ اپنے جنم بھوم کو ترک کر دے۔ ایسے دستور کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ "یہ ملک اس درجہ تباہ حال ہے، اور یہاں کی حکومت اس قدر ناکارہ ہے کہ اسے ترک کرنے کا ہم ہر شخص کو ممانعت کرتے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں سبھی اسے چھوڑ کر نہ نکل جائیں۔" بہتر صورتِ حال پیدا کرو۔ اپنی رعایا میں

خواہش پیدا کرو کہ تمہارے ساتھ رہے، اور غیر ملکیوں میں شوق پیدا ہو کہ آئیں اور تمہارے ملک میں بس جائیں۔

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ دوسروں سے اپنی برابری کے متعلق ذاتی رائے رکھے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ لاٹ پادری کا باورچی یہ طے کرے کہ اپنے آقا کو کھانا پکانے کا حکم دے۔ باورچی یہ البتہ کہہ سکتا ہے کہ "میں ایک انسان ہوں، اپنے آقا کی طرح۔ میں بھی اسی کی طرح روتا ہوا پیدا ہوا تھا، اور اسی کی طرح کرب میں مروں گا، اور میرے مرنے کی رسوم بھی اسی جیسی ہوں گی۔ ہم دونوں ایک ہی طرح کے حیوانی فرائض ادا کرتے ہیں۔ اگر ترک رُوم پر قابض ہو جائیں اور اس وقت میں لاٹ پادری [illegible] اور لاٹ پادری باورچی بن جائے تو میں اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لوں گا۔" یہ بات بڑی معقول اور صحیح ہے، لیکن جب تک ترکِ اعظم روم پر قبضہ پائے اس وقت تک تو باورچی کو اپنا فرض ادا کرنا پڑے گا، ورنہ پورا انسانی معاشرہ الٹ جائے گا۔

رہا وہ شخص جو نہ تو لاٹ پادری کا باورچی ہے اور نہ ریاست میں اُسے کوئی عہدہ ہی حاصل ہے ——— وہ شخص جس کے کوئی تعلقات نہیں ہیں اور جو اس بات سے متنفر رہتا ہے کہ سب اس سے سرپرستانہ یا حقارت سے ملتے ہیں جسے صاف دکھائی دیتا ہے کہ بہت سے اونچے درجے کے اور خطاب یافتہ لوگ علم، ذہانت، یا خوبی میں مجھ پر فوقیت نہیں رکھتے، اور جو بار باران کی ڈیوڑھیوں پر حاضری دینے سے اکتا چکا ہے ——— ایسے آدمی کو کیا کرنا چاہیئے؟ اسے دور رہنا چاہیئے۔

آزادی

ا: توپوں کی ایک باڑ ہمارے کانوں پر چھوڑی جاتی ہے، کیا آپ کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ جی چاہے تو اسے سنیں اور جی نہ چاہے تو نہ سُنیں؟

ب: یقیناً میں اپنے آپ کو اس کے سننے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

ا: کیا آپ اس پر رضامند ہیں کہ یہ توپیں آپ کا سر اڑا دیں، اور آپ کی بیوی اور بیٹی کے بھی، جو آپ کے ساتھ چہل قدمی کر رہی ہوں؟

ب: کیا خوب سوال ہے؟ جی نہیں، کم از کم جب تک میں اپنے صحیح ہوش و حواس میں ہوں۔ ایسی کوئی بات پسند نہیں کروں گا۔ یہ ناممکن ہے۔

ا: بہت خوب! آپ ان توپوں کی آواز ضرور سنیں گے، اور آپ یہ خواہش بھی ضرور نہیں کرتے کہ توپوں کے چھوٹنے سے آپ مر جائیں اور آپ کی بیوی اور بچی بھی مر جائے۔ آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ ان کی آواز نہ سنیں، اور نہ یہ اختیار ہے کہ بہیں رہیں۔

ب: ظاہر ہے۔

ا: میں فرض کرتا ہوں کہ توپوں کی زد سے آپ تیس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کو یہ چند قدم میرے ساتھ چلنے

کا اختیار حاصل تھا۔

ب: یہ بھی بالکل ظاہر ہے۔

و: اور اگر آپ مفلوج ہوتے تو توپوں کی زد سے آپ نہیں بچ سکتے تھے۔ آپ کو ان کا شور ضرور سننا پڑتا، توپ کا گولہ آپ کو زخمی بھی کر دیتا، اور آپ مر بھی ضرور جاتے۔

ب: اس سے زیادہ اور کیا سچ ہو سکتا ہے۔

و: اچھا تو آپ کی آزادی پھر کس چیز سے عبارت ہے، اگر اس قوت سے نہیں جو آپ کے جسم نے حاصل کی ہے اس کام کے کرنے کی جسے قطعی ضرورت کے تحت آپ کے ارادہ نے چاہا؟

ب: آپ مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں۔ تو آزادی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میں چاہوں اسے کرنے کی قوت کا نام ہے؟

و: سوچیے۔ اور دیکھئے کہ کیا آزادی کو کسی اور طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے؟

ب: اس لحاظ سے میرا شکاری کتا بھی اتنا ہی آزاد ہے جتنا میں۔ جب وہ خرگوش کو دیکھتا ہے تو ضرور اس کے پیچھے دوڑنے کا ارادہ کرتا ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی ٹانگوں میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ لہٰذا کتے پر مجھے کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ آپ نے مجھے گھٹا کر جانوروں کی سطح پر پہنچا دیا۔

و: یہ گھٹیا باطل دلیلیں ہیں، اور وہ گھٹیا سوفسطائی تھے جنھوں نے آپ کو پڑھایا۔ آپ اپنے کتے کی طرح آزاد ہونے پر رضامند نہیں ہیں۔ کیا آپ تقریباً اسی جیسے رجحانات کے ساتھ کھاتے، سوتے، اور پیدا نہیں کرتے؟ کیا آپ ناک کے علاوہ کسی اور طرح بھی سونگھ سکتے ہیں؟ اپنے کتے سے مختلف آزادی کے مالک آپ کیوں بننا چاہتے ہیں؟

ب: مگر مجھ میں ایک روح ہے جو عقل آرائی کرتی ہے، اور میرا کتا بالکل حجت نہیں کرتا۔ اس کے دماغ میں سیدھے سادے خیالات آتے ہیں، اور میرے ذہن میں ہزاروں مابعد الطبیعاتی تصورات بھرے رہتے ہیں۔

و: ہاں، تو آپ اس سے ہزار گنا آزاد ہیں، آپ میں اس سے ہزار گنی فکر کی قوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کسی اور لحاظ سے اپنے کتے سے زیادہ آزاد نہیں ہیں۔

ب: کیا! میں کیا اپنے ارادے میں آزاد ہوں؟

و: اس کا آپ کیا مطلب سمجھ رہے ہیں؟

ب: وہی سمجھ رہا ہوں جو ساری دنیا سمجھتی ہے۔ کیا یہ روزانہ نہیں کہا جا رہا کہ ارادہ آزاد ہوتا ہے؟

و: کہاوت تو دلیل نہیں ہوتی۔ آپ کھل کر بیان کیجیے۔

ب: میں سمجھتا ہوں کہ میں جیسا ہوں ارادہ کرنے میں آزاد ہوں۔

و: اجازت ہو تو عرض کروں کہ یہ مہمل بات ہے۔ آپ نہیں دیکھتے یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ میں ارادہ کروں گا

۹: ۔ سب مہمل ہیں۔ بے اعتنائی کی آزادی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک لفظ بے معنی ہے، جسے کسی ایسے ہی مہمل انسان نے تراشا ہے۔

محبت

یہ فطرت کی بساط پر تصوری گل کاری ہے۔ اگر آپ محبت کا کوئی تصور قائم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پائیں باغ میں چڑیوں کو دیکھئے، اپنی قمریوں کو دیکھئے، اس سانڈ کو دیکھئے جو بچھیا پر چھوڑا جاتا ہے، اس قوی اور پرجوش گھوڑے کو دیکھئے جسے آپ کے دو سائیس گھوڑی کی جانب لئے جا رہے ہیں، جو خاموشی سے اس کی منتظر ہے اور اس کے قریب آنے سے خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ گھوڑے کی آنکھوں کی چمک دیکھئے، اس کے ہنہنانے کی توانائی اور بلندی دیکھئے، اس کی جست و خیز دیکھئے، کنوتیاں کھڑی ہوئیں، تشنج آمیز سانسوں سے منہ کھلا ہوا، پھیلے ہوئے نتھنے، سانسوں میں آگ کی لپٹ، ہوا میں اڑتے ہوئے ایال کے بال، اور وہ تندی و تیزی جس سے وہ اس شے کی طرف جھپٹتا ہے جسے قدرت نے اس کے لئے نذر کیا ہے۔ مگر اس کی سرخوشی پر آپ حسد نہ فرمائیے، بلکہ نوعِ انسانی کی برتری پر غور کریں۔ حیوانِ محض پر جو نوازشیں قدرت نے فرمائی ہیں —— قوت، حسن، سبک پن اور سرعت، ان سب کی کافی تلافی محبت میں کر دی گئی ہے۔

لیکن اس درجے کے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو جنسی تعلقات سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ مچھلیاں اس لذت سے محروم ہیں۔ پانی کی کیچڑ میں مادہ اپنے لاکھوں انڈے چھوڑ جاتی ہے اور جو نر ان پر سے گزرتا ہے جان بخش اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ انڈے دینے والی مادہ سے کبھی نہیں ملتا بلکہ شاید اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔

جفتی کرنے والے جانوروں میں بڑی تعداد ان کی ہے جو صرف ایک حس کی لذت کا ادراک کرتے ہیں، اور جب بھوک مٹ جاتی ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جانور بغل گیر ہونا نہیں جانتا۔ اس کا سارا جسم حساس ہوتا ہے۔ اس کے لب بالخصوص ایک ایسی لذت محسوس کرتے ہیں جو کبھی کم نہیں ہوتی، اور یہ صرف اس کی نوع کا حصہ ہے۔ پھر یہ کہ ہر موسم میں اپنے آپ کو محبت کے افعال کے حوالے کر سکتا ہے۔ حیوانِ محض کے لئے صرف ایک محدود زمانہ ہوتا ہے۔ اگر ان اعلیٰ درجے کی فوقیتوں پر غور کریں تو آپ روچیسٹر کے رئیس کا یہ قول مان لیں گے کہ محبت دہریوں کی قوم کو خدا کی عبادت کرنے پر دھکیل سکتی ہے۔

انسانوں کو چونکہ یہ حکم ودیعت کیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی قدرت نے انھیں بخشا ہے اس کی تکمیل کریں۔ اس لئے انھوں نے عطیۂ محبت کو بھی مکمل کر لیا۔ ستھراپن، جسم کی دیکھ بھال، اور صحت کا خیال رکھنے سے جسم زیادہ حساس ہو جاتا ہے، لہٰذا اس کی تسکین کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے خوش گوار اور بے بہا جذبات بعد میں محبت کے جذبے میں داخل ہوتے ہیں، ان دھاتوں کی طرح جو سونے میں مل جاتی ہیں۔ دوستی اور تکریم اس کی امداد کو بڑھتی ہیں، جسم اور روح دونوں کے جوہر کھلتے ہیں اور نئے تقویت بخش رشتے قائم ہونے لگتے ہیں۔

ان سب پر مستزاد ذاتی محبت ان تمام بندھنوں کو کھینچ کر قریب تر کر دیتی ہے۔ مرد اپنے انتخاب پر ناز کرنے لگتے

ہیں، اور وہ بے شمار فریبِ نظر جو چاروں طرف سے امڈے چلے آتے ہیں۔ اُس تعمیر کے نقش و نگار بن جاتے ہیں جس کا سنگِ بنیاد قدرت نے اس قدر مضبوط رکھا تھا۔

یہ ہیں وہ فوقیتیں جو انسان کو جانوروں کے مختلف قبیلوں پر حاصل ہیں۔ لیکن اگر انسان ان لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جن سے حیوان ناآشنا ہوتے ہیں۔ تو اس کے برعکس وہ بے اندازہ الجھنیں اور نفرت انگیز باتیں ہیں جن کا شکار انسان ہوتا ہے۔ مگر حیوان ان سے آزاد رہتے ہیں۔ ان میں سب سے خوفناک وہ ہے جس سے فطرت نے محبت کی۔ لذتوں اور زندگی کے سرچشموں کو مسموم کر دیا۔ اور ایک بھیانک بیماری کی صورت میں تین چوتھائی دنیا پر مسلط کر دیا۔ اس بیماری کا شکار صرف انسان ہے۔ دوسری بیماریوں کی طرح یہ بیماری افراط کا نتیجہ نہیں ہے۔ عیاشی اسے دنیا میں لانے کا سبب نہیں ہے۔ قرینی اور لیسبی، فلورا اور میسالینا پر اس بیماری کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ یہ ان جزیروں سے اٹھی جہاں نوعِ انسانی معصومیت میں زندگی بسر کر رہی تھی اور پرانی دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اگر کوئی صورت ایسی ہو سکے جس کی رو سے قدرت پر خود اپنی تخلیق کو ذلیل کرنے، اپنے ہی منصوبے کو ناکام بنانے، اور اپنے ہی نظریوں کی مخالفت کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے تو ایسی نفرت انگیز عذاب کو پیش کیا جا سکتا ہے تو کیا پھر بھی اسی کو اچھی سے اچھی دنیا کہا جائے گا؟ کیا! اگر سیزر اور انطونی اور اکیتوی اس کو یہ بیماری کبھی نہیں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ فرانسس اوّل کو اس بیماری سے مرنے سے بچا لیا جاتا؟ کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہی مشیتِ ایزدی تھی اور خدا کے ہر کام میں بھلائی ہوتی ہے۔ میں اس پر یقین لانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ مشکل نظر آتا ہے۔

اِنسان

(کیا انسان بد پیدا ہوا ہے؟)

کیا یہ عملاً دیکھا نہیں گیا کہ انسان بدکیش پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ زائیدۂ ابلیس ہے۔ اگر اس کی فطرت بد ہوتی تو وہ چلنے کے قابل ہوتے ہی بڑے بڑے جرائم اور وحشیانہ مظالم کرنے لگتا۔ پہلی دفعہ چھری ہاتھ میں آتے ہی اپنے ناخوش کرنے والے کو زخمی کر دیتا۔ ضرور وہ ان بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بچوں سے مشابہ ہوتا جو جلد از جلد کاٹنے لگتے ہیں۔

اس کے برعکس دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک شیر خوارگی کے زمانے میں اس کی فطرت بھیڑ کے بچے جیسی ہوتی ہے۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ اکثر بھیڑیا اور لومڑی بن جاتا ہے؟ کیا حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان نیک یا بد تو پیدا نہیں ہوتا لیکن تعلیم، مثال، جو حکومت اس پر مسلط ہوتی ہے ——— مختصر یہ کہ ہر قسم کے مواقع ——— اسے نیک یا بد بنا دیتے ہیں؟

شاید انسانی فطرت کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان ہمیشہ جھوٹے خیالات میں نہیں پلتا، اور نہ سدا سچے میلانات اسے اپنا گہوارہ بنائے رہتے ہیں۔ نہ تو ہمیشہ خوش مزاج ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ بے رحم۔

اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی کی ترازو میں عورتوں کا پلڑا مردوں سے بھاری رہتا ہے۔ ہم سیکڑوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن پاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف ایک کلائی ٹمنسٹرا ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

ایسے پیشے ہیں جو روح کو مزید بے رحم بنا دیتے ہیں، مثلاً فوجی کا پیشہ، قصائی، منصف، اور داروغۂ محبس۔ اور وہ تمام

کا مرجع کی بنیاد دوسروں کو تکلیف پہنچانے پر ہوتی ہے۔

جس کسی نے بھی شراب خانہ کے تہ خانے کی کیفیت دیکھی ہے، جس کسی نے بھی وکیلوں کو آپس میں بے تکلف باتیں کرتے دیکھا ہے اور انھیں اپنے موکلوں کی بدنصیبیوں پر خود ستائی کرتے سنا ہے، اس کی رائے انسانی فطرت کے بارے میں بہت خراب ہی ہوگی۔

وہ عورتیں جو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مسلسل لگی رہتی ہیں، ہر جگہ مردوں سے کم بے رحم ہوتی ہیں۔

طبیعات اخلاقیات میں شامل ہو کر انھیں بڑے جرائم سے باز رکھتی ہے۔ ان کے خون میں اتنی گرمی نہیں ہوتی تیز مزاجیں خونخواری کو اکساتی ہیں، عورتیں ان کی نسبتاً کم عادی ہوتی ہیں۔ ایک ظاہر ظہور ثبوت اس کا وہ ہزاروں انصاف کے شکار ہیں جنھیں پھانسی دی گئی۔ ان میں مشکل سے ہزار میں چار عورتیں ہیں۔ غالباً کہیں اور بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایشیا میں عورتوں کی دو مثالیں بھی ایسی نہیں ملتیں جنھیں بر سر عام سزا دی گئی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے طور طریق اور عادتوں نے مردوں کو بہت بد بنا دیا۔

اگر یہ حقیقت عام اور بغیر استثنیٰ کے ہوتی تو مردوں کی نوع مکڑیوں، بھیڑیوں اور خونخوار جنگلی بلیوں سے زیادہ نفرت انگیز ثابت ہوتی۔ مگر خوش قسمتی سے وہ پیشے جو دل کو سخت کر دیتے ہیں اور قابلِ نفرت جذبات سے بھر دیتے ہیں بہت ہی کم ہیں۔ یہ دیکھئے کہ دو کروڑ کی قوم میں زیادہ سے زیادہ دو لاکھ فوجی ہیں۔ گویا دو سو افراد میں ایک فوجی۔

دوسرے پیشے جو اخلاق کے لئے خطرناک ہیں تعداد میں کم ہیں۔ مزدور، دستکار، اور فن کار اس قدر اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں کہ جرائم کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کمینے لوگ ہمیشہ پائے جائیں گے اور کتابوں میں ان کی تعداد ہمیشہ بڑھا کر لکھی جائے گی مگر دراصل ان کی تعداد جتنی زیادہ بتائی جاتی ہے اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

اگر نوعِ انسانی ابلیس کی مملکت میں ہوتی تو دنیا میں کوئی انسان باقی نہ رہتا۔ ہمیں اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہئے: ہم نے اچھی فطرت کے لوگ پیکنگ سے لارو شل تک ہمیشہ دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ اور سند یافتہ واعظ، اور فارغ التحصیل حضرات چاہے جو کچھ کہیں سارے ٹائیٹس، ٹراجن، انتینوس اور پیٹر بلی، بڑے دیانتدار لوگ ہو گزرے ہیں۔

شادی

میری ملاقات ایک عقل آرا سے ہوئی۔ اس نے کہا "اپنے لوگوں کو آمادہ کر کہ جلد از جلد شادی کر لیا کریں۔ پہلے سال ان کے ٹیکس چھوڑ دو۔ اور ان کے حصے کی رقم ان لوگوں سے وصول کرو جو اتنی کی عمر میں تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔"

"تمہارے ہاں جتنے زیادہ شادی شدہ لوگ ہوں گے اتنے ہی کم جرائم ہوں گے۔ اپنے ہاں کے جرائم کے گوشواروں کے خوف انگیز خانوں پر نظر ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ایک باپ کے مقابلے میں سو مجرد نوجوانوں کو سزائے موت ملی۔"

"شادی لوگوں کو زیادہ صالح اور زیادہ دانشمند بنا دیتی ہے۔ بچوں کا باپ اپنے بچوں کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ اپنے ورثہ میں شرمناکی کو چھوڑ جانے سے ڈرتا ہے۔

الوکیل	آنکہ حق باطل گرداند	وکیل وہ ہے جو بے اصل اور بے بنیاد باتوں کو سچ کر دکھائے
الرشوۃ	کارسازِ بیچارگاں	رشوت اس چیز کا نام ہے جو غریبوں اور مظلوموں کی دستگیری کرے
السعید	آنکہ ہرگز روئے قاضی نہ بیند	خوش قسمت وہ ہے جس کو قاضی یا جج کا دیدار کبھی نصیب نہ ہو۔
الطبیب	خر	ایک بے مغز اور نادان آدمی
الشاعر	طامع خود پسند	ایک حریص اور البیلا انسان

فصل چہارم (شیوخ اور ان کے مریدین)

الشیخ	ابلیس	معلم الملکوت
الشیاطین	اتباع او	اس کے متبعین
الصوفی	مفت خور	جو دوسروں کی کمائی کھائے اور خود نہ کمائے
الحاجی	آنکہ دروغ بکعبہ خورد	جو کعبہ کی جھوٹی قسم کھائے

فصل پنجم (شرفا اور ان کی عادات کے متعلق)

اللاف والوقاحۃ	مایۂ ایشاں	بے باکی و شیخی شرفا کی تجارت کا سرمایہ ہے۔
الہیچ	وجود شاں	ہیچ و لوپوچ شرفا کا وجود ہے
المجوف	تواضع شاں	ان کی آداب و تہذیب بالکل بے مغز اور بے اصل ہے۔
الگزاف والسفہ	سخن شاں	شرفا کی گفتگو کا دوسرا نام غرور و حماقت ہے
اللوم والحرص والبخل والحسد	اخلاق شاں	حسد، بغض، غرور، نکتہ چینی ان کی خصوصیات ہیں۔
الابلہ	آنکہ بر ایشاں امید خیر دارد	بے وقوف وہ ہے جو ان شرفا سے بھلائی یا جلب منفعت کی امید رکھے۔

فصل ششم (پیشہ ور اور صناع)

البازاری	آنکہ از خدا نہ ترسد	دکاندار وہ ہے جسے خوفِ خدا نہ ہو
العطار	آنکہ ہمہ را بیمار خواہد	عطار وہ ہے جو ہر شخص کو بیمار بنانے کا متمنی ہو۔
الطبیب (ڈاکٹر)	جلاد	جلاد و قاتل
الکذاب (جھوٹا)	المنجم	نجومی
الکشتی گیر (پہلوان)	تنبل	کاہل، بے وقوف، سادہ لوح، آوارہ

الدلال	حرامی باز	بازار کا مستند چور
الصدیک	آنچہ از مزروعات بہ مالک نرسد	جو چیز زمیندار کو فصل سے نہیں ملتی وہ ایک فیصدی ہے۔
الشکایتہ	آنچہ بہ مالک برسد	جو مالک کے کانوں تک پہنچتی ہے وہ شکایت ہے۔

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازم کے بارے میں)

الشراب	مایۂ آشوب	بے چینی اور اضطراب کا سرچشمہ
الزرد والشاہد والشمع والنقل	آلاتِ آں	جو سر، گجعۂ، حسن پرستی قندیل و فابلیت سب شراب نوشی کے ذرائع ہیں۔
الچنگ والعود والمزمر	سازِ آں	بربط و طنبور و چنگ و رباب وغیرہ اس کا گانا بجانا ہے۔
الچمن والبستان	موضعِ آں	باغ و چمن شراب پینے کی مناسب جگہ ہے۔
الشوربا والکباب	اغذیۂ آں	کباب و گزک شرابیوں کی غذا ہے۔
ہادم اللذات	رمضان	خوشی و لطف کو تباہ کرنے والا رمضان۔
لیلۃ القدر	شبِ عید	جشن کی رات

فصل ہشتم (بھنگ نوشی کے متعلق)

البنگ	آنچہ صوفیاں را بوجد آورد	بھنگ وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کر دے۔
المرصع والکریم والطرفین	آنکہ بنگ و شراب باہم خورد	زندہ دل وہ ہے جو شراب اور بھنگ دونوں پیے۔
المحروم	آنکہ ازایں دو ہیچیک نخورد	مردہ دل وہ ہے جو دونوں کو منہ نہ لگائے۔

فصل نہم (صاحبِ خانہ اور اس کے ملحقین)

المجرد	آنکہ بریشِ دنیا خندد	نوجوان یا کنوارا وہ ہے جو دنیا کی داڑھی پر ہنسے۔
الشقی	کدخدا	بدقسمت وہ ہے جو صاحبِ خانہ ہو۔
ذوالقرنین	آں کہ دو زن دارد	جس کی دو بیویاں ہوں وہ ذوالقرنین ہے۔
الشقی الاشقیاء	آنکہ بیشتر دارد	سب سے زیادہ بدقسمت وہ ہے جس کی دو سے زیادہ بیویاں ہوں۔
الباطل	عمر کدخدائی	لایعنی اور بے کار صاحبِ خانہ کی زندگی۔
الضائع التلف	روزگارِ او، مالِ او	ضائع ہونے والی چیز وقت اور صاحبِ خانہ کی دولت۔
الپریشاں	خاطرِ او	پریشان کرنے والا صاحبِ خانہ کا دماغ

التلخ	عیشِ او	تلخ چیز صاحبِ خانہ کی عیاشی
الماتم سرا	خانۂ او	اس کے دولت کدہ کا نام ماتم سرا ہے۔
العدو نمائی	فرزند	گھر میں دشمن اس کا خلف الرشید
البداختر	آنکہ بدختر گرفتار باشد	بدنصیب وہ جو لڑکی کی وجہ سے رنج اٹھائے۔
الخصم	برادر	حریف۔ صاحبِ خانہ کا بھائی
الخون بہا اند	دشمنِ جان	رشتہ دار۔ اس کا جانی دشمن
الفرح بعد الشدہ	لفظ سہ طلاق	افسوس کے بعد خوشی طلاق ثلاثہ سے حاصل ہوتی۔

فصل دہم (مرد عورت کی حقیقی فطرت کے متعلق)

الخاتون	آنکہ معشوق بسیار دارد	خانم کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواستگار ہوں۔
الکدبانو	آنکہ بسیار ندارد	بیگم کی صفت یہ ہے کہ اس کے چاہنے والے کم ہوں۔
المستور	آنکہ بیک عاشق قانع نباشد	پاکباز۔ جو ایک عاشق پر قناعت نہ کرے۔

(روس)

ترجمہ: مظفر علی سیّد

کُتّا اور بیل

ایوان کریلوف

کُتّا اور بیل

ایک کتا اور ایک بیل —— جو ایک ہی کسان کی خدمت میں تھے —— ایک دن اپنی اپنی خوبیوں پر بحث کرنے لگے۔

اصحاب کہف کے ساتھی نے کہا: "کیا کہنے ہماری قوم کے! انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تمھیں زمین سے بے دخل کر دینا چاہیئے۔ ہل چلانا گاڑی جوتنا —— بھلا یہ بھی کوئی کام ہے! اور مجھے پتہ نہیں کہ اُن کے سوا تم میں کونسا گُن ہے! خیر میرا تمہارا تو مقابلہ ہی کیا ہے! مجھے تو آٹھ پہر میں گھڑی بھر آرام نہیں ملتا۔ دن کو ڈھور ڈنگر کی رکھوالی کرتا ہوں، اور رات کو مکان پر پہرا دیتا ہوں!"

"بالکل ٹھیک! سو فیصدی ٹھیک"۔ بیل نے کہا: "آپ جو کچھ فرماتے ہیں، سرا سر درست ہے، بس اتنا یاد رکھئے کہ اگر میں ہل نہ جوتوں اور گاڑی نہ چلاؤں تو آپ کاہے کی رکھوالی کریں گے اور کس چیز پر پہرا دیں گے؟"

گدھا اور بُلبل

ایک گدھے کی ملاقات، ایک دن، ایک بلبل سے ہو گئی۔ اُس نے کہا:

"عزیز من! سننے میں آیا ہے کہ تم گیت گانے میں بڑی مہارت رکھتی ہو۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں گاتے ہوئے سنوں اور فیصلہ کروں کہ آیا تم واقعی اتنی ہی باکمال ہو یا محض عوام الناس کا مبالغہ ہے؟"

اس پر بلبل نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ اس نے ہزار طریقوں سے لہجہ بدل بدل کر سیٹیاں بجائیں، سسکیاں بھریں اپنے گلے سے لگائے اور ایک گیت سے دوسرے گیت پر آئی۔ کبھی اس نے اپنی آواز کو ایسے مدھم کیا کہ دور سے بجتی ہوئی بانسری کی نرم تانوں کا اثر پیدا ہوا۔ کبھی اس نے جنگل میں ننھے ننھے سروں کی بوچھاڑ کر دی۔ صبح کی ہر دلعزیز مغنیہ کے سامنے ہر چیز ہمہ تن گوش تھی۔ ہوائیں چلتے چلتے تھم گئیں، پنچھیوں کی منڈلی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ حتیٰ کہ چرندے بھی گھاس پر لیٹ گئے۔ چرواہا بھی گیت کے مزے لے رہا تھا، اور سانس تک کی آواز بلند نہ ہونے دیتا تھا۔ بس سنتے سنتے کبھی کبھار چرواہی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔

آخر کار مغنیہ خاموش ہو گئی۔ گدھے نے سر کو جھکاتے ہوئے اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا

"گوارا ہے! سچ پوچھو تو تمہارا گانا کچھ ایسا بیزار کن بھی نہیں، افسوس کہ تم نے ہمارے مرغے کو نہیں سنا! اگر تم اس سے دو چار دن سبق لے لو، تو بہت عمدہ گانے لگو۔"

یہ فیصلہ سن کر غریب بلبل کے پروں میں حرکت ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اُسترے

ایک مرتبہ سفر کے دوران میں میری ایک صاحب سے ملاقات ہوئی اور ہم نے سرائے کے ایک ہی کمرے میں رات بسر کی۔ اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں! میرے ہم سفر کو شاید کوئی شکایت ہو گئی۔ پچھلی رات ہم دونوں خوش خوش بستروں پر دراز ہوئے تھے۔ کسی فکر یا پریشانی کے بغیر۔ مگر اب میرے دوست کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ کراہتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور شکایت کے کلمے زبان پر لاتا ہے۔

"کیا بات ہے، یار؟" میں اس سے پوچھتا ہوں "تم کہیں بیمار تو نہیں ہو؟"

"نہیں بھئی، بالکل نہیں۔" اس نے کہا "بس ذرا شیو بنا رہا ہوں!"

"ہائیں! کیا اتنی سی بات تھی!" میں حیرانی سے کہتا ہوں اور فوراً اٹھ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب آدمی، آئینے میں منہ بگاڑ رہا ہے، آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور ایسے کرب کے عالم میں ہے گویا اس کی کھال کھینچی جا رہی ہو۔

جب میں نے اس کے عذاب کی وجہ معلوم کر لی تو اس سے کہا "خیر، یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم تو اپنے آپ کو گھائل کرنے پر تُلے ہو۔ ذرا اپنے سامان کی طرف دیکھو! یہ اُسترے ہیں یا لکڑی چھیلنے کے رندے؟ ان سے بھلا کون شیو بنا سکتا ہے! بس یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھیل کے رکھ دو۔"

"میں مانتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "کہ میرے اُسترے کُند ہیں۔ یہ تو صاف نظر آتا ہے۔ مگر میں اتنا احمق بھی تو نہیں ۔۔۔ نقصہ یہ ہے کہ تیز دھار کا اُسترا میں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں گلا نہ کٹ جائے۔"

"دوست، یقین مانو کہ کُند اُسترے سے تم اپنا گلا اس سے بھی پہلے کاٹ کے رکھ دو گے۔ تیز اُسترے کے ساتھ تم دگنی حفاظت سے شیو بنا سکتے ہو۔ بس اتنی بات ہے کہ اسے برتنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو۔"

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں (خواہ وہ اس بات کو شرم کے مارے تسلیم نہ کریں) جو چالاک آدمیوں سے ڈرتے ہیں اور اپنے آس پاس احمقوں کا جمگھٹا لئے بیٹھے رہتے ہیں۔

عینک اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہو گئی۔ اس نے انسانوں کی زبانی سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بدقسمتی کی بات نہیں، بس اتنا ہے کہ عینک لگانی چاہئے۔ چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پہ رکھا، کبھی دم پہ باندھنے کی کوشش کی۔ کبھی سونگھا، کبھی چاٹا۔ پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

"واہیات!" اس نے کہا "احمق ہیں وہ، جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انھوں نے بالکل غلط ہانک

دی ہے۔ ان کا تو ذرا بھی مانند نہیں!"

اس کے بعد، بندر نے غصّے اور بے زاری کی حالت میں، عینکوں کو ایک پتھر پر اس زور سے مار کر سب کی سب ریزہ ریزہ کر دیں۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں، کوئی چیز کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو، ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا، ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے اور اگر تھوڑا بہت اختیار بھی رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اود بلاؤ

عدالت میں اود بلاؤ کے خلاف ایک استغاثہ دائر ہوا۔ بدیں معنی کہ اس نے جو ہڑ کو اپنی غلاظت پسندی کے باعث رہنے کے قابل نہ رہنے دیا ہے۔ شہادت کے طور پر جھینگے بطور ثبوت مہیا کئے گئے اور جیسا کہ مناسب تھا، ملزم کو ایک بڑے ٹب میں بٹھا کر کمرہ عدالت میں لایا گیا۔ جج صاحبان ذرا سے فاصلے پر، چرنت میں مصروف تھے۔ ان کے اسمائے گرامی اب بھی قدیم دستاویزوں میں محفوظ ہیں۔ وہ عدد گدھے، چند ایک بڈھے گھوڑے، اور دو یا تین بکرے۔ آخر میں ایک عدد لومڑ کو ۔۔۔۔ اسیسر کے طور پر ان میں شامل کر لیا گیا تاکہ کسی لائق ہستی کے زیر معائنہ ہی کارروائی ہو ۔۔۔۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ افواہوں کے مطابق اود بلاؤ، لومڑ کی ضیافت کے لئے مچھلیاں فراہم کیا کرتا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، عدالت میں جانبداری کا شائبہ نہ تھا، اور یہ بھی یاد رہے کہ اس معاملے میں اود بلاؤ کی بدمعاشی عدالت سے مخفی نہ رہ سکتی، اور اس افواہ کے جھوٹ سچ سے کوئی فرق نہ پڑ سکتا۔ آخر فیصلہ تجویز کیا گیا جس میں اود بلاؤ کو سنگین ترین سزا دی گئی تھی یعنی دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے، اسکو درخت میں پھندا ڈال کر پھانسی دے دی جائے۔

"محترم جج صاحبان" لومڑ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا "پھانسی تو بڑی معمولی سی سزا ہے۔ میرے خیال میں تو ملزم کو ایسی کڑی سزا ملنی چاہئے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے۔ اس غرض سے کہ آئندہ کے لئے بدمعاش ہمیشہ قانون سے خائف رہیں اور سزا کی دہشت سے لرز اٹھیں، میری ناقص رائے میں اود بلاؤ کو دریا برد کر دینا چاہیئے۔"

"کیا کہنے! کیا کہنے!" جج صاحبان نے اسے داد دی، اور ایک آواز ہو کر اس کی تجویز قبول کر لی۔

چنانچہ اود بلاؤ کو ۔۔۔۔ سزا کے طور پر ۔۔۔۔ دریا برد کر دیا گیا۔

ماہر تعمیرات

ایک ٹیر کو پنچھی پکھیروؤں سے بڑا پیار تھا، مگر یہ دیکھ کر اسے افسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑھتے پھولتے نہیں۔ ان کا طرز حیات ایسا ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہتے ہیں، کچھ چوری ہو جاتے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔

اس ناخوشگواری اور نقصان کی تلافی کے لئے ٹیر نے چاہا کہ ایک بڑا سا محفوظ آنگن ان کیلئے بنوائے جو ایسی مہارت سے تیار ہو کہ چور کے گھسنے کو کوئی راستہ نہ رہ جائے اور اس کے اندر جملہ ضروریات اور کافی جگہ ان کے کھیل کود کے لئے ہو۔

چنانچہ شیر کو معلوم ہوا کہ لومڑ تعمیرات کے کام میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے ذمے یہ فرض ڈالا گیا۔ عمارت شروع ہوئی اور بڑی کامیابی سے تکمیل پذیر بھی ہوئی، کیونکہ لومڑ نے اس کام پر اپنی تمام ذہانت اور بے پناہ محنت صرف کی تھی۔ اس وسیع و عریض آنگن کو دیکھنے بھالنے پر محسوس کیا گیا کہ یہ حدِ توصیف سے باہر ہے۔ پکھیروؤں کو جس شئے کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہاں موجود تھی۔ دانا دنکا اور پانی ڈالنے کے لئے بڑے بڑے پیالے بنے تھے۔ بیٹھنے کے لئے ہر جگہ اڈے لگائے گئے تھے، گرمی سردی سے بچنے کے لئے پناہ گاہیں تعمیر کی گئی تھیں، اور کڑک مرغیوں کے لئے الگ تھلگ جگہیں بھی تیار تھیں۔ لومڑ کی مہارت دیکھ کر اس کی عزت اور تکریم کی گئی، اسے فیاضانہ انعام سے نوازا گیا اور حکم جاری کیا گیا کہ تمام پکھیرو اپنی نئی قیام گاہ میں اٹھ جائیں۔

مگر اس نقل مکانی سے کچھ فائدہ؟ پکھیروؤں کی آبادی بڑھی؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عمارت وسیع و عریض اور مضبوط تھی، دیواریں بلند اور دبیز تھیں۔ مگر پکھیرو روز بروز کم سے کم تر ہوتے جاتے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس خرابی کا باعث کیا ہے آخر شیر نے پہرہ لگانے کا حکم دیا اور بھلا کون پکڑا جاتا ہے؟ وہی بدمعاش لومڑ! اس نے عمارت کو اس ڈھنگ سے بنایا تھا کہ کوئی دوسرا اس میں داخل ہو کر چوری نہ کر سکے، اور بڑی احتیاط سے ایک چھوٹا سا سوراخ چھوڑ دیا تھا جس کے راستے وہ خود داخل ہو سکے۔

زمیندار صاحب اور کمیرا

ایک شام کا ذکر ہے کہ ایک زمیندار صاحب اور ایک کمیرا جنگل کے راستے گاؤں کو جا رہے تھے۔ گھاس کاٹنے کا موسم تھا اور شام بھی گہری ہو رہی تھی۔ یکایک انھوں نے ایک ریچھ کو دیکھا کہ ان کے بالکل پاس آ چکا ہے۔ زمیندار صاحب کو بھاگنے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا کہ ریچھ ان پر چڑھ دوڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ زمین پر تھے۔ ریچھ نے جب ان کو الٹا پلٹا تو ان کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اس کے بعد ریچھ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی اچھی سی جگہ ملے جہاں آرام سے بیٹھ کر کھانا شروع کرے۔

زمیندار صاحب نے ریچھ کے نیچے سے اپنے ملازم کو پکارنا شروع کیا: میرے دوست، میرے بھائی! مجھے چھوڑ کر نہ جانا! کمیرے نے رستم کی سی دلاوری سے کام لے کر ریچھ کے سر پر کلہاڑے کی ضرب لگائی۔ ریچھ کی کھوپڑی دو ٹکڑے ہو گئی اور پھل انتڑیوں تک چلا گیا۔ ریچھ درد سے دھاڑنے لگا اور آخرکار اس کی جان نکل گئی۔ جب خطرہ دور ہوا تو زمیندار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کمیرے کو بری طرح کوسنے لگے۔ وہ غریب حیران پریشان ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"حضور، معاف کر دیجئے۔ مگر میں نے قصور کیا کیا ہے؟"

"نامعقول! تو نے کیا کیا ہے؟ تم از راتے کس بات پر ہو؟ تم نے اندھوں کی طرح ایسی کڈھب چوٹ لگائی ہے کہ ریچھ کی کھال بالکل ضائع کر دی ہے!"

بھیڑیں اور بھیڑیے

ایک مرتبہ بھیڑوں کا سکھ چین، بھیڑیوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خرابی یہاں تک جا پہنچی کہ جنگل کے حاکموں نے فیصلہ کیا کہ مظلوموں کو کس طرح ظالموں کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک مجلس شوریٰ بلائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ

(چینی)

آزادئ تقریر

مصنفہ:۔ لن یوتانگ

مترجمہ:۔ شاہد احمد دہلوی

چند سال ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ چینی لیگ برائے حقوقِ عوام میں آزادئ تقریر پر ایک خطبہ دوں۔ یہ ایک اہم موضوع ہے اور میں پوری آزادی کے ساتھ اس پر تقریر کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے والا ہے تو سب خائف ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچی آزادئ تقریر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اپنے پڑوسیوں کے متعلق کسی کے کیا خیالات ہیں، پڑوسیوں کو بر بنانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ معاشرہ صرف اسی بنیاد پر قائم رہ سکتا ہے کہ اس میں کسی حد تک خوبصورت جھوٹ شامل ہو اور کوئی فرد اپنے خیالات کا سچا اظہار نہ کرتا ہو۔

یہ ساری خرابی تقریر کے وجود سے پیدا ہوتی ہے۔ بامعنی زبان صرف انسانوں کی ہوتی ہے کیونکہ جانوروں کی آوازیں صرف جبلی ضروریات کا اعلان ہوتی ہیں، مثلاً تکلیف، بھوک، خوف اور طمانیت کی آوازیں۔ کتے کی آوازیں طرح طرح کی ہوتی ہیں مگر سب جذباتی ضروریات کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب شیر کسی آدمی کو نگل جاتا ہے تو اطمینان سے ہونکتا ہے۔ لیکن ہمارے قبلِ جنگ کے ایک جنرل کی طرح ایک اخبار نویس کو قتل کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ "دیکھو جی، میرا اخلاقی جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں تمہیں نگل جاؤں کیونکہ تم جمہوریۂ چین کے خطرے میں ڈال رہے ہو۔" صرف نسلِ انسانی ہی ایسی حقیقی انسانی زبان کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہے فرق انسان اور حیوان میں۔

میں اسی وجہ سے جنرل ہو چینٹن کی رائے سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں جنھوں نے ایک دفعہ جدید نصابِ تعلیم کو یہ کہہ کر غلط ٹھہرایا تھا کہ ان میں ریچھ سے یہ یہ باتیں کہلوائی ہیں اور خرگوش سے یہ یہ کہلوایا گیا ہے۔ یوں جانوروں کو ان باتوں سے متہم کیا گیا ہے جو وہ کہہ ہی نہیں سکتے اور حیوانوں کو اتنا ہی کج اندیش بنانے کی کوشش کی ہے جتنا کہ انسان ہے۔ حکایاتِ لقمان تمام تر دنیائے حیوانی کی صریح اہانت کرتی ہیں۔ اور اگر حیوان انھیں پڑھ سکتے تو ان کا ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ انگوروں کے خوشے تک جب لومڑی کی رسائی نہیں ہوتی تو بس وہ چلی جاتی ہے۔ وہ اتنی بد مذاق نہیں ہوتی کہ "انگور کھٹے ہیں" کہے۔ انسان کے علاوہ کوئی حیوان اتنی گھٹیا بات نہیں کہہ سکتا۔ افیون کاشت نہ کرنے والوں سے ٹیکس وصول کر کے اگر کوئی لومڑی چینی کاشتکاروں کو افیون کے پودے لگانے پر مجبور کرے تو وہ اسے "کاہلی دور کرنے کا ٹیکس" نہیں کہے گی۔ اور اگر کہے گی تو وہ دیانتدار لومڑی نہیں ہو گی......

لہٰذا انسان اور حیوان میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان باتیں کرتا ہے اور جانور آوازیں نکالتا ہے۔ برنارڈ شا نے سچ

کہا ہے کہ صرف ایک قسم کی آزادی حاصل کرنے کے لائق ہے، اور وہ ہے چوٹ کھانے پر مظلوموں کو آواز نکالنے کی آزادی، اور ان حالات کو دور کرنے کی آزادی بھی جو انھیں تکلیف پہنچ رہی ہو۔ چین میں جس قسم کی آزادی کی ہمیں ضرورت ہے وہ آزادئ تقریر نہیں ہے بلکہ فقط یہی آزادی ہے کہ جب کسی کو تکلیف پہنچے تو وہ آواز نکال سکے۔ باتیں ہم سب کافی کر لیتے ہیں لیکن ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو چوٹ کھانے پر آواز نکال سکیں۔ ہماری زبان اس درجہ شائستہ ہے کہ ہماری حیاتی ضروریات کا اظہار شاذ ہی کر سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ رات کو جب بلی چیخنا شروع کرتی ہے تو اسے پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے، اور اس کی آواز ہمیشہ پُرمعنی ہوتی ہے۔ یہ بات چینی کاشت کار کو حاصل نہیں ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے گھر جا کر بچا جھکتا ہے، اور ڈرتا ہے کہ اس کے بکنے جھکنے کو کہیں کوئی سن نہ لے۔

آزادئ تقریر کا تصور غیر ملکی ہے، کیونکہ چین میں کبھی بھی اس کا وجود نہیں رہا۔ اپنی عظیم عقل سلیم سے ہم نے بولنے کی نہیں خاموشی کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ ہمارے ہاں کی ایک کہاوت ہے کہ "تمام بیماریاں منہ کے ذریعے اندر آتی ہیں، اسی طرح جیسے ساری بلائیں منہ کے ذریعے باہر آتی ہیں۔" چینی افسروں نے ہمیشہ بڑی احتیاط برتی ہے کہ "لوگوں کے منہوں پر زیادہ اور دریاؤں پر کم پشتے باندھے ہیں۔" اور عوام کے منہ ہمیشہ پشتہ بستہ ہوتے ہیں۔ صرف ایک کہاوت ایسی تلاش کرنے میں مجھے کامیابی ہوئی ہے جس میں ایک طرح کی آزادئ تقریر کی کچھ حمایت کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

انھیں ہنسنے دو اور دھمکانے دو جو ہنسنا چاہتے ہیں اور دھمکانا چاہتے ہیں۔ میں

ایک اچھا افسر ہوں، میں ایک اچھا افسر ہوں۔

مگر اس کا مطلب وہی نہیں ہے جو آزادئ تقریر کا۔ کیونکہ یہ آزادی صرف اس حد تک ہے جس حد تک لوگوں کی ہنسی اور نفرت تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ جب تکلیف دہ ہو جائے تو "اچھا افسر" انھیں گولی سے اڑا سکتا ہے۔

لہٰذا ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تقریر کلیتاً ایک باعثِ تکلیف امر ہے اور افسروں کی نگاہ میں آزادئ تقریر اس سے بھی بڑا باعثِ تکلیف امر۔ افسر خاموش لوگوں کو پسند کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو جو تکلیف پہنچنے پر نہ تو بولتے ہیں نہ آواز نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ادارۂ تحفظِ عوام کا کوئی سُراغ رساں میرے سامعین میں شریک ہے تو وہ سوچ رہا ہو گا کہ میں ایک بہت بڑی لعنت ہوں، اور سارے سامعین جو اس قدر خاموش بیٹھے ہیں، "گلدانوں کی طرح منہ بند کئے" مجھ سے کہیں بہتر شہری ہیں۔ یہ عین فطرت ہے۔

ہمیں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ لوگوں کے لئے آزادئ تقریر کا جو مطالبہ ہم کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ افسروں کے لئے کوئی آزادئ عمل نہ رہے۔ افسر بھی اپنی آزادی سے اس قدر محبت کرتے ہیں جتنی ہم اپنی آزادی سے۔ جب ہم اخباروں کیلئے آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دراصل ہمارا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اخباروں کا منہ بند کرنے کا جو اختیار افسروں کو حاصل ہے وہ ان سے چھین لیا جائے۔ جب ہم فرد کی آزادی کا مطالبہ ایک دستوری حق قرار دے کر کرتے ہیں تو لوگوں کے سر اڑا دینے کی آزادی جو افسروں کو حاصل ہے سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں آزادیوں میں پرلے سرے کی ضد ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اگر میں افسر ہوتا تو میں بھی یہی چاہتا کہ کسی دن اگر میری طبیعت مکدر ہو تو جب اور جتنے چاہوں لوگوں کے سر اڑانے کی آزادی مجھے حاصل ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے شہر چانگ چاؤ کے جنرل چانگ لی کو اس قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ اس سے لطف اندوز

ہوتے تھے۔ جب ان کی طبیعت مرجھا رہی ہوتی اور اسے اکسانے کی انھیں کوئی صورت نظر نہ آتی تو تکلدر کو دور کرنے کے لئے ایک پرچے پر صرف دو سطریں لکھ دیتے، اور ان کا دردِ سر دور کرنے کے لئے ان کے سامنے کئی قیدیوں کے سر اتار دیئے جاتے۔ میں اس حقیقت کا اظہار بے خوف و خطر کر رہا ہوں، کیونکہ جنرل چانگ پی کا انتقال ہو چکا ہے۔

لہٰذا جب چینی لیگ برائے حقوقِ عوام نے افسروں کی آزادیوں میں کمی اور عوام کے حقوق کا تحفظ کرنے کا مطالبہ کیا تو فوجیوں اور افسروں کی آنکھوں میں لیگ کھٹکنے لگی۔ فوجی چاہتے تھے کہ لوگوں کو سزائے موت خفیہ عدالتوں میں دی جائے، لیکن لیگ نے کھلی عدالتوں میں مقدمے چلانے کا مطالبہ کیا۔ افسر یہ چاہتے تھے کہ اپنے مخالفوں کو چپکے سے پکڑ کر روئے زمین سے انھیں غائب کر دیں، مگر لیگ تار پر تار بھیجتی اور مطالبہ کرتی کہ غائب ہونے والوں کا اتہ پتہ بتایا جائے۔ جیسے جیسے لیگ اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتی گئی اسی نسبت سے بڑی سے بڑی لعنت بنتی گئی۔

تاریخ چین میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ منگ خاندان کے اختتام پر جب تنگ لن علماء حکومت پر نڈر ہو کر آزادانہ اعتراضات کرنے لگے تو انھیں شوئی ہو نی رومانی کہانی کے ۱۰۸ ڈاکوؤں سے تشبیہ دی گئی۔ عوام میں ان کا نام لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ فوجوں کے ہاتھوں وہ مارے گئے۔ ان کے بدلے ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ سوئی چنگ ہیؤ تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جس کے بارے میں [illegible] کرتے تھے کہ اس میں "پانچ شیر، پانچ چیتے، پانچ کتے، دس بیٹے، چالیس پوتے" شامل ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تنگ لن علماء قید کئے گئے، انھیں عذاب دیئے گئے، اور ان کے سر اڑا دیئے گئے اور شیروں اور چیتوں اور کتوں نے بازی جیت لی۔

موجودہ کیفیت کے متعلق یہ توقع رکھنا کہ اگلے زمانے سے مختلف ہو گی۔ احمقانہ بات ہو گی۔ عوام کے حق تقریر کا مطالبہ جو بھی کرے پہلے خوجوں کی دشمنی کا بندوبست کر لے۔ چینی لیگ برائے حقوقِ عوام اور منگ خاندان کے تنگ لن علماء میں فرق یہ ہے کہ لیگ اصولِ آزادیٔ تقریر کے لئے "ایک دستوری اصول" کی بنیاد پر لڑ رہی تھی۔ جب تنگ لن علماء نے مشہور بدمعاش خوجے اور رائی وائی چنگ، ہیسن کو مجرم ٹھہرایا تو اس بدنام و رسوا خوجے کو صرف یہ کرنا پڑا کہ شہنشاہ کے حضور آنسو بہائے اور علماء کو دربار سے نکلوا دے۔ بنیادی اعتبار سے صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کسی نئے اصول کے لئے صرف اصولی طور پر لڑنے ہی سے صورتِ حال میں تبدیلی ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔

(عربی)

مُلّاجی اور اُن کا خلیفہ

مصنف: ڈاکٹر طٰہٰ حسین
مترجم: شیخ محمد احمد پانی پتی

"جدید عربی ادب کے معماروں میں مصر کے مشہور نابینا عالم اور مصر کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نام سر فہرست ہے۔ ان کی تحریریں فلسفیانہ رنگ لئے ہوتی ہیں اور معاشرہ کی بوقلمونیوں پر ان کا قلم طنز کے گہرے نشتر لگاتا ہے۔ انھوں نے "الایام" کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشہور سلسلۂ مضامین "یاد ایام عشرت فانی" کی طرز پر اپنے بچپن اور زمانۂ تعلیم کے حالات بڑے پر لطف طریقے سے بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب بظاہر ایک شخص کے ذاتی حالات پر مشتمل چند واقعات کا مجموعہ ہے لیکن در اصل اس میں اُس معاشرہ کی پوری کیفیت بیان کر دی گئی ہے جس میں سے ڈاکٹر صاحب کو گزرنا پڑا۔ اساتذہ کے اطوار اور علماء و مشائخ کے مشاغل کا حال انھوں نے جس طرح مزے لے لے کر بیان کیا ہے اس سے دو باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بلادِ عربیہ کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ دوم یہ کہ عربی کی جدید مزاح نگاری ہمارے ہاں کی مزاح نگاری کے بہت حد تک مماثل ہے۔

"یہ دکھانے کے لئے کہ عربی کے مزاحیہ ادب کے جدید رجحانات کیا ہیں، ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مکتب کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ گو یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے لیکن کتاب میں ہر جگہ انھوں نے اپنے لئے "میں" یا "ہم" کی بجائے "بچہ" یا "ہمارا دوست" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، لہٰذا ترجمہ میں بھی انہی الفاظ کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مکتب کا خلیفہ بھی ملاجی کی طرح عجیب و غریب خصلتوں کا مالک تھا۔ ناٹے قد اور توے کی طرح سیاہ رنگ کے اس آدمی کا بخت بھی اس کے چہرے کی طرح سیاہ تھا۔ جہاں جاتا نحوست اس کی پیشوائی کے لئے پہلے سے موجود ہوتی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا۔ ناکامی بڑھ بڑھ کر قدم چومتی۔ اس کے باپ نے کئی کاریگروں کے پاس بٹھایا کہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنی گزر اوقات کا ذریعہ پیدا کرے مگر خیر سے دماغ ہی

ایسا نہ پایا تھا کہ صنعت و حرفت کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکتا۔ اس کے بعد اُسے اس کے باپ نے کئی کارخانوں میں نوکر کرایا کہ اور کچھ نہ سہی چوکیداری کر کے اپنا پیٹ پالے مگر نحوست نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے دوسرے بھائی بھی تھے جو خوب کماتے تھے مگر یہ پوستیوں کی طرح سارا دن گھر میں بیٹھا مفت کی روٹیاں توڑا کرتا تھا۔ ایک دن کہیں اس نے مکتب کے ملّاجی کو اپنا دکھڑا جا سنایا ملّاجی کو مکتب کے لئے ایک نائب کی ضرورت تھی اور انھوں نے اسی کو غنیمت جانا اور اس سے کہنے لگے:۔

"تم ہمارے ہاں آجاؤ۔ میں لڑکوں کو قرآن کریم پڑھاتا اور حفظ کراتا ہوں۔ تم انھیں عربی لکھنا پڑھنا سکھا دیا کرو۔ ان کا سبق سن لیا کرو اور ان کی نگرانی کیا کرو کہ کہیں وہ میری غیر حاضری میں کھیل کود میں تو وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح سویرے بچوں کے آنے سے قبل مکتب کی صفائی کر دیا کرو اور عصر کے بعد مکتب کو بند کر کے تالا لگا دیا کرو۔ میں اس کے معاوضہ میں تمھیں آمدنی کا چھوٹا حصہ دے دیا کروں گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ خلیفہ کو پہلے ہی روزگار کی تلاش تھی اس نے ملّاجی کی پیش کش فوراً قبول کر لی اور قول و قرار کے بعد ملّاجی کی نیابت کے طور پر کام شروع کر دیا۔

دونوں ساتھ ساتھ کام تو کر رہے تھے لیکن "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" والا حال تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن چونکہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارہ ہونا مشکل تھا اس لیے مجبوراً چاپلوسی اور خوشامد سے کام لیتے تھے۔ خلیفہ کو ملّاجی سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ انھیں اوّل درجے کا مکّار، فریبی اور جھوٹا خیال کرتا تھا۔ ملّاجی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مکتب کی کل آمدنی کا چوتھا حصہ خلیفہ کو بطور تنخواہ دیا کریں گے لیکن آمدنی کا بہت سا حصہ خلیفہ کو بتائے بغیر خود ہی ہضم کر جایا کرتے تھے۔ بچوں کے والدین اکثر ملّاجی کے لئے عمدہ کھانے تیار کر کے بھیجا کرتے تھے۔ ملّاجی انھیں اکیلے ہی اکیلے چٹ کر جاتے اور غریب خلیفہ کو ان کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے تھے۔

ادھر ملّاجی کا یہ حال تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ خلیفہ کو کچا ہی چبا ڈالتے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب دوپہر کو دونوں کھانا کھانے بیٹھتے تو خلیفہ ملّاجی کے اندھے پن سے فائدہ اٹھا کر روٹیاں چُرا لیتا اور انھیں کسی دوسرے وقت مزے سے کھاتا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مزیدار یا نفیس چیز دسترخوان پر ہوتی تو اس کا بھی بہت سا حصہ خود ہی ہتھیا لیتا۔ ملّاجی نے اسے رکھا تو اس لئے تھا کہ وہ بچوں کی نگرانی کرے اور کھیل کود میں نہ پڑنے دے لیکن اس نے خود مکتب میں پڑھنے والے بعض بڑی عمر کے لڑکوں سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا اور انھیں پڑھائی میں مشغول رکھنے کی بجائے ان کے ساتھ گپیں مارتا رہتا تھا۔

ملّاجی کی بے ایمانی اور ان کے نائب کی حرام خوری کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج تھے۔ اگر خلیفہ مکتب چھوڑ کر چلا جاتا تو گلیوں میں جوتیاں چٹخانے کے سوا اس کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا اور اگر ملّاجی خلیفہ کو جواب دے دیتے تو مکتب کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام کون کرتا؟ کیونکہ یہ کام اکیلے ملّاجی کے بس کا نہ تھا۔

ہمارے دوست نے جب قرآن کریم حفظ کر لیا تو ملّاجی نے اسے خلیفہ کے سپرد کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ وہ روزانہ چھ پارے خلیفہ کو سنایا کرے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں بچے نے خلیفہ کو سبق سنانا شروع کر دیا لیکن یہ سلسلہ تین روز سے زیادہ نہ چل سکا۔ بچے کو پہلے ہی روز سناتے سناتے جمائیاں آنے لگیں۔ خلیفہ دو روز تک سن کر اکتا گیا۔ تیسرے روز دونوں کا بھید ایک دوسرے پر ظاہر ہو گیا تو

جو نئے روز یہ قرار پایا کہ بچہ خلیفہ کے سامنے دوزانو ہو کر خود ہی چپ چاپ آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرے اور اگر کہیں بھول جائے تو خلیفہ سے پوچھ لیا کرے۔ چنانچہ اب بچے کا روزانہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ صبح آکر خلیفہ کو سلام کرتا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر ہونٹوں کو اس طرح حرکت دینے لگتا جیسے قرآن کریم پڑھ رہا ہو۔ خلیفہ کو دکھانے کے لئے کبھی کبھی اس سے کوئی لفظ بھی پوچھ لیتا۔ ملّاجی ظہر کی نماز سے پہلے مکتب میں آیا کرتے تھے۔ آتے ہی وہ بچے کو بلاتے اور پوچھتے:۔

"تم نے آج کا سبق پڑھ لیا؟"

بچہ جواب دیتا "جی ہاں"

"کہاں سے کہاں تک پڑھا ہے؟" ملّاجی دوبارہ استفسار کرتے۔

بچہ بتا دیتا کہ فلاں سورۃ سے فلاں سورۃ تک پڑھا ہے اور ملّاجی مطمئن ہو کر دوسرے لڑکوں کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔

مکتب میں رہ کر اور ملّاجی کے عادات و خصائل دیکھ کر خلیفہ نے بھی ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے تھے پہلے تو اس نے بچے کا سبق سننے کے جھنجھٹ سے نجات حاصل کی، لیکن اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے لڑکے کی حالت کا اندازہ لگا کر اس سے رشوت وصول کرنے کی ٹھانی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے اس قسم کی دھمکیاں دینے لگا کہ میں ملّاجی سے تمہاری شکایت کر دوں گا اور کہوں گا کہ تمہیں فلاں سورۃ یاد نہیں رہی اور قرآن کریم کا فلاں حصہ تم بالکل بھول گئے ہو۔ ادھر حال یہ تھا کہ نگرانی ختم ہونے کی وجہ سے لڑکے کو ایک سورۃ تو کیا پورا قرآن کریم ہی بھول گیا تھا اور اس کا کوئی حصہ بھی اسے پوری طرح یاد نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی دن ملّاجی نے اس کا امتحان لے لیا تو پھر اس کی خیر نہ ہوگی۔ اس ڈر کے باعث وہ ہر طرح خلیفہ کی خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اس کا منہ بند رکھنے کے لئے اسے مختلف قسم کی سوغاتیں لا کر دیا کرتا تھا۔ کبھی روٹی لا دی۔ کبھی کھجوریں لا دیں۔ کبھی اپنے جیب خرچ کے پیسے اس کے حوالے کر دیئے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت بنانے کے لئے مصری کی ڈلیاں لا دیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو اسے دوپہر کا کھانا بھی اس ڈر سے خلیفہ کے حوالے کرنا پڑتا تھا کہ کہیں وہ ملّاجی سے اس کی شکایت نہ جڑ دے۔ لیکن جو چیز مقدر میں ہو وہ تو بہر حال ہو کر ہی رہتی ہے۔

جمعرات کا دن تھا۔ ہمارے دوست نے حسب معمول خلیفہ کے سامنے بیٹھ کر سبق "یاد" کیا اور ملّاجی کو بھی یہ اطمینان دلا کر کہ اس نے آج کا سبق دہرا لیا ہے۔ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ چھٹی ہونے پر سیدھا اپنے گھر جانے کی بجائے وہ دوستوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے جامع مسجد میں چلا گیا۔ وہ اکثر جامع مسجد چلا جاتا اور وہاں منارہ پر چڑھ کر دور دور کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی جوتیاں مسجد کے ایک کونے میں رکھ کر منارہ پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیچے اترا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب جوتیاں دیکھیں تو غائب۔ مسجد کا کونا کونا چھان مارا مگر کہیں ہوتیں تو ملتیں۔ مجبوراً ننگے پیر گھر واپس آنا پڑا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باپ نے پوچھا:۔

"جوتیاں کہاں ہیں؟"

اس نے اس خیال سے کہ اگر سچ بولوں گا تو پٹوں گا کہہ دیا:۔

"مکتب میں بھول آیا؟"

خیر بات آئی گئی ہوئی اور بچہ اپنے بہن بھائیوں کے پاس جا کر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اس کے باپ نے آواز دی۔ وہ کھیل کود چھوڑ کر باپ کے پاس پہنچا تو باپ نے پوچھا:۔

"آج تم نے مکتب میں کیا پڑھا؟"

لڑکے نے جواب دیا "آج میں نے آخری چھ پارے پڑھ کر قرآن کریم کا ایک دور ختم کر لیا۔"

باپ نے پوچھا "اس کا یہ مطلب ہے کہ اب تمہیں قرآن کریم پوری طرح حفظ ہو گیا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "جی ہاں"

باپ نے کہا۔

"سورۂ سبا سناؤ"

مگر وہاں ایک سورۂ سبا کیا لڑکا پورا قرآن کریم ہی بھول چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ باپ نے کہا:۔

"اگر سورۂ سبا یاد نہیں تو سورۂ فاطر پڑھو"

وہاں بھی یہی حال تھا۔

باپ نے کہا:۔

"تم تو کہتے تھے مجھے سارا قرآن ازبر یاد ہے۔ اچھا سورۂ یٰسین ہی سناؤ"

لڑکے نے چند آیات تو سنائیں مگر آگے چل کر پھر زبان رک گئی۔

باپ نے کہا:۔

"اچھا اب تو تم جاؤ۔ اس وقت میں تم کو کچھ نہیں کہتا۔ فی الحال تمہارے ملاجی سے نبٹ لوں گا۔"

چنانچہ لڑکا سر جھکائے باپ کے کمرے سے نکل کر اپنے حجرے میں آ کر مغموم و ملال ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کے باپ نے اسے پھر آواز دی۔ وہ اس کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ملاجی بھی تشریف فرما ہیں۔ بجائے اس کے کہ باپ کچھ پوچھتا ملاجی نے بچہ سے پوچھا:۔

"بتاؤ کیا آج تم نے مجھے قرآن کریم کے چھ پارے نہیں سنائے تھے؟"

لڑکا ملاجی کی صریح دروغ گوئی پر حیران و ششدر رہ گیا مگر کیا کرتا۔ باپ کے سامنے ملاجی کو کس طرح جھٹلاتا۔ کہنا ہی پڑا۔

"جی ہاں سنائے تھے"

ملاجی نے پوچھا "کیا تم نے مجھے کل سورۂ سبا نہیں سنائی تھی؟"

لڑکے کو اس کا اقرار بھی کرنا پڑا۔

"تو پھر آج تمہیں کیا ہوا کہ تم اپنے والد کو یہ سورۃ نہ سنا سکے؟"

لڑکا چپ۔

"اچھا اب میرے سامنے سورۂ سبا سناؤ"

مگر لڑکے کو یاد ہوتی تو باپ ہی کو کیوں نہ سناتا۔ خاموش کھڑا رہا۔

باپ نے کہا "اگر سورہ سبا یاد نہیں تو سورۂ سجدہ ہی سنا؟"

لڑکا وہ بھی نہ سنا سکا۔

یہ دیکھ کر باپ کا پارہ یکدم چڑھ گیا اور وہ ملاجی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

"یہ سب کچھ تمہارا قصور ہے۔ میں اسے تمہارے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ تم ہر طرح اس کی نگرانی کرو گے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ مکتب میں جا کر پڑھنے لکھنے کی بجائے کھیلتا کودتا پھرتا ہے۔ اگر تم اس کی صحیح نگرانی کرتے تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؛ آج یہ ننگے پاؤں گھر واپس آیا اور میرے پوچھنے پر کہا کہ میں اپنی جوتیاں مکتب میں بھول آیا ہوں۔ جب تم ایسی معمولی باتوں کی بھی نگرانی نہیں کر سکتے تو پڑھائی کی نگرانی کیا خاک کرتے ہوگے؟"

ملاجی یہ سن کر بولے:۔

"میں خدائے پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور ہر طرح اس کی نگرانی کی۔ آج میں چھٹی ہونے سے ذرا پہلے مکتب سے اٹھ کر چلا آیا تھا ورنہ مجال تھی کہ آپ کا لڑکا ننگے پیر چلا آتا؛ پڑھائی کی طرف سے بھی میں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ میں روزانہ اس سے سبق سنتا ہوں اور جب تک یہ سبق یاد نہیں کر لیتا چھٹی نہیں دیتا"

باپ نے یہ سن کر جواب دیا:۔

"مجھے تو تمہاری ایک بات کا بھی یقین نہیں"

ملاجی کہنے لگے:۔

"اگر میں نے آپ سے آج تک ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق۔ میں آپ سے سچ سچ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے لڑکے سے چھ پارے روزانہ سنتا ہوں"

باپ نے کہا "اگر سنتے ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی"

ملاجی نے کہا:۔

"استغفر اللہ! آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کے ہاں سے مجھے ماہ بماہ جو تنخواہ ملتی ہے وہ مجھے اپنی بیوی سے زیادہ عزیز ہے حالانکہ میں ابھی سے قسم کھا چکا ہوں کہ اگر میں نے ایک بار بھی آپ سے جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق"

باپ نے جواب دیا:۔

"ملاجی ان باتوں کو چھوڑو۔ لڑکا کل سے تمہارے مکتب میں پڑھنے نہیں جائیگا"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ملاجی نے بھی بصد حسرت و یاس اپنے گھر کی راہ لی۔ صرف لڑکا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا۔ دنیا بھر کے خیالات اسکے ذہن سے نکل چکے تھے، اگر کوئی خیال رہ گیا تھا تو صرف یہ کہ ملاجی نے کتنی آسانی سے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔

باپ نے لڑکے کیلئے ایک اور حافظ صاحب کا انتظام کیا جو روزانہ گھر پر آ کر اس لڑکے کو قرآن کریم حفظ کراتے تھے۔ عصر کے وقت ملاجی کے مکتب سے اس کے سابق ہم سبق آجاتے اور وہ ان کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتا۔ چونکہ اسے پکا یقین تھا کہ اب اس کے

والد نے کبھی مکتب میں نہیں بھیجیں گے اس لئے ملاجی اور ان کے خلیفہ کے بارے میں اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور وہ ان کے مکر و فریب، حرص و طمع اور درندگی کی داستانیں بڑے مزے لے لے کر اپنے دوستوں کو سناتا تھا اور اس کے دوست بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

لیکن عیش و مسرت کا یہ زمانہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ملاجی زیادہ عرصہ تک صبر نہ کر سکے، کیونکہ ہمارے دوست کے مکتب سے اڑ جانے کی وجہ ان کی آمدنی میں بہت فرق آ گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے بعض آدمیوں کے توسط سے لڑکے کے والد سے التجائیں کرنی شروع کیں کہ وہ اپنے لڑکے کو دوبارہ مکتب میں بھیجنا شروع کر دیں۔ بالآخر والد کا دل بھی نرم پڑ گیا اور انھوں نے لڑکے کو دوبارہ ملاجی کے سپرد کر دیا۔ اگر معاملہ اسی حد تک رہتا تب بھی کوئی بات نہ تھی لیکن ہوا یہ کہ اس کے ہمجولیوں نے جو شام کو آ کر اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے، وہ تمام باتیں ملاجی اور خلیفہ کے سامنے دہرانی شروع کر دیں جو ہمارے دوست نے ان کی شان میں کہی تھیں۔ شرمندگی کے مارے اس کا بُرا حال ہوتا مگر کیا کر سکتا تھا۔

ان تمام واقعات سے ہمارے دوست کو اندازہ ہو گیا کہ بزرگوں کی باتوں اور قسموں پہ اعتبار کرنا انتہائی نادانی اور حماقت ہے اس کے والد نے قسم کھائی تھی کہ ان کا لڑکا آئندہ ہرگز مکتب میں پڑھنے نہ جائے گا لیکن چند ہی دنوں میں ان کی قسم ٹوٹ گئی اور لڑکا دوبارہ ملاجی کی جھڑکیاں اور گالیاں کھانے کے لئے مکتب میں آ گیا۔ تقدس مآب ملاجی نے فرمایا تھا کہ اگر انھوں نے زندگی میں ایک بار بھی جھوٹ بولا ہو تو ان کی بیوی پر تین طلاق، حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صریح جھوٹ ہے، اور نو اور اس کے ہمجولی جن کی اس کے ساتھ دانت کاٹی روٹی تھی اور جو ہر روز اس کے پاس آ کر ملاجی اور خلیفہ کو ملاحیاں سنایا کرتے تھے، اب انہی ملاجی اور خلیفہ سے اس کی چغلیاں کھایا کرتے اور اسے پٹتے دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے ہمدردی کی کچھ امید تھی لیکن اسے چڑانے میں وہ بھی دوسروں سے کم نہ تھے۔ ان حالات میں ہمارے دوست کے لئے صبر اور خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

(اطالوی)

سنہرا گدھا

مصنفہ :- لیوسیئس اپولیئس

مترجمہ :- شاہد احمد دہلوی

۲۔ پجاری خوجوں کے ساتھ

صبح ہوتے ہوتے ہم نے بہت سارا راستہ طے کر لیا اور جب سورج نکلا تو ہم ایک سنسان مقام پہ پہنچے۔ یہاں دیر تک خوجے صلاح مشورے کرتے رہے اور آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ مجھ پہ رحم بالکل نہ کیا جائے۔ انھوں نے دیوی کی مورتی میری پیٹھ پر سے اتار کر زمین پہ رکھ دی، پھر میری کاٹھی اتار دی، مجھے ایک درخت سے باندھا اور گول ہڈیوں کے دتے سے مجھے اتنا سوٹا کہ میں دم توڑنے لگا۔ ان میں سے ایک یہ چاہتا تھا کہ تبر سے میرے بکل اڑا دے کیونکہ میں نے اس کے تقدس کو رسوا کیا تھا۔ مجھ سے یوں انتقام لینا چاہتا تھا۔ مگر دوسرے پجاریوں نے اسے باز رکھا، اس وجہ سے نہیں کہ انھیں مجھ پر ترس آ رہا تھا بلکہ اس اندیشے سے کہ اگر مجھے مار ڈالا گیا تو پھر دیوی کی مورتی کس پر لادی جائے گی؟ لہٰذا انھوں نے پھر مجھے لادا اور اپنی تلواروں کے پھلوں سے مار مار کر ہنکالتے رہے یہاں تک کہ ہم اگلے بڑے شہر میں جا پہنچے۔ وہاں کے ایک بڑے شہری نے، جو بڑا مذہبی خیال کا آدمی تھا، ہمارے جھانجھ، تاشوں، اور نرسنگھے کی فریجی غمناک موسیقی کا شور سنا۔ وہ ہمارا استقبال کرنے کے لئے باہر نکل آیا اور اس نے دیوی کی اقامت کے لئے بڑی عقیدت سے اپنا مسکن پیش کیا۔ دیوی کے ساتھ ہم سب گھر میں داخل ہوئے۔ دیوی کو خوش کرنے کے لئے ہر ممکن احترام کا مظاہرہ کیا گیا اور اچھی سے اچھی بھینٹ چڑھائی گئی۔ مگر یہی وہ جگہ تھی جہاں میں مرتے مرتے بچا۔

ہوا یہ کہ ہمارے میزبان کے ایک دیہاتی کرایہ دار نے ایک بارہ سنگھا شکار کیا۔ اس کی ایک موٹی تازی ران تحفتہً ہمارے میزبان کو بھیجی۔ ہیپیس شن رکابدار نے مطبخ کے دروازے میں بے پروائی سے اسے اتنا نیچا لٹکا دیا کہ ایک کتا گھومتا پھرتا آیا اور ران کھینچ کر لے بھاگا۔ جب ہیپیس شن نے دیکھا کہ ران غائب ہو گئی تو اس نے بری طرح رونا شروع کر دیا، کیونکہ سارا الزام اسی پر آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اور جب آقا کھانا طلب کرے گا تو کیا گزرے گی؟ مارے خوف کے اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اس نے اپنے چھوٹے بچے کو اپنے پاس بلایا، اسے خوب پیار کیا اور بڑی دل ریشی سے اسے رخصت کیا۔ اسکے بعد ایک رسی لی اور پھانسی لگا کر خودکشی کرنے چل پڑا۔ اس کی بیوی کو اس سے بہت محبت تھی، اسے اس بھیانک ارادے کی اطلاع اتفاق سے فوراً مل گئی۔ اس نے رکابدار کے ہاتھ سے رسی چھین لی اور بولی "میرے پیارے ہیپیس شن، کیا تم بالکل ہی اندھے ہو گئے؟ اس واقعہ نے اس قدر الٹا دیا کہ وہ دروازہ بھی تمہیں نہیں سوجھتا جو غیب سے تمہارے بچ نکلنے کے لئے کھل گیا ہے؟ اس خوفناک واقعہ کے علم کے بعد اگر تم میں کچھ بھی عقل باقی رہ

گئی ہے تو میری بات مانو۔ بچاریوں کا گدھا تو تم نے دیکھا ہے نا، جسے آج گھر ہی لایا گیا ہے؟ اسے کسی ویرانے میں لے جا کر حلال کر ڈالو۔ پھر اس کی ایک ران کاٹ کر ویسی ہی بنالو جیسی جاتی رہی ہے۔ اسے پکا پکا کر خوب گلالو۔ مزیدار مسالے ڈال کر اس کی بو مار دو اور اسے شکار کا گوشت کہہ کر آقا کی میز پر لگا دو۔"

بد معاش رکابدار مجھے مار کر اپنی جان بچانے کی تدبیر سن کر مارے خوشی کے کھل گیا۔ اپنی جورو کو اس نے دنیا بھر کی سب سے قابل عورت قرار دیا اور لگا اپنی چھریاں تیز کرنے۔

دست نکالا جا رہا تھا۔ میں بیکار کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، جان بچانے کی ترکیب مجھے کوئی سوچنی تھی۔ مجھے اس چھری سے بچنا تھا جو میرے حلقوم سے آلگی تھی۔ میں نے فوراً اپنی رسی تڑائی اور سرپٹ بھاگا، اور بھاگنے میں دولتیاں جھاڑنا نہیں بھولا۔ میں پہلے برآمدے میں سے اڑا چلا گیا اور لمحہ بھر بھی توقف کئے بغیر کمرۂ طعام میں گھس گیا جہاں صاحب خانہ بچاریوں کے ساتھ قربانی کا گوشت کھا رہا تھا۔ میں نے ان کے بہت سے برتن گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور چند میزوں کے بھی پرخچے اڑا دیئے۔ میرے یوں بدتمیزی سے گھس آنے اور نقصان کرنے پر وہ بہت برہم ہوا۔ ایک غلام سے بولا "اس اچھل کود کرنے والے بیہودہ جانور کو لے جاؤ اور ایسی جگہ بند کرو کہ اس کے شتر غمزوں سے میرے مہمانوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔" اپنی چالاکی کی بدولت چھری سے گلو خلاصی پانے پر میں خوش تھا کہ چلو اب مجھے میرے اصطبل میں حفاظت سے بند کر دیا جائے گا۔

لیکن اگر بدنصیبی شامل حال ہو تو کوئی کتنا ہی دانشمند کیوں نہ ہو ہرگز پنپ نہیں سکتا۔ جو کچھ اس کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے اسے نہ تو بدلا جا سکتا ہے اور نہ ٹالا جا سکتا ہے۔ میری جس چال نے مجھے فوری موت سے بچایا تھا۔ اسی نے مجھے ایک اور مہلک خطرے میں ڈال دیا۔ چنانچہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گھر کا ایک اور غلام بدحواس ہو کر بھاگا ہوا کمرۂ طعام میں یہ خبر لے کر پہنچا کہ گلی میں کھلنے والے پیچھے کے دروازے سے ایک پاگل کتا ابھی ابھی گھر میں گھسا ہے۔ پہلے تو اس نے پالتو شکاری کتوں کو جھنجھوڑا، پھر اصطبل میں گھس کر گھوڑوں کو کاٹنے لگا، اور آخر میں غلاموں پر بھی جھپٹا۔ اس نے داروغۂ اصطبل مرطولوس، ہیپیسی شن، کابدار ہیسپایوس، خادم کر کاٹ کھایا۔ طبیب اپولینیوس اور کئی ان خدام خانہ کو بھی کاٹا جنھوں نے اسے گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ جن جانوروں کو اس نے کاٹا ہے اُن میں سے بعض میں باؤلے پن کی علامات بھی دکھائی دینے لگی ہیں۔

یہ خبر سن کر سب گھبرا گئے اور میرے وحشت ناک طرز عمل سے انھیں گمان ہوا کہ مجھ میں بھی زہر سرایت کر گیا ہے جس کے ہاتھ جو ہتھیار لگا لے کر میرے مالکوں نے دیوانہ وار چیخنا شروع کر دیا "ارے مار ڈالو اسے، مار ڈالو۔" حالانکہ درحقیقت میں نہیں، وہ پاگل تھے۔ غلاموں نے کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے بھالا اور کسی کے تبر تھما دیا تھا اگر میں خطرے کی بو پا کر اپنے اصطبل سے بگٹٹ بھاگ کر اپنے آقاؤں کے آراستہ کمرۂ خواب میں نہ گھس جاتا تو وہ ضرور میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے پکڑنے کے لئے کمرۂ خواب میں داخل ہوتے انھیں ڈر لگا، اس لئے انھوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور رات بھر کے لئے ایک پہرہ دار وہاں کھڑا کر دیا۔ انھیں یقین تھا کہ جب صبح ہو گی تو مجھ سے انھیں لڑنا نہیں پڑے گا، کیونکہ باؤلے کتے کے زہر سے میں مر چکا ہوں گا۔ ہاں تو اب میں یہاں بند تھا، اکیلا اور آزاد کہ جو جی میں آئے کروں۔ قسمت کے اس عطیہ کا میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں ایک بستر پر دراز ہو گیا اور انسانوں کی طرح خوب جی بھر کر سو رہا، کیونکہ میں ایک مدت سے اس نعمت سے محروم تھا۔

جب میں جاگا تو دن خوب چڑھ چکا تھا۔ نیند کی راحت حاصل کرنے کے بعد میں تازہ دم ہو کر اچھل پڑا۔ باہر میرے مالک میرے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "مگر میرے پیارے، وہ بچارہ جانور اس وقت تک پاگل کیسے رہ سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اب تک زہر خارج ہو چکا ہو گا اور جانور پھر بالکل ٹھیک ہو گیا ہو گا۔"

"ہاں جانِ من، اب میں تم سے اختلافِ رائے نہیں کر سکتا۔"

انھوں نے طے کیا کہ دروازے کی ایک درز میں سے مجھے دیکھیں، اور انھوں نے دیکھا کہ میں بظاہر پہلے کی طرح بھلا چنگا آرام سے کھڑا ہوا ہوں۔ انھوں نے ہمت کر کے ارادہ کیا کہ دروازہ کھول کر مجھے زیادہ قریب سے دیکھیں۔ ان میں ایک نے جسے شاید غیب سے مجھے نجات دلانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں پاگل ہوں یا نہیں، ایک سیدھی سی تجویز پیش کی: میرے آگے تازہ پانی کا بھرا ہوا تسلہ رکھا جائے۔ اگر میں حسبِ معمول بے جھجک پانی پی جاؤں تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہو گا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میں ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مجھ پر ابھی باؤلا پن سوار ہے۔ اس نے کہا کہ تمام مستند طبی کتابوں میں جانچنے کی یہی ترکیب بتائی گئی ہے اور اس نے خود عملاً بھی یہی مشاہدہ کیا تھا۔

سب نے یہ بات مان لی اور قریب کے فوارے سے ایک بڑا سا تسلہ شفاف پانی کا بھر کر میرے آگے لا رکھا مگر میں اب بھی اپنے ہتھیاروں کو مضبوطی سے گرفت میں لئے رہا۔ مجھے بڑے زور کی پیاس لگ رہی تھی، سیدھا تسلے کی طرف گیا اور اپنی تھوتھنی پانی میں ڈال کر اس کا ایک ایک قطرہ پی گیا۔ ایسا کرنا کئی لحاظ سے میرے حق میں اچھا ثابت ہوا پھر میں چپکا کھڑا ہو گیا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مجھے تھپکی دیتے رہے، میرے کانوں کو سہلاتے رہے، میری رسی پکڑ کر مجھے چلایا پھرایا اور میرے ساتھ جو [illegible] کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ یہ سب ایک غلط فہمی تھی، اور میں ایک شریف جانور ہوں اور میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔

دوسرے دن، ان دونوں بڑے اندیشوں کے باوجود، مجھ پر دیوی اور دیوی کا سازوسامان لادا گیا، اور جھانجھوں اور تاشوں کے شور کے ساتھ حسبِ معمول خیرات جمع کرنے کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ ہم چند جھونپڑیوں اور فوجی اڈوں میں سے گزر کر ایک دیہات میں پہنچے جس کے باشندوں نے بتایا کہ یہ بستی ایک مشہور قدیم شہر کے کھنڈروں پر بسائی گئی ہے۔ جو پہلی سرائے ہمیں ملی ہم وہیں ٹھہر گئے۔ یہاں ہم نے ایک دیہاتی کی مزیدار کہانی سنی۔ اس بچارے کو اس کی بیوی نے بڑی بری طرح دھوکہ دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی یہ کہانی سنیں۔ ہاں تو۔۔

اس شخص کی گزران لوہار کے چھوٹے موٹے کام سے ہوتی تھی۔ اس کی بیوی کی بھی کوئی ملکیت نہیں تھی لیکن اس کی جنسی بھوک بہت مشہور تھی۔ ایک دن صبح سویرے لوہار جب اپنے کام پر سدھارا تو اس کی بیوی کا ایک منچلا عاشق فوراً ہی گھر میں آ دھمکا اور بستر ہی میں اس سے جا چمٹا۔ لوہار کو کسی قسم کا شبہ تو تھا ہی نہیں، اتفاق سے اتنے جلدی لوٹ آیا کہ یہ دونوں اپنی گرمی ہم سری کر رہے تھے۔ دروازہ اندر سے مقفل پا کر خوش ہوا اور سراہا کر بولا "میری بیوی کس قدر پارسا ہے کہ کسی کے اکیلے گھر میں گھس آنے کے اندیشے سے اس درجہ احتیاط برتتی ہے!" اس کے بعد اپنے دستور کے مطابق اس نے کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر سیٹی بجائی تا کہ بیوی کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ عورت بڑی ہوشیار تھی، اپنے عاشق کی آغوشِ شوق سے نکل کر جھٹ اسے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے بڑے سے ٹب میں چھپا دیا۔ ٹب میلا اور گلا ہوا تھا لیکن تھا بالکل خالی۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور

سنانا شروع کر دیا " ارے موئے احدی، نٹھلا بیٹھا کر چلا آیا بغلوں میں ہاتھ دیئے، اور جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں! آخر کب کام [illegible] کرے گا اور کب روٹی کما کر لائے گا! ارے میرا کیا حشر ہوگا؟ صبح سے شام تک چرخہ کاتتی ہوں، میری انگلیوں کی ہڈیاں [illegible] جاتی ہیں تب کہیں اتنا پیدا ہوتا ہے کہ دیئے میں تیل پڑ جائے۔ اور اس کمبخت بل میں رہنا پڑتا ہے۔ کاش میں اپنی سہیلی [illegible] وہ دن بھر کھاتی پیتی رہتی ہے اور جی چاہے جتنے عاشقوں سے دل بہلاتی رہتی ہے۔"

لوہار کر یہ باتیں سن کر صدمہ ہوا۔ بولا " ارے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے کہ ٹھیکہ دار کو آج [illegible] عدالت کی پیشی پر جانا پڑ گیا اور اس نے ہمیں کل پر ٹال دیا؟ یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں نے آج کے کھانے کا فکر نہیں کیا۔ وہ [illegible] پرانا ٹب دیکھتی ہو نا، وہ جو بہت سی جگہ گھیرے ہوئے ہے؟ میں نے ابھی ابھی ایک شخص سے اس کا پانچ درہم میں سودا کر [illegible] بس وہ آکر ابھی رقم دے جائے گا اور ٹب اٹھا کر لے جائے گا۔ آؤ ذرا ہاتھ تو لگواؤ، اس ٹب کو گاہک کیلئے باہر پہنچا دیں۔"

عورت ذرا نہ گھبرائی اور اسے ایک ترکیب سوجھی کہ اگر لوہار کو ذرا بھی شبہ ہو تو دور ہو جائے۔ ایک زور کا [illegible] لگا کر بولی " مجھے بھی کیا عجیب شوہر ملا ہے، کیا کہنا! اور سودا کرنے میں تو جواب نہیں ہے ان کا۔ گھر سے باہر جاتے ہیں [illegible] جناب ہمارا ٹب پانچ درہم میں بیچ آتے ہیں۔ میں بچاری عورت ہوں، لیکن گھر سے باہر قدم تک نہ نکالا اور ٹب کو سات در[illegible] میں بیچ بھی چکی۔"

لوہار کی باچھیں کھل گئیں، بولا " بھلا وہ کون تھا جو تمہیں اتنی قیمت دے گیا؟"

بیوی بولی " ارے احمق چپ! وہ ابھی ٹب اندر ہی ہے۔ دیکھ رہا ہے غور سے کہ مضبوط بھی ہے یا نہیں۔"

عاشق نے اس کے اشارے کو فوراً پا لیا۔ اس نے سر ابھار کر کہا " دیکھو بی بی جی، تمہارا ٹب بہت پرانا ہے اور بلیسیدہ [illegible] سے کچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر لوہار کی طرف پلٹ کر بولا " جناب میں آپ کو نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں، مگر آپ مجھے ایک موم بتی لا دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔ مجھے اسے اندر سے کھرچ کر دیکھنا ہے کہ یہ چیز میرے کام کی ہے یا نہیں۔ میرے پاس فالتو روپیہ نہیں ہے کہ پھینکتا پھروں۔ روپیہ آج کل درختوں پر تو نہیں اگتا، ہے نا؟"

چنانچہ سادہ لوح لوہار نے بلا تاخیر ایک موم بتی جلائی اور بولا " نہیں نہیں دوست، تم اس زحمت میں مت پڑو۔ تم ذرا ادھر آکر کھڑے ہو جاؤ۔ میں اس ٹب کو خوب صاف کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی صدری اتاری، موم بتی لی، ٹب کو اٹھا کر اوندھایا، اور اس کے اندر گھس کر صفائی کے کام میں لگ گیا۔

بیقرار عاشق نے فوراً لوہار کی بیوی کو اٹھا کر اوندھے ٹب پر اس کے شوہر کے سر کے اوپر ڈال لیا اور شوہر کا کام انجام دینے لگا۔ اس موقع سے وہ بہت لطف اندوز ہوئی۔ ٹب کے کنارے سے اپنا سر لٹکا کر جگہ جگہ اپنی انگلی رکھتی جاتی اور ہدایتیں دیتی جاتی " یہاں، پیارے، یہاں! .... اور اب یہاں ....." یہاں تک کہ دونوں کاموں سے اس نے بہ اطمینان فراغت پائی [illegible] لوہار کو اس کے سات درہم مل گئے، لیکن اسے ٹب اپنی کمر پر لاد کر عاشق کے گھر پہنچانا پڑا۔

ہانوی)

ڈان کوئکزوٹ

معنفہ :۔ سروینٹیز

مترجمہ :۔ شاہد احمد دہلوی

حصۂ دوئم۔ باب ۱۷۔ جس میں پیش کیا گیا ہے وہ نقطۂ آخریں و بلند ترین جس پر
ڈان کوئکزوٹ کی ہمتِ ناشنیدہ کبھی پہنچی یا کبھی پہنچ سکتی
تھی۔ ببر شیروں کی مہم کا انجامِ خوش۔

کسی تازہ مہم کے پیش آنے کا کوئی احتمال تو تھا ہی نہیں۔ لہٰذا سانچو، جیسا کہ تاریخ احتیاط سے بتاتی ہے، بھیڑوں کے گلہ بانوں سے بڑے اطمینان کے ساتھ دہی خرید رہا تھا۔ آقا نے جو اسے اچانک جلدی بلا بھیجا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دہی کا کیا کرے، اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اسے لے کیسے جائے۔ لہٰذا اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اس نے دہی اپنی خود میں ڈال لیا، اور اس عمدہ ترکیب سے مطمئن ہو کر اپنے آقا سے احکام پانے کے لئے جلدی جلدی چل پڑا۔ سورما نے کہا "سانچو، مجھے میری خود دو۔ کیونکہ یا تو ہمیں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے یا وہ جو مجھے سامنے دکھائی دے رہا ہے کوئی ایسا مقابلہ ہے جس کے لئے مجھے ہتھیاروں سے کام بنتا ہوگا۔ وہ تماشائی جو سواری کا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بات سن کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایک گاڑی ان کی طرف چلی آ رہی تھی جس میں دو تین چھوٹی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے سوچا کہ غالباً اس گاڑی میں بادشاہ کا کچھ خزانہ جا رہا ہے۔ اس نے اپنا قیاس ڈان کوئکزوٹ پر ظاہر کیا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ اس کے تصور پر کارنامے چھائے ہوئے تھے، صرف اتنا جواب دیا "جسے پہلے معلوم ہو جائے وہ پہلے ہتھیار سج لے۔ پوری تیاری آدھی فتح ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں، تجربہ سے، میرے دو طرح کے دشمن ہیں، دکھائی دینے والے اور نہ دکھائی دینے والے۔ اور میں نہیں جانتا کب، کس طرف سے، کس وقت، اور کس شکل میں وہ مجھ پر حملہ کر دیں۔" اس سے پہلے کہ سانچو دہی پھینک دیتا۔ سورما نے اس کے ہاتھ سے خود لے کر بغیر دیکھے بھالے جلدی سے اپنے سر پر رکھ لی۔ دہی پر جو دباؤ پڑا تو اس کا پانی سورما کے چہرے اور ڈاڑھی پر بہہ بہہ کر آنے لگا۔ وہ بہت گھبرایا۔ بولا "اس کا کیا مطلب ہے سانچو؟ میرا خیال ہے کہ میری کھوپڑی ملائم ہو رہی ہے، یا میرا بھیجا پگھل رہا ہے، یا میری چوٹی کا پسینہ ایڑی ہیں، آ رہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یہ نتیجہ خوف کا نہیں ہے، گو مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ یہ مہم بڑی خوفناک ہوگی۔ کچھ دینا مجھے اسے پونچھنے کے لئے۔ پسینے کی دھاریں تو مجھے اندھا کئے دے رہی ہیں۔" سانچو نے کچھ نہیں کہا، ایک کپڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آقا پر بھید نہیں کھلا۔ ڈان کوئکزوٹ نے اپنا چہرہ صاف

کیا اور خود کو اتار کر دیکھا کہ ایسی کیا چیز ہے جو اس قدر ٹھنڈی سر کو لگ رہی ہے۔ سفید ڈلے ڈلے سے دیکھ کر اس نے انھیں اپنی ناک سے لگا کر سونگھا، اور حیران ہو کر بولا "میری روح میں سمائی ہوئی خاتون کی قسم! ابے بدتمیز کمینے نفرے، یہ تو دہی ہے جو تو نے اس میں ڈال دکھا ہے!" سانچو نے بڑی طمانیت اور چالاکی سے جواب دیا "جناب عالی، اگر یہ دہی ہے تو مجھے دیجئے، میں اسے کھا لوں۔ نہیں، اب مجھے خیال آیا، میرے بدلے شیطان اسے کھائے کیونکہ اسی نے خود میں ڈالا ہوگا۔ کبھی ہو سکتا ہے یہ کہ میں عالی جناب کی خود کو آلودہ کروں؟ یا خدا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے پیچھے بھی جادوگر لگے ہیں جو مجھے اس لئے تنگ کر رہے ہیں کہ میں حضور کا پروردہ اور ساتھی ہوں۔ انھوں نے یہ گندگی اس لئے ڈالی ہے کہ آپ کو مجھ پر غصہ دلائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب کے ان کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔ مجھے اپنے آقا کی صحیح قوتِ فیصلہ پر بھروسا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ میرے پاس نہ تو دہی ہے، نہ ملائی، اور نہ ایسی کوئی اور چیز۔ اور اگر ایسی کوئی چیز ہوتی تو میں اسے فوراً اپنے پیٹ میں ڈال لیتا نہ کہ جناب والا کی خود میں۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "ہاں، اس میں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے۔" وہ شخص جو سارا ماجرہ دیکھ رہا تھا یہ سن کر حیران ہوا۔ اور جو کچھ آگے چل کر ہوا، اس سے اسے بھی حیرانی ہوئی۔ ڈان کوئکزوٹ نے سر، منہ، ڈاڑھی اور خود کو صاف کرنے کے بعد خود پھر پہن لی، اور اپنی رکابوں میں پاؤں خوب جما کر تلوار کھسکائی اور نیزہ تول کر نعرہ لگایا "ہاں اب میں تیار ہوں شیطان تک سے مقابلہ کرنے کے لئے۔"

تھوڑی دیر میں جھنڈیاں لگی گاڑی ان کے قریب آپہنچی۔ اسے گاڑی بان ایک خچر پر بیٹھا چلا رہا تھا، اور گاڑی کے اگلے حصے میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈان کوئکزوٹ عین ان کے سامنے جا کر ڈٹ گیا اور بولا "کہاں جا رہے ہو تم، اے بھائیو؟ یہ کیسی گاڑی ہے! اس میں کیا ہے؟ اور یہ جھنڈیاں کیسی لگی ہیں؟" گاڑی بان بولا "یہ گاڑی میری ہے، اور اس میں دو خوفناک شیر ہیں جنھیں اوران کے جنرل نے بادشاہ سلامت کے لئے بطور تحفہ بھیجا ہے۔ جھنڈیاں ہمارے آقا بادشاہ سلامت کی ہیں اور اور یہ بتانے کے لئے لگائی گئی ہیں کہ گاڑی میں جو کچھ ہے ان کا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے تحکم سے پوچھا "کیا شیر بڑے ہیں؟" گاڑی کے اگلے رخ جو شخص بیٹھا ہوا تھا بولا "افریقہ سے ہسپانیہ تک ان سے بڑے شیر کبھی نہیں آتے۔ میں ان کا محافظ ہوں۔ میرے پاس عمر بھر بہت سے شیر رہے مگر اتنے بڑے کبھی نہیں رہے۔ ان میں ایک نر ہے اور ایک مادہ۔ نر پہلے پنجرے میں ہے اور پرلے میں مادہ ہے۔ آج صبح انھیں کھانا نہیں ملا، اس وقت بہت بھوکے ہیں۔ اس لئے جناب راستہ چھوڑ دیجئے کیونکہ ہمیں جلدی وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں انھیں کھانا دینا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا "ہائیں! شیر اور میرے آگے چوں کرے! ابے میرے آگے یہ ذرا ذرا سے جانور کیا حقیقت رکھتے ہیں؟ اور دن کو، وہ بھی اس وقت! اس متبرک سورج کی قسم! وہ جنھوں نے انھیں یہاں بھیجا ہے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں شیروں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ نیچے اتر آؤ، دیانتدار دوستو۔ اور تم چونکہ ان کے محافظ ہو اس لئے تم ان کے پنجرے کھول دو اور اپنے صحرا کے وحشی درندوں کو باہر نکال دو۔ باوجود ان جادوگروں کے جنھوں نے انھیں یہاں بھیجا ہے۔ میں اسی کھیت میں انھیں بتادوں گا کہ ڈان کوئکزوٹ ساکن منچا کون ہے۔" تماشائی نے اپنے دل میں کہا "ہمارے اچھے سورما نے اب ہمیں اپنا نمونہ تو دکھا ہی دیا۔ یقیناً دہی نے اس کی کھوپری پلپلی کر دی ہے۔ اور اس کا بھیجا نرم پڑ گیا ہے۔" سانچو نے تماشائی کے قریب آکر کہا "جناب، خدا کے لئے شیروں سے الجھنے سے میرے آقا کو باز رکھئے۔ اگر یہ الجھ گئے تو شیر ہم سب کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔" تماشائی نے پوچھا "تو کیا تمہارا آقا اس قدر پاگل ہے کہ

پہنچا اس قدر خوفناک جانوروں پر حملہ کر دے گا؟" سانچو نے کہا "پاگل نہیں ہیں، نڈر ہیں۔" تماشائی نے کہا "میں انھیں روک دوں گا۔" یہ کہہ کر ڈان کوئکزوٹ کی طرف بڑھا جو محافظ سے اصرار کر رہا تھا کہ پنجروں کے دروازے کھول دے۔ تماشائی نے کہا "صاحب سورماؤں کو ان خطرناک کاموں میں دخل دینا چاہئے جن میں کامیابی کی کچھ امید دکھائی دیتی ہو۔ ایسے کاموں میں نہیں پڑنا چاہئے جن میں صریح ناکامی دکھائی دیتی ہو۔ کیونکہ وہ شجاعت جو تہوّر سے نزدیک ہو جاتی ہے۔ اس میں ہمت سے زیادہ دیوانگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، جناب سورما صاحب، یہ شیر آپ پر حملہ کرنے نہیں آئے ہیں۔ یہ تو بادشاہ سلامت کو تحفتہً بھیجے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو روکنا یا ان کی راہ کھوٹی کرنی مناسب نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "پیارے جناب، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے اور اپنے فریب دے کر لگا لانے والے بٹیر اور پھانس لانے والے جانوروں کی خبرگیری کیجئے۔ جو جس کام میں لگا ہوا ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑیئے۔ یہ میرا معاملہ ہے اور میں دیکھوں گا کہ یہ عالی نسب شیر میرے مقابلہ پر آتے ہیں یا نہیں۔" پھر محافظ کی طرف پلٹ کر کہا "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، معزز عوام الناس صاحب، اگر آپ نے پنجروں کے دروازے فوراً نہیں کھولے تو میں آپ کو اس نیزے سے اس گاڑی میں جڑ دوں گا۔" گاڑی بان نے دیکھا کہ مسلح پاگل ٹالے نہیں ٹلتا تو بولا "اچھے جناب، مجھ پر ترس کھا کر اجازت دیجئے کہ شیروں کے کھلنے سے پہلے میں اپنے خچر کو خطرے سے باہر نکل جاؤں۔ میرے جانور اگر مارے گئے تو میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤں گا، کیونکہ اس گاڑی اور ان خچروں کے علاوہ میری کمائی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے بگڑ کر کہا "ارے او پھکڑ بدبخت، کھول دے اپنے خچر اور جو تیرے جی میں آئے کر۔ مگر تو جلد دیکھ لے گا کہ تو نے یہ زحمت ناحق کی۔"

گاڑی بان نے اتر کر جلدی جلدی اپنے خچروں کو کھولا۔ اس کے بعد محافظ نے بہ آواز بلند کہا "جتنے لوگ یہاں موجود ہیں، سب گواہ رہیں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اور زبردستی کئے جانے پر شیروں کے پنجرے کھول کر شیروں کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ صاحب جو کچھ کر رہے ہیں میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں، اور اعلان کرتا ہوں کہ ان جانوروں سے جو بھی نقصان ہو گا اس کے ذمہ دار یہ صاحب ہوں گے، اور میری تنخواہ اور دیگر واجبات کے بھی۔ صاحبان، براہِ مہربانی میرے دروازہ کھولنے سے پہلے آپ سب اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ رہا میں، تو مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ جانور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" تماشائی نے ایک بار پھر ڈان کوئکزوٹ کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اسے آگاہ کیا کہ اس حرکت سے وہ خدا کا قہر اپنے اوپر نازل کرا رہا ہے۔ ڈان کوئکزوٹ نے کہا "میں جانتا ہوں میں کیا کر رہا ہوں۔" تماشائی نے استدعا کی "آپ اچھی طرح غور فرما لیں یقیناً آپ کو دھوکا ہو رہا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "نہیں جناب، اگر آپ اس افتاد کو دیکھنا نہیں چاہتے جسے آپ سمجھتے ہیں کہ المناک ثابت ہو گا تو اپنی لنگڑی گھوڑی کو ایڑ دیجئے اور اپنی جان سلامت لے جائیے۔" سانچو نے بھی آنکھوں میں آنسو بھر کے اس سخت مرحلہ سے باز رہنے کی درخواست کی جس کے مقابلے میں ساری زندگی کے تمام مرحلے حلوے مانڈے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ "جناب والا، غور فرمائیے کہ اس میں کوئی افسوں نہیں ہے اور نہ کوئی سحر ہے، کیونکہ میں نے پنجرے کی درزوں میں سے سچ مچ کے شیر کا پنجہ دیکھا ہے اور اس کے پنجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شیر پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "تیرے خوف نے تجھے آدھی دنیا سے بھی بڑا دکھائیں گے۔ چلا جا سانچو، اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔ اگر میں مارا جاؤں تو اس پرانے معاہدے کو یاد رکھیو جو مجھ میں اور تجھ میں ہوا تھا۔ ڈلسینا کے پاس واپس چلا جائیو ——— بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" اس کے بعد کچھ ایسی باتیں بھی کہیں جن سے اس کے ارادے کا استحکام ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اب ساری دلیلیں بے اثر ثابت

ہوں گی۔ تماشائی چاہتا تھا کہ اسے زبردستی روک لے مگر مقابلے کے لئے نہ تو اس کے پاس ہتھیار تھے اور نہ زرہ۔ اور ایسے جلتے ہوئے پاگل سے اُلجھنا دانش مندی کے خلاف تھا جو محافظ کو اب شدت سے دھمکیاں دے رہا تھا۔ لہٰذا تماشائی نے اپنی گھوڑی کو ایڑ دکھائی، سانچو نے اپنے ابق اور محافظ نے اپنے خچروں کو ٹھکاری دی، اور شیروں کے کھلنے سے پہلے جتنی دور نکل سکتے تھے نکل گئے۔ سانچو اپنے آقا کی موت پر واویلا کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا شیروں کے پنجے اس کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ وہ اپنی بد نصیبی اور اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا جب اس نے آقا کی ملازمت دوبارہ قبول کی۔ لیکن اپنے آنسوؤں اور واویلا کے باوجود اپنے ابلق کو آگے بڑھاتا رہا تاکہ گاڑی سے دور تر ہوتا جائے۔ محافظ نے جب دیکھا کہ پناہ لینے والے دور نکل گئے تو اپنی دلیلیں اور گزارشیں پھر دہرائے لگا، مگر بے نتیجہ۔ ڈان کوئکزوٹ نے ان سب کا یہ جواب دیا کہ "میں نے تمام باتیں سُن لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو مزید زحمت نہ دو۔ میرا حکم مانو اور دروازہ فوراً کھول دو۔"

محافظ جب پہلے پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا تو ڈان کوئکزوٹ نے دل میں سوچا کہ گھوڑے پر سوار رہ کر مقابلہ ٹھیک رہے گا یا نہیں۔ بالآخر یہ طے کیا کہ اتر کر ہی مناسب ہوگا، کیونکہ ہو سکتا ہے روزی ننٹ شیروں کو دیکھ کر ڈر جائے۔ یہ سوچ کر وہ گھوڑے پر سے کود پڑا اور اپنی ڈھال سنبھال کر تلوار سونت لی۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور حیرت ناک دلیری اور بے خوفی سے شیر کے پنجرے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ پہلے بڑے خضوع و خشوع سے اپنے تئیں اللہ کو سونپا اور اس کے بعد اپنی محبوبہ ڈلسینیا سے امداد چاہی۔

یہاں تک پہنچ کر اس سچی تاریخ کا مصنف توصیف سے یوں پھٹ پڑتا ہے: "اے نہایت عالی ہمت، زبردست، اور ناقابل اظہار شجیع، ڈان کوئکزوٹ سا کن منچا! اے سورماؤں کے آئینے، اور اے بہادروں کے نمونے! تو جدید اور دوسرا ڈان مینوئل سا کن لی آن ہے ——— ہسپانوی سورماؤں کی سطوت و شان۔ وہ الفاظ کہاں سے لائے جو اس عظیم معرکہ کو بیان کر سکیں؟ آنے والی نسلوں کے لئے اسے کیسے قابل یقین بناؤں؟ وہ کونسی مدح و ستائش ہے، جو کتنی ہی مبالغہ آمیز مغالغہ کیوں نہ ہو، جو پہلے ہی تیرے حصے میں نہ آ چکی ہو؟ تو جو تن تنہا، قدم جمائے بے خوف دلیرانہ یوں کھڑا ہے کہ ہاتھ میں صرف ایک تلوار ہے، اور وہ بھی کچھ بہت تیز نہیں ہے، اور صرف ایک ڈھال اپنے بچاؤ کے لئے رکھتا ہے، جو نہ تو چوڑی ہے اور نہ چمکدار، تو یوں کھڑا منتظر ہے۔ اُن دو خوفناک ترین شیروں کے حملہ کرنے کا جن سے زیادہ خوفناک شیر کبھی بھی صحرائے لیبیا میں نہیں گونجے۔ تیرے اپنے بے مثل کارنامے ہی منچا کے بہادر کی ستائش کریں گے، اتنے بلند موضوع کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" یہاں پہنچ کر مصنف اپنی توصیف ختم کرتا ہے اور تاریخ کا سلسلہ پھر شروع کرتا ہے۔

محافظ نے دیکھا کہ ڈان کوئکزوٹ اپنی ضد پر اڑا کھڑا ہے اور اگر میں شیر کو نہیں کھولتا تو اس پُرغضب اور نڈر سورما کی ناراضگی سے نہیں بچ سکتا، لہٰذا پہلے پنجرے کا دروازہ پورا کھول دیا۔ درندہ لیٹا ہوا تھا اور غیر معمولی قد و قامت اور بھیانک شکل کا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلا کام اس جانور نے یہ کیا کہ پنجرے کا ایک چکر کاٹا اور ایک پنجا آگے بڑھا کر انگڑائی لی۔ پھر منہ پھاڑ کر بڑے آرام سے جمائی لی، اور اس کے بعد کوئی ہاتھ بھر کی زبان باہر نکالی اور چاٹ چاٹ کر اپنا منہ دھویا۔ اس سے فارغ ہو کر پنجرے میں سے اپنا سر باہر نکالا اور دہکتے انگاروں جیسی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ منظر ایسا تھا کہ خود بے باکی بھی خوف زدہ ہو

گشتی سورما کا کام یہ ہے کہ دنیا کے بعید ترین گوشوں کی چھان بین کرے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ بھول بھلیوں میں داخل ہو، ہر قدم پہ ناممکنات سے ٹکرائے، بے برگ و گیاہ صحراؤں میں گرمیوں کے سورج کی دہکتی کرنوں کو انگیز کرے، اور جاڑے کی برفیلی ہوا اور کہر کی شدت کو گوارہ کرے۔ شیر اسے خوف نہ دلا سکیں، عفریت اسے خائف نہ کر سکیں، اور نہ اژدہے اسے ڈرا سکیں۔ کیونکہ انھیں ڈھونڈ نکالنا، ان پر حملہ آور ہونا، اور ان سب کو شکست دینا اس کا مخصوص فرض ہے۔ لہٰذا جناب، چونکہ گشتی سورماؤں میں سے ایک ہونا میرے مقدر ہو چکا ہے۔ اس لئے میرے فرائض میں جو کچھ آتا ہے میں اس کی ادائیگی سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی صورت شیروں کے معاملے میں مجھے پیش آئی، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بڑی اندیشہ ناک بے باکی ہے۔ پر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ استقلال ایک ایسی خوبی ہے جو بزدلی اور بے باکی کے انتہائی سروں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہتر ہے کہ بہادر بزدلی کے سرے پر پہنچنے کے بدلے بے باکی کے سرے پر پہنچ جائے۔ کیونکہ جس طرح کنجوس کے مقابلے میں سخی کے لئے کشادہ دست بننا آسان ہے اسی طرح بزدل کے مقابلے میں کسی بے باک کا سچا بہادر بن جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ یقین کیجیے جناب ڈان ڈیئگو صاحب، ہر قسم کے دشوار معاملوں میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ بازی ایک پتہ کم سے ہارنے کے بدلے ایک پتہ بیش سے ہاری جائے۔ کیونکہ کم ہمت اور بزدل کہلوانے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بے باک کہلایا جائے۔

ڈان ڈیئگو نے جواب میں کہا "جناب ڈان کوئکزوٹ صاحب، آپ نے جو کچھ کہا اور کیا اس میں صحیح شعور کار فرما ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر گشتی سورمائی کے اصول و ضوابط کبھی محو ہو جائیں تو حضورِ والا کے سینے میں جائیں گے، کیونکہ یہی ان کی حقیقی کھتی اور کھاتہ ہے۔ لیکن چونکہ دیر ہو رہی ہے، ہمیں ذرا قدم بڑھا کر چلنا چاہئے۔ یوں ہم سب جلدی غریب خانہ پہنچ جائیں گے۔ آپ نے ابھی اتنی محنت کی ہے، جسم کی نہ سہی، ذہن کی تو ضرور تھی۔ میرے گھر پر تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔ سورما نے کہا "میں آپ کی پیشکش شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔" اس کے بعد ذرا رفتار بڑھا کر کوئی دو بجے دوپہر کو سب ڈان ڈیئگو کے گھر پہنچے، اور ڈان کوئکزوٹ نے صاحب خانہ کو "شہسواری کے سبز کوٹ والا سورما" موسوم کیا۔

(ترکی)

حکایاتِ مُلّا نصرالدّین ھوجا

آدھی رات کے وقت دو نقاب پوش ڈاکو ملا نصرالدین کے گھر میں داخل ہوئے۔ آہٹ پانے پر ملا سب کچھ تاڑ گیا اور اپنی جان بچانے کے لئے جلدی سے ایک الماری میں چھپ گیا۔ ڈاکو کمرے میں پہنچے تو سیدھے الماری کی طرف لپکے۔ پٹ کھولا تو ملا نصرالدین کو سامنے پایا۔ اُن میں سے ایک نے کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ایک بوڑھے آدمی کو نہیں مار سکتے؟ باہر آجاؤ، چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ملا نے جواب دیا "میں جان بچانے کے لئے نہیں چھپا ہوں۔ دراصل میں منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ یہ میرا نصیب کہ آپ ایسے شرفا نے یہاں آنے کی زحمت گوارا فرمائی لیکن گھر میں سوائے ویرانی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے منہ چھپائے کھڑا ہوں۔"

سات سو برس پہلے کا یہ واقعہ ترکی میں کئی موقعوں پر بیان کیا ہے اور اس دور میں اس کے لئے ایک خاص موقعہ وہ ہے جب اسمبلی کا کوئی امیدوار ووٹ کی خاطر کسی گھر میں قدم رکھتا ہے یا کسی جماعت کا کوئی رکن چندہ لینے کے لئے کسی دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ترکی کے ہر شعبہ زندگی میں ملا نصرالدین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمی، ادبی، فنی، تہذیبی، معاشرتی، تجارتی اور سیاسی مسائل جب اُلجھ کر اکتا دینے والی حد تک لاینحل سے نظر آتے ہیں تو اُس وقت ملا نصرالدین کی ایک شگفتہ مسکراہٹ ساری الجھن کو دور کر دیتی ہے۔ ملا نصرالدین کی پرانی باتیں آج بھی اپنی تروتازگی سے نئی شگفتگی پیدا کرتی ہیں۔

ملا نصرالدین کوئی خیالی کردار نہیں، البتہ کئی من گھڑت واقعات اس کی ذات سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ ویسے اُس کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور گزرے ہیں جو اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں۔ انہی واقعات نے ملا کو بڑی شہرت بخشی اور ترکی کی ہر محفل میں اُس کا ذکر ہونے لگا۔ ملا ترکی کے ایک گاؤں ہورتو میں ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ عبداللہ اسی گاؤں میں مسجد کا امام تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے نصرالدین کو اس زمانے کے لحاظ سے اچھی تعلیم دلوائی۔ نصرالدین جوان ہو کر عالموں میں شمار ہونے لگا۔ اور اسی حیثیت سے ملا کا خطاب ملا۔

نصرالدین اپنے وقت کا واحد ملا تھا جو زاہد خشک اور تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا مسکراتا اور ہنسی ہنسی میں بڑی اہم اور سنجیدہ باتیں سمجھا دیا کرتا۔ اس کی مزاح وطنز سے بھرپور باتیں دل پر اثر کرتیں اور سننے والے ہنستے ہنستے زندگی کی کوئی بڑی حقیقت پر غور کرنے لگتے۔ ملا نصرالدین نے پند ونصائح سے ہمیشہ گریز کیا۔ اُس کا یہ نظریہ تھا کہ اس روتی بسورتی دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے

یہ ضروری ہے کہ ان کی سمجھ کے مطابق بات سمجھائی جائے اور بات سمجھانے کے لئے ہنسی مذاق کو اپنا شعار بنایا جائے۔ ملا نصرالدین نے اپنے اس نظریے کو اس حد تک عملی جامہ پہنایا کہ وہ خود جان بوجھ کر بے وقوف بنتا رہا۔ لوگ اس کی بیوقوفی پر ہنستے اور دوسرے لفظوں میں کسی اچھی بات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی عقلمندی کا ثبوت دیتے۔

ملا نصرالدین کی زندگی کے پورے واقعات تو کسی کو معلوم نہیں، البتہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے گاؤں کا قاضی بھی تھا۔ وہ شاعر اور فلسفی تھا۔ صاف ستھرا، خوش پوش اور ہنس مکھ انسان تھا کہ بڑی سے بڑی بات ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز سے موثر پیرائے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس کی یہ بات اسی کے ایک واقعے سے یوں ظاہر ہوتی ہے کہ ایک بار وہ گاؤں سے باہر سڑک پر مزے مزے سے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں رسی کا ایک سرا تھام رکھا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے گدھا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے گدھے کی پیٹھ پر لدی ہوئی بوری میں سے مٹی کا ایک پیالہ گر کر زمین پر ٹوٹ گیا۔ لیکن ملا نصرالدین بغیر رکے اور بغیر پیچھے دیکھے اپنی راہ چلتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک راہ گیر نے یہ خیال کرتے کہ شاید ملا کو پیالے کے ٹوٹنے کی خبر نہیں، ٹوٹے ہوئے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ ملا نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے لیکن جب پیالہ ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا۔"

ایسے موقع پر دراصل سوائے اس کے کوئی اور چارہ ہی نہ تھا کہ بجائے اس نقصان پر رونے دھونے کے وہ اپنی رفتار جاری رکھتا۔ ملا کا یہ جواب مزاح اور طنز کے پردے میں کڑھنے والے شخص کی سمجھ پر ایک کڑی تنقید ہے۔ یہ جواب دوسرے شخص کے لئے یہ معنی رکھتا ہے کہ "تم کتنے بیوقوف ہو۔ پیالہ ٹوٹ تو ٹوٹ گیا اس کو جوڑا تو جا نہیں سکتا تو پھر ٹھہر کر افسوس کرنے اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

ملا نصرالدین اپنی حاضر جوابی، خوش باشی اور زندہ دلی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ یوں تو وہ جسمانی طور پر ۶۷ برس تک حیات رہا اور اب وہ سوری حصار زیر زمین ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی آخری قیام گاہ ـــ مزار کی پیشانی پر سے محروم ہو گیا اور دونا قول رہنے لگا۔ ملا بڑا خوش تھا لیکن ایک صبح اس نے دیکھا کہ گدھا زمین پر مردہ پڑا ہے۔ گدھے کو مرا ہوا دیکھ کر ملا نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ گدھا آخر گدھا نکلا اور اس وقت مرا ہے جب وہ فاقے رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔"

ایک دن ملا نصرالدین نہانے کے لئے گرم حمام میں پہنچا۔ معمولی سے کپڑوں میں ملبوس ملا کو حمام والوں نے معزز نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسے پھٹا پرانا اور میلا کچیلا تولیہ، اور کپڑے دھونے والے صابن کا ننھا سا ٹکڑا دے کر اس غسل خانے میں بٹھا دیا جہاں نہانے دھونے کا معقول انتظام نہ تھا۔ ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے حمام کے دونوں آدمیوں کو ایک ایک اشرفی انعام کے طور پر دی۔ وہ دونوں دم بخود ہو کر رہ گئے اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگے کہ ہم نے اس انسان کو پہچاننے میں بڑی غلطی کی۔ دوسری بار ملا جو آیا تو انھوں نے مل کر ملا کی بڑی خدمت کی۔ ایک نے نیا تولیہ، خوشبودار صابن اس غسل خانے میں رکھا جو خاص لوگوں کے استعمال میں آتا تھا۔ دوسرے نے ملا کے بدن کی مالش کی اور جب ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے دونوں کی ہتھیلی پر تانبے کا ایک ایک پیسہ رکھ دیا۔ اس پر وہ بہت حیران ہوئے۔ ملا سے کہا "جب ہم نے کوئی خدمت نہ کی تو ہمیں ایک ایک اشرفی ملی۔ اور آج ہماری خدمت کا یہ عوض ...." ملا نے جواب دیا "اس دن تم نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، اس کا معاوضہ تمہیں آج ملا اور آج تم نے بڑی خدمت کی تو اس کا معاوضہ تمہیں اس دن پیشگی دے دیا گیا تھا۔"

ملا نصر الدین سے کسی نے پوچھا "عورت کوئی راز اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

ایک نے پوچھا "کون سا راز؟"

ملا نے جواب دیا "فقط ایک راز۔ اپنی عمر کا!"

اس پر ایک اور نے پوچھا "ملا، تمہاری کیا عمر ہوگی؟"

اس نے جواب دیا "چالیس برس کا ہوں۔"

ایک اور نے کہا "لیکن ملا، پچھلے برس بھی تم نے یہی الفاظ کہے تھے۔"

"ہاں کہے تھے۔ میں اپنے الفاظ سے پھرنے والا نہیں ہوں اور آج بھی انہی الفاظ پر کاربند ہوں۔"

ایک بھاری جلسے میں ایک لیڈر جب تقریر کرنے کے لئے سٹیج پر آیا تو وہ جم غفیر دیکھ کر ایسا سٹپٹایا کہ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور تقریر دل ہی دل میں ہوتی رہی۔ اس پر اس کے بہت سے عقیدت مندوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے تاکہ اس عرصے میں وہ سنبھل جائے لیکن وہ نہ سنبھل سکا۔ آخر ایک آواز آئی "آپ کچھ تو کہئے۔"

اس نے کہا "کیا کہوں، میں تو کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ملا اٹھ کر سٹیج کے پاس آیا اور اس سے کہا "کیا یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ سٹیج سے فوراً نیچے اتر آؤ۔"

ایک کسان اپنے گھوڑے کی لمبی دم تراش رہا تھا کہ پاس سے ملا نصر الدین گزرا۔ کسان نے ملا سے پوچھا "دیکھو کتنی دم ٹھیک رہے گی؟"

ملا نے جواب دیا "میرے بھائی، تم گھوڑے کی دم چھوٹی تراشو یا بڑی وہ بعض لوگوں کے لئے بہت چھوٹی اور بعض لوگوں کے لئے بہت لمبی رہے گی۔"

ایک کسان احمد نامی ملا کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ اس نے ایک ننھا سا چوزہ ملا کو تحفتہً دیا۔ ملا نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ اس کے رخصت ہونے کے چند روز بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے ملا سے کہا کہ "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے اس کی بھی تواضع کی۔ تیسرے دن ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے پھر وضعداری کا ثبوت دیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتے بعد ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے اسے اپنے دیوان خانے میں بٹھایا۔ اتفاق سے وہ کھانے کا وقت تھا۔ دسترخوان بچھایا گیا تو مہمان کے سامنے ملا نے ایک بڑے کٹورے میں خالی گرم پانی پیش کرتے ہوئے کہا "یہ احمد کے دیئے ہوئے چوزے کے شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔"

ایک دن ملا نصر الدین نے اپنے بیٹے سے کہا "کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر لاؤ اور دیکھنا کہیں گھڑا نہ ٹوٹ جائے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹے کے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا "تم نے اپنے بیٹے کو

یوں بھلا اس غریب نے گھڑا کہاں توڑا تھا؟"

ملّا نے جواب دیا "گھڑا ٹوٹنے کے بعد اگر میں اُسے سزا دیتا تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔"

ملّا نصرالدین کا ایک پڑوسی بڑا لالچی اور بے ایمان تھا۔ ایک شام ملّا نے اُس سے فرائی پین (تلنے کا برتن) مانگا۔ پڑوسی نے اُسے فرائی پین دے دیا۔ ملّا کو دراصل فرائی پین کی ضرورت نہ تھی، وہ اپنے پڑوسی کو ایک سبق دینا چاہتا تھا۔ پندرہ دن بعد جب اس نے اپنے پڑوسی کو اُس کا فرائی پین واپس دیا تو اُس کے ساتھ ایک ننھا سا فرائی پین بھی دیا۔ پڑوسی نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ملّا نے جواب دیا "تمہارے فرائی پین نے بچہ دیا ہے۔"

پڑوسی بہت خوش ہوا اور ننھا فرائی پین بھی لے لیا۔

تیسرے دن ملّا نے پھر اُس سے فرائی پین مانگا اور اپنے پاس ایک ماہ تک رکھا اور جب پندرہ دن اور گزر گئے تو پڑوسی خود ملّا کے پاس آیا اور اُس سے اپنا فرائی پین مانگا۔ ملّا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "تمہارا فرائی پین مر چکا ہے۔"

پڑوسی سیخ پا ہو گیا اور گرج کر بولا "کبھی فرائی پین بھی مر سکتا ہے، کیا بکتے ہو؟"

ملّا نے کہا "جب فرائی پین بچہ دے سکتا ہے تو مر بھی سکتا ہے۔"

(بنگالی)

ایک رات

از: پرشورام
ترجمہ: یونس احمر

شہر میں بچوں کو اغوا کرنے کی وارداتیں پھر سننے میں آ رہی ہیں۔ شام کے وقت لوچن بابو کے بیٹھک خانہ میں اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان کا بھانجا اُدے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں کہہ رہا ہے — "آج کی خبر سنی ہے آپ لوگوں نے! صرف آج پچاس بچوں کو اغوا کیا گیا ہے۔ کل بھی اسی قسم کی پچیس وارداتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ جو بچے اغوا کئے گئے ہیں ان کا ٹھور ٹھکانہ کسی کو نہیں معلوم۔ لوگ غصے میں دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں، موٹر گاڑیاں سرپٹ بھاگی جا رہی ہیں اور سپاہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ خاموش ہے۔"

لوچن بابو نے پوچھا۔ "اخبار والے نے کیا لکھا ہے؟"

لوچن بابو کے مالا نگن نے جواب دیا۔ "دھوم کیتو نے بڑا ہی زوردار اداریہ لکھا ہے — وہ لکھتا ہے — ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس افسوسناک واقعہ کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ان پڑھ عوام کا خیال ہے کہ بالی برج کی بنیاد کو پختہ کرنے کے لئے دس ہزار بچوں کو بھینٹ چڑھایا جائیگا اور پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بچے دنیا ترک کر کے بن باس لے رہے ہیں۔ آپ ہی بتایئے کس پر یقین کیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام لیڈران متحد ہو جائیں۔ ہم حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اور کس ملک میں اتنی کثرت سے بچوں کو اغوا کیا گیا ہے؟"

لوچن بابو کے چھوٹے لڑکے گھنٹو نے کہا: "کیا بچوں کو ان کے باپ ہی لے بھاگتے ہیں —؟"

وکیل بنو بابو نے کہا: "باپ بھی ایسے ہی ہونگے تم فکر نہ کرو، ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔"

بوڑھے کیدار مہاشے اس وقت چپ چاپ تمباکو نوشی میں مصروف تھے۔ نگن نے ان سے کہا۔ "کیدار مہاشے ذرا ہوشیاری سے راستہ چلئے گا۔"

لوچن داس: یہ خوب ہوشیار ہیں۔ انھیں بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔

اُدے: غالباً صرف بچوں ہی کا اغوا کیا جا رہا ہے؟

کیدار مہاشے نے گڑگڑی کو رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی اُدے تم نے کیا لکھا پڑھا ہے۔ ہنھ! بتاؤ نوجوان اور جوان میں کیا فرق ہے؟"

اُدے: جوان وہ ہے جس کے جسم میں طاقت ہوتی ہے اور نوجوان یعنی جسے ینگ کہتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے لغت دیکھ کر بتاتا ہوں۔

کیدار: لغت میں نہیں ملے گا تمہیں۔ آج کل لفظوں کے معنے بدل گئے ہیں۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس کی داڑھی اور مونچھیں دونوں ہوں وہ نوجوان جیسے روبی ٹھاکر، پی سی رائے اور جس کی نہ داڑھی ہو اور نہ مونچھیں، وہ بوڑھا نوجوان جیسے بنکم چیٹر جی، سرت چیٹر جی اور میں یعنی کیدار چیٹر جی؟

اُدے: اور میں؟

کیدار: تم ان دونوں کے بیچوں بیچ ہو۔ تم ہی پکڑے جاؤ گے۔

اُدے نے ذرا پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا "میں داڑھی رکھتا مگر بیوی نے ـــ"

نگن: خبردار اُدے۔ بیوی کا نام لیا تو کان مل دوں گا۔

اسی اثنا میں نوکر نوجن داس کے ہاتھ میں ٹیلیگرام دے کر چلا گیا۔ ٹیلیگرام پڑھنے کے بعد اس نے کہا ـــ "کیدار مہاشے یہ تار آپ کا ہے؟"

کیدار: مجھے تار کس نے کیا؟ ذرا سناؤ تو پڑھ کر۔

نوجن داس: کارتک مسنگ

اُدے: ایں، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

نوجن داس: جبل پور سے چرن گھوش نے تار دیا ہے۔ لکھا ہے کہ کارتک لاپتہ ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیجئے۔ اور چرن بابو پانچ بجے کی ٹرین سے خود آ رہے ہیں۔ مگر اس وقت تو چھ بج چکے ہیں اب آ ہی چلے۔ ان کی زبانی سارا ماجرا سن کر ہی پولیس میں رپورٹ درج کرائیگا۔ مگر کارتک ہے کون؟

کیدار: چرن کا بڑا لڑکا۔ یہیں ہاسٹل میں رہتا ہے اور ہر ہفتے گاؤں چلا جاتا ہے۔ ان دنوں تو کالج بھی بند ہے۔

نگن: مگر سوال یہ ہے کہ کارتک کو اغوا کون کر سکتا ہے۔ بکواس ہے۔ بالکل جھوٹ۔

کیدار: تم جانتے ہو اُسے؟

نگن: اچھی طرح۔ میرے منجھلے سالے بانٹو کا ساتھی ہے۔ بڑا ہی بہادر ہے وہ تو اور خوب ہوشیار بھی۔ جب دس سال کا تھا تو کہا کرتا تھا کہ لڑکیاں بھی کیا انسان ہیں ـــ سر پر بالوں کا گچھا، اِدھر اُدھر سے بندھا ہوا۔ اور جب چودہ سال کا ہوا تو اس نے بانٹو کو خط میں لکھا ـــ عورت کی محبت؟ سب بکواس ہے۔ بھائی بانٹو اس دنیا میں رہنے کا کسی کو حق نہیں۔ صرف میں اور تم رہیں گے لیکن دو سال کے بعد ہی اُس کے نیچر چڑھائی کی شاخوں پر پنچھی اُڑ گیا اور کارتک نے اپنی بیاض میں لکھا ـــ عورت تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے، کٹھن اور دشوار۔

نوجن داس: یہ باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں سن کر۔ چرن بابو نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی۔

کیدار: کتنی بار کہا چرن سے مگر بے سود۔ جب بھی میں بیاہ کا ذکر چھیڑتا وہ کہتے ـــ تعلیم مکمل کرنے دو کچھ کمانے دو پھر دیکھا جائے گا۔ البتہ اس کے لیے لڑکی ڈھونڈی جا چکی تھی اور وہ تھی اُن ہی کے دوست دکھال سنگھ کی لڑکی۔ تیرہ چودہ سال پہلے ہی

دونوں دوستوں میں وعدے وعید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد راکھال بابو فوت ہو گئے اور بھرامن کی بیوی بھی چل بسیں۔ لڑکی کی ساری ذمہ داری اس کے ماموں کے کندھے پر آگئی۔ سنا ہے وکیل کے جج تھے، ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

گگن: راکھال سنگھ کی لڑکی ——— ہنھ، کارتک کبھی شادی نہیں کر سکتا اُس کے ساتھ۔ سنا ہے لڑکی بالکل وحشی ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ چرن گھوش آ پہنچے۔ ایک ہاتھ میں چھتری، دوسرے ہاتھ میں بیگ۔ داڑھی کے بال کچھ پکے ہوئے اور کچھ کچے [illegible] طرح ہانپ رہے تھے۔ بولے۔ "شریر۔ بدمعاش کہیں کا۔"

کیدار: پتہ چلا اُس کا؟

چرن: پتہ کیا خاک چلے گا۔ جھوٹا، نالائق۔

لوچن داس: چرن بابو ذرا دم لیجئے۔

کیدار: غصہ بعد میں اتارنا پہلے واقعہ تو بیان کرو۔

چرن: واقعہ کیا خاک بیان کروں گا ——— اپنا سر۔ گڈ فرائڈے کی وجہ سے کالج میں تعطیل ہے۔ وہ کئی دنوں تک میرے ساتھ رہا۔ کل سویرے یکایک اس نے کہا کہ فلسفہ کی دو ایک کتابیں باٹلو کے پاس ہیں۔ کلکتہ جا کر لے آؤں۔

میں نے کہا ٹھیک ہے جاؤ لیکن دوپہر کی گاڑی سے لوٹ آنا۔ شام ہو گئی مگر نہ لوٹا۔ رات بھی صبح میں بدل گئی۔ اسکی ماں نے سینہ کوبی شروع کر دی کیونکہ پرسوں ہی ترسٹھ لڑکوں کا اغوا ہو چکا ہے۔ کلکتہ پہنچ کر میں سب سے پہلے باٹلو کے گھر گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی شاٹلو نے کہا کہ باٹلو اور کارتک اپنے کئی دوستوں کے ہمراہ ٹاؤن ہال میں تقریر سننے گئے ہیں لیکن باٹلو کی بہن بولی ——— بالکل جھوٹ۔ دونوں اینگلو مغلائی ہوٹل گئے ہیں، وہاں سے پھر سینما جائیں گے۔ اب بتاؤ اُسے کہاں ڈھونڈا جائے۔

بنود: اب پتہ چل گیا پھر حیران پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تفریح کرنے دیجئے۔ چلا جائے گا اپنے گھر۔

وہ تو یہاں آیا ہے تفریح کرنے اور ہمارا برا حال ہو گیا ہے میں زبردستی کان پکڑ کر اُسے لے جاؤں گا یہاں سے۔ چلو کیدار۔

کیدار: کہاں؟ کدھر؟

گگن: اینگلو مغلائی ہوٹل ٹیکسی میں بیٹھ جائیے۔ بس دس منٹ میں دھرم تلہ پہنچ جائیں گے۔

اور چرن گھوش اور کیدار مہاشے روانہ ہو گئے۔

اینگلو مغلائی ہوٹل تھا تو چھوٹا سا مگر خوب مشہور تھا۔ یہاں ہر وقت جوانوں بوڑھوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ہنگامہ برپا ہے۔ دروازے کے پاس ہی منیجر کی سیٹ ہے۔ کبھی وہ بیٹھ کر اور کبھی کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور آواز لگاتا جاتا ہے ——— تین نمبر ایک پلیٹ قورمہ، چھ نمبر دو پیالی چائے، چار کٹلیٹ فوراً اور پانچ نمبر میں دو اور انڈے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چرن گھوش اور کیدار مہاشے اندر داخل ہوئے۔ کیدار نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "دیکھو ذرا ہوئے ہوئے۔ لونڈا یہیں بیٹھا کس اطمینان سے پلیٹ صاف کر رہا ہے؟"

چرن گھوش نے ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوٹل شریفوں کیلئے نہیں ہے۔ بدمعاش اور غنڈے جمع ہو گئے ہیں یہاں

(COMMITMENT)

گھنن: جناب دیکھیے ذرا زبان سنبھال کر۔

چرن: اس اسٹوپڈ سے میں نے کہا تھا کہ فوراً گھر لوٹ آنا مگر اس نے بات نہ مانی۔ میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے اندیشے پیدا ہوئے۔۔۔ کہیں
موٹر کے نیچے تو نہیں آ گیا، پولیس نے ہتھکڑی تو نہیں پہنا دی یا کسی نے اغوا تو نہیں کر لیا۔۔۔ آجکل ویسے ہی اغوا کرنے کی وارداتیں
سننے میں آ رہی ہیں۔ ماں اس کی چھاتی پیٹ رہی ہے ۔۔۔ اور اسے دیکھو کتنے اطمینان سے دوستوں کے ساتھ خوش
گپیوں میں مصروف ہے۔ نالائق۔ بندر۔ اسٹوپڈ۔ یونیورسٹی میں یہی تعلیم دی جاتی ہے کیا؟ کیا تمہارے استاد ایسے ہوٹل میں اڈہ
جمانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری پارٹی کا سردار یہ بالٹو ہے اور یہ گوپال اور گھنن ———
بے حیا، بے شرم۔

کارتک تو اپنے باپ کی جلی کٹی برداشت کر گیا۔ مگر اس کے دوست آپے سے باہر ہو گئے اور ہوٹل کے منیجر نے آستین چڑھالی۔
بالٹو بڑا ہی ہشیار، سمجھدار اور شیریں سخن ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھئے چرن بابو، آپ کارتک کو جو جی میں آئے کہہ سکتے ہیں
لیکن ہمارے خلاف آپ کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔"

منیجر: میں آپ کو پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔

چرن مہاشے کو اشتعال آ گیا "دم ہے تو حوالے کر کے دیکھو۔"

منیجر: مہاشے جی یہ ہے اینگلو مغلائی کیفے۔

بالٹو یہ غلط تلفظ برداشت نہ کر سکا اور ٹوکتے ہوئے کہا "کیفے نہیں کیفے۔"

منیجر: ایک ہی بات ہے۔ مہاشے جی اس ہوٹل میں مہذب قسم کے لوگ آتے ہیں۔ یہ ہے ایک رسپکٹ ایبل ریسٹورنٹ۔

بالٹو: ریستوراں۔

منیجر: ٹھیک ہے۔ آپ نہیں جانتے مہاشے جی یہ ہے پڑھے لکھے لوگوں کا اینڈیز ووز۔

بالٹو: اندیوو۔

بار بار بالٹو کی اس مداخلت سے منیجر کو تاؤ آ گیا۔ بولا "ابھی تم بچے ہو، صحیح تلفظ کیا ہے۔ تمہیں بعد میں معلوم ہوگا۔ دھوپ میں یہ
بال سفید نہیں ہوئے ہیں۔"

بالٹو نے بھی چیخ کر کہا "دیکھو ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ ہم تمہارے ہوٹل کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ کتے کا گوشت اور سانپ کی چربی
کھلا کھلا کر تم شریفوں کو لوٹ رہے ہو۔"

سامنے ایک معمر شریف صورت اور کم سخن شخص بیٹھا ہوا ٹماٹر کھا رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ دو پلیٹ قورمہ صاف کر چکا تھا۔ بالٹو کی یہ
بات سن کر وہ چونک پڑا اور بولا "حیرت ہے۔ اسی لئے تو میں اب یہ چیزیں نہیں کھاتا۔ صرف ٹماٹر پر اکتفا کرتا ہوں۔"
ہوٹل کے دوسرے لوگ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے کہا "کتے کا گوشت۔" کسی نے کہا "اسی لئے تو وٹیامین
کی کمی ہے۔" منیجر نے سبھوں کو خاموش کرتے ہوئے کہا "دیکھئے جھوٹ اور لغو باتوں پر کان نہ دھریئے۔ کیا ہمیں خدا کا ڈر نہیں ہے۔"
کیدار مہاشے نے پہلے تو چاروں طرف دیکھا پھر کہا "بھائیو اگر آپ بور محسوس نہ کریں تو وٹیامین کے بارے میں دو چار

باتیں سن لیجئے۔"

چند نوجوانوں نے سبھوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا "ہاں ہاں ضرور سنائیے"۔

کیدار مہاشے نے کہنا شروع کیا: "دیکھئے جناب اصل غذا ویٹامن ہے۔ یہ ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں یعنی سبھوں کو وٹامین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر آپ ویٹامن چاہتے ہیں تو کٹھل کھانا شروع کر دیجئے۔ ٹماٹر سے دلچسپی رکھنے والے بابو نے تعجب سے پوچھا "کیا کہا کٹھل؟"

کیدار: جی جناب کٹھل۔ شاعروں نے اس پھل کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ بنگال میں کٹھل ہی پھلوں کا راجہ ہے۔

شریف آدمی: کٹھل بھی کوئی پھل ہے۔ ہنھ!

کیدار: جی جناب۔ کھا کر دیکھئے۔ وزن دو من تک ہوتا ہے۔ ویٹامن سے بھرپور۔

شریف آدمی: کس کلاس کا ویٹامن مہاشے۔ اے، بی، سی یا ڈی؟

کیدار: اے، بی، سی، ڈی، ای، ایل، سلائی فاکس میٹ، غرض آپ جو کہیں۔

شریف آدمی: نان سنس۔

کیدار: یقین نہیں آیا آپ کو۔ تو پھر کچے ٹماٹر کھا کر جہنم ہی جائیے۔ ہم رخصت ہوئے۔ نمسکار۔ چلو بھئی چرن۔

منیجر: جناب اور دہی کی قیمت تو چکاتے جائیے۔

کیدار: ایسی معلوماتی تقریر سننے کے بعد بھی پیسے مانگتے ہو۔ اچھا لو یہ چونی۔

کیدار مہاشے نے چرن گھوش کو ایک طرف کھینچ کر آہستہ سے کہا: "کارتک کو کڑوی کسیلی تو سنا چکے اب دو چار میٹھی باتیں کہہ کر اس کا دل بہلا دو۔ جاؤ اسے بلا لاؤ ادھر۔"

چرن گھوش نے کارتک کے قریب جا کر کہا "مسٹر اگھن مہینے میں تمہارا بیاہ کر رہا ہوں۔ راکھال سنگھ کی لڑکی سے بچپن ہی سے اس کے ساتھ تمہاری نسبت لگی ہوئی ہے، یاد ہے نا؟

کارتک: میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔

چرن گھوش آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے: "دیکھتا ہوں شادی سے تو کیسے انکار کرتا ہے۔ اسٹوپڈ۔"

کیدار: ارے ارے تمہیں تو جیسے عقل ہی نہیں۔ ہوٹل میں بھی کون شادی بیاہ کی بات کرتا ہے۔ دیکھو اب دیر نہ کرو۔ نو بجے کی ٹرین مل جائے گی۔ کارتک کو آج یہیں رہنے دو۔

چرن گھوش غصے میں باہر نکل گئے۔ کارتک اور اس کے تین دوستوں کے ساتھ کیدار مہاشے بھی ہوٹل سے باہر آئے۔

گھنن: ہم اپنی اس بے عزتی کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے۔ کارتک تم اپنے باپ کے خلاف مقدمہ درج کر دو۔ ہم شہادت دیں گے۔

میں تمہارے اس خیال سے متفق نہیں۔ باپ کے خلاف ایسا نازیبا قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ البتہ اخباروں میں یہ خبر چھپا دی

جائے۔ ایسے باپ کے لئے یہ سزا کافی ہے۔

گھنن: نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم رینو کا دیوی کے پاس چلیں۔ ان کے سامنے لڑکوں کیلئے آشرم کھولنے کی تجویز رکھیں۔

باٹلو: لڑکیاں پھر ہماری مخالفت کریں گی۔ کارتک تمہارا کیا خیال ہے؟

کارتک: باٹلو ہائیڈرو سائنک ایسیڈ کی کیا قیمت ہے؟

باٹلو: بہت زیادہ۔ اس کے مقابلے میں مٹی کا تیل بہت سستا ہے۔ دس روپیہ میں کام بن جائیگا۔

کارتک: مگر اس سے بہت تکلیف ہوگی۔

باٹلو: کیا ہوا جب مرنا ہی ٹھہرا۔

کیدار مہاشے نے کارتک کو سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹے کارتک دل چھوٹا نہ کرو۔ بڑھا باپ ہے۔ اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ باپ کی عزت خدا کی عزت ہے میاں۔

گھنن: نہیں کارتک ہم رینو کا دیوی کے گھر چلیں۔ آشرم کھولنے کے لئے ان کا پیغام حاصل کر لیں۔

کیدار: رات زیادہ ہوگئی ہے۔ انھیں تکلیف ہوگی۔ کل دیکھا جائیگا۔

گھنن: ابھی تو ساڑھے آٹھ ہی بجے ہیں۔

کیدار: اچھا تو چلو۔

گھنن: مگر آپ ہمارے ساتھ کیوں جائیں گے۔

باٹلو: کوئی حرج نہیں۔ ہمارے ساتھ ایک بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔

رینو کا دیوی کا ڈرائنگ روم چھوٹا سا ہے۔ بیچ میں ایک میز ہے، اس کے چاروں طرف کچھ کرسیاں ہیں اور ایک بنچ بھی۔ یہ لوگ پہنچے ہی تھے کہ ایک نیپالی ملازم پر نظر پڑ گئی۔ باٹلو نے کہا ——— کیدار مہاشے آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ لیجئے اپنا کارڈ بھجوا دیجئے۔

کیدار: میرے پاس کارڈ وارڈ کہاں۔ ارے بھئی سنو۔ جاؤ رینو کا دیوی کو اطلاع کر دو کہ کیدار بابو اور چار نوجوان تشریف لائے ہیں۔

گھنن: نوجوان نہیں جوان۔

کیدار: اچھا بھئی اچھا۔ جوان ہی سہی۔

ملازم نے پوچھا "میم صاحب کے ساتھ۔

کیدار: ہاں ہاں رینو کا دیوی کے ساتھ۔

ملازم چلی گئی تو باٹلو نے کہا "دیکھئے کیدار مہاشے آپ ہمارے وفد کے لیڈر ہیں۔ گھبرا لیجے گا نہیں؟

کیدار: میاں کیوں گھبرانے لگا۔

اتنے میں ریزو کادیوی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں ——— بھاری بھر کم عورت، پاؤڈر سے لپا ہوا چہرہ۔

انھوں نے آتے ہی پوچھا: "مجھے فوراً کمیٹی کی میٹنگ میں جانا ہے۔ ذرا جلدی اپنا مقصد بتا دیجیے۔ نوازش ہوگی۔"

باٹلو: کیدار مہاشے بتا دیجیے۔

کیدار مہاشے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "دیکھیے ریزو کادیوی جی اس لڑکے کا نام کارتک۔ شریف صورت اور نیک۔ باپ کا نام ہے چرن گھوش۔ ان کے مزاج میں تلخی اور چڑچڑاپن ہے۔ انھوں نے کارتک کو اسٹوپڈ اور بندر کہا ہے اور اسی لیے یہ لڑکے ...."

گھنن نے اپنا نوٹ بک نکالا اور دیکھتے ہوئے کہا: "تین بار بندر کہا ہے انھوں نے۔"

کیدار: ٹھیک۔ ہاں تین بار کہا ہے۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا ریزو کادیوی جی جب ہمارے باپ دادا گالیاں دیتے تھے اور ہم سر جھکا کر سن لیتے تھے۔ اس زمانے کی بات ہی کچھ اور ہے جب اسی کلکتے میں گھوڑے ٹرام گاڑیاں کھینچتے تھے، لڑکے داڑھیاں رکھتے تھے، لڑکیاں چھپ چھپ کر گانے گاتی تھیں یہ باتیں اب پرانی ہوگئیں۔ باپ نے لڑکے کو اگر بندر کہہ دیا تو کیا برا کیا۔ بندر بھی تو خدا کی مخلوق ہے۔

ریزو کادیوی نے کیدار مہاشے سے پوچھا: "نوجوانوں میں سینگ لگا کر آپ کیوں شامل ہو گئے؟"

کیدار مہاشے نے ذرا سوچ کر جواب دیا: "آپ نہیں جانتیں۔ میں بھی تو نوجوانوں کا جوان ہوں۔"

یہ سن کر ریزو کادیوی خوش نہیں ہوئیں۔ کیدار مہاشے نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا: "میری مثال گجراتی ناریل سے دی جا سکتی ہے ——— باہر سے پکا ہوا اور اندر سے کچا۔"

گھنی یہ سن کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے کہا: "کیدار مہاشے فضول باتیں نہ کیا کیجیے۔ میں بتاتا ہوں۔ دیکھیے ریزو کادیوی جی پبلک ہوٹل میں ہماری بے عزتی کی گئی۔ ہماری خطا کچھ بھی نہیں۔ ہم اس ذلت و رسوائی کو اور برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اس مقصد کے لیے بے قصور لڑکوں کا ایک آشرم بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو آشرم کی بنیاد پڑ جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں ایک پیغام لکھ کر دے دیں۔"

ریزو کادیوی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہیں پھر انھوں نے آواز دی: "شوشین، شوشین۔"

اس آواز کو سن کر ایک ٹھگنے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ ریزو کادیوی کے سوامی ہیں ——— کمزور، لاغر، آنکھوں میں عینک، ہنس مکھ۔

ریزو کادیوی نے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ لڑکے میرا پیغام لینا چاہتے ہیں۔"

شوشین بابو کاغذ قلم لے آئے اور ریزو کادیوی نے اپنا پیغام لکھوایا۔

کیدار مہاشے پیغام پڑھ کر اچھل پڑے اور بولے: "واہ بہت خوب۔ بہت خوب۔"

کیدار: ہم نے آپ کا قیمتی وقت برباد کیا معاف کیجیے گا

ریزو کادیوی: نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ اچھا تو میں میٹنگ میں چلی۔ نمسکار۔

ریزو کا دیوی رخصت ہوگئیں تو کیدار مہاشے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شو شین بابو نے کہا: "آپ جلدی میں تو نہیں ہیں؟ ... دیر اور بیٹھیے۔"

کیدار: تو کیا آپ بھی کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں؟

شو شین بابو نے دروازے سے جھانک کر دیکھا پھر کہا: "پیغام! نہ۔ مہاشے میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف کام جانتا ہوں۔ ہاں سنیے تو آپ لنائی گھوشال کو جانتے ہیں؟ سینیٹ ہاؤس کی چھت پر چھتر گھنٹے تک وہ ایک پاؤں پر کھڑے رہے ہیں۔ وہ ہیں میرے چچا زاد بھائی۔"

کیدار: اچھا!

شو شین: جی: بلائی سنرجی کو جانتے ہیں؟ اس لونڈے نے تنہا تین گوروں کی پٹائی کی ہے۔ وہ ہے میرا ماموں زاد بھائی۔

کیدار: اچھا! آپ تو بڑے جیوٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اچھا ہم چلے۔ نمسکار۔

شو شین نے ذرا ہنساتے ہوئے کہا: "پانچ روپے ہوں تو؟" باٹلو نے اس کی طرف ایک ادھنی پھینک دی اور سب رخصت ہو گئے۔

باہر آ کر کیدار مہاشے نے کہا: "لو ہم قلعہ فتح کر آئے۔ اب جلد سے جلد روپے جمع کر کے ریزو کا دیوی کے حوالے کرنا چاہئے۔ اچھا اب میں چلا۔ کارتک۔ آج تم باٹلو کے ساتھ رہو گے! کل ملاقات ہوگی پھر۔"

کیدار مہاشے کے چلے جانے کے بعد گھنن نے کہا: "دس ہزار روپے! فی الحال تو پچاس نوجوانوں کے قیام کا بندوبست کرنا ہے۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سونے کے کمرے، لائبریری، ٹینس کورٹ۔ ریزو کا دیوی نے کم سے کم اسٹیمیٹ دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ روپے کہاں سے آئیں گے؟"

باٹلو: میرا خیال ہے آج ہم خوب پیٹ بھر کر کھا لیں —— کل سے برت رکھ کر جگہ جگہ جلسے کریں گے، تقریریں کریں گے اور چندہ کی اپیل کریں گے۔

گھنن: تمہارے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں۔

اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ کارتک چپ چاپ باٹلو کے ساتھ ہو لیا۔ جب دونوں گھر پہنچے اور باٹلو کارتک کے لئے اوپر سے چادر لے کر نیچے آیا تو کارتک کہیں جا چکا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہے۔ گوبند بابو دو منزلے پر بے خبر سو رہے ہیں۔ یکایک ان کی آنکھوں پر روشنی پڑنے سے نیند ٹوٹ گئی اور ان کے کانوں میں آہستہ آہستہ یہ آواز آئی: "خبردار جو حرکت کی اپنی جگہ سے ورنہ گولی مار دوں گا۔ الماری کی کنجی دے دیجئے فوراً۔"

گوبند بابو کو یہ چور بڑا ہی ماڈرن معلوم ہوا۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے کہا: "کنجی تو بیوی کے پاس ہے اور وہ چند

اپنے بھائی کے گھر گئی ہے۔

چور: اور منی بیگ، گھڑی، انگشتری وغیرہ؟

گوبند: سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر ہی سب کچھ ہے۔ لیکن میاں چیک بک چھوڑ دینا۔ تمہارے کسی کام نہ آئے گی وہ اور چور نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھما گھما کر ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی شروع کر دی۔ یکایک وہ ٹیبل سے ٹکرا کر گر پڑا اور اس کی زبان سے اُف نکل گئی۔

گوبند بابو نے کہا "کیا ہوا؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد چور "اف" سنائی دی۔ گوبند بابو کو فکر لاحق ہوا۔ پلنگ کے پاس ہی بجلی کا سوئچ تھا۔ انھوں نے دبا کر بجلی جلا دی۔ چور زمین کے اوپر بیٹھا کراہ رہا تھا۔

گوبند بابو نے پوچھا "گٹھیا کے مریض معلوم ہوتے ہو؟"

چور: نہیں، ماہ دو ماہ بعد ایسی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اُف، آہ۔

گوبند: علاج کرا رہے ہو؟

چور: نہیں۔

گوبند: ظلم کر رہے ہو اپنے اوپر۔ کچھ روز تک تلسی کے پتے کے رس میں کونین ملا کر کھا کر دیکھو۔ بڑا اچھا علاج ہے یہ۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ دن پوری یاد گھر میں جا کر گزارو۔

چور: دیو گھر یا شری گھر؟

گوبند: ہاں ٹھیک۔ بات یہ ہے کہ بڈھا ہو گیا ہوں۔ یہ بھول گیا کہ تم چور ہو۔ خیر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے خود عدالتوں سے ڈر لگتا ہے۔

چور آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو گوبند بابو نے کہا "بیٹھ جاؤ اس کرسی پر۔"

چور کے سر کے بال بڑے بڑے تھے، آنکھوں میں عینک تھی، جسم پر ریشمی کرتا، پاؤں میں کینوس کے جوتے، ہاتھ میں ایک پستول اور کلائی میں گھڑی۔

گوبند: پستول کہاں سے ملا؟

چور: دو آنے میں لایا ہوں خرید کر۔

گوبند: اچھا تو یہ نقلی ہے اور تم سودیسی ڈاکو ہو؟

چور: جی!

گوبند: باپ نہیں تمہارے؟

چور: ہاں حیات ہیں!

گوبند: تو انھوں نے تمہیں نکال دیا ہے گھر سے!

چور: نہیں، میں خود گھر سے فرار ہو گیا ہوں۔

گوبند: وجہ فرار ہونے کی؟

چکور: ان کے ظلم وستم سے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ آج شام کو میں چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ وہ سبھوں کے سامنے مغلظات بکنے لگے۔ پھر بولے کہ اگلے مہینے میں راکھال سنگھ کی لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔

گوبند: بس اتنی سی بات پر تم نے ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کر لیا؟

چکور: آپ میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بابا تو مجھ پر غصہ اتار کر سیالدہ اسٹیشن چلے گئے اور میرے دوست مجھے لے گئے [illegible] کابلی کے پاس۔ بگ بھاگ۔ وہاں سے پھر بابو میرا ساتھی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اور میں وہاں سے بھاگ آیا کچھ کر گزرنے کے لئے ۔۔۔ چوری، ڈاکہ زنی، قتل۔

گوبند: راکھال سنگھ کی لڑکی شاید قبول صورت نہیں ہے؟

چکور: یہ تو بابا ہی جانتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے میں نے جس لڑکی کو کبھی دیکھا تک نہیں اس کے ساتھ زندگی بھر کا سودا کیسے کر سکتا ہوں۔ سنا ہے اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ماموں نے پرورش کی ہے اس کی۔ اور ماموں بھی اس کے بد دماغ ہیں۔ میری ہونے والی شریک زندگی تو اور ہی پیٹرن کی ہے ۔۔۔ سنتھیسس آف پرفکشن۔

گوبند: ذرا میں بھی سنوں وہ ہے کیسی؟

چکور: سنیں گے آپ؟

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالا۔

گوبند: کیا ہے وہ؟

چکور: یہ ہے میری بیاض۔ میں اپنے متفرق اشعار لکھتا ہوں اس میں۔ سنیں گے۔

گوبند: ہاں ہاں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ لڑکی کا نام کیا ہے؟

چکور: اصل نام تو نہیں معلوم، ویسے لوگ اسے شیلا کہہ کر پکارتے ہیں۔

گوبند: اور تمہارا نام؟

چکور: کارنک گھوش۔

گوبند: اچھا، کارنک کے دل کی رانی تو شیلا ہی ہو سکتی ہے۔

یکایک کسی کی چاپ سنائی دی۔ گوبند نے پکارا۔

"کون شیلا؟"

ایک جادو بھری آواز لہراتی ہوئی آئی "اب تک آپ جاگ رہے ہیں" اور یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

چکور گھبرا رہا تھا۔ گوبند بابو چکور سے مخاطب ہوئے "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے ۔۔۔ ٹھیک۔ تو تم سنتھیسس آف پرفکشن دیکھ چکے اب اس کی قابلیت کا بھی امتحان لے لو"

اس کے بعد گوبند بابو شیلا سے مخاطب ہوئے "موجودہ لکھنے والوں میں تمہیں سب سے زیادہ کون پسند ہے؟"

شیلا : جاپانی شاعر سیما نسو۔ اس کے اشعار پڑھ کر تو میں دم بخود رہ جاتی ہوں۔

گوبند : اچھا شیلا اب وہ ساز جا کر سنا دو۔

اور شیلا ساز بجانے لگی۔ چوہنے آہستہ آہستہ گوبند بابو سے پوچھا " اس ساز کا نام غالباً سائنتھ سمفونی ہے۔ کیوں ؟

گوبند : اُونہہ ! نہیں یہ کوئی روسی ساز ہے۔ شیلا روسی ساز کی بجد دلدادہ ہے۔

شیلا : مجھے نیند آ رہی ہے ماموں جان۔ اور ہاں آپ نے تو تعارف ہی نہیں کرایا ان سے ؟

گوبند : یہ ہیں ایک صاحب چوہر۔ ڈاکہ ڈالنے آئے ہیں یہاں۔

شیلا اچھل پڑی اپنی جگہ سے اور بولی " چور" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ٹیلیفون اٹھا کر کہنے لگی ——

"پارک ، ۸ — ہیلو۔ بالی گنج پولیس اسٹیشن ؟

گوبند : شیلا ، شیلا ، ٹیلی فون رکھ دو۔ ذرا "

شیلا نے ٹیلی فون رکھ کر کہا۔ " تو چور کو آپ چھوڑ دیں گے "

چوہر : نہیں۔ وعدہ کرتا ہوں یہیں بیٹھا رہونگا۔

گوبند : بیٹی شیلا جاؤ تم گرم گرم چائے اور کٹلیٹ تیا کرو اور بازو کے کمرے میں اس کے سونے کا انتظام کر دو بیچارہ اتنی رات کو کہاں جائیگا۔

اور شیلا فوراً چلی گئی۔

گوبند : کیوں کارتک شیلا پسند آئی۔

کارتک : اکس کیوزٹ۔

گوبند : تمہاری سنتھسس آف پرفکشن سے یہ ملتی جلتی ہے ؟

کارتک : یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ لیکن بابا کیا کہیں گے۔ یہ شیلا تو ان کی شیلا سے مختلف ہے۔

گوبند : ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میری یہ شیلا جب سسرال جائیگی تو گاؤں کی گوری جیسی بہوں کو گھونگھٹ سے سلام کرے گی اور باورچی خانہ میں گھر بھر کا کھانا تیار کرے گی۔ اور اگر تم اُسے بڑے سے بڑے کلب میں لے جاؤ تو وہ ماڈرن ڈانس کے لئے فوراً تیار ہو جائے گی۔

کارتک : واہ !

گوبند : ڈر گئے کیا ؟

کارتک : بالکل نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔

(ہندی)

ہم لکھنؤ گئے

گوپال ویاس

ترجمہ: ظفر ادیب

بہت دنوں سے آرزو تھی کہ لکھنؤ دیکھا جائے، بیلے کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں جیسی لکھنؤ کی ککڑیاں ہی ہمیں لکھنؤ جانے کو نہیں للچا رہی تھیں بلکہ سفیدا آم دو سیری نگینے اور پکھراج کے ڈلوں جیسے خربوزے کی گول گول چکنی چکنی بٹیاں بھی ہمارے منہ میں پانی بھر رہی تھیں۔

اُن دنوں کچھ ایسی بات آبنی تھی کہ جو ملتا لکھنؤ کی تعریف کرتا، کوئی چھتر منزل کی بات کرتا تو کوئی امام باڑہ کی۔ کوئی حضرت گنج کی چہل پہل بیان کرتا تو کوئی چوک نخاس کی ہماہمی۔ کسی کو وہاں کی بولی پیاری تھی تو کوئی وہاں کے کھانوں میں پڑنے والے مصالحے کی گویوں پہ نچھاور تھا۔ کوئی وہاں کی شیروانی کا قائل تھا تو کوئی غزل خواں کا۔ کوئی وہاں کے عطر پر قربان تھا تو کوئی سرمے پر۔ کوئی وہاں کی شرافت کو سراہتا تو کوئی نفاست کو۔ ہم نے بھی سوچا اب کے گرمیوں کی چھٹیوں میں اس بار لکھنؤ دیکھ ہی لیا جائے۔

وہاں ہمارے بچپن کے ایک دوست بھی جا بسے تھے، بارہ سال سے اوپر انھیں وہاں رہتے ہوئے ہو گئے تھے، ہمارے دوست نے اس لئے شریف تو ہونے ہی تھے پھر ایک زمانے سے لکھنؤ میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا یہ خیال بے جا نہ تھا کہ لکھنؤ نے ان کی شرافت میں کچھ اضافہ ہی کیا ہوگا۔ کئی بار وہ لکھنؤ آنے کو لکھ چکے تھے۔ اس بار ہم نے پہل کی، لکھا ——— بھائی ہم اس تاریخ کو اس گاڑی سے لکھنؤ آ رہے ہیں۔

گاڑی لکھنؤ پہنچی، سٹیشن دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی۔ گاڑی رُکی، ہمارا خیال تھا کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے، دوست ہمارے ہمیں لینے کے لئے آئے ہوں گے۔ لیکن گاڑی سے اتر کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا، پہلے تو سچ کہیں، ہمیں بہت عجیب سا محسوس ہوا، دوست پر غصہ بھی آیا، مگر سوچا شاید چھٹی نہ ملی ہو یا کسی ضروری کام سے نہ آ سکے ہوں، کوئی بات نہیں، آپس میں ظاہرداری کیا؟ معمولی سا سامان تھا، رکشا میں ڈالا اور دوست کے گھر کی طرف چل دیئے۔

رکشا والا شریف تھا، شہر لکھنؤ کا تھا، ہونا ہی چاہئے، اس نے کئی سڑکیں پار کیں، کئی موڑ کاٹے اور کئی گلیاں پھرا ڈالیں تو پھر صرف ایک گھنٹے میں ہمیں دوست کے مکان پر پہنچا ہی دیا۔ محنت کو دیکھ کر اب ہم اسے ٹھیک مزدوری نہ دیں یہ کیسے ہو سکتا تھا، خیر، مزدوری تو اسے دے دی لیکن دوست کے مکان کا بند دروازہ کیسے کھلوایا جائے۔ یہ بڑا مسئلہ ہمارے سامنے تھا، لکھنؤ کا معاملہ تھا، ذرا شرافت سے ہی کام لینا چاہئے۔ ہم نے انگلی سے دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن کسی نے نہ سنا، ہلکی سی دستک دی کوئی آہٹ نہ ہوئی، ذرا زور سے دروازے کی زنجیر بجائی کسی کی بھنک نہ آئی۔ لاچار ہو کر آواز لگانی پڑی "اے بھائی بھوشن"۔

ایک دو تین جب ہمارے گلے سے نکل کر ساتویں بار آواز محلے میں گونج گئی تو اندر سے ایک باریک لیکن تیکھی آواز جیسے بگڑ کے

آخر دو گھنٹے کے بعد ہمارے دوست آئے، آتے ہی بغلگیر ہوئے، کچھ بھی ہو لڑکپن کی دوستی کا مزا کچھ اور ہی ہے، بولے، "اماں تم نے تو کوئی خبر ہی نہیں دی؟"

خط کی بات کہی تو کہنے لگے، "مجھے نہیں ملا" ہم نے سوچا، تب ہی تو ——— ورنہ تو خط ملے اور بھوشن گھر بیٹھا رہے، کبھی ہو سکتا ہے؟

بہت دنوں میں ملے تھے، ہم دونوں ——— باتوں میں الجھے تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، ہم تو جانے کب تک بیٹھے رہتے مگر وہ تو اندر سے موہن آیا اور کہنے لگا، "ماتا جی بلا رہی ہیں!"

ہمارے دوست گئے اور کچھ دیر بعد لوٹ کر آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں، پوچھا، "کیوں کیا ہوا، جی! ———"

بولے "کچھ نہیں، انکی بہن بھی یہاں لکھنؤ میں رہتی ہیں طبیعت ذرا علیل ہے، انکی ——— وہ ذرا وہاں جانا چاہتی تھیں میں سوچتا تھا ———"

"ہاں- ہاں، سوچنے کی اس میں کیا بات ہے" ہم نے کہا "انھیں ہو آنے دو، نہا دھو تو میں ریل ہی میں لیا ہوں، کھانا باہر کہیں کھا لینگے؟"

ہمارے دوست فوراً مان گئے، کبھی کبھی باہر کھانے میں بھی بڑا لطف آتا ہے، خصوصاً پرانے ساتھیوں کے ساتھ ——— بولے "صرف ایک وقت کے کھانے کی ہی تو بات ہے۔"

خیر، وہ وقت تو ہوٹل میں خوشی خوشی کٹ گیا، مگر بعد کے تین دن ہمارے جو رام رام کر کے کٹے، وہ ہم ہی جانتے ہیں، نہ جانے موہن بیچارہ ان دنوں کتنی بار پٹا، نہ جانے ہمارے بھوشن بھائی کتنی بار غصے میں آئے اور کھسیانے ہوئے، چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، کیا بتائیں؛ کبھی دیا سلائی مانگنے پر موہن کی ماں بھبھک اٹھتیں، کبھی ہاتھ پونچھنے کے لئے تولیہ نکالنے پر ان کا کلیجہ نکل پڑتا، کبھی وہ شوہر کو ڈانٹتیں، کبھی بیٹے کو ——— جب ان دونوں میں سے کوئی نہ ہوتا تو ان کی جھنجلاہٹ باورچی خانے کے برتنوں پر اترتی، ہمارا حال یہ کہ ہم کبھی دال میں سے مرچ نکالتے تو کبھی ساگ سبزی میں سے کنکر ——— بستروں میں سے کبھی دری غائب ہو جاتی تو کبھی چادر، غسل خانے میں کبھی صابن نہ دکھائی دیتا تو کبھی تیل ——— کبھی بالٹی نہ ہوتی تو کبھی لوٹا نہ ہوتا۔ لیکن واہ رے ہم! ہماری بیوی ہمیں ناحق تنگ مزاج کہتی ہے، ہماری برداشت تو ان دنوں چنگیزوں کو بھی مات کر گئی تھی، ہم نے وہ حالت اختیار کر لی، کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہم پر اسی طرح اثر نہیں کر رہی تھیں جیسے برسات میں سطح بوندوں کے حملوں سے پہاڑوں کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

کوئی ایک بات ہو تو کہیں، جس دن ہم سیر کو جاتے وہیں باہر کھاتے پیتے تو ہمارے دوست کی بیوی گھر پر ہی رہتیں اور کسی قدر میاں بیوی بھی ساتھیں، لیکن جب ہم گھر میں ہی رہتے تو ان کا دل ایک دم گھر سے فرنٹ ہو جاتا، تو اکثر انھیں کوئی باہر کا کام آ نکلتا، تب پانی کیلئے، پان کیلئے، ایش ٹرے اور اگالدان کیلئے موہن اور ان کے باپ ہی نہیں ہمیں بھی ہاتھ پاؤں ہلانے پڑ جاتے تھے۔

تین دن تو ہمارے دوست ہمارے قابو میں رہے لیکن چوتھا دن آتے آتے وہ بھی حوصلہ چھوڑ بیٹھے، یا تو ان کی بیوی نے انھیں بھرا ہو یا خود ہی انھیں عقل آ گئی ہو کہ صبح ہی انھوں نے بیٹھک میں ٹنگے میرے کپڑوں کو اٹھا کر میرے اٹیچی پر پھینک دیا، بولے "اس طرح یہ پھیلے ہوئے ٹھیک نہیں لگتے۔"

ہم پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، تو میری بار بار پان کھانے کی عادت پر لیکچر پلایا گیا، ہم نے سوچا کہ یہ تو حضرت کی پرانی عادتیں ہیں لیکن جب دوپہر کو کھانے میں میرے ساتھ وہ صرف دو روٹیاں کھا کر ہی اٹھ گئے تو پہلی بار میرا ماتھا ٹھنکا ——— معاملہ جیسا ہم سمجھتے تھے ویسا نہیں، بہت گمبھیر ہے، شام کو آئے تو کسی بات پر اپنی بیوی سے اس قدر الجھ پڑے کہ مجھے شک ہوا، کہیں مار پیٹ نہ ہو جائے، ہم نے ادھر کان لگائے اور معلوم کرنا چاہا آخر بات کیا ہے؟ جو کچھ سنا اس کا نچوڑ یہ ہے،

"تو میں کیا کروں، یہ کمبخت تو ملتا ہی نہیں"

"وہ ملتا نہیں یا تم ٹالتے نہیں، تمہیں کیا، بھگتنا تو مجھے پڑتا ہے۔"

"تو بھاگوان! بتا میں کیا کروں؟"

"میں بتاؤں! پھینک دو اس بے حس کی اینٹھی باہر، مڑا، ایسا جم گیا ہے جیسے اس کے باپ کا گھر ہو"

لکھنؤ کی ہماری مہمان داری اب کلائمیکس پر پہنچ گئی تھی، نہ جانے کیوں تلسی داس کی یہ چوپائی (رباعی) ہمیں یاد آئی،

"آگے چلے بہری رگھو رائی"

ہم نے اپنا سامان اٹیچی میں ٹھونسا، بستر لپیٹا، کپڑے پہنے اور ہمارے دوست اندر سے آئے تو ہم نے اُن سے کہا "اچھا بھائی نمستے"۔

ہمارے دوست کے دل میں کیا تھا یہ تو وہی جانتے ہوں گے، مگر ظاہراً انھوں نے یہی کہا، "ارے ابھی سے"

ہم نے اپنے دل میں سوچا ——— بس، اتنی ہی یادگار کافی ہے لکھنؤ کی ——— لیکن ہم نے یہی کہا "چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اب چلنا ہی چاہیئے۔"

ہمارے دوست نے لمبی سانس لی، جس کا ایک مطلب جدائی کا غم تھا اور دوسرا مطلب تھا۔ چلو پاپ کٹا۔ ہم نے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، جو مل گئی وہی ریل پکڑ لی، جس درجے کا ملا ٹکٹ خریدا، جہاں ملی جگہ ——— وہاں بیٹھ گئے۔ جب گارڈ نے سیٹی بجائی اور جب سچ مچ وہ چل پڑی تو اس کے پہیوں کی دُھن کے ساتھ میرے دل میں بھی یہ کہاوت گونج اٹھی،

"جان بچی اور لاکھوں پائے"

ہندی دوہے

یہ نفس انسانی کی کمزوری ہے کہ وہ کسی حقیقت کو بھی جو اس کے لئے باعث ذلت ہو تلخ سمجھ کر گوارا نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی وہ ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لئے دوسروں کی آبروریزی یا تقلیل عزت کا آرزومند ہے۔ انہیں دو نفسانی قوتوں کے باعث انسان میں تکبر اور عیب جوئی کی خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو ذلیل ٹھیراتا ہے تو دوسرا اپنے کو اور زیادہ حقیر سمجھتا ہے۔ اس باہمی تنازعہ کو شاعرانہ تمثیلات میں یوں ادا کیا گیا ہے ؎

سونا کہے سنار سے کہ اُتّم میری ذات ۔۔۔ کارے منہ کی گھونگچی تلئے ہمارے ساتھ
لالن کے ہم لال ہیں اور لالوی ہمرو رنگ ۔۔۔ کریا منہ جب سے بھیو تلے بیٹھ کے سنگ

سونا سنار سے کہتا ہے کہ میری ذات اعلیٰ ہے (اور کیا غضب ہے) کہ کالے منہ کی گھچی ہمارے ساتھ تولی جاتی ہے۔ اس تحقیر پر گھچی برافروختہ ہو کر کہتی ہے کہ "لالوں کے ہم لال ہیں اور ہمارا رنگ بھی لال ہے (ہمارا) منہ تو کالا اس وقت ہوا کہ ذلیل کے ساتھ تولے گئے۔"

شاہی درباروں میں، امراء و روسا کے دوست احباب میں اور سلطنت کے عہدہ داروں میں بالعموم انہی لوگوں کو اپنی قدر و منزلت کے لئے سب سے زیادہ کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جو مقابلۃً سب سے زیادہ ایماندار، محنتی، جفاکش اور عقلمند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جعلساز، ریاکار، فریبی اور منہ چڑھے لوگ اسی طرح اپنے حاکم کو محکوم کر لیتے ہیں۔ جس طرح کہ منشیات نفس انسانی کو تسخیر کرتی ہیں۔ آجکل بھی وہی لوگ زیادہ تر معتوبین میں شمار کئے جاتے ہیں جو صداقت، خلوص، سچائی اور نیک چلنی سے خدمات انجام دیتے ہیں اور جو لوگ جھوٹ موٹ باتیں بناتے پھرتے ہیں خوشامد کرتے ہیں انہیں گھر بیٹھے دھن دولت عزت آبرو سب ہی میسر ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

سانچے کوئی نہ پتیائے، جھوٹے جگ پتیائے
گلی گلی گورس پھرے، مدیرا بیٹھ بکائے

سچے آدمی کی قدر بہت کم ہوتی ہے۔ جھوٹے آدمی (اپنی لفاظی کی بدولت) قابل اعتماد تصور کئے جاتے ہیں۔ دودھ (اس وقت فروخت ہوتا ہے جبکہ وہ) گلی گلی پھرتا ہے اور شراب (شراب خانہ ہی پر) بکتی ہے۔

سبئے سہائک سبل کے، کوئی نہ نبل سہائے
پون جگاوت آگ کو، دیپہی دیت بجھائے

سب ہی طاقتوروں کے مددگار ہوتے ہیں، کمزور کی کوئی بھی اعانت نہیں کرتا۔ ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے اور چراغ کو بجھا دیتی ہے۔۔۔

خراٹے کس طرح بند کئے گئے

[ذیل کا مضمون اخبار رفیقِ ہند لاہور مورخہ ۱۸ نومبر ۱۸۹۹ء جلد ۱۰ نمبر ۴ سے لیا گیا ہے۔
یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۴ء میں مولوی محرم علی چشتی مرحوم نے مطبع خداداد لاہور سے جاری کیا تھا اور ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۹ء تک سات سال کے وقفہ کے علاوہ ۱۹۰۳ء تک برابر اپنی پُر زور تحریروں سے ملک میں ہنگامے برپا کرتا رہا۔ مولوی محرم علی چشتی فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں کے بے پناہ شاعر تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اپنی آخری عمر میں ہائیکورٹ پنجاب کے ایڈووکیٹ، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن اور خان بہادر بھی ہو گئے تھے۔ وکالت میں خوب نام پیدا کیا، بہت کمایا لیکن خوب اڑایا یہاں تک کہ کوڑی کفن کے لیے نہ رکھی۔
مولوی صاحب بنیادی طور پر صوفی تھے مگر فطرتاً شوخ اور ظریف۔ ان کی ظرافت کا کمال اس مضمون میں ملاحظہ فرمایئے]

۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء کا تذکرہ ہے۔ مسٹر بجن کے ہمراہ (جن کو میں اردو و فارسی پڑھایا کرتا تھا) مجھے سیر کشمیر کا اتفاق ہوا صاحب ممدوح کو سیر و شکار کا خاص شوق تھا اور وہ ماہ اکتوبر کے اخیر تک کشمیر ہی میں قیام پذیر رہے۔ کیونکہ سری نگر میں بوجہ رونق افروزی لارڈ لینسڈون صاحب بہادر سابق گورنر جنرل کشور ہند خاص رونق تھی۔ صاحب بہادر کا ارادہ بھی کشمیر میں زیادہ قیام فرمانے کا تھا اور مجھے کسی خاص خانگی ضرورت کی وجہ سے صاحب بہادر کو وہیں چھوڑ کر سری نگر سے واپس آنا پڑا۔

بارہ مولا سے آگے چل کر تقریباً نصف رستہ میں گڑھی کا پڑاؤ ہے جہاں شب باش ہونا پڑتا ہے اور مقام گڑھی میں ایک ڈاک بنگلہ ہے۔ یہی ڈاک بنگلہ ہے جہاں انگریز مسافروں کے ہاتھ سے ہندوستانی مسافروں کے پٹ جانے کی خبریں اخبارات میں گشت کرتی رہتی ہیں۔ یہ مقام ہندوستانی مسافروں کے لیے خالی از خطرہ نہیں۔ کیونکہ آئی جاتی دفعہ صاحبان یورپین اس ڈاک بنگلہ میں گزرتے [illegible] [illegible] پڑتا ہے اور جب وہ ذرا شکتے تو اس کا لازمی علاج بھی عمل میں آتا ہے۔

[illegible]

آتے ہی خانساماں سے اس کی مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

جوان: کوئی کمرہ خالی ہے؟

خانساماں: جی ہاں! ایک کمرہ ہیں یہ صاحب (میری طرف اشارہ کر کے) اُترے ہوئے ہیں۔ باقی سب کمرے خالی ہیں مگر ان میں بہت سے صاحب لوگ آنے والے ہیں۔

جوان: بوکھیجی یہ قواعد ڈاک بنگلہ تم نے خود آویزاں کر رکھے ہیں ان میں صاف لکھا ہے کہ جو مسافر پہلے آئے وہ جس کمرہ کو خالی پائے اس میں اپنا قبضہ کر لے۔ تم مجھے کمرہ میں داخل ہونے سے روک نہیں سکتے۔

خانساماں: حضور! ہم تو کسی کو نہیں روکتے۔ حضور کی بھلائی کے لیے عرض کرتے ہیں۔ پیچھے اگر دنگا فساد ہوا تو حضور جانیں۔

جوان: اچھا جی! ہم خود سمجھ لیں گے۔ تم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں اس جوان شخص کی جرأت اور کینڈے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کسی دھمکی میں نہیں آتا حالانکہ لباس اور وضع سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا مگر ایسے استغنا سے جواب دیتا تھا کہ گویا بڑا جلیل القدر شخص ہے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک نہایت موٹا ڈنڈا (جو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم بیس سیر کا تھا اور جس سے بڑھ کر موٹا ڈنڈا میں نے تمام عمر میں نہیں دیکھا) موجود تھا۔ ان کی اس وحشت ناک حرکت سے میں نے خیال کیا کہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ غرضیکہ جوان مذکور سے چند خانساماں نے التجا کی کہ پچھلے پہلو کی طرف جو ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اس میں وہ اپنا اسباب رکھوا دے مگر اس نے مطلق نہ مانا اور رٹ کر اپنا اسباب اسی بڑے کمرے میں رکھوایا جو تمام ڈاک بنگلہ میں سب سے زیادہ وسیع ہے اور دریا کی طرف کو نہایت پُرفضا موقع پر واقع ہے اور اسباب کے پاس اپنے نوکر کو بٹھا کر آپ دریا کے کنارے سیر کے لیے اتنی دور چلا گیا کہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ جاتی دفعہ خانساماں کو حکم دے گیا کہ اپنے اسلامی برتنوں میں میرے لیے پلاؤ اور قورمہ اور بھنا ہوا مُرغ تیار رکھنا۔

اتنے میں شام ہو گئی تھی۔ ٹانگوں کی گھر گھراہٹ شروع ہو گئی اور یکے بعد دیگرے چھ ٹانگے احاطۂ ڈاک بنگلہ کے اندر داخل ہوئے اور ان میں سے کل دس لیڈیاں اور آٹھ یورپین جنٹلمین اُترے اور بنگلہ کے احاطہ میں پہنچتے ہی ایک شور و غل سنائی دیا۔ خانساماں کو جھڑکنا شروع کیا کہ تمام کمرے خالی کیوں نہیں رکھے گئے؟ اور دیسیوں کو ان میں کیوں آتارا گیا ہے اور "ایک دم سب کو کمروں سے نکال دو" کا نادری حکم جاری ہو گیا۔ جب خانساماں نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا تذبذب کیا تو دو صاحب بہادر خود آگے بڑھے اور سب سے پہلے اس جوان شخص کے نوکر سے کہا کہ "جھٹ پٹ اسباب نکالو" غرضیکہ ملازم دوڑا ہوا گیا اور تقریباً آٹھ منٹ کے عرصہ میں واپس آ کر بیان کیا کہ اس کے مالک صاحب ابھی نماز شام پڑھنے میں کنارِ دریا پر مصروف ہیں اور تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ صاحب بہادروں نے دھمکایا کہ "ڈیم مالک! جلدی اسباب نکالو" اس نے کہا "حضور! ابھی ابھی چلے آتے ہیں"۔

غرضیکہ ادھر پانچ سات منٹ کی مہلت تخلیۂ کمرہ کے لیے دے کر صاحب بہادروں کی یورش میرے کمرہ پر ہوئی اور بڑا لال منہ چھو کر کے فرمایا کہ "ول! تم جلدی اپنا اسباب نکالو" میں انگریزوں کے تیوروں کے پہچاننے کا عرصہ سے عادی ہوں اس لیے یہ سمجھ کر کہ ذرا بھی چوں چرا کی گئی تو ابھی ٹھوکروں سے تواضع کی جائے گی۔ دست بستہ عرض کیا کہ "بہت اچھا غریب نواز! اکثر یہ کہ جس کمرہ میں حکم ہو چلا جاتے" اس پر حکم صادر ہوا کہ "ٹمول تم دیکھتا ہے کمرہ کوئی خالی نہیں۔ تم شاگرد پیشہ والی کوٹھری میں چلا جاؤ"۔ "بہت اچھا حضور!" کہہ کر میں اپنا اسباب اور بستر

[illegible] تھا۔ میرا ملازم محمد رمضان ایسا سٹپٹایا کہ اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے اسباب کے باندھنے میں سینکڑوں غلطیاں کر رہا تھا۔
اتنے میں دیکھا کہ دور سے وہی جوان مسافر چلا آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ حضرت کے ہوش و حواس اس زبردست جماعت کو دیکھ کر [illegible] ہو جائیں گے۔ وہ پہلی شیخی کرکری ہو جائے گی اور تمام ستی پٹی بھول جائے گی مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوان مذکور ایک ہاتھ میں وہی سوٹا [illegible] دبا کے سوٹوں کا مورثِ اعلیٰ سمجھا چاہیے) سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے ایک عجیب [illegible] اور وقار کی چال سے چلے آتے ہیں اور چہرہ سے ایسا استغنا برس رہا ہے گویا کچھ پرواہ ہی نہیں۔ جوان مذکور جب اس جنٹلمین اور لیڈی صاحبان [illegible] کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جوان کا رعب اس مجمع پر چھا جانے کے آثار ان کے چہروں اور بشروں سے نمایاں تھے۔ یا تو اس مجمع نے [illegible] شور و غل مچا رکھا تھا اور سب یہی کہتے تھے "وہ وئی ول کک ہم آؤٹ" (یعنی ہم اسے لاتیں مار کر کمرہ سے نکال دیں گے) یا جب جوان مذکور [illegible] پہنچا تو ایک کی جرأت بھی اس سے بات کرنے کی نہ ہوئی۔ جوان نے اہلِ مجمع میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ اسی معمولی بے پروائی [illegible] مجمع مذکور کے پاس سے گذر کر سیدھا اپنے کمرہ کے رُخ کو چل دیا۔
اتنے میں اہلِ مجمع میں سے ایک صاحب بہادر نے (جو بعد میں معلوم ہوا کہ فوجی کرنیل تھے) پیچھے سے جوان مذکور کو آواز دی کہ [illegible] "جس پر اس نوجوان نے پیچھے مڑ کر انگریزی میں کہا کہ "میری توہین مت کیجیے۔ میں بابو نہیں ہوں۔" اور اتنا کہہ کر اپنے کمرہ کے اندر داخل [illegible] اہلِ مجمع کے چہرے زرد پڑ گئے اور میں اپنے اسباب کو اٹھوا کر شاگرد پیشہ کے مکانات کی طرف جانے کو تھا کہ نوجوان مذکور کا ملازم مجھے [illegible] لے گیا اور نوجوان نے میرا حال سُن کر کہا کہ "آپ ہرگز اس طرف نہ جائیے یہی کمرہ حاضر ہے اور یہیں قیام فرمائیے۔" میں نے بخوشی اس [illegible] منظور کر لیا اور چونکہ اس جوان سے کوئی سابقہ تعارف نہ تھا اور اس نے مجھ سے دریافت نہیں کیا تھا کہ میں کون ہوں، خود مزید حالات [illegible] استفسار سے زبان کو بند رکھا اور جو حیرت مجھے اس جوان کی زبان سے ایک مختصر بامحاورہ انگریزی فقرہ بالکل انگریزی لہجہ میں سُن کر ہوئی تھی [illegible] کو بھی مخفی رکھا۔

اتنے میں خانساماں اس نوجوان کا کھانا پکا کر میز پر لایا جس میں نوجوان مذکور نے مجھے شامل کیا۔ اس سردی کے وقت میں سخت [illegible] لگی ہوئی تھی۔ سفر کی تھکان، غرضکہ اس دن کے پلاؤ اور قورمہ اور بھنے ہوئے مرغ اور انڈوں اور چائے کا ذائقہ کوئی میرے ہی دل سے [illegible] انگریزوں کی صحبت میں کثرت سے رہنے کے باعث جس کم بخت چیز کے پینے کی مجھے عادت ہو گئی ہے اس سے محروم رہا مگر اور [illegible] طرف سے دعوت تکلف کی تھی۔

ابھی ہم لوگ کھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ یورپین مجمع مذکور میں سے ایک صاحب بہادر (جو بعد میں معلوم ہوا کہ ممالک مغربی [illegible] کے ایک ضلع کے کلکٹر تھے) کمرہ کے اندر تشریف لائے۔ جوان مذکور اسی طرح کرسی پر بیٹھے ہوئے کھانے میں مصروف رہا مگر میں اپنی [illegible] عادت سے مجبور ہو کر دفعتاً کھانا کھاتے کھاتے کھڑا ہو گیا۔ اب جوان اور کلکٹر صاحب کی گفتگو جو انگریزی میں ہوئی قابلِ شنید تھی۔
صاحب کلکٹر: میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے کھانا کھانے میں مداخلت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم آٹھ یورپین ہیں جن میں [illegible] اور دس لیڈی صاحبان ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک فوجی لفٹیننٹ جو سخت بیمار ہو گیا ہے وہ بھی ہمارا رفیقِ سفر ہے۔
پس آپ کی مہربانی ہو گی اگر ہماری خاطر آپ اس کمرہ کو خالی کر دیں۔
جوان: مجھے آپ کی تکلیف کا افسوس ہے مگر آپ مجھے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کمرہ خالی کر کے خود کہاں رات بسر کروں؟

صاحب کلکٹر: آپ یا تو شاگرد پیشہ والے مکان میں چلے جائیں یا برآمدہ میں گزارہ کر لیں۔

جوان: شاگرد پیشہ والے مکان میں جا کر رہنا تو میرے فیلنگ کے ویسا ہی خلاف ہے جیسا کہ آپ کے فیلنگ کے خلاف ہے باقی رہی برآمدہ کی رہائش سو آپ دیکھ لیجیے کہ میرے جسم کا کونسٹیٹیوشن ایسا مضبوط نہیں اور میں ایک اہل قلم شخص ہوں ... خیال میں بہادر اور مضبوط فوجی افسر جو کوہستانی معرکوں کے غالباً تجربہ کار ہوں گے رات کے اس سرد موسم کی ... زیادہ دلیری سے مقابلہ کر سکیں گے۔

صاحب کلکٹر: تو آپ کمرہ خالی نہیں کر سکتے؟

جوان: ہاں! مجھے افسوس ہے کہ یہی ناگوار جواب اس کم بخت موقع پر دے سکتا ہوں جبکہ میں اور آپ یکساں عالم مسافرت میں ہیں۔

صاحب کلکٹر: تو پھر آپ اس کا کوئی چارہ بتائیں۔

جوان: میرے پاس تو کوئی چارہ سوائے افسوس کے نہیں اور بجز زبانی ہمدردی کے اور کیا کر سکتا ہوں خصوصاً جبکہ حتیاً اعتدال بڑھی ہوئی ہمدردی میری صحت اور جان کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔

صاحب کلکٹر: مجھے آپ سے ایسا روکھا پھیکا جواب سننے کی توقع نہ تھی۔ اگر آپ کے ساتھ آپ کے خاندان کی عورتیں ہوتیں تو میں خود تکلیف اٹھا لینے میں تامل نہ کرتا اور اگر آپ کا کوئی بیمار رفیق ہوتا تو میں اس کے لیے ہر قسم کی سہولت کا سامان پیدا کر دیتا۔

جوان: مگر لیڈی صاحبان اور بیمار لفٹیننٹ صاحب کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔

صاحب کلکٹر: وہ کس طرح؟

جوان: لیڈی صاحبان کی رہائش کے لیے کافی کمرے موجود ہیں۔ ایک ایک کمرہ میں دو دو لیڈیاں آرام فرما سکتی ہیں اور لفٹیننٹ صاحب کو آپ میرے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔

صاحب کلکٹر (کسی قدر چیں بجبیں ہو کر): بہت اچھا صاحب! میں اتنا ہی غنیمت سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج میں اس قدر ہمدردی ہے کہ آپ ایک بیمار کو اپنے کمرہ میں پناہ دیتے ہیں۔ میں لفٹیننٹ کو ابھی یہاں بھیج دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں لفٹیننٹ صاحب (جو واقعی بیمار معلوم ہوتے تھے) ہمارے کمرہ میں داخل ہوئے اور ایک کوچ پر دراز ہو گئے۔ اب صرف ایک کوچ باقی رہ گئی تھی جس پر جوان مذکور نے مجھے لٹا دیا اور خود فرش پر ایک طرف بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میں فرش پر لیٹنے کا عادی ہوں مگر جوان مذکور نے ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر کہ آپ مہمان عزیز ہیں خود فرش پر ہی گزارہ کیا۔

ہم دونوں کو لحاف اوڑھ کر لیٹے ہوئے صرف پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ صاحب بہادر کی چارپائی سے "خر ر خر ر خر" کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ صاحب بہادر کے خراٹوں کی آواز تھی جو پہلے دھیمی سُر سے شروع ہوئی مگر بعد میں "خرر خر"، "خرر خرر" کے ایسے پُر زور آواز سے نکلنے شروع ہوئے کہ الاماں والحفیظ! بلا مبالغہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ریلوے ورکشاپ کا انجن ... جہاں سالتی کی حالت قابل دید تھی۔ گو میں بھی خراٹوں کی آواز سے گھبراتا تھا مگر ہمارا نوجوان مسافر تو اپنے لحاف میں ... کی حالت میں معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا کبھی سر جھکا لیتا تھا کبھی پھر لیٹ جاتا تھا ... اٹھ کر آئے۔ اب ... گئے۔ لحاف سے سر نکال کر ...

[illegible] سے باہم گفتگو ہوئی اور پھر باہم ہماری قیل و قال بھی شروع ہو گئی :

[illegible] : حضرت! اس کم بخت کے خراٹوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

[illegible] : واللہ طبیعت کا برا حال ہے۔ ابھی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج کی نیند حرام ہے۔

[illegible] : اوہو! خوب یاد آیا۔ میں نے آج رات نمازِ عشاء نہیں پڑھی اور جناب باری سے یہ اسی بات کی سزا تجویز ہوئی ہے کہ جس نیند کی خاطر میں نے آج رات کی نماز اور وظیفہ کو چھوڑ دیا اسی نیند سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ لیجیے میں تو نماز اور وظیفے کے لیے اٹھتا ہوں۔

اس کے بعد جوان مذکور نے اٹھ کر ایک گوشہ کی طرف وضو کیا اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر بعد ازاں ذکر جہر لا الٰہ الا اللہ کا کرنا شروع کیا۔ یہ [illegible] گردن کو دائیں طرف لے جا کر لا الٰہ تو کسی قدر آہستہ آواز سے کہتا تھا مگر الا اللہ اس زور و شور کے ساتھ نعرہ مار کر کہتا تھا کہ تمام کمرہ [illegible] تھا حتیٰ کہ پہلے دو تین مرتبہ تو میں بھی تھرا اٹھا۔ اللہ اکبر! نعرہ کیا تھا ایک شیر ژیاں یا رعد کی گرج تھی۔ جوان مذکور نے ابھی دس بارہ ہی نعرے [illegible] ہوں گے کہ لفٹیننٹ صاحب تو تھرا کر جاگ اٹھے اور خراٹوں کی بلا سے نجات ہوئی مگر ان کی خونخوار آنکھوں اور جوشِ غضب سے تمتمائے ہوئے [illegible] کو دیکھ کر مجھے ایک اور بلائے عظیم سے سابقہ کا اندیشہ ہوا۔ لفٹیننٹ صاحب اپنی کوچ پر بیٹھ گئے اور جوان کو آوازیں دینی شروع کیں مگر [illegible] شیر برابر پر زور کڑک کے ساتھ قبلہ رو بالکل متوجہ اور محو ہو کر الا اللہ الا اللہ کیے جاتا تھا۔ جو حالت ہم دونوں پر لفٹیننٹ صاحب کے [illegible] سے گذری تھی یعنی جس طرح جوان مذکور ان کے خراٹوں سے تنگ ہو کر کبھی لیٹ جاتا تھا، کبھی کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی اٹھ بیٹھتا تھا وہی [illegible] اب لفٹیننٹ صاحب کو پیش آئی کہ وہ بیچارے عجیب مصیبت میں گرفتار تھے اور کبھی تنگ ہو کر جوان مذکور کو پکارنا بھی شروع کر دیتے تھے [illegible] کے جواب میں سوائے الا اللہ کے پُر زور نعرہ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لفٹیننٹ صاحب منہ میں بڑبڑا کر شاید کچھ برا بھلا کہتے تھے اور [illegible] ان کے پُر رعب چہرہ سے ایسا خوف معلوم ہوتا تھا کہ میں دم سادھ کر بالکل خاموش پڑا ہوا تھا اور ایسی وضع بنائی تھی کہ گویا مست خواب [illegible] ہوں۔ کچھ عرصہ کے بعد جوان مذکور نے اپنے نعروں میں وقفہ کیا اور منہ میں آہستہ سے کچھ پڑھ کر صاحب بہادر کی طرف مخاطب ہوا۔ اس [illegible] یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی :

[illegible]ان : آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے ؟

[illegible]ننٹ صاحب : یہ آپ کیا کر رہے ہیں ؟

[illegible]ان : میں خدا کی عبادت کر رہا ہوں۔

[illegible]ننٹ صاحب : یہ کس قسم کی عبادت ہے ؟

[illegible] : یہ ہمارے مذہب کے مطابق ہے۔

[illegible]ننٹ صاحب : آپ جواب کیوں نہیں دیتے تھے ؟

[illegible]ان : ہمارے مذہب کے مطابق عبادت میں بولنا منع ہے اور اب بھی آپ کے بولنے کے باعث میری مذہبی رسم میں مداخلت [illegible]۔ اب مجھے نہ بلائیے گا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

[illegible]ننٹ صاحب (حیران اور پریشان ہو کر) : یہ آپ کی عبادت کب تک جاری رہے گی ؟

[illegible] [illegible] عبادت کروں گا۔ بعد ازاں دو تین گھنٹہ سو کر پھر صبح کے وقت ایک گھنٹہ [illegible] عبادت کروں گا۔

لفٹیننٹ صاحب (سخت حیران و غمزدہ ہو کر): تو پھر ہم کو ساری رات آپ کی عبادت کے باعث جاگنا پڑے گا۔
جوان: نہیں میرے ساتھ آپ کے جاگنے کی ضرورت نہیں۔ آپ شوق سے آرام فرمائیے اور اب مجھے نہ بلائیے گا۔

اس کے ساتھ ہی اسی سیکنڈ اور اسی لمحہ میں جوان مذکور نے پھر گھنٹے زور کے ساتھ اللہ اللہ کے نعرے شروع کر دیے۔ اللہ اللہ اور الا اللہ اس زور کے ساتھ کہ سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ڈاک بنگلہ ہی نہ گر پڑے۔

ابھی ہمارے جوان دوست کو پانچ دس منٹ ہی نعرے لگاتے ہوئے گزرے ہوں گے کہ لفٹیننٹ صاحب پلنگ پر سے اٹھے اور کچھ عرصہ منہ میں بڑبڑاتے رہنے کے بعد خانساماں اور بیرا کو آواز دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ وہاں کمن موجود تھا جو باہر سے آواز دے۔ صاحب بہادر نے خود اپنی چارپائی اور بستر کو کمرے سے اٹھایا اور باہر لے جا کر برآمدہ میں دراز ہو گئے۔

صاحب بہادر رنگ روپ رخصت ہوئے اور جوان برابر نعرے لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد فارغ ہو کر دعا مانگی اور جانماز کو تہ کر کے رکھ دیا۔ بعد ازاں کمرہ کے دروازے کی چٹخنیاں اندر سے لگا دیں اور خاموش اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت کی میری کیفیت کچھ نہ پوچھیے کہ مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے مگر نوجوان مذکور کی حالت قابل دید تھی کہ نہ ماتھے پر بل تھا اور نہ لب پر تبسم۔ اس کی متین اور معقول اور ثقہ صورت اور باتیں مہر۔ یہ چہرہ کو دیکھ کر مجھے اور بھی سخت ہنسی آتی تھی کہ عجب ستم ظریف شخص ہے اور اپنے مزاج پر عجب قابو رکھتا ہے کہ لبوں تک تبسم سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا بلکہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ آخر آپ اس قدر ہنستے کیوں چلے جاتے ہیں؟"

مجھے اس شخص کی جرأت، بہادری، حاضر جوابی اور ظریف مزاجی نے ایسا فریفتہ کر لیا تھا کہ اتنی بے تکلفی کے بعد میں نے اس کا نام دریافت کرنا ضروری سمجھا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کا ایک معروف و مشہور شخص ہے جس سے گو میری ظاہری ملاقات نہ تھی مگر میں غائبانہ اس کے حالات سے واقف تھا اور اس کے ملکی و قومی خیالات کو پڑھ کر بالخصوص اس وجہ سے میں اس کا سخت مخالف تھا کہ وہ ہماری قوم کے محسن اور مربی عالی قدر شیدائے قوم حضرت سرسید احمد خاں صاحب بہادر مرحوم کی بے جا مخالفتیں کرتا رہا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ جس شخص کے ساتھ میری اس قدر غائبانہ مخالفت تھی اس نے نادانستہ اور بے اختیاری کی حالت میں میرے دل پر عجیب طرح سے قبضہ کر لیا۔ اس وقت سرسید مرحوم کے بارے میں میں نے بہت کچھ تذکرہ اس سے کیا مگر اس شخص کو میں نے اپنی رائے میں ایسا ضدی اور اپنے عقیدے میں ایسا متعصب اور کٹر پایا کہ ذرہ بھر بھی اس کی رائے میں فرق نہ آیا اور اگر وہ الٹا مجھے سرسید کا مخالف بنانا چاہتا تھا مگر اس مرحوم کی قومی خدمات کا جو نقش بیٹھا ہوا ہے وہ تمام دنیا کی مخالفت اور کسی قسم کے دلائل پیش کرنے پر بھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا اور مرتے دم تک محو نہیں ہو سکتا۔ (گستاخی معاف! یہ تو ابوجہل والی ضد ہے۔ اڈیٹر)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کچھ عرصہ کی گفتگو کے بعد ہم نے آرام کیا اور خراٹوں کی بلا سے مخلصی پا کر مزے سے میٹھی نیند سوئے۔ علی الصباح ٹانگوں نے وہاں سے روانہ ہونا تھا اور ہم لوگ سویرے سے تیار ہو گئے اور بقچہ بندھنا سنبھال کر باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ رات والی تمام پارٹی ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں موجود ہے اور اندر سے بلند صدائیں بات چیت کی سنائی دیتی ہیں۔ نوجوان مذکور اور بندہ نے کان لگا کر سنا تو جوان مذکور کو خوب صلواتیں پڑ رہی تھیں۔ مجمع کے صاحب بہادر مع لفٹیننٹ صاحب کے جن کو رات کے وقت برآمدے کی سردی نے سخت پریشان کر رکھا تھا ٹھٹھر رہے تھے اور جس شخص کے باعث یہ تکلیف ان کو نصیب ہوئی اس کو صلواتیں سنانے سے

بیٹھے باز رہ سکتے تھے۔ کوئی دانت پیستا تھا اور کوئی کھسیا کر رہ جاتا تھا۔ گفتگو پُر از غضب تھی۔ اس وقت میں نے اپنے جوان ساتھی کے بشرہ اور چہرہ کو غور سے تاڑا تو اس ساری گفتگو کو سن کر نہ تو اس کے چہرہ پر جوش و غضب کے آثار نمایاں ہوئے اور نہ کوئی ڈر یا خوف یا سہم کے نشان پائے جاتے تھے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی خاص حرکت کا مرتکب ہی نہیں ہوا اور بڑے مزے سے اسی وقت مجھ سے کہا کہ "آؤ چلو ہم بھی اندر چل کر چائے پئیں"۔ میں پہلے تو اندر جانے سے ہچکچایا کیونکہ میری طبیعت میں احتیاط بہت ہے مگر بعد میں جوان مذکور نے اس زور سے پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا کہ میں اس کے ساتھ ہی کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرہ کے اندر ہمارے داخل ہوتے ہی سب حاضرین پہ عالمِ خاموشی طاری ہو گیا۔ ایک دفعہ تو کنکھیوں سے سب نے ہماری طرف دیکھا مگر ہماری طرف سے منہ پھیر کر آپس ہی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میز کے گرد چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ معمولی چوکیوں پر صاحبان بہادر بیٹھے تھے اور آرام کرسیوں پر لیڈی صاحبان تشریف فرما تھیں۔ شراب کی بوتلیں میز پر موجود تھیں اور ہر ایک کے آگے گلاس اور چائے کے پیالے، بسکٹ اور اُبلے ہوئے انڈے وغیرہ موجود تھے۔ شراب ناب نے ان کو کسی قدر گرما دیا تھا اور سب کے سب کیف و سرور کے عالم میں تھے۔

اب ہمارے ہیرو کی کیفیت سنیے کہ میز کے ایک کونے کی طرف کمال بے پروائی اور استغنا سے کرسی پر ڈٹ گئے اور اپنے قریب دوسری کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور طرفہ حرکت یہ کی کہ وہ اپنا سونٹوں کا باوا آدم بھی میز پر اپنے سامنے رکھ دیا جس کو دیکھ کر بعض لیڈی صاحبان مسکرائیں۔ جوان مذکور نے خانساماں کو حکم دیا کہ چائے کی دو پیالیاں اور چار اُبلے ہوئے انڈے اور کچھ بسکٹ لائے۔ سب چیزیں اسی وقت میز پر موجود ہو گئیں اور ہم دونوں کھانے میں مشغول ہوئے۔

اس وقت تو سب طرح سے خیریت تھی اور کمرہ میں سناٹے کا عالم تھا مگر اس وقت سے ایک نیا سین شروع ہوا۔ رات والے لفٹیننٹ صاحب کی طرف میں نے دیکھا تو ان کے چہرے سے خون ٹپکا پڑتا تھا۔ دیگر فوجی کرنیلوں اور میجروں کے چہرہ سے بھی آشفتگی کے آثار نمایاں تھے۔ لیڈی صاحبان اس نوجوان کی حرکات کو حیرت اور استعجاب سے دیکھ رہی تھیں مگر یہ شیر اسی طرح ڈٹا ہوا بسکٹ اور چائے اُڑانے میں مشغول تھا۔ کسی کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ "کیوں حضرت! اس وقت چائے نے خوب مزا دیا ہے"۔

میں مارے ڈر کے سہما ہوا تھا اور مجھے یہ اندیشہ معلوم ہوتا تھا کہ "ابھی گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی"۔ میں جوان مذکور کی کسی بات کا جواب نہ دیتا تھا۔ صرف آہستہ سے ہوں ہاں غوں غاں کر کے ٹال دیتا تھا۔ اتنے میں میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور ایک دفعہ ہی رات والے لفٹیننٹ صاحب نے آنکھیں لال پیلی کر کے بڑے جوشِ غضب کے ساتھ جوان مذکور کی طرف مخاطب ہو کر اس کو سخت ڈانٹ بتائی اس وقت انگریزی میں دونوں کا جو کچھ مکالمہ ہوا اس کو بیان کرتا ہوں:

لفٹیننٹ صاحب (دانت پیس کر): تم بڑے گستاخ ہو۔

جوان (بڑے صبر، تحمل اور وقار کے ساتھ): کیوں؟ کیا مجھ سے کوئی گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی ہے؟

لفٹیننٹ صاحب (جھلا کر): تم نے یہ ڈنڈا کیوں میز پر رکھ دیا ہے؟

جوان (اسی طرح بڑے وقار سے): معاف فرمائیے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو اس ڈنڈے کی صورت دیکھنے سے ایسا خوف

معلوم ہوتا ہے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (ڈنڈا میز سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا) آپ تسلی رکھیے کہ یہ ڈنڈا بغیر اشد [illegible] ضرورت کے کبھی استعمال نہیں کیا جائے گا۔

لفٹیننٹ صاحب: تم نے رات بھی مجھے سخت تکلیف دی اور تمام رات مجھے سردی میں مارا۔

جوان (کمال حیرت کا چہرہ بنا کر بڑی سادگی سے): میں نے تو جناب والا (ریوالور) کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ آپ نے خود ہی ہماری مصاحبت کو پسند نہ فرمایا اور خود بخود کمرہ سے اٹھ کر باہر تشریف لے گئے جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس وقت اپنی عبادت میں مشغول تھا اور بول نہ سکتا تھا ورنہ میں ضرور آپ کو باہر جانے سے روکتا۔

لفٹیننٹ صاحب: ڈیم تمہاری عبادت! ایسی لغو عبادت کا فائدہ کیا ہے؟

جوان (اسی صبر و تحمل اور سادگی سے چائے پیتے ہوئے): ہماری عبادت کا اور کچھ فائدہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اتنا فائدہ تو ضرور آپ بھی تسلیم کر لیں گے کہ اگر کوئی خراٹے مار کر اپنے ساتھیوں کو بدمزا کرے اور ان کی نیند حرام کر دے تو ایسے شخص کے ساتھیوں سے خلاصی ضرور نصیب ہو جاتی ہے۔

جوان مذکور کے منہ سے یہ آخری فقرہ نکلا تھا کہ کمرہ میں ایک لطیف سین نظر آیا۔ ایک لیڈی صاحبہ جو آرام چوکی پر تشریف فرما تھیں ——— (اور جن کی نسبت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انہی لفٹیننٹ صاحب کی زوجہ مکرمہ تھیں) اس فقرہ کے سنتے ہی دفعتاً آرام چوکی سے بے تحاشا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور مارے ہنسی کے ایسی بیتاب ہوئیں کہ چائے کی پیالی جو ان کے ہاتھ میں تھی ان کے کپڑوں پر گر گئی۔ اب ستم یہ تھا کہ میم صاحبہ کی ہنسی بند ہونے میں نہیں آتی تھی۔ قہ قہ قہ قہ قہ قہ قہ قہ قہو قہو قہو قہو۔ قہی قہی قہی قہی۔ غرضکہ ان کی ہنسی کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ کئی منٹ تک ان کی ہنسی کا یہ عالم رہا اور جب وہ ذرا دفعہ لیتی تھیں تو صرف ایک آدھ سیکنڈ کا، پھر وہی ان کے اسی قہقہے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ لفٹیننٹ صاحب تو ان کے قہقہوں سے جھینپے جاتے تھے مگر دوسرے یورپین اور لیڈی صاحبان حیران و متعجب ہو کر میم صاحبہ کے منہ کی طرف دیکھتے تھے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ بڑی دیر کے بعد میم صاحبہ نے ہنسی سے دم لیا اور اس وقت اپنے شوہر جناب لفٹیننٹ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ڈیم! معلوم ہوتا ہے تم نے اس بیچارے جنٹلمین کو بھی اپنے خراٹوں سے تنگ کیا اور اس نے اپنی مخلصی کا حیلہ اپنی عبادت کو بنایا"۔ غرضکہ حاضرین کو میم صاحبہ نے اپنے شوہر کے خراٹے مارنے کا سارا قصہ سنایا اور فرمایا کہ وہ بعض اوقات میں بھی سخت تنگ ہو جایا کرتی ہوں۔

حاضرین کو ہمارے جوان ہیرو کی عجیب و غریب عبادت اور اس عبادت کی وجہ سے تنگ ہو کر کمرہ چھوڑ جانے کا قصہ تو لفٹیننٹ صاحب خود سنا چکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس متن پر میم صاحبہ کے حاشیہ نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اب فرمائیے کون لفنٹا ہنسے۔ تمام یورپین اور لیڈی صاحبان کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سب کے سب ورلڈ وار قہقہہ بن گئے اور بالاتفاق یہی کہتے تھے کہ عجب زندہ دل شخص ہے اور عجیب ترکیب سوجھی۔ حاضرین کے قہقہوں نے لفٹیننٹ صاحب کو اور بھی کھسیانا کر دیا۔ اس وقت تمام جنٹلمین اور لیڈیاں ہمارے نوجوان ہیرو کی طرف مخاطب تھیں مگر بل سبب خودداری اور اپنے جذبات پر قابو الاختیاری کہ اس شخص کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نمودار نہ ہوئی اور بڑی متانت سے مختلف سوالات کا جواب دیا جاتا تھا۔ بالخصوص میم صاحبہ کی گفتگو اور لفٹیننٹ صاحب کی [illegible] کی گفتگو پر ایسے شیدا معلوم ہوتے تھے کہ علانیہ عشق عشق کر رہے تھے۔ [illegible]

کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور لطیف تھی مگر اس کے لکھنے کے لیے اس طویل مضمون میں گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

یہی گپ شپ جاری تھی کہ سواری کے تانگے آن موجود ہوئے۔ وقت روانگی آن پہنچا۔ ہم سب لوگ کمرہ سے باہر نکلے اور اس وقت ہمارے ہیرو کو جس قدر اپنی قابلیت پر ناز ہوتا بجا تھا۔ کل جنٹلمین اور لیڈیاں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے کھڑی تھیں۔ سارا مجمع یک زبان ہو کر اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ سب نے یہی خواہش ظاہر کی کہ پھر کوئی موقع ملاقات کا ملے اور یکے بعد دیگرے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہوئے۔

اب ہمارے لفٹیننٹ صاحب کی سُنیے کہ وہ سخت کھسیانا چہرہ بنائے ہوئے ایک طرف کو منہ کر کے ہمارے پاس سے گزر کر تانگے میں جا بیٹھے ——— مگر بل بے بے خوفی! ہمارے نوجوان ہیرو نے ان کا تعاقب کیا اور تانگہ کے پاس جا کر ان سے بڑے عاجزانہ انداز کے ساتھ مؤدب وضع سے سامنے کھڑے ہو کر لفٹیننٹ صاحب کو انگریزی میں کہا کہ "اگر میری کوئی حرکت آپ کی ناراضی کا موجب ہوئی ہو تو بڑے ادب کے ساتھ اور کمال عجز کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔ آئیے اب سب رنجشوں کو دور کر کے باہم مصافحہ کر لیں۔" اس فقرہ کو لفٹیننٹ صاحب اور بھی جھلائے اور سخت کھسیانے ہو کر کمال غصہ کی حالت میں درشتی کے ساتھ فرمایا "میں تم سے ہاتھ نہیں ملاتا، تم جنٹلمین نہیں ہو۔" اتنے میں تانگہ والے نے گھوڑوں کو چابک لگایا اور دیکھتے دیکھتے تانگے وہاں سے کافور ہو گئے۔ ہم دونوں بھی اپنے تانگوں میں سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیے۔

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اگر یہ کوئی ناول یا قصہ ہوتا تو ناظرین کو ہمارے جوان ہیرو کا نام معلوم کرنے کے لیے بہت بیتابی نہ ہوتی۔ مگر چونکہ یہ میرا چشم دید قصہ ہے اور تمام حالات راست راست بلا کم و کاست لکھے ہیں اس لیے ناظرین ضرور اس جوان کا نام معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔ پس اب میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ناظرین کو زیادہ کبیدہ خاطری کی حالت میں رکھوں اور بلا تامل کھول کر بتا دیتا ہوں کہ اس مضمون کے ہیرو اسی رفیق ہند کے اڈیٹر ہمارے مولوی یا مسٹر محرم علی چشتی ہیں اور یہ سب انہی کی حرکات تھیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں درج ہے جس سے ناظرین قیاس فرما سکیں گے کہ جہاں ایک طرف آپ کے مزاج میں کمال درجہ کی ثقاہت ہے اسی طرح دوسری طرف آپ ظرافت میں بھی اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہیں۔ بغرضکہ ایک عجیب طرفہ معجون شخص ہیں۔

پنجاب پنچ

مولوی فتح الدین بسمل پنجابی اخبار نویسوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، وہ نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے والد مولوی جان محمد بھی لاہور میں ایک مشہور عالم گذرے ہیں۔ پنجاب کے اکثر مسلمان اور سکھ رؤسا نے ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔
بسمل نے ۱۸۸۰ء میں "اخباروں کے قبلہ گاہ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس کا ضمیمہ "پنجاب پنچ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ یہ غالباً پنجاب کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کا دفتر لاہور میں دہلی دروازہ کے اندر مسجد وزیر خاں کے متصل واقع تھا۔ مطبع کا نام بھی قبلۃ المطابع تھا۔ قبلہ گاہ کا ایک اشتہار ملاحظہ فرمائیے:

تشریف شریف کو وہ لائے لائے
پھر ہند نے بھی وہ رتبے پائے پائے
کیا دھوم مچی ہے کس خوشی میں بسمل
اخباروں کے قبلہ گاہ آئے آئے

اخبار کے اغراض و مقاصد ان دھواں دھار الفاظ میں ظاہر کئے جاتے تھے:۔
"اخبار ایک سچی شہادت کا نام ہے اور ملک کی خدمت کرنا اس کا کام ہے۔ منصب میں رعایا کا سفیر ہے اور قدر و منزلت میں گورنمنٹ کا مشیر باتدبیر۔ کبھی فریادی ہو کر ادب کے ساتھ گورنمنٹ کو پکارتا ہے، اور کبھی ناصح بن کر اچھی طرح رعایا کو للکارتا ہے۔ ہمیشہ بہبود ملک کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اپنی عادل گورنمنٹ کا ہر حالت میں دم بھرتا ہے۔ جمیع کمالات سے اپنے آپ کو ایسا بناتا ہے کہ جام جم اور آئینہ سکندری بھی شرماتا ہے۔ شائقان اخبار کو مصفا لوح محفوظ ہے اور طالبان مسرت کو مرقع محفوظ۔ اللہ اللہ مشتاقان دیدار کو کوہ طور ہے اور عباد زہاد کو جلوۂ نور دور بینوں کے واسطے دوربین ہے اور باریک بینوں کے واسطے خوردبین ہے۔ جب کبھی کاملوں کو اپنے علم سے آزماتا ہے، اپنے آپ کو بھی ان کا ثانی ہی پاتا ہے۔ سبحان اللہ کل کائنات کے سارے رنگ اس میں مہیا ہیں۔ کہاں تک بیان کئے جائیں کہ اس کے اوصاف کیا ہیں۔ غرضیکہ خلاصۂ کائنات ہے اور پسندیدۂ موجودات۔"

پنجاب پنچ میں ظریفانہ مضامین اور خبروں کے علاوہ کارٹون بھی اچھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ مذاق عام طور پر سطحی، عامیانہ اور زیادہ تر ذاتیات پر مشتمل ہوتا تھا۔

بسمل شاعر بھی تھے اور ظرافت کے نظم و نثر مضامین برابر لکھتے رہتے تھے۔ اس عہد کی ظرافت میں ان کو درجۂ کمال حاصل تھا۔ ان کا مزاحیہ کلام انجمن پنجاب کے رسالہ گلدستۂ سخن میں بھی بالعموم نقل ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں بعارضۂ تپ انتقال کیا۔ وفات کے وقت ان کے فرزند منشی دین محمد کی عمر صرف چار برس کی تھی۔ اس لئے اخبار کا تمام کاروبار ان کے چچا مولوی فیروز الدین نے سنبھالا جو اس وقت خود بھی اخبار مشیر ہند کے مالک تھے اور اب اپنی یادگار ایک بہت بڑا ادارہ فیروز سنز کے نام سے چھوڑ گئے ہیں۔

منشی دین محمد نے تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں پنجاب پنچ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا مگر چونکہ اچھے اور تیز مزاحیہ مضامین لکھنے والے بہت کم تھے اس لئے نہ صرف ظریفانہ رنگ ہی اڑا دیا بلکہ اخبار کا نام بھی بدل کر صدائے ہند رکھ دیا جو بعد میں میونسپل گزٹ ہو کر ان کی وفات تک چھپتا رہا۔

مولوی فتح الدین بسمل کی ایک ظریفانہ سیاسی نظم رسالہ گلدستۂ سخن لاہور مارچ ۱۸۸۰ء سے لے کر یہاں پیش کی جاتی ہے یہ غالباً اس زمانے کی جنگ افغانستان کے وقت لکھی گئی تھی ؎

کابلی برسرِ پیکار ہیں لو اور سنو — ان کے اب موت کے آثار ہیں لو اور سنو

جن کے کھدنے سے پہلے در ہوئے اپنے بڑے — ان سے بھی لڑنے کو تیار ہیں، لو اور سنو

شاہ قیانہ تو اور کہ نہ مصالح موجود — سونٹھ کی گانٹھ پہ عطار ہیں لو اور سنو

دو قدم گو نہیں چل سکتے مگر اس پر بھی — جنگ میں چلنے کو تیار ہیں لو اور سنو

ہم نے مولوی تھے آج طفیلِ سرکار — پنچ میں صاحبِ اخبار ہیں، لو اور سنو

جیب میں فاقے پڑے رہتے ہیں تسلی کے دام

آج ہم عزتِ تاتار ہیں، لو اور سنو

———

ہم بھی اخبار جاری کریں گے

ابو محمد سید جمال الدین

"ہم بھی جاری کریں گے ؛"
"ارے میاں، کیا جاری کرو گے ؟"
"بس جناب ہم بھی جاری کریں گے ۔"
"بھلا کچھ معلوم تو ہو کیا جاری کرو گے ؟"
"ابھی ہم جاری کریں گے ۔"
"الٰہی تیری پناہ ! کچھ کہو گے بھی کیا جاری کرو گے ؟ کیا ریل تو نہیں جاری کرو گے ؟"

(یہ مضمون اخبار "دہلی پنچ" لاہور، مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۸۶ء (?) جلد چہارم شمارہ ۱۳ سے لیا گیا ہے۔ اس کے لکھنے والے ابو محمد سید جمال الدین ڈاکٹر شفاخانہ قصبہ کھوری ضلع ساگر ہیں۔

اخبار دہلی پنچ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا دفتر ہیرا منڈی میں تھا۔ یہ ہمارے عہد کے مشہور اہلِ علم اور ماہرِ تعلیم آغا بیدار بخت ایم اے ایم او ایل کے والد مولوی فضل الدین مرحوم نے یکم جون ۱۸۸۶ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے بارہ صفحے ہوتے تھے سائز ۲۰×۲۶/۴ تھا۔ قیمت سرکار اور عالیجاہان ریاست سے [illegible] روپے اور عام شائقین سے [illegible] روپے معہ محصول ڈاک لی جاتی تھی۔

پرچہ کی روش نام سے ظاہر ہے۔ نظم و نثر کے تمام مضامین ظریفانہ ہوتے تھے۔ ایک آدھ کارٹون بھی ہوتا تھا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس اخبار کا عنوانِ ترغیب یہ ہوتا تھا:

"یہ ظریف اخبار ملک کے واسطے گلدستۂ ظرافت ہے اور آئینۂ فطرت اسی کا نام ہے۔ ایک نمکین جملہ میں ملک کی بلائے ختم کرتا ہے اور نقلیں بجا بجا کر رعایا اور گورنمنٹ کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ کبھی بانتیجہ راگوں سے رعایا کو وجد دلاتا ہے اور ظریفانہ اشعار سے گورنمنٹ اور ملک دونوں کو جگاتا ہے۔ نئے روپ بھر کر ملک کے سامنے آتا ہے اور ہر ایک فقرے میں ہنستے ہنستے کی کہہ جاتا ہے۔ [illegible] کا استعمال نہیں کرتا، خوشامدانہ بے نتیجہ مضامین نہیں بھرتا، اردو زبان کو چمکانے والا الفاظ زبانِ قلم ہی سے محفوظ نہیں کرتا بلکہ مضمون کو تصویر کے لباس میں لاتا ہے جس میں سینکڑوں کارٹیکلوں کا مزا آتا ہے۔"

[illegible]

"ریل گورنمنٹ یا ایسٹ انڈیا کمپنی کو مبارک ہو مگر ہم بھی جاری کریں گے۔"

"تو کیا کوئی کاغذ کا کارخانہ جاری کرو گے؟"

"یہ تو ان بڑی توند والوں کا کام ہے جن کی توند اُڑد کی دال کھا کھا کر اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ دھوتی کھسکتی جاتی ہے لیکن ہم بھی جاری کریں گے۔"

"پھر کیا کوئی نہر جاری کرو گے؟"

"یہ ان ظالم حکام کا حصہ ہے جو مظلوموں کی آنکھ سے ایک کیا ہزاروں نہریں جاری کرتے ہیں۔ لیکن ایں جانب بھی ضرور جاری کریں گے۔"

"آہا معلوم ہوا آپ شاید کوئی جہاز جاری کریں گے۔"

"آپ بھی کیا ساون کے اندھے ہیں جو خشکی میں جہاز چلواتے ہیں اور جن جہازوں کی نسبت آپ فرماتے ہیں ہندوستان میں ان کی اب حاجت بھی نہیں رہی سینکڑوں روشنی والے بے غیرتوں نے اہل یورپ کی دیکھا دیکھی دن دہاڑے ...... کے جہاز چلانے شروع کر دیے مگر بارہم بھی ضرور جاری کریں گے۔"

"اے حضرت! اب جلد بتلائیے کیا جاری کرو گے؟"

"اب بتلاہی دوں۔ تو سمجھیے بندۂ درگاہ ایک پھڑکتا ہوا ظریف اخبار جاری کریں گے۔ کیوں یار ہے نا سہل ساٹوٹکا۔ ادنیٰ سا نسخہ کہ ٹکے کی کل جاری کر دی ہزاروں روپیہ کی اخبار فروشی کرنے لگے۔ اس میں بڑا منافع ہے اور عزّ ز پیشہ۔"

"اخبار نہیں، بڑے کا سر جاری کرو گے۔ اخبار جاری کرنا کیا خالہ جی کا گھر ہے۔ کر چکے اخبار جاری۔"

"اجی ہٹ کے سٹرو۔ ہم اخبار جاری کریں گے اور ریچ کھیت جاری کریں گے۔ تم ہی پھوٹی آنکھ سے دیکھو آئے سال سینکڑوں کندۂ ناتراش اخبار جاری کرتے ہیں۔ پھر ہم ہی کیا کیڑے پڑ گئے ہیں؟"

"آپ اخبار تو جاری کریں گے مگر یہ تو فرمائیے کس منشا اور غرض کے واسطے؟"

"آپ بھی پورے جانگلو ہی رہے۔ ارے میاں جس واسطے تمام اخبار جاری ہوتے ہیں اسی واسطے ہم بھی جاری کریں گے۔ قومی ہمدردی، ملکی بہبودی اور رفاہِ عام کے کاموں میں امداد پہنچانے کے واسطے ہمارا اخبار بھی جاری ہوگا۔ کیونکہ تمام اخبارات اجرا کے وقت یہی ظاہر کرتے ہیں۔ پھر چاہے کریں اس کے برعکس۔ چنانچہ ہمارے اخبار کا اشتہار بھی آپ آنکھ بند کر کے اور کان کھول کر دیکھ لینا، سوا الفاظ قومی ترقی اور ملکی بہبودی وغیرہ کے دوسرا لفظ اگر اشتہار بھر میں دیکھنے میں آجائے تو مفت اخبار دیں۔ کوڑی قیمت نہ لیں۔"

"ان لن ترانیوں کو تو رہنے دو۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ قومی ترقی اور ملکی بہبودی کے واسطے کس قسم کے مضامین لکھنے چاہئیں۔"

"آپ کیا میرا امتحان لیتے ہیں؟ مجھے آپ نے اڈیٹر نہیں کوئی کاٹھ کا اُلّو تصوّر فرمایا ہے۔ ہم تو اپنے اخبار کا پہلا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں پر (خواہ مفید خلائق ہوں خواہ مضر) بجا بے جا نکتہ چینی کرے اور سخت و درشت ناگوار الفاظ سے پیش آئے۔ اس میں اخبار کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ لوگ بہادر، منہ پھٹ، نڈر، بے لگ اخبار کہہ کر بڑی خوشی سے

چھپتے ہیں۔۔ دوسرا فرض یہ ہے کہ ریاستوں کی جھوٹی تعریفیں لکھنا، ہٹ دھرمی سے بچ لینا، خوشامدانہ مضامین سے اخبار سیاہ کرنا (جیساکہ بعض خوشامدی اخباروں کا دستور ہے) پھر دیکھیے ژر علیہ الرحمۃ کی کیسی بارش ہوتی ہے اور ریاستوں سے خلعت و انعامات کی کیونکر بوچھاڑ پڑتی ہے اور دوسرا یہ کہ کسی پر ہر لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ آخر سیاہی، کاغذ، کاپی نویس وغیرہ کی تو ہر قسم کے اخباروں میں برابر ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں اس میں کسی قدر ایمان کا ضرور خرچ ہے سو اس کا جانا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایمان ہر قسم کی آزادی کا جانی دشمن ہے۔ اسی کی بدولت ہم سے اور بڑی بڑی نئی روشنی والوں سے ہر روز کی تو تو میں میں اور دانتا کل کل ہوا کرتی ہے۔ اگر ہم کو اس ایمان کا خیال ہوتا تو ہم بھی کب کے ستارۂ ہند بلکہ شمس العلما ہو گئے ہوتے۔"

"اسے لعنت تمہارے اس اخبار جاری کرنے پر، بس یہی قومی ترقی اور ملکی ہمدردی ہے۔ اسی اخبار کے جاری کرنے کا وہ شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ملکی و قومی ہمدردی کہیں گورنمنٹ پر بیہودہ اعتراضات جمانے اور ریاستوں کی جھوٹی تعریفیں اور بے جا طرفداری کرنے سے ہوا کرتی ہے۔"

"اگر تم بڑے لال بجھکڑ ہو تو بتلاؤ کہ کس قسم کے مضامین لکھنے سے یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ گھر سے فاضل تو ہوں نہیں جو سارا کام چھوڑ کر مضمون نگاری کی تکمیل (تعلیم) دوں۔ البتہ قومی ترقی اور ملک کی بہبودی کے واسطے چند عنوان بتلائے دیتا ہوں۔ تم اپنی لیاقت کے مطابق اس پر مضامین لکھتے رہنا لیکن پہلے ہی تم کو جتلائے دیتا ہوں کہ اخبار نویس کو گورنمنٹ کی رائے اور تجویز پر بہت غور کر کے رائے زنی کرنا چاہیے۔ اگر گورنمنٹ کی تجویز قوم کے حق میں مفید معلوم ہو تو سچے دل سے گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور جو قوم کے حق میں مضر ہو تو نیک نیتی سے شائستہ اور مہذب لباس میں مؤدبانہ طریق سے نکتہ چینی اور رائے زنی شوق سے کرے۔ نا ملائم اور بیہودہ الفاظ، اُجڈ اور گستاخانہ طریق سے واویلا نہ مچاتا پھرے۔ لیکن سب سے پہلے اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کے واسطے مضامین لکھنا مقدم سمجھے۔ اب اپنے جاری ہونے والے اخبار کے واسطے تھوڑے سے عنوان نوٹ کر لو۔ پھر ان پر مضامین لکھنا:

(۱) قومی اتفاق کی ضرورت (۲) قوم میں اتفاق اور اتحاد کیونکر بڑھ سکتا ہے (۳) ضرورت علم (۴) فوائدِ علم (۵) کون سے علوم حاصل کرنے چاہئیں (۶) کس طرح علم حاصل کیا جائے (۷) زراعت کی ترقی کی تدابیر (۸) تجارت کے فائدے (۹) تجارت کو نوکریوں پر کیوں ترجیح ہے (۱۰) پیشوں کو ذلیل نہ جانو (۱۱) ہر قسم کی دستکاری کو ترقی دینے کی تدابیر (۱۲) اولاد کو تندرست رکھنے کی تدابیر سیکھنا سب پر واجب ہے (۱۳) بچوں کو وہ کون لباس ہیں جو بیماری سے روکتے ہیں اور موٹے ہوتے ہیں (۱۴) فوائد مقوی اور ہلکی غذا کے بچوں کی پرورش میں (۱۵) تعلیم اولاد کی مقدم ہے (۱۶) کس طرح تعلیم دی جائے جس میں بچہ تعلیم کو مثل کھیل کے شوق سے سیکھے (۱۷) بچوں سے بہت مشقت اور محنت لینے کے نقصانات (۱۸) وہ کون کھیل ہیں جن سے بچوں کے اعضا درست یا سیدھے و مضبوط ہوں (۱۹) زیور پہنا کر بچوں کو باہر نکالنے کی مذمت (۲۰) بچوں اور جوانوں کو بد صحبت زیادہ اثر کرتی ہے (۲۱) بچوں سے شیریں کلامی اور تہذیب سے برتاؤ کرنے کے فوائد (۲۲) صبح اٹھنے کے فوائد (۲۳) چھوٹی عمر میں شادی کرنے کی مذمت (۲۴) استاد اور والدین سے ادب سے پیش آنا سعادت ہے (۲۵) شادیوں اور تقریبوں میں اسراف بُرا ہے (۲۶) نیک صحبت کے فوائد (۲۷) لہو و لعب باج سنگ کی مذمت (۲۸) عورتوں کو بقدرِ ضرورت تعلیم ضروری ہے (۲۹) بیوہ کی

ی شادی کرنا بُرا ہے (۳۰) رفاہِ عام کے کاموں کو خاص طور پر ترجیح ہے (۳۱) حُقہ، تمباکو، چرٹ سے آلاتِ تنفس کو ...ت نقصان ہوتا ہے (۳۲) مے نوشی کی خرابیاں (۳۳) مدک چانڈو کی مذمت (۳۴) بُرے پیشیوں کی مذمت (۳۵) بھیک ...نگنے کی مذمت (۳۶) حاکم کی نافرمانی بُری ہوتی ہے (۳۷) فحش و پھکڑ کی مذمت (۳۸) ہمسایہ سے سلوک (۳۹) دوستوں سے ...مروت (۴۰) جھوٹ کی مذمت (۴۱) غیبت کی مذمت (۴۲) مذمتِ حسد (۴۳) مذمتِ تعصب (۴۴) ذات اور نسب پر فخر کرنا بُرا ہے (۴۵) غرور کی مذمت (۴۶) ظلم کی مذمت (۴۷) سود کھانا حرام ہے (۴۸) سستی اور کاہلی کی مذمت (۴۹) چھوٹوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت ضروری ہے (۵۰) پست ہمتی کی بُرائی (۵۱) حوصلہ مندی کی تعریف (۵۲) فضول کاموں میں عمر برباد کرنے کی مذمت (۵۳) نیم حکیموں سے علاج کرانے کی مذمت (۵۴) میاں کے بیوی پر اور بیوی کے میاں پر کیا حقوق ہیں (۵۵) نوکروں غلاموں ماتحتوں پر سختی کرنا بُرا ہے۔"

"بس کرو، بس کرو۔ اجی سننے بھی ہو، بس کرو۔ ہم سے ایسے پاپڑ نہیں بیلے جائیں گے۔ تم نے تو ایک طرف سے دنیا بھر کے علوم و معلومات و تجربہ کاری کی باتیں بتلانا شروع کیں۔ ایک آدمی تمام ملک کی باتیں کیونکر جان سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے حاصل کرنے کے واسطے تو عمرِ نوح بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ بس جناب ایسی اڈیٹری اور اخبار نویسی کو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے۔ آج سے کبھی اخبار جاری کرنے کا نام بھی لیا تو جو سات چوروں کی سزا (جو کہ برابر ہیں ایک مضمون بہ کے) وہ ہماری سزا۔"

"اچھا اب ہم تم کو ایک ذرا سی بات بتلائے دیتے ہیں۔ اگر اس پر عامل ہوئے تو تمہارے برابر روئے زمین پر کوئی اڈیٹر نہ ہوگا۔"

"اے سبحان اللہ! کیوں نہ ہو۔ ہو تو تم ہمارے لنگوٹیا یار۔ تم کو ہماری بہبودی کا خیال نہ ہوگا تو کس کو ہوگا۔ لے اب جلدی سے لگے ہاتھوں بتلا دو تو ابھی جاتے ہی پہلے اخبار جاری کروں پیچھے کھانا کھاؤں۔"

"اچھا سنو، بہت کر خوب یاد رکھو کہ جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھا کرو تو آیت قرآنی ما آتکم الرسول فخذوہ و ما نھکم عنہ فانتھو کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ کیونکہ جس رسول معصوم کا استاد خود علام الغیوب ہو اس کی پند و نصائح میں دینی و دنیاوی فوائد کس درجہ پر ہوں گے۔ کیا مجال ہے کسی بشر کی جو آپ کے مضامین پر نکتہ چینی کرے یا کوئی عاقل مخالفت کا دم مارے۔"

"اچھا تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ پہلے میں کسی محدث سے احکام رسولِ خدا سیکھ آؤں۔ پھر اخبار جاری کروں گا جب تک دیگر اخبار نویسوں پر لازم ہے ہمارے قائم مقام اسی قسم کے مضامین لکھیں اور دل کھول کر لکھیں لیکن کہیں بدتمیزی یا مفسد آمیز مضامین یا آپس میں جوتی پیزار کر بیٹھے (جیسا کہ آج کل مراد آباد کے اخباروں کا حال ہے) تو آ کر ایک ایک اخبار نویس کی وہ درو ثنا کروں گا کہ توبہ ہی بھلی ہے ؏

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

مُلکی مخبر

دُور کی بات

احمد علیخاں عاصیؔ

یہ مضمون اخبار ملکی مخبر یعنی پولیٹیکل سپاہی سے لیا گیا ہے جو ۱۸۸۶ء میں لاہور کے مطبع وہلی پنچ جاری ہوا تھا۔

مولوی احمد علی خاں صاحب عاصی بریلی کے رہنے والے تھے ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت سے اس وقت کے تقریباً تمام پنچ اخبارات مالامال نظر آتے ہیں۔ کتاب شاہد ظرافت میں ان کے بہت سے ظریفانہ مضامین جمع کر دئے گئے ہیں ؎

ہر سمت جلوہ ہائے معانی کی سیر کر
گھونگٹ الٹ دیا ہے عروس خیال کا

میرے مکٹ دھاری نیسی والے سانورے کنھیا ملکی سپاہی! خدا تمہارے عوض اس جانب کو برج کی پرچھم گوپیاں نصیب کرے۔ کیوں یار! یہ سن کر ورنی کی طرح جل بھُن تو ضرور ہی گئے ہوگے۔ تو تمہیں اپنے دلربا انداز کی قسم سچ کہنا دیکھی پھیکی بھدی صورت پر اس جانب نے بھی کیسی نکھری ہوئی شوخ بے چین طبیعت پائی ہے ؎

دیکھے جو نظر بھر کے یہ کیا منہ ہے کسی کا
آئینہ خورشید میں پر تو ہے اسی کا

غور سے دیکھیے تو نگاہ یار سے زیادہ تیز، برق سے بڑھ کر بے چین، بتان سنگدل سے کہیں شوخ واللہ کوئی ادا فہم، رمز شناس شعلہ مزاج اک ذرا مسکرا کر چھیڑ دے۔ پنجۂ نگاہ سے رگ جاں میں دو چار چٹکیاں لے اتنی شوخ چشمی سے دل میں گدگدی پیدا کرے، اس وقت اس عاصی کی رنگ آمیزیاں اور گل افشانیاں دیکھیے ؎

نالہ بے چھیڑے ہوئے غیر کے پیدا نہ ہوا
میں لبِ نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا

خیر یہ تو یاروں کی چھیڑ چھاڑ، کہنے سننے کی باتیں ہیں مطلب کی سنئے۔ آج جو اس جانب کی دلفریب طبیعت کا مضمون میں دلی عاشق کی طرح بے چین ہو کر ہاتھ سے نکل گئی تو اُدھر ہو۔ عالم خیال سے گزر کر عجب شان و شکوہ کے ساتھ [illegible]

وہاں پہنچی جہاں فرشتہ خیال کی عقل کو بھی رسائی نہیں۔ اے واللہ! اس اپنی انوکھی جستجو کے قربان۔ نرالی تلاش کے صدقے۔ ایک دم میں تمام عالم ابداع چھان مارا۔ فرشتہ پیکر بن کر قرب ملاء اعلیٰ کے سیر سپاٹے کئے۔ گاؤ زمین پر سوار ہو کر تہ کی خبر لی۔ ارمان بن کر دل عاشق میں راہ لی۔ ... طرح پس کر شوخ چشموں کی آنکھوں میں گھر گیا۔ سبزہ میں شادابی، پانی میں روانی کی کیفیت دکھائی۔ پردۂ گل میں بزنگ بو نہاں ہو کر گلشن ایجاد کی بہاریں لوٹیں۔ زاہد کے ہمراہ دانۂ تسبیح کی طرح ہزاروں موم کے چکر کاٹے، دہر میں زنار برہمن بن کر بتوں کے گلے پڑے۔ غرض ہر رنگ میں بھیس بدل کر دیکھا بھالا۔ تلاش کی جب کہیں ہزار بات کی ایک بات ہاتھ آئی ؎

کوئی صحبت ہو مجھے چھپ کر تماشا دیکھنا
میں بھی گویا رنگ محفل تھا کہ ہر محفل میں تھا

اب آپ ہماری خوشامد کیجئے اور کچھ دے کر پوچھئے تو وہ بات بتائیں۔

کیا خوب اگر خوشامد ہی کرتے تو کسی بے حجاب ہرجائی کو گھر میں نہ ڈال لیتے۔ یہ برسات کے موسم میں جھوم جھوم کے اودی اودی گھٹائیں آتی ہیں اپنا کے مزے نہ اٹھاتے۔ اور ستو بار اجہاں دینے لینے کا نام آیا اور آنکھوں سے خون اترا۔ مگر خیر عالم مجبوری۔ مصر، کابل، سوڈان [illegible] ہے۔

اچھوتے بن کر، کچھ وہاں اندیشہ تو نہیں ہے۔

ہیں! بجز خیال و مال کے وہاں اندیشہ ہی کیا تھا۔ سب جیبیں جان رعایا مطیع فرمانبردار۔ چوہے کا کھٹکا نہ بلی کا غم۔

واحضرت وا! یہ کسی اخبار نویس بننے کے لونڈے کو دم دیجئے۔ اس جانب کی آنکھوں پر عالم بین عینک لگی ہوئی ہے۔ پولیٹیکل اور سول حالات جہاں کے کہئے کہہ چلیں۔

چہ خوش! اس لمبے چوڑے دعوے پر آپ دو ہی ایک پھڑکتی ہوئی باتیں ارشاد فرمائیے۔

سنئے! پہلی دوراندیشی ریاست رامپور کی نیابت ہمارے نئے نواب صاحب کی تلون مزاجی سے درمیان نواب حیدر علی خاں اور جنرل اعظم الدین خاں کے گل بازی کا رنگ دکھا رہی ہے۔ نتیجہ دونوں شخصوں کی بددلی ریاست کی خرابی۔

دوسری انجام بینی فی الحال ہماری سرکار جو قرضہ لیتی ہے شاید کسی وقت میں کشمیر کے مالامال خزانے سے ادا کیا جائے جس پر آج کل انگریزی اخباروں نے تاک لگائی ہے۔

تیسری نازک خیالی ہم نہیں کہتے کہ روس کسی وقت میں ہندوستان آئے یا نہ آئے۔ دلیپ سنگھ کا معاون و مددگار بنے یا نہ بنے مگر ان دونوں خبروں کے گرم و ٹھنڈے ہو جانے سے ہماری گورنمنٹ ایک پر اثر نتیجہ ضرور نکال لیتی ہے وہ یہ کہ کمال رعایائے ہند کی مختلف طبیعتوں کی جانچ پڑتال ہو جاتی ہے۔

راقم

صورتِ لفظ خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اور کیا خاک کہیں۔ واللہ دل بٹ گیا۔ بیار دلی کے پیچڑاسی کم بخت بھی کیا نا اہل بے مروت، خود غرض ہوتے ہیں کہ ہزار انہیں انعام اکرام دو خاطر تواضع کرو۔ مگر کمینے ذرے آنکھ کی طرح اینٹھے ہی جاتے ہیں۔ دور سے جہاں بنگلہ پر کسی بھلے مانس کو آتے دیکھا اور رونی صورت بنائی ملوٹے کی سی آنکھیں پھیریں۔ اگر اس وقت ان کے ہاتھ ملا یا کچھ دے لے دیا تو جھڑکیاں کسی بھی بیٹھنے کو موجود۔ اطلاع بھی نہیں اول تو ورنہ صاحب حاضر نی پہیں غسلخانہ گئے ہیں۔ بڑا صاحب آگیا ہے میم صاحب کی چھٹی آئی ہے۔ یہ بات وہ بات اس وقت نہیں مل سکتے۔ بس مجبوراً احاطہ میں چکر لگا دیتے۔ اور بنگلہ نہ لفیہ کا طواف کر کے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے گھر چلے آیئے۔ کہاں گئے تھے۔ کہیں نہیں اور اگر قسمت جاگی۔ نصیبا پلٹا۔ صاحب کی ملاقات ہو گئی۔ تو مرے جیا خدا کی مل گئی کئی ہزار قبیٹ سے فرشی سلام کیا۔ معنے پاندان کی طرح بچھ گئے۔ آگے جو کوڑے کھڑے گٹ پٹ بات چیت ہوئی۔ اسے بھی چلتی لے ہیں سننے جائیے۔

صاحب دل۔ رئیس! حضور کے اقبال سے سب خیر صلاح ہے۔

صاحب۔ شہر میں اُلو کا کیا بھاؤ ہے؟

رئیس۔ صاحب وہ پبلک میں لے بہت صبح نہار منہ جا کر دیکھا میرے دل سے ہزار درجہ صاف ہے ذرا انسانیت کی بو نہیں آتی۔

صاحب۔ اچھا رخصت۔

اے واللہ صدقے اس ملاقات کے اور قربان اس گفتگو کے من چہ می گویم تنبورہ من چہ می سراید۔ اب جو لوٹ کر آئے تو دھنیا سے الگ۔ پاجامہ سے باہر بنئے بقال۔ نوکر چاکر، ماما اصیل، تجھ مجھ میں لگے لمبیاں جڑنے۔ آج صاحب سے پچاس گھنٹہ برابر بات چیت رہی صاحب نے یہ کہا۔ میں نے یہ کہا۔ اس کا ذکر آیا۔ اس کا ذکر آیا۔ اس کی سفارش کی۔ اس کا تنزل کرایا۔ جلایا تو کھو جھوٹے پر کیا ع

ہم بھی گھر بیٹھے ہوا باندھتے ہیں

اور کہو

قسم ہے جناب امیر کی اور نہ پوچھیے ع

کوفہ کا نمونہ یہ بریلی ہے شریف

یہاں محرم میں آٹھویں تاریخ تک۔ وہ پھڑکتے ہوئے دھوم دھامی رام لیلا کے میلے ہوئے مزے گھٹے۔ آتشبازیاں چھوٹیں جشن اڑے کہ واہی واہ۔ نویں کو راجگدی کو توالی کے قریب ہو کر بڑے زور شور سے نکلی۔ تعزیہ داروں کو اس بات سے ایسا الم ہوا کہ اس وقت تک سانس نہ لی۔ آج تک وہی سوز و گداز ہے۔ گھروں میں تعزیے لئے بیٹھے ماتم کر رہے ہیں۔ یاحسین۔ اگر چالیسویں تک بھی تعزیے نہ ٹھنڈے ہوئے تو پھر کربلا کا سامنا ہے۔

اور کہو۔

اور کیا کہیں۔ لوگ کہتے ہیں، روس اور ہماری سرکار کی صلح ہو گئی۔ لڑائی جھگڑے سے جان بچی مصنوعی قواعد کی اصلی منشا کو سمجھنے والے ہی سمجھیں گے۔ مگر ہم تو خیال کرتے ہیں کہ ہیضے کے پرچے۔ جاڑے بخار کی آڑ میں یہ بھیا روس ہی ٹھنڈی گرمیاں کر رہا ہے۔ ہائے ہائے کیا تڑ پڑ گولی چل رہی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹروں کے امیر کابل سے بھی ہزار درجہ زیادہ پیچے جھکے ہو رہے ہیں۔ لوگ ہیں کہ آنکھ بند کئے کفن پہنے سرپٹ عدم کو چلے جا رہے ہیں۔ ہم تو عوام کے ساتھ جان دینے میں کسر شان سمجھتے ہیں ورنہ ہم بھی والنٹروں میں داخل ہونے کی درخواست کرتے۔

عجب آ کے منڈلی ملی ہے یہ ساری — کوئی بے نقب زن کوئی چور بھاری
بے نتنی کا بچہ کوئی راسدھاری — مشیر اس کے کنجڑ ہیں اور ڈوم ڈھاری
میں لکھوں نہ کیوں ایسی صحبت پہ لعنت

چلے حج کو اب پیر نیچر کے نائب — بہت چوہے کھا کر ہے بلّی بھی تائب
ہوئے گرگ کر گرگ کہن یہاں غائب — مدد تو جو مانگے تو دیں رائے صائب
تری ایسی لنگڑی حمایت پہ لعنت

تجھے حامیوں نے کیا غرق یکسر — دکھانا ہے تو ان کی شیخی پہ تن کر
اگر مجھ سے پوچھے تو اے نطفۂ خر — کموں کا دل و جاں کو یک دل سمجھ کر
ترے حامیوں کی حمایت پہ لعنت

بھری تو رسے گو کہ مجلس تو رکھے — مگر ماں بچاری کو فلقے سے مارے
وہ روتی ہوئی تجھ کو اس طرح کوسے — جو ہیں ٹوٹی اب کرسیاں گھر میں اس کے
انہوں پر بھی لعنت ہے لعنت پہ لعنت

تو نتنی کا سب مال کھا پی کے بیٹھا — دیا قرض خواہوں کو مطلق نہ پیسا
وہ پنڈت تری جان کو اب ہے روتا — قرض داریوں، ڈگریوں کا تقاضا
جو نے کرنہ دے اس دیانت پہ لعنت

بٹھائی جو بجرے پہ اب تو نے برکت — نظر آ گئی تیری ساری اصالت
اور اس پر تو بنتا ہے سید کی عزت — تو لعنت کے قابل ہی ہے فی الحقیقت
حقیقت میں تیری حقیقت پہ لعنت

راقم

کس لئے فوج عدو پر نہ ہو افتاد نئی
سب مضامین میں کرتا ہوں میں ایجاد نئی

ملا دو پیازہ لاہور یکم ستمبر ۱۸۹۶ء

لاہور پنچ

دکھڑا

سمجھے وحشی جو ہمیں اور کہے کالا ہم کو
کس طرح اس سے کہو ربط ہو پیدا ہم کو

وحشی و غیر مہذب ہو جب اپنا القاب
الفت و انس ہو پھر تم سے بھلا کیا ہم کو

پہلے چمڑے ہی پہ موقوف ہے تہذیب اگر
تو مہذب کبھی ممکن نہیں ہونا ہم کو

بس نہ لو اتنی مشیخت کی ذرا شرماؤ
یاد ہے خوب تمہارا بھی زمانا ہم کو

ڈھانکا جسم کو پتوں سے مگر بھول گئے
نیم وحشی تمہیں زیبا نہیں کہنا ہم کو

کون سے پوتڑوں کے لال تھے کہیے تو سہی
گر ہو انصاف دعائیں دو ہمیشہ ہم کو

جن کی نعمت سے پلو ان ہی کو یوں نام دھرو،
ہائے افسوس کسی سے نہیں لہنا ہم کو

ہم نے ہی تم کو سکھائے، یہ کرشمے، یہ ناز
اپنے سے آپ ہی جو کچھ کہ ہے شکوا ہم کو

بنے دولت سے ہماری ارل اور مارکوئس
اور حقارت سے ہو پھر دیکھنے کیا کیا ہم کو

زر دیا، ملک دیا، جان سے بھی حاضر ہیں،
پھر بھی خاطر میں نہیں لاتے تم اصلا ہم کو

ہم نے کیا کیا نہ وفا تم کو جتائی پہ حیف !
تم نے جانا نہیں اک روز بھی اپنا ہم کو

تم کرو تیز ہمارے لئے ہر روز چھری
اور ہو لطف و عنایت کی تمنا ہم کو

ٹکس کا خنجر و تخفیف کا دشنہ ہے ہے
سخت مشکل کہ پڑی جان بچانا ہم کو

کس کی تعلیم بھلا اور کہاں کی تہذیب ؟
خاک میں تھا فقط اس ڈھب ملانا ہم کو

عہد و پیماں پہ نہ ہوں خوش تو کریں کیا ناچار
کچھ تو ہاں چاہیئے جینے کا سہارا ہم کو

کاش ہم پر نہ کھلے آپ کی پیماں شکنی !
ورنہ دشوار ہے پھر وعدہ پہ جینا ہم کو

سیدھے سادھے ہیں ہم اور راستی ہے ہم کو پسند
چال فقرہ یہ تمہارا نہیں بھاتا ہم کو

گر یہی آپ کے وعدے کی کمندیں ہیں رسا
جلد کابل بھی ہے پھنستا نظر آتا ہم کو

سوکھ کر ہو گئے کانٹا نہیں جینے کی اب آس
ٹکس اور قحط نے یاں تک ہے بگاڑا ہم کو

دیکھنا پہنچے نہ سیلاب کہیں تا انگلینڈ　　　آگیا اپنے اگر حال پہ رونا ہم کو
کالے گورے کا اگر پردہ اٹھا دو رُخ سے　　　درد پھر تم کو ہمارا ہو، تمہارا ہم کو

ان کو نفرت ہو ہمیں انس، محال ست محال
حضرت پنچ یہ قول آپ کا بھایا ہم کو

(۱۸۷۷ء)

جالندھر پنچ

ہندوستان کا نیلام

اجی حضرت کچھ آپ کو بھی خبر ہے ؟

کیا ہے ؟

کیا آپ سوتے ہیں ؟ امیر کابل تو ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں۔ جب بڑی ٹوپیوں والے نیلام میں آ گئے تو ہم کس شمار و کس قطار میں ہیں ؟

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ خیر تو ہے ! یہ خبر آپ نے کیا سنائی۔ کہاں کا نیلام ؟

ارے بھائی ! امیر کابل ان دنوں حلوائی کی دوکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ تو انگریزوں کو اپنا ناز و انداز دکھلاتے ہیں اور انگریز ان کی یہ چال ڈھال دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے۔

اجی امیر کابل تو انگریزوں کے ناز پروردہ اور وظیفہ خواروں میں سے ہیں، ان کا وہ کیا کر سکتے ہیں ؟ بہت کریں گے تو اپنے وظیفے سے ہاتھ اٹھائیں گے۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب انگریزی خواں جاکٹ پتلون پہنے، پھندنے دار ٹوپی لیے، انگریزوں کی نقل بنائے تہذیب کی چال چلتے آ نکلے۔ مائی ڈیر۔ مائی ڈیر کہتے ہوئے ہو ڈو یو ڈو کرنے لگے۔ اور جیب سے انہوں نے ایک پرچہ نکالا اور پڑھا کہ امیر کابل انگریزوں سے ۱۳ کروڑ روپیہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ روپیہ مجھ کو دو میں روس منحوس کے مقابلہ میں خرچ کروں اور ان سے لڑوں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ امیر صاحب فرماتے ہیں کہ روس ہم کو ۱۳ کروڑ طلائی سکہ اور کچھ ملک جہلم تک دینے کو تیار ہے۔ اب گویا سمجھنا چاہیئے کہ امیر صاحب ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں۔ اگر انگریزوں نے زیادہ بولی بولی تو ان کے ہاتھ ہندوستان چھوٹ جائے گا۔ نہیں روس کے ہاتھ چھوٹے گا۔

مگر یارو ! یاد رہے ہند ممسک ہے۔ اس کا یکایک چھوٹنا محالات سے سمجھنا چاہیئے اور فی الحال ہند کی قوت علم و تہذیب میں دو چند بلکہ سہ چند ہے۔ جب کوئی اس کے رگڑے میں آوے گا تو اس وقت آپ دیکھیں گے کیا روس کیا افغانستان اس کے آگے چیں بول جائے گا۔

(۱۸۸۷ء)

بنارس پنچ

پندنامہ

چارچیزوں کو چارچیزیں ضرور ہیں :- کالوں کو ذلت ، گوروں کو (بیجا) حکومت ، روم کو نصرت ، روس کو ہزیمت
چارچیزیں چارچیزوں کے بے رونق ہیں :- پانوں بے بوٹ ، سر بے ہیٹ (انگریزی لمبی ٹوپی) جسم بے کوٹ پتلون ، منہ بے برٹ
چارچیزیں ہندوستان کی تبرک ہیں :- گرانی ، خشک سالی ، تخفیف ، لوکل ٹیکس۔
چارچیزیں سبب نیک بختی ہیں :- چندہ دینا ، چوں نہ کرنا ، ہاں میں ہاں ملانا ، دیوالہ نکالنا۔
چارچیزیں سبب بدبختی ہیں :- راست گوئی ، صاف دلی ، کالا رنگ ۔ اطاعت۔
چارچیزیں محال ہیں :- سول سروس کا عہدہ ، دیسی ریاستوں میں خوش انتظامی ، انگریزوں میں میل جول ، ہندوستانیوں سے بے وفائی
چارچیزیں آب حیات ہیں :- مدک ، چنڈو ، افیون ، شراب۔
چارچیزیں موجب ذلت و خفت ہیں :- اولاد کو پیار نہ کر کے تعلیم میں ہلاک کرنا ، بیواؤں کی شادی ، اولاد کا بچپن میں نہ بیاہنا۔
چارچیزیں مخصوص چارچیزوں کے لیئے ہیں :- پڑھنا نوکری کے واسطے ، اتفاق ولایت کے لیئے ، نفاق ہند کے واسطے ، ذات کی زنجیر ہندؤں کے واسطے۔

چارچیزیں بے فائدہ ہیں :- اخباروں کی خریداری ، کتابوں کی سیر ، حال کی طرز تعلیم ، گورنمنٹ سے التجا۔
چارچیزیں ہندوستان کے لیے مخصوص ہیں :- جاہلی ، کاہلی ، غلامی ، بے پروائی۔
چارچیزیں برائے نام ہیں :- نئی روشنی ، روسیوں کی جوانمردی ، انگلینڈ کی دوستی ، حکام کی خوشنودی۔
چارچیزیں بالکل بے مصرف ہیں :- شکر گزاری ، دربار دہلی کے خطاب ، لارڈ لٹن کی اسپیچ ، روسی سوار۔
چارچیزیں چارجگہ کم ہیں :- بادلوں میں پانی ، ہندوستان میں غلہ ، گورنمنٹ ہند میں رعایا کی رعایت ، روس کی شجاعت۔
چارچیزوں کو زوال نہیں :- حکام کی خودرائی کو ، ہمارے مصائب کو ، رشوت کے بازار کو ، پنچ اخبار کو

([illegible]ء)

آگرہ پنچ

کملائی ہوئی ظرافت

شوخ بےچین

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
آنکھ پڑتی ہے انھیں پر جو کھِلے ہوتے ہیں

دنیا کی نعمت ہو اور خواجہ آگرہ پنچ - ہم ہوں اور ظرافت کا لہلہاتا ہوا خوشنما باغ - دلفریب نہر ہو اور موتی سا آب رواں بکھری ہوئی چاندنی ہو اور کوئی ماہ پیکر خوش گلو مطرب ہو اور یہ پھڑکتی ہوئی غزل ؎

ایسے غارتگر سے یارب دیکھئے کیسے بنے	سینکڑوں برباد کر ڈالے ہوں جس نے گھر بنے
تیرے آگے بھی نہ چوکے جو ستمگر ظلم سے	مجھ سے اُس سے کس طرح اے داور محشر بنے
اور تو کچھ بھی نہ آئے شیوہ ہائے دلبری	چٹکیاں لے لے کے دل ہیں آپ بھی دلبر بنے
ناز ہوں گے کیسے کیسے خاک ہونے پر مجھے	میری مٹی سے اگر دو چار بھی ساغر بنے

تاج گنج کے مجاور ملا آگرہ پنچ صاحب: قسم آپ کے مضحکہ آمیز تنفوئی کی - آج جو ایں اجانب کی نغز "المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام" پر پڑی تو جی پھڑپھڑا گیا کہ جا سے کچھ ہو تم بھی کسی پرانی ناٹکہ کی قبر کے دو چار ڈھیلے ملاجی کی نظر کر کے اس مردار کی روح کو ثواب پہنچاؤ - واللہ اس ذکر سے تو آپ کا بھی ہاتھ بھر کا نفس مردہ جی اٹھا ہوگا - خیر یہ تو دل لگی تھی - اب ظرافت کی تسبیح ہاتھ سے رکھ کر یاروں کا پھڑکتا ہوا "دل لگا" سنئے :-

بہت سے ہجڑے پنچ جن کو پولٹیکل اور سوشل خبروں کا ویران گنج کہنا چاہئے اس مثل کے مصداق ہو رہے ہیں - گھر میں ڈھولکی نہیں اور نام نوبت رائے - تو بہ لاہور بڑا شہر - یہ پنچ کیسے جن میں چٹ پٹے ظرافت کا تو ذکر ہی کیا خبروں کا انتخاب بھی پھوہڑ کے بالوں کی طرح الجھا ہوا نظر آتا ہے - ہم چمکار کر کہتے ہیں کہ وہ مہربانی فرما کر یا تو پنچ کے نام کو استعفا دیدیں یا اپنے ویران کالموں کو دلفریب ظرافت سے پری خانہ بنائیں

جو شکل نظر آئے تصویر نظر آئے

سجھنے پنچوں کو مضمون کا ہیڈنگ تک لکھنا نہیں آتا - اعلیٰ نامہ نگاروں کو بھونڈے الفاظ کیسا بقدر پکار بیٹھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ پنچ کے نامہ نگار ایک آمادہ خو، نازک مزاج، بےچین طبیعت لوگ ہوتے ہیں - ان کو چلبلے چانٹوں کا خطاب دینا گویا ان کی پیاری وقعت کو برباد کرنا ہے - ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ایسے دل شکن الفاظ سے اپنے چلبلے قلم کو روکیں گے ؏

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

بعض بھانت بھانت کے شوقین نامہ نگار زندہ دل گھر سے فاضل خون اگا کر شہ پاروں میں ملنے والے اپنے خیالات کی کند چھری سے صنف ظرافت کا گلا کاٹتے ہیں اور نتیجہ سے خالی بے سود مضامین مہذب طبیعتوں پر گراں گزرنے والے الفاظ جو نمکین ظرافت کی حد سے گزر کر پھکڑ کے بازاریں نیم چڑھے کریلے کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ نام آوری کے شوق میں بے سوچے سمجھے دھر گھسیٹتے ہیں۔ ربنا بھائی اپنی ظرافت سے گورنمنٹ کو ہنسا کر قوم کی اصلاح، ملک کی بہبودی کی درخواست کرو اور نوعمر آزاد طبع دیسی بھائیوں کو دل لگی دل لگی میں بڑے کاموں کا بد نتیجہ دکھا کر اچھی باتوں کا شوق دلاؤ اور اپنے ظریفانہ دلفریب لٹریچر سے اس طرح ان کا دل لبھا کر راہ پر لاؤ ؎

جو مجھ سے کہیں قائل اس کو ہیں گھر اپنے
باتوں میں لگا لایا تقدیر اسے کہتے ہیں

بعض مہربان بڑی دم کے انسان جن کی گمشل طبیعت کند ذہن جدت کے پاس ایجاد کے قریب کبھی خواب میں پھٹکنے نہیں پاتی یاروں کے پرانے مضامین لکھے چھپے ہیڈنگ لوٹ پھیر الٹ پلٹ کر اپنے نام سے اس غرض سے اخباروں میں لکھ مارتے ہیں کہ ہم بھی پانچویں سواروں میں مل کر شوخ نگاروں میں داخل ہو جائیں۔ آئندہ ایسی کم ہمتی کا عدم قبولیت کے حال پر رحم فرمائیں اور یہ سمجھ لیں ؎

جھوٹی حنا ملے جو کوئی مَسے بہار کیا

راقم

شکوہ کیا جو دل نے کسی کی نگاہ کا
سینہ میں ایک شور اٹھا واہ واہ کا

دکن پنچ

ہندی اور مغربی ناٹکوں کی امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر ایچ جگناتھ پرشاد ۔ ایچ ۔ ایم ۔ بی
(وکیل ہائی کورٹ و ایڈیٹر دکن پنچ حیدرآباد دکن)

عموماً ہندو ناٹکوں میں بھی کچھ حصہ نثر اور کچھ حصہ نظم کا ہوتا ہے اور سنسکرت و پراکرت زبانیں مخلوط ہوتی ہیں۔ ہندو ناٹکوں کی زبان بھی بہت شستہ ہوتی ہے۔

خاص طور پر قابلِ ذکر بات اور امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں زناکاری کا جو یوروپی ناٹکوں کا ماسٹرپیس ہے۔ شاذ و نادر ہی ذکر ہوتا ہے بعض ناٹکوں میں حسن و عشق کی رنگینیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن عشق کا نتیجہ لازمی طور پر پاکبازانہ ہوتا ہے دوسرے کی بیوی سے تعلق پیدا کرنا اس زمانہ میں بہت بڑا پاپ اور اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔

یوروپی ڈراموں کی طرح ہمارے ناٹکوں میں بھی طوائف کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ہندی طوائف میں وہ عریانی نہیں تھی جو یوروپی طوائف کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے سوا اس وقت ہندوؤں میں طوائف وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے یونان میں ہیٹرا اور اپنی اعلےٰ تعلیم و قابلیت کے لحاظ سے ان کا رتبہ یوروپی طوائف سے بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ تفریحی دل بستگیوں کے علاوہ وہ تربیت اطفال کی بھی سردار تھیں۔

ہندو ناٹکوں میں البتہ واقعات خرقِ عادت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خود دیوتا اور دیویاں ان میں شریک ہوتی ہیں اور جب کسی محل وقوع پر کوئی مصیبت اور مشکل آپڑتی ہے تو دیوتا ہی ان مشکلات کو آسان کرتے ہیں۔

انشاء کے لحاظ سے بھی ہندو ناٹک کسی طرح کم نہیں ہیں ان میں کلیات کی طرف زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جزئیات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اگرچہ بعض محققین کی رائے ہے کہ ہندو ناٹک یونانی سے ماخوذ ہے۔ لیکن واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

ہندوؤں میں ایکٹروں کا درجہ اس وقت بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور ایکٹ بھی نہایت مہذب طریقہ پر کیا جاتا تھا۔ ناٹک کے مصنفین تو نہایت ہی بلند پایہ اور بلند خیال ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات بادشاہ خود ڈرامے لکھتے تھے چنانچہ مٹی کے گاڑی کا جو سنسکرت ڈراموں میں ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ اس کا مصنف شودرک مگدہ کا بادشاہ ہے۔

یوں تو ہندو ناٹکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی فہرست بھی مرتب کرنا مشکل امر ہے ہم صرف بعض مشہور و معروف ناٹکوں کا

اکتفا کرتے ہیں۔

کالیداس کے ڈراموں میں میگھ دوت کمار سنبھو و کرم اردشی شکنتلا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان سب میں شکنتلا زیادہ تر مشہور و مقبول ہے۔ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے۔ خود فرانسیسی میں کئی تراجم موجود ہیں۔ اس ناٹک نے یورپ میں عام مقبولیت حاصل کی۔ گیوٹی اور لا مارٹین جیسے قابل ڈراماٹسٹ نے اس پر عش عش کیا۔ اس ناٹک سے ہندو مصنفین کے اوصاف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں سادگی ہے اور دوسرے مغربی ناٹکوں کی طرح اس میں مبالغہ آمیزیاں نہیں ہیں۔ طرز بیان دلکش اور کہانی دلچسپ و دل کو لگنے والی ہے۔

اس کے بعد پراکرت ناٹکوں میں، راجہ ہریشچندر نل دمن بسنتہ ساوتری۔ سیتہ وتی۔ دیوایانا۔ انسویا پرہلاد۔ سارنگدھر۔ رام داس وغیرہ وغیرہ سب ناٹک ایسے ہیں کہ جو اخلاق عصمت و فاداری اور فرمانبرداری کے احساسات و جذبات سے سراپا لبریز ہیں آج کل کے یوروپی ناٹکوں کی طرح اس میں عشق اور مخرب اخلاق باتوں کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ جو کوئی بھی انسان خواہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا ان ناٹکوں کے دیکھنے سے ایک گونہ اخلاقی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے یوروپی ناٹکوں اور سینماؤں کے دیکھنے سے آجکل ہمارے ملک کے نوجوان، عورتوں اور مردوں کے عادات اور اطوار پر جیسا کچھ ناگفتہ بہ اثر پڑ رہا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اگرچہ ڈرامہ کے فن میں یورپ نے قابل قدر اضافہ کیا ہے اور حسیات و نفسیات کی دلچسپ ترجمانی کی ہے۔ لیکن حسن و محبت کو اس قدر نازیبا پیرایہ میں ظاہر کیا ہے کہ بجائے کسی مفید درس عمل کے مطالعہ کرنے والی نگاہوں اور مشاہدہ کرنے والے دماغوں کو شہوانی جذبات کے چکلدار پیغامات ملتے ہیں جن کے اثرات سے نوجوانوں کا محفوظ رہنا محالات سے ہے۔ لیکن ہندی ڈراموں میں حسن و عشق کی تفسیر ضرور کی گئی ہے مگر ایسے مہذب پیرایہ میں کہ حفظ نفس کے بعد حصول خودداری اور تحفظ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض ہندو ڈراموں میں مشکل کے وقت فوق العادات قوتوں یعنی دیوتاؤں وغیرہ کی جو بر وقت امداد دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اس کو مبالغہ خیال کریں لیکن اس کو مبالغہ خیال کرنے کے بعد بھی خدا ترسی اور ہمدردی انسانی کا سبق ضرور ملتا ہے۔

یہاں ہم نے ان چند ہندو ناٹکوں کے نام صرف بطور نمونہ پیش کئے ہیں اور اگر ہم اپنی ناٹکوں کی تفصیل بتلانا چاہیں تو ہر ایک ناٹک کی جزئی تفصیل بھی ایک دفتر بن جائے گی اس لئے ہم بخوف طوالت صرف اجمالی تشریح پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

کچھ اودھ پنچ کے بارے میں

پنڈت برج نرائن چکبست

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اُردو زبان کا نغمہ سُنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان اودھ پنچ مرحوم کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہوں۔ اودھ پنچ نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردہ میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پُرانی جلدوں کے گردغبار میں اکثر ایسے اہلِ کمال و فن ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔

جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا اس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اٹھائی۔ اس چالیس[1] سال کے عرصہ میں اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے مثلاً لاہور میں اخبارِ عام اور کوہ نور کا دور تھا یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔ دہلی میں اشرف الاخبار کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ سے جاری تھا۔ کشف الاخبار بمبئی اور جریدہ روزگار مدراس میں اردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ کارنامہ اور اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع ہونے تھے۔ عرصہ ہوا کہ کارنامہ کا کام تمام ہو گیا' اودھ اخبار ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ کی اشاعت کے قبل بہت سے اردو اخبار اپنی پیدائش و موت کی منزلیں طے چکے تھے مگر قابلِ غور یہ بات ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز لارنس گزٹ کے جو میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولٹیکل یا سوشل مسلک تھا نہ کسی مستقل دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ ہندوستانی کا دور اودھ پنچ کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولٹیکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے اخبار کو بھی اپنی ذات کی طرح پولٹیکل خدمت کے لیے

---

[1] ان اخباروں کے اکثر حالات منشی بال مکند گپتا مرحوم کے اُردو اخباروں کے تذکرہ سے اخذ کیے گئے ہیں جو بھارت مترا اور زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولٹیکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل سوشل اور پولٹیکل مسلک تھا۔ اس صوبہ میں ہندوستانی کانگرس کا چراغ سمجھا جاتا ہے مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً انڈین پنچ، بمبئی پنچ، بانکے پور پنچ وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اُردو زبان پر سو صدی تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں ان پر نظر ڈالنے سے اُردو لٹریچر کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں، در لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی مگر قوموں کے مذاقِ سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اُردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں محض روزمرہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی رنگین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے بار بار اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طراز طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر...... جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیرِ لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاقِ سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس زمانہ کی ہوا کھائے ہوئے تھے جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا، اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اُردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ سے پہلے رجب علی سرور کے طرزِ تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع و بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانے میں جو اُردو اخبار جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اُردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثر اُردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف، حضرت

[illegible] تعلق فسانۂ آزاد سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گروہ کے [illegible] تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اسی رنگ میں وہ بھی ڈوبے ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ کے جس انقلاب نے دنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی اسی نے سرشار کی طبیعت کو بھی پیدا کیا۔

اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے سرشار نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا ورنہ فسانۂ آزاد کا دریا بھی اودھ پنچ ہی کے چشمہ سے جاری ہوتا کیونکہ دونوں کا مذاق تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو بنیا اخبار کا خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے تو کچھ مدت تک تو ذاتی مراسم کا پردہ قائم رہا لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہو گئیں اور آخر کار فسانۂ آزاد پر اعتراضات شائع ہونے لگے۔ اودھ پنچ کا فسانۂ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کے دونگڑے عرصہ تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برسا کیے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور درست ہیں مگر زیادہ تر طباعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شائع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لیے چنگاری کا کام کیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطری شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔

اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلافِ فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعراء کی توہین ہو۔ ان خیالات کا دلوں میں اٹھنا تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ بھی مدت تک جاری رہا۔ جس عنوان سے اودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی پت کے میدان میں طرارے بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابلِ اعتراض ضرور ہے مگر نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی۔

تیسرے ہنگامہ کی رونق داغ کی شاعری سے ہے۔ اودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کے ظریفوں کے دل میں لکھنؤ اور دہلی کی قدیم رقابت کا رنگ

---

[1] اودھ پنچ میں کلامِ حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اس کے عنوان [illegible] [illegible]

ہرا تھا اور دوسرے جانب داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بد مذاقی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں یہاں تک اڑا کیں جن کا رُخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے حسب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزارِ نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنؤ کے مشہور فسانہ نویس مولانا شرر نے گلزارِ نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کیے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے۔ نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارہ کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی بھجی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہنچی۔ گلزارِ نسیم کا قصہ تو در کنار رہا مولانا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم و نثر کی پھلجھڑیاں چھوٹا کیں۔ یہ سلسلہ کبھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف حصہ کے علاوہ نفسِ مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف موجود ہے۔ ان مباحثوں کے علاوہ اکثر دوسرے اخباروں سے بھی اودھ پنچ کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ان میں اودھ اخبار اور طوطیِ ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ کی پولٹیکل خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولٹیکل معرکہ آرائیاں پیش آئیں ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ الحاق اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کے جکڑ بند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس نے والیانِ ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرہ میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں کی آمد کی خوشی میں اودھ پنچ عید اور شب برات کے استقبال سے کم سرگرمی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانہ میں اس کا پرچہ سُرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا تھا اور رنگین مزاج نامہ نگاروں کے ساقی نامہ اور ترانے وغیرہ ہفتوں تک چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانوں کے قومی اتفاق کا ہمیشہ سے معین تھا اور اگر دونوں قوموں میں کوئی نزاعی امر پیش ہوتا تھا تو اسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہٰذا یہ بھی اس پولٹیکل تحریک کا دل و جان سے مددگار تھا۔ اس صوبہ میں منشی سجاد حسین مرحوم کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے۔ ابتدا میں جب سر سید مرحوم نے اپنی زبان و قلم کے جادو سے اہلِ اسلام کا دل کانگریس کی طرف سے پھیر دیا تھا اس وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علیگڈھ کے پولٹیکل پیپر کا کلمہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء میں جب سر آکلنڈ کالون سر سید مرحوم اور مفت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگریس کا طبقہ الٹنے کی فکر میں تھے

اس وقت ہندوستانی کے مضامین اور پنڈت اجودھیا ناتھ مرحوم کی دھواں دھار تقریروں کے علاوہ اودھ پنچ کی شمشیر برہنہ اس قومی تحریک کی تائید میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا تو شہر کے چند سن رسیدہ بزرگوں نے اس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس مخالفت کی تردید میں ہندوستانی اور ایڈووکیٹ میں پند و نصائح کے دفتر کھل گئے۔ لیکن ان واعظانہ فہمائشوں کے مقابلہ میں وہ مضمون زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ میں "انڈے سینے والی چیل چلاہٹ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اکثر مزاج ایسے ہوتے ہیں جو بحث و منطق کے کڑوے گھونٹ نہیں قبول کرتے مگر ظرافت کی چاشنی سے راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اس صوبہ کے پولیٹیکل بحث و تحریک میں اس خدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ مذہبی اور قومی رسم و رواج کی اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا پالیسی زمانہ کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علی گڑھ کے پولیٹیکل مسلک کی مخالفت نہیں کی بلکہ سر سید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلیں ان پر خاک ڈالنے کی بھی کوشش کی۔ علی گڑھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو "نیچری" کا خطاب دیا اور نیچریہ مذہب کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اسی طرح پردہ کی اصلاح اور تعلیم نسواں وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہل اسلام میں مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہوگئی تھی اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ پردہ کی رسم کی تائید میں حضرت اکبر کا ذیل کا قطعہ زبان زد عام ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں	اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا	کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اسے پڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کریں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ میں مشکل سے ملے گا۔ کاش کہ یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ کی کوشش میں صرف ہوتا۔

اودھ پنچ کی ترقی و وقعت کا راز بہت کچھ اس کے ایڈیٹر کی ذات سے وابستہ ہے۔ منشی سجاد حسین کا مزاج عجب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کبھی کسی نے ان کے چہرہ پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی۔ بیماری کے زمانہ میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے کہ زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔ دوا و علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لیے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دنیا کے ناہموار و کاواک پہلو ان کی نگاہوں میں خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور ان کی پُرمذاق طبیعت کو بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے۔ غیر کا ذکر نہیں ان کے دلی دوستوں اور عزیزوں کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزا چکھنا پڑا ہے۔ دوستوں کی محبت اور قدر شناسی کی بدولت انھیں ابتدا ہی میں اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت میں شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوئے ہوں گے۔ یہ لوگ محض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار میں لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد یہ رنگ قائم نہ رہا بقول شاعر ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس!

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اللہ

ہونے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس مٹی ہوئی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام بکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے اڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اس کی دھوم ہو جاتی تھی۔ علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوقؔ، نواب سید محمد آزادؔ اور حضرت اکبرؔ کے نظم و نثر کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھیں مگر واقف کار جانتے ہیں کہ آخر دس بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارہ کے کوئی منفعت کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا مرحوم کو لکھا تھا جو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:-

"مکرمی! تسلیم

خط پہنچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لیے نکلتا ہے
کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ
منہ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ نوکر ہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج
میں گرفتار لب گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔
اخبار صرف اس لیے نکالتا ہوں کہ جینے جی مر نہیں سکتا ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ضعیف جسم میں خون کے دس ہیں قطرے ضرور رہتے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع اڈیٹر کی باوجود لب گور ہونے کے یہ تمنا ضرور تھی کہ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔۔۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار، یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور دو ایک پرانے دوستوں کی محبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔ غرضیکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اس وقت اردو زبان میں بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانہ کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہے گی۔ مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدردانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں مگر اس کے تذکرہ سے سخن سنجوں کی محفل خالی نہیں ؎

پھر گئے آنکھوں میں مشتاق گذشتہ نشہ میں
دور جام مے میں اکثر ذکر خیر جسم ہوا

اودھ پنچ

اکبر الہ آبادی

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت — وے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر — تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت — عنوانِ صحیفۂ بلاغت
خلّاقِ معانئ طرب خیز — کشّافِ رموزِ عشرت انگیز
ہادی و ادیب و دانش آموز — گوہر افشاں و گوہر اندوز
زینت دہِ شاہدِ تکلّم — آئینۂ خندہ و تبسّم
سرچشمۂ قول و وعظ و گفتار — گنجینۂ وعظ و پند و اسرار
اے فخر دہِ زبانِ اُردو — وے اوج دہِ نشانِ اُردو
رنگینی میں غیرتِ گلستاں — شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ — محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
دن رات یہی ہیں اب تو چرچے — پرچاتے ہیں دل کو اس کے پرچے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی — حاسد کا حسد دلیل اس کی
معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ زہرِ نیشتر ہے — گو فقرۂ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھلا ہے — یہ آبِ حیات میں بجھا ہے
وہ شربتِ حفظِ عقل و ایماں — یہ مُردہ دلوں کو ہے رگِ جاں
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں — حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں
ہر کس کہ بدید گفت خوب است — باللہ مفرح القلوب است
رندوں کی زباں میں پند دلخواہ — سبحان اللہ واہ وا واہ

اکبر الہ آبادی

کیونکر نہ ہو ادعائے اعجاز — کھوئے ہیں قفس میں بال پرواز
کی سیر دو عالم اک نفس میں — پھر دیکھیے تو اسی قفس میں
دریا قطرے میں موجزن ہے — غنچے میں بہار صد چمن ہے
ہے نوک سناں پہ نقش پروانہ — رقصاں دم تیغ پر بصد ناز
شعلوں کے ہجوم میں سمندر — امواج میں ماہیٔ قوی پر
کیا کثرت خار سے خطر ہے — یاں دوش نسیم پر سفر ہے
پابندی کا کب ہے یہاں تاسف — یوسف زنداں میں بھی ہے یوسف
جلوہ ہے وہی وہی تجلی — شوکت ہے وہی وہی تعلی
پابند جو یوسف سخن ہے — پھیلی ہوئی بوئے پیرہن ہے
ہر رنگ میں ہے بہار معنی — ہر لفظ ہے پردہ دار معنی
ہر نقطہ ہے نکتۂ بصیرت — ہر حرف ہے کاشف حقیقت
صرصر کے جور سے بری ہے — یہ شاخ خزاں میں بھی ہری ہے
آپ اپنے فروغ کا سبب ہے — محتاج برنگ ماہ کب ہے
وہ مہر فلک سے منفعل ہے — یہاں روشنیٔ دماغ و دل ہے
دریوزہ گری پہ اس کی اوقات — یہاں قطب صفت ثبات دن رات
جن سے آسیب کا تھا کھٹکا — ان دیووں نے خوب سر کو پٹکا
غالب تھا اثر میں اسم اس کا — ٹوٹا نہ کبھی طلسم اس کا
ہوتے نہ جو رشک سے وہ بے چین — حسّاد بھی صاد کرتے بالعین
سنیے اک اور نکتۂ خوب — آزادیٔ گفتگو ہے معیوب
لاتا ہوں دلیل شاعرانہ — دیکھو قدرت کا کارخانہ
منہ کے اندر زباں جڑی ہے — دانتوں کے حصار میں پڑی ہے
بتیس جوان سخت طینت — استادہ ہیں مائل اذیت
ہیں مثل سفید دیو بیباک — ظالم جابر حریص سفّاک
حد سے جو بڑھے زبان گفتار — دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار
پہلو میں جو ان کے ہمنشیں ہو — وہ نوک خلال سے حزیں ہو
کتنا ہی ہو وہ ملائم و تر — دانا پستا ہے ان میں آ کر
لوہے کے چنے کہاں سے لائیں — سختی کا انھیں مزا چکھائیں

اس قید میں جبکہ یہ زباں ہے　　آزادیٔ گفتگو کہاں ہے
باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل　　لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل
مرضی تھی خدائے جسم و جاں کی　　محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ　　ہشیار رہو بہک نہ جاؤ
دریائے خیال موجزن ہے　　وقفِ یزدان و اہرمن ہے
ہے شارعِ عام حق و باطل　　ناظر اس کی ہے فکرِ عاقل
گذرے جو خیالِ بد بلا کد　　بازوئے خرد سے بس کرو رد
باطل پہ نہ جاؤ حق کو چن لو　　کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو
خاموش بس اے زبانِ خامہ　　منظورِ نظر ہے ختمِ نامہ
ہر چند یہ عالمِ سخن ہے　　یہاں فیضِ انا ضیا فگن ہے
ہر گوشے میں وسعتِ فلک ہے　　ہر ذرّے میں مہر کی چمک ہے
ہر گام پہ ہیں چمن ہزار دل　　اک ایک میں گلِ سخن ہزار دل
ہر برگِ گلِ سخن میں سو رنگ　　ہر رنگ میں لاکھ لاکھ نیرنگ
نیرنگ ایسے کہ عقل حیراں　　حیرت ایسی کہ نورِ عرفاں!
ہر سمت ہزار میکدے ہیں　　ہر ایک میں لاکھ خم بھرے ہیں!
ہر خم میں شرابِ ارغوانی　　یعنی رنگینیٔ معانی!
یک قطرہ سے طبع ہو جو ممتاز　　سینہ بن جائے مخزنِ راز
وہ راز کہ دل ہو محوِ مستی　　مائل ہو سوئے سخن پرستی!
ہو طول جو سلسلہ سخن کا　　ہمسر ہو زلفِ پرشکن کا
پر طولِ بیاں سے فائدہ کیا　　اس صرفِ زباں سے فائدہ کیا
بس بس اب روکئے زباں کو　　کافی ہے اشارہ نکتہ داں کو
ہو کر آمادہ جان و دل سے　　ہو محوِ دعا زبان و دل سے
جب تک ہے رباعیٔ عناصر　　رنگینیٔ نقشِ لوحِ خاطر
جب تک کہ یہ نظمِ بیتِ ہستی　　موزوں ہے برائے خود پرستی
جب تک ہے مسدسِ جوانب　　برہانِ مشارق و مغارب
جب تک کہ ہے روح کا لطیفہ　　انفاس کا ہر نفس وظیفہ
یہ پرچہ دلفریب و زیبا　　ہو مونسِ جانِ ناشکیبا

ہر رنگ میں انتخاب نکلے ۔۔۔ ہر جامے میں لاجواب نکلے
ہر سوز دل و یگانہ و غیر ۔۔۔ بن جائے چراغ کعبہ و دَیر
جب تک کہ اثر ہے کاف و نوں کا ۔۔۔ مفتوں ہو ہر ایک اس فسوں کا
پروانہ اسے چراغ سمجھے ۔۔۔ بلبل دیکھے تو باغ سمجھے
خورشید کا نور میں ظرف ہو ۔۔۔ ذرّوں کی کشش اسی طرف ہو
اے حافظ و خالقِ اودھ پنچ ۔۔۔ خوشدل رہیں عاشقِ اودھ پنچ
اپنی اپنی مراد پائیں ۔۔۔ دیکھیں جب قل کو شاد پائیں
ہر مشتری بلند فطرت ۔۔۔ پائے دورِ قمر میں رفعت
محتاج ہو سیم کا نہ زر کا ۔۔۔ مورد ہو بلندیٔ نظر کا
احباب جو اس کے ہیں معاون ۔۔۔ عالی منشان نیک باطن
ظرّاف و مصنفِ لطائف ۔۔۔ طبّاع و مصوّرِ کوائف
سرسبز ہوں گلشنِ جہاں میں ۔۔۔ خرّم پھریں باغ و بوستاں میں
رنگیں طبعی سے گل کھلائیں ۔۔۔ چشمِ بد بیں کو خوں رلائیں
پیدا ہوں وہ گوہرِ مضامین ۔۔۔ دریا کے ہو لب پہ شورِ تحسیں

بے ساختہ بول اٹھیں سخن ور
اللہ ری طبع و فکرِ اکبر

(اودھ پنچ ۱۴ مئی ۱۸۷۸ء)

اودھ پنچ کا ایک شمارہ

(جنوری ۱۸۷۸ء)

یہ پرچہ ۱۸۷۸ء میں نکلا تھا۔ صفحہ ۲۶۵ سے لیکر صفحہ ۲۸۰ تک اس کا ایک پورا شمارہ (ٹائیٹل سمیت) حرف بہ حرف پیش کیا جارہا ہے۔ اقتباسات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ معلوم کرسکیں کہ پرچہ بحیثیت مجموعی کیسا تھا۔ اسی لیئے ایک پورا شمارہ من وعن پیش کیا جارہا ہے۔

پرچے کا سائز ۱۲″ × ۹½″، سطریں ۳۵، کالم تین اور صفحے آٹھ ہوتے تھے۔

اشتہار
OUDH PUNCH

مضامین سالِ نو مرسلۂ مضمون نگاران

یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

اے لو صاحب میاں ۱۸ء بھی سونے جیسے فقرہ الی اللہ ہوئے۔ سال بھر خوب کوڑے کیے۔ نہیں کا تھیں لگے کاٹے، رہ مہینے کے اندر اکھوں شعبدے، سینکڑوں کرشمے دکھلا ڈالے۔ کتنے کاؤں صاف کر دیے، شہر کے شہر تباہ کر دیے، کبھی بوند بوند بھر پانی کو ترسایا، کہیں قحط کی آ گئے، کسی کا نرد جھاڑا، کسی کو قرضدار کیا، کسی کو نوکری بندھوا دی، کسی کو خطاب دلوایا، کسی کی شکایت منظور کرائی، کسی کو مٹی کا نواب بنایا۔ بھی دتی کو رونق دی، کبھی آگرہ کو۔ روم و روس میں غدا چلوا دی، سرحد پہ پانگ کشش فتن کرا دی اور پھر تینا مر کے نیکیا مر بلا سے کھڑے رہے۔

اٹھارہ سو چھتر بھائیوں میں سب سے نمبر اول۔ جتنے سنہ گئے ایسے گئے جیسے تا ہے کے سر پنے سینگ، نہ نام لیوا، نہ پانی دیوا۔ نہ آل اولاد، ناشاد و نامراد۔ یہ تو سلامتی سے بیسیوں یادگار بھی اپنے چھوڑ گئے کہ باید و شاید۔ خطاب قیصر ہند، الحاقِ اودھ، جنگِ روم و روس، غرضکہ کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے۔ اب ان کے بھائی صاحب سنہ اٹھارہ سو اٹھتر کی آمد آمد ہے۔ ان کا دن بھی دیکھنا ہے کس پہلو پر جا تے ہیں۔ ہم لوگوں سے کیونکر برتاؤ رہتا ہے۔

ج ۔ ن

زباں گھس گئی آپ، دن گنتے گنتے ٭ بڑی راہ دکھلائی حضرت سلامت

بھلے کو حضور اب بھی تشریف لائے ٭ مبارک مبارک سلامت سلامت

السلام علیک یا سنتہ الثمانیہ و سبعین ! مرحبا لکم یا ہلال الذین۔ خیر مقدم ؎

رواں منظر چشم من آشیانہ تست ٭ کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

دل مسرور شد و دل کم۔ خوش آمدی، صفا آوردی ؎

اٹکھیلیوں سے چل کے نہ غمزے دکھائیے ٭ مرشد کہا تھا آئیے تشریف لائیے

آہا ہا ہا ہا۔ آئیے آئیے، قدم رنجہ فرمائیے۔ بڑی راہ دکھلائی، بعد مدت سواری آئی۔ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ بانسوں میں کنوئیں اور کوئلوں میں بانس ڈال دیے۔ بارے بڑی مشکلوں سے خدا خدا کر کے جب اللہ پیر بنا ہے تب جمال باکمال نظر آیا اور قدم مبارک دیکھنے میں آئے۔ پناہ تیری، ہر لحظہ چشم براہ اور ہر ساعت دروازے پر نگاہ تھی۔ دن گنتے تھے، گھڑیاں شمار کرتے تھے۔ سینکڑوں جگہ فالیں کھلوائیں، ہزاروں گنڈے تعویذ لکھوائے، درگاہ میں چوکی بھری، امام باڑوں میں چہل ممبری کی، مسجدوں میں چراغ جلائے، گرجوں میں گھنٹے بجائے، مندروں شوالوں میں ناک گھسنی کی۔ مری ٹیک کو گر سے، بھتیاں بھوانی میں لے کر ماکرتے پھرے۔ اب اللہ میاں کے گلگلے، رحم مولا مشکل کشا کا، کھڑا دونا، حضرت عباس کی حاضری پر دربار کے کونڈے، سید احمد کبیر کی گائے، شیخ سدو کا بکرا، پیر ٹھٹھیلے کا مرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بی ثرت پھرت کی بوڑیا، کشتی کی صحنک، بی آسیا کا کاسہ، سرمد کا ملیدا، دریا ڈیری کا طبق، خواجہ خضر کا بیڑا، ازیں قبیل اور بھی وغیرہ وغیرہ منتیں مرادیں مانیں کہ خدا نے یہ گھڑی دکھلائی، منہ مانگی مراد پائی۔ لیجیے تاشے سرفے۔ تڑ تڑ جھیم جھیم۔ تڑ تڑ جھیم جھیم، نوبت خانے جھنگڑ جھنگڑ، ڈبنگ ڈبنگ ادھر نرہی فرنا، دھونتو دھونتو، سالکھوں سالتہ انگریزی باجے والے ہل ہل بنیا کو جاتے رہی۔ نندیا تنا دی ری ری ری رم تنا ری ری سی ری رم۔

رنڈیاں، منڈیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوال ایک سال مل کر بڑے او نچے سُروں میں مبارکباد دے

دھوم سے آیا نیا سال مبارک باشد — خوش ہیں سب ہند کے کنگال مبارک باشد
رہ گئے جھانچ فقط سوکھ کے انجور ہوتے — ہڈیوں پر ہے فقط کھال مبارک باشد
سود سٹے کی بدولت ہوئی چندیا گنجی — پھر نئے سر سے اُگے بال مبارک باشد
پانی سب ناک تک بھی نل ٹسٹری کی طرح — بیٹھ بر سنتے ہی اُدھڑا کاں مبارک باشد
کچھ تعجب نہیں سب بیٹھیں دھڑا دھڑ بنیے — اپنا منہ نوچیں گے بقال مبارک باشد
آتے والا کوئی برا اسے تو پیسا جاتے — خوب جوتوں میں بٹے وال مبارک باشد
سال بھر رنج اٹھاتے ہیں الٰہی توبہ — اب تو غارت ہوا چنڈال مبارک باشد
پنچ سب مل کر جا ہے طمانچے مارے — منہ ابسر نکل گیا لال مبارک باشد

خیر یہ بات وہ بات۔ ذکر شہر اصلوات۔ آیئے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تسلیم تسلیم تسلیم۔ کہیے مزاج مبارک، مزاج شریف، مزاج مقدس بہت مزاج اچھا۔ الحمد للہ۔ آپ کی عنایت، نوازش، مہربانی۔ دعا کرتا ہوں۔ سب طرح خیریت ہے۔ اپنے مزاج کی کیفیت بیان فرمائیے شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے لیکن مجبوری درجہ کو۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔ آپ کا سر بجائے قدموں کے جھوٹ کہوں تو کسی اور کی آنکھیں پھوٹیں آپ کو زندہ دیکھ لیا، چار آنکھیں ہو گئیں۔ اس کی امید بھی کسی حلال خور کو ہوئی، دن کو تارے نظر آنے لگے۔ اے ہے پھر خیال آ گیا۔ نعوذ باللہ سات قرآن درمیان۔ نادِ علیاً مظہر العجائب ــــ الخ ــ ہاتھ لائیے۔ دیکھیے تصور سے کلیجے میں پنکھے لگ گئے۔ دل ہے یا گھنٹہ گھڑی۔ اے لو خود بخود بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ نیا سال آخر ہے کیا، کچھ فرمائیے۔ توبہ ذکر کس کا ہے اور آپ اس قدر ڈر رہے ہوتے کیوں ہیں، ان کا نام تو لیجیے، وہ ایسے کون حضرت ہیں۔ ارے رے رے۔ خدا بچاوے۔ اس نناوے کا نام کون لے۔ سات سمندر پار اس کا منہ اُدھر ہی رہے۔ لی خمسۃ اطفی بہا ـــــ الخ ـــ پھر وہی بندہ نواز نام تو لیجیے۔ نہیں نہیں صاحب معاف کیجیے۔ میں تو ہزار برس تک نام نہ لوں گا چاہے دھرتی دنیا اُدھر ہو جائے۔ اچھا اشارے کنایے میں کسی نہ کسی طرح کہیے تو سہی۔ اچھا سمجھ جائیے۔ ز ع ض غ۔ اب اور آفت میں جان پڑی۔ بقول شخصے ؎

شامت کی ماراں سے کیا غیر کا گلہ — اندازِ گفتگو نہیں تیور بدل گئے

آنکھ اٹھا کے جو دیکھا تو ایک ایک ہونٹ سوا پانچ پانچ سیر کا۔ نہایت رنجیدہ چیں بر جبیں آتش بجبیر باشد۔ آپ ناخوش ہوتے۔ جی نہیں میں کیوں خفا ہونے لگا لیکن خوشی کا بھی کوئی مقام نہیں۔ یہ جن کا نام آپ لیتے ہیں اور اس قدر تعریفیں بیان کیں وہ حضرت میرے بڑے بھائی صاحب ہیں اور آپ کا کیا بگاڑا جو اس قدر آپ آزردہ ہیں۔ قبلہ بندہ خدانخواستہ میرا کیا بگاڑا۔ ہاں تمام دنیا کی حیثیت بگاڑ دی۔ تقصیر معاف، بُرا نہ مانیے گا۔ آپ کے بھائی صاحب بڑے قصائی تھے بلکہ چنگیز خاں کہیے تو بجا ہے۔ خدا بچائے اک سرے سے جھاڑو پھیر دی، صفایا بول دیا۔ قیامت برپا کی۔ ایک بات ہو تو کہوں روم روس کی لڑائی۔ ہندوستان پر مہنگی کی چڑھائی، پھر ایک جگہ نہیں، عالمگیر۔ ملک اسپین میں ملکس کی آفت، غریب اودھ پر الحاق کی مصیبت، لکھنؤ میں بنیوں کے مارے ناک میں دم۔ ہر بار رتی یا کا نیور والی رُر و سا کرنے کو جی چاہتا تھا۔ چلتے چلتے جب دُم باقی رہ گئی تھی اور بالکل جانہار تھے تو ہزاروں بچے معصوم ریزگان جنت مبتلا کی معرفت چھٹ کر گئے اور سانس ڈکار بھی نہ لی اُد

...ہوئی ضدی یا جاک لوٹ پوٹ کے بچ بھی گیا تو صورت بگاڑ دی۔ منہ کیا بھڑ کا چھتا ہو گیا۔ بس یہی نا؟ اب آپ کہہ چکے۔ اللہ اللہ یہ آپ کے ...یک کچھ بات ہی نہ ہوئی۔ کیا چپکے سے بس کہہ دیا اور کیا طوفان نوح آجاتا تو آپ جانتے یا حضرت اسرافیل کا صور پھونکنا تو خوش ہوتے ...نہیں جہاں اس قدر برائیاں تھیں کوئی اچھی بات بھی تھی۔ اچھی بات کی ایک ہی کہی۔ کوئی آپ ہی بیان کیجیے۔ میں نے تو نہیں دیکھا مگر کانوں سنا ہے ...قیصری کی خوشی کیا کم تھی۔ میرے ذہن ناقص میں جتنی باتیں ہیں سب وہ اس خوشی کے آگے کچھ نہیں۔ واہ وا وہ بھی کچھ ان کا احسان نہیں اوّل ...دشت کے دم سے شروع ہوا تھا۔ دوسرے ایک دن تھوڑا سا برا تھے نامنس لیے پھر سال بھر برابر رونا پیٹنا رہا۔ ہاں یہ شکر کا مقام ہے کہ خدا نے جان بچائی۔ خیر اب ان باتوں سے کیا، میں اور زیادہ تو کہہ نہیں سکتا لیکن اگر منظور خدا ہے تو یہ ناچیز آپ کو ایسا راضی ...ے کہ نہایت خوش ہو جیے اور بہت دنوں کو یاد کیجیے۔ اللہ سے ... چھیت تو بے ڈھب ہے۔ ابھی سے آپ فرماتے ہیں کہ ایسا راضی کروں گا کہ بھول جائے گفتگو دوغلی ہے۔ لیکن خیر خدا سے ما بزرگ است ہیچاں نماند و چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند۔

ستم ظریف!

گلدستہ

بہار آئی ہے ہوئے چمن شجر ہیں نہال — ہرے ہیں سبزے سے جنگل گلوں سے گلشن لال
چمن کو پھول مبارک ہوں پھول کو خوشبو — اودھ کو پنچ اور پنچ کو یہ دوسرا سال
مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورت طفل — جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال
برب کعبہ نرالی ہے سج، نرالی دھج — خدا گواہ نیا سکہ ہے نئی ٹکسال
یہ بول چال جدا ہے یہ چال ڈھال جدا — جدا سخن کی روش ہے جدا یہ طرز مقال
ہیں لوگ جھومتے یوں قیل و قال پر اس کے — کہ جس طرح کسی صوفی کو آئے بزم میں حال
معاندین نے پٹکا بہت سر اس کے لیے — مگر تراش خراش اس کی پائیں یہ تھا محال
کہاں یہ فوق سما اور کہاں وہ تحت ثریٰ — کجا براق نبیؐ اور کجا خر دجال؟
ہے ابتدا ہی ہیں اس کے بس انتہا کا مزا — خدا کی شان مہ نو ہیں حسن بدر کمال!
ہوا شیوع زمانے میں جس برس اس کا — عجب سعید تھا الحق وہ سال فرخ فال
اودھ کے چیف کمشنر کا بڑھ گیا عہدہ — کہ لفٹیننٹ گورنر ہوئے ہیں وہ امسال
ہوئی ترقی فرماں روائے انگلستان — خطاب قیصری پایا بدولت و اقبال
جو ہندیوں کو ہوئی اس خطاب کی شادی — زبان ناطقہ اس کے بیان میں ہے لال
ہزاروں راہ میں کھوئے کروڑوں نذر دیے — امید یہ تھی فزوں ہوگا اپنا جاہ و جلال
مگر زبانی ہی تھا جمع و خرچ جتنے کیے — گنوا کے ہاتھ سے مال آپ ہو گئے پامال
کسی امیر کو تو توپ کی سلامی ملی — دیا کسی کو فقط اک خطاب ہی پہ ٹال

پلٹ کے واں سے بہت خاک پھانکتے آئے ۔۔۔ یہ سمجھے تب کہ نہ اچھا ہوا کچھ اس کا مآل!

غرض جو آنکھ کھلی پنچ شاخہ ہاتھ میں تھا ۔۔۔ برات ڈھونڈتے پھرتے تھے سب یہ تھا احوال

یہ وقت کا تھا تقاضا کہ سالِ قیصر یہ ۔۔۔ ہو اہلِ ہند کے خاطر سرور و عیش کا سال

مگر غضب ہوا لینے کے پڑ گئے دینے ۔۔۔ ہزاروں آفتیں تھیں اس جلوس کے دنبال

اسی کے بُن سے باہم یہ کچھ فساد ہوا ۔۔۔ کہ روم و روس کے بٹتی ہے جوتیوں میں دال

تمام ہند میں برپا ہوئی اک آفت سی ۔۔۔ اودھ میں قلتِ باراں تو میڈراس میں کال

خطاب دیتے ہی ٹھونک کیا اودھ کو اُدھر ۔۔۔ ذرا نہ سوچے کیا پہلے چومے کاٹا گال!

سُنا ہے اس کی ہوئی ہے اپیل لندن میں ۔۔۔ اقول شخصے مگر یاں گھڑی میں ہے گھڑیال!

خدایا فضل و کرم اپنا بھیج ہم پر ۔۔۔ عجیب ضیق میں ہے جان پھنس گئی فی الحال!

الٰہی دور جہاں سے ہو حکمتِ عملی ۔۔۔ یہ وہ بلا ہے کہ جو کھینچتی ہے بال کی کھال

جہاں میں اپنے اودھ پنچ کو سلامت رکھ ۔۔۔ اس آفتاب پہ آئے نہ تا بہ حشر زوال

زمانے میں رہیں اس کے عدو ہمیشہ تنگ ۔۔۔ جہاں میں اس کے معاون رہیں سدا خوشحال

ت - ن - حجر

سالِ نو، اودھ پنچ

بادۂ احمر لا دے ساقی ۔۔۔ اب تو پھول پلا دے ساقی

پھول نہ ہو تو ٹھرّا لا دے ۔۔۔ خم کو اٹھا کر منہ سے لگا دے

ہو جو نہ ٹھرّا تاڑی دے دے ۔۔۔ سیندھی لا کے پھاڑی دیدے

سیندھی میں بھی ہو جو بہانا ۔۔۔ لانا لانا بھنگ ہی لانا

سبزی پی کر خوب بنے گی ۔۔۔ دیکھنا کیسی گاڑھی چھنے گی

سبز قدوں سے کام پڑا ہے ۔۔۔ ہند میں اک کہرام پڑا ہے

اس میں بھی ہو جو نخرہ دینا ۔۔۔ دینا دینا طرّہ دینا

چھینٹے دے کر ہم کو نہ دم دے ۔۔۔ چٹ پٹ بھر کر ایک چلم دے

کابل سے ہم گرک منگائیں ۔۔۔ جا کے بخارا دھوئیں اڑائیں

کش کوئی دینا ٹنک کا دینا ۔۔۔ لانا چھینٹا مدک کا دینا

فکر نہ کر تو اس کی اُس کی ۔۔۔ افیوں کی اک دے دے چسکی

دیکھ تو ہم نے کیا کیا مانا ۔۔۔ پھر بھی ہم سے آنکھیں چرانا

نخرا ہے تیرا ساقی ٹیڑھا — ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا
نشا جما دے دام نہ مانگ — پاس نہیں ہے پھوٹی بھانگ
چار جو پائے آٹھ اُڑائے — خالی ہاتھوں گھر کو آئے
جام پہ جام پلائے جا — دام کا ذکر نہ لائے جا
مانگے تو کہہ دیں صاف نہیں ہم — مسرف ہیں صراف نہیں ہم
من میں دھیرج دھرنا ساقی — پنچ کے دام بھی ہیں کچھ باقی
جس دم پائے نرے نرے دام — کھری مجوری چوکھا کام
باتوں کا تیری خرچ بڑا ہے — رندوں سے اب کی پالا پڑا ہے
کیا کیا سوانگ تماشے لائے — کیا کیا باغ سبز دکھائے
روم و روس لڑایا ہم نے — ریچھ کا ناچ نچایا ہم نے
دیکھے سب نے قلم کے جوبن — بجلی چمکی اور نز اوکھن
حال نظام کا سارا چھاپا — کابل پر بھی مارا چھاپا
شام اودھ کا رنگ جمایا — توڑ بتایا جوڑ بتایا
سچ کہو ہم جو نہ دل بہلاتے — اب تک ہوش ہیں کس کو پاتے
جان ہی لیتی فاقہ مستی — پانی کے بدلے خاک برستی!
چھاپتے پرچہ اُڑتی خاک — فاقہ سے منہ پر رہتی ناک
کلوں سے کتنے جانچ تولوں — چل بے چرخے چرخ چوں
پنج سے ملک کو بانٹا ہم نے — سال مزے میں کاٹا ہم نے
ناؤ لگی وہ پہنچے پار — مارا غوطہ پہنچے پار
ہاں مئے رنگیں ساقی لانا — سال بھرے کی باقی لانا
تشنہ لبی سے رند ہیں ترسے — اوبلے مٹکا ہنڈیا برسے
شرع شراب اور اُودی گھٹائیں — گرم پیالہ ٹھنڈی ہوائیں
گڑ گڑ بادل پڑ پڑ بوندیں — خاک پہ برسیں جھڑ جھڑ بوندیں
نکلے صدا ہر خاک سے — "برسو رام جھڑاکے سے
برسیں گے برسائیں گے — بنیے مونڈ کٹائیں گے"
جھوم کے آئے ابر بہاری — باغ پہ برسے باری باری
پھول کھلیں جب بلبل چہکے — دل بھی اچھلیں رہ رہ کے

کیسا نکھرا سارا گلشن | نہر بھری ہے گردن گردن!
غنچے چٹکیں لے کے بلائیں | مانگیں زباں سے برگ دعائیں
جب تک گلشن ہرا بھرا ہے | عارض گل سب لہرا بھرا ہے
دل ہو شگفتہ چمن ہو ہر جا | خوش رہیں یا رب راجا پرجا

قیصر ہند جئیں جم جم!
راج میں ان کے براجیں ہم

اللہ اللہ۔ آج منگل کا دن حضرت پنچ کا دوسرا جلوس ہے یا اودھ کا جنگل میں منگل۔ یہ جنوری کی پہلی حضرت قیصر ہند کی خاص ایجاد کردہ تاریخ ہے یا کتاب روزگار کا ٹائٹل پیج۔ یہ حسن اتفاق ہے یا حضرت پنچ کا اقبال، زمانے کے لاکھوں ورق کے ورق دفتر کے دفتر الٹ جاتے ہیں۔ ایسے فرمائشی لطیفے کہیں ہاتھ لگتے ہیں۔ بارے آج ہزاروں ٹوٹوں ٹوٹکوں کے بعد میاں ۱۸۸۶ء صاحب اصل خیر (نہیں نہیں شر) سے سدھارے۔ اب ۱۸۸۷ء کی نئی کھیپ، نیا مال، نیا وزن، روم روس کی ہشت پشت، انگلینڈ کا سوٹھ کا ناس، جرمن کی روباہ بازی، سرویہ رومانیہ کی کورنگی، فرانس کے بگڑے نیل کا ماٹ، خران کابل کی گیدڑ بھبکی اقوام سرحد کی گوشمالی کو انگریزی لوہا، الحاق اودھ کی میٹھی چھری، لیسنس ٹکس کی پیچ، مسندھ اور سہار کے نئے گھن والی لوکل گورنمنٹ، ریاست نظام کی شکر رنجی، نئی روشنی والوں کی قومی ہمدردی، نئے جلسوں کی گلخپ، جدید اخباروں کی اپچ دیکھنا ہے ؎

دیکھئے پاتے ہیں کیا فیض بتوں سے عشاق
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

پرسال روم و روس کی جنگ شائقین اخبارات کو لامحالہ اپنی طرف کھینچے گی مگر مسٹر اودھ پنچ کے برمحل لطیفوں، غضب کی شوخ بیانیوں خوشامدیوں کی سلے دے، امر حق کے اظہار میں آزادہ بیانی، گورنمنٹ کی واجبی نکتہ چینی نے اس پر بھی سینکڑوں کو اپنا مطیع کر ہی لیا۔

ہمارے چندہ باز شہر کے بے فکرے نواب جن کو اخبار کے نام سے بخار آتا تھا انہی کا دم بھرنے لگے۔

مسٹر اودھ پنچ بعض غبی لوگوں پر بھی آئینہ کر دیں گے کہ دیکھو شوخ بیانی یوں پھکڑ فحش سے خالی ہو سکتی ہے۔ استعاروں تشبیہوں کا لطف تصویر کھینچ دینے سے اس طرح دوبالا ہو جاتا ہے۔ راشے بریلی سے مقام پر دو ہی چھڑوں میں رشوت کا یوں استیصال ہو جاتا ہے۔ مسرف نوجوان لوگ یوں رنڈی کی مستی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ گو ہٹ دھرم سحر بیانی کا لوہا نواب بھی مان گئے ہیں مگر صاف صاف اعتراف میں جو شرماشرمی ذرا جی ہچکچاتا ہے تو خیر اس سال وہ بھی لو۔

مسٹر اودھ پنچ اپنے سچے یکرنگ عالی دماغ نامہ نگاروں کے تہ دل سے شکور ہیں جنھوں نے اعلیٰ درجے کے مضامین کے پل باندھ دیئے، نہیں تو پورا اخبار (اور پھر پنچ سا) لکھنا ایک متنفس سے کیونکر ممکن تھا خصوصاً ہمارے عنایت فرما ر۔ن لکھنوی کی لفاظی، ت۔ن ہجر کی جادو طرازی، اپچ اور سلاست، اسح الہ آبادی کے مہذب مزاج اور عالی دماغی، پنجاب پنچ کی ذکاوت و خوش طبعی، بنارس پنچ کی مضمون آفرینی، دکن پنچ کی ظرافت، ج۔ن کی چلبلی تقریر بلا کی نوک جھوک، ہمارے لوکل ستم ظریف مضمون نگار صاحب کی وقوع گوئی، غضب کی سحر بیانی، آتش زبانی، ننھو صاحب بہادر کی لطیفہ بازی، لاہور پنچ کے سماں باندھ دینے والے فقرے، دہلی پنچ کی بولیاں ٹھولیاں پنچ کا سکہ بٹھا دینے میں یادگار رہیں۔

عذر رہ۔ لاکھ جلدی کی مگر رج کی کھڑاک سے اخبار نکلنے میں ایک دن کی دیر ہو گئی۔ ہمارے ناظرین از راہ عنایت معاف فرمائیں۔

کرسمس

کرسمس ڈے کی دھوم دھام، گرجا کا اہتمام، میوہ جات کی گرانی، ڈالیوں کی ارزانی۔ کیک بسکٹ کی طیاری، بنگلے کوٹھیوں کی گلکاری، انگریزی بانسری کا بجنا، تنبور کا گرجنا۔ لباس و زیور کی آرائش، تکلفات کی افزائش قابلِ دید ہے۔ انگریزوں کا بڑا دن، نئی روشنی والوں کی انگریزی عید ہے۔ صاحب لوگوں کے تکلفات جو کچھ ہوں مزیب اور بجا ہیں مگر نئے گڑے نیو کرسچین کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ بیرا اول بیرا! اِدھر آؤ۔ کل بڑا دن ہے۔ چاشے کا کیتلی بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کلی گر سے برلوسی جوس کر کے پیندے میں جوڑ لگا دے۔ ویل ڈیکھو، وہ کالا بوٹ ہمارا لے جاؤ، بہت سکت ہو گیا ہے۔ بچارے سے بولو پیوند لگا دے، اوس کا ایڑی بالکل گر گیا ہے درست کر دے۔ وہ کالا کوٹ الپاکہ والا جو مسٹر بچلر کے مرنے کے بعد ہم نیلام میں لیا تھا اور وہ لال ٹوپی جو سر کے میل سے کالا ہو گیا ہے جیسے مسٹر سیدھ یڈ نے جوتا پونچھ کر پھینک دیا تھا اور ہم نے دھو لیا کر نہ کہ چھوٹا اتھا نکال رکھو اور رات کو کسی بنگلے سے دو رنگی چور لاؤ اور وہاں بجانا سکو تو بدھو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مشلچی سے ہمارا اسلام کہو اور لے آؤ۔ ہمارا کھانے کا میز جس پر مکھیاں لپٹا رہتا ہے کوئی سپیتھرا لے کر پونچھ پانچھ دو۔ کل ہمارا دوست لوگ سب جمع ہو گا۔

بیرا ابھی وہ پھیل چکنیا کیل کانٹے سے درست ہے کہ ماشاءاللہ۔ پچاس برس کا سن، دبلا پتلا، بدن میں فقط ہڈی چمڑا، سر کے ذری ذری بال، بھونی سری کی قطع، آنکھوں میں کیچڑ، داڑھی کے بال کچھ سفید کچھ کالے، پھیلا ہوا منہ جیسے چھوٹی مہتاب، بیلی غرقی لگائے ایک مرزئی جس میں بیسیوں پیوندوں کے سوا روئی کا ذکر نہیں، ہلدی مصالحہ کے جابجا دھبے۔ ایک میلا لتہ صافی کا ٹکڑا تولیہ کے عوض کندھے پر پڑا، پھٹا جوتا پہنے بازار کو نکلا ہوا۔ وہی بیرا، وہی خدمت گار، وہی بورچی، وہی مشلچی، بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے اور چپکے چپکے کہتا جاتا ہے میاں کے نہ میز نہ کرسی، ایک ٹوٹی میز اور مرتے گلے چار مونڈھے، دو رکابیاں، دو کالے کوٹ پتلون نیلام سے کھریدے۔ ٹکہ پاس نہیں انگریج بننے پر گس کرتے ہیں۔

غرضکہ ہر شخص بہ خیالِ خویش خبطے دارد۔ یہ حضرات بھی عجیب طرح بسر کر رہے ہیں۔ بقول شخصے کہ ؎

گئے دونوں جہان سے واے ستم نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

ستم ظریف

الف بائے پنج

ا انگلینڈ کے سُن رے بھائی	روس نے کی ٹرکی پہ چڑھائی
کابل ہندوستان بھڑاوا	ڈانڈا لیے جوا کی دھاوا

بابا بابا ہندوان جانت ہے سب کوئے
چھوٹے مکر برتے جو کوؤ ہر کوئی دا کا ہوئے

ب بتیا اک بات سناؤں	یہوں قلات پشور بچاؤں
مانت ناہیں شیر علی	حکمت عملی کچھ نہ چلی

صوبہ ہندوستان کا ہے کابل قندھار
جو کوؤ پہنچا وے وہاں تک دا کے ہیں بلہار

ت ترکی سے لائے سفیر　　　واکی بھی نا سنس اہیمر
سب سے کہت ہے کرو جہاد　　　کل سرحد پر مچا فساد
جو نلوا دیا توپ پر آن پرست ہر آن
کابل لڑکے دیکھ چکے ہیں وہ سارے افغان

ث ثابت ہوتا ہے ایسا　　　جان بچائے دے کر پیسا
دشمن کو پھر دوست بنائے　　　زور گھٹانے کو لڑوائے
جو چاہو سو ہم سے او پر لڑو روس سے جائے
فوج ہماری کمک کرے گی یہ کو دسمجھائے

ج جو صاحب جو جھے رن میں　　　رن کا ہے کو کہیے بن میں
اون کا بدلا کیسے ملے ہے　　　جو نے ہے وہ کا دل ہلے ہے
بگڑا باگھ نہ مانے چمکاری مت دیو
چھوڑو ایسی کڈھب جگہ گھر کا رستہ لیو

ح حرکت جو فوج نے کینی　　　پگ پاچھے ہو جیسے ہینی!
کس کے سر پر ٹھوپی جائے　　　بنا لڑے کیسے ہٹ آئے
دھمکی دینے آئے تھے سو دھمکن لاگی توپ
گولے ٹوپی مار رہیں اور بگڑی گھٹا ٹوپ

خ خوف اور بڑا یہ بھائی　　　جن کے برتے رار مچائی
وہ سب دم او نہیں کا بھریں　　　ایسا ہوئے نہ واند کریں
پکا پھوڑا چھیڑیے تو چھیڑانا ہیں جائے
بے دھڑکا سو ہے دن رین ہیا نہ پھوٹے آئے

د دیا جو کچھ سب کھویا　　　دانا ڈالا کیا بس بو یا
دیا خزانہ کر تنخواہ　　　دیا میگزین برائے سپاہ
جیسا کیا سو آگے آیا اب کا ہے پچھتاؤ
جو من کا کپٹے بھیا وا کا کو سبھاؤ

ذ ذلت یہ کیسی ہو گی　　　جو گی جو ہو جائے بھو گی
بھیک نہ مانگے مانگے حصہ　　　میل کیے ہو جھگڑا قصہ
جن کے کارن بھرن بھرے کیا انہیں سے میل
دیکھ سکی ان تلن مان تنک نہ نکسا تیل

ر رخصت ہوآئے سفیر　　لگے بڑھاو نے فوج امیر
اب بن لڑے نہیں چھٹکارا　　کیسی کر بے لٹن بچارا

اپنی سی سب کر دیکھی کرم لکھے کی ہوئے
کپٹی سے نہا کرے گرہ سے اپنی کھوئے

ز زار کے آئے سفیر　　اوس سے پڑیا ہے ہیں امیر
دیکھیں دیئے وہ کیا ئبت　　کیسے کھائے حرص کت

چیوا اور بچارا دیکھو کیا جو کچھ برتاؤ
پھر کال قسندھار میں جو مانگو سو پاؤ

س سچ اک بات بتاؤں　　تجھ کو صاف جو دل سے پاؤں
چھوڑ قلات اپنا گھر سیوو　　ڈوبی نیا اس گن کھیوو

نام سے کچھ چھیڑ ہو نا ہو کچھ بگاڑ
بسے بسائے گھر کا کودا ایسے دیت اُجاڑ

ش شرارت جو کو و کری　　تری حد مان پاؤں دھری
وہ کا حبانو موڑ پُرانا　　چاہت ہے وہ ڈھول لگانا

ایسے کی جس چاہیے ویسی نکتا ہوئے
پاؤں کلہاڑی مار کے گھر میں بیٹھا روئے

ص صبر سے نکلے کام　　جلدی کر کیوں ہو بدنام
پہلے اون کے ساتھی توڑو　　جو کچھ کہیں نہ منہ کو موڑو

اون کے سب کو اپنا کرو اپنی لو پھر جیت
مانو کہ ہمرا کہا ہر اک سے راکھو پیت

———

راقم: شاعر

بے نکلے آنکھ تُسند پٹنے دون کی لینے لگے
طفلِ مکتب بے الف پڑھ کے سبق دینے لگے

دوسرا سبق

یا اوستاد ابھی میدان ابھی چوگان ابھی گوے (ا)، شامت ہے پٹھے کی شامت ہے اسے مرحبا شاباش پٹھے شاباش مرحبا۔ پڑھنا پڑھانا چولہے بھاڑ میں جائے۔ ہماری بات چیت ہی سیکھو تو بن جاؤ ہاں سر باللہ (بسم اللہ)

(ش) کونسا علم سیکھیے؟

(ا) علمِ مجلس!

(ش) علمِ مجلس کے معنی مع مطلب فرمایئے۔

(ا) واہ یہ بات کہی دیکھو ایک ہی سبق پڑھ کر دو آنکھوں کی چار ہوگئیں یعنی مسئلے بگھارنے لگے۔ سنو علمِ مجلس کے اصطلاحی معنی کتاب خوشامد کی جوتھے باب تملق کی دوسری فصل ناجا لوجی میں یوں لکھے ہیں کہ —— جیسا دیس ویسا بھیس۔

(ش) ہم یہ بھی نہ سمجھے۔

(ا) جیسا رنگ ہیں پانی۔

(ش) آگ لگے تمہاری باتوں میں خلاصۂ مطلب کیا ہوا؟

(ا) ہاں جس صحبت میں جائے ہاں میں ہاں ملائے۔ حق ہو یا ناحق بات کی تائید ضرور کرے ہاتھ جوڑتا رہے۔ سب کی چلیں لم ترے چاہے کوئی چار کھوٹی بھی سنائے برا نہ مانے۔ بھلائی اپنی چاہے تو بے عزتی کو مقدم جانے کیونکہ (عزت چہ گُنتی است کہ پیشِ مرداں بیاید) پھر نفع سے مطلب نقصان کا ہے کا۔ اگر اس نصیحت پر عمل کیا تو دیکھنا پیٹ پھول کے مٹکا ہو جائے گا۔ یاد کرو گے اور ایمانداری تو کبھی پھٹکنے نہ پائے۔ ایسا بغل میں دبا بیٹھے جیسے بندریا اپنے بچے کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ پھر موقع محل دیکھے تو جھوٹ، حالت بھی اوٹھالے کو ثواب عذاب نہیں مقتضائے وقت کہا جائے گا یا دروغ مصلحت آمیز بہ ... الخ بن جائے گا۔

(ش) کیوں مرشد جھوٹ اچھا کہ سچ؟

(ا) جھوٹ اچھا جھوٹ۔ خدا سچ نہ بلوائے اور اس جانب کا شیوہ تو قدیم الایام سے (یعنی پشت ہا پشت) یہی چلا آتا ہے اور خوب ہی پھلا (بلکہ پھولا ہے) دیکھو دو تین باتیں یاد رکھو ایک تو مثل مشہور ہے جھوٹے کے آگے سچا رو مرے۔ دوسرے سچی بات سعد اللہ کہیں سب کے من سے اترے رہیں۔ بھائی اللہ بچائے سچ بول کے گردن کون کٹوائے۔

(ش) بھلا حضرت تو آپ آزمودہ کار ہیں کچھ اس کے فائدے اور بھی بیان فرمایئے۔

(ا) بچشم سر آنکھوں سے، گلے گلے پانی اور گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں ایک ادنیٰ سا فائدہ یہ کیا کم ہے کہ اب ہم سچ بھی بولیں تو کوئی یقین نہیں لاتا۔ باقی اور بھی از قبیل وغیرہ وغیرہ۔ واہ تو آپ بھی بعضے بے اٹکل اخبار نویس ٹھہرے۔

(ش) اب ایک بہت بڑی بات ہم پوچھتے ہیں۔ حاکم محکوم میں کیا فرق ہے؟

(ا) پشش بس یہی بات تھی۔ یہ کیا بڑی بات ہے سنو ایسا فرق ہے جیسے زمین و آسمان یا لکھنؤ سے لندن یا بمبئی تال سے دکن حیدر آباد۔

(ش) ذرا ٹھہریے اور خدا حکومت والے نوکرے۔

(ا) اس کا جواب زار روس سے پوچھو کے دو دن گاہاں زبردستی دہیں دھینگا دھینگی خود رائی بے پروائی، سخن پرستی بھنگ زندگی نا پرسانی غفلت، ہزار طرح کی سیاست (یعنی جز و ریاست مارے اور رونے نہ دے۔ سر بازار جیسے پاسے کھلی ڈال کے لوٹ لے) اور کہیں مثل ورد زبان رہے۔ کس کا سر اپنے آگوے مارے۔ یہ وہ زمانہ جس کا گلا گھونٹو وہی آنکھیں نکالتا ہے۔ زبردست کی واہ سر پر۔

(ش) بھلا محکوم کی کیا تعریف ہے؟
(ا) جیسے کتے، مار کتے کے گلے میں رسی باندھ کے کھینچا پھیے جاتا ہے یہ صفت پیدا کرے۔ ہرچہ از دوست میرسد
[illegible] کا مضمون۔ لاکھ طرح کی سختی ہو چوں نہ کرے۔ گو بات چاہے کیسی ہی بری ہو یا بجا بہت، قسب بہت، ناسب، بہت بجا۔
[illegible] شکر ہے، ہر مصیبت پر احسان ہے تیرا، کچھ مصلحت ہو گی۔ جس کل بٹھائے بیٹھے۔ جو ناچ نچائے ناچے چار باتیں سن کے
[illegible]۔ خطا بے خطا تقصیر ہوئی، قصوروار ہوں، غرض کہ حق ناحق، بدنامی کا ٹوکرا اپنے ہی سر دھرے لیکن یہ سب چاپلوسی بے غرضی یا ذی
[illegible] سازی سے ہو۔ دل میں گھر کر کے پانچوں مال اپنے کر لے، وقت پر صاف الگ اور خیانت، بد دیانتی، کاہلی، جھوٹی کام چوری،
[illegible] کام بگاڑ دینے کی فکر، پاس نمک، رنج سے ماننا نمک ندارد لیکن بن پڑنا شرط ہے۔ باقی اور مطالب آئندہ تم آپ سمجھ جاؤ گے
[illegible] پڑھ لو۔

(ش) خفا نہ ہو جیے برا نہ مانیے تو ایک بات کہوں۔
(ا) ہم تو برے کے باپ کو نہیں مانتے۔ شوق سے تم ہزار باتیں کہو۔
(ش) میں چاہتا ہوں چھوٹے چھوٹے جملے مختصر طور پر تڑاق پڑاق بیان کروں۔
(ا) واہ جملہ چو حرفی اور دو حرفی سے تو کم نہ ہو گا۔ مجھ سے کہو تو اشاروں میں سمجھا دوں۔
(ش) ہاں او استاد! یہ بات۔ بھلا سال کون سا اچھا؟
(ا) سن صفر جس میں وہ ایکٹ جاری ہوا۔
(ش) اور مہینہ کون مبارک ہے؟
(ا) پونڈ کا مہینہ!
(ش) اچھا دن کون متبرک ہے؟
(ا) ہفت شنبہ!
(ش) ہائیں۔ یہ کوئی دن نہیں۔
(ا) اہو ہو ہو ہو بھائی جسے بڑا دن کہتے ہیں۔
(ش) تو تم کون گھڑی؟
(ا) چودھری (بنیوں کا) جس کا کہیں قفل پڑا نہیں۔
(ش) دنیا حاصل ہونے کی ترکیب؟
(ا) دین سے کنارہ کشی۔
(ش) سچ بیوپار کون سا ہے؟
(ا) لوگ تو کہتے ہیں چوری۔ ہمارے نزدیک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔ رشوت بھی غنیمت ہے۔
(ش) روشنی کون اچھی؟

(ا) ظاہر ہے یہی نئی روشنی۔ پرانی چیزیں تو بھی بیکار ہے۔

(ش) سفر کرے تو کدھر جائے؟

(ا) سیدھا لندن کی طرف۔

(ش) فصل کون سی اچھی؟

(ا) خشک سالی میں چیچک وبا۔

(ش) نعوذ قرآن و دیان کیا ہے دھڑک نام لیا ہے۔ خدا نہ کرے۔

(ا) آخر بچے ہونا۔ بات کی تہ کو نہ پہنچے۔ تیرھویں صدی اخیر زمانہ دجال کی آمد آمد (نائب تو خروج کر چکے) تخفیف کی کاں سب باتوں پر طرہ بی گرانی صاحب نے وہ مرڈوڑ پیچ لڑایا ہے اور شاید وہ ہر سر پڑ گئی کہ کٹنے کا نام نہیں لیتیں اس میں جہاں تک کی ہو مصلحت سے خالی نہیں اور سنا نہیں کہ خس کم جہاں پاک۔

(ش) بھلا آدمی کہاں بنتا ہے؟

(ا) کمیٹی میں۔

(ش) کمیٹی چیز مئی دارد؟

(ا) جہاں چار آدمی لائق کیا نالائق جمع ہو کے زمین و آسمان کے قلابے ملائیں۔

(ش) پھر وہاں آدمی کیونکر بنایا جاتا ہے؟

(ا) اس میں کچھ محذوفات ہیں ایک نہ ایک طرح سے ضرور بنایا جاتا ہے۔ پھر کبھی کہہ دیں گے۔

(ش) اور دعا کہاں قبول ہوتی ہے؟

(ا) یہ نہ پوچھو زبان کا اثر غائب غلہ ہوا۔ دعا کا قبول ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک کہیں نہیں قبول ہوتی۔

(ش) اچھا دنیا میں لاحاصل کون کام ہے؟

(ا) سچی اخبار نویسی اور عمدہ مضمون نگاری۔ کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔

(ش) واہ اوستاد واللہ تمہاری باتیں کیا ہیں نپے تلے مٹھائی ہے۔ ایسی خوش ذائقہ کہ دیکھی نہ سنی جی لگتا ہے دو چار فقرے اور۔

(ا) بس بس معاف کیجیے میرا تو جی نہیں لگتا۔ اب کتاب بغل میں دبائے اور چلتے پھرتے نظر آئے طبیعت لگی تو پھر کبھی۔

تار برقیاں

۲۳ دسمبر۔ لندن۔ بوجہ سرد ہوا اور برف کے جنوب بلگیریا کی جنگی کارروائیاں بند ہیں۔

افواج سرویا نے پینگ گلیوا کو فتح کر لیا۔ دوسری افواج سرویا روسیوں کے ساتھ مل گئیں اور رون کی جانب بڑھتی جاتی ہیں۔ روسیوں نے مقام اولٹی کو فتح کر لیا اور اپنی افواج اٹروان اثر میں جمع کر رہے ہیں۔ آرمینیا میں سردی کی شدت ہے۔

۲۴ دسمبر۔ لندن۔ سلیمان پاشا نے قلعہ جات ذوار لیعہ الاضلاع میں فوج داخل کی ہے اور باقیماندہ فوج کو وہ اڈریانوپل میں جمع کیے ہیں۔

یقین ہے کہ گورنمنٹ سلطان نے اخیر وقت تک جنگ کرنے کا ارادہ ٹھان لیا ہے۔

شہنشاہ روس مع شہزادہ گورٹشکاف سینٹ پیٹرس برگ میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ روسی جنرل موم [illegible] ادہ کر رہے ہیں۔

انگلستان ان عہدناموں کو جواب میں امن میں رکھے گا اور یورپ کے ملکوں کو مساوی رکھے گا اور روس کو نہ بڑھنے دے گا اور [illegible] کا [illegible] روائی میں اس کو فرانس اور اٹلی سے اعانت ملے گی۔

۲۵ دسمبر لندن۔ شہنشاہ روس نے کہا ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور مجھ کو امید ہے کہ جو کام روس نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کو جناب عالی ہی پورا کریں گے۔

وزیر اعظم ٹرکی نے ایک وکیل سے ملاقات کی جو کہ مسلمانانِ ہندوستان کی جانب سے وہاں گیا ہے۔

سرویا نے بانتری پر ناکامی سے حملہ کیا۔ ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ فوج نیش نے ارادہ کیا تھا کہ بلند مقامات کمپنی پر قبضہ کر لے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔

فوج کشی جواکی

۲۴ دسمبر، شیر گھاسہ۔ فوج کل دوسری پہاڑی پر دشتوئی گھاٹی ہوتی ہوئی روانہ ہوگی۔ یہ دو کالم ہو کر روانہ ہوگی۔ اول برگیڈ تو زیر کمان کرنیل بہادر ہو گا اور دوسرا زیر کمان کرنیل ڈرونڈ۔ دو سو پچاس آدمی رفل برگیڈ اور ایک حصہ بائیسویں ہندوستانی پلٹن کو حکم دیا گیا ہے کہ فوراً یہاں آویں۔ [illegible] کا تار غنیم نے کاٹ دیا ہے۔ جواکی پشتوئی میں جمع ہو رہے ہیں۔ رات کو لشکر پر گولیاں غنیم چلاتا ہے۔

۲۶ دسمبر، شیر گھاسہ۔ ایک فوج سے کل گرد آوری ہوئی تھی۔ کچھ مخالفت نہیں ظاہر کی گئی۔ ایک جواکی مارا گیا۔ فوج پوری میں کل خیمہ زن ہوں اور پشتوئی پر جمعہ کو قابض ہوگی۔ یہ حملہ بسر اکت فوج جنرل کنبر صاحب کے کیا جائے گا۔ یہ فوج ہمارے شریک پشتوئی میں ہوگی موسم خراب معلوم ہوتا ہے۔

۲۶ دسمبر، شیر گھاسہ۔ انتیس ہندوستانی پلٹن خوشحال گڈھ سے اور نصف باڑی کوہاٹ سے آج مقام ترکی باغ کو جاوے گی۔

۲۶ دسمبر، کلکتہ۔ کوئی انکم ٹیکس جاری نہ ہوگا مگر آمدنی کی ترقی اس طور پر کی گئی ہے کہ درجہ وار لیسنس ٹکس تجارت اور پیشہ پر لگایا جاوے اور مالگذاری کسی قدر ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں بڑھائی جائے گی۔

فوج کشی ناگا

۲۶ دسمبر، جورہاٹ۔ جب سے موزما کو لے لیا ہے اس وقت سے ناگوں نے نہایت ستا رکھا ہے۔ دو ڈاکیوں کو روکا اور لوٹ لیا۔ دو کانسٹبلوں کو مار ڈالا۔ وہ چاہتے ہیں آمد و رفت روک دیں اور جو فوج بھیجی گئی تھی تھوڑی قرار دی جاتی ہے اور مواضع بھی مخالفت ظاہر کرتے ہیں۔ ایک سو آدمی تنتالیسویں پلٹن سے طلب ہوئے ہیں جو دبرو گڈھ میں ہے۔ چیف کمشنر آسام مقام گورہاٹ میں داخل ہوئے۔ امید ہے کہ یہ ناگا کے پہاڑوں کو جاویں گے جب کہ وہاں امن ہو جائے گا۔ مقام اوکھا میں سب تندرست ہیں۔

۲۶ دسمبر بمورہ رات۔ انگامی ناگا موزما کے جن گاؤں کو جلادیا تھا ان کے جدا جدا گروہ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے سڑک بند کردی ہے اور پل کو توڑ ڈالا ہے اور آمد و رفت درمیان فوج اور سماگٹن کے بند کی ہے۔

کانسٹبل کو جو ڈاک لیے جاتا تھا مار ڈالا۔ دوسرے کو زخمی کیا۔ ایک اور گروہ ان ناگوں کا درمیان سماگٹن اور میدان کے ظاہر ہوا ہے انھوں نے ایک اور کانسٹبل کو برچھی سے مار ڈالا اور ڈاک والے کو زخمی کیا اور انھوں نے بورپا لنگر کو دھمکی دی جو ایک اسامی موضع میدان میں اور امپل گودلہ گھاٹ سے ہے اور یہ بھی بیان ہے کہ سماگٹن کو دھمکی دی ہے۔

اخیر ڈاک جو سماگٹن سے آئی وہ زیر گارد بیس کانسٹبلوں کے آئی تھی۔ لماک پولیس کے لوگوں کی گولہ گھاٹ میں داخل ہوئی اور ایک حصہ نمبر ۴۴ پلٹن کا دبرو گڈھ سے آنے والا ہے۔

فوج کشی جواکی

ایک تار برقی جو کوہاٹ سے مورخہ ۲۲ دسمبر کی آئی اس میں لکھا ہے کہ جواکیوں کے پاس سے ۲۲ اور ۲۴ ماہ حال کو قاصد آئے اور جو درخواست ان کی سابق میں تھی اسی کو ظاہر کیا یعنی کچھ رہنیوں کو اجازت ملی کہ وہ جاکر اپنے جرگوں کے لوگوں کو لشکر میں لاویں مگر ان سے کہا گیا کہ یہ بات غیر ممکن ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ اور قاصد نہ آوے جب تک کہ جرگے کے لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں۔ شہر گھاسہ سے مورخہ ۲۴ ماہ حال کو کسی قدر گولیاں ۲۲ ماہ حال کو جواکیوں نے اس بجٹ پر چلائیں جو پہاڑی پر تھا۔

مطبع شام اودھ واقع لکھنؤ محلہ گولہ گنج میں محمد سجاد حسین کے اہتمام سے چھپا

اودھ پنچ کے شاعر

بسنت نامہ دھوم دھامی

ستم ظریف

آئی ہے [illegible] اب کی مگر بسنت ‏ ‏ برنام سے رقص پہ ہوئی عید [illegible] بسنت
فاقوں کے مارے چھائی ہے چہروں پہ مُردنی ‏ ‏ کہتے ہو زرد رو میں منائی مگر بسنت
سب جھوٹ ہے بات ڈھول کے پیٹ ہی بات ہے ‏ ‏ کھائی پھری سے ٹھوکریں کیا دربدر بسنت
بھیروں ہی باجتا ہے یہاں کس کا راگ رنگ ‏ ‏ دیکھی سنی نہ تھی کبھی ایسی عجب بسنت
مطلق نہ کانوں کان کسی کو ہوئی خبر ‏ ‏ کس سمت کو چلی گئی آئی کدھر بسنت
حسرت سے بالیوں کی طرف تکتی ہے [illegible] ‏ ‏ کنگال دانہ زرد ہے کچھ اب کی مگر بسنت
اللہ بار [illegible] دکھا دے گیہوں کی شکل ‏ ‏ آباد تیرے دم سے ہوا اجڑا نگر بسنت
کہتے ہیں سب کہ آئی گیہوں کاٹنے کی فصل ‏ ‏ شاباش کیا سنائی ہے اچھی خبر بسنت
ہلدی کی اک گرہ نہیں پلّے وہ رنگ ہے ‏ ‏ نفرت ہے پھیکے پھیکے چلے ہم سے نہ کر بسنت

اے پنچ کیا ہتھیلی پہ سرسوں جمائی ہے؟
اس فصل میں بھی تم نے منائی مگر بسنت

رُباعیاں

ترجمون ناظم تجر

حضرت اودھ پنچ صاحب! یوں کہنے کو تو رباعیاتِ عمر خیام زبان زدِ خاص و عام ہیں مگر جناب ہماری رباعیوں میں افیون کے قوام ہیں۔ واللہ وہ چاشنی ہے کہ تار نہ ٹوٹے۔ لے اس کو اس سے کیا حاصل اوس قوام کا ہمیں بھی مزا تو چکھ لیجئے۔ بہت بہتر ۔

چانڈو کا جو کوئی لطف ہم سے پوچھے ‏ ‏ نَے ہاتھ میں لے لگائے منھ سے
ہو تہ نظر جوابِ بحر کا مزا ‏ ‏ ہر چھینٹے کے بعد اک گنڈیری چوسے

قندِ مکرر

میٹھی میٹھی گزک نہ ہم سے چھوٹے | دنیا نوسی سٹک نہ ہم سے چھوٹے
گھربار چھٹے بلا سے لیکن اے ہجر | افیون، چانڈو، مدک نہ ہم سے چھوٹے

(اودھ پنچ ۱۸ دسمبر ۱۸۷۷ء)

غزل

از بھون ناتھ ہجر

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے | سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن | آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں | واہ کیا واقعہ نگاری ہے
کیا لکھیں دل نہ جب شگفتہ ہو | آفتِ جاں امیدواری ہے
کوئی بیٹھے نہ آکے دفتر میں | نادری حکم اب یہ جاری ہے
کیا کریں اب بچارے ایڈیٹر | رات دن شغلِ آہ و زاری ہے
مارے تخفیف اور ٹکس کے پیچ | رو چکے سب، ہماری باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر | محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے | روز بازارِ جاں سپاری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر | زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز | گرم بازارِ فوجداری ہے
شجرِ کہنہ ہو گئے سرسبز | کیا ہی گوہر کی آبداری ہے
مفت کا مال کرتی ہے تحصیل | بس یہی اک وفاشعاری ہے
ہر گرانی سے ناک میں دم ہے | اب نہ وہ اشرفی نہ ساری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں | پھر وہی زندگی ہماری ہے
دیکھیے فیصلہ یہ کب تک ہو | حضرتِ دل کی روبکاری ہے
اک نہ اک دن یہ ہوگا پردہ فاش | اس کا خمیازہ شرمساری ہے

تھوڑے تھوڑے پونٹ کی چوری
واہ کیا خوب پردہ داری ہے

(اودھ پنچ ۱۹ مارچ ۱۸۷۸ء)

ناول ڈرامے سچ ہیں کہ یورپ میں ہیں چھپے — مطبوع ہند قصۂ گلفام جھوٹ ہے
کہتے ہیں وہ جو آتی کو استار عین صادق — کہتے ہیں ہم جو آنکھ کو بادام جھوٹ ہے
گردش کا اپنی گردشِ ایام ہے سبب — گو وہ کہیں کہ گردشِ ایام جھوٹ ہے

ادبار جب کہ آ گیا سب عیب آ گئے
آغاز جھوٹ نہ سہی سر انجام جھوٹ ہے

اسی طرح جس وقت فصیح الملک نواب مرزا داغ کا انتقال ہوا تو اان انسان ضاحک کی نجلی شوخ طبیعت نے ...
جناب سے یہ قطعہ ارشاد فرمایا ؎

یادش بخیر آئے اجل نے مٹا دیا
گویا کہ داغ صفحۂ ہستی پہ داغ تھے

تھے باعثِ نشاط کبھی صورتِ صُداع
بلبل تھے ناچ گھر کے کلب گھر میں زاغ تھے

گھبراتے تھے ولایتی چکر کی سیر سے
مخمورِ حسنِ کیفیتِ جام باغ تھے

مجلس میں ان کی پورٹ نہ وسکی نہ شامپین
بیندھی کے سونیا کی فقط کچھ ایاغ تھے

شائستہ لیڈیوں کا نہ مطلق تھا واں نشاں
ہاں تھے تو مولیوں کے پتے تھے سراغ تھے

باتوں میں جو چلے تھے طبیعت میں شوخیاں
روشن خیال تھے نہ وہ عالی دماغ تھے

کس نے کہا کہ تھے وہ نئی روشنی کے لیمپ
وہ تو الہ دین کے طلسمی چراغ تھے

غزل

پیٹنٹ

ڈیر پنچ! اُردو شاعری پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ شاعر لکیر کے فقیر ہیں، جدت کا مادہ نہیں۔ اعتراض کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے
ہم صرف ایک شق پر بحث کریں گے۔ شاعروں نے صرف چند اعضائے انسانی لیے ہیں جن کا فراق اور وصال میں دکھڑا روبا ...
ہم کہتے ہیں کیا خدا نے کوئی عضو بیکار بنایا ہے یا کوئی عضو ایسا بنایا ہے جو اس عشق کو محسوس نہ کرے جو سر سے پیر تک ...

...ہے کہ صرف دل و جگر، آنکھ، سینہ، پہلو کا لگاتار سلسلہ ہے اور باقی اعضا جو شاید مادۂ عشق قبول کرنے اور متاثر ہونے میں آن...
...رکھتے ہوں چھوڑ دیے جائیں۔ ہماری رائے میں سب کو درجہ بدرجہ اور رتبہ بہ رتبہ یاد کرنا چاہیے۔ اس عمل درآمد کے بعد
...کے اسکول والوں سے بھی صلح ہو جائے گی۔ بہرصورت ایک نئی غزل اس نئی طرز میں نذر ہے۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا
...ہم نے بتا دیا ہے اب شاعرانِ رنگین بیان طبع آزمائیاں کریں اور اس طرزِ جدید کو آسمان پر اڑا لے جائیں۔ یعنی ایجاد بنام
...ہے۔ تتبع اور تقلید کی اجازت عام ہے۔

معدہ میں آگ عشق کی بدستور لگی ہے — پھیپھڑوں کی دھونکنی مرے سینہ میں چلتی ہے
گردوں نے دردِ عشق میں آفت مچائی ہے — تلی غمِ فراق میں ہاتھوں میں ملتی ہے
چھینک آئی ہم نے شکر خدا کا ادا کیا — اس راستے سے ناک کی حسرت نکلتی ہے
کروٹ بدل رہے ہیں شبِ ہجر بار بار — آنتوں میں زور شور سے بندوق چلتی ہے
تارے گنا کیا ہوں پڑا چت شبِ فراق — اتنی دبی کہ ریڑھ کی ہڈی اچھلتی ہے
دانتوں کا دسترس نہ ہوا گوشِ یار تک — سچ ہے کہ بدنصیب کی کب دال گلتی ہے
شیرو شکر نقصِ عشق میں یہ بھی بلا ہوئیں — لو آج پسلیوں میں بھی تلوار چلتی ہے
تصویرِ یار ہم نے لگائی دماغ میں — کچھ کچھ شبِ فراق طبیعت بہلتی ہے

برسات آئی پھر وہی گڑبڑ مزاج ہے
پھر پیٹ میں فساد ہے پھر ناف ٹلتی ہے

رنگ میں بھنگ

اصغر

(سید اصغر علی نام تھا۔ شاہ پور ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے۔ بذلہ سنج شاعر تھے۔ اودھ پنچ سابق میں لکھا کرتے تھے۔ کلام میں شوخی اور ظرافت کا لطیف امتزاج ہوتا تھا)

یہ محرم میں ہولی کا تہوار
ہنسی صورت ہے اور دل بیمار
گر پڑے تھک کے پردہ ہائے چشم
جب نہ آیا ستم شعار عیار
لگ گئی آنکھ موت آ پہنچی
ہو گئی حسِ مشترک بیمار
روح قالب سے سیر کو نکلی
عالمِ خواب کی دکھائی بہار

[illegible] ہو گیا ہو
اپنا مجھ کو بتاؤ نام و دیار
کس کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہو
کس کی چشمِ سیہ کے ہو بیمار
بولا وہ مردِ نیک خوش اسلوب
حال کیا پوچھتے ہو تم اے یار
تیغِ ابرو کا میں نہیں گھائل
نہ کسی حور وش کا عاشقِ زار
انقلابِ فلک کا مارا ہوں!
دل پہ اٹھی ہے درد کی دیوار
لوگ سب ہو رہے ہیں غفلت سے
ان کے اعمال پہ ہوں زار و نزار

فرطِ غم سے جو کھل گئیں آنکھیں
مٹ گیا سب طلسم کا گھر بار
وہی کنجِ قفس وہی [illegible]
بسترِ غم ہے اور آتش زار

میں نے پوچھا کہ کون ہو کیا ہو
اپنا مجھ کو بتاؤ نام و دیار
کس کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہو
کس کی چشمِ سیہ کے ہو بیمار
بولا وہ مردِ نیک خوش اسلوب
حال کیا پوچھتے ہو تم اے یار
تیغِ ابرو کا میں نہیں گھائل
نہ کسی حور وش کا عاشقِ زار
انقلابِ فلک کا مارا ہوں!
دل پہ اٹھی ہے درد کی دیوار
لوگ سب سو رہے ہیں غفلت سے
ان کے افعال پر ہوں زار و نزار

فرطِ غم سے جو کھل گئیں آنکھیں
مٹ گیا سب طلسم کا گھر بار
وہی کنجِ قفس وہی فریاد
بسترِ غم ہے اور اصغرِ زار

[illegible] گے ۔ مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار رحم دل کہیں گے ۔ مبارک وہ جو راست بازی کے نشے دھمکاتے [illegible] ہونگا ان کے سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی ۔ (۱۱ ستمبر ۱۸۷۷ء)

ایک ولایت سے تازہ وارد انگریز کے سامنے ایک گائے کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا ۔ صاحب بہادر کا اجلاس سہ منزلے [illegible] صاحب بہادر گائے کا نام سن کر گھبرائے اور کہا کہ گائے عدالت میں حاضر کیا جائے ۔ اہلِ عملہ اور فریقین نے عذر کیا کہ گائے کو چھت پر [illegible] آپ نیچے چل کر ملاحظہ فرمائیں ۔ جب صاحب نیچے گئے اور گائے کو دیکھا تو فرمایا "او کالا لوگ ہم کو بہت کھراب (خراب) کرتا ہے۔ [illegible] مانے بیار ہے ۔ یہ نہیں صاف کہتا کہ بیل کا میم ہے ۔"

حضرت لقمان نے باوجود عمرِ دراز کے کوئی مکان نہیں بنایا ۔ ایک جھونپڑی میں جان بحق تسلیم ہوئے ۔ ملک الموت نے پوچھا کہ باوجود [illegible] زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟ آپ نے جواب دیا کہ جس کی تاک میں آپ ایسے رہیں اس کو مکان بنانے کی کب [illegible] ۔ (ا ۔ ح ۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء)

حضرت اودھ پنچ صاحب! یہ سال عیسوی اگرچہ سنت بہت تر کہلاتا ہے مگر میں اس کو سنت بہت خشک کہتا ہوں ۔ کیونکہ [illegible] کہیں نام بھی نہیں ۔ بجز مشتی میں سامان تباہی ہے ۔ خوشۂ گندم درخت بے آبی سے صورت ریگ ماہی ہے ۔ جوار کا درخت دامن کو بیٹھے [illegible] کی طرح کترا ہے ۔ سبزہ سموم جانستان سے مسموم ہو کر نزع میں پڑا ہے ۔ دانۂ گندم کی موجودگی نے دادا جان کو بہشت سے نکالا [illegible] اس کی عدم موجودگی ان کی اولاد کو پھر وہاں پہنچا رہی ہے (۱۶ اکتوبر ۱۸۷۷ء)

ایک صاحب نے اپنے شائستہ و تعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ "حضرت ماشاء اللہ یہ کرنسی نوٹ ہے ۔ جہاں پہنچا [illegible]" ایک صاحب خوشامدی بیٹھے تھے بول اٹھے کہ "بجا ہے پیر و مرشد ۔ اگر کوئی دختر نیک اختر ہوتی تو چشم بد دور وہ بھی بل آف [illegible] ہوتی ۔" (ا ۔ ح ۔ ۸ جنوری ۱۸۷۸ء)

ذرا بتلانا تو سہی کہ انگریزی حجام زیر بار کیوں ہے اور ہندوستانی حجام فارغ البال کیوں ہے ؛ وہ بقول خود باربر اور [illegible] بال بر! (۵ جون ۱۸۷۷ء)

زبان نہ جاننے کی خرابی

ایک ہندوستانی نے شملہ میں آکر ایک موقع پر جہاں خانساماں نہ ملتا تھا کہہ دیا کہ میں خانساماں گری جانتا ہوں ۔ ایک صاحب بہادر [illegible] نے اس کو نوکر رکھ لیا اور دو دل ہی روز فرمایا کہ انڈے کا بیل کرلاؤ ۔ یہ بیچارہ کیا جانے کہ بیل انگریزی میں اُبالنے کو کہتے ہیں ۔ اس نے جانا

صاحب بہادر فرماتے ہیں اس کا بیل بنا لاؤ۔ اب یہ حیران ہوا۔ کبھی صاحب بہادر کے چہرے کو دیکھتا کہ کچھ پی تو نہیں گئے۔ اور کبھی اپنی طرف دیکھتا کہ میری سماعت میں تو فرق نہیں آگیا۔ بڑی دیر تک کھڑا ہوا سوچتا اور صاحب بہادر کو تکتا رہا۔ آخر کار تاچار ہو کر کہا کہ "صاحب! میں حضرت عیسیٰ نہیں ہوں جو انڈے کا بیل بنا دوں کسی اور کو بلا لیجیے۔ خانساماں گری تو میں جانتا ہوں مگر معجزہ کوئی اور جانتا ہوگا۔

بارہ بجے تھے چوکیدار حلوائی کی بھٹی میں سو رہا تھا۔ گلی کا کتا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک خوش وضع رنگین طبع شاعرہ نے اپنے شوہر سے میٹھی میٹھی باتیں اور دلربائی کی گھاتیں شروع کیں۔

میاں ہم نے ایک غزل کہی ہے مگر سر پٹک مارا مطلع نہیں موزوں ہوتا۔ لگے ہاتھوں ایک مطلع نہیں کہہ دیتے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

بہتے ہیں سدا آنکھوں سے یہاں خون کے دریا ـــ یہ کام تو ہرگز یم قلزم سے نہ ہوگا

اتفاق سے چور چپکے چپکے بیٹھا داؤں سے سن رہا تھا اور طرہ یہ کہ چور بھی شاعر اور حاضر جواب۔ فوراً ایک شاعر کے یہاں چوری کی۔ سوچتے دیر نہ ہوئی تھی کہ مطلع بافقہ باندھے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اب قیامت کا سامنا ہے۔ بولیں تو مشکیں کسی جائیں۔ چپ رہیں تو ذہن کند ہو جائے۔ آخر نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ یہ آوازۂ بلند بول ہی تو اٹھے کہ

کودا کوئی یوں گھر میں تیرے دھم سے نہ ہوگا ـــ جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

(رتن ناتھ سرشار۔ اودھ پنچ، ۵ مارچ ۱۸۷۸ء)

ایک مولوی صاحب کو خانہ ساز تمباکو میں شیرہ ڈالنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بنئے کے پاس گئے اور کہنے لگے "ابے شیرا ع ہے شیرا ع؟" عین اپنے مخرج سے کچھ اتنے غلیظ اور قبض کے ساتھ خارج ہوا کہ بنیا گھبرا گیا اور کہنے لگا "صاحب! اتنا گاڑھا شیرا تو نہیں ہے جس کا نام آپ کی شکل سے نکلے۔"

ایک شخص نے اپنے لڑکے سے پوچھا کہ تم مکتب میں کون سی کتاب پڑھتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا قرآن۔ پوچھا کون سی سورت؟ کہا لا اقسم بہذا البلد (یہ سورۃ کی ابتدائی آیت ہے) باپ نے کہا آگے پڑھو۔ صاحبزادے کو اور کچھ یاد نہ تھا۔ فرمانے لگے ووالدی بلا ولد۔ (اور میرا باپ چونکہ لاولد ہے) والد محترم جھلائے اور کہنے لگے۔ اپنی جان کی قسم ہے جس کے گھر میں تیرا سا بچہ پیدا ہوا۔ سے "لاولد" ہی کہنا چاہیے۔

پروفیسر: کیوں بھئی بیرا! صاحب خانہ تشریف رکھتے ہیں؟

بیرا: حضور وہ تو نہیں ہیں۔

پروفیسر: اور یہ کھڑکی سے جھلک کس کی دکھائی دی؟

بیرا: وہ نہیں ہیں ان کا سایہ ہے۔

پروفیسر: اوہو! میری عقل روز بروز کیسی ہوتی جا رہی ہے رسائے کو آدمی سمجھنے لگا۔

جج :- تو تم نے اپنے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی؟
ملزمہ :- مگر میرا ارادہ نہ تھا۔
جج :- یعنی تمہاری نیت حملہ کرنے کی نہ تھی؟
ملزمہ :- میری نیت کرسی توڑنے کی نہ تھی۔

ایک صاحب کو جنہیں شادی کی تلاش تھی اتفاق سے ایک بی بی صاحبہ مل گئیں۔ انہوں نے جھٹ پیام دے دیا۔ اب آپس میں شرائط کی بحث چھڑی —

بی بی :- سنئے صاحب! میں اپنے میکے والوں کے سامنے برابر ہوں گی، آپ کو حق منع کرنے کا نہ ہوگا۔
میاں :- منظور!
بی بی :- دیکھئے مجھے چوتی بھر افیون کھانے کی عادت ہے۔
میاں :- کچھ مضائقہ نہیں۔
بی بی :- سینا پرونا بالکل نہیں جانتی۔
میاں :- آپ ہی ننگی پھریئے گا۔
بی بی :- کھانا پکانے کی عادت نہیں۔ نگوڑا چولھے میں سر کون دے۔
میاں :- خیر تو فاقہ کرنے میں ایذا آپ ہی کو ہوگی۔
بی بی :- بھئی میرا مجاز (مزاج) بھی ذری جل ککڑا ہے۔
میاں :- بی ودلتی اپنے جیسے ہیں آپ ہی کھوتی۔
بی بی :- کسی کسی وقت جو خفقان ہوتا ہے تو سیر سپاٹے کو چلی جاتی ہوں۔
میاں :- خدا کا ملک وسیع ہے۔ آپ کی ٹانگ لنگڑی نہیں۔
بی بی :- شعر کہنے کی بھی لت ہے۔ رات کو اکثر مشاعرے میں شرکت کرتی ہوں۔
میاں :- عیب نہیں شعر گوئی تو ہنر ہے۔
بی بی :- ہاں سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جھوٹ بھی بولتی ہوں۔
میاں :- تو میرا سلام۔ یہ مصیبت برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

کسی بخیل سے بہادر کی تعریف پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ بہادر وہ ہے جو غیر کے منہ سے نوالہ چبانے کی آواز سنے اور نہ مرے۔

صاحب کا کتا مر گیا۔ خانساماں رونے لگا۔

صاحب: (دل) خانساماں تم ہمارا کتا کو بہت پیار کرتا تھا؟

خانساماں: حضور نہیں کچھ نہ پوچھئے۔ آنجہانی مسٹر ٹریبری ہمیشہ جھوٹی رکابیاں پیالے زبان سے چاٹ کے صاف کر دیتے تھے۔ میں دھونے دھلانے کی مصیبت سے بچ جاتا تھا۔ ہائے اللہ! اب کون برتن صاف کرے گا۔

اسکندریہ کے ایک باغ میں علی ابراہیم عطار صاحب کسی درخت کے نیچے پڑ کے سو رہے۔ بیچارے تھکے ہوئے تھے نیند کم بخت موت کی بہن ہے، ہوش نہ رہا۔ اتنے میں ایک چور آیا۔ اس نے ہونٹوں کی دراز سے طلائی دانتوں کی جھلک جو دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا آہستہ سے ہونٹ ہٹا کے بتیسی غائب کر دی۔ یہ لے وہ چل۔ لاحول ولا قوۃ۔ عطار صاحب کو جب ہوش آیا تو ٹھنڈی ناک کی پھنگی سے گلے ملنے بڑھی۔ یہ بھی موتیوں سے خالی تھے آہ! اور پوپلے منہ بڑھے پوپلے منہ گھر آئے۔

ایک بنیا عقل کا اندھا آنکھوں سے جو کس کچھ ڈنڈی ترازو کے ہیر پھیر میں ایسا آیا کہ کسی کنوئیں میں دھم دھمکا۔ اتفاق سے کوئی افیونی صاحب بھی پینک میں اونچ نیچ نہ دیکھ سکے لڑھکتا دھڑام۔ غڑپ سے اسی کنوئیں کے اندر۔ بنیا گھبرایا کہ ارے تو کون۔ انہوں نے کہا ابے تو کون۔ اس نے کہا میں بنیا۔ آپ نے کہا تو لاہمیں ذری سا گڑ تو دے دے۔ (۳۰ اپریل ۱۸۷۸ء)

ایک ..... اور بکرے دل سپاہی سے جج چل گئی۔ وہ جب تک ہیر تر سے اینٹ اکھاڑے میاں سپاہی نے اڑنگے پر لگا کے مارا تو چاروں شانے چت اور جھٹ چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب حضرت جو کھسیانے ہوئے تو کیا کہتے ہیں "اچھا اس وقت تو نہیں۔ آنے دو اپنی بدلی تو ہمی تمہاری نقل بنا کے گدھے پر سوار کردوں"

میاں سپاہی "جی ہولی پر کیا موقوف۔ اسی وقت ہماری ران کے نیچے گدھا موجود ہے" (۲۶ مارچ ۱۸۷۸ء)

مولوی صاحب شاگرد کو ڈانٹ رہے تھے کہ تجھے کل انشاء اللہ پڑھایا تھا کہ ہر بات میں اسے یاد رکھا کرو۔ پھر بھول گیا۔ بہت تیرے استاد کی ایسی تیسی۔ ایک کچہری کے منشی جی سن رہے تھے۔ سمجھے کہ انشاء اللہ شاید کوئی بہت ہی عمدہ انشا ہے۔ ہمیں بھی انشاء میں مہارت کم ہے۔ جھٹ مطبع نولکشور کانپور میں درخواستیں روانہ کردیں کہ ایک جلد انشاء اللہ کی جلد بھیجئے۔

لالہ جی کی ڈاڑھی میں سفید بال سر نکالنے لگے۔ ایک پرانے رفیق مدت کے بعد جو ملے تو کہا "بھائی تمہارے تو سفید بال ہو چلے۔" حضرت فرماتے ہیں "جی مضائقہ نہیں۔ دل تو ویسا ہی سیاہ ہے"

کسی شاعر کا طوطا مر گیا۔ اس نے تاریخ وفات کہی ؎

میاں مٹھو جو ذاکرِ حق تھے — رات دن ذکرِ حق رٹا کرتے

گربۂ موت نے جو آ دابا — کچھ نہ بولے سوائے "ٹے ٹے ٹے"

بتیہ ی = تین بار = ۱۲۳۰ھ

صلحنامہ

روس ـ "سنا کانفرنس مین کہدینا کہ مین سب طرح راضی ہون ـ اور بہت خوش ہون نہین تو پھر تیرے اور تم ہو"

"منقول از فن"

پولیٹکل شطرنج

(شرح کیفیت تو الگ صفحہ پر دی گئی ہر یہاں پر صرف اسقدر بتادینا کافی ہر کہ سیاہ بازی روسیہ کی اور سفید بازی انگلنڈ کی ہے۔ اور چال روس کی ہر)

کہل کے گل کچہ تو بہار اپنی صبا دکہلا گئے   حسرت ان غنچون پہ ہی جو بن کہلے مرجہا گئے

خان بہادر نظیر حسن خاں صاحب کلیمؔ نواب آغن صاحب، مرزا عباس علی خاں صاحب سکریٹری، حکیم محمد رضا خاں بہادر، شیخ علی عباس صاحب وکیل جانتے ہوں گے کہ متعلقین بیگم سی یعنی گھر کے لوگوں، یعنی لڑکیوں کی والدہ یعنی اے بی یعنی بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو جی یعنی زوجہ عظمہ الطان پانچ یا دو آنچل وو [illegible] علی [illegible] شہر بن الی یوم الوفات بل بعد الممات کو کہتے ہیں تو ان ذات شریف کے اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ جس طرح تھیٹر، سرکس، گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے اسی طرح یہاں لڑکیاں نکلیں گی اور یہ بھی دور نہ سمجھئے کہ جب سارا گھر لیس شریک ہوتا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا۔ خواصیں، پیش خدمتیں، شیرخوار بچہ جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا اور دانہ ابھر نسیا [illegible] کی وجہ سے چڑچڑا ہوگا۔ پھر اس کا گہوارہ، پالنا، جھنجھنا، چسنی، انا، چھوچھو مع بڑا دیرصاحبی ان کے علاوہ بکری کا بچہ جو خرگوش، او جینی جو ہے طوطے کا پنجرہ جو ریز کم کرتا ہے اور خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ لپٹنے والے کی بولیاں یاد کرے، بادرچی خانے کا نمکلا، انا کے صاحبزادے نطفہ نا تحقیق کا پالا ہوا اللہ بنی کتے کا پلا، چھوٹی صاحبزادی کا گھری کا بچہ، بالی کریہ خانم متاؤ جیسی کبوتر دن کی، ایک مرغی کا لانا پڑ بٹیروں کے کٹھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان یعنی سب کچھ دان آفتابہ، آئینہ، اگالدان، طشت، تسلہ، [illegible] ڈھولک، پایان نمبرے، بچھونے، کاڈ نکیے، بچے کے پوتڑے، نہالچے، لحاف، توشک، سلامتی سے سب کچھ ہوا چاہیں، پس معلوم ہونا چاہیے اس کا کیا سامان کیا گیا ہے اور یہاں بڑی بات تو رہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون دے گا۔ بی صاحبہ خدا نخواستہ کیوں دینے لگیں۔ کیا وجہ یہ نہایت بدشگونی ہوگی۔ دوسرے اگر یہ جرمانہ دینا پڑا تو متعلقین کیا معنی متعلقین کے متعلقین یعنی شوہران اور برخوردار بھی گھر سے باہر نہ نکلنے پائیں گے۔ پھر اگر مع اعزا و اقربا و احباب و متعلقین کے بلانا چاہتے ہیں تو پہلے جلسے کی جانب سے سواریوں کا بندوبست ہونا چاہیے تو بہتر اللہ نے چاہا تو تل دھرنے کی جگہ نہ ملے گی۔ اینٹی بھائی تقوا اہل دکن اپنا اپنا کھٹولا لیے موجود جلسہ ہوں گے۔ طاعون والے جلسہ میں تو دکانیں بند تھیں اس دفعہ چولھے تک گھروں میں نہ گرم ہوں تو کیا سند مگر جائے استاد خالی۔ ایک بات شہر صاحبان بھول گئے یعنی متعلقین کو تو طلب کیا مگر رنڈیوں، خانگیوں کا ابھی تذکرہ نہ کیا جو آپ کیا معنی ساری دنیا کے تعلقین ہونے کا پشتہ اٹھائے ہوئے ہیں اور معاملہ فہمی کا یہ حال ہے کہ بی چمدان بی چو دھرائن وغیرہ وغیرہ کا تجربہ ذاتی تو غالباً اینٹی بادوں کو کیا بڑے بڑوں تک کو ہوگا پس ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا یعنی جو بلوائیں اور ضرور بلوائیں۔ اس کے کیا معنی کہ جہاں بگھیاں پالکیاں ڈولیاں ہوں وہاں جو پہلے نہ ہوں۔ واللہ اینٹی وینٹی، تو چار دن کی بات ہے۔ سابقہ تو انہی سے پڑتا ہے۔ اگر اس تقریب میں انھیں نہ پوچھا تو بہنوں سے برادری ترک ہو جائے گی اور شادی بیاہ ہو یا ناچ گانوں کے جلسوں میں کوئی رنڈی منڈی ایک نہ آئے گی اور سفر والیوں کو جو شکایت ہوگی وہ تک پر جرات سمجھ لیں۔ ان کی پیشوازی گورنمنٹ بھی اندرونی قوت رکھتی ہے ان کا سکہ دلوں پر چلتا ہے، ان کے طبلے کی گمک، ماتک، متی، توپ، سارنگی، ہنری، ٹٹی، مجیرے، گزم گن سے زیادہ توڑ رکھتے ہیں اور بی صاحبہ تو پوری ڈائنامیٹ، تارپیڈو ہی ہیں۔ ان کے توڑ کا کیا پوچھنا بلکہ سچ پوچھو تو یہ لوگ سرنگ ہیں جن سے اکثر خاندان کے خاندان اڑ گئے۔ پس ان کی زد سے ضرور بچنا چاہیے۔

ساتھ میں لے کے اپنے یاروں کو

مینڈکی بھی چلی مداروں کو

منشی سجاد حسین

کُھلے خط و سربستہ مضامین

منشی سید محمد سجاد حسین مرحوم (ایڈیٹر اودھ پنچ)

(۱)

نام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن صاحب طولعمرہٗ !

دعا ہے شیر نصیب شاد باد۔ ایسے زمانے میں جبکہ چاروں طرف سے ہوا ہے شر و فساد، ہر ملک سے قوم لعنت و فساد کے جھونکے آ رہے ہیں تمہارے حق میں اس سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی اور دعا ہو گی۔

تم غالباً واقف ہو گے اور اگر نہیں تو اب کان کھول کر سن لو کہ یہ تمہارا بوڑھا، خیر اندیش، تجربہ کار، زمانہ دیدہ، فلسفی، حکیم، مورخ، پولیٹیشن اور خدا جانے کیا کیا دوست، ایسا تاریک خیال اور نامنصف نہیں کہ محض ضد، ہٹ دھرمی، استبداد سے کسی معاملے میں ایک طرفہ رائے قائم کرے اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف سے عمداً اور ارادۃً اپنی دوربین اور باریک بین آنکھیں بالکل بند کر لے۔ آج کل ہزاروں دوست ہیں تو لاکھوں تمہارے دشمن۔ بس اچھا کہتے ہیں تو نہیں برا بھی مگر یہ سب ہوا کے رخ اپنا جہاز راے چلاتے، انصاف کا انجن ہرگز کام میں نہیں لاتے لیکن یہ تمہارا اور اپنی ملکہ معظمہ کا سچا، بے میل، پکا، سولہ آنے ڈبل، دوست، خیر خواہ، جاں نثار، اودھ پنچ ان عیوب سے ایسا دور ہے جیسا روس، ایران یا ہندوستان کی نمک حرامی سے۔ یہ مصلحت وقت، دوستی انجام کار سب باتوں پر غور کرتا اور تمہاری ذمہ داریوں، فرائض منصبی، مشکلات عہدہ کو خوب جانتا بوجھتا ہے۔ بیشک تم کو چند آدمیوں نے بنا لیا ہے مگر واضح رہے دو صورتوں میں بنایا جاتا ہے۔

اوّل جب واقعی اس میں صفت بنائے جانے کی پائی جاتی ہو اور کھلی بازل اپنے ڈھب کا اسے پاتے ہوں۔

دوسرے اگرچہ وہ فی الحقیقت اس قابل نہ ہو مگر اتفاقاً کچھ حرکات سکنات یا معاملات کی ظاہری صورت ایسی ہو جائے کہ لوگوں کو غلط فہمی واقع ہو۔

بہر نوع دل لگی بازوں، دور سے تماشا دیکھنے والوں کا الو کہیں نہیں گیا۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اور میں تمہارے

اعمال ماضی و حال پر انصافانہ غور کرتا ہوں کہہ سکتا ہوں کہ تم بیچارے درحقیقت ایسے ہرگز نہیں جیسا کہ آج کل لوگ خیال کرتے ہیں۔

مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ تم بن گئے اور خوب بن گئے۔ بخت و اتفاق کو کوئی ٹڈّر بلی روک سکتا ہے گو یہ اہتمام مگر اب تو بدنامی کا ٹوکرا تمہارے ہی سر ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ اس کے مستحق بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ رفاہ و فلاح، آرائش و زیبائش، ظاہری ٹیم ٹام، اور پری لیس پوت کے واسطے تمہاری ذات مخصوص ہے مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی جورو سے۔ تم پولیٹیکل دسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا، تیار ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالحہ کیونکر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے گلاوٹ آتی ہے، پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں، فارن پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیونکر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مار ڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو مگر اب یہ ضرورت بیشک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور رکابدار سب تیار کرے۔ پھر دسترخوان لگانے اور خاصہ چننے کو تم بلا لیے جاؤ تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام تمہارے سپرد ہوں۔ یہ خدمت کچھ کنسرویٹو ہی خوب جانتے ہیں لیکن سر دست کچھ کہتے دھرتے نہیں بنتا۔ اس دفعہ کی الٹ پھیر میں تمہارا تو وہی حال ہوا ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کھانا تیار، نہ سامان درست مگر دعوت (جنگ) کی وہ دھوم دھام کہ عالم گونج رہا ہے۔ (ناخواندہ) مہمان ہیں کہ چلے آتے ہیں بلکہ ایک آدھ تو آستینیں ہاتھ دھوئے قرار واقعی ہنچھے مارنے پر مستعد ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو تمہارا قصور نہیں۔ جن لوگوں نے اس دفعہ تم کو بلایا اور وہ نہ سمجھے کہ کھانا تو اس دفعہ رکابدار نے ہنوز تیار نہیں کیا۔ ہم ان کو باورچی خانے سے کیوں نکالے دیتے ہیں۔ اب عین وقت پر کون ہتھیلی پر سرسوں جمانے آتا ہے۔

اشارہ کنایہ برطرف صاف صاف یہ ہے کہ آجکل تمہارے واسطے بڑے بڑے افکار آموجود ہیں گو خزانہ و فوج و قوم ہر طرف سے اطمینان ہے مگر سمجھ تو شیطان مارتا نہیں پریشان تو ضرور کرتا ہے۔ خیر اس کی نوبت خدا نہ لائے۔ فی الحال اہل الرائیوں نے تم کو اور بھی بوکھلا رکھا ہے جو ہے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی اٹھاتا ہے مگر صلاح کی صلاحیت ایک میں نہیں۔ سب اپنے دل کی آرزو پیش کرتے ہیں اور تم جانو صلاح و آرزو میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لحاظ سے میں اپنے دست و قلم کو تکلیف دیتا اور تمہاری دماغ خراشی کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو فارن معاملات آج کل کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ مصر اور وسط ایشیا کے معاملات تو

سمجھو۔ دو بڑے ستون ہیں جو جمعہ مسجد کی طرح دوری سے سربلند کیسے کھڑے ہیں۔ باقی ٹرکی کا تذبذب، فوج کی حفاظت
میں امیر کی تحاشی، برہما میں کشیدگی، مغربی افریقہ میں جرمن کی بیہودگی، یہ سب امور اگرچہ فرداً فرداً خفیف ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی
اطمینانِ خاطر کے دشمن جانی ہیں۔ بُرا نہ لگے تو میں صاف کہوں کہ اکثر یہ دقتیں تمھاری قوم کے غلط قیاسات اور
تفرضات سے پیدا ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی۔ چنانچہ مصر کا
معاملہ لیجیے تم بغاوت کو قومی نہیں شخصی سمجھے مگر دیکھا۔ ایک عربی گیا مہدی سوڈانی (یا سوڈانی) آیا۔ اس کو زیر کرو دیکھو
کل ہی عثمان دغنا موجود ہے۔ عثمان کو بھگا دیا گرفتار کرو دوسرے کوئی ان کے بھائی بند بلائے بوغا پیدا۔ پھر آج تک
خیال کرو کتنی فتحیں پائیں، کتنی شکستیں دیں۔ باغیوں کو کیسے کیسے کنوئیں جھکائے لیکن بارہ برس بعد کتنے کی دُم وہی
ٹیڑھی۔ جب دیکھا مصر کا قوام وہی بگڑا ہوا۔ کوئی بادشاہ ہو، صاحب تخت و تاج ہو اس کو زیر کیا، تخت و تاج
لے لیا، دارالسلطنت پر قبضہ کیا۔ یہاں سب ایک سرے سے لنگوٹی بند، خانہ بدوش۔ ادھر سے بھاگے
اُدھر ہوئے، اُدھر سے آئے ادھر ہو رہے۔ بھلا ایسوں سے اُلجھنا اپنی بات کھونا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر
کسی حصۂ ملک کو ان کے حوالے کر بھی دیا تب بھی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ کیا وجہ کہ مہدی ملک مانگتا ہے نہ سلطنت
اس کو تو تجدید اسلام کا خبط ہے۔ ادھر اطمینان ہوا کہ لگے اور ٹرکی پر لپکا۔

وسط ایشیا میں تمھاری کارروائی چنداں قابل اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اچھا
یا بُرا کیا کہا جاوے۔ باقی اس کاہلی سے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ بلا شبہ تم کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اس کی وہی مثل "کچھ
نہ کرنا بھی بُرائی کرنا ہے"۔ جہاں تک تمھارا بس رہا ہاتھ پاؤں نہ ہلائے مگر اب تو روس منحوس کے سر جا کر شیطان
چڑھا۔ اب تو وہ خواہ مخواہ افغانیوں کو پچھاڑتا ہے۔

چونکہ یہ مضمون طویل ہے اور میں سمجھتا ہوں تم کو بھی آج کل کام کی کثرت ہے میں اس خط کو ناتمام چھوڑتا
ہوں۔ اس بحث کو دوسرے خط میں لکھ کر ان سب کے علاج بتاؤں گا۔ تم گھبرانا نہیں۔ دیکھو اوسان نہ جانے
پائیں۔ گرینول ایسے وقت میں کام کا آدمی ہے۔ ڈفرن کی مستعدی قابل صاد۔ زیادہ عمرت دراز باد۔

(۲)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن صاحب طول عمرہٗ!

دعائے ہمت و جراٗت۔ میں اپنے پہلے خط میں وعدہ کر چکا تھا کہ دوسرے ہفتے اپنے خیالات روشن
سے تم کو مستفیض کروں گا۔ تم سمجھو کہ پولٹیکل معاملات پر منحصر نہیں عموماً ہر کام میں ایفائے وعدہ و راستی تقریر
تحریر فی زمانہ جوہر انسانی تصور کی جاتی ہے لہٰذا زیادہ زحمت کش انتظار نہیں رکھتا اور مخاطب کرتا ہوں:
میں نے اپنا سلسلۂ سخن اوس دفعہ وسط ایشیا تک پہنچ کر چھوڑا تھا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس نے بہتوں کے

جی بھر اٹھے ہیں۔ اس سے تم اپنی طرف کوئی اشارہ نہ سمجھنا۔ میرا دستور ہے کہ ہر کس و ناکس سے چھیڑنے کی دل لگی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے ہی دل میں خجل ہو جاتا ہے اور مجھے سر دست شخصی، قومی، ملکی سب مصلحتوں سے تم کو بددل کرنا منظور نہیں۔ کیا وجہ ایک تم ہو کہ صورتاً سیرتاً بچھیا کے باوا بنتے۔ اس پر آج کل کی چکر گھنیوں نے اونچ کو لمبو کا بیل بنا دیا ہے۔ برداشتہ خاطر تو ہو ہی رہے ہو۔ اگر ووٹ آف کریڈٹ کی لڑائی تو یقینی تو ہوتے ہنسی خوشی رخصت ہو۔ ہوا اگر ٹاؤن کونسل میں تیشے سے نجاری کرنا شروع کر دو گے۔ دل لگی بازوں کا کیا بگڑے گا۔ یہاں کا سلطنت میں خلل کا اندیشہ ہے اور سب سے بڑھ کر تو یہ سمجھ لو کہ آج تم نے استعفا داخل کیا اور کل روسی ہرات پر قابض ہو۔ وہ لوگ بڑے قابو پرست اور بیباک موقع شناس ہیں۔ تم وقت گزر جانے کے بعد لنڈی کی طرف چوٹی ڈھونڈتے ہو۔ وہ قدم آگے سے اس کی پیشانی والے چار بال اس پھرتی اور چالاکی اور استواری سے پکڑتے ہیں جیسے ہمارے مسٹر ٹیپو کا ڈوریا اپنی نازک بدن زوجہ محبوبہ کے تھرمٹے، جب وہ شخص از راہ غمزہ و عشوہ کسی دن اس کے لئے کھانا نہیں پکاتی۔

اچھا اب مصر سے چلو۔ واقعی اگر تم میں کچھ انصاف و شرم و کانشنس ہے تو تمہارا دل ہی جانتا ہوگا کہ اس نرسی پھنسی نے کیسا دل باندھا ہے اور زمانۂ تہذیب میں کیا کیا سفاکیاں کرائی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض وقت چھوٹی جسامت کی وجہ سے تو بہت خفیف سی ہوتی ہے مگر موضع اور موقع کی بدولت بڑے بڑے کاربنکل اور پھوڑوں سے گوئے سبقت لے جاتی ہے۔ مصر بجائے خود کچھ نہ سہی اس کی سو ز راعتیں یا در لعینی سلطان کچھ تو اپنے لمبوں اور کچھ اپنے دغاباز دوستوں کی بدولت چنداں قابلِ خوف و خطر نہیں مگر یہ بھی معلوم رہے کہ تمہاری یورپین طاقتیں سب مصر کے معاملات میں حصہ بخرہ لگانے کو موجود ہیں۔ وہاں یورپ کی ناک پر بیٹھ کر تم چاہو کہ کوئی اُٹھا بائیں کی سی کارروائی بے غل و غش کر جاؤ یہ محال ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم کو اپنے زمانۂ طفولیت کا واقعہ یاد ہے کہ ایک دفعہ ہمارے دوستوں میں کنکوا لڑایا تم جانو یہاں کنکوا اڑتا ہے۔ کٹے کنکوے جھپٹانے یونہی ہاتھ کی صفائی دکھانے کو بازاری لونڈے لاٹھی بھی اور کانٹے دار جھاڑ اور ڈھیلچی کنکیاں بڑھاتے رہا کرتے ہیں۔ ایک صاحب اس بلا کے جلد باز اور عجلت پسند تھے کہ جب تک دوسری طرف جھپٹ کے آپ انہیں کنکیوں سے الجھ جائیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے۔ اچھے اچھے سُدھ کنکووں کو نفیس مانجھا سب اسی میں صرف ہو گیا ہے اور جب اُدھر کا سر پر تڑتڑایا تو حضرت ہاتھ لگانے کی جگہ ہاتھ ملتے تھے۔ پس مصر کی کارروائی بہت کچھ اس سے مشابہ ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ یہ ساری گل افشانیاں تمہاری ہی جودتِ طبع کا نتیجہ نہیں۔ یہ قضیہ بھی گذشتہ وزارت نے ترکہ چھوڑا ہے اور تم بیچارے کے سر پڑا لیکن یہ بھی تو سمجھ لو آخر قوم نے ایسی ہی ایسی خرابیوں کی درستی کے واسطے تو تم کو قلمدانِ وزارت دلوایا اور تم نے قبول کیا۔

علاوہ اس کے بہت سی بے عنوانیاں تو خاص تمہارے ہی صدقے میں واقع ہوئیں۔ بھلا جنرل گارڈن کو بھیج کر تم خاموش ہو رہے۔ پھر اس بیچارے کی خبر بھی نہ لی۔ آخر مروا ڈالا۔ اس سے تمہاری کتنی بدنامی ہوئی۔ اب بھی

دیکھ کر تو سر ہٹلر مسٹن وسطالینؔ یا ہی بھلا رہے ہیں۔ دیکھیے جتنا تمہارا فرقہ گشت وخون سے متنفر تھا اسی قدر اب باعث ہوا ہے۔

خیر یہ تو داستانِ پارینہ ہے۔ اب مطلب کی یہ بات ہے کہ کرنا کیا چاہیے۔ خداوند کریم تم کو عقل اور ناصحانِ مشفق کی بات پر توجہ دے تو سب کچھ درست ہو جائے۔

اس امر کا تصفیہ کہ آیا مقصد مہم مصر حاصل ہوا کہ نہیں تو میرے نزدیک کوئی نہیں ایسا تھا۔ ابھی جب کوئی مقصد ہو تب تو دیکھا جائے۔ وہاں سر سے سے تنزلزل اور مبہم کارروائی تھی۔ مقاصد بھی اسی طرح پردے میں رہتے ہیں اب انتظار ہی کس بات کا کرنا لازم آتا ہے۔ اب تم اپنی فوج ٹھکانے ٹھکانے پہنچاؤ۔ ٹرکی کو اول تو اس لائق نہ رکھا۔ دوسرے اگر کسی حکمتِ عملی سے یا ہو گے کہ اس کی فوج وہاں بھجوا دو کہ وہ بھی حیران پریشان ہوتی پھرے تو یہ سمجھ لو کہ تم وہی غلطی پھر کرو گے جو اس فتنۂ عظیم کی بنا ہے۔

شاید تم اپنی کج الفہمی سے اس بلیغ جملے کو فوراً نہ سمجھو گے مگر مجھے سردست صراحت منظور نہیں۔ مناسب ہوا تو پھر کبھی بتا دوں گا۔

اب رہی کوئی اور یورپین طاقت خانہ خود مطلبی خراب، اب تو برابر والوں کے ساتھ یہ حال ہے۔

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے

اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ہاں ایک اٹلی ہے سو میرے نزدیک چہ خفتہ چہ بیدار۔ عقلا کے نزدیک کچھ نہ سہی مگر حال میں فرانس نے تم کو زک فاش دی۔ فرانسیسی اخبار بند کروا کر مصر سے معذرت کرانا آدابِ شہنشاہی کے خلاف تھا مگر تم سے ہم کو اول روز وزارت سے ایسی ہی امیدیں تھیں۔ وزارتِ سابق پر تم امریکہ والوں سے کہا ہے۔ جنیوا میں چند چلتے پرزے جمع ہوئے اور تمہاری سلطنت کو الاباما کا تاوان دینا پڑا۔

وزارت حال پر آنے سے کچھ روز پہلے تم نے سلطنت آسٹریا کو سخت سست کہا تھا۔ منسٹری نصیب ہونے پر تمہاری پہلی حرکت، کا تاوان دینا پڑا۔

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

پس تم نے تو بار پاشا سے معذرت کرائی تو کون نئی بات کی۔ جس نے اپنی ٹوپی اتار لی اس کو اور کا کیا خیال۔

لیکن حال کی پیچیدگیوں کو دیکھتے تم نے کمال حلم اور بردباری کی۔ اس پر میرا صاد ہے۔ میں اس کارروائی کا مخالف نہیں۔ واقعی ایسا ہی چاہیے تھا۔ کاش خدا تمہاری ایسی ہی موقع شناس عقل رکھے۔ جس دُھن اور ڈھرے پر ہو اسی پر قائم رہو

---

(۴)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن طول عمرہٗ!

آج کل زمانہ ایسی جلد جلد کروٹیں بدل رہا ہے اور تم بھی اس کے ساتھ وہ قلابازیاں کھا رہے ہو کہ معلوم نہیں انگریزی کے پہنچنے پہنچتے چمن دہر میں کون کون جدید گل کھلیں اور کون انوکھے شگوفے سربلند کریں۔ اسی بہت سے میری دو دو باتیں تم چٹ پٹ او رسن لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ باقی اتفاقات کا چکر تو کسی کے روکے رک نہیں سکتا جو جس کام کے واسطے بنا ہے جب مہلت موقع پائے گا اپنی علت غائی پوری کرے گا۔

تم سمجھو۔ مہدی، عثمان دقیما، زار روس اور اس کے ارکان سلطنت، ازبیل جرنیل، علی خانوف، کروف اور بے وقوف جن کی بے ایمانی پر ذوف، آخر عالم اسباب میں جھگڑے فساد، قتل و غارت ہی کے واسطے آئے ہیں کہ میری آپ کی طرح علوم، فنون، حکمت، فلسفہ، تہذیب، ترقی کے واسطے جان کھپانے، کوشش کرنے۔ یہ مانا کہ تم نے وہ گذرے معاملہ مختصر کیا مگر حرامزادے کی رسی دراز، سردست یہ سلسلہ ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ پس جو بات کرو ماننے کے موقع ہیں۔ نے پہلے خط میں سب تفصیل لکھ دی ہے کہ اگر تم مصر کے جھگڑے کو یوں چھوڑ بھاگے تو بڑی خطا کی۔ جن کا بھروسہ تھا میں نے ان کی قلعی بھی کھول دی۔ پس اب سوا اس کے کوئی صورت ہی نہیں باقی کہ مصر میں اگر تیسو پالیسی یعنی فوجی حکمت عملی بالکل ترک کی جائے۔ مہدی و عثمان دقیما وغیرہ کی عداوت سینہ بہ کینہ سے آزاد ہو۔ اب جس قدر قبض و تصرف میں ہے اس پر ایک دفعہ آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دی جاوے اور اسی طرح اس کی محافظت کی جاوے جیسے رنڈی اپنی ساری پھول پیٹ کے نیچے چھپائے رہتی ہے۔ اگر حملہ کرو تو روفائی، مقابلہ کرو تو حفاظتی۔ ساری فوج بلا لینا اور ملک کو اس سے تنزیہ کر کے چھوڑ دینا یہ کس خدا نے بتایا اور کس ایمان نے سکھایا ہے۔ اب لازم ہے سب افواج دو مقام مناسب محفوظ پر جمع رکھو کہ مصر والوں کے کام بھی لا سکو اور سرحد ہندوستان کے جھگڑے میں بھی بلا سکو۔

اب رہا روس کا جھگڑا، اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی کے ساتھ حسن عقیدت ہوا کرتا ہے کسی کو اپنے کسی دوست سے ایسی امید ہوتی ہے کہ سراسر خلاف ترصد حرکات دیکھتا جاتا ہے مگر عقیدت نہیں جاتی۔ کوئی بزرگوار اپنی زوجۂ مقدس کی جانب سے وہ حسن ظن (زن نہیں) رکھتے ہیں کہ آیت حدیث غلط ؎

حکم جورو جی برا ز حکم خداست

آنچہ جورو جی بفرماید رواست

کسی کو کسی حکیم طبیب ڈاکٹر پر وہ اعتقاد ہوتا ہے کہ صریح حضرت قلم کا رتیغ و سناں کر رہے۔ خدا گنج کی نو آبادی کو ہر روز ہزاروں کا چالان بھیج رہے ہیں مگر یہاں مسیحائے دوراں حضرت ہی ہیں۔ کسی کو کسی وکیل صاحب پر اطمینان ہے

کہ معاملہ فہمی سے اس قدر دور جیسے اگلی بینائی سے مگر یہاں سارے عالم کا قانون انہی کی نوک زبان پر ہے۔ بعض کو کسی شاعر پر عقیدہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا مہمل گوئی پر ملامت کناں ہے مگر آپ کو وہی کلام مرغوب و مطبوع ہیں اسی طرح سمجھ لو تم کو بھی روس کے ساتھ حسنِ عقیدت ہے۔ تمہارا دل و دماغ اتنا وسیع ہی نہیں کہ روس کی چالاکیوں اور فریب کے دفتر کا ایک حرف بھی اس میں سما سکے۔ تم بیچارے اس کے فتنہ و فساد کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ تم میں فریب دہی کا وہ جوش ہے کہ تم جان نہیں سکتے۔ آلِ سلطنت، صولت و شوکتِ شہنشاہی، شکوہ و شان قیصری کیا ہے۔ پھر اس کی کج بینی کا اندازہ تم کو کیا خاک پتھر مل سکتا ہے۔

الغرض اس حسنِ عقیدت نے تم کو کنگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ علاوہ اس کے دو حماقتیں تمہاری قوم سے ایسی ہوئی ہیں کہ مدت تک ان کا اثر بد تم کو سہنا پڑے گا۔ اول تو مختلف تعصبات مذہبی، تابہ پرستی، تنگ نظری کی بدولت تمہاری دونوں پارٹیوں نے سلطنتِ ٹرکی کو ایسا ضعیف اور نحیف کر دیا کہ روس کے ساتھ کلہ بکلہ لڑنے والا کوئی نہیں رہا۔ یونان کی بادشاہت نئے سرے سے قائم ہو گئی۔ کرسٹم میں اسلامی سلطنت مخل انداز تھی وہ فوت ہیں کم ہوئی۔ مگر پھر بھی سمجھ لو تم نے ایک دوست کے ساتھ گھاٹ کے وقت پر کنائی کاٹی۔ سلطنت و شاہی کے خلاف کیا۔ یہ تمہاری کوتاہ فہمی ہے کہ دنیا کی بادشاہت کو مذہبی سلطنت سمجھتے ہو۔ اگر مذہب کو بادشاہت میں ایسا دخل ہوتا تو سارے پیغمبر اور اولیا، رشی اور منی بادشاہت ہی کرتے۔ تم نے ایک طرف مذہبی تعصبات پر قہقہہ اڑایا اور دوسری طرف مذہبی عناد و عداوت کو ہادی بنایا۔ حال کی جنگ روم و روس میں اگرچہ کنسرویٹو پارٹی برسرِ حکومت تھی اور جو امر فروگذاشت ہوا اس کا عذاب ثواب اس کی گردن پر۔ مگر انصافاً کہو کہ تم اس پالیسی میں کیسے شریکِ غالب رہے۔ جھوٹ یا سچ جو کچھ وہ کرنے والے تھے تم نے ہفتہ ہفتہ بھر میں دو دو لمبے چوڑے رسالے شائع کر کے ان کو باز رکھا۔ بلگیریا کے مظالم رنگنے کو تو آپ کا قلم خونیں رقم رواں دواں تھا مگر اب فرمائیے بارہ سو افغان سرحد پر کٹ گیا۔ آپ کی کمیشن کی توہین ہوئی۔ اس کے ساتھ کے لوگ بے رحمی فصل سے کھیت رہے۔ جاڑے پالے کے مارے ٹھنڈے ٹھنڈے ملکِ عدم کا راستہ ناپنے لگے۔ مصر اور سوڈان اور خرطوم میں انسانوں کی قربانی کرا ڈالی۔ اس پر جودتِ طبع صرف نہیں ہوتی ؎

بس گرسنہ خفت و کس ندانست کہ کیست
بس جان بہ لب آمد کہ برو کس نگریست

المختصر روس کو غلبہ نصیب ہوا۔ پھر اس کا نتیجہ کھلا ہی رکھا ہے کہ وسط ایشیا میں کارروائی کرنے کو اب سلطان کو اپنی طرف ملا ڈالو کیا اور مُجدار کھو تو کیا۔ اب تو روس ذرا ذرا سی بات پہ ان کو دھمکا کہ اپنی طرف سازش پہ مجبور کر سکتا ہے۔ بہت رعایت کی نیوٹرل رہنے دیا۔ اس حماقت کا خمیازہ تمہاری حیات میں کیا بعد ممات تک انگلستان کو بھگتنا پڑے گا۔ تمہاری قوم جس قدر ٹرکی سے مغایرت کرتی جائے گی اسی قدر غرور لایعنی اور تبختر فضول کے ثمرے اٹھائے گی۔

دوسری خطا یہ ہوئی کہ جب معلوم تھا کہ افغانستان پر ہم قبضہ نہیں رکھ سکتے۔ اس میں آمدنی نہ منافع
قوم پرورش پاسکتی ہے نہ تجارت چل سکتی ہے تو پھر شیر علی خان سے لڑنا اور کابل قندھار فتح کرنا محض
فضول تھا۔ اس میں اتنی بات ہوئی کہ تم شریک نہ تھے۔ لیکن اوّل منزل پہنچانے کی خدمت تمہارے
سر تو تھی۔ اس پر تم نے اپنی حماقت صرف کی یعنی ساری کارروائی کالعدم کردی حالانکہ قندھار پر قبضہ رکھنا
لازم تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب روس نے قدم بڑھایا اور تمہارے کمیشن کی سخت توہین کی۔ میں اس
جگہ اس سے بحث نہ کروں گا کہ تم سے اس بارے میں کیا عقلمندیاں ہوئیں مگر اس قدر ضرور کہوں گا کہ جو چال
تم چلے وہ بری چلے۔ اگر کوئی اپنی سوچ سے بھی تو انجام بخوش اسلوبی نہ ہو سکا کمیشن سرحدی کی تجویز ایسی معقول
تھی کہ یا بدو شاید بگڑ و بی دم کی کسر رہ گئی جس کا اعادہ فضول ہے۔

اب بعد قبضہ پنج دہ و مرد چیک و ہرانی بصرہ جو ثالثی کا معاملہ ٹھہرا ہے۔ اس کی نسبت بھی کچھ نہ کہوں گا
جو ہونا تھا ہو گیا۔ تم نے میرے اشارات پر عمل نہ کیا۔ تمہاری قوم اور تمہارا خدا اپنے سمجھ لے گا۔ اب واقعی
انگریزی عظمت و حشمت کی نظریں کم کرا دی۔ سر پیٹر لمسڈن سا افسر کمیشن روس کے چالاک اور چلتے پرزے
کروف علی خانوف کے مقابلے میں دوسرا خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اب سے

قرن ہا باید کہ تا یک لمسڈن از لطف طبع
صاحب غیرت شود یا زیرک ڈپلومیٹ

سر معنی صاحب نہیں بلکہ یہی سر جو آج کل مصر کے محروطی میناروں اور وسط ایشیا کے لق و دق بیابانوں میں ہم اب
ٹکرا رہے ہیں اور پیٹر معنی بیٹھنے والا (آر علامت فاعل) لمس معنی چھونا، ڈن یا ڈان آداز توپ و بندوق۔ پس
مطلب یہ کہ ایسا سر بیٹھنے والا کہ لمس کرنے سے ڈن سے چھوٹ جاتا ہے۔ آدمی کاہے کو چاندی کی بارود ہے
خشکی کا تار پیڑو ہے مگر افسوس تمہاری کاہلی سے روس نے اس کو محض آتشبازی بنایا کمیشن سمیت بے چارہ
جھنک کر رہ گیا اور اب اگر چھوٹا بھی تو کمیشن سے مستعفی ہو کر، بم کے گولے کی طرح سیدھا اپنے گھر کی طرف
راہی ہوا۔ اب اس سگھڑ بھلائی کو تہہ کر رکھیے اور سارے کمیشن کو بلا لیجیے۔ لندن ہو یا ڈنمارک بطور خود کارروائی
کیجیے۔ اس کے بعد جب قضیہ زمین بر سر زمین فیصل کرنے کی نوبت آئے تو اپنا کمیشن سینٹ پیٹرس برگ سے
بہیئت کمیشن روس بھیجیے کیونکہ پولٹیکل معاملات ایک طرف یوں بھی دو شخص جب کسی جگہ اس طرح ملنے کا
بندوبست کرتے ہیں کہ ایک طرف سے ایک دوسری طرف سے دوسرا چل کر مقام پر پہنچے تو وقت سے
خالی نہیں ہوتا۔

اب رہی شاہ ڈنمارک کی ثالثی۔ یہ سچ ہے کہ ثالث صاحب کی ایک بیٹی زار روس کو ایک پرنس
آف ویلس کو بیاہی ہیں۔ دونوں سلطنتوں سے قرابت قریبہ ہے مگر تم اس قدر ضرور سمجھ لو کہ گو وہ بادشاہ اعزاز
میں قدیم ہے مگر بادشاہت اور ملک گیری سے بالخلقت محروم ہے ایسے بادشاہ کے واسطے تمہارا سا

وزیر بہت مناسب تھا۔ جس نے اپنا ہی ملک جرمنیوں وغیرہ میں دے دلا کر مختصر کر رکھا ہے۔ وہ ملک گیری اور ملک داری کی لذت سے بالکل ناواقف) اس کے علاوہ میں پوچھتا ہوں اس کی نظروں میں روس اور انگلستان بوجہ قرابت کیوں برابر ہونے لگے۔ ہاں تم کسی جدید منطق سے ثابت کر دو کہ جس طرح شہنشاہ روس کو ایک بیٹی بیاہی ہے اسی طرح ہماری قیصر ہند ملکہ معظمہ کو دوسری تو البتہ میں بھی برابر سمجھوں ورنہ بادشاہوں میں ایسی باتوں کو مانیں تو زار روس ہی کیوں انگریزوں کو ستاتا ہے۔

تمہاری کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روس جس قدر ملک پر قابض ہو گیا ہے وہ بہ رضامندی امیر کابل اسی کے سر رہے گا۔ آئندہ کا وعدہ لے لیا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم فضولیات میں مبتلا ہو کر مقصد اصلی کو اس طرح سٹ سے نکل جانے دیتے ہو جیسے چوہے دان سے چوہا یا ہاتھ سے زندہ مچھلی۔ امیر خود وہ ویران حصۂ ملک جو بہ قبضۂ روس آیا ہے مارچ کو بیع کر چکے اور تم سے دام بھی راولپنڈی میں وصول کر چکے ان کو پرواہی کیا۔ تم نے جس مصلحت سے افغانستان کو وظیفے دیے، تحفے نذر کیے اس کا خیال تو تم کو لازم ہے۔ اگر روس کو بڑھنے دیتے ہو تو خیبر، جلال آباد، قطع، پشاور، ڈیرہ جات پر فوج جما کر منتظر روس بیٹھو۔ پھر امیر کی اعانت کی ضرورت نہ وظیفوں کی حاجت اور اگر ہمسائگی روس نہیں چاہتے تو ایک ایک انچ زمین نہ لینے دو یا ہرات (جس پر وہ کوئی دن میں آیا ہی چاہتا ہے) روس کے سر رکھو اور قندھار پر خود قبضہ کر لو۔ جی چاہے دام دونوں کے اپنے خزانے سے دینا۔ روس بیچارہ مفلس ہے —— سمجھ لینا ڈچس اڈنبرا کے مہر میں رقم مجرا ہوتی۔

اگرچہ جانتا ہوں تم میری باتوں کو کم سمجھتے ہو مگر اتنا پھر بتا دوں گا کہ یہ سامان تیاری افواج جاری رکھو اس کی بدولت پارلیمنٹ روپیہ دے گی، روس دبے گا، افاغنہ تالیاں اور بغلیں نہ بجائیں گے وحشی اقوام عبرت کی نظر سے دیکھیں گے۔

چونکہ یہ اخیر خط تھا کسی قدر طویل ہو گیا ہے۔ اب مجھے اور تنائر دوں کو تعلیم دینا ہے۔ تم کو چندے کوئی خط نہ لکھوں گا۔

مختصر این کہ ان اہم معاملات کے علاوہ اور جو چھوٹے چھوٹے خرخشے ہیں وہ بھی اسی درستی کے ساتھ خود درست ہو جائیں گے۔

(۴)

بنام ملکہ وکٹوریہ (قیصر ہند)

ملکہ سکندر حشم دامت ظلہا!

اگرچہ تمہارے ملک و حشم کے آئین و قوانین ملکداری رفتہ رفتہ ایسے ڈھرے پر آ رہے ہیں کہ حاکم وقت

کو انتظام مہام میں خودسری و خود رائی کے منہ زور... ہوا پر سواری کی نوبت نہیں آتی اور محض زمانہ کی ہوا، قوم کی نبض دیکھ کر
اپنی رفتار مطابق کر لینا ہوتی ہے۔ سلطنت ایک ٹرین ہے جس کا انجن پارلیمنٹ۔ چند چلنے پرزوں کی قوت اور کاست
واقف ہو کر مباحث ملکی کی سردی گرمی سے رایوں کی سلنڈر کی رفتار پر نظر رکھنا اور ٹرین چلانا صرف کار بیست
ذراست حاکم بیخواہ... اور باقی دنیا کے سارے بکھیڑے جھنجھٹ پارلیمنٹ کے سر اور وزرا کے حوالے۔ مگر پھر بھی
بندہ بشر گہوارۂ عالم کے نشیب و فراز زمانے کی سردی گرمی دماغ پر تو کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔ چونکہ میرے
علم و یقین میں تم بھی انسان اشرف البیان ہو لہٰذا تم کو بھی ایسے خرخشوں سے معرا و مبرا نہیں پاتا اور ضرورت دیکھ
ہوں کہ بعد تعلیم و تلقین کا ایڈ اسٹن چند کلمات تمہارے گوشِ حق نیوش تک پہنچا دوں۔

آج کل معاملات کا قوام بہت کچھ بگڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر فعالیت اولوالعزمی کی چاشنی اندازۂ اعتدال سے
بڑھ کر حلاوت ملکداری میں زیادہ ترشی دکھائے تو چنداں ناگوار نہیں گزرتا۔ کیا وجہ کہ وہ تو ایک باطنی بنک ہے جو رنج
میں کھٹ کھٹ کر اثر پیدا کرتی اور عجیب دکھاتی ہے مگر صلح اور امن کی حالت منفعلہ کا شربت بزوری معتدل ادنیٰ سی کمی بیشی
میں بگڑ جاتا اور خدا جانے کیسی الٹی پلٹی تاثیرات پیدا کرتا ہے جب کوئی منفعل درجۂ لازمی سے گزر کر متعدی ہو جاتا ہے
تو ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ بہت سے امور کا وقوع ایک کو ناپسند ہو مگر ضرور نہیں کہ دوسرا
بھی اسی قدر کراہت کرے۔ پس انسان لامحالہ چار ناچار طوعاً و کرہاً بہت سے افعال اسی وجہ سے کرتا ہے تم بھی
اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ سب سے اہم اور ضروری کام عموماً حاکموں اور خصوصاً تمہارے واسطے زمانے اور
قوم کی رفتار پر نظر رکھنا ہے۔

زمانے کا چلن آج کل پر کیا منحصر ہے، ہمیشہ آگے کی جانب رہا ہے۔ پستی اور سستی عارضی امور ہیں مگر میلان
رجحان اسی جانب ہے۔

قدم وقت بیشتر باشد

گاہے ماہے وقفہ یا مکث زیادہ تیزی اور سرعت کے ساتھ رواں ہونے کو ہوا کرتا ہے۔ جیسے آندھی آنے سے پہلے
ہوا میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح جب عالم اسباب میں تولید واقعات کمی پر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ
مادر گیتی اس دفعہ بڑے بڑے گھن گرج جھول نکالنے والی ہے۔ عقلمند اور انجام بین ہر وقت چوکنا اور ہر کام کے واسطے
مستعد رہا کرتے ہیں۔ تم بھی ایسی ہی ہو مگر اتنی کسر ہے کہ تمہاری قوم کثرتِ کامیابی اور فرطِ سامان سے اس قدر مغرور اور
متکبر ہو گئی ہے کہ اب بلا خوض و فکر اور داہنے بائیں دیکھے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ہر چیز کو اعلیٰ اور افضل سمجھتی ہے
اس سے علاوہ دیگر نتائج کے یہ نقصان ہوتا ہے کہ وقت پر چند ایسے امور ناپسندیدہ و نامطبوع سے سامنا ہو جاتا ہے
کہ جن سے طبیعت میل کھاتی ہے نہ گوارا کر سکتی ہے۔

عالی ہمتی اور بلند خیالی اور کار ہائے سترگ کرنے کے واسطے خفیف سی لاپرائی اور بلند نظری وہی خدمت انجام
دیتی ہے جو راہگیر کو لاٹھی یا چھڑی۔

مگر کون کہہ سکتا ہے کہ بہرام گھاٹ کے پورے مٹھے کی لاٹھی کو حبیب زحمت نہ ہوگی۔

ترقی ہو یا تنزل دراصل دونوں ایک اور ایک ہی دو ہیں۔ صرف نام کا فرق ہے۔ گیند کو دیکھو اور بتاؤ اس میں سے کس مقام کو اونچا اور کس کو نیچا کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح زمانے کو چکر یا دائرہ یا چرخ جو چاہو کہو۔ دنیا کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہ محض ہماری فہم ہے کہ مختلف نام پیدا کرتی ہے۔

حیات و ممات، صحت و عارضہ، ترقی و تنزل چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ تمہاری قوم تہذیب اور ترقی کے درجے کو طے کر چکی اب اس کو سنبھلنا چاہیے اور بہت پھونک پھونک قدم رکھنا لازم ہے۔ سارا یورپ اپنے واسطے ایک طوفان عظیم بنا رہا ہے۔ تمہارا ملک اس سے قبل کسی قدر قصص اور معاشرت کے باعث بہت سی آفات میں شریک یورپ نہ ہو سکا۔ اب عنایت خدا سے تمہاری وہ سلطنت ہے جس پہ آفتاب غروب ہی نہیں ہوتا۔ اب ہر جگہ کی سرد گرم ہوا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرے گی۔ اگر تمہاری قوم عقیل ہے تو اس کو لازم ہے کہ

اگر خواہی سلامت برکنار است

پر عمل کر کے پھونک پھونک قدم رکھے۔

لبرل فرقہ باعتبار پولیٹیکل مباحث بے شک مجھے پسند ہے مگر اعتدال کی دم ضروری۔ افعال لازمی اس کے بہت اچھے ہوتے ہیں متعدی میں بوجہ تکبر و غرور فوقی اور لاپرواہی کسی و دیگر اسباب خفیف و عظیم معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے۔

ایک اور امر جو تمہاری توجہ خاص کا محتاج ہے یہ ہے کہ یورپ کے ساتھوں ساتھ تمہارے انگلستان میں مذہب کے خیالی باغ و بوستان کے ہرے بھرے سبز و شاداب تناور درخت سموم علم نفری و ظاہری کے جھونکوں سے جڑ سے اکھڑ اکھڑ کر گرتے ہیں۔ صرف تھوڑے سے لنڈ منڈ تنے اپنی سخت جانی سے بچ رہے سو وہ بھی امروز و فردا میں کوچ کرتے نظر آتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم ظاہری، صوری و معنوی طور سے خود سر و آزاد ہو کر بادشاہی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ جب نے حاکم حقیقی کی اطاعت کا بوجھ سر سے پھینک دیا وہ حاکم مجازی کو پہلے سلام کرے گا۔ مذہب اب صرف ظاہری مراسم اور آرائش و زیبائش کے واسطے رہ گیا ہے اس کے اصلی تصدق و تسکین سے مدت ہوئی کہ ناآشنائی ہو چکی ہے۔ اگر کچھ ہے تو نقد مس کی تہگ و وضعداری۔ خلقی اور نیچرل رفتار زمانہ کسی کے روکے نہیں رک سکتی۔ آگ، پانی اور ہوا کسی کی مذہب سے اپنی قوت ترک نہیں کر سکتے مگر ان کی قوتوں سے کار مفید لینا آج کل کے حکماء اور عقلاء کا کام ہے۔

المختصر اسی طرح اور بھی چند امور ہیں جن کو دوسرے خط میں لکھوں گا۔ اب تم جاؤ زار روس کو خط بھیجو۔ میں بھی کائنات کی سیر کو جاتا ہوں۔

(۵)

بنام ملکہ وکٹوریہ (قیصر ہند)

ملکہ سکندر حشم دامت ظلہا!

میں نے اپنے پہلے خط میں دوسرے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی جہت سے اگرچہ مجھے ساری دنیا کے بکھیڑوں

اور تم کو اپنی پارلیمنٹ کے جھگڑوں، وزراء کے استعفوں سے مہلت کم ہے مگر ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔

سب سے پہلے میں پا افتادہ مضمون وزارت کا ہے۔ جو کچھ ہوا اور تم نے اور گلیڈ اسٹن نے کیا وہ تو ہو چکا اس کا ذکر نہیں کیا وجہ کہ میری عادت ہے معاملات گذشتہ کو بجز مورخانہ تجربہ کے اور کسی لائق نہیں سمجھتا۔ تم نے سالسبری کو وزارت دی۔ اچھا کیا نہ برا۔ آخر تم بیچارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ کنسرویٹیو فرقہ اب ایسا بے سرا اور بے ٹکا ہو رہا ہے کہ کوئی لیڈر کانا نہیں لیڈر ہی اندھوں میں کانے راجا بنتے۔ اب نظرِ تعمق سے ملاحظہ کیجیے تو ایسے فرقے کا کمزور رہنا اچھا ہے جو قدیم بانوں [illegible] شخصی سلطنت بھی شامل ہے، حامی ہو بادشاہوں کی ذات کے واسطے خالی نیک نہیں۔

لارڈ رنڈالف چرچل جو بدقسمتی ہندوستان سے وزیر ہند ہو گئے ہیں بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کم سنی اور [illegible] اور [illegible] تیز ترقی ہے۔

معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی۔ آج تک تمہارے ملک اور پارلیمنٹ میں جس قدر توجہ ہوتی ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور لاپروائی سے مملو۔ یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شورہ پشتی کی دست برد سے اعوانِ قیصری محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔ اگر تمہارا کا رخ بنانا ہے تو ایک شہزادے کی تخواہ کے بارے میں قوم کی نسبت بہت کچھ سمجھاتی ہے۔ یہ اسی ہندوستان کے جھگڑے ہیں جو بادشاہ کا انداس تک چاہتا ہے۔

بھلا کچھ تو ہے کہ ہر اولوالعزم کو جہاں زمانے نے کسی قدر بھی وسعت دی اس نے اسی طرف کو رخ کیا۔ ظاہر ہے اگرچہ میں یہاں کا باشندہ نہیں مگر دراصل میں سارے دنیا کا رہنے والا ہوں۔ ازل سے اس ملک کی خوبیاں مجھ پر اس طرح روشن ہیں جیسے بادشاہوں میں آج کل زار روس سکندر نے بیرسے ہی مشورے سے پر کار بند ہو کر ادھر کا قصد کیا تھا مگر افسوس اس کی فوج نے وہی ارادے ایک دوسرے عنوان سے برتنے جن کے حامی سے تمہاری قوم آج کل بدمست ہے، اور آخر اس کا نتیجہ جو ہوا اس سے ہر ایک سکندر ہی کا دل آگاہ ہے اور تھا جب تک ہندوستان انگلستان کا ضمیمہ و دُم چھلا بنا رہے گا پارلیمنٹ انگلستان میں اس کا گیند دھڑکا ہو گا، وہاں کا ادنیٰ سے ادنیٰ گورا ہندوستان میں دیوتا بن کر جہاز سے اترے گا تب تک ہندوستان ہندوستان نہ ہو گا۔ لاکھ روپیہ کی بات تم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر شئے کی خوبی ذاتی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک اس کی ذات میں فرق نہ آئے۔ آم تب تک ہی آم ہے جب تک اچار نہیں بنایا گیا ہے۔ پس اسی طرح ہندوستان اسی وقت تک ہندوستان ہے جب تک ہندوستان کی ذات میں خلل نہیں آیا۔

تہذیب اور ترقی صدق اور راستی کے جانی دشمن ہیں مگر کیسے جیسے مارِ آستین۔ حکما کہتے ہیں کہ نیکی کو کسی طرح سے عمل میں لانا نیکی نہیں اور راستی کو ایشیائی شاعر یوں کہہ گیا ہے ؎

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے

حوروں پہ مر رہا ہے یہ ...... پرست ہے

صاحبزادہ بلند اقبال جشن تخت نشینی مناتے ہوتے تھے۔ ایک جلد باز جلے تن نے بوڑھے باپ کو یہ بات پہنچا دی کہ تم تو مر گئے نہیں، ہم بوڑھے ہوتے جاتے ہیں لطف ریاست کب اٹھائیں گے۔ پس اب تو میری عملات سب اور نہ غالباً تمھارا دل باپ کا غم منانے کو چاہتا ہوگا یعنی ما مضی۔ اب ریاست کا جھگڑا ملکداری کا بکھیڑا تمھارے سپرد کیا کم ہے۔

تم نے جو کچھ گدی پر بیٹھتے ہی رفاہ و فلاح کے احکام جاری کیے اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے سوچے ہوئے ہیں بلکہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آج کل کی مصلحت کے موافق بیہودہ دستور اور لایعنی تکلیف وہ مراسم کی قدر اسی قدر تمھارے ذہن میں ہے جتنی ہونا چاہیے۔ بات تو اچھی ہے بشرطیکہ تمھارے دماغ سے نکلی ہو۔

تمھارا ملک دستکاری، نفاست، میوہ جات، لطافت، موسم، خوبی آب و ہوا میں ضرب المثل بلکہ اہل اس کے بدانتظامی و بدحالی میں شہرۂ آفاق ہیں۔ تمھارے خوشامدیوں نے اگر انگریزی یا اور ہندوستانی عملداری کی ناب پیش کر کے نیچی آنکھ اوپر اٹھوا دی، عرقِ خجالت رومالِ خوشامد سے پونچھ دیا تو اس سے نہ شال بافوں نے گاڑھی کمائی کا پورا اجورہ پایا نہ مفلوک اور کنگال مسلمان خوش ہوئے۔

آج کل کی تہذیب کی کنجی یہ مثل ہے:

"ہاتھ پاؤں بچائے اور موذی کو ٹرخائے"

جب تک اس پر عمل ہے مزے سے ڈل میں عیش مناؤ، گل مرغ میں جشن اڑاؤ۔ کس نے پرسد کہ بھیا کون ہو۔ سرحد کا جھگڑا کچھ تم ہی کو بیہودہ جا بیں نہیں رکھتا، سارے ہندوستان اور انگلستان اور افغانستان میں بکھرو نچا پھرتا ہے۔ ہندوؤں نے سانڈ چھوڑ دیتے ہیں وہ جانتے ہو کس قدر ظلم کرتا پھرتا ہے۔ بازار میں جدھر رخ کیا دکاندار کی جان اگاڑی پچھاڑی نڑاکر نو دو گیارہ ہو گئی۔ پس اسی طرح سمجھ لو علتہ العلل نے روس کو بھی سانڈ دیا ہے۔ اس کے علاوہ نوش میں گزند نیش، گلستانِ شادی میں خارِ غم، شیرینیٔ الفت میں چاشنیٔ شکایت، بہار میں خزانِ موت، ننگ میں بھنگ، کلبل میں غلبل نہ ہو تو لطف کیا آئے۔ قدر و منزلت کیا معلوم ہو۔ قدرِ عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید۔ صاحبِ توبۃ النصوح کا قول ہے اگر مرنا نہ ہوتا تو لوگ درختوں سے گر کر، کنوؤں میں پھاند کر جان دیتے۔ سرکس میں محض تماشائیوں کی توجہ میں تحریک پیدا کرنے کے واسطے سہواً و عمداً گھوڑوں پر سے گر پڑتے اور دوڑتے ہی میں اچک جاتے ہیں یہ سب کیا ہے۔ بندھی ٹکی وضعداری، سلامت روی کی چالوں میں چہل پہل پیدا کرنا ہے تاکہ دلچسپی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ روس ادھر سے آئے گا نہ آئے گا مگر تم یہ سمجھ لو۔ ٹیکے کا ڈر شیر کا پتا پانی کرتا ہے۔ علاوہ اس کے ناؤ میں خاک اڑانے یا پانی گندلے کا بہانہ تو بآسانی مل سکتا ہے۔

آج کل رزیڈنٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے۔ تمھاری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ برمحل

لوگوں کی ہمت، نیت، صحبت کے اثر سے تم کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب ہر طرح کوشش کی جائے کہ فعالہ کی جگہ صرف انفعالیہ ہی ترقی پکڑے۔ اب بجز اس کے اور چارۂ کار نہیں کہ تم ہر بات حالاتِ رعایا، کارگزاری اہل کاران مداخل و مصارف خزانہ بغیر عینک کے دیکھو اور پھر جس بات پر دل کا استقرار واجب آئے اس پر عمل کرو۔ تم انتخابِ دیوان ہیں، ہر انسانی خوبی کو کام میں لاتے۔ قدردانی ریاست، مصلحت وقت، عزت افزائی سب کچھ کر گذرے اور واقعی نمک حلال، وفادار، خیرخواہ، عقیل، عالی دماغ دیوان کے حقوق کو خوب ادا کیا مگر ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

لاپروائی، استغنا، گستاخی جو بعض اوقات سوء ادبی کی حد تک پہنچ جاتی ہے سب خاک میں ملائے دیتی ہے۔ تم تو اپنی کہہ گذرے۔ آگے جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ مثل مشہور ہے سکھائے پوت (یعنی بیٹے) دربار نہیں جاتے قصہ یوں ہے کہ ایک سلطنت میں نہایت لائق ہوشیار وزیر تھا۔ بادشاہ بھی اس کو مانتا اور بہت معزز جانتے تھے وزیر انجام بیں نے اپنی اولاد کی آئندہ بہبود اور وزارت موروثی کرنے کے واسطے مناسب سمجھا کہ میرا لڑکا عینِ حیات اگر دربارِ شاہی میں حاضر ہو کر کاروبار سیکھا کرے تو غالب ہے بعد میرے میرے آقا اور لڑکے دونوں کو دقت نہ ہو۔ وزارت بھی بلاتکلف خاندان میں قائم رہے مگر سلامتی سے صاحبزادے پورے صاحبزادے ہی تھے۔ باپ تو ریاست کے وزیر تھے، صاحبزادے احمقوں کے بادشاہ نکلے تاہم وزیر پُر تدبیر نے طبیعتِ انسانی کی تربیت پذیری پر اطمینان کر کے خیال کیا کہ کچھ نہ کچھ میرے جیتے جی سیکھ جائیں گے۔ آگے کام چل نکلے گا۔ چنانچہ ایک روز کسل مندی کا حیلہ کر کے خود تو دربار نہ گئے مگر صاحبزادے کو بھیج دیا اور چلتے وقت امورِ ذیل بطورِ ہدایت نامہ پڑھا دیے:

اول۔ پہلے بادشاہ اور پھر ولی عہد کو نہایت ادب اور محبت سے سلام کرنا۔ کیونکہ وہ ہمارے بڑے خواجہ یہ چھوٹے خواجہ ہیں۔

دوسرے۔ چونکہ تم وزیر کے بیٹے ہو کسی ایسے ویسے مقام پر نہ بیٹھ جانا۔ جب بادشاہ اشارہ کریں کسی اونچی جگہ پر بیٹھنا۔

تیسرے۔ اگر کوئی بات بادشاہ پوچھیں تو نہایت نرم اور میٹھی باتیں کرنا۔

اب سنیے حضرت داخل دربار ہو کر کیونکر نصائح آبائی و تعلیماتِ پدری کو صرف کرتے ہیں کہ پہلے جاتے کے ساتھ ہی بآوازِ بلند پکارے "بڑے کھوجنیا تھکا (تجھے) سلام اور چھوٹے کھوجنیا تو ہوگا (تجھے بھی) سلام۔ بیٹھنے کا اشارہ پا کر آپ لگے بلند مقام ڈھونڈھنے۔ آخر ایک گوشے میں سامانِ روشنی کے واسطے ڈیوٹ کی قطع کی چیز رکھی ہوئی تھی آپ اچک کر اس پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے محض اپنے لائق وزیر کی قدر افزائی کے خیال سے مزاج پوچھا، جواب ملا "روئی ریشم، سوت قائم۔"

(۷)

کہ کوئی شخص مشورے کے لائق تمہاری قلمرو میں باقی نہیں رہا۔ نہیں، ہیں اور متعدد ہیں مگر ان کو پہچاننا اور ان کی مناسبت طبیعت کے لحاظ سے رائے لینا اور اس رائے کو میزانِ عقل میں تولنا تمہارا کام ہے۔ دیکھو تمہارے وزیر معہود کیسے کیسے متضاد صفات کے حضرات مختلف اقطاع ہندوستان سے جمع کیے تھے مگر ہر ایک سے کام وہی لیا تھا جس میں اس کو لیاقت ہوتی تھی۔ یہ سمجھ لو جس قدر تیز چست، چالاک گھوڑا ہوگا، اسی قدر سوار کو اور بھی ہوشیار بیٹھنا ہوگا۔ میں تم کو ایک لٹکا فقیروں کا بتاتا ہوں۔ گو بہ آسانی اور مفت میسر آنے کی وجہ سے تم قدر نہ کرو مگر سمجھ لو کہ کشور کا زیر انتظام مہمات، حصولِ مقصد کے واسطے منتر ہے تو یہی اور خزانہ ترقی کے لیے کلید ہے تو یہی یعنی جب غور کر لیا کہ یہ امر ہماری ذات و صفات کے واسطے مفید ہے اور اس کو تکمیل تک پہنچانا ضروری، تو پھر ہر وقت، ہر لمحہ، ہر جگہ اس کا خیال رکھنا فرض ہے اسی کا نام دُھن ہے۔ جب تک اس میں پکّے نہ ہو گے ہرگز ہرگز مقصود حاصل نہ ہوگا۔ تمہارے وزیر کو بہبود و ترقیٔ ملک کی بہت لمبی دُھنیں تھیں جن میں وہ سوتے جاگتے ہر ساعت مستغرق رہتے تھے۔ تم جانتے ہو ہیں، بجز ایک کے نقصان کے دوسرے کا فائدہ نہیں ہوتا۔ پس وہ فکریں ہی اسی طرح کی تھیں کہ جہاں تم کو اور تمہارے ملک کو فائدہ پہنچائیں وہاں دوسروں کا نقصان بھی کریں۔ پس اب ان حضرات نے موقع اور گھات پا کر ایسے ایسے رخنے اور جھگڑے بکھیڑے شروع کر دیے کہ تم کو ریاست ملنے پر دُھن نہ بندھنے پائے۔ گو تم کم سن تھے مگر ایسے کہ اپنے وزیر کی تدابیر و مساعی واپسی برار کی خبر نہ سنتے ہو۔ اس کو مرتے مرتے بھی دھن رہی۔ اب انصاف کرو۔ اس کے بعد پھر بھی کبھی اس کا چرچا ہوا۔ ملک وہی، والیٔ ملک وہی، برار وہی، سرکار وہی مگر افسوس انگریزی مثل "کوشش کرو، کوشش کرو اور پھر کوشش کرو" پر عمل کرنے والا نہیں۔ ممکن ہے تمہارے دل پر ایسا اثر ڈالا گیا ہو کہ واپسی برار کا جملہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں یا طبیعت وحشت کی لیتی ہو۔ مگر سمجھ لو اگر تم کچھ کر گے تو ایسے ہی مہمات سر کرنے سے ورنہ کٹھ پتلیوں کا ناچ تو عالم میں ہوا ہی کرتا ہے۔

ایک اور بات اخیر میں کہتا ہوں کہ غور کا مقام ہے خدا کو عوام اور بعض خواص خدا کیوں مانتے ہیں صرف یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات کسی قدر مختار اور کسی قدر مجبور پاتے ہیں اور اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ جب ہمارے اختیارات محدود ہیں تو ضرور ہے کوئی ذات ایسی ہو جو بہمہ وجوہ مکمل اختیارات رکھتی ہو۔ پس وہی ذات خدا ہے غرض یہ کہ جو کچھ ہیں یہی لوگ حضرتِ اختیار صاحب ہیں۔ جو لوگ اس کی قدر کرتے ہیں وہ حتی الوسع اپنے ہی اختیارات وسیع رکھا کرتے ہیں۔ تمہاری طبیعت نے بھی دانستہ یا نادانستہ تم کو اسی وادی پر پہنچایا ہے۔ اب تم کو لازم ہے اپنے ہی اختیارات کا میدان گھوڑ دوڑ کے چکّر سے زیادہ وسیع بنائے رکھو اور کسی دوسرے کو عام اس سے کہ وزیر ہو یا وزیر کا بھائی، عزیز ہو یا قریب، کسی کو نہ دو۔ میری صلاح تو یہاں تک ہے۔ اگر ملک غارت بھی کرو تو اپنے اختیار سے اور خزانہ لٹا دو تو اپنے اختیار سے، کسی پیادے کو نوکر رکھو اپنے اختیار سے، غرض یہ کہ جو کچھ چاہو کرو اپنے اختیار سے۔

ایک بات اور چلتے چلاتے سن لو کہ مالی انتظام تو خیر جیسا ہے ویسا ہے مگر اہلِ سیف کی جانب بھی

تم کو توجہ چاہیے۔ پرانے اور قدیم طریقے نے تمہارے خزانے کو سپاہیوں کی جیب میں ڈالا نہ تمہارے صندوقوں میں رکھا بلکہ اکثر جمعداروں کے پیٹ کی لپیٹ میں الجھایا۔ اس کا انتظام بہ لطائف الحیل نہایت سہولت سے کرنا چاہیے۔ کیا وجہ کہ ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اور بھی چند امور باقی ہیں۔ اگر فرصت ہوئی تو تیسرے خط میں گوش گذار کیے جائیں گے۔

(۹)

بنام نظامِ دکن

حضرتنا!

میں نے جو آپ کے نام خطوں کی بھرمار شروع کر دی ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ کچھ دنوں یاد کیجیے جس قدر کم توجہی کی شکایت تھی غالباً وہ رفع ہو گئی ہوگی اور کچھ کچھ آنکھیں کھلی ہوں گی کہ اب تک میں نے کیا کیا اور کیا کرنے کو باقی ہے لیکن مشکلات و معاملاتِ موجودہ کا حجم غفیر ایسا مضطرب الحال بنائے ہے کہ آپ کو مشکل سے آگے پیچھے نظر پھیرنے دیتا ہے۔ خیر یہ تو امور اتفاقی ہیں۔ چارہ ہی کیا ہے۔ اگر اتنا ہی خیال ہے جتنا میرے خیال میں ہے وہی بہت ہے ع

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

آدمی کی تلاش عالمگیر اور سعادت علی خاں کو عمر بھر رہی اور ہمیشہ پہیلیاں بجھایا کیے کہ وہ کیا ہے کہ بہت ہے اور پھر نہیں یعنی انسان بجز خدا کی عنایت سے کوئی نہ ملا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس وقت کوئی بھی انسان نہ تھا بلکہ بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق کوئی نہ مل سکا۔ اس پر کوئی کام ان کا رکا نہ انتظام ملتوی۔ ایک نے سلطنت کی شاخیں انتظام کی تختیاں دور تک پہنچا دیں۔ دوسرے نے ایک جدید ریاست کی بنا ایسی قائم کی کہ سلطنت کی حالت نصیب ہوئی۔ پس اسی طرح کام چلانے کے واسطے تم بھی رکے نہ رہو۔ کسی نہ کسی طرح چھکڑا چلا جائے۔ پہلی کا نام گاڑی ہے۔

سعادت علی خاں کوئی نائب نہ مقرر کرتا تھا۔ اگر لوگ پوچھتے یہی جواب دیتا کہ وہ ریاست ہی ایسی کیا ہے جس کے واسطے نائب کی حاجت ہو۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے ہاں معاملہ بالعکس ہے ریاست اور اس کی آمدنی سے شاید محض اس وجہ سے ترقی نہیں کی جاتی کہ وہ نیابت ہی کیا ہے جس کے واسطے ریاست بڑھائی جائے۔ خیر اس میں اور دیگر امور میں کلیہ یاد رکھو کہ وزارت ریاست کے واسطے ہے نہ ریاست وزارت کے لیے۔

عاشق و معشوق کے خطوط کیسی احتیاط سے کیوں نہ بند ہوں ضرور تاڑ لیے جاتے ہیں، وہ ان کا وزن،

وہ چاروں طرف سے نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹا سمٹایا، لفافہ بند ہونا، وہ گوٹ کی چار چار تہیں، وہ سیکڑوں تختے
کاغذ اور لمبے چوڑے مضامین، ارمانوں، آرزوؤں، حسرتوں کے جمِ غفیر سے چست اور تنگ لفافے کے گرتے
سطح معشوق نوخیز کے سینہ و بازو کی طرح اُبھرے اور بھرے بھرے، وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ وہ انتہا کی خوشخطی
وہ خوشبوؤں میں بسا ہونا، وہ بند کرنے کی جگہ پر اکثر پان کی ہلکی سُرخی، وہ اسم برخانہ، وہ دوسروں پر طلاق، یہ سب
محبت الفت، شکوہ و شکایت، راز بنانے لب اور پان خوردہ کی شیرینی ظاہر کرتے ہیں، مشتاق اور نظر باز ع
خط کا مضمون تاڑ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

پس ہندوستانی رئیسوں کے ساتھ گورنمنٹ انگریزی کی مراسلہ بازی، وہ رزیڈنٹ کا آنا جانا، وہ مراسلہ
لانا، وہ تخلیے ہی میں سرگوشیاں، وہ اخفا میں اہتمام جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس بوڑھے خرانٹ پر آئینہ ہے۔ ہاں
(سر ہلا کر) اچھا تو ہے۔ تمہاری خاطر کس کو منظور نہیں خصوصاً جب تم ناراض بھی نہ کرو۔ امور ناگوار زبان تک
نہ لاؤ۔ مشرق کے جانے والے کو سمجھ لینا چاہیے اگر برابر چلا ہی جائیگا تو ایک دن مغرب میں آ نکلے گا۔

"اگر در خانہ کس است یک حرف بس است"

تمہارے مدار المہام کے چھوٹے بھائی گھوڑ دوڑ میں (جو تمہارا خاص مشغلہ ہے) اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے
اور گھوڑ دوڑ بازی جیتے۔ ان کو اور تم کو مبارک۔ اگر حیدرآباد کی مدار المہامی میں صرف شہسواری درکار ہوتی تو پھر کیا تھا
ترقی و تنزل، عروج کے واسطے حاکم کی توجہ یا کم توجہی کے ساتھ امورِ اتفاقی لازمی ہیں۔ پس یہ بھی انہی امورِ اتفاقی
سے ہے۔

مجھ کو تو تم جانو ہندوستانی نہ دکنی، پارسی نہ مدراسی، انگریزی نہ ارمنی۔ میں تو باشندۂ دنیا ہوں۔ میری نظر میں
ہیں سب یکساں، پس میری صلاح و مشورت میں کسی کی جنبہ داری کو دخل نہیں ہو سکتا۔ فی الحال ہندوستانیوں کی نئیا
کا چڑھاؤ اُتار ریاست کو ہنڈولا بنائے ہے۔ تم کو لازم ہے سب میں اپنا مطلب مقدم رکھو۔ نہ وہ افراط کہ
ادھر سے کوئی بھی بال کترا فیہ ہووے۔ جھاڑن کا کوٹ پتلون پہن، کھڑے گھاٹ نیچری بن، سید صاحب والے
بی چھتی کے چادر گھاٹ جا اترا اور آنکھ بند کر تمہارے یہاں سے تنخواہ، عہدہ، جگہ، کام سب بگٹٹ چلا آتا
ہے بلکہ اسٹیشن پر ریل سے قدم نیچے رکھا نہیں کہ تنخواہ بیش قرار نے نذر دکھائی۔ عہدے نے سلامی اتاری
اور ترقی کی ہو گئی پر یہ جا وہ جا۔

اور نہ یہ مناسب و مصلحت ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ ہندوستانی نکالے جائیں۔ ایک آغا صاحب
ولایت سے ہندوستان تشریف لائے۔ ایک دوست نے پھلیندے کھلائے۔ ہندوستان کا یہ میوہ آپ کو
بہت لذیذ معلوم ہوا۔ پوچھا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی آنجا لے چلے تو بڑا مہربانی ہو۔ دوست صاحب
نے ایک پھلیندے کے درخت کے نیچے جا کر دکھا دیا کہ تو یہاں ٹوٹے ہوئے سیاہ سیاہ یہ بہت سے
پڑے ہوئے ہیں جتنے کھانے چاہیں کھاؤ۔ آغا صاحب لگے ذوق شوق سے کھانے، اتفاق سے پھلیندے

کے ساتھ ہی کئی بھونرے بھی مرے پڑے تھے۔ آپ ایک آدھ وہ بھی چکھ گئے۔ وہ جب دانت کے نیچے پہنچا تو کرکراہٹ معلوم ہوئی۔ آغا صاحب فرماتے کیا ہیں "تم چاہے چڑ کرے چاہے مڑ کرے کالا کالا ہم ایک نہیں چھوڑے گا" بس کچھ ضرور نہیں ہندوستانی ہندوستانی ایک نہ چھوڑے۔ ہاں افراط تفریط ہر شخص کے نزدیک معیوب ہے۔

خیر یہ تو ہو چکا۔ ایک ضروری اور اہم ضروری بات لکھ کر میں یہ خط ختم کرتا اور کسی دوسری طرف رُخ کرتا ہوں۔

مثل مشہور ہے "جان ہے تو جہان ہے" اگر اپنی طبیعت درست مزاج صحیح ہے تو ریاست، سلطنت، عیش عشرت، شراب کباب، سیر تماشے سب کا لطف ہے۔ بھلا معشوقانِ پری تمثال و مہ وشانِ خوش خصال، ناچ و نوش، مستی کا جوش و خروش کیا مزا دے گا جب ہم پڑے پڑے سہری پر بالسم کپیبا اور مرکیوری کے مرکبات کے محتاج نیم کا ٹیرا بلا رہے ہیں۔ تاج پُر زر، لباسِ مکلف کیا اس چہرے پر بھلا معلوم ہوگا جس کو فسادِ خون نے تتبع سے اس طرح بگاڑا جیسے گلفام اور بے نظیر کو اندر سبھا اور مثنوی میر حسن کے مصوروں نے ان امور کا اثر اعصاب پر اور اعصاب کا اثر دماغ اور جسم لطیف (حواسِ خمسہ و ارادہ وغیرہ) کے افعال پر جو کچھ پڑتا ہے طب و حکمت گواہ ہیں۔ واجد علی شاہ باوجود جسیم و تخیم ہونے کے انتزاعِ سلطنت کی خبر سن کر رونے لگے۔ اس کی وجہ علی نقی خان اور لارڈ ڈلہوزی سے پوچھو۔

شاید تم فسادِ خون میں شہزادہ بسمارک کی مثال پیش کرو۔ مگر اتنا بھی سمجھ لو کہ یورپین طرزِ تعلیم و خیالات، وسعتِ معلومات اور کندی جذبات انسانی وہاں کیسی ہے۔ اس پر بھی دیکھو تو فسادِ خون کو افسادِ عالم اسباب میں کس قدر دخل ہے جو بات اس کے دماغ سے نکلتی ہے دنیا میں فتنہ و ہنگامہ پیدا کرتی ہے۔

اب میں تم کو رخصت کرتا اور سید بلگرامی کو سونپتا ہوں۔

۱۸۸۱

تمت شد

آخر اس کا کیا جواب ہے؟

وکیل۔ کاہش تن تو میں جوہر عاشقی ہے۔ امیاں فراق میں گھل گھل کے پوست و استخوان رہ جائے تو اپنے حساب قلعہ فتح کر لیا۔

ذات شریف۔ یہ تو کچھ پہیلی سی آپ نے کہی۔ واللہ جو مطلق سمجھ میں نہیں آئی

وکیل۔ ہائے کیسی پھوہڑ عقل ہے۔ ارے میاں جہاں سوکھ کے کانٹا ہوئے سمجھئے کہ طلبی کا پروانہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اب دیکھیں وصل کیونکر حاصل نہیں ہوتا؟

ذات شریف۔ ہاں ہاں۔ پھر یہ کہیئے۔

وکیل۔ اب آپ کو بھی لازم ہے کہ بہت نہیں صبح و شام دو چھینٹے بسم اللہ کر کے پی لیا کیجئے، پھر دیکھئے کیسے عقل کے جوہر کھلتے ہیں۔ لو دور کیوں جاؤ، ان چینیوں کو دیکھو کیسے آفت کے پرکالے ہیں کہ ریل ان کے ہاں سے نکلی، تار برقی ان کے ہاں سے نکلی، دخانی کشتی ان کے ہاں سے نکلی۔ سب سلطنتیں روم و روس کی لڑائی دیکھ کے کانپ رہی ہیں اور فغفور کو دیکھئے قطب از جا نمی جنبد۔ بے غل و غش بیٹھا ہوا مزے اڑا رہا ہے۔ نے غم خویش نے غم کالا۔

ذات شریف۔ ذہن و ذکا کے علاوہ قوت اختراعی بھی آ جاتی ہے۔ ماشاء اللہ معلومات میں بھی دستگاہ کامل بہم پہنچ جاتی ہے خیر یہ تو قابلیت اور علمیت کی قلعی کھلی۔ اب یہ فرمایئے کہ استعمال افیون سے اور کون فائدے متصور ہیں

وکیل۔ نہیں اس بکواس سے کیا حاصل۔ صرف دو تین دن ذرا ذائقہ لے لو، پھر چاہے چھوڑ دینا، اور اس کا ذائقہ کچھ ایسا تو ہے نہیں کہ جوہرن کیسی پانی ہو کر میں بیان کر جاؤں، وہ خود اپنے جوہر دکھا دے گی کسی کے کہنے کی کیا حاجت ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

ذات شریف۔ حضت دمڑی کی ہانڈی بھی لی جاتی ہے تو ٹھونک بجا کر لی جاتی ہے۔ یہ تو پھر ولی ہونا ہے۔ ہر پہلو دیکھ بھال کے ولایت اختیار کریں گے۔ بھلا کچھ تعریف تو سنیں۔

وکیل۔ لے تم بھی کیا یاد کرو گے، قواعد افیون کے ست کا لب لباب بتائے دیتے ہیں۔

(۱) بڑے بڑے مرتاض اور عابد یاد الٰہی میں شب بیداری کرتے کرتے اونگھ جاتے ہیں، مگر ہمارے جتھے کے لوگ رات کو سونا حرام سمجھتے ہیں۔ جب دیکھئے مراقبہ میں غرق، دریائے محبت میں غوطے لے رہے ہیں۔ او ہو ہو ہو!

(۲) جس کو دیکھئے خندہ رو، ہنستا بھی ہے ہنساتا بھی ہے۔ باور نہ آئے تو زعفرانی رنگت شاہد ہے۔

(۳) حلم و بردباری، سلیم الطبعی، عجز و انکساری تو گویا خدا ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتا ہے نفس کش اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اناث سے سر کی جوئیں دکھاتے، مگر ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

(۴) سب سے افضل یہ صفت ہے کہ تعزیرات ہند کی کوئی دفعہ ان پر فضل الٰہی سے عائد نہیں ہو سکتی۔ ہاتھا پائی جانتے ہی نہیں سخت کلامی سیکھی ہی نہیں، بے ادبی اور گستاخی کے پاس نہیں پھٹکتے۔ ہزٹ کا نام نہیں جانتے۔ آپ جھک کر تسلیم کیجئے گا، وہ قدرتی خمیدہ کمر ہیں۔ آپ ہی ملاحظہ کیجئے کہ کیا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کم خوراک اتنے بڑے کہ کیسا ہی قحط پڑے ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ چھٹانک آدھ پاؤ ماش دن میں کھا لیا، نہیں تو کچھ اس کی بھی پروا نہیں۔

(۶) داستان گو ایسے جید کہ چھ مہینے گذر گئے اور امیر حمزہ نے ملکہ مہر نگار کی خواب گاہ کا ابھی پردہ ہی اٹھایا ہے۔

(۷) لے اور سب کچھ جانے دیجئے خیر خواہ سرکار کتنے بڑے ہیں کہ سولہ روپے سیر اور بیس روپے سیر چنیا چمن چھن بیچے جاتے ہیں۔ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ ان سے بڑھ کے مالگذار سرکار کا کوئی ہو تو لے۔

(۸) شیریں گفتار، شیریں کے عاشق زار۔ گھوڑے پر بھی سوار ہوں گے تو مٹھی پونی پسند۔ بھئی اب جی گھبرا گیا۔ لو جماہیاں آنے لگیں۔ سلاشہ مٹی ہو گیا۔ اچھا پھر کبھی بیان کریں گے۔ مصرعہ

تا کجا شرح کنم طاقت گویائی نیست

ذات شریف۔ آخ تھو دکھکھار کے اور گلا صاف کر کے ختم ہوئی بس رام کہانی۔ اس برتے پر تتا پانی۔ لے چلو ہٹو ہوا کھاؤ ہم اور تمہارے چھینٹوں میں آئیں۔ قدرت خدا کی۔ افیون وفیون تو نہیں ہاں

رباعی

در مذہب من اگر شوی بادہ پرست
بزانکہ بری بجانب افیوں دست!
نے مرد نہ زن، نہ مردہ و نے زندہ
نے خفتہ، نہ بیدار نہ ہشیار، نہ مست!

وکیل۔ (نہایت پیچ و تاب کھا کر) مصرعہ

ہم تو مرشد تھے، تم ولی نکلے!

ذات شریف۔ واللہ ہے، منہ سے تو بھولے بھالے معلوم ہوتے تھے، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ بھی بڑے ذات شریف ہیں۔ مصرعہ —— لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی۔

(اودھ پنچ۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۸ء)

ہو گیا زندگی سے جی بیزار

وقنا ربنّا عذاب النار

مرزا مجھو بیگ ستم ظریف

توبہ توبہ نلا پلاؤ روہائی نہائی جو تھائی۔ داد بیداد فریاد الغیاث وغیرہ وغیرہ۔ باینہمہ کان پکڑ کر اوٹھا بیٹھی بعد ملاحظہ نظر ثانی پھر توبہ کر
بند سے اس گندے روزگار سے۔ کیا کہیے اور کیا نہ کہیے۔ آج تک مع مبالغہ پونے پانچ کروڑ برس ہوئے اس عذاب النار کا مطلب
سمجھ کے بیچا پیچ میں نہیں آتا۔ بعضے عذاب النار کے یہی معنی بھاڑ چولھے کی آگ کہتے ہیں۔ بہتیرے ملا قل اعوذیے، نار، دوزخ جو ہمارے
معزز مولانا سے معزبی کے بقول یونہی سا ایک دوزخ پن کا ڈراوے دھمکاوے کا آلہ ہے۔ مان بیٹھے ہیں۔ اکثر پیٹو مر بھکے پیٹ کی
آگ یعنی بھوک پیاس کا عذاب سمجھے ہوئے ہیں، بعضے سپاہی پیشہ لڑنے مرنے، مورچہ میدان داری کے آدمی بندوق کی نلی سے تعبیر
کرتے ہیں۔ غرضکہ اپنے اپنے خیالی پلاؤ کون ایسا ہے جو نہیں پکاتا۔ خاص مطلب سچی بات وہی ہے جو ایک برگزیدہ، سن رسیدہ،
گرم و سرد چشیدہ پہنچے ہوئے اللہ والے بزرگ نے مرتے وقت چپکے سے کہی تھی کہ بھیا نار سے مراد عورت، یہی عذاب وہ ہے کہ
جس سے پناہ مانگنی چاہیے بلکہ پناہ بھی مانگے نہیں ملتی۔ غرض یہ کہ چھٹکارا ہی نہیں۔ بھاگے سے بھی جان نہیں بچ سکتی۔ اب ضرور ہوا
کہ میں تھوڑا تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں، پورا مرقع اتاروں تو کم سے کم کوئی سوا لاکھ جزو کی کتاب ہو۔ ان دو ایک چلتے پتے نشان کے
طور پر وہ بھی لب لباب کہہ دوں گا۔ ہاں سے اب بڑھیے کیا۔ (وقنا ربنا عذاب النار) اے حضرت پہلی قسم بڑھیا معاملہ چندہ جورو عاشقی
معشوقی کا درجہ، بیوی شمع پر جیسے پروانہ، میاں جیسے چاند کے گرد چکور، انہماک کے پینگ بڑھے ہوئے اخلاق میل جول ساری دنیا داری
کی باتیں، ات گت سانٹھ دنیاوی سب کام بند، میاں سب بے مصرف محض، گھر میں حوالات کا مزا، مجال کیا دالان کے باہر قدم نکالیں۔ دوست
آشنا حق ملاقاتی سب کو استعفا۔ نوکری چاکری کا تو ذکر ہی کیا بلا تشبیہ کفر کے کلمے سے بھی زیادہ بیوپار تجارت گھر کی چار دیواری میں
تو ممکن نہیں۔ بے دست غیب یا کیمیا بنانے کے کام کیونکر چلے، کھائیں کس کے گھر سے، اوقات بسری کیونکر ہو، لاکھ امیر سہی بیٹھے بیٹھے تو
کنوئیں خالی ہو جاتے ہیں۔ خرچوں پرچوں کو آئے تو کہاں سے آئے۔ گھر سے باہر جانا، سفر کرنا بغیر سارا ٹبر لادے کل اثاثہ ساتھ لیے
ممکن نہیں۔ پھر کچے بچے چینگا پوٹی ماما، اصیل دائی کھلائی آئے گئے ملا کے تین چار کروڑ آدمی اور ایک دوسرے سے ایسا متعلق
جیسے چہرے سے ناک۔ مصارف دن دونی رات چوگنی ماشاءاللہ ہونے والے کی آنکھوں میں خاک روز بروز ترقی پر روزمرہ میں [illegible]
کی کیفیت جو پایا جہاں سے جو کچھ ملا جھونک دیا آخر تابکجا۔ مجبوری کو ہاتھ پاؤں ہلانا چاہا۔ گھر سے باہر قدم نکالنا تھا کہ آفت آ گئی۔ بس
ہو چکا خوب دیکھا اب وہ ہماری بات کہاں صورت سے نفرت ہے۔ رسیاں تڑاتے ہیں۔ اسے صاحب وہ نہیں کہتے کہ

چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ، کون کس کا ہوا ہے ایک سی بات ذرا مشکل ہے۔ اب کی یہی کیفیت بہی نگاہ تھی۔ اسے مشکل کہتا کی قسم وہ آنکھ ہی نہیں۔ گھڑی بھر کو گھر میں آتے ہیں نورتیاں توڑ لیتے ہیں گنڈے تولا کرتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر باہر اٹھ جاؤں، کب نظر بچے کہ بھاگوں۔ توبہ ہے ہم سے تو نگوڑی کبوتری اچھی۔ جب دیکھو کبوترا اس کے گرد پھرتا ہے۔ چونچ سے کھینچا جاتا ہے، جوبن دیکھتا ہے، اور تو اور اپنے پیٹ کا دانہ اس کے منہ میں اُگل آپ بیچارہ بھوکا رہتا ہے۔ پھر یہ ایک پیالہ اخلاص ہی نہیں، بچے پالے تنکے چونچ میں اٹھا لا کے دسبے میں گھر بنائے، انڈے سیا کرے، بچوں کو پھرائے، کبوتری ذرا باہر نکلی اور غوں غوں یہ اپنی زبان میں بلاتا ہے۔ زبان تو ہے نہیں کہ کہے مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے بہن بہن سے بیٹھی رہو اور مزا یہ کہ وہ قطامہ اُدھر رُخ نہیں کرتی، بھاگتی ہے، دس دفعہ کی خوشامد درآمد میں ایک دفعہ شاید یہ بھی چونچ سے چونچ ملا دیتی ہے اور بڑی بڑائی اِدھر کی اُدھر اتراتی اتراتی دم لٹکائے تیرتی پھرتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کتنا مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب تم نے نواب سب کہیں کا آنا جانا اٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا۔ دن رات گھر میں کھونٹے سے لگے بیٹھے رہتے ہو، گھڑی بھر کو ٹانگیں سیدھی کر لیا کرو۔ اسی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا ٹل ٹل چلا کرتی ہے تو حضور فرماتے تھے کہ صاحب تمنو باہر تم جانہیں سکتیں اب تمہارے دیکھے بغیر چین کیونکر آئے۔ میں کہتا ہوں کہ گھڑی بھر میں تو میرا دل اُٹ جائے، نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے، کچھ بن پڑتا ہے۔ چلیے صاحب وہی ہم ہیں کہ پڑے مکھیاں مار رہے ہیں پورے نو بجے میاں سدھارے تھے یقین ہے بارہ بجنے کو آتے ہوں گے۔ اس بندۂ خدا نے پھر کر کروٹ ہی نہیں لی یہ بھی نہیں معلوم کہ مرتی ہے یا جیتی ہے اس پر کیا بنی اس نے کچھ کھایا پیا یا ہمارے انتظار میں یونہی بھوکی پیاسی کنڈا ہوتی ہے لگے آگ۔ سچ کہتے ہیں مردوے اور طوطے کی ایک ذات ہے۔ بیوی سے دید بے مروّت آج کے سوا لعنت اللہ ہے جوان کا رستہ دیکھے اور بھوکوں مرے۔ میں تو اپنے پیارے دیدوں کی قسم کل سے نو بجتے بجتے سویرے سے کھا پی مگن ہو کے بیٹھوں گی۔ پھر یہ بھی میری ناحق کی بات ہے مان نہ مان میں تیرا مہمان انھیں اس کی پرواہی کیا ہے وہ نہیں معلوم کہاں کہاں کون کون سی نعمتیں کھا کے مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوں گے۔ مگر آج تو ذوف ہے۔ ایسی باتوں پر یہ جب ہی تک ہے کہ دوسرا خیال نہ کرے جان کے انجان بنا رہے مجھے کیا آنکھوں سے دیکھے اور ٹال دے نہیں تو ذرا سے میں آدمی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ہے۔ دن کو تارے نظر آتے ہیں۔

عورت اگر ضد ہی پہ آجائے تو مردوے کو ناک چنے چبوا دے اور میرے ہاتھ میں وہ چڑیا دبی ہے کہ ابھی کہو تو کل ہی سے تگنی کا ناچ نچوا دوں، کچھ بنائے نہ بنے آنکھوں سے دیکھیں اور کرم کرم جلا کریں۔ ایک ادنیٰ سی بات کل سوار ہو کے باجی اماں کے بہانے سے چھوٹی پھوپی کے یہاں جاؤں اور پندرہ دن کا غوطہ ماروں، سواری پر سواری جائے اور خالی پھر آئے یوں ہی اکیلے بیٹھے مکھیاں مارا کریں۔ پھر آپ سے آپ دوتی تو یہ پھٹکار ہے میری باتوں پر اسے تو وہی سیدھی سمجھ کے ننھی بھولی باتیں کہنے لگی یہ نہیں جانتی کہ گھر والے کا ایک گھر تمھارے سو گھر۔ وہ تو خود اللہ خیر منا تے ہوں گے کہ کہیں یہ دفع دفعان ہو تو کھل کھیلوں، رات رات بھر غائب رہوں۔ نوج آگ لگے ایسے خاوند کو جورو کو کلیجے میں پیپ پڑ گئی آئے دن کی موئی سوختنی اس گھر داری کو لوکا سات چھپروں کا پھونس نگوڑی جان جلنے ہی کی ہو گئی۔ سب سے بڑی مصیبت جھوٹ ہو یا سچ اُلفت محبت کا نام ہی سہی اب بدگمانی بھی لازم و ملزوم بلکہ ضروریات شعر میں سے کہنا چاہیے۔ لیکن نہ اتنی بے تکی نفرت خیز کہ جس سے جی متلائے دل گھبرائے

ے آنے لگے، یہاں سیکھا سیکھ پڑوسن کی کہیں کسی دوست آشنا کے یہاں گئے لڑائی کا سر انکلا۔ حق ناحق کی تن لگو فسا قسمی ہو رہی
ہے۔ قرآن کتاب تسبیح کنٹھا ایک ہے شامت کی مار کسی دوست نے بلایا یا کہیں سے کوئی ملازم خدمت گار رقعہ لے کر آیا، چلیے
غضب ہوا تیوریاں بدل گئیں باچھیں پھڑکنے لگیں الٰہی شکر اِلٰہی شکر چلو اچھا ہوا یہ کوئی نئی ملاقاتی بڑے گھر سے دوست پیدا ہوئے
ن کا حکم اتنی دیر بھی گھر واسطے ہیں بیٹھنے کا نہیں۔ پھر تازی تازی دوستی ہے نا ملاقات کے معنی بھی یہی ہیں جب تک ملاقاتی دوسرے
کی ٹانگوں میں ٹانگیں ڈالے ایک جگہ نہ بیٹھا رہے وہ ملاقات ہی کیا۔ ہم نے تو یہی دیکھا سنا کہ جہاں کسی سے رسم و راہ دوستی آشنائی
ہوئی وہاں فوراً گھر بار تج دیا، جورو بچوں کو استعفا دے انہی کے دروازے پر دھونی رما بیٹھے، لکیر کے فقیر ہو گئے۔ اگلے وقت
کی وہ مثل سنی تھی کہ شادی مبارک نوکری ندارد یہاں الٹی گنگا بہی ہے دوستی مبارک گھر داری ندارد بلکہ جورو جاتا بال بچے سب برخاست
ااا اور پھوٹی انا ذرا جا کے ان آدمی صاحب سے اتنا تو پوچھ آ کہ بھائی کہاں بلایا ہے کیا کام ہے کچھ خیریت تو ہے بھلا اگر
تھوڑی سی دیر ہو جائے تو کچھ قباحت تو نہیں۔ خط چاہے کیسا ہی ضروری بلکہ دوسرے کسی شخص کا فقط یہاں کے پتے سے آیا
ہے پھر کچھ ہی کیوں نہ ہو بغیر کھولے اور پڑھ لیے چین کہاں سب سے بڑھ کے شامت کی مار اگر کہیں میرے پیارے دوست
(تہذیب حال کا فقرہ) یا جانِ من فدایت باد کسی بے اٹکل خانماں خراب نے لکھ دیا اور بملاحظہ اقدس بیوی صاحبہ معظمہ آیا تو زمین آسمان
کے قلابے مل گئے۔ بہت بڑی بڑی موٹی جلدوں کے قرآن سات سات نیچے اوپر رکھ کے اٹھتی ہیں کہ یہ خط کسی عورت کا ہے
(مُیں نام تو دیکھو۔ نام کو کیا دیکھیں اول تو بنا کے احمد محمود لکھ دیا دوسرے کیا مردانے نام رنڈیوں کے نہیں ہوتے ہیں صاحب
علی جان امیر صاحب وزیر صاحب پیارے صاحب حیدر صاحب ایک ہو تو کہا جائے۔ باقی جب قلم ہاتھ میں ہے تو گوہر خاں
یا خورشید کا صاحب خورشید حسن نہیں ہوتا بلکہ اس قوم کے تو یہی پیارے پیارے ننھے منے نام ہوتے ہیں۔ اب لڑائی کیا
لینے جانا ہے آٹھ آٹھ دن تک ہنڈیا چولھا اوندھا پڑا ہے۔ بہ ہزار دقت بڑی منت خوشامد سے جب سعی سفارش ہوئی تو اس
خانہ جنگی سے نجات ملی غرض کہ آئے دن کی تو تو میں میں۔ پھر ہانڈی کا سا اُبال ایک مورچہ ہو چکا تھا کہ دوسرا قلعہ دغنے لگا آج کیا
ہے دامن میں پیک کا دھبہ کیوں لگا ہے۔ کل یہ گلوریاں کہاں چبائی گئیں کہ ہونٹوں پر لکھوٹا جم گیا۔ بنی جان عطر کیوں نہ لگائے ہو
اب تو گلاب کیوڑے کے حوض میں غوطے لگتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی نہ کرے اور نہائے نہیں تو جوئیں بہنے لگیں۔ کپڑے گرمی میں
دوسرے دن نہ اتارو تو پسینے کی بو سے ناک سڑی جائے۔ پناہ بذاتِ خدا اب سنیے خدا اس لائے ریختی پر چکن پٹ بغیر
کہیں لگن لگے تو ہوئی نہیں۔ ماشاء اللہ جب دیکھو جیسے چوتھی چالے کی دلہن، پٹیاں بنتی ہیں، گلوری سے منہ کبھی خالی نہیں آئینہ
تو سامنے سے سرکتا ہی نہیں، بغلیں سونگھو کے تازے پھولوں کی خوشبو آتی ہے اور ابٹنا کہاں ملا گیا ماتیوں بھی بیٹھے بیٹھے یہ نواب
جوہر کھلتے جاتے ہیں۔ جناب امیر کی قسم میں اگر قرآن کا جامہ پہن کے آؤ تو نہ مانوں، کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ نیند کسی دن
شام سے آتی تھی کبھی دو دو بجے تک آنکھ نہیں لگتی۔ ٹھنڈی سانس اکثر اوقات بلا ضرورت بھی نکل جاتی ہے۔ شعر کا پڑھنا اور اس
کے مضامین کا مختلف ہونا کچھ اختیاری بات نہیں اور نہ کچھ ایسی قباحت ہے بھوک یہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک ہی رہے اور ایک
ہی وقت اشتہا ہوا کرے۔ سوتے میں آدمی بدخواب بھی ہوتا ہے، بڑاتا بھی ہے۔ مشکوک مزاج کو اکثر تھری پہ نالی کی چھینٹ سے
بھی بغیر نہائے چارہ نہیں، نماز پڑھے بڑے نمازیوں کی ایک کیا دو دو چار چار وقت کی قضا ہو جاتی ہے۔ آنکھیں مرد و زن مزاجوں کی

توہمیشہ اور بیوا عموماً گرمیوں کی فصل میں یا کسی گرم غذا کے کھانے سے سُرخ بھی ہو جاتی ہیں۔ رنج ملال انسان کو ہوا ہی کرتا ہے یکسی
طبیعت ہمیشہ رہتی نہیں، کبھی گدگدی میں آدمی رو دیتا ہے۔ کبھی چٹکیاں کھاتا ہے اور ٹھٹھے لگاتا ہے سوتے میں کروٹ کا اِدھر سے
اُدھر ہو جانا کوئی ایسے گناہ کی بات نہیں پھر سوا موا برابر مثل مشہور ہے مگر توبہ توبہ العظمت للہ جتنے سامان عوض کیے گئے
جملہ دفعات مندرجہ بالا ایک ایک کو تخمِ فساد کہنا چاہیے۔ اس میں سے جو تفصیلی ہے وہ ایسا دل بانجھتی ہے جس کی حد نہیں۔ وہ
الجھنیں ہوتی ہیں کہ مضمون کلیجے پر نشتر پڑا کرتے ہیں۔ محرم کی مجلسیں بلاقید کل فرقے سب قوموں میں ہوا چاہیں۔ پھر ایک شہر کی سکونت
اور کچھ نہ سہی تو خالی علیک سلیک صاحب سلامت ہی ہے بغیر شریک ہوئے بنتی نہیں۔ طوائف الفعل پر سب سے زیادہ محبت کا الزام
برقعہ حصّہ کیونکر نہ آسکے۔ اب اِدھر آدمی نے پکارا کہ ماما جی حقّہ لے جاؤ۔ بیوی آپا دی کے یہاں کی حاضری یا بی مشتری کے گھر کی
قفلی ہے اور قیامت قائم ہوئی۔ پیچ پیچ بیر ٹیڑھی کھیر ہو گئی۔ مجال کیا ٹاٹ کا پردہ نا نگھنے پائے۔ مزدوری دستوری چو معنی وار دنیا
تبرک کی درو شا ہونے لگی۔ سب سے بڑی اہم لڑائی پوری قلعہ بندی کوئی لونڈی باندی ماما اصیل پیش خدمت مغلانی اناری کہاری
ایک آدھ ہے کتنے سے درست سنون سے اتری ہوئی نہ ہوئی اور گھر کا مالک سمجھ کے کام کاج بھی ہک دبک کے کیا پھر کیا پوچھنا
لے بیرے بھائی کھڑے کھڑے شہر بدر تو نہیں گھر بدر کر دی گئی۔ اب کام کی تکلیف ہے تو بیزار کی نوک سے۔ ہزار روں ملاکھوں
قسموں پر تسکین نہیں، دشمنی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ غصّہ میں اگر کبھی کوئی امر خلاف مزاج زبان پر آگیا تو نوبت سے پانی بلند [illegible]
دلوا دینا اور قتل کرا دینا باقی رہ جاتا ہے۔ غرضکہ زندگی تلخ، بے بلا وزن۔ ابت چاہ پیار الفت محبت والا تھا۔ اب اختلاف مزاج
کا ذکر ہی کیا بقول شخصے ع

تم تو بیٹھے ہوئے پر آفت ہو　　　اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

البرٹ بل

منشی جوالا پرشاد برق

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خرمے بینم

لو سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک چھلاوہ تھا جو چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یکا یک بلائے آسمانی پھٹ پڑی۔ ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی۔ پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا۔ بچپن میں کیسی کیسی داشت کی۔ رات کو رات دن کو دن نہ سمجھا مگر دشمنوں کی نظر کھا گئی۔ سوتیلی ماں کے پلے پڑا۔ ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ ہماری امید دل کا خون ہو گیا۔

فوج اندوہ و الم ٹوٹ پڑی دھو کے ہیں
آرزوئیں ہوئیں سب قتل پڑا رن کیسا

کلیجہ دھک سے ہوا کیسی کچھ دل پر چوٹ لگی۔ رپن کا زمانہ۔ ہم تو خوشیاں مناتے بغلیں بجاتے مست پڑے ہوئے تھے آخر کو پالا ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔ مگر یکایک پردۂ غفلت جو آنکھوں سے اٹھا تو بھبھر ہو گیا۔ ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے عین موسم بہار میں ہمارا آشیانہ نوچ کھسوٹ کے پھینک دیا۔ "کم بخت کنکارڈٹ" نے منحوس شکل دکھائی۔ سخن سازوں نے ملکہ معظمہ کے پروکلیمیشن کے الفاظ میں نئے نئے معنی پہنا کے پیارے رپن کو مجبور کیا۔ وہ بھی برے پھنسے۔ کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا۔ ممبران کونسل کے نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔ آخرش وہ بھی انہی کے ساتھ سر ہلانے لگے۔

جا کر قفس میں عاشق صیاد ہو گیا — بلبل کا حال قابل فریاد ہو گیا
انصاف الٹے استرے سے مونڈا گیا — بغاوت نے نقارہ فتح کڑام دھڑام بجا دیا
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے — پیارے رپن کو ہم کیا کریں
بیش بالائی تو نازم چہ بصلح و چہ بجنگ — کہ بہر حال باندازۂ ناز آمدہ

اختیار ملا مگر برائے نام چوری کی پخ بلا کی طرح پیچھے لگی مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندو دشمنوں سے سبق تو کچھ کھ کے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اگر ہم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے۔ فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا۔ مگر یہ ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو سچے خیرخواہ سرکار ہیں۔ مگر ہائے سال بھر کی محنت کھاری کنوئیں میں ڈوب گئی۔ کیا کیا خیالی قلعے بنا بیٹھے تھے۔ مگر، کنگا رڈٹ ' کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔ جن پر ہمیں بھروسہ تھا، جو ہماری خیرخواہی کا دم بھرتے تھے وہی دسے گئے۔ وقت پر بغل کھڑے ہوئے۔ کاندھا ڈال دیا۔ گویا ہم بیچوں بیچ سمندر میں ایک ٹاپو پر اُتر رہے تھے۔ کھانا پکایا، دسترخوان بچھایا۔ جیسے ہی کھانے کو ہاتھ بڑھایا کہ دفعتاً جزیرہ ہلنے لگا اور دم کے دم میں سب غڑاپ سے سمندر میں۔ اوہ دھوکہ ہوا تھا۔ وہ جزیرہ نہ تھا وہیل مچھلی کی پشت تھی۔ خیر۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بہار

جوالا پرشاد برق

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی ‏— کس ناز سے ہے بہار آئی
کمسن - الھڑ - حسین - انیلی ‏— چڑھتی کی دولھن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن ‏— اوبھتی کوپل اوبھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر ‏— دھانی جوڑا اپنا پہن کر
گھونگھٹ اک ناز سے نکالے ‏— سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
ہریالی بنی وطن میں آئی ‏— اک سبز پری وطن میں آئی
اوتری گلشن میں جب سواری ‏— سورج نے آرتی اوتاری
گل نے زر گل کیا نچھاور ‏— صدقے ہوئی عندلیب اوڑ کر
شبنم بھر لائی کورے کورے ‏— شربت سے گلاب کے سکورے
خورشید نے آئینہ دکھایا ‏— کرنوں نے مورچھل ہلایا
نہریں ہر پھر کے لائیں پانی ‏— سبزے نے بچھایا فرش دھانی
خوشیاں اشجار نے منائیں ‏— میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لی بلائیں ‏— بلبل نے چہک کی دیں دعائیں
مرغان چمن نے گیت گائے ‏— ہر رنگ کے زمزمے سنائے
چڑیوں نے گا کے دل لبھایا ‏— موروں نے ناچ کر رجھایا
بدلی پھولوں نے اپنی وردی ‏— اودی - زنگاری - لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی ‏— کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی ‏— آئی آئی بہار آئی
سن گن جو ہیں فصل گل کی پائی ‏— سردی گھبرائی سٹ پٹائی

گردش سے دنوں کے بے خطر تھی
مطلق نہ بسنت کی خبر تھی

معزولی کی اپنی پاتے ہی چھاؤں
اوتر کو کھسک چلی دبے پاؤں

رنگ اوڑ گیا پہلے جو جما تھا
گھر مٹ گیا جو بنا ہوا تھا

بیچاری کی کوکھ اوجڑ گئی ہے
پالے پر اوس پڑ گئی ہے

کہرے پہ گھٹا ہے غم کی چھائی
بھرے پہ ہے پھوٹتی ہوائی

پھوٹی قسمت پہ روتی ہے برف
ہستی گھل گھل کے کھوتی ہے برف

رنگت ارض و سما کی بدلی
صورت سیرت ہوا کی بدلی

اطرافِ جہاں میں مچ گئی عید
پہونچا خطِ استوا پہ خورشید

چرخِ چارم پہ ہے نمایاں
فیاضِ زماں۔ مسیحِ دوراں

چلتی ہے ہوا اوسی کے دم سے
ہے نشو و نما اوسی کے دم سے

نیچر کو شعاعیں پالتی ہیں
ہر چیز میں جان ڈالتی ہیں

کرنوں نے گدی جڑوں میں گھس کر
پیدا کیے یہ نمو کے جوہر

شاخوں میں جڑوں سے چڑھ کے پہونچیں
دوڑیں پتوں میں بڑھ کے پہونچیں

سجنے لگیں باغ و بوستاں کو
رنگنے لگیں تختۂ جہاں کو

فیروزی صندلی۔ گلابی
خاکی۔ عنابی۔ سرخ۔ آبی

لاکھی۔ نارنجی۔ ارغوانی
طوسی۔ خشخاشی۔ آسمانی

کافوری۔ کاکریزی۔ لاہی
بادامی۔ سیاہ۔ زرد۔ کاہی

عباسی۔ پیازی۔ زعفرانی
ماشی۔ زنگاری سبز دھانی

ہر اک کا جدا ہے رنگ و روغن
پر سبز پہ ہے بلا کا جوبن

سایہ بھی ہے اس میں روشنی بھی
گرمی سے ملی گلی ہے سردی

سبزے کا ابھار کیوں نہ بھائے
ہر فصل بہار کیوں نہ بھائے

اور آنکھوں کو نور دینے والے
اور دل کو سرور دینے والے

کہساروں پہ تو ہی وہ ڈھایا
گلزاروں میں تو ہی لہلہایا

ساری خلقت ہری ہے تجھ سے
ہر چیز ہری بھری ہے تجھ سے

اللہ ری نمو کی کارسازی
بخشی گلشن کو روح تازی

بادِ سحری چلی جو سن سن
ابھرا ہر شاخِ گل کا جوبن

سینوں میں ہوئی اُمنگ پیدا
ننھی کلیاں ہوئیں ہویدا

چھیڑا جو صبا نے کسمسائیں — کچھ کچھ دبے ہونٹوں مسکرائیں
پھر گل پہ نسیم نے کھلایا — بڑھ کر پہلو میں گدگدایا
سب مارے ہنسی کے کھلکھلائیں — پھولے نہ وہ جامے میں سمائیں
باچھیں گئیں کھل خوشی کے مارے — دم پھول گیا ہنسی کے مارے
خوشبو در بچ دہن سے نکلی — اتراتی ہوئی چمن سے نکلی
کچھ ایسی دماغ میں سمائی — شاخ گل کو ہوا بتائی
اٹھلاتی ہوئی چلی ادا سے — چہلیں کرتی ہوئی ہوا سے
گھوڑے پہ سوار تھی ہوا کے — جھونکے گئے بن اوڑن کھٹولے
ہر موج نسیم تھی معنبر — خوشبو سے جہان ہوا معطر
پیارا پیارا آسماں جو دیکھا — خلقت کو شادماں جو دیکھا
گھر سے اپنے کسان نکلے — بوڑھے بالے جوان نکلے
تاروں کی چھاؤں منہ اندھیرے — کھیتوں میں پہونچ گئے سویرے
کوڑی جوتی زمیں کمائی — نیچے کی زمیں اوپر آئی ۔
بو جوت کے بیڑیاں لگائیں — کچھ لوگوں نے چرخیاں لگائیں
پر سے پانی کسی نے کھینچا — بعضوں نے ڈھیکلی سے سینچا
برہا کوئی سنبھالتا ہے — نالی کوئی نکالتا ہے
رل مل کے دہاتنیں ہیں گاتی — کھرپی لیے کھیت میں نراتی
کھیتی پہ نثار ہونے والے — وہ جوتنے والے بونے والے
فارغ ہوئے آج جوت بو کر — پلٹے گھر ہاتھ پاؤں دھو کر
پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ — جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ
اس کام سے گو ہوئے وہ آزاد — اب فکر ہے فصل ہو نہ برباد
آفت سے اوسے خدا بچائے — امید پہ پانی پھر نہ جائے
بے چین ہیں سخت ہے تردد — ہر دم کمبخت ہے تردد
دھڑکا ہے بڑا پڑے نہ افتاد — کھٹکا ہے ہوا کرے نہ برباد
دل میں ہیں یہ وسوسے سمائے — گردی گیہوں میں لگ نہ جائے
پتھر نہ پڑیں کہ کھیت ہوں گرد — پالا نہ پڑے کہ پیڑ ہوں زرد
پچھوا سے نہ ساری فصل کھو جائے — گیہوں پتلا نہ گر کے ہو جائے

پیڑوں پہ ٹڈیاں نہ چھا جائیں
ہر سے گو رو نہ کھیت کھا جائیں

چوہوں کے کاٹنے کا ڈر ہے
دیمک کے چاٹنے کا ڈر ہے

کھیتوں میں بیج سڑ نہ جائے
کھیتی پہ اوس پڑ نہ جائے

دل ٹوٹ گیا پھٹے جو بادل
جی چھوٹ گیا ہٹے جو بادل

پالا جو پڑا تو دل ہوا سرد
سرسوں نہ جمی تو منہ ہوا زرد

خورشید حمل سے ہو ہویدا
نیچر میں کرا امتزاج پیدا

برہم نہ مزاج آب و گل ہو
حدت کرنوں کی معتدل ہو

بادل برسا دے ابر نیساں
دانے موتی سے رولے دہقان

شبنم بدھ جا تو ڈالیوں میں
موتی سے پرو دے بالیوں میں

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آویں
اودی اودی گھٹائیں چھاویں

گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ
اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ

دنیا کا رفیق تو ہے دہقان
عالم کا شفیق تو ہے دہقان

مفلس، قلاش، بھوکے محتاج
زردار، امیر، صاحب تاج

سب کا تو نے ہے پیٹ پالا
تیرا ہو جہان میں بول بالا

تیری فیاضیاں ہیں مشہور
کیونکر نہ ہو تجھ پہ ہند مغرور

یارب برسائے ابر رحمت
لگ جائے ٹھکانے اس کی محنت

نیت میں ہو پھل جناب باری
محنت ہو سوپھل جناب باری

ٹھنڈے جھونکے چلیں خدایا
شاخیں پھولیں پھلیں خدایا

ہاں جوشِ نمو بڑھے الٰہی
یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی

پودے جو نہال ہوں تو بن جائے
دہقان خوش حال ہوں تو بن جائے

اے ابر کنوں بہ جوش در آ
اے رحمت حق بہ جوش در آ

گاڑھی ہے کسان کی کمائی
باشد کہ برو کرم نمائی

دکھلایا دعا نے یہ نتیجا
آہوں سے فلک کا دل پسیجا

نکلا تیزی سے مہر انور
حدت سے بھڑک اٹھا سمندر

کرنوں کی ادھر بڑھی شرارت
پانی کی ادھر بڑھی حرارت

قلزم کی بدن میں لگ گئی آگ
منہ پر غصے سے آ گیا جھاگ

اک جوش میں آیا بحر ذخار
دل بادلوں کے چڑھے دھواں دھار

چھایا بڑھ کے فلک پہ مارا
چھانٹا دل کا بخار سارا

خورشید کو بادلوں نے گھیرا
عالم میں چھا گیا اندھیرا

کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر
چلنے لگی بن کے باد صرصر

بادل ڈرتے ہوا سے بھاگے
باتیں کرتے ہوا سے بھاگے

میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ
کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ

ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پر
جھلا کے برس پڑے وہیں پر

اونچی نیچی پہاڑیوں پر
دھاریں گرتی ہیں لڑکھڑا کر

چشمے کہیں زور کر رہے ہیں
نالے کہیں شور کر رہے ہیں

نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں
لہریں موجیں اڑا رہی ہیں

سبزے سے ہرا ہے دامن کوہ
پھولوں سے بھرا ہے دامن کوہ

تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی
گملا پھولوں کا یا کہ جھاڑی

سبزے کا پہاڑ پر ہے انداز
جیسے چہرے پہ سبزہ آغاز

گھاٹی پھولوں سے رشک گلزار
دانتی پہ درخت سلسلہ وار

معشوقہ سبز رنگ ہے گھاس
ہر پھول میں ہے دولھن کی بو باس

بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر
بندھن واری بندھی ہے در پر

چرتے ہیں ہرن پرے جمائے
پھرتے ہیں کنوتیاں اٹھائے

مستی میں کلیلیں کر رہے ہیں
میداں میں طرارے بھر رہے ہیں

کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں زاہد
دنیا بھولی ہوئی خدا یاد

چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے
اللہ سے اپنے لو لگائے

جل پیتے ہیں کھا کے جنگلی پھل
جنگل میں منا رہے ہیں منگل

پھل پھول پہ کرتے ہیں قناعت
تنہائی میں کرتے ہیں عبادت

صانع کی دیکھتے ہیں صنعت
اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت

ہر شے سے عیاں ہے نور اوس کا
ہر رنگ میں ہے ظہور اوس کا

افلاک و زمین ۔ نجوم و حیواں
دیہات اور نبات ۔ جن و انساں

جھیلیں ۔ دریا ۔ پہاڑ ۔ چشمے
اوس کی قدرت کے ہیں کرشمے

مرغان چمن شجروں میں گاؤ
توحید کے زمزمے سناؤ

نہرو پھر پھر کے ہو عبادت
جھرنو گر گر کے ہو عبادت

سر سجدے کو خم کرا دو شمر تو
جھک جاؤ شاخ بارور تو

مرغانِ چمن چہک اٹھو تم
گلہائے چمن مہک اٹھو تم

بلبل کی زباں پہ قال آئے
پتی پتی کو حال آئے

قدرت کے ہتھکنڈے ہیں نرالے
دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے

تازہ کیا جسم و جاں کو اوس نے
سرسبز کیا جہان کو اوس نے

ہے رشکِ جناں ہر ایک گلشن
ہر پیڑ پہ ہے بلا کا جوبن

رک رک کے نسیم چل رہی ہے
سبزے پہ ہوا مچل رہی ہے

گیہوں کے کھیت دھانی دھانی
تختے سرسوں کے زعفرانی

ایسی کھیتوں میں کچھ تو اودی
کچھ سرمئی اور کچھ کبودی

ٹیسو سے ہے لال لال جنگل
منہ پہ ہے ملے گلال جنگل

آتے ہی بسنت مدہ پہ آئیں
شاخیں آموں کی بور لائیں

کوئل کو کی تو آئے بادل
سر پر گلشن کے چھائے بادل

اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے
نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے

شکلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی
زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی

سحر انکھڑیوں میں زباں میں جادو
نظروں میں فسوں بیاں میں جادو

مستانی ادا۔ نشیلی۔ آنکھیں
تیکھی چتون۔ رسیلی آنکھیں

بانکی وہ چھب وہ ترچھی چتون
شوخی۔ طراری۔ چلبلاپن

جو ہے وہی کھیلتی ہے ہنس کر
اک ایک ٹھیلتی ہے ہنس کر

انداز سے آ رہی ہے کوئی
منہ پھیر کے جا رہی ہے کوئی

ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتنی
جوڑا پہنے ہوئے بسنتی

کوئی کرتی ہے چھیڑ خانی
دکھلا کے کسی کو کچھ نشانی

کوئی پڑی آہ کر رہی ہے
کوئی کھڑی واہ کر رہی ہے

کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں
آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں

کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں
رل مل کے بسنت گا رہی ہیں

دنیا تو بہار سے ہے مسرور
ہے برق کا سوز دل بدستور

واں دشت و چمن ہرے ہوئے ہیں
یاں داغ کہن ہرے ہوئے ہیں

گل بے رخِ یار خوش نباشد
بے یار بہار خوش نباشد

کیا یہی ہے لن ترانی آپ کی
دیکھ لی بس خوش بیانی آپ کی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ہم :- اودھ پنچ ہیں؛ ذرا ادھر تو آؤ۔ تمہیں واللہ ایک بات سُنتے جاؤ۔ خدا کی قسم وہ لطیفہ سناؤں کہ ہنستے ہنستے لوٹ کبوتر ہو جائیے۔

اودھ پنچ :- تو بھئی ہم بے سُنے ہی کھلکھلا کے ہنسے دیتے ہیں (ہا ہا ہا۔ خ خ خ خ خ)

ہم :- یار اس کی سند نہیں۔ آخر عجلت کیا ہے۔

اودھ پنچ :- واہ وا۔ عجلت کیا ہے! اور سنئے صاحب۔ زار روس کا حال سُنتا ہے پرنس بسمارک کی ملاقات کرتا ہے۔ ڈزیلی صاحب کی خبر لاتی ہے۔ رومیوں کی خیر منانی ہے۔ کیا آپ کی طرح لونڈے پڑھاتے ہیں۔

ہم :- واللہ۔ کیا کہی ہے۔ لانا ہاتھ۔ کیوں پیچ کتنا کس چلکے سے ہاتھ لیا ہے۔ کیا سر دست سوجھی ہے۔ ورنہ تم ہاتھ نہ لگتے۔

اودھ پنچ :- اے لاحول۔ ہاتھ وے کے ہم نے یہ پھل پایا۔ اچھا کہو کیا کہتے ہو؟

ہم :- ایک ضلع میں ایک بیدم کے ولایتی کا بیٹھے بیٹھے شوق چرایا کہ اردو پڑھیں۔ سوچے کہ ہرشل نے علم ہیئات میں اپنی تخلیق انیق کا سکہ بٹھا دیا۔ نیوٹن نے ریاضی میں کوس لمن الملک بجایا۔ کلمبس نے دنیائے عتیق کا پتہ لگایا۔ آؤ ہم اردو کے پڑھنے میں ایسی بات ایجاد کریں کہ شیطان سے زیادہ مشہور ہو جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ بہت دور کی سوجھی۔ سمجھے کہ الف بے تے بیٹھے بیٹھے کون رٹے۔ یہ پرانا فیشن ہے۔ آؤ پہلے گالیاں سیکھیں۔ اس سے دو فائدے بہ یک کرشمہ دو کار۔ ایک تو گالیاں سیکھ جائیں گے زباں دان کہلائیں گے۔ دوسرے ہم ولائتی آدمی ملنیٹریوں پر بڑھ بڑھ کے منہ لگائیں گے۔ اونہیں کی زبان میں اونکو صلواتیں سنائیں گے۔

اودھ پنچ :- بارک اللہ۔ ولائتی اور لنڈی کی ایک ہی ہوئی۔

ہم :- خیر صاحب۔ یہ سوچ کر حضرت نے ایک مولوی نما کو بلایا۔ اور اپنا مافی الضمیر کہہ سُنایا۔ وہ بے چارے چکرائے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ صاحب گالیاں سکھانا ہمارا کام نہیں۔ فرخ آباد جائیے۔ پیر بجھڑی کی بیعت کیجئے۔ یا بھٹیاریوں سے قارورہ گرائیے۔ یہیں آزاد فرمائیے۔ ایسی لڑکری سے ہم درگزرے۔ صاحب بہادر بہت بگڑے۔ سیدھے سے ٹیڑھے اور میٹھے سے اوندھے ہو گئے (عقل کے اوندھے) طیش کھا کر فرمایا کہ دل میں افسوس آتا ہے۔ ہم گالیاں نہیں جانتا ورنہ ہم (ورنہ) سب کے پہلے ہم تم کو گالی دیتا۔ آخوں جی (گنجے کو خدا

پنجے نہیں دیتا) کہتے ہوئے اس بیدُم کے یہاں سے دُوک دم بھاگے۔ صاحب بہادر اس مولوی کو کوڑ مغز سمجھا اور کسی پہلے الدولہ خش ملک سے میر مجلس گالیاں لکھوا لائے۔ ایک دن کا تذکرہ سُنیئے ذرا دو زانو ہو بیٹھئے۔ صاحب بہادر ایک مرتبہ موضع حماقت پور پرگنہ خرآباد میں تشریف لے گئے۔ رات کو دس بجے جب اپنے کام سے فراغت پائی تو یاد الٰہی کے عوض گالیاں یاد آئیں۔ فوراً بآواز بلند گالیاں یاد کرنے لگے۔ خانساماں خیمے سے دور تھا۔ سئیں سے پوچھا۔ کاہے ہو گپوا یو مُرگا سار آج بے برکت (بے وقت) کاہے بتا چلائے ہے اوسنے گھبرا کر کہا (چپائی مار چپائی مار۔ یو مُرگا نا ہیں۔ صاحب کچھ پڑھت ہیں) خانساماں فوراً خیمے کے پاس گیا۔ ہاہاہا۔ یہ صاحب کو کیا گیا۔ ابھی تو اچھے بھلے چنگے تھے۔ گرمی چڑھ گئی یا پاگل ہو گئے۔ چق اٹھا کر اندر گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ صاحب لہرا لہرا کر گا رہے ہیں۔ مگر بے وقت کی شہنائی۔ نئے دھن میں سر دُھن رہے ہیں:-

سور کا بچہ - مرغی والا

حرام زادہ - کتیں کا سالا

ا۔ سبحان اللہ۔ کیا موزونئ طبع ہے۔ یہاں بھی قافیے کا قافیہ تنگ کیا۔

خانساماں :- صاحب یہ آپ ہی آپ کس کو گالیاں دے رہے ہیں۔

صاحب :- ول ہاگ جاؤ۔ آج ہمارا پہلا سبق ہے۔

بجا ہے پیر و مرشد۔ دوسرا سبق اس دن ہوگا جب حضور کی چپت گاہ سے پٹے پر تیغ کئے جائیں گے۔ فصد کھولی جائے گی۔ توگویا سب کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔ اور فاضل حضور تب ہی ہوں گے جب پاگل خانے میں زنجیر کھڑکھڑائیں گے۔ آپ کا علم دنیا سے نرالا ہے کہ بسم اللہ ہی سے لوہے کے چنے چبواتا ہے۔

ا۔ قہ قہ قہ۔ بھئی قہ قہ قہ اچھی بٹ

بحمد اللہ کہ یہ ولایتی صاحب کسی ضلع کے مجسٹریٹ یا جج نہیں۔ ورنہ عدل و انصاف برخوب، گالیوں کا چھرا چلتا ہے۔ ہم کہتے آم دہ کھٹے املی۔ سرکار نے یہ اچھی قید کر دی کہ حکام یورپین جب تک اردو کا امتحان نہ دے لیں ترقی نہ پا سکیں۔

اودھ پنچ ۱۴ اگست ۱۸۷۷ء

سرشار

طالبِ نظارہ ام پردہ برافگن ز رخ
پیش صفِ راستاں شعبدہ بازی مکن

ایک پُرفضا اور فرحت افزا باغ میں ایک رند شاہد باز پھٹے رنگ ڈلیاں منا رہے تھے۔ اردگرد گلرخانِ سیم بدن خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ اور احباب بذلہ سنج مرغانِ مرغ بلبلِ ہزار داستاں کی طرح چہچہا رہے تھے کہ دفعتاً مجمعِ احباب سے ایک خوش ادا اور خوش گلو نے بڑی سریلی اور رسیلی آواز سے تان لگانی شروع کی کہ

تنی جھانکی جھونکی لائیو مورے بارے بلم

واہ جو جو۔ میاں شوری کی روح اس وقت وجد کر رہی ہوگی۔ واہ اوستاد کیا کہنے ہیں۔ ہاں ذرا اونچے سروں میں۔ واللہ کیا گلے بازی ہے۔ یہ گلا ہے یا سورداس کا چٹکارہ۔ اس کے بعد حضرت کھلے بند کا ولریا مضمون آویزۂ گوشِ سامعین ہوا۔ ہم بھی نظر سے اوجھل بیٹھے تھے جیسے بوئے گل یا سرور درگل یا نسیمِ نوبہار یا شمیمِ طرۂ مشکبار۔ ہم نے اس دلکش مضمون کو اپنے مذاق کے موافق پاکر غلغلۂ واہ واہ بلند کیا۔ واہ بھئی کھلے بند تم تو چھپے رستم نکلے۔ بیس خط کے ذریعے سے اپنے نام نہیں بتا دیئے۔ لیکن حضرت ڈبل بیرنگ نہ بھیجئے گا کہ اس تنگی میں آٹا گیلا ہو جائے۔

ہندوستان کی شادی جیسے گوڑیا گڈے کا بیاہ۔ اے سبحان اللہ۔ دولہن جالندھر میں دولہا پشاور میں اور جوڑی بھر گئی۔ مرد کارم نگر میں، عورت ٹوپ شہر میں اور نکاح ہو گیا۔ ع

خانۂ ملاح در چین است وکشتی در فرنگ

دو سن بیچاری کی کیا طاقت کہ زبان تو ہلا سکے۔ راضی برضا۔ ماں باپ نے جس کے ساتھ چاہا بیاہ دیا۔ جس کنوئیں میں چاہا دھکیل دیا۔

لکھنؤ میں ایک باوضع خوش باش شریف عالی خاندان، معالی دودمان خواجہ صاحب کی دختر پری پیکر سب نام خدا سیانی ہوئی تو بڑے اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے۔ آخر ایک رئیس نجیب الطرفین، شریف الجانبین کے صاحبزادے سے نسبت قرار پائی۔ خواجہ صاحب کی دختر رشکِ قمر، چندے آفتاب چندے مہتاب ؎

اگر دیدے رُخِ آں حور پیکر ۔۔۔ خلیلِ بت شکن بگشت آذر

نوعمر نوخیز ہمجولیاں چہل کرنے لگیں۔ اے بہن مبارک۔ اللہ کرے کہیں جلد دروازے پر شہنائی بجے۔ شبر گھڑی سسرال جاؤ۔ ہم نے بھی اڑتی سی خبر پائی ہے۔

وہ مسکراویں،

تو لجاتی کیوں ہو۔ اللہ سب کو یہ دن نصیب کرے۔ ہم تو آج حضرت عباس کی حاضری کریں گے۔ بہن! خاتونِ جنت کی قسم! تمہارے

میاں تو صورت دیکھنے کے لائق ہیں۔ ابھی نام خدا مسیں بھیگی ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔
دولہن بیچاری شرمائی جاتی تھی۔ کسی کو ہنسی ہنسی میں ٹھڑ کنا۔ کسی کو جھڑکنا۔ مٹو بھی۔ اللہ سوں بھی یہ دل لگی نہیں بھاتی۔ مگر دل ہی دل میں ہنسی
جاتی تھیں۔ غرض کہ خدا خدا کرکے کہیں شادی ہوئی۔ جب چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا تو مشاطگان چابک دست نے اس مہ لقا کو سولہ سنگار کرکے
بہ ادائے حمیدہ کمرے میں بھیجا۔ شوہر نے ـ

برقع ز عارض بر فگن یک صبحدم تا جاوداں
گرد و فراش صبح را خورشید تاباں در بغل

کہتے ہوئے نقاب زریں جو اٹھایا تو نور کا بکہ نظر آیا۔ نگاہ پھسلی جاتی تھی۔ دولہن نے جو دزدیدہ نگاہ حضرت پر نظر ڈالی تو اللہ ہی اللہ۔ ادھر دولہن
کا وہ نور عالم افروز، ادھر میاں کا سے عبوجنگا شکل کے روز، اور ادھر طبیعت بشاش، ادھر سینہ پاش پاش، ادھر چہرہ گلنار، ادھر آنکھیں اشک بار
ادھر سینہ باغ باغ، ادھر کلیجے پر داغ۔ ادھر عرش بریں پر دماغ، ادھر خوشا بہ دل در ایاغ۔ ادھر ترانہ خوشی و ظیفہ زبان، ادھر آہ و فغاں۔ طوطی را
بازاغ ہم قفس کردند۔

بے ہیئے چاند کو گہن لگ گیا۔ شاخ صندلی پر مار سیہ کا قبضہ ہوا۔ ہائے اگر ایجاب و قبول کا نحو جاری ہوتا تو کس مزے سے دولہا دولہن
میں گذرتی۔ اور طرہ یہ کہ بیوی پڑھی لکھی، تربیت یافتہ، خوش فکر، نکتہ سنج۔ میاں مڈک باز، بد قطع، بد وضع، لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔ العت اللہ بے برکت
سے تو بڑا، نہ خیر صلاح۔

یا حضرت! ذرا غور تو کیجئے، یہ شادی ہے یا رنج و الم کی خانہ آبادی۔ دولہا دولہن کی رضامندی مقدم ہے۔ یہ نہیں کہ والدین نے جہاں جی
کے کھونٹے باندھ دیا۔ روز رنج و الم کی افزائش۔ تمام عمر کی کاہش۔ بات بات میں تکرار۔ آئے دن ہوتی پیزار۔ ایسی شادی پر خدا کی سنوار۔
جی ہاں یہ تو ہم نے بھی سُنا ہے کہ یورپ میں کبھی کبھی بڑا کڑا امتحان لیا جاتا ہے۔ بھیا یہ تو اس حال میں کہ جب ہم ان کی سی بے تکلفی
پر اصرار کریں اور اچھا اگر اس بھاڑ کی جھونکی میں کبھی ننگ و ناموس کا خیال نہیں رہتا تو خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کیجئے۔ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی
کیوں دیجئے۔ چلئے فراغت ہوئی۔ ہمارا مطلب حاصل۔ اور یہ تو بات ہی نرالی ہے کہ گندہ بروزہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ۔

اودھ پنچ، ۱۲ مارچ ۱۸۸۳ء

جنگی پتنگ کا میدان

کیوں آکا اودھ پنچ! کبھی جنگی پتنگ بھی لڑائے ہیں؟
یہ جنگی پتنگ کیسے؟ گُل، دوپنا، ڈیرہ گنا، خربوزیا، شطرنجیا، جھنڈی دار، طوتیا، مانگ دار، بھیڑیا، بگلا، دو پاٹے سنتے تھے۔ یہ
جنگی پتنگ کہاں ایجاد ہوئے؟
اسے میاں! [illegible] سردیانے بیٹھے بٹھائے یہ گُل کھلایا کہ سلطان روم سے جنگی کنکوؤں کا میدان بد دیا۔ اس تکلی کا تو کیا پتا تھا کہ

...سلطنت رفعیہ سے ٹکر لڑتا۔ مگر روسیوں کی شہ جو پائی تو جنگ پر چڑھ گیا۔ مدد مانگ کر بل کرنے لگا۔ ترکی فوج نے دم کے دم میں اس کی ... کردی۔ ایسا چتایا کہ پتا توڑ، میدان چھوڑ، رشتۂ شجاعت توڑ، حیثیت سے تاتا جوڑ نوک دم بھاگا۔ وہ کاٹا نگر کاٹے جانے والا پتنگ ... جانے۔ روس نے جو دیکھا کہ پالا روم کے ہاتھ ہے تو بھگوڑے کا ہاتھ بٹا لیا۔ فوراً پیچ چلا۔ عیسائی سلطنتوں کے آزاد کرانے کے حیلہ ... سے میدان بدلیا اور میدان کارزار میں دوڑ پڑا۔ اوچکا اور منہ کے بل گرا۔ گرا اور پھر سنبھلا اور پھر بڑھا۔ بڑھا اور پھر گھٹا۔ گھٹا اور پھر ... پٹا۔ پٹا اور پھر ڈٹا۔ اب تو ایسا جم گیا کہ خدا ہی ہٹائے تو ہٹے۔ طرفین سے خوب خوب جوڑیں جھکیں۔ بڑے بڑے جنادری پتنگ باز ... گھسیٹ میں خوب مشاق ہیں۔ اپنے گھر سے چھپکا ہینے پر سے اس زناٹے سے کھینچ گئے کہ عرفشانی کا پتنگ کھٹ سے الگ ... کتنے نمٹ گئے تو خالی ڈور ہاتھ میں۔ لنگڑا ہوا ہو گیا۔ ارے کر کے رہ گئے۔ روسی لنڈورا لڑانے میں طاق ہیں۔ چپ چپ راست ... جاتے ہیں اور غنیم کے میدان میں جا کر پیچ لڑاتے ہیں۔ دونوں نے خوب خوب پیچ کاٹے۔ مگر روسیوں نے آج کل ... تھوڑے دنوں سے کچھ ایسی ہوا بندی ہے کہ ترکوں کی جیت کا چراغ گل ہو گیا۔ مگر چہ بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ می شود ... روس کی طرف ہو رہے مگر انگلستان نے للکارا کہ کیوں بچارے بھلا۔ پٹا ہے۔ پیٹا۔ جرمنی اور آسٹریا بھی روس کی شراکت کر کے ... کے چھکے چھڑانے پر آمادہ تھے۔ لیکن پیٹے کے خیال سے چپ ہو رہے۔ بحری میدان میں بھی خوب ماہی جال پھیلے۔ کبھی انہوں ... انہوں نے دیکھیں پالاکس کے ہاتھ رہتا ہے۔

اودھ پنچ ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء

لکھیم پور کھیری

لکھیم پور کھیری کے شمال کی جانب کے مشرق کے مغرب کے دائیں کونے کے بائیں طرف ایک بڑا لق و دق جنگل ہے کھیری۔
... عرصۂ دراز سے محکمۂ آبکاری کے ٹم میں پڑے تھے۔ شوق چرایا کہ شکار کھیلیں۔ عجب جنگل میں ہو رہے۔ جھٹپٹے وقت کسی ٹکائی کا بھائی پانچے ... ہاتھ میں دبائے۔ نکے دار ٹوپی سر پر جمائے۔ چلم لٹکائے سامنے سے آ رہا تھا۔ صاحب بہادر نے پوچھا ول تم کون؟ حضور بیر شکار ... ساتھ چلے ہم کو شکار کھلاؤ۔ خداوند یہاں جنگل میں کیا شکار کھیلئے گا۔ ول اسی جھاڑی میں۔ واہ حضور اس میں تو کانٹے چبھیں گے ... معشوق کو ڈھونڈیے جو بیریوں میں چھپ رہے تھے۔ نڑکا ہونے دیجئے۔ گجر دم ایک سے ایک قبول صورت — لیجئے مگر اس ... شام ہونے کو آئی ہے۔ مجھے تین کوس اور چلنا ہے۔ سلام۔ ول سلام نہیں نہیں۔ تم بولا کہ یہاں سے تین کوس چپتا ہے۔ ہم چلنا ... تب تو چپراسی نے بڑھ کر کہا کہ حجور یہ سار بیر سکار پتریا کا بھائی ہے۔ صاحب مسکرا دیئے۔ اتنے میں ر۔ن لکھنوی جو جنگل جنگل ... پھرتے ہیں عین وقت پر پہنچ گئے۔ نوٹ بک کے جال میں پنسل کے لاسے سے اس خبر کو ایسا پھانسا کہ جکڑ گئی نذر ہے۔

رتن ناتھ لکھنوی۔ اودھ پنچ ... نومبر ۱۸۷۷ء

کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی
خوشامد سب کے رب کہتے ہیں جس سے جیسی بن آئی

اکبر الہ آبادی

ہٹو۔ بچو۔ سنبھل بیٹھو۔ جگہ دو۔ ہم آتے ہیں۔ ہم آتے ہیں۔

ہاں۔ ہاں۔ یا اللہ! اے حضرت آپ ہیں کون!

ایں! ہم ہیں کون؟ ہم ہیں۔ ہم!

توبہ! ارے میاں خدا کے لئے کچھ کہو گے بھی آخر ہو کون! بتا ہی دیں۔ ہم ہیں۔ خیال ولد دماغ ولد نیچر ولد قل ہو اللہ احد اللہ الصمد ...... الی آخرہ۔

واہ وا۔ واہ وا۔ یہ تو آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا نسب نامہ بھی پڑھ سنایا۔ یہ تو فرمایئے یہاں نہ کوئی کمیٹی نہ سوسائٹی نہ لکچر نہ آرٹکل۔ نہ چندہ نہ لاٹری۔ آپ زور شور سے جو تشریف لائے ہیں اس کا کیا باعث؟

آہا ہا ہا۔ اس کا باعث کچھ نہ پوچھئے ؎

چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے!
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

ادھر اودی اودی بدلیاں، نیلم پری بنی ہوئی بحر ہند سے آ رہی ہیں ادھر ہری ہری پتیاں معشوق سبز پوش کی طرح اپنا جوبن دکھا رہی ہیں۔ آپ جلیئے۔ ہم ایک جوہر مجرد۔ کلیل میں آ گئے۔ کمیٹی چھوڑ محفل رنداں میں آ نکلے۔

جناب یہ سب سہی مگر کچھ بات اور بھی ہے ورنہ ؎

ایک سے ایک ہے تماشا رنگ
دیدنی ہے جہاں رنگا رنگ

ہزار رنگ بدلے کبھی آپ نہا نخانۂ دماغ سے نہ نکلے۔ اب کیا تھا کہ آپ نے اس دھوم دھام سے پر پرواز کھولے ہیں؟

سچ بتا دوں؟

مناسب تو یہی ہے!

بھئی سچ تو یہ ہے اللہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بغیر کہے اول درجہ کا صدر اعلیٰ کر دے (ولایتی معنی صدر اعلیٰ کے مراد ہیں۔

۔۔ نہیں کر بیٹا گریا مرثیہ خوان اور بگڑا وکیل صدر اعلیٰ) ایکٹ پابندی اخبارات کی ترمیم کی کس عمدگی سے رائے دی ہے کہ جی پھڑک گیا۔ پھنے تو ہم کو جلا دیا۔ میرے حق میں تو مسیحائی کی۔ سقف دماغ میں سوکھے مکڑی کی طرح ہزار جال پھیلاتا تھا مگر ایک مگس مضمون ہاتھ نہ لگی۔ اب تو وہ خرمگس میں پھنسا دُس کہ ہزار قحط پڑے میرے راتب میں خلل نہ پڑے۔ اس وقت طبیعت ایسی حاضر ہے کہ جو کچھ فرمایئے بے تکلف موزوں کر دوں۔

اگر یہ ہے تو اپنی سرکار ابد قرار کی شان میں ایک رباعی دعائیہ کتنا ضرور ہے۔

بہت خوب۔ اے حضرت! یہ تو خود ہمارا فرض ہے بغیر اس مضمون ہاتھ آیا ہے تو ادائے شکر واجب ہے۔ چھاپیئے۔

پہلا وزن

قیصرِ ہند کو اللہ سلامت رکھے | دشمنوں کو بہ دفتر سلامت رکھے
حاسدوں کو غم و حسرت کی نشانی کر دے | پیچ کو عشرت و راحت کی علامت رکھے

آمین۔ آمین۔ آمین۔

اے سبحان اللہ! خوب ارشاد کیا ہے۔ مجرد کے واسطے علامت کس قدر موزوں ہے۔

آداب بجا لاتا ہوں۔ بندگیاں اچھالتا ہوں۔

کیا خوب آداب نہ ہوا دولتیاں ہوئیں
جی یہ تو سہن طبع کی رعایت ہے

اچھا یہ بندگیوں کا اچھالنا چہ معنی دارد۔ بندگیاں نہ ہوئیں۔ میخوار کی پگڑی ہوئی۔

جی یہ بارہ مضمون کی مناسبت ہے۔

طفیل میں تو آپ ہی ہیں۔ بھلا جواب دینے میں کب رکئے گا۔ خیر اب زمانہ سابق کی کچھ برائی اور اس عہد کی کچھ تعریف فرمایئے۔ سچ بات کہنے میں کیا عذر ہے۔ وہ بھی لیجئے۔

دوسرا وزن

ہر تے تھے آگے ہند میں مجنون بادشاہ | کرتے تھے بے خطا بھی بہت خون بادشاہ
اے پیچ میرا عہد عجب عہدِ امن ہے | یعنی ہے اس زمانے میں قانون بادشاہ

بیچ پر ——— !

ہاں ہاں۔ بس آگے نہ بڑھیئے گا۔ صرف شعر کہلا لیجئے۔

یوں ہے تو خیر۔

خیر کیسی؛ خون جگر کھا کر نظم کروں۔ آپ ایک خیر میں خاتمہ بالخیر کئے دیتے ہیں۔ اے حضرت! تعریف کیجئے۔

اچھی زبردستی کی تعریف ہے۔ اچھا صاحب۔ واہ وا۔ ماشاء اللہ۔

تسلیم جاری کرتا ہوں۔

یہ کیا؟

قانون کی رعایت۔

اسی رعایت نے آپ کو مجنوں بنا کر دو قافیوں کا زبردستی خون کرایا۔

اچھا افواج ہند کو سرکار نے یورپ بھیج کر جو عزت افزائی کی ہے اس کی نسبت بھی کچھ ارشاد ہو۔

یہ تو آپ نے میرے دل کی کہی۔ اچھا سنیئے۔

تیسرا وزن

انگلش کی مدد سے مالٹا تک — ہندی لشکر جو بڑھ گئے ہیں

کہتے ہیں یہ ہنس کے ہندوالے — کالے گوروں پہ چڑھ گئے ہیں

بہت خوب۔ سبحان اللہ۔

آداب فیر کرتا ہوں (رعایت ظاہر ہے)

خیر یہ تو سب کچھ ہوا۔ اب شہر کلکتہ کی تعریف میں بھی کچھ ارشاد ہو جائے۔

ضرور ضرور۔ وہ تو ہمارا دارالسلطنت ہی ہے۔ اللہ آباد رکھے۔ اچھا سنیئے۔

چوتھا وزن

نائب سلطان عالم کی یہاں درگاہ ہے — حاکمان دادگر کا خیمہ و خرگاہ ہے

تاجروں کی کیوں نہ ہو اطراف یورپ سے ورود — جانتے ہیں سب کہ کلکتہ بھی بندرگاہ ہے

اے سبحان اللہ۔

تسلیم کو داتا ہوں۔

یہ کیا؟

بندرگاہ کی رعایت۔ اے حضرت! اب فرمائش نہ کیجئے گا۔ دیوالہ نکلا چاہتا ہے۔ اس وقت رخصت ہوتا ہوں۔ آپ بھی سمجھ لیجئے گا کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے۔ چلتے چلاتے ایک وزن اور عرض کئے دیتا ہوں۔

پانچواں وزن

سَرسَر سَرسَر سنّاک

سَرسَر سَرسَر پھٹاک

میاں خیال صاحب اس قدر جھاگ مار کے رفوچکر ہو گئے، وہ گئے، پھر وہی سکوت۔ وہی سناٹا ہے

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے راہی ہو گئے

دفعتاً کیا تھا میاں انجمن کیا ہو گیا

اودھ پنچ ۶ اگست [illegible]

مسٹر اودھ پنچ صاحب! آپ کو عالم بالا کی پولیٹیکل باتیں بتا دوں، وہاں کے انتظامات کی خبر سنا دوں تب تو آپ بھی اپنے
[illegible] سپانڈنٹ کی بلند پروازی کے قائل ہوں گے یا نہیں۔ لیجئے مجھ سے سنیئے۔ عرش بریں پر ایک کمیٹی ہوئی۔ حضرت جبریل نے طوفان سند
[illegible]ندہ کا بجٹ پیش کیا۔ بہت دیر تک بحث رہی۔ بالآخر سال بھر کے لئے حضرت میکائیل تخفیف میں در آئے۔ حقیقت میں ایسے فرشتہ کا
[illegible] خدمت ہونا جس کے ایک بال کو سات سمندر نہ تر کر سکیں۔ خالی از مصارف کثیرہ نہ تھا۔ خصوصاً ایسے وقت میں کہ کوہ ہندوکش سے
[illegible] جبل اسود تک رسد کی ضرورت ہے۔ بعدہ سنہ گذشتہ کے عالم ارواح کی آمدنی کا بجٹ پیش ہوا۔ حضرت عزرائیل کی کارروائی کی ایک سستی
[illegible] ساتھ پائی گئی۔ لہٰذا علاوہ قحط اور وبا اور امراض معمولی کے فرشتہ جنگ روم و روس ان کی مدد کے لئے مقرر کیا گیا۔ کہیں آپ یہ
فقرہ نہ تیز کریں کہ عالم بالا کی مخبری میں شہاب ثاقب سے کیونکر بچے۔ جناب یہ بات دوربین لگانے والوں سے پوچھئے میں نے مرتبہ
[illegible] حالات دریافت کئے ہیں۔ آپ کے کارسپانڈنٹ کے خیال کو ہر محکمہ میں حاضری کی اجازت ہے۔

اودھ پنچ۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۷ء

سسرال کی گالی کا بُرا ماننے سو بھڑوا

ولزلی صاحب فوجی سفیر متعینہ لشکر روس جب بخارسٹ میں گرینڈ ڈیوک نکلس کی ملاقات کو گئے تو نکلس نے ان سے بے اعتنائی برتی کیونکہ ان
[illegible] سار کی حکمت عملی کے بدلہ روس میں جم کر رہ گئی۔ نہایت انقباض کے ساتھ نکلس صاحب منہ پھیر کر بولے بھی تو یہ کہ "کم بخت جاسوس جو
دوستوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں اور بھی بدتر ہیں"۔ اس توہین کی شکایت جلسہ وزرائے انگلستان تک پہنچی۔
گمان کیا بلکہ یقین تھا کہ کوئی سخت تہدید منجانب انگلستان عمل میں آئے گی۔ لیکن سارے جھگڑے کا تصفیہ مفصلۂ ذیل
تحریروں سے ہو گیا۔ وہ اصل تحریریں ہم کو نہیں ملیں مگر فرانس والوں کے قیاس کے مطابق ان مراسلات کا منشاء یہ ہے۔ لارڈ ڈربی
بنام ڈیوک نکلس "کیوں بھائی جان! ذلیل کرتے ہو۔ ہم نے کبھی کان دم ہلائی۔ یہ اہانت کے کوڑے چہ معنی دارد؟"
ڈیوک نکلس "لڑکی بیاہ کے کیا ہم اب اس چھیڑ چھاڑ سے بھی گئے؟"
مخاطبہ لارڈ ڈربی با ولزلی صاحب "سسرال کی گالی کا برا ماننے سو بھڑوا"

اودھ پنچ ۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء

ایک نادان خوش اعتقاد کسان کی دُعا

اے میرے اچھے خدا میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ تیرا کوئی ساجھی نہیں مجھ پر کرم کر۔ پڑھے ہوئے ملا کہتے ہیں کہ تو قوی ہے قدیر

ہے۔ [illegible] میں ان پیچیدہ باتوں کو کچھ نہیں سمجھ سکتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ تو لاٹ صاحب سے بھی بڑا ہے۔ عام لوگ کہتے ہیں کہ تو ہر ذرہ عالم کا منتظم ہے۔ میں اپنے چھوٹے سے اور کمزور خیال کو اتنے چکر دے سکتا کہ ہر ذرہ پر نظر دوڑا کر تیری قدرت کی کارروائیوں کا مشاہدہ کروں مگر یہ جانتا ہوں کہ حاکم بندوبست نے بغیر تیری مرضی کے مجھ پر جمع نہیں بڑھائی۔ اے میرے داتا مجھ پر رحم کر جب تو ہر ذرہ کا منتظم ہے تو میرے کھیت میں بہت سا غلہ کیوں نہیں پیدا ہوتا کہ اس کو بیچ کر جو باقی بچے اس سے بال بچوں کو پالوں۔ اے اللہ تو ہر جگہ ہے مگر شاید اس موضع میں تو نے گزر نہیں کیا اور اگر گزر گیا تو میری اجڑی حالت کو دیکھ کر مجھ کو اپنا بندہ نہ سمجھا اور اگر بندہ سمجھا تو گنہگار پایا اسی وجہ سے مجھ پر جمع بڑھا دی۔ اے اللہ میرا گناہ معاف کر وہ گناہ کچھ بہت بڑا نہیں ہے۔ میں نے تیل والے صاحب کی ایک بھینس چرائی تھی مگر اس کے لئے دو مہینے کی قید بھی بھگت لی اس نے میرے کھیت کا نقصان کیا تھا میں نے اس کو باندھ رکھا تھا اس کے سوا اور کوئی گناہ بھی نہیں کیا نہ کسی کی زمین دبائی نہ مال چھین لیا یا خدا اب مجھ پر اپنا فضل کر اور میری اس دعا کو بدلی کے لفافہ میں لپیٹ کر تیز رو بجلی کے ہاتھ صاحب لوگوں کے پاس بھیج دے اور حکم دے دے کہ مہنگی بھر غریب کسانوں پر مالگذاری کے واسطے ذرا سختی نہ کریں۔

ع۔ح۔ الہ آباد

خمارستان کا ڈِنر

(نواب) سیّد محمد آزاد

رُوئیداد
حاضرینِ نکہت قرین

مسٹر پینک الدولے	چیرمین
چسکی الملک	گورنر صوبہ تریاک آباد
مرزا خمار بیگ	راقم فوجو گزٹ
میر مطہر و خنا	منڈالین یانگ کانگ
سیّد بانبو جنگ	کمانڈر انچیف افواج فغفوریہ
دھواں دھار خنا	انسپکٹر جنرل چانڈو خانجات

مسٹر پینک الدولہ۔ حضرات! میں اپنے پلّے درجے کی خوش نصیبی اور افتخار کا باعث اس کو سمجھتا ہوں کہ آج میرے نصیب یہ عزت بخش خدمت ہوئی کہ میں آپ صاحبوں سے اپنے اس شاہنشاہ آفتاب لقب، عادل، انصاف گستر، پرقوت، ذی شوکت اور پرہیبت کے جام صحت و تندرستی کے پینے کی استدعا کرتا ہوں کہ جس کے عہدِ انصاف مہد میں ہم لوگ کالی ناگن کو بے تکلف نگل جاتے ہیں اور وہ بد ذات اور فتنہ گر ہم لوگوں کو ڈسنے اور آزار پہنچانے کی ہمت نہیں کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اس وقت اس عالی قدر بادشاہ کا جام صحت ہے کہ جس کی رعیت سے بڑھ کر کسی کی رعیت منکسر المزاج، نرم طبیعت اور تہذیب یافتہ نہیں ہے اور جس کی نیک نیتی اور پاک باطنی کی برکت سے افیون کی ایسی مفید نفس کش اور مفرح چیز ہم لوگوں کے استعمال میں ہے کہ جس نے ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ آرام اور تسکین اور راحت اور بے خلش طور سے زندگی بسر کرنے کا سامان ہم لوگوں کے واسطے مہیا کر دیا ہے۔ اور جس کی بدولت انگریزوں نے ہم لوگوں کی جیب کا لاکھوں روپیہ پایا ہے (چیرس) یہ اسی متبرک چیز کی برکت ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے آج تک بجز اس کی یاقوتی رنگت کے خون کی رنگت

---

[1] پورا عنوان ہے: "خمارستان کے تہذیب یافتہ مدکیوں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر"

کبھی خواب میں نہیں دیکھی ہے اور ایسی کی کرامت ہے کہ صدہا سال سے ہمارے کان بجز سامعہ نواز آواز بانبو کے توپ و بندوق کی وحشت انگیز اور ہیبتناک
اور عاقبت سوز آواز سے آشنا نہیں (چیرس)۔ یہ اسی پری کا جلوہ ہے جس کا تصور ۱۲ بجے دن تک ہم لوگوں کو آنکھ نہیں کھولنے دیتا ہے
اور یہ اسی حور کا عشوہ ہے کہ جس نے ہم کو ساری دنیا کی شیطانی اور نفسانی لذتوں، ہوسوں اور خواہشوں سے بے نیاز کر دیا ہے یہ رحم دلی کا مادہ ہماری قوم
میں اسی کا خاص عطیہ ہے کہ ترکوں کے بہادرانہ طور سے لڑنے مرنے کا تذکرہ سن کر دو دو دن تک ہم لوگوں کے ہوش پراں رہتے ہیں اور یہ اسی کی کشش
ہوئی بہادری کی نعمت ہے کہ ہمارے ہم وطن پٹاخے کی آواز پر دست بقبضہ ہو جاتے ہیں۔ (چیرس)
ہم لوگوں کا عمدہ برتیغ تو ور مسٹر نم ہوم کا ایجادی بانبو ہے کہ جس کا دھنواں غنیم کے خطہ کو جلا دے اور اقلیم بھر کو خاک میں ملا دے ہمارے
مدک کا چھینٹا چشم دوربین کے لیے ہٹرولیوز کا گولا ہے اور کون آج تک اس کی چوٹ کھا کر سنبھلا ہے (چیرس)
ہم لوگوں کا خیالی جنگی جہاز البا ہے کہ جو ہمارے چین کے سمندر سے ایک منٹ میں بحر اسود کی موجوں پر برق کی طرح چمکنے لگتا ہے
اور ہماری پینک کی گاڑی ایسی ہے کہ جو ایک لمحہ میں ہزاروں سمندروں اور لاکھوں پہاڑوں کو طے کرتی ہے۔
اب ہمارے ملک میں بھی افیون کی کاشتکاری سرکاری طور سے جاری ہو گئی ہے، کیونکہ ہمارا سارا ملک اس کا محتاج ہے اور اب وہ
زمان مسرت نشان قریب ہے کہ ہم لوگوں کا کروڑوں روپیہ ہمارے ہی ملک میں رہے گا اور ہم لوگ مالوا اور بہار کے بار عظیم
سے دائمی طور سے سبکدوش ہو جائیں گے (چیرس)
عام تجارت کی بھی ایسی ترقی ہمارے ملک میں فضل الٰہی اور توجہ سلطانی سے ہے کہ جس کا ذکر ناگفتہ بہ ہے۔ تہذیب و علم بھی ان دونوں
اوج پر ہے کہ یورپ والے بھی جس کا رشک کرتے ہیں۔ اور ایسے کامل پروفیسر لوگ ہماری یونیورسٹی میں ہیں کہ جو برسوں مراقبہ میں رہ کے
میں اور ستارہ او [illegible] وج کا حال دریافت فرماتے ہیں۔ خلاصۂ کلام ہر قسم کی ترقیوں سے ہمارا ملک چین اور ممالک مفتوحہ وغیرہ
مالا مال ہے اور ہر طبقہ اور فرقہ اور ہر درجہ کی رعایا مرفہ الحال ہے۔
اب ہم جام صحت سلطانی کو نوش جان کرتے ہیں۔ (چیرس) بینڈ بجنے لگا۔

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

مرزا خمار بیگ ۔ راقم فوج گزٹ۔ ہز ایکسیلنسی، جنٹلمین اینڈ لیڈیز، ہماری قسمت میں آج ایسا مشکل سبق پڑا ہے کہ جس کے ہم حاشیے اپنے
کو قابل تصور نہیں کرتے ہیں اور کبھی ہم کو اس کی امید نہیں کہ ہم اپنی آج کی اس عظیم خدمت کو پوری طرح سے اور نیک طور سے انجام دے
کر سرخرو اس سے نکل جائیں گے۔ ہماری دلی مسرت اور بڑی عزت کی یہ بات ہے کہ ہمارے سپرد اس جلیل القدر مہمان کا ٹوسٹ
ہوا ہے جو آج اتنے بڑے صوبے کا گورنر ہے اور جس کی قلم کی نوک پر ہم لوگوں کے اقبال و ادبار کا دار و مدار ہے۔ ہم کو فقط اس کی
مسرت نہیں ہے کہ میرے سپرد ایسے عالی جاہ اور بے مثل عہدہ دار کا ٹوسٹ ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ قلبی شادمانی بھی ضم ہے کہ
میں اپنی خوش قسمتی سے گورنر ممدوح کا ذاتی دوست بھی ہوں اور اکثر ہم نے لڑکپن میں اپنی ولایت کی چراگاہوں میں ان کے ساتھ
چھوٹے چھوٹے سور کے خوشنما اور خوش رفتار و رنگ اطوار بچوں کو چرایا تھا۔ عجب کہ ہم اور وہ سمندر گمنامی میں ڈوبے ہوئے تھے اس
وقت اس ایوان رفیع الشان کے دیکھنے اور عام لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش ہونے کا تصور تک ہم کو نہیں تھا۔ ہمارے

معززہ دوست کی ذاتی صفتوں کا بیان کرنا یہاں تحصیل حاصل ہے کیونکہ آپ لوگ بھی ان کے ذاتی دوست ہیں۔ اور ان کے خلق وسیع، سلیم الطبعی تحمل، مہمان نوازی، ہمدردی، نیک نفسی کا مزا چکھے ہوئے ہیں اس لئے ضرور ہے کہ میں ان کی قدرت انتظامی، ملکی اور اس کے عمدہ نتیجوں کی طرف رجوع کروں اور مشتے نمونہ از خروارے آپ لوگوں کو سناؤں۔ جو صفائی اور رونق کہ سررشتہ آبکاری کی ان کے زمانہ حکومت میں ہوئی ہے، ایسا آج تک کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور صرف شراب افیون کی تجارت کو ترقی دینے سے اس قلیل عرصہ میں تہذیب اور علم ایسا شائع ہوا ہے کہ ہر کوچہ و بازار میں شراب خانے اور مدک خانے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے دیکھنے سے نیک نیت آدمی کی آنکھوں کو بڑا آرام ملتا ہے۔ ٹیکس کی تلخ گولی کو مصلحت ملکی اور خزانہ خالی کے خیال سے حکمت عملی کی مصری میں ملا کر اس چالاکی سے انہوں نے نیٹو لوگوں کو کھلا دیا ہے کہ جس طرح لڑکوں کو دوائے تلخ شہد ملا کر کھلا دیتے ہیں۔ کب پکن اور کنٹن میں اس لطف کے ساتھ ٹیکس جاری ہوا تھا۔ اس دوا کا ایسا اثر لوگوں پر ہوا ہے کہ ہزاروں آدمی روزانہ خون تھوک تھوک کر اس خارستان کو گلستاں بنا رہے ہیں۔ یہ انہیں کا گرامی کونسل اور قانون خانہ ہے کہ جس نے ہم لوگوں کو اس جنگلی ملک میں ایسا محافظ صحت اور سرپرست اطوار اخلاقی قانون عطا کیا ہے اور یہ ہماری فوج کے ولایتی لچھے ہیں کہ جن کے طفیل میں خارستان کے اکثر شہروں اور کمپوں کے نوجوان [illegible] کی تائید سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ گو اس سے بظاہر چین کے دوا کے نجیوں کا نقصان معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے وہ نقصان خفیف اس عام فائدہ عظیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہی ہمارے عالی مرتبہ دوست کے اعلیٰ درجہ کی سرگرمی اور عرق ریزی پر دال ہے کہ ضلع خرابہ کے کبھی لوگوں کی زبان بھی اس سے آشنا ہوئی اور انہوں نے بھی مغربی تہذیب کا مزا چکھا۔ چیف کمشنر خرابہ کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے رم کو ان کوہستانی ملکوں میں مروج کیا گیا ہے۔ تب سے سیکڑے میں بیس آدمی آگے سے زیادہ قحط کی سختی اور خوف کو کم کرنے کے لیئے دار البقا میں نشیمن کرتے جاتے ہیں

اس کا کامل یقین ہے کہ میرے جلیل القدر دوست بعد انقضائے ایام خدمت گورنری اس ملک مفتوحہ کی کہ جب کہ سرسبزی اور کامیابی کا ہار گلے میں ڈال کر اپنے وطن کو تشریف لے جائیں گے تو وہاں بھی اپنے ملک کے لیے پارلیمنٹ پکن میں بڑا بڑا کام کریں گے اور یہوم گورنمنٹ کی تحویل میں جتنے اعلیٰ درجے کے تمغے اور خطاب ہیں، یہ سب لے لیں گے۔

حاضرین نے بڑے تپاک سے گورنر کا ٹوسٹ پیا اور بینڈ بجنے لگا ۔

تو کار زمیں را نکو ساختی کہ بر آسمان نیز پرداختی

(اودھ پنچ، ۱۹ فروری ۱۸۷۸ء)

لفظ: ہندوستانی بی بی

نواب سید محمد آزاد

انسانی زندگی کی تازگی کے لیے جاں نواز اور فرحت آثار ہوائے بہار، گھر کی رونق، گھر کی زینت، گھر کا بھرم، عزیزوں اور جملہ متوسلین کے لیے ہمیشہ رواں، ہمیشہ شاداب اور ہمیشہ لبریز چشمۂ کرم، عصمت کے سراپا، عزت و محبت گلستان کی ہزار داستان بلبل، سچی دینداری کا محفوظ گنجینہ، عصمت، عفت اور مروت کا قومی دفینہ، بالخلقت دوسروں کی وقف خدمت و چارہ سازی، بالطبع بردبار، اپنے شوہر کی عاشق، شیدا اور فدائی۔ اپنے بچوں کی انّا کھلائی اور دائی، عفت کی دیوتا، محبت کی تصویر، مروت کی اوتار، قناعت، اسلامیانہ صبر اور درویشانہ توکل کے صاف اور خوش رنگ بادۂ گل رنگ کے مینا کی قلقل، خالص اور بے لوث محبت کے لیے سرگرم جاں نوازی، وہ غنچہ کہ ہوائے محبت خالص کے چلنے پر جس کی شگفتگی کا دار و مدار ہے، وہ سرسبز اور بار آور شجر جو اپنے سایۂ عنایت و محبت کے جاگزینوں پر بغیر کسی قسم کی خصوصیت اور قید کے ہر فصل میں ایک رنگ سے رحمت بار ہے۔ وہ سپاہی معرکۂ زندگی میں صبر و قناعت جس کی آبدار تلوار ہے۔ وہ منتظم جزرسی پیش بینی اور دور اندیشی آئندہ بکار کے اصول پر جس کا ہر کاروبار ہے۔ زندگی کے طوفان بلانشان اور مصیبت سامان میں مردوں کی طوفانی طبیعت کے لیے لنگر کا کام دینے والی، ان کی ہر واقعی اور مصنوعی مصیبت اور رنج میں اظہار خواہش ہمدردی و چارہ جوئی ہی نہیں بلکہ اوصاف ہمدردی کا درد فرسا اور غم تراش لبریز جام دینے والی، اپنے گھر کے چراغوں پر رات بھر اپنی صحت سے قطع نظر کر کے پروانہ وار نثار ہونے والی، روتے ضدی لڑکوں کی پُر اثر اور پُرشور و شر آواز کی فطرتی جگوتی کے بجنے پر رات بھر میں دس دس بار بیدار ہونے والی، وہ انسان، اولاد کی تمنا جس کی سب سے بڑی حاجت ہے، بے اولادی جس کے لیے سخت آفت اور قیامت ہے وہ صحت بار نسیم عنبر شمیم جس کے چلنے سے متعصب دشمنوں کی تنگ خیالی کا نیونار زندان ہر ہندوستانی کے لیے روضۂ رضوان ہے وہ مسیح الزمان جس کے شفاخانۂ محبت و ہمدردی کی معجون کا محتاج ہر پیر و جوان ہے۔ وہ قومی یا فنی کان جس میں ہزاروں لعل بے بہا نہاں رہتے ہیں وہ عمان رحمت نشان جس سے اخلاقی خوبی اور نسوانی نیکی کے سینکڑوں

میں کھڑے کھڑے ذرا سا ہاتھ ہلانے کی بات سننے پر بکے جانے کے لیے قیامت خیز تکرار اور بے انتہا اصرار۔ وہ جاندار تکیہ جس پر
آج بڑے بڑے لوگوں کی آسائش، امارت اور سخاوت کا تکیہ ہے وہ زندہ سلائی کی کل جس کے ذریعہ سے ہزار ہا چاک دہ چاک
گریبان افلاس میں مضبوط بخیہ ہے۔ وہ وحشی غیر محرم مرد کی سریلی لے دار اور دلکش آواز تھی جس پر چابک کی طرح پڑتی ہے وہ نازک اندام
موم کی گڑیا غیر مرد کی نگاہ محبت و عنایت تھی جس کے بدن میں مثل کانٹے کے گڑتی ہے۔ وہ چراغ محبت و شرافت جس کی نورانی شعاع
سے بعض بدنصیب روشن خیال حکیموں نے اپنی آسائش اور عافیت کے کاشانے کو دائمی طور پر پُر نور ہونے دینا محض بے سود
جانا، وہ آب دار اور آبرو دار شرافت و عفت کہ جس کو مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے سرتاج نے اپنے سلک ازدواجی میں
بہ ہزار تمنا و خواہش پرونا اپنے اور اپنے افسردہ حال اور شتر بے مہار نوجوان قوم کے حق میں ہر طرح سے محمود جانا۔

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہئے

احمد علی شوق

آخر یہ عشق ہے کون جانور۔ چرند ہے یا پرند۔ رہتا کس دیس میں ہے کھاتا کیا ہے، پیتا کیا ہے۔ بس، پنچی سی رائی کے دانے کے برابر بات، جس کے واسطے کامل کی تلاش۔ کشف نہیں، کرامات نہیں، مراقبہ نہیں، سماع نہیں، حال و قال نہیں، مسئلہ تجدد امثال نہیں ؎

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی پوچھے ہم سے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

اللہ اللہ آپ ہیں اودھ پنچ کے نامہ نگار۔ چشم بد دور آپ سے بڑھ کے اس معمے کا حل کرنے والا کون۔ علماء زاہد خشک، صوفی جاہل، پنڈت برائے نام، شعرا بے اعتبار، ایک آپ کی ذات ہے باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ بندہ پرور سنیے اگلے زمانے والے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے سیدھے سادے آدمی تھے، جو جی میں آیا کہہ گذرے جو سنا مان لیا، نہ حجت نہ دلیل۔ یہ عقل جو اس زمانے والوں کو اللہ نے دی ہے پہلے اس کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ نہ یہ طریقۂ تعلیم، نہ یہ تہذیب، نہ یہ اپج، نہ یہ ایجادیں، نہ یہ رفتار، نہ گفتار، نہ یہ لباس، نہ قیاس، اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اسی عشق کے معاملے میں دیکھ لیجیے متقدمین نے کیسی منہ کی کھائی، ہزار عقل کے گھوڑے ہانٹ دوڑائے لیکن منزلِ مقصود کو نہ پہنچے۔ صرف دو قسمیں قائم کیں، ایک مجازی دوسری حقیقی۔ بھلا عشقِ بازاری، عشقِ خانگی، عشقِ ازدواجی، ان کا بھی کہیں ذکر ہے؟ خاک نہیں۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے، لمبی چوڑی عقل والے ان کی تحقیق پر کیوں نہ حرف رکھیں۔ مجازی اور حقیقی کی تفصیل میری دانست میں فضول ہے۔ ان سے تمام پرانی کتابیں بھری پڑی ہیں، رہیں نوایجاد قسمیں ان کا سمجھانا کون بڑی بات ہے، چٹکی بجاتے سمجھائے دیتا ہوں۔ عشق ایک قسم کا ولولہ ہے جو ایامِ شباب میں ظاہر ہوتا ہے اور جو ایک جنس کو رجوع کرتا ہے طرف دوسری کے۔ بازاری میں یا ئے نسبتی تصور فرمایئے۔ چونکہ عشق بازار سے تعلق ہے اس لحاظ سے عشقِ بازاری نام رکھا گیا۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

قسم اوّل

لکھنؤ کا سا دن باقی رہا اور لپ جھپ، نہا دھو کنگھی سے بال سنوار، ٹیڑھی ٹوپی، بنارسی رومال، رنگین گھٹنا پہن، گلوری کا

یو قتے چوک میں جا نکلے۔ کبھی اس کمرے پہ نگاہ کبھی اس مونڈھے پر، باچھیں کھلی ہوئیں، مونچھیں نیم باشے' اس کمرے سے نگاہ
اس کمرے سے نگاہ بازیاں۔ کوئی ہنس دی اور یہ ریشہ خطمی ہو گئے، کسی نے چھوٹوں اشارہ کیا اور یہ دائیں بائیں دیکھ کھٹ سے
زینے پر۔ آتے ہی نواب صاحب اعضویہ کیا کہنا، حضور ایسے، حضور ویسے۔ وہ ٹپر لڑائے کہ بڑے بڑے استادوں کے چھکے
گئے۔ وہ وہ گُنا، اٹھایا کہ لوگ بنی بنل گئے۔ طبلہ بجانے میں ماشاء اللہ ہاتھ ایسا تیار جیسے ریل کا انجن، گھڑی کا پرزہ۔ ادھر حضرت
نے گلوری کھائی ادھر غیرت آئی، جبھی رنڈی کے ہاں یوں مفت کیا کھا جائیں لٹو دار پگڑی والے کو اشارہ کیا اس نے جیب
سے نکالے اور ناٹکہ جی کے حوالے کیے۔ بھڑووں نے دیکھا ابھی سونے کی چڑیا پھنسی، ساز ملا مجرے کا رنگ جمایا۔ غرض چھٹم چھٹے
چھڑانا مشکل، دو چار جو گرہ میں تھے وہیں چڑھا دیے۔ ہاتھ جھلاتے رخصت ہوئے۔ یار دوستوں میں لن ترانیاں اڑانے لگے
بڑے مرزا آج تو بی . . . . . . نے وہ خاطر داریاں کیں کہ واللہ ہے بندہ بے زر بنا لیا۔ بھئی کیا خلیق لوگ ہیں۔ جب ادھر
سے ہو نکلے سب دو چار گلوریاں کھلائے چھٹا کا محال ہو گیا۔

قسمِ دوم (عشقِ بازاری)

اس کے واسطے صرف چار ٹکے پیسوں کی ضرورت ہے مٹھی میں دبا بازار کی سیڑھیاں بھریں، ہانپتے کانپتے
جا پہنچے، چڑیلیں نظر پڑیں، آنکھیں ملائیں، باتیں چکنائیں۔ دو چار جوتیاں، دس بیس گالیاں کھائیں، ٹکے حوالے کیے
یہ نوع عشقِ بازاری ہوا، اب عشقِ خانگی کا ماجرا سنیئے۔ یہ بھی دو قسموں پر منقسم ہے۔ اوّل بلانا دوسرے خود جانا۔

قسمِ اوّل (عشقِ خانگی)

یہ بڑے آدمیوں کے حصے میں ہے۔ ایں بڑے آدمی کیا۔ یہی دراز قد فربہ، نہیں نہیں بھیا روپے والے
کو بڑا آدمی کہتے ہیں۔ اب قسمِ اوّل کی تعریف سنیے دس بیس روپے کے خرچ میں اونچی سے اونچی . . . . . . کیوں نہ ہو
گھڑ گھڑ گھڑ دروازے پر موجود۔ پری نے جلوہ دکھایا، حور نے حجابِ فاصل اٹھایا، چودھویں کا چاند نکل آیا۔ تکلف برطرف

آنچل رخ سے جو ہٹ گیا ہے
پردہ غیرت کا پھٹ گیا ہے

یہ بات، وہ بات، لٹیا پسند، خاصدان پسند، گھڑی پسند، اگالدان پسند آناً فاناً گھر کا تعلیقہ کر لیا۔ فرمائشیں
مزید برآں لیکن یہ چاندنی چار ہی دن کی ہے۔ ادھر میاں کا دیوالہ نکلا ادھر ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

پر عمل کیا گیا۔

قسمِ دوم (عشقِ خانگی)

دو روپیہ کمر میں باندھ چل کھڑے ہوئے۔ یہ گھر دیکھا وہ گھر دیکھا آخر ایک مکان میں سبزے کی روش

سہم گئی ـــ حضرت خوش خلاف ہو پلنگ پر دراز ہوئے۔ خانم صاحب کو پیاس کی شدت۔ دوسرے مکان کا دروازہ کھلا ہوا۔ پانی پینے کو اٹھیں اور غڑاپ سے اسی دروازے سے میں۔ میاں ہیں کہ امیدوار۔ بودہ بد انند یا الٰہی زمین کھا گئی یا آسمان۔ ۔ سنے میں دو تین مسٹنڈے ڈنڈے باز آدھمکے۔ اسے سے قیامت نازل ہوئی اوسان خطا ہوگئے۔ پیٹ میں سانس سمانی مشکل ہوگئی۔ دو چار ہاتھ کا کانٹا سا نکال باہر کیا۔ جی ہی جی میں پچھتاتے اپنا سا منہ لیے ٹپ کا۔ تے چلے آتے ہیں۔ ہمت نہ پڑے کی۔

یہ عشقِ خانگی ہوا رہا عشقِ ازدواجی، اس کے مزے کچھ نہ پوچھیے جو ہیں سو ہیں۔ یہ عشق خود ہی مہذب ہے اس کی عفت شیبہ۔ ایک مہذب مرد کا ایک مہذب عورت کو عقد کے لیے دیکھنا بھالنا۔ اب اگر نہیں بن دیکھے بھالے عقد کر لیا اور دونوں میں نہ بنی۔ شادی عذاب جان، جورو اجیرن۔ زندہ درگور ہوئے۔ اس سے عقلا نے عقد سے پہلے کچھ دنوں امتحان لازمی ٹھہرایا۔ پھر بے بنا کیا جیا ہاکھٹ سے الگ ہو رہے۔ تم اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ اسے عشقِ ازدواجی کہتے ہیں اور اس پر اپنا بھی عماد ہے۔

نمائش گاہ

احمد علی شوق

ابرِ نیساں کو قلم نے پانی پانی کر دیا
موتیوں سے دامنِ کاغذ لبالب بھر دیا

واہ ری رنگیں بیانی تو نے کیا باندھی ہوا
نو عروسانِ سخن کو پھولوں کا زیور دیا

اے اودھ پنچ اپنے بہرِ رگِ جانِ عدو
حرف لکھتے ہی بس اس کے ہاتھ میں نشتر دیا

بنیا اخبار اور بازارِ سخن کی بانگی
اس کو کیا سوجھی کہ اس نے اوکھلی میں سر دیا

ہم کو دکھیو کھینچ کر نقشہ نمائش گاہ کا
تحفۂ اربابِ بینش کہہ کے آگے گر دھر دیا

لطافت کی کان ظرافت کی جان مسٹر اودھ پنچ صاحب! بالفعل زمانہ کیا کیا کروٹیں بدل رہا ہے۔ کیسی کیسی قلابازیاں کھا رہا ہے۔ جو بات ہے وہ الٹوانسی ہے۔ ان نئے نئے ڈھکوسلوں سے جی اکتا گیا۔ ستم ظریفوں کی میٹھی میٹھی چھریاں کام کر گئیں۔ چین کا کوسوں پتا نہیں۔ آرام کنوؤں میں بانس ڈالے نہیں ملتا۔ سال کا سال سر پڑے کے بسر لیا۔ دنیا بہ امید قائم پر عمل کئے ہوئے۔ آس لگائے۔ زندگی کے دن بھرتے رہے۔ سوا دھر کے پتھروں کی مارا ماری نے اور بھی دل سرد کر دیا۔ فصلِ انبہ کا بیج گن گن کر مارا گیا۔ آندھی کا منہ کالا، کہ آئے دن اس پر خاک اڑایا کرتی ہے ؎

[illegible] ہر سمت سے ہے ہجومِ ظلمات
[illegible] جو دن ہے وہ پہلی گور کی رات

ایک تو یونہی حال پتلا ہو رہا ہے۔ اس پر طرہ سنئے کبھی کالی گھٹا چھائی ہے۔ گھن گرج بادل گرجتے ہیں۔ جھاجھم مینہ برستا ہے۔ کبھی سرد ہوا جینے جی ٹھنڈا کئے دیتی ہے۔ بدن یخ ہو جاتا ہے۔ کبھی لون جھلسائے دیتی ہے۔ آفتاب آنکھیں نکال نکال کر گرمیاں دکھاتا ہے۔ دھوپ کے مارے کھوپڑی چٹخی جاتی ہے۔ سر کا پسینا تلووں کو آتا ہے۔ یا تو گلی گلی وہ چھچھے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا ایسا سناٹا ہے جیسے اس دیس میں آدمی ہی نہیں بستے۔ مکانوں کی وہ گت کہ اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے۔ جس کو دیکھئے بدن میں سکت نہیں ضعف کے مارے آنکھیں یوں بند جیسے بخیلوں کے دروازے۔ ہندی بھائی، بھولے بھالے دربار الٰہی سے بے ہنری کا تمغا پا چکے ہیں۔ اگر کسی نے ایڑی چوٹی اوٹ پٹانگ چار لکیریں کھینچ لیں، سمجھئے بھیا بڑے دستکار ہیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ اپنے حسابوں مانی بہزاد پر چھاپا مارا۔ مگر یہ ہے جہاں روکھ نہیں وہاں رنڈ روکھ۔ خوشامدی للّو پتو کے آدمی۔ خراب کن بتیرے۔ انہیں کیا بس میں چنگی ڈال جا لو الگ کھڑیں۔ کسی کا گھر جلے تاپنے کو موجود۔ ان خوبندوں کی دل سوزی جھوٹے کولوں کی آگ ہے۔ ٹھہرنے کا نام نہیں جانتے۔ کڑی پڑی آڑے آنے والا کوئی نہیں ؎

کس را زہ بیم روزِ غم جز سایہ در پہلوئے خود
آنہم چو بیم سوئے او گردو اندازِ من رشکِ خود

اوے ماں یہ تو سب ہوا۔ کوئی ڈھنڈورا کچھ پکار رہا ہے (کان لگا کر) ہاں بھئی (کھڑکی سے سر نکال کر) کیوں بھئی یہ ڈھنڈورا
[illegible] ہے کا ہے ؟

مجو ر نمائش گاہ کا !

واہ وا۔ گھر بیٹھے خرچے۔ یہاں تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ سیر گشتی کا عارضہ بھئی ہزار کام چھوڑ اس جلسے میں ضرور جائیں گے۔
[illegible] ہے چانڈو کا وقت قضا ہو جائے) دن تاریخ پوچھ پاچھ چار دن آگے سے کمر کس بیٹھے۔ گھڑی گھڑی پہاڑ ہو گئی۔ سوتے جاگتے اسی کا دھیان
[illegible] بندھا ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کی لو لگی ہے۔

بارے خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ اے لیجئے سویرے ہی سے نکھر کنگھی سرمے سے لیس ہو، جامدانی کا انگرکھا ڈانٹ، کریپ
[illegible] کی دو پلی نکہ دار ٹوپی ٹیڑھی رکھ، ٹاٹ بانی جوتا پہن، کڑی کمان کا سا تیر نمائش گاہ کے پھاٹک پر پہنچے۔ ابھی قدم ڈگنے نہیں پایا تھا کہ پہرے والوں
[illegible] نے ڈانٹ بتائی۔ الٰہی خیر۔ عہد چکے ہو رہے۔ زمین نے قدم پکڑے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہر چند آج کل کے خوشامدیوں سے کچھ بڑھ چڑھ کر
خوشامد کی۔ وہ سب کے سب فرعون بے سامان ہوا کے گھوڑوں پر سوار کس کی سنتے ہیں۔ لاچاری درجے مخالفت کا سبب پوچھا۔
میاں تم تو بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو۔ ذرا ہوش سنبھالو۔ عقل کے ناخن لو۔ پہلے آدمی بن آؤ پھر اس
پھاٹک کے اندر قدم دھرنا۔

بھائی جان آدمی کیسے بنتے ہیں ؟

ماشاء اللہ ! اتنے دنوں دلی میں رہے۔ بھاڑ جھونکا کئے۔ اجی ٹوپی ایسی۔ کوٹ ایسا۔ پاجامہ ایسا۔ بوٹ ایسا۔

قہر درویش بر جان درویش۔ سوائے بغلیں جھانکنے کے کچھ نہ بن پڑا۔ گم صم الٹے پاؤں گھر کا راستہ لیا۔ جی میں آیا۔ او نہہ مارو
[illegible] گولی۔ کس کی نمائش گاہ۔ اپنی ایسی تیسی میں جائے کپڑے۔ دیڑے کہاں خریدتے پھرو گے۔ اتنا پیسے کا بٹیر کھائیں گے۔ مرغوں کے کام
آئے گا۔ چانڈو کے دم اڑیں گے۔ پھر ایا ہوا شوق بھلا کب مانتا ہے۔ ایک پل چین نہ آیا۔ بے کل ہو گئے۔ ننگے سر، ننگا منہ، بگٹٹ مسٹر
جونس کی کوٹھی میں پہنچے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ منہ مانگے داموں جو کچھ لینا دینا تھا وہ لے دے، آدمیت کا جامہ پہن۔ تڑاق پڑاق کندھے جوڑ۔ پھر اسی
چاکسا پر۔ اب کس کے منہ میں دانت ہیں جو ڈانٹے۔ کھٹ پٹ۔ کھٹ پٹ آگے بڑھے۔ گردن نیچی کئے اپنی راہ چلے گئے۔ اس دفعہ چپراسی
[illegible] سب کے سب ہمارے کوٹ پتلون بوٹ کی چمک دمک دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ غرضکہ یہ چل وہ چل بھرے جلسے میں غٹ پٹ۔
[illegible] دہاں تو ماشی گنگا بہتی دیکھتے ہی بجھ گیا۔ دھوٹھنڈے ہو گئے۔ ہم اس دھن میں آئے تھے کہ بندا دین کا ناچ، حیدر کی گلے بازیاں ہوں گی۔
[illegible] سواس راگ مالے کی تو بھن بھی نہیں۔ خیر ایک حماقت شدنی تھی۔ ہو گئی۔ اس میں پچھتاوا کاہے کا۔ جو تقدیر سے اڑ گیا تھا۔ اس کو بھاڑ میں جھونک چکے
[illegible] آگے کو کان ہو گئے۔ بہتا پانی بہہ جائے۔ ٹھہرا بابا پانی رہ جائے۔ جیتے جی تو کوڑی کوڑی دانت سے پکڑیں گے۔

گذشتہ را صلوٰۃ کہہ کر جی کو سمجھایا بجھایا۔ ادھر آئے ادھر ادھر گئے۔ یہ چیز دیکھی وہ چیز دیکھی۔ اے لیجئے اب تو آنکھیں کھل گئیں۔
جس دکان پر جا پڑے آئینہ بن کر رہ گئے۔ چین کی دستکاریاں، انوکھے گڑھت کے مال۔ یورپ کے نفیس نفیس تجارتی اسباب۔ خصوصاً
انگلستان کے صنائع۔ دیدہ شنیدہ۔ واللہ ہے ہمارا مینا بازار اس کی گرد کو نہ پہنچے۔ ساری خدائی کا تماشہ کھڑے کھڑے ان آنکھوں سے
دیکھا۔ لیکن دیکھنا ہی دیکھنا ہاتھ لگا۔ ٹکا پاس نہیں جو کسی دوکاندار سے بات کریں۔ چانڈو، مدک میں توڑے کے توڑے پھونکنا یاد کر کے

تمت تمہید

قانونِ قسمت

ہم نے پوچھا یہ اپنی قسمت سے
کالی رنگت ہے کیا محل اس میں
شب ہی کو ہے سدا چمکتا چاند
کالی رنگت سے گیسوئے جاناں
کالی رنگت سے گیسوئے خمدار
کالی رنگت سے تپلیاں دونو
رنگ کے زیب سے مسی کاجل
کس طرح دیں جگہ نہ آنکھوں میں
زیب دیتا ہے تن پہ کالا سوٹ
حجرِ اسود کے مذہبی بوسے
پاک کعبے کے کالے کالے غلاف
گوری رنگت ہے گر سبب اس کا
رنگِ ابیض سدا نہیں مطبوع
ڈرتے ہیں داغِ برص سے یوں لوگ
شکل سے سنکھیا شکر کی ایک . . .
فرض کریں سفید کو گر دن
پتلیاں گر سپید ہو جائیں
رشتہ مندوں میں خوں اگر ہو سفید
رنگ ـ نقرہ برا ہے گھوڑوں میں
اجلے سے ہے سہاگنیں بیزار
سچ بتا ان پہ کیوں نور بھی ہے
بولی قسمت فضول سب تقریر
کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف

دور کیوں ہم سے گنجِ مطلب ہیں
کالی رنگت سے گزمیں شب ہیں
شب ہی کو جگمگاتے کوکب ہیں
لیلۃ القدر سے مخاطب ہیں
تیغ و خنجر ہیں جفت عقرب ہیں
چشم کے آسمان پہ کوکب ہیں
راحتِ چشم و زینتِ لب ہیں
فائدے کحل کے مجرب ہیں
متفق اس پہ کل مہذب ہیں
بوسۂ لعل سے بھی اعذب ہیں
سرمۂ چشمِ دین و مذہب ہیں
ہم میں بھی کالے کم نہیں سب ہیں
ورنہ کیوں داڑھیاں مخضب ہیں
جیسے مبروص کے معذب ہیں
جتنے ابیض ہیں کب سب اعذب ہیں
دن بھی خالی کسوف سے کب ہیں
ہر قدم پر قدم مذبذب ہیں
لاکھ اقرب ہوں پھر بھی عقرب ہیں
اس پہ شاہد صفاتِ مرکب ہیں
کیونکہ رنگیں سہاگنیں سب ہیں
ہم سے غمزے ترے یہ کیوں اب ہیں
ایسی باتیں نظر ہیں یاں کب ہیں
دل کے بننے کے اور ہی ڈھب ہیں

معذرت انگریزی

ایک مرغے نے یہ مرغی سے کہا — لوٹتی ہے خاک پر کیوں بے تمیز
ہنس کے مرغی نے دیا اس کو جواب — جسم پر ملتی ہوں پوڈر اے عزیز
بولا مرغا ہے یہ پوڈر کیسا بلا — بولی مرغی ہے یہ اک فیشن کی چیز
پوچھا مرغے نے کہ ہے فیشن یہ کیا — بولی مرغی بچہ کمفرٹ و ایز
ڈانٹا مرغے نے کہ انگریزی نہ بول — بولی مرغی تیرے سر ہیں سے ڈریز
مرغا جھنجھلایا کہ پھر پھر وہی — مرغی بولی چپ بھی رہ اے بدتمیز
وہ زباں جو ہے زبانوں کی کوئین — بولی وہ ہے جس کی ہر بولی لینز
چھوٹ سکتی ہے چھڑانے سے کہیں — جب تلک ہے کوٹ پتلون اور کمیز
حبذا شہباز کا حسنِ کلام — مرحبا باغِ فصاحت کی بریز

پادری ولیم نے احمد سے کہا — لو پڑھو انجیل سے سیکھو تمیز
بولا احمد اس کی اب حاجت نہیں — پڑھ چکا ہوں میں تو صاحب مسٹریز

حضرت رمضان کا فوٹو

دو ہفتے سے گھر میں مرے وارد رمضان ہیں — جھلّے یہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بجاں ہیں
ہے شام مہینوں ہی میں جا کر کہیں آتی — سنتے کہیں برسوں ہی میں مغرب کی اذاں ہیں
مسجد میں ہیں ترتیل و قرأت کے وہ جھگڑے — آمین کی جا مقتدی کہتے الاماں ہیں
ہوتی ہی نہیں ختم کسی طرح سے رکعت — مغرب پہ تراویح کے یاروں کے گماں ہیں
مغرب ہی چلی جاتی ہے مغرب سے عشا تک — سن لیتے کبھی اس میں ہی مرغوں کی اذاں ہیں
مسجد سے جو آئے تو پھرے گھر سے خدا کے
الفاظ ہیں جو شکر کے سب وردِ زباں ہیں

ایڈیٹر چاند کے نام

سید ممتاز حسین

[محترم و معظم جناب منشی کنہیا لال صاحب!]

تسلیم۔ اودھ پنچ کا بار تنہا اپنی گردن پہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام چور ہو گیا۔ پھر بھی دو چار ورق کا مضمون لکھنا پہاڑ ہی کے ڈھونے کے برابر تھا۔ جو تعمیل حکم سے گردن تابی کرتا۔ اور بہانہ ڈھونڈھتا مگر دو قسم کی بیماریوں نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک ملیریا [illegible] جس نے تمام ڈیل پر کرم فرمایا۔ دوسرے اسفل جسم کے بعض دو دہریا ثمر نما تولید مثل پر آمادہ ہو گئے۔ آپ جانئے مردوں کو تولید کی زحمت یا عسر ولادت کی ابتدا سے کب واسطہ پڑتا ہے؟ پھر تولید بھی کس کی۔ اوندھے پھوڑے کی تین چار ہفتے اس مخصوص درد [illegible] بیماری نے ضائع کئے۔ خدا خدا کر کے اب تفرقِ انصال ہوا ہے۔ اس حالت میں چاند کے لئے مضمون بہت مشکل ہے۔ عذر لنگ نہیں عذر صحیح قبول فرمایئے۔

مجھے جب اس کا علم ہوا کہ آپ نے میرا نام اہل قلم کی فہرست میں لکھ لیا تو بہت تعجب ہوا۔ آج تک سینکڑوں مضمون قدیم اور جدید نظم و نثر لکھنے والوں کے متعلق ماہواری رسالوں اور اخباری کاغذوں میں شائع ہوئے ان میں کہیں میرا ذکر یا میرا نام نہیں۔ اور ہے بھی تو اعتراضات کی ہتھکڑیوں بیڑیوں میں مقید ہے۔ خدمتِ اردوئے معلیٰ کا خلعت دوسروں کے جسم کی زینت نظر آتا ہے۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ ایک تو میں ادیب نہیں۔ دوسرے بیمار۔ تیسرے متروک الدنیا۔ چوتھے اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ نالائقی کا خلعت جو بزرگوں نے عنایت کیا ہے اسے نامنظور کر دوں اور زبردستی کہوں کہ میرا شمار کاملینِ روزگار میں ہونا چاہئے۔ پانچویں سب سے بڑا عذر یہ کہ ڈرپوک ہوں یعنی مردِ میدان مقابلہ و مسابقت نہیں۔ پھر بھلا کیا سمجھ کے مضمون نگاری کی بانگی دکھاؤں۔ جناب میرا دور ہی سے سلام ہے۔ میں ان لوگوں کا حشر کتب تاریخ میں دیکھ چکا ہوں جن کو جہل مرکب کی بیماری نے شکل کابوسی کی طرح دبوچا اور اپنے پرائے کے سامنے بے جانی بوجھی بات میں دخل دے کے ذلیل ہوئے:۔

(۱) اسحٰق بن ابراہیم موصلی کے سامنے ابو عبیدہ نے قدما کے بعض شعر پڑھے۔ اسحٰق نے پوچھا "کیوں جی اس کلام میں کوئی حسن یا مزہ بھی ہے؟" عبیدہ نے جواب دیا "نہیں"۔ اسحٰق نے ناک بھوں چڑھا کے کہا "تو پھر کیوں گدھے کی طرح بوجھ اٹھائے پھرتے ہو؟"

ممکن ہے کہ میری بے مزہ عبارت دیکھ کے آپ سے یہی سوال ہو کہ جناب منشی صاحب آخر اس شخص کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور بے ربط عبارت میں کیا لال لگے ہیں جو آپ نے خواہ مخواہ اچھا بھلا کاغذ ردی بنا ڈالا! اے حضرت اس سے تو بہتر تھا کہ ملا فلاں

[illegible] مسٹر فلاں۔ پروفیسر فلاں سے مضمون لکھنے کی درخواست کی ہوتی جو پیدائشی ادیب و ظریف ہیں اور جن کے رشحات قلم کے [illegible] آج ہندوستان بھر کے میگزین ہیں۔

(۲) بنی تمیم (قبیلہ) کا ایک شخص ابو نواس فرزدق مشہور شاعر عرب کے پاس آیا اور کہا: میں نے ایک شعر کہا ہے سن لیجئے۔ فرزدق [illegible] کے بعد کہا: سنو بھائی شعر کو ایک ۱۰ سالہ اونٹ فرض کرو جس کے اجزا کی تقسیم یوں ہوئی کہ امرؤ القیس کے حصے [illegible] عمرو بن کلثوم نے کوہان پایا عبید بن الابرص نے ران پر قناعت کی۔ اعشیٰ کو زہیر بن علی زہیر نے پٹھے تھپائے طرف کے ہاتھ [illegible] بغتان (نابغۂ جعدی و نابغۂ ذبیانی) پہلو اور پسلیاں لے بھاگے۔ میں سب کے آخر میں پہنچا۔ تو ہم نے پنڈلیاں اور ٹانگیں [illegible] کا مالک میں بنا۔ اوجھڑی بچی تھی اس نے پکا کے کھائی مگر بچی تو زمین دیکھی اور دکھائی۔ میاں تمہاری شاعری وہی جزار [illegible] سے نکالا ہوا فضلہ ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں کوئی مستقل مضمون لکھوں تو وہ اگلوں کے پیٹ کا فضلہ سمجھا جائیگا۔ ابھی [illegible] نے بجائے خود یہ طے کیا ہے کہ پرانے اودھ پنچ کے ماخوذات جدید اودھ پنچ کے حیات کا سبب ہیں۔ اجی وہ وقت ہی اور [illegible] زمانہ ہی اور تھا۔ وہ لوگ ہی اور تھے۔

(۳) ایک شاعر صاحب نے اپنے برادر مکرم سے فرمایا کہ میں شاعر ہو گیا ہوں سنا آپ نے! انھوں نے ارشاد کیا بھائی یہ کوچہ پر خطر [illegible] تو سہی۔ شاعر صاحب مستعد ہوئے۔ ابھی ایک ہی شعر پڑھا تھا ؎

هل تعرفنا لدا ربالقفنينا   ابكينا فلحزنينا

کیا تم اس گھر کو جانتے ہو جو قفنینا میں ہے اور اس نے مجھے رلایا اور رنجیدہ کیا) نون کی نامعقول تکرار سے جھلا کے بھائی صاحب [illegible] ہوئے اور کہنے لگے "ابے مردود اگر تو نے دوسرا شعر پڑھا تو خدا کی قسم تجھے کنوئیں میں دھکیل دونگا۔"

ایڈیٹر صاحب۔ مجھ بے بضاعت فرومایہ کا مضمون دیکھ کے مبادا چاند کے خریداروں میں سے کوئی کنوئیں میں دھکیلنے پر [illegible] ہو جائے۔

(۴) ابن صباح کی کنیز جس کا نام برہان تھا۔ ابن صباح کے مہمان بنان کے سامنے گانے بیٹھی ؎

إنّ نفسي رسول نفسي اليها

ولنفسي جعلت نفسي رسولاً

[illegible] (خود میرے نفس کا معشوقہ کی طرف پیامبر ہے اپنے نفس کے لئے میں نے اپنے نفس کو پیامبر بنایا ہے) بنان نے برہان کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہا "چپ اب تو سارے گھر میں نفس نفس پھس پھس کی آواز گونجنے لگی۔"

ملتی صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ چاند میں میرا سڑا اور پھسپھسا مضمون دیکھ کے لوگ چاند کے منہ پر ہاتھ نہ رکھیں۔

(۵) ایک شاعر صاحب شعر پڑھ رہے تھے دوسرے نے تعریف کی "واہ صاحب! کیا شکر ہے جس میں مٹھاس نہیں۔"

حضرت بیمار ہوں۔ بیماری میں ٹھنڈول کسے سوجھتی ہے۔ کڑوی دوائیں پیتے پیتے زبان تلخ ہو گئی۔ سوکھے ٹھٹھے۔ یا زہر خند اور ہنسی [illegible] ایک ہی ہیں۔ تاریخ میں بڑے اور بے معنے مضمون کے نتائج بعد ہادر ہیں۔ مگر سب سے بڑا یہ واقعہ ہے کہ محمد بن حسن الحصنی کے صاحبزادے

...کو شاعری کا شوق ہوا۔ مگر وہ صرف شاعری کی تہمت اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ محاسن شعری یا معنویت کی پروا نہیں نہ تھی۔ ایک دن باپ سے [illegible]
آیا۔ ابا۔ میں نے شاعری شروع کر دی۔ باپ نے جواب دیا کہ سناؤ صاحبزادے اس پہ مچلے کہ اگر شعر آپ کو پسند آیا تو ایک لونڈی یا ایک غلام [illegible]
انعام میں لونگا۔ باپ نے ہامی بھری کہ ایک نہیں دو دو دونگا۔ اب تو صاحبزادے دل کھول کے پرکٹی اڑانے لگے۔ حضرت کو غصہ آ گیا اور [illegible]
لگا:۔ خدا کی قسم ایسے اشعار کا صلہ نہ لونڈی ہے نہ غلام۔ مگر سر دست میں تیری ماں کو تین طلاقیں دیتا ہوں۔ جس نے ایسا بیٹا [illegible]
لڑکا جنا۔

بہر کیف جناب ایڈیٹر صاحب میں عذر خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے نظم و نثر میں پھکڑوں کے ساتھ [illegible]
کرنے پر مجبور نہ فرمائیں گے۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے کوئی دعویٰ یا سلیقہ انشا پردازی میں نہیں۔ میں نے تو دو بندیں [illegible]
برائے اکل "کے طور پر یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ زیادہ نیاز۔

نیازمند
ممتاز
(ایڈیٹر اودھ پنچ)

———

ایشیا میں آج بھی لنگوٹی باندھنے والے فقیروں کے آگے بڑے بڑے ہفت ہزاری سر ٹیک کرتے ہیں۔ ایک بوریے پر آسن جمائے فقیر کے سامنے لاکھوں ہفت ہزاری ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں وہ خود کسی کے دروازے پر نہیں جاتا مگر اس کی [illegible] شہریار تک حاضری دیتے ہیں شاعروں نے اسی کی مدح کی ہے؎

سمجھنے والے کیا قدر زر و گوہر سمجھتے ہیں
اسے مٹی سمجھتے ہیں اسے پتھر سمجھتے ہیں

دیوالیے ہونے پر فخر کیا جاتا ہے؎

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھتے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے

عورتیں مثل کہتی ہیں "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان"؎

زندگی ترک سوال مدعا است
آبرو چوں جمع شد آب بقاست

آن پر جان قربان کرنے والے ہزاروں بندگانِ خدا اب بھی موجود ہیں جو فاقہ کرتے کرتے مر گئے مگر ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلایا [illegible] تمھاری تقریر اخباری کاغذوں میں دیکھی۔ ارے مردِ خدا سے ڈر کہیں تو جلی کٹی طعن تشنے (تشنیع) سے باز آیا ہوتا تو [illegible] ڈاہ کو مات کر دیا۔ ابھی نہ گورنمنٹ نے کچھ دیا نہ ہندوستان والوں نے کچھ پایا مگر واویلاہ وامصیبتاہ کا شور مچ گیا ——— " اطمینان [illegible] حقوق کا تحفظ" ایک معمہ ہے اور اسی چیستان کے حل کرنے میں نصف خزانۂ ہند ہر سال صرف ہوتا رہے گا۔ خبر نہیں کہ ایسی حالت میں [illegible] اپنے قومی حرمان کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا۔ اس وقت جو معاملہ درپیش ہے اس کی توضیح اس حکایت سے ہوتی ہے۔

دود کباب

یکے روستا از پدر کردہ قہر — سیاحت کناں از دہ آمد بشہر
زبس آں پسر چیز نادیدہ دید — بدنداں سر انگشت حیرت گزید
چو سرگشتہ از پیچ رہ خستہ بود — بر بازار رفت و زمانے غنود
درینجا زیک دکہ دود کباب — پدیدار شد روستا با شتاب
برآورد زانبان خود قرص نان — بر دودش بیالود و مخورد از آں
زنان بخورد دادہ چوں می جوید — مکرر سر انگشت خود می مکید
کبابی دُوں ابلہش دید چوں — سراسیمہ از دکہ آمد بروں
گریبان وے سخت بگرفت و گفت — کہ دود کباب اے پسر نیست مفت
ربودی متاعم ـ بزدادہ ثمن — بگو پس چہ شد قیمت دود من؟

کلام کبابی بر بہشتش فزود — بگفتا متاع کہ بودم چہ بود!
نمی خوردم از می زدود شما — نبا شد مگر دود و جز دو ہوا!
نمودند القصہ آغاز جنگ — ز پیکارشاں رہگزر گشت تنگ
دو جاہل۔ آرام با ہائے و ہو — نمودند بایک دگر گفتگو
سر کارشاں بر تر افغ کشید — دراں بین بہلول آنجا رسید
برغبت نمودند او را حکم — بدہقاں بگفت اے کہ تنہا ستم
بدہ قیمت دود کش آنگہ برد — کر نیز آں خوری مال مردم بھو!
زدے پول بگرفت وچنداں شمرد — کہ دل از کبابی صبا ایش بر برد
بردہقانی آں پول ہا دلمود — بگفت ایں ہم صدا قیمت دود بود
چہ خشے کہ بر دی ز آواز پول — کند جائے دود کبابش قبول
مشامت معطر زدود کباب — شدہ پس بشد ی ز ایں نفعا کامیاب
بر بردی اگر دود ایں پول ہم — شمرد۔ کز شمردن نگر دید کم
چو دود کبابی است گفتار من — کہ در نزد جاہل نہ دارد ثمن

بدیں رسم سلطانیہ از قدیم
کہ تہند قیمت بگفت حکیم

لوگ فارسی زبان سے کم واقف ہیں لہٰذا خلاصہ ترجمہ اس کا لکھے دیتی ہوں کہ ایک صاحبزادے اماں باوا سے روٹھ کے گھر سے نکل گئے۔ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ دیہات سے شہر میں جو پہنچے تو ہر چیز نئی معلوم ہوئی۔ جو چیز دیکھی بھو نچکے رہ گئے کہ اہا ہا یہ کیا ہے [illegible] پھرتے پھرتے ایک کبابی کی دکان تک پہنچے۔ بھنے ہوئے گوشت کی چراہند مسلمان کو بہت بھاتی ہے۔ مرزا قتیل جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے کہا کرتے تھے "ایں بوئے کباب رونے مرا مسلمان خواہد کرد"۔ صاحبزادے کے پاس دام تھے مگر کنجوس تھے کباب کا دھواں غنیمت سمجھ کے وہیں بیٹھ گئے اور روٹی نکالی۔ ایک نوالہ توڑا سیخ کباب پر جھکے ناک سے دھواں سڑکا اور نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ القصہ دھوئیں سے لگا لگا کے روٹی ختم کی۔ کبابی نے جو دھوئیں کی پونجی مفت لٹتے دیکھی بہت جھلایا دودھ غضب کا رخ دماغ سے پار ہوا۔ ایک کے گنوار نے لونڈے کی پگڑی اتار لی اور کہا "سیدھی طرح دھوئیں کے دام ڈھیلے کر دو اسی میں خیر ہے ورنہ کوفتہ بنا کے رکھ دوں گا۔ صاحبزادے منت کرنے لگے کہ بھائی تمہارا کیا نقصان ہوا آخر یہ دھواں ہوا میں مل کے اڑ ہی تو جاتا۔ کسی بندۂ خدا کا بھلا ہو گیا تو کیا برائی ہوئی۔ مگر لالچی کبابی کے ہتھے ایک بے وقوف چڑھا ہوا تھا وہ کیوں چھوڑتا۔ اتفاقاً ادھر سے حضرت بہلول دانا جنھیں پاگل مؤرخ دیوانہ کہتے ہیں چلے آتے تھے۔ دونوں نے بہلول کو پنچ مقرر کیا۔ طرفین کی روداد سن کے بہلول نے دہقان بچے سے کہا "جب تم نے دھوئیں پر تصرف کیا ہے تو قیمت ادا کرو"۔ پنچ مقرر کرنے کے بعد حیل حجت کا محل نہ تھا۔ ناچار ہمیانی کا منہ کھولنا پڑا۔ بہلول نے روپیہ اپنے ہاتھ میں لیے اور کبابی کے کان تک لے جا کے کھنکھنانا شروع کیا۔ کھن کھن کھنانا نانا۔ کبابی اس جھنکار یا کھنکار سے پھولوں نہ سمایا کہ واہ "اللہ دے اور بندہ لے" ہاں صاحب روپیہ کی صدا ایسی ہوتی ہے لوگ بنک گھر میں جا کے سنا کرتے ہیں۔ چنانچہ

ایک مفلس فقیر کا ذکر ہے کہ وہ پہلی مرتبہ بنک میں بھیک مانگنے گیا۔ بہت سے پنشن لینے والے انگریز اعلیٰ درجہ کی وردیاں پہنے فورٹ اور نقدی لے کے جو وہاں سے نکلے تو اس نے چپراسی سے پوچھا یہ کیوں جی یہ لوگ کہیں کے بادشاہ ہیں۔ دیکھو تو کیسی عمدہ پوشاکیں ہیں اور کتنا روپیہ ان کے پاس ہے" چپراسی نے جواب دیا تم بھی نرے بے وقوف ہو۔ اجی یہ سلطانی غلام (نوکر) ہیں تنخواہیں لینے آئے ہیں۔

مفلس فقیر نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہنے لگا دیکھ اے میرے مالک غلاموں کی پرورش یوں کرتے ہیں۔ اگر تجھے بندہ پروری کی عادت معلوم نہیں تو بادشاہوں سے سیکھ لے۔"

جب کانوں میں روپیہ کی کھنکھناہٹ خوب بج چکی تو بہلول نے دہقان بچے کو اس کے روپے پلٹا دیئے۔ "لو صاحبزادے اپنا مال تم نے اس کے دھوئیں سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے تمہارے مال کی کھنکار سے دل خوش کیا جیسا مال ویسی قیمت۔ ما بخیر شما بسلامت۔ نہ کباب کے دھوئیں سے اس کے کبابوں کو نقصان پہونچا نہ جھنکار کی "دانہ" نے تمہارے مال میں کمی کی۔ کہو میاں کبابی "دو دو کباب" کے دام پائے؟

میاں چرچل! گول میز کانفرنس میں "دو دو کباب کی قیمت" ہی کا معاملہ درپیش تھا۔ ہندوستانی دہقان زادے ملکی اُدھم سے جو ان کے مقاصد بیان کے مفسر ہے۔ ناخوش ہو کے لندن گئے اور وہاں کبابی کی دکان سے دھواں اٹھتے دیکھا۔ مر بھکوں کی طرح پتلیوں کی جیبوں سے سوکھے ٹکڑے نکالے اور بیت بھرنے لگے قیمت اس دو دو کباب کی کانگرس والوں سے مانگی جاتی ہے۔ کانگریس کا پولیٹکل بہلول "زور است کہ از صدائے زر کامل العیار قیمتش بدہد" بالفعل تو اور بیت بازی ہو رہی ہے۔

چلر کمپنی کے ہندوستانی شریک سے

کانگریسی اہل ملک سے

تشدد پسند ہندوستانی۔

حکومت ہند اور اس کی پالیسی کہتی ہے سے

من بلاگردان این یالات بشم[1] — من فدائے حلقہ چشمات بشم[2]

گر کسے می گردد روزا زبراے — تن بقرباں ہمیں حالات بشم

بنگریا این حسن روز افزون تو — می توانم مخلص فردات بشم

چوں بہر عضو تو یک خاصیت است — من فدائے جملہ اعضات بشم

صد ہزاراں ادا است دریک ہو در تو — معتقد من کدام ادات بشم

"کر بگر لیکم"[2] شاہ پیش بازی کتابانہ ات — مات شدم من چراں بخواہم مات بشم

از برائے دیدن بابا مگر — چند باید نوکر با بابات بشم

بسکر یا الوات دیدم دلبراں — مصلحت گر بدکہ من ہم لات بشم

عاشقی را بیں کہ بعد از این ہمہ — تازہ می خواہم کہ خاطر خوات بشم

مصلحت کے غار میں بیٹھنے والی نگاہیں کہتی ہیں کہ اس بیت بازی اور غزل خوانی کا نتیجہ اور اس حکایت کا نتیجہ یکساں ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک میاں نے شادی کی۔ جو رو ذری کاہل تھی جھاڑو بہار و سے کھلتی تھی میاں نے اپنی ماں سے کہا "اماں تم جھاڑو دو میں تمہارے ہاتھ بہر کہہ کر ستھرائی سے لو نگا کہ ہائیں میرے ہوتے تم زحمت اٹھاتی ہو۔ لاؤ میں جھاڑو دے دوں۔ شاید اس بہانے سے حمیدہ بیگم اپنی فرد گزاشت پر متنبہ ہو اور وہ جھٹ جھپٹ اماں نے جھاڑو ہاتھ میں لی۔ صاحبزادے نے مشورے پر عمل کیا۔ دلھن بیگم تھیں پالاک انہوں نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک روز اماں دیا کریں ایک روز تم دو۔ بس "

نقی آرا بیگم

[1] مخفف بشوم [2] چشمانت کا مخفف ۱۲ [3] کانگریسی شطرنج کا میر خطاب بہ مسٹر رامزے [4] تصرف ہے مذمت سے بدل گئی مگر میاں ملات معنی "لیٹھ" یا "لات" کا سمجھنا چاہیئے ۱۲۔

فتنہ و عطر فتنہ

عقیل احمد جعفری

بے خزاں دیدۂ بہار رہا　　　صفحہ از "ریاض" بازکشا

وہ لوگ جنھوں نے ریاض کو صرف سنا ہے دیکھا نہیں ہے ریاض کی شخصیت کی جاذبیت کا راز ان کی خوش صورتی میں مضمر سمجھتے ہوں گے۔ انھوں نے کاش ریاض کی وہ تصویر ہی دیکھی ہوتی جو خود ریاض نے اپنے ایک شعر میں یوں کھینچی ہے ؎

"بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں!"

ورنہ خست، قوطز، نوایجاد، سہرے بٹن کی نظر اذ درا اچکن جس پر لفظ "ریاض" سلمے کے کام سے نمایاں طور پر کڑھا ہوا، بڑی اور کھڑی مونچھیں تھی بل کھائی ہوئی کبھی تنی ہوئی ایک فٹ کی ٹوپی اونچی جس کی توصیف میں خود کہا ہے ؎

چوٹیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں
میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں!

ہے ریاض کی وہ تصویر جس پر ایک زمانے میں ایک زمانے کی نگاہیں پڑ رہی تھیں ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

فتنہ! آہ چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار جو مذاق کی شگفتگی، شستگی اور پختگی اور تخیل کی جدت، ندرت اور نزاکت کی گویا کھنچی ہوئی روح تھا۔ ہلکے رنگ سے رنگے ہوئے اور کٹے ہوئے ورق گویا ورق گل، پاکیزہ کتابت خط، حسین سیاسی کارٹون، دلچسپ اسکیچ، منتخب اشعار اور چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ادبی سیاسی ظریفانہ مضامین ——— یہ تھا فتنہ ——— یہ تھا فتنہ کہ "پیام یار" جو دل سے زبان پر آ گیا، جو دماغ نے قلم کے سپرد کر دیا۔ کوئی "فتنہ" کو فتنہ کہے یا قیامت مگر میں تو اسے ریاض کی رنگین زندگی کا ایک خوشنما ورق سمجھتا ہوں اور بس ؎

"فتنہ" کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا؟

فصل گل کے سے فصلی مضامین ہر فصل و موسم کے اعتبار سے جدید اور لذیذ، وہ ہلکی ہلکی مذہبی چوٹیں، وہ رندانہ سرمستانہ کیفیتیں، وہ نثر شاعرانہ،

وہ نظم تاقدانہ، وہ عنوان کی جدت، وہ خبروں کی لطافت اور وہ زبان کی نزاکت کہ ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

وہ نازک خیالیاں اور وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے شاہدِ معنی کی گرفتاریاں۔

اور سنیئے "فتنہ" میں خبریں بھی ہوا کرتی تھیں مگر صرف وہ خبریں جن میں کوئی نہ کوئی ظرافت کا پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔

حسرت موہانی اسی "فتنہ" کی نسبت "اُردوئے معلّٰی" میں تحریر فرماتے ہیں:

گورکھپور کا "فتنہ" مارچ ۸۳ء میں جاری ہوا۔ حضرت ریاض کی شوخ مزاجی اور برق طبعی نے "فتنہ" نام تجویز کیا اور "کُل قصبہ فتنۂ" کی سُرخی حسبِ حال اس کا عنوان قرار پائی۔ وقت کی خوشحالی سے حکیم برہم، شاد، شوخ نگار، فطرت، سحر نگار وغیرہم اچھے اچھے لکھنے والے اس کے معاون تھے۔ حضرت ریاض کا یہ دعویٰ تھا کہ اس وضع اور اس رنگ ڈھنگ کا روئے زمین پر کوئی اور پرچہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ بعد میں ایک یوروپین افسر سے جو "فتنہ" کا عاشق تھا یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک زمانے میں ایک پرچہ اسی تقطیع کا فرانس میں بھی موجود تھا مگر رنگ کے لحاظ سے "فتنہ" پھر بھی لاثانی ٹھہرا۔

ابتدا میں صرف فتنہ ہی شایع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر نثر کے شوخ اور چلبلے مضامین ہوا کرتے تھے مگر کئی سال کے بعد اس کے ساتھ ایک حصہ نظم کا بھی نکلنے لگا جس میں اُردو زبان کے تمام گلدستوں سے چوٹی کے اشعار چھانٹ کر درج کیے جاتے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے اس کا نام "عطرِ فتنہ" بہت صحیح تجویز کیا گیا اور حضرت ریاض کا شعر ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

زیبِ عنوانِ "عطرِ فتنہ" ہونے کی وجہ سے تمام دنیائے ادب میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ "فتنہ" کی ابتدائی جلدوں میں ایسے ایسے لطیف مضامین نکلے ہیں جن کو پڑھ کر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ ۸۵ء کا ذکر ہے کہ مدیر "صلائے عام" دہلی نے ایک خط میں ایڈیٹر "فتنہ" کو لکھا تھا کہ "اگر ولایت میں ایسے لکھنے والے ہوں جیسے "فتنہ" میں ہوتے ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سیکرٹری آف اسٹیٹ ہو کے رہیں۔"

"فتنہ" کے متعلق "سید الاحرار" کی وقیع رائے معلوم کرنے کے بعد اب آیئے "فتنہ" کی تعریف خود "فتنہ" کی زبان سے سُنیں:

"فتنۂ عالم" کے اس لوہٹے سے قد اور چھندنے سے ڈیل پر کہیں فتنہ سامانوں کی نظر نہ لگ جائے۔ ایک تو ماشاء اللہ حُسنِ خداداد نوک کا جوان، اس پر خوش نما لباس، گلے میں طلائی مجدول کا جڑاؤ کنٹھا، سنہرے لفظوں کا نازک نازک زیور، بین السطور چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ہار، اللہ رے نکھار، اللہ ری بہار، ہزار جیو صدقے کروں جب بھی جی نہ بھرے۔"

اس "چند تصویرِ بتاں" اور "چند حسینوں کے خطوط" والے مرقع کی کوئی کوئی تصویر کیا آپ دیکھنا پسند نہ کریں گے؟

"قہر نگار"، "شوخ نگار" اور "میاں رمضانی" ——— وہ میاں رمضانی جن کا ایک مضمون دیکھ کر میر ناصر علی چیخ اٹھے تھے:

"اُردو اخبار دیکھنے کا اگر کوئی نتیجہ نہیں تو بھی "فتنہ" میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ

مدّت کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہے۔

تارک الصوم سے مخاطب ہوکر جو باتیں میاں رمضانی نے کی ہیں اُردو لٹریچر کے عمدہ سے
عمدہ نمونوں میں سمجھیے۔ مجھے فرصت ہوئی تو ایسے پاکیزہ خیالات کے جمع کرنے میں
بہت محنت کروں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ملک کے اہلِ کمال
اُردو میں کیا کیا لیاقتیں دکھا سکتے ہیں ——— قصور ہے تو زمانے کا کہ اس کے داد
دینے والے بھی نہیں ملتے۔"

وغیرہ کے ساتھ چھوٹے اور البیلے مضامین کے ساتھ ایک اور مضمون نگار کا نام بھی "فتنہ" کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ حضرت ریاض کا اصلی کمال یہ تو ہے ہی کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انشا پردازی میں ایک طرزِ خاص کے بانی تھے لیکن ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف ایک نیا طرز ہی نظم و نثر میں نہیں نکالا بلکہ اس کو ایک "اسکول" کی حیثیت دے کے چند اپنے رنگ کے لکھنے والے بھی پیدا کر دیے۔

ریاض الاخبار

اے عندلیب رنگ ہمارا اڑائیو
تقلید میں بھی تا ۔ ہے ایجاد کا مزا

"ریاض الاخبار نے اپنے طرز میں جو اعلیٰ درجے کی نمود حاصل کی ہے وہ اس لائق ہے کہ زمانے کو اس پر ناز ہو۔ شاہد پرستانِ سخن سے اس کی قدر پوچھیے اور عروسِ مذاق کے نکھار پر مٹے ہوئے ہیں ان کے دل سے پوچھیے۔ شوخیوں نے ہر چند ابھی تیز چٹکیاں نہیں لی ہیں پھر بھی ہلکے ہلکے نیلے سایے نظر آرہے ہیں چٹکیوں نے ابھی چھپتا ہوا اثر نہیں ڈالا ہے پھر بھی کس مزے سے گدگدی اٹھ رہی ہے ـــــ سامان وہ فراہم ہوئے کہ طاؤسِ میاں رقص کے عوض اس کے ورق بھلے معلوم ہوتے ہیں ـــــ جنھیں شعر و ادب سے لگاؤ تھا وہ اس کی پرستش کرنے لگے جنھیں پولیٹکل مضامین کی چاہت تھی وہ اس پر مر مٹے۔ ناول کی شہرت کا وہ شور ہوا کہ ہنگامۂ محشر سمٹ کر یہیں آرہا۔

اس پرچے کی خواہش ہے کہ اپنی حالت کو اپنے حوصلے کے موافق سنبھالے۔ وہ بات پیدا کرے کہ ملک کو اس کے وجود سے فخر حاصل ہو۔"

ریاض الاخبار ۹۳ء

حُسنِ سرِ رہ گزر

۱۔ زرّیں کالم

ریاض الاخبار نے نادہندہ خریدارانِ اخبار کے خلاف بطور پروٹسٹ ایک یہ جدت کی تھی کہ ایسے حضرات کے نام مدّتِ انتظار گزر جانے کے بعد سیاہ جدول میں بڑے بڑے حرفوں سے شائع کرتا تھا۔ اس کے برعکس خوش معاملہ خریداروں اور معطیوں کو وہ زرّیں کالم میں جگہ دیتا تھا ـــــ عنوانِ بالا کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"دنیا میں وہ حضرات بھی ہیں جن کے نام خاص کالم کے نذر کیے جاتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا یہ ساتھ ہی

بعض ایسے بھی ہیں جو اشخاص مندرجۂ خاص کالم کی تیغ تغافل کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نام جس کالم میں درج ہوں اس کو زرّیں کالم سے تعبیر کرنا مناسب ہے ؎

کام آتی ہے حسینوں کے کسا ئی میری
جو مجھے دیں مرے اللہ خزانے پائیں

جو لوگ اخباری دنیا سے باعتبار دیسی مذاق کے واقف ہیں وہ زرّیں کالم کی سیادت کو بہت ہی نگاہِ قدرت دیکھیں گے ہم نے آئندہ کے لیے پسند کیا ہے کہ خاص کالم کی ترمیم سیاہ کالم سے کر دیں اور وہ سیاہ کالم زرّیں کالم کے دوش بدوش رہے کہ .... قدمے فاصلہ دارد کا مضمون صادق آئے۔

۲۔ ذیل کی خبر ہرگز قابلِ اعتبار نہیں

اخبار "تحفۂ ہند" میں ایک "سنسنی خیز" خبر شائع ہوئی۔ ریاض الاخبار تعلقات کی بنا پر اس خبر کو اپنے اخبار میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن خبر اتنی دلچسپ تھی کہ بے شائع کیے بھی نہ رہتا تھا۔ آخر اس دلچسپ اور معنی خیز مندرجہ بالا تشریح کے ذیل میں وہ خبر شائع کر دی:۔

"نواب بہاول پور، راولپنڈی سے افغانی دربار میں حسبِ دستور گز بھر کا اونچا عمامہ اور مرصع سرپیچ باندھ کر تشریف لائے۔ لاکھوں روپے کے سونے کے زیور اور جواہر لدے ہوئے۔ انگریز افسر نواب صاحب کو جب امیر کے ڈیرے میں لے گیا تو نواب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ امیر نے کہا السلام علیکم۔ جواب ندارد۔
امیر نے پوچھا "حالتِ انتظامِ مملکتِ شما چیست"۔ جواب میں خاموش۔
امیر نے فرمایا "نواب چہ گونہ وچہ حال داری وترا چہ شد"۔ وہی سکوت
الغرض امیر جھلا گئے اور برآوازِ بلند کہا:
"ایں بے چارہ را راہ گزارید کہ با طفلاں یا زناں بازی وملاعبت نماید یا بگوئے وچوگاں مشغول شود"۔
نواب صاحب بہ زبانِ حال شکریہ ادا کرتے ہوئے خیمے سے نکل آئے ؎

اگر نقوشِ مصور ہمہ ازیں جنس اند
خواہ دیدۂ بینا خنک تنِ اعمیٰ"

۳۔ تازہ ایجاد

اسپین میں اور اس کی وجہ سے کیوبا میں بلکہ یورپ کے کل کیتھولک گرجا گھروں میں عبادت کے ساتھ بیہودگیوں کے بھی مرقعے ملتے ہیں۔ اسپین کی عورتوں میں ایک خاص کمال یہ ہے کہ وہ اپنی پنکھیوں کے ذریعے سے عام جلسوں میں اپنے دوستوں سے باتیں کر لیتی ہیں ——— ایک صاحب حال میں کیوبا گئے تھے وہ بیان کرتے ہیں ——— میں گرجا گیا میرے ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے انھوں نے مجھ کو کچھ حال پنکھیا کے ذریعے سے اظہارِ مدعا کی ترکیب کا سمجھایا۔

"کھنٹے ہیں ہم بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک نوجوان خوش پوشاک، خوب صورت لیڈی گرجا میں آئی۔ پہلے تو اس نے کچھ عبادت کی اس کے بعد چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کرتی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی پنکھیا کو پورا کھولا۔ میرے دوست نے یہ بتایا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس نے اپنے مطلوب کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے پنکھیا کو آدھا بند کر دیا، اس کے یہ معنے ہوئے کہ آؤ مجھ سے ملو۔ پھر اس نے بند پنکھیا کے بالائی نصف حصے پر چار انگلیاں رکھیں مطلب یہ کہ ساڑھے چار بجے۔ پھر یکایک اس نے پنکھیا گرا دی، اس کے معنی مجھ کو یہ بتائے گئے کہ میں اس وقت تنہا ہوں گی۔"

ریاض الاخبار:- پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنا مدت سے ہے، افسانوں میں بھی اس کا ذکر ہے، حرم سرا میں بھی۔ جہاں تک پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنے کا تعلق ہے یہ ایجاد عربوں کی جدت طرازیوں کی یادگار معلوم ہوتی ہے اور جہاں سے پنکھیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اسپینیوں کی بدمذاقی ہے۔

بیل کی سرگزشت

ریاض خیرآبادی

بیل بن کر کس مصیبت میں پھنسے ہم ناتواں،
سرگزشت اپنی بیاں کس سے کریں ہم جان ہار

دُودھ میں ماں کے تھے ہر قوم کے بھائی شریک
بھائی بن کر بھی نہ یہ سمجھے کہ میں ہوں شیر خوار

رکھ کے بھوکا ہم کو اپنا پیٹ سب بھرتے رہے
کہہ کے ماتا دھوکے دیتے تھے اسے بھی بار بار

اس کو آتی تھی محبت منہ ہمارا دیکھ کر
چاٹتی تھی پیار سے کس طرح وہ الفت شعار

دودھ اُترے ماں کا دو منہ ہم نے مارے اس لیے
ورنہ یہ منہ تھا ہمارا دودھ کرتے زہر مار

ہم بندھے رہتے تھے تھن کے پاس ماں کے پاؤں سے
منہ کے بدلے ہاں کھلی رہتی تھی چشمِ انتظار

دُور تھا منہ سے ہمارے تھن بھی ظرفِ شیر بھی
اور ظرفِ شیر سے باہر نہ جاتی کوئی دھار

ساتھ ماں کے جب چلے منہ پر چڑھی جاتی ضرور
اب ترس آتا ہے کس کو لاکھ ہم ہوں بے قرار

آنکھ پر سب کے چڑھے جب کچھ نکالے ہاتھ پاؤں
سینگ بھی آنے نہ پائے ہو گئے نظروں میں خار

نوجوانی رنگ بھی لائی تو کس آفت کا رنگ
کیا کہیں اپنی خزاں ہم کیا کہیں اپنی بہار

ایک آفت جوتنے کو ہل میں ہم جوتے گئے
ہر طرف ہل چل گئے کیا ہو گئے وہ سبزہ زار

کھینچنا وہ ہل جو چلتے ہوں زمیں کو پھاڑ کر
گو زمیں پتھر سے بھی ہو سخت ایسے نوک دار

ایک حالت پر گزر جانے لگے دو دوپہر
ماں کے تھن کا دودھ آیا ہونٹ پر اُف رے فشار

آ گیا بھاری جُوا گاڑی کا گردن پر کبھی
ہم نے گو میدان جیتے پھر سمجھے اپنی ہار

ہم نے کیسے کیسے چھکڑے کھینچے دلدل میں پھنسے
بوجھ ہم نے یوں اٹھایا جس طرح عصیاں کا بار

کھانے پینے کا نہ کوئی وقت تھا آرام تھا
ٹھوکریں کھا کھا کے گرنا اور چلنا بار بار

موسم گرما میں دن کی دھوپ [illegible] سخت و تیز
موسم سرما میں شب کی اوس کیسی ناگوار

ہم اگر تھک کر کبھی بیٹھے تو منہ چلتا رہا
تھا ہماری زندگانی پر جگالی کا مدار

خون سوکھے دیکھ کر کھانے کو وہی خشک گھاس
جس کو پی کر خون پانی ہو وہ آب ناگوار

جیسے جی گویا بھرا جاتا تھا بھوسا کھال میں
سوکھے ڈنٹھل بھوک کی شدت میں کرنا زہر مار

پگھلے چربی جس سے کولھو میں کھلی اس تیل کی
وہ بھی قسمت سے مہینے میں کبھی دو چار بار

دانہ بن جائیں تو بن جائیں بدن کی پھنسیاں
اس کا بدلہ بھی بھگتنا ہم کو تا روز شمار

آندھی آئے پانی برسے ہم کو چلنا رات دن
ساتھ دے تو اس طرح دے گردش لیل و نہار

ہائے وہ سُوجے ہوئے پھولے ہوئے کاندھے کا زخم
بوجھ بھاری سخت منزل اُونچی نیچی رہگزار

بے سکت، پالنگ، لاغر ناتواں زار و نحیف
بھوکے پیاسے زخم خوردہ سینہ ریش و دلفگار

رفتہ رفتہ دے دیا طاقت نے بھی بالکل جواب
بیٹھ کر اُٹھنا ہوا مشکل ہمیں انجام کار

جان بچنے کے ذریعے جس قدر تھے سب مٹے
رحم کے قابل نہیں اب بھی ہمارا حال زار

باندھ کر بیچ ہے کھلائے کون بوڑھے بیل کو
کون پالے ہم کو اس حالت میں اے پروردگار

وقت نازک عمرِ آخر جان دو بھر حالِ غیر | سر پر اب قصاب پہنچے لے کے چھریاں اور کٹار

…ات کھنے کر دئے ہر عضو کے ٹکڑے جدا | قیمہ قیمہ کر دیا بے دردیوں سے جسمِ زار

ریشے ریشے پر ہمارے دانت تھا ہر ایک کا | آدمی کیا چیل کوے ٹوٹے ہم پر بے شمار

حصے بخرے ہو گئے کچھ بٹ گیا کچھ لٹ گیا | گوشت اپنا تکے بوٹی ہو گیا انجام کار

کھال باقی رہ گئی تھی اس کے نقارے منڈھے | شامتِ اعمال سے پڑتی ہے اب اس پر بھی مار

ایک ناکردہ گنہ کا حال یہ ہے اے ریاض | وہ بھی اک بے عقل بے بس بے زباں بے اختیار

دیکھئے ہوتا ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا حشر
دیکھئے پاتے ہیں کیا پاداش ہم سے زشت کار

چٹکیاں اور گدگدیاں

ریاض خیرآبادی

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

ہماری اس آرزو میں ہمارے سید احمد خاں بہادر بھی شریک ہیں شاید اوپر کے دل سے۔ اخبار والوں نے کعبہ پہنچا دینے کا کوئی دقیقہ اٹھا ہی نہیں رکھا تھا ؎

وہ تو کہیئے بچ گئے فصلِ بہار آنیکو تھی

کسی نہ کسی طرح جھوٹ سچ بول کر بیچارے سید نے اپنا دامن چھڑایا۔

ہمارے بُرے بھلے سید کو لوگ یہیں پڑا رہنے دیں تو بہتر ہے اور اس بُرے وقت میں بہتیرے کام اس سے نکلتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو معتقدین سید سے سید ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ ہزار چھیڑ چھاڑ پر اس سے نہ ہو سکا کہ عزم حج کی خبر شہرت کرنے پر اپنی زبان سے تردید کر سکتے۔ کہا تو یہی کہا عزم مصمم ہے جب خدا لیجائے ـــ مگر معتقدین کے تو آگ ہی لگ گئی۔ ایک نئے بگڑے ہوئے میاں رمضانی ہیں کئی فاقوں میں آپ نے ایک مضمون چست کیا مگر واہی واطواف بیت اللہ کے نام پر آپ اس طرح جامہ سے باہر ہوئے گویا شیطان نے انگلی دکھا دی۔ ان کو جب حج کی ضرورت ہوگی تو علیگڑھ سوجھیگا ؎

کسی کا دل پاک ہے سنگِ اسود
بڑھو کہہ کے لبیک یا سید احمد

ہمارے نزدیک اخبار والوں نے غلطی کی جو یہ لکھا۔ الفاظ میں تغیر و تبدل ہوتا تو اچھے رہتے انہیں لکھنا چاہیئے تھا کہ سید صاحب خدا کے گھر جانے والے ہیں۔ اس صورت میں کوئی تردید نہ کرتا۔

دیر سے کعبہ کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

سید صاحب کے ایک عقیدت مند کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب حج کو نہ جائیں گے۔ ان عقیدت مند کا نام محمد رضاؔ

ہے جو سکرٹریٹ گورنمنٹ پنجاب میں ہیں۔

ان کو اور سید صاحب کو یوں سمجھیے کہ ایک ہی خاک کے چند ذرّے ہیں جو شکست کردہ قالبوں میں کم و بیش جا بسے ہیں۔

عقیدت مند صاحب پہلے اڈیٹر ناصر سے بگڑتے ہیں اور وہ تیرہ خیال جو درد دل کی طرح دماغ میں گھٹے ہوئے تھے کچھ ظاہر کئے ہیں سید صاحب کے عزم حج کے متعلق آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"وہ اس قابل نہیں ہیں کہ مکہ معظمہ کے مصائب اٹھا سکیں۔ انہیں دس پانچ قدم چلنا مشکل ہے۔ بوجہ جسامت بیت اللہ اونٹ کی سواری اور بیت اللہ کے گرد ننگ دھڑنگ برہنہ سر طواف کرنا بہت دشوار ہے۔"

اونٹ کی سواری گویا گدھے کی سواری سے گری ہوئی ہے۔ سچ ہے ماں کے پیٹ سے جو کوٹ پتلون پہنے نکلے بھلا ان کو ننگ دھڑنگ ہونا یا تہمد باندھنا کیوں نہ دشوار ہو۔

صاحب کشف الاخبار نے براہ راست سید صاحب سے دریافت کیا تھا۔ جواب ملا:

اس فریضۂ اعلیٰ کے ادا کرنے کا مثل اور مسلمانوں کے میرا بھی مصمم ارادہ ہے لیکن بعد عید الفطر غلط۔ اخباروں کی نیک فال کا شکر گذار ہوں۔

مبارک بود فال مرغ زدن
نہ مرغ زدن بلکہ شہ رخ زدن

ہماری خاک تھی کیا فتنہ انگیز
بنے سات آسماں دو گز زمین کے

ہمارے سرسید کو عاقبت کی فکر ہو یا نہ ہو اپنے گورگڑھے کی بھی فکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو ہم ان کو مرد آخر بیں نہ تسلیم کریں گے اور اگر ہے تو ہمیں بتائیں انہوں نے اب تک کیا کیا۔

ہم ان کے خیر اندیش ہیں۔ چاہتے ہیں جس طرح مدرستہ العلوم کی بابت ان کی محنت ٹھکانے لگی مٹی بھی ٹھکانے لگے۔ بے وقوف ہمارے الفاظ کو فال بد سمجھیں۔ ہم ایسوں کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ گور گڑھے کی فکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدانخواستہ سرسید کوچ کا قصد کریں یا ہماری طرف سے تقاضہ سمجھیں خدا ان کی عمر میں اس قدر برکت عطا فرمائے جتنی اپنے فرشتہ خاص کی عمر میں برکت عطا فرما چکا ہے۔

یہ ہماری محض خیر اندیشی ہے کہ جو بات ان کو نہیں سوجھتی وہ ہم سجھائے دیتے ہیں۔ ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ صرف اپنی مٹی برباد ہونے ہی کی فکر نہیں کرتے بلکہ مرنے سے پہلے اپنے دائمی رہنے کی جگہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی باغ میں۔ کبھی کسی بزرگ کے پائیں مزار بھی ٹھہر ہی ہیں۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے جانشین نامزد کرتے ہیں۔ یہ تو سرسید بھی کر چکے۔ باقی ہے تو وہی بات جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ علیگڑھ کی سرزمین نے ان کے لئے بے طرح کشش دکھائی ہے ورنہ لندن جا کر ان کا واپس آنا

یعنی ہو ——— بیچتے جی اس لئے ان کو بزور کھینچا ۔ خدانا نخواستہ مرنے پر واگذاشت کی کیوں ٹھہرائے گی مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ علیگڑھ میں کس جگہ کی زمین ——— یہ کچھ ہم لوگ تو ہیں نہیں جن کے لئے کہنا پڑے ۔

ہم میکشوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ
حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

ان کی مبارک لاش کے لئے تو ہر طرف سے زمین دوڑے گی خصوصاً جب پہلے سے تصفیہ نہ ہوا ہو گا ۔ مرنے پر اس کشمکش کو اٹھا رکھنا عقل انجام بین کے خلاف ہے ۔ یہ بات سمجھا تو ہم نے دی اب سوچ کر اس کا تصفیہ کرنا سرسید کا کام ہے جن کو ابھی تک اس کی خبر نہیں ہے ۔

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

قرین قیاس تو یہی ہے گو ان کی کوٹھی نے اپنی کشش ان کے لئے اچھی طرح ثابت کی ہے اور جہاں انسان شب کو رہتا ہے وہیں نیند بھی خوب آتی ہے مگر یقیناً وہ اسے پسند نہ کریں گے ۔ یہ حضرت والہ و شیدائے مدرسۃ العلوم ہیں جب پسند کریں گے تو مدرسۃ العلوم کی زمین کو ۔

اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہو گا کہ مقبرہ کے لئے بہت کچھ عمارت متعلقہ مقبرہ کی ضرورت نہ پڑے گی ۔ کسی کمرہ میں اگر زمین دوز قبر پسند کر لی تو مقبرہ کی چار دیواری اور گنبد کا بھی جھگڑا گیا ۔ اور اگر علٰحدہ جگہ لی تو مقبرہ کی عمارت سے مدرسۃ العلوم کی نمود اور بھی بڑھ جائے گی ۔

خیر وہ بیرونی زمین کو پسند کریں یا اندرونی زمین کو ۔ چھوٹے سے احاطہ میں بیرونی سرو نما کچھ مٹی کا نشان نظر آئے یا زمین دوز قبر پر سبزہ لہرائے یہ ہو گا جب ہی کہ جب پہلے سے تجویز ہو اور یہ تجویز بھی کسی قانون کی دفعہ سے متعلق کر دی جائے تاکہ اسی اکھاڑے کے پچھیتی پہلوان مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو وقت پر اڑنگا لگانے کا موقع نہ ملے ۔

اس وقت باغ کی ہوا موافق ہے ۔ کثرت رائے سے جو کچھ کرنا ہو کر لیا جائے وہ جانشین کے اکھاڑ دینے کو تو چوکے نہیں بعد کو گڑے مردے اکھاڑنے کے لئے بھی دریغ نہ کریں گے ۔ انہیں کب تاب آئے گی کہ مرنے کے بعد سرسید مدرسۃ العلوم کی زمین پر دائمی قبضہ کریں ۔ لائف سکرٹری ہونے کے لئے تو موت نے وقت محدود کر دیا تھا اس کے لئے تو یہ اعتقاد سرسید قیامت بھی نہیں ۔

ریشِ مومن

لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے ۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجینئر و یکتائے فن زلزلہ کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند معتقد رئیس و روسائے شہر تشریف فرما تھے ۔

فتنہ اور عطرِ فتنہ کے مضمون نگار

(۱)

ہم کو شۂ بتاں میں تھے ماہِ رمضان آیا
صد شکر کہ مستی میں سمجھے نہ کہاں آیا

ہم وہ طریقے بتائیں گے کہ روزہ تو ہو مگر معلوم نہ ہو۔

سُنیے! راتیں ہیں تو گرمیوں کی بس اک ذرا ہوا سنک رہی ہو پھر کیا کہنا۔ کھلے ہوئے صحن میں اُجلا فرش اور اس سے لطیف چھٹکی ہوئی چاندنی، جھکا ہوا آسمان اور اس میں اُبھرا ہوا چاند، پھیکے پھیکے ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ دھوپ کسی شمار قطار میں نہیں۔

فرش ہو، فرش پر گاؤ تکیے اِدھر اُدھر دس پانچ کرسیاں، دو ایک کوچ، چھوٹا سا چمن زار اور اس میں ہرے بھرے نیچر گل بس اتنے کہ ہوا کی ہلکی سنک بھی بوئے گل لوٹے اُڑے۔

یہ بھی تکلف ہیں داخل ہو تو ہرا بھرا سبزہ وہ بھی نہ ہو تو ہری بھری دوب، اس کے نمو کے لیے تو وضو کا پانی بھی بہت ہے نہ کہ جب توجہ ہو تو بہت پھیل کر جگہ لے سکتی ہے۔

یہ سامان بھی نہ ہو تو جھاڑ دار درختوں کی ملتی جلتی شاخیں اپنے نازک ہاتھوں سے ہوا کی موجوں کو پینگ دے رہی ہوں اتنے میں بھی روزہ وصول ہے۔

دس پانچ احباب ہوں، کوئی فرش پر تکیے کے سہارے کوئی کوچ پر کوئی کرسی پر۔ بوٹے سے قد والوں کی طرح صراحیوں کی قطار ہو، ان پر کاغذی آبخورے اور یہ سب اس سوندھی مٹی کے جس سے ہم پارسا وضع رندوں کا خمیر ہوا ہے۔ ہوا پانی کو ہم سے زیادہ سرد کر رہی ہو۔ ہار، پھول، عطر، پان، پیچوان، سٹک، گلی بقول امیر ؏

ساقیا پھول سے کیا کام کلی پیتے ہیں

دو گھونٹ پانی پی کر گلوری منہ میں دبائے دو چار کش کھینچ کر ابرِ بہار بن جانے والے دھوئیں کو آسمان کی طرف لہرا دیا۔ رنگ صحبت ہے کہ جما ہوا ہے، پھر اس طرح کہ گنبدِ مسجد سے نکل کر تراویح خواں بھی اسی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ مختلف ذکر اذکار ہنسی قہقہے۔ بے تکلف

صحبت الٹی، کسی نے زانو بدلا، کسی نے کروٹ۔ ہوا کی سنک خوابِ نوشیں لائی بھی تو ع

مردم دیدہ بہ چلائے کہ باہر باہر

کسی دوست نے زانو تھپک دیا کہ نیند کافور۔

ماہِ مبارک کی راتیں وہ پاک صحبت نہ چوڑیوں کی کھنکار، نہ چھڑوں کی جھنکار، نہ چھم چھم، نہ چھن چھن، خدا کی یاد نہیں تو خدا کو بھولے بھی نہیں، ننھی منی رات باتوں میں کٹی یا آنکھوں میں، شجر و حجر سجدے میں جھکے تو بھی شبِ قدر نہ جھکے تو بھی شبِ قدر۔ نور کی راتیں نور کے ملے۔ چار چھ گھڑی رات ہی سے "سحر" کی ٹھیرا ٹھیری، کچھ دیر یہ مشغلہ رہا، اس سے فراغت پائی کہ تلاوت و نمازِ فجر کی طرف جھکے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے آٹھ نو بجے دن تک اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جو سونے کی ٹھہرائی تو پھر کون کروٹ لیتا ہے۔ آبِ وضو کے چھینٹوں سے ظہر کے وقت آنکھ کھلی بھی تو چند منٹ کے لیے، نفل کے سجدوں کے ساتھ پھر رخصت ہوئے۔ پانچ پہر کے جاگے ہوئے، دھوپ کیسی، گرمی کیسی، بھوک کیسی، پیاس، نیند تو سولی پر آتی ہے، غرض کہ خوب سوئے اور جی بھر کے سوئے۔ اٹھے تو دو چار گھڑی دن رہے۔ نہائے دھوئے، وضو کیا، نماز پڑھی، گل گشت کی، چمن زاروں میں ٹھہرا دی۔ ادھر کا دن ہی کتنا، اللہ اکبر کے ساتھ افطار اور افطار کے ساتھ ادائے فرض —— پھر وہی رنگِ صحبت، کھانے پینے کا لطف، حقے پان کے مزے ؎

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

یونہی ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں کو خوابِ غفلت میں ضائع کرنا ہمارے مشرب میں گناہ ہے نہ کہ رمضان المبارک میں۔ جن کو ٹھنڈی رات راس نہیں وہی دن کو بدنام کنندۂ صوم ہیں۔ روزے ہیں اور دھوپ، گرمی، بھوک، پیاس کی شکایت کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اے توبہ! کبھی کوئی روزے ہیں، دن رات محوِ عبادت نہ رہے لیکن اس شکایت سے تو بچے۔ راقم ؎

مفتی یہ کہے لاکھ کہ روزہ نہیں جاتا
میں بھول کے بھی پی نہیں سکتا رمضاں میں

"رمضانی" از بجنور

۲۔ ہمارا خواب اور جلسۂ کانگریس

شوقِ نسساں کو لٹتی ہے، پھولوں کی بھینی بھینی بو کسی کافر کی چوٹی کی یاد دلا رہی ہے۔ شمع کی سنہری لو پر پتنگوں کا جھرمٹ ہے، تکیے میں ٹیس زیادہ ہے، دل میں پھڑک ہے، آنکھوں میں بول کا جنگل اگا ہے، دروازے پر ٹکٹکی بندھی ہے۔ ہارمونیم چھیڑ رہا ہوں، کسی کی یاد میں لب پر یہ ترانہ ہے ؎

نم وہ ہو کہ سر بار اگر حشر بپا ہو — وعدہ نہ وفا ہو نہ وفا ہو نہ وفا ہو
ہم بند کیے آنکھ تصور میں پڑے ہیں — ایسے میں جو چھم سے کوئی آ جائے تو کیا ہو
ہے شام ہی بھی صبحِ شبِ وصل کا عالم — قربان ان آنکھوں کے جن آنکھوں میں حیا ہو

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے | ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو
گذری ہوئی ہم یاد دلاتے ہوں کسی کو | منہ پھیرے ہوئے کوئی ہمیں کوس رہا ہو
کیا چیز ہیں یا رب یہ حسینانِ جہاں بھی | ان پر جو کوئی جان دے عمر اسی کی سوا ہو

لاکھوں ہی جوانوں میں ریاض ایک جواں ہے
کم بخت حسینو! اسے چاہو اسے چاہو

مسہری، گجرے اور پھولوں سے لدی ہے، ابھی تک کسی کے چھم چھم چھن چھن کی آواز کانوں میں نہیں آئی، طبیعت زیادہ گھبرائی تو لیٹ رہا، نیند کا جھونکا زلفِ محبوب کی لپٹ بن کر آیا اور پلک جھپک گئی۔

رخسارِ گل گوں سمٹے دو آتشہ، لبِ سرخ پارۂ یاقوت، ہنسی موتیوں کی لڑی، آنکھیں چڑھی ہوئی نشہ جوانی میں چور، گدرایا ہوا جوبن، پائنچے ہاتھ پر ڈالے اٹھکیلیوں کے ساتھ کوئی آتا نظر آیا۔ سننے والوں کے لیے ع

ناگاہ ز در در آمد جاناں ندیدہ

کیا کہوں، کس طرح کرسی پر لا بٹھایا اور ہارمونیم بجا کر خوب ہی لبھایا۔ ابھی ع

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک خادمہ کواڑ کھڑکاتی آ پہنچی۔ چلیے بیگم صاحب چلیے! سب ہمجولیاں آگئی ہیں اب جلسے کا وقت ہے وہ آفتاب حشر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم پر ایک عمدہ کمرہ آراستہ دیکھا۔ کرسیوں پر تھوڑی تھوڑی عمر کی حسین گل پوش لیڈیاں بیٹھی ہیں۔ اس جانب کو بھی سب نے انھوں ہاتھ کرسی پر جگہ دی۔ سب کے چہروں سے تعلیم کا اثر پیدا تھا۔ نستعلیق چال ڈھال، پاکیزہ خیالات، ایک مہذب اور رنگین لیڈی جو سب سے عمر میں اتری ہوئی تھی پائنچے چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "میری پیاری بہنو! میں چاہتی ہوں کہ آج کانگرس کی تحقیق میں کچھ دیر باتیں ہوں۔" دو ایک کانفرنسوں نے تائید کی، کہا "ضرور ضرور، اخباروں میں اس کال موہنی کی بہت پکار ہے۔" تائید کے ساتھ کارروائی شروع ہوئی۔

دھانی دوپٹے والی بیگم: ـ میری آنکھ کی روشنی، کلیجے کا ٹکڑا، دل کی مراد سب بہنو! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ بنگالی کوّے موئے کیا کرنے والے ہیں۔ ہماری بھینی ماں ملکہ (وکٹوریہ) کے آگے ہم کو خوار کرنے والے ہیں۔ وہ باتیں چاہتے ہیں کہ گدھوں کو مسن کر نہ آئے۔ پوچھو ہمارے لیے یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم جنس کی سلطنت ہے ——— (قہقہہ)

اطلسی پاجامے والی بیگم: ـ میرا خیال بھی آپ ہی سے ملتا جلتا ہے اگر انگریز ہندوستانیوں کو ہتھیار دے دیں تو دن رات لہو لہان ہونے کی نوبت پہنچے۔ یہ نگوڑے مردوے ایسے کلیجے کے ہوتے ہیں کہ خون خرابا کرتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری غریب بہنوں پر روز (اللہ بچائے) تلوار اٹھایا کریں گے۔ پھر لڑکوں سے گھر ہیں ایسے جو کھم کا رہنا کیا۔ دور پار چھپا سی جان پھر سے نکل جائے۔ نا بابا نا!

بڑی موباف والی بیگم: ـ میری پیاری بہنو! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ کالے کوّے امتحانِ مقابلہ جھینک جھنکا کر پاس بھی کر لیں تو ہمارے بٹیر اور مرغ لڑانے والے مردوے کیونکر ان سے بازی لے جائیں گے۔ اس وقت بنگالنیں کولھا پھڑکا پھڑکا کر

ہم کو نام رکھیں گی اور ہم سر نہ اٹھا سکیں گے اس لیے میں کبھی نہ کہوں گی کہ امتحانِ مقابلہ ہوا کرے۔ اس میں جا ہے کیسا ہی ہندوستانیوں کا نقصان ہو ہماری آنکھوں پر ایسے پردے پڑے ہیں کہ یہ ذلت سہہ لیں اور فائدہ بھی کتنا بگلا مارے پکھنا ہاتھ، چار پاس ہو گئے بڑے بڑے عہدے پا گئے تو جھاڑو پھرے ملک کو کیا سرسبزی ہوتی۔ یہ ملک میں کیا مینہ برسا دیں گے، ان کے شگون کے لیے سارا ملک کیوں اپنی ناک کٹوانے بیٹھے۔ اتنی سی بات کے لیے ہم اپنی ولایتی بہنوں سے دشمنی ٹھانیں۔ ہماری پیزار کی نوک کو کیا پڑی ہے۔

افشاں جبیں بیگم:۔ تاروں بھری رات ہے، اگر دہری ہوں صاف جی سے کہتی ہوں کہ مگس دریا گوں سے ہے کیونکہ سوارت ہو جاتا ہے اس روپے سے جو پتنگ میں اڑے جسے چوک کی کسبیاں لے جائیں نگوڑی گھر کا ستیاناس کر دیں، وہ اچھا یا سرکار کا بھلا ہو وہ اچھا۔ خدا کی مار ان مردوں پر جو ہماری سرکار کو روپے دیتے جلیں۔

بسنتی پوشاک والی بیگم:۔ سنو میری چہیتی بہنو! اس میں شک نہیں کہ یہ بنگالی سرکار سے ہم کو زرد رو کرانے والے ہیں جو ہتیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سرسوں پھول لی ہے۔ اب رات زیادہ گئی، آئندہ تاریخ بڑے جلسے کے لیے مقرر ہو۔ سنتے ہی میں نے چاہا کہ دو ایک سے کچھ باتیں کروں کہ ایک نے سینے کا دھکا دیا۔ آنکھ کھل گئی۔

راقم: رات کا خواب الٰہی توبہ
(حکیم برہم مرحوم)

۳۔ "مرزا منش"

اُٹھے، ٹہلے، چلے، پھرے، داڑھی میں خضاب کیا، بالوں میں تیل ڈال کنگھی کی۔ کپڑے بدلے، تسبیح زمرد ہاتھ میں لی یا اللہ یا خدا کی حرکات صوت لب سے جاری مگر دل و زبان دونوں ناواقف، عطر ملا "چار باغ" رومال کندھے پر ڈالا، زیتون کی چھڑی بطور تبرک ہاتھ میں لی۔ پہلے پہنچے حکیم برہم کے دواخانے میں، شیشی اور پڑیا جیب میں رکھ کر خیال خوشی میں مسرور پہنچے کہاں سراسے پختہ میں اور منگوائی وہاں ہر مزہ جی کمپنی کے یہاں سے ولایتی، اس کے بعد عاقبت بخیر!

نظم

اب ہند میں کیا رہا ہے بھائی — فریاد ہے ہند و دہائی
"مصری" اس باغ کے تھے اک گل — شاگرد تھے ہند کے جزو کل
اک پھول اسی چراغ کے تھے — اک بوند اسی ایاغ کے تھے
سقراط سے لے کے تا بہ لقماں — طفلِ مکتب تھے اہلِ یوناں
آ گئے اس کے زہیں سے تا بہ مہ — سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
کنتیاں کے بھی خدا تھے ہندی — اس کشتی کے ناخدا تھے ہندی

راماشن میں دکھائے وہ ڈھنگ — ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ!
رنگت ملٹن کی بھی ہے پھیکی — سبحان اللہ —— والمیکی
کالی داس آہ خدائے بینش — سرمایۂ نازِ آفرینش
مشہورِ جہاں کتاب اس کی — مقبولِ زماں کتاب اس کی
جھنڈے بید کے بھی گڑے تھے — یونانی جیب میں پڑے تھے
تشریح کے بادشاہ تھے ہندی — تشخیص کے بھی خدا تھے ہندی
دعویٰ جس کو ہو جہاں بل کا — دیکھے وہ فلسفہ "کپل" کا

وہ علم وہ نفس اب ڈبویا
جو کچھ سیکھا تھا سب وہ کھویا

اس نظم "پرفتنہ" کا نوٹ بھی قابلِ دید ہے:-

"نظم کیا ہے ایک تصویر ہے "ولی جذبات" کی۔ ہمارے دوست کو گو ان فضول باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر کبھی کبھی حبِ وطن کے جوش کا بھی "جوار بھاٹا" آ جاتا ہے۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرشار ہندوستان کی قدیم تاریخ کے بھی ماہر ہیں اور تمام دنیا کے ابتدائی حالات بھی ان پر آئینہ ہیں۔

"پدرم سلطان بود" کی مثالیں بھی اس نظم سے ملتی ہیں افسوس ہے "سبہوت" کچھ نہ کر سکے۔ اس کا مرثیہ جہاں تک پڑھا جائے کم ہے۔"

۴ - ایک نئے انداز کی غزل

باغِ عالم کی روش پر جلوہ گر ہیں گل کے گل — جان کر خونِ بطِ مے پی رہے ہیں مل کے مل
رشک کے قلزم میں کیا شئے ہے صراطِ مستقیم — نالۂ شب گیرِ عاشق توڑ دیں گے پل کے پل
سخت مشکل جان بچنی ہے بتِ سفاک سے — قتل پر عشاق کے چتون گئی قاتل کی تُل
باغ ہے صحنِ چمن ہے شیشہ و ساقی و جام — جی میں آتا ہے پئیں اے جان تجھ سے مل کے مل

دشمنوں کی بات پر ہرگز نہ جا تو اے نثار
رستم و سہراب کے مرقد سے سن جا جل کے جل

بے نام مضمون نگار

۱۔ چانڈو خانے کی گپ

ایک افیونی :- بڑا آیا تھا وہاں سے ہمارے پٹھے سے لڑنے۔ کیا مارا ہے۔

دوسرا :- یہ روسیہ بڑا حرام زادہ ہے۔ اس کو پانی پت کے میدان میں بھی کوئی بیس تیس برس ہوئے دگلے والی پلٹن نے خوب پیٹا تھا۔

تیسرا :- اخاہ یہ وہی ذات شریف ہے جو بڑے بڑے جہاز لے کر کابل قندھار پر آئے تھے اور ہمارے لاٹ صاحب نے سب جہاز چھین لیے تھے۔

چوتھا :- مگر آج ہم نے میلے میں پنیر (پاینیر) کا پرچہ دیکھا تھا اس میں لکھا تھا کہ روسیہ کے بہت سے جہاز آرتھر پور (آرتھر پورٹ) پر پڑے ہوئے ہیں۔

پانچواں :- پانیر کا پرچہ کیا وہی ارے میاں وہی ضلع کل " گورکھ پور والا۔

پہلا :- اچھا تو کیا وہاں کوئی بڑا بھاری دریا ہے ؟

دوسرا :- آرتھر پور وہی نا جس پر نواب شجاع الدولہ نے ایک بڑی بھاری مسجد بنائی تھی۔

راقم " افیونی ! "

۲۔ ایسے بھی ہوتے ہیں

قرض دار ہیں لیکن چہرے پر شکن نہیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ کتنوں کی جمع مارے بیٹھے ہیں مگر خرچ سب اُجلے ہیں۔ نقد آمدنی خرچ پہ آمد گوشت، شراب اور آرائشی چیزوں کے لیے وقف ہے۔ دھوبی بھنگی وغیرہ کی تنخواہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بزاز بنیے کا حساب الگ ہے ابھا بھی آنا ہے کئی سال کی قیمت باقی ہے آئندہ طاعون کے منتظر ہیں لیتا مرے کہ دیتا۔

۳۔ الف، لام

عربی لٹریچر میں الف لام کی بڑی وقعت تھی مگر ہندوستان میں اس کی درگت ہوئی۔ جب تک مولوی شبلی کا تصرف رہا قاعدے کی

پابندی رہی۔ پنجاب میں اصلاح دی گئی اب میں نے نیا قاعدہ ایجاد کیا ہے میرے قاعدے کے موافق الف لام آخر میں آیا کرے گا مثلاً چند الفاظ پیش کرتا ہوں:۔ بھوپال، بنگال، گرطھوال، نینی تال، جنجال، بھونچال، بال، وبال، ابال، لال، گلال، تال، حال، حلال، ننھیال، ددھیال، سسرال، سال، دلال، خورجال۔

راقم: یکے از آل بوڑھ

۴۔ بیکاری کے مشغلے

پھٹنے کی کھولی اور پھر بند کر کے رکھ دی۔ کتابیں ادھر سے اُدھر کر دیں، کاغذ پنسل لیا، دو چار شعر لکھ ڈالے۔ فتح پورٹ آر نظر پر طباعیاں کرنے لگے، کسی راہرو پر ایک آدھ پھبتی چست کر دی، میز اٹھوا کر کمرے سے برآمدے میں رکھوا دی، پھول کے گملوں کی ترتیب بدل دی، سرا میں گشت کر آئے، کسی دوست سے ملنے چلے گئے۔ اگلا پچھلا حساب دیکھ ڈالا، کسی اخبار کا نمونہ طلب کر لیا، زبان اردو پر بحث کرنے لگے، پتکون رفو کرنے کو بھیج دیا، آج سے بازار کا نرخ دریافت کرا منگایا، شاہدان بازاری میں فرق و امتیاز کرنے لگے، آئینے کے روبرو سفید بال چننے لگے، دو پیگ اڑا کر نزدماغ ہو گئے، دوسروں کے جھگڑے میں برپر فیصل بن گئے۔ لیٹے اٹھے بیٹھے اور پھر سو گئے۔

۵۔ دیوتاؤں کا استھان

کہا جاتا تھا لہاسہ میں طلسم نظر آتا ہے۔ مکان نور کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ انسز کاری اور پلاستر موتیوں کے چونے سے کیا گیا ہے۔ یاقوت، نیلم، پکھراج، ہیرے، لعل، زمرد، فیروزے دیواروں پر جڑے ہیں عجیب پچی کاری ہے۔ جنت کا مکان اگر دنیا میں دیکھنا ہو تو لہاسہ میں جا کر لاما ئے اعظم کا محل دیکھ لو۔ محل کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ دودھ اور شہد کی وہ افراط ہے کہ کتے کو تے بھی نہیں پوچھتے مگر جب کرنل ینگ ہسبینڈ اور جنرل مکڈانلڈ پہنچے تو کھانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ بڑی خوشامد و آمد کی منتوں سے ایک نہیں سنی آخر جنرل مکڈانلڈ کا فوجی قہرمان دریا جوش میں آیا تو ایک مہنت صاحب کچھ پرساد لے کر حاضر ہوئے جو غیر کافی سمجھا گیا۔ دیوتاؤں کے شہر میں کھانا پانی سے نا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے سو دیوتاؤں کو کھانے پانی سے کیا واسطہ، سنا ہے سرکار وہاں کی کوئی چیز نہ چھوڑے گی نہ کسی چیز پر دوامی قبضہ کرے گی جیسی گئی تھی ویسی ہی واپس آئے گی۔ فوج کی ورزش مقصود تھی وہ ہو گئی اور لارڈ کرزن فاتح تبت بن گئے۔

راقم: سونے کا ورق

۶۔ رشتے داریوں کا ایک حرف

مہربانی کر کے کوئی صاحب اس کا جواب دے سکتے ہوں تو حل کریں کہ مندرجہ ذیل رشتے داریوں میں حروف ابجد کا حرف ب پہلے کیوں آتا ہے مثلاً باپ، بابا، بھائی، بیٹا، بھانجا، بھتیجا، بہن، بہنوئی، بہو، بھاوج، بیوی ——— اور چچا، چچی، خالہ، خالو، ماموں، ممانی، پھوپھا، پھوپھی اس سے کیوں علیحدہ رکھے گئے؟

راقم: واہ بے

شیرازہ

یوں تو زندہ دلانِ لاہور نے وقتاً فوقتاً کئی ظریفانہ اخبار نکالے مگر شیرازہ خاص اہتمام سے نکلا اور اچھے حلقوں میں بہت مقبول ہوا لوگ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ادبی اور فکاہی ہفت روزہ اخبار تھا جو مولانا چراغ حسن حسرت نے سندباد جہازی کے فرضی نام سے دسمبر ۱۹۳۶ء میں لاہور سے جاری کیا تھا۔ حسرت ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، اخبار نویس بھی تھے اور مزاح نگار بھی۔ وہ صحیح زبان لکھنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ ان کا انداز تحریر بے حد شگفتہ رنگین اور دل نشین ہوتا تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز کلکتہ سے ہوا جہاں عصرِ جدید، نئی دنیا، جمہور، استقلال اور پیغام میں ادارت کے فرائض انجام دیئے اور کوچہ گرد اور کولمبس کے فرضی ناموں سے فکاہی کالم لکھے جن کی شہرت انھیں لاہور کھینچ لائی جہاں وہ پہلے زمیندار پھر انصاف، اس کے بعد پھول اور تہذیبِ نسواں پھر احرار، زمیندار، احسان، شہباز، نیشنل کانگریس، فوجی اخبار، امروز اور نوائے وقت وغیرہ روزناموں کے اداروں سے منسلک رہے اور مزاح نویسی میں خوب نام پیدا کیا۔

شیرازہ بہت بلند پایہ فکاہی پرچہ تھا۔ اس میں مولانا عبدالمجید خاں سالک مدیر انقلاب لاہور کے حوادث و افکار اور سندباد جہازی کے اشارات خاص کشش کا باعث ہوتے تھے۔ اس نے اپنے گرد اور بھی بہت سے اچھے لکھنے والے جمع کئے جن میں حفیظ ہوشیارپوری، محمود نظامی، خضر تمیمی، میراجی، عطاء اللہ سجاد، محمد فاضل، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، باری علیگ، حاجی لق لق، ضمیر جعفری، عاشق محمد غوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چراغ حسن حسرت کی کتب مطائبات (جغرافیہ پنجاب جدید) کا سلسلہ بھی پہلے پہل اسی میں شروع ہوا جس میں انھوں نے اپنے زمانے میں پنجاب کی بعض مشہور سیاسی شخصیتوں اور تحریکوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ سیاسی شخصیتوں کی بظاہر سنجیدہ اور اہم زندگیوں کے بعض چھپے ہوئے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کر کے دکھلانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔

اس سلسلے میں ان کے سات مضامین جو شیرازہ میں چھپے تھے مردم دیدہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کیلے کا چھلکا، دو ڈاکٹر اور اقبال نامہ بھی اسی پرچے کی یادگاریں ہیں۔

جدید جغرافیہ پنجاب (تیسرا باب)

پہاڑ - دریا - نہریں وغیرہ

سندباد جہازی

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے سدِ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جہاں آج کل سدِ سکندری واقع ہے وہاں زمانہ قبل [illegible] ہیں ہر طرف بنجر میدان اور ریگستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میلوں تک روئیدگی کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ پھر زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اس کی جگہ لے لی۔ ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کفِ دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن بعض اعلٰی محققین اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری سنگِ خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی تغیرات لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ سدِ سکندری کی سب سے اونچی چوٹی سکندر ماؤنٹ ہے جو اس سلسلہ کوہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ سپید برف جمی رہتی ہے جو دور دور سے نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ہیں جن کے برفانی عمامے دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ان چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خدانخواستہ ان پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے ویران ہو جائیں۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ سکندر ماؤنٹ بہا پاحق جانتے ہیں۔ چنانچہ سادھو کار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہے کیونکہ یہاں مدت تک شری سادھو کرنے کٹیا ڈال رکھی تھی اور شری گاندھی جی مہاراج بھی اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ملیچھوں نے اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔

منوہر پربت

یہ چوٹی اتحادی سطح مرتفع کے حصہ میں ہندو سبھا کی ترائی کے پاس واقع ہے۔ یہ بالکل چٹیل پہاڑ ہے اور اس کے صرف بعض حصوں میں تھوڑی تھوڑی زیر درختی پائی جاتی ہے۔ اسے لاکھی پربت بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں اگلے وقتوں کے خزانے

سیاہی مائل ہے۔ اس کے بعض حصوں میں تھوڑی سی زرخیزی بھی پائی جاتی ہے لیکن اکثر حصے بالکل لق و دق نظر آتے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ سے کبھی لاوے کا سیلاب بہہ نکلے گا جو اتحادی سطح مرتفع کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی اندرونی حرارت ختم ہو چکی ہے اور اب اتحادی سطح مرتفع کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

کوہ محمود ٹ

مشہور پہاڑ ہے جو اتحادی سطح مرتفع سے وادیٔ لیگ تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں چنانچہ جو برساتی نالے اس سے بہہ نکلے ہیں ان کے ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادیٔ لیگ دونوں کے باشندے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مظفر کوہ

یہ بھی مشہور برفانی پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سدِ سکندری سے ملا ہوا تھا۔ لیکن بعض کوہستانی ندیوں نے سدِ سکندری کو آہستہ آہستہ کاٹ کر مظفر کوہ سے الگ کر دیا۔ اگرچہ یہ پہاڑ اتحادی سطح مرتفع میں ہی ہے لیکن اس میں اور سدِ سکندری میں کئی دریا اور وادیاں حائل ہیں اور یہ سدِ سکندری سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکی جوالا مکھی

آتش فشاں پہاڑوں کا مشہور سلسلہ ہے۔ کبھی اس سے برابر کئی کئی مہینے تک آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مدت تک افسردگی سی چھائی رہتی ہے۔

کانگریسی سلسلۂ کوہ

اس کی دو بڑی شاخیں ہیں، رست پڑا اور رہبار گوپربت۔ ان دونوں کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔

درّے

درّہ دولتانہ

سدِ سکندری کا مشہور درّہ ہے۔ جھیل دولتانہ جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اسی درّہ میں واقع ہے۔ بہت کشادہ درّہ ہے اس لیے اسے اتحادی سطح مرتفع اور دوسرے علاقوں کے درمیان آمد و رفت اور رسل و رسائل کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس درّہ سے ہر موسم میں بکثرت قافلے اخباروں کے انبار اور سینما کے فلم گذرتے نظر آتے ہیں۔ سدِ سکندری اور کوہ شہاب الدین کے درمیان بھی یہی درّہ حائل بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر محققوں کا خیال تھا کہ درّہ دولتانہ دراصل کوہ شہاب الدین میں واقع ہے لیکن جدید تحقیق سے اس بات کی

تو یہ ہوگیا ہے مسلم لیگ کی وادی اس درّے کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔

درّہ میر

یہ بھی سدِ سکندری کا مقبولِ عام درّہ ہے۔ بہت سا مالِ تجارت جو وسادر کو جاتا ہے اسی درّہ کے راستہ سے گذرتا ہے۔ پنجاب کی ریاستوں کے جو کارواں جاتے ہیں ان کا راستہ بھی یہی ہے۔

درّۂ جہان یا درّۂ شاہنواز

سدِ سکندری کا مشہور درّہ ہے جو میاں کے ٹیلے میں درّہ میر کے عین بالمقابل واقع ہے۔

درّہ غضنفر

ایک تنگ درّہ ہے جس کے دونوں طرف پُرہیبت اور سنگلاخ چٹانیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ یہ درّہ بہت پُرپیچ ہے اور دور سے وادیِ لیگ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے لیکن قریب جاؤ تو وادیِ لیگ سے بہت دور سدِ سکندری کی چٹانوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

انجل ڈنڈی

یہ درّہ مجیفضر پہاڑ میں واقع ہے۔ اکالی جنگلات اور رسندرین کی بہت سی پیداوار اسی درّہ کے راستے باہر بھیجی جاتی ہے۔ یہ درّہ اونچے اونچے اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے درّے ہیں جن کا حال بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔ لیکن گو پربت اور ست پڑا میں بھی بہت سے چھوٹے بڑے درّے ہیں جن میں زیادہ آمد و رفت تو نہیں ہوتی البتہ وہ تجارتی مقاصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جھیلیں

جھیل دوتانہ

یہ میٹھے پانی کی بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ کوہِ شہاب الدین اور سدِ سکندری کے درمیان واقع ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اب آہستہ آہستہ اس کا پانی کھارا ہوتا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی سطح بالکل ساکن نظر آتی ہے اور اس کے نیلگوں پانی پر مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے تیرتے پھرتے ہیں لیکن یہ جھیل بہت گہری ہے اور جھیل ولر کی طرح اس میں کشتی رانی بہت خطرناک ہے چنانچہ ہر سال اس میں بہت سی کشتیاں اور ڈونگے غرق ہو جاتے ہیں۔

دریا

دریائے ظفر علی خان

پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دریا کی ہولناک موجیں ایک طرف سدِ سکندری سے جا ٹکراتی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں اور جب اس میں طغیانی آتی تھی تو اتحادی سطح مرتفع کے باشندے الامان والحفیظ پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے تھے۔ لیکن اب اتحادی انجینیروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے اور اس پر راہ کے سیمنٹ سے ایک عظیم الشان پُل تعمیر کیا ہے جسے عہدِ جدید کی انجینیری کا عظیم الشان کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ پہلے اس سے آبپاشی بالکل نہیں ہو سکتی تھی لیکن اب اس سے اتحادی سطح مرتفع کی اراضی کو سیراب کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر خطرناک چٹانیں ہیں۔ کئی جگہ آبشار بھی ہیں اس لیے اس میں زیادہ دور تک جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔

کسی کو یقین نہیں کہ دریائے ظفر علی خان ہمیشہ اس حالت میں رہے گا۔ کیا عجب اس میں پھر کبھی بڑے زور کی طغیانی آئے اور اس کی موجیں بند اور پُل کو بہا کر لے جائیں۔ ابھی چند سال ہوئے اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے احراری کاہستان کو ویران کر دیا تھا۔ دریائے ظفر علی خان پہلے سدِ سکندری سے ٹکراتا، وادیٔ لیگ سے پہلو بچاتا بحیرۂ کانگریس میں ڈیلٹا بنا کے گرتا تھا اب اتحادی سطح مرتفع اور وادیٔ لیگ کو سیراب کرتا ہوا خلیج لیگ میں جا گرتا ہے۔

دریائے ظفر علی خان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا اور ندی نالے آ ملتے ہیں جن میں دریائے اختر علی خان بہت مشہور ہے۔ یہ دریا اصل میں دریائے ظفر علی خان کی ہی ایک شاخ ہے جو کرم آباد سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان سے الگ ہو جاتا ہے اور میدانی علاقے میں بڑے زور سے بہتا ہوا اسکندر مونٹ کے مقام پر پھر دریائے ظفر علی خان سے آ ملتا ہے۔ یہ دریا اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر مونٹ سے آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان کا پانی بہت گدلا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے مٹی بہا کے لاتے ہیں اور دریائے ظفر علی خان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو دریائے ظفر علی خان ایک دن ایک وسیع دلدل بن کے رہ جائے گا۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اسے دوآبہ زمیندار کہتے ہیں۔

دریائے سالک و دریائے مہر

یہ دونوں دریا پہلے دریائے ظفر علی خان کے معاون تھے لیکن ۱۹۲۷ء میں ایک زلزلہ آیا تھا جس نے ان کی گذرگاہ تبدیل کر دی۔ دریائے سالک کا پاٹ زیادہ ہے اور دریائے مہر اگرچہ عرض میں اس سے کم ہے لیکن زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ لمبائی میں بھی اس سے زیادہ ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں نہ کہیں چٹانیں ہیں نہ آبشار، دونوں خاموشی سے اپنے مقررہ راستہ پر بہتے چلے

---

[1] بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

[illegible] جاتے ہیں اور ذرہ بھر ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔ دریائے سالگٹ میں سارا سارا سال کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور لوگ غوطے لگاتے اور موتی نکال لاتے ہیں لیکن اکثر غوطہ خوروں اور شناوروں کو دریائے تھر کی طرف رخ کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں دریا بہتے ہوئے سکندر یونٹ کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور دریائے انقلاب کہلاتے ہیں۔ ان کے درمیان جو سرسبز اور زرخیز علاقہ ہے اسے دوآبہ مہر ساگر یا دوآبہ [illegible] کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس دوآبہ کو دوآبۂ انقلاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا نخاری سطح مرتفع کے شمالی حصہ سے نکلتے ہیں اور خلیج لیگ [illegible] جا گرتے ہیں۔

دریائے نورا

چشمہ نوب نور سے جو کشمیری بازار سے شمال کی جانب واقع ہے نکلتا ہے۔ یہاں کے ٹیلے کے پاس سے گذرتا ہوا مٹی [illegible] ساتھ روٹی، نورنامہ کلاں، قصہ شاہ بہرام اور بہت سی چھوٹی بڑی دینی کتابیں بہا لاتا ہے۔ کہتے ہیں سکندریہ کا کتب خانہ اسی دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہ دریا کچھ ایسا گہرا تو نہیں لیکن کتابوں کی گھلی ہوئی سیاہی کے باعث اس کا پانی بہت تاریک نظر آتا ہے اور اکثر لوگ غلطی سے اسے بہت گہرا سمجھ لیتے ہیں۔ پہلے اس میں جہاز چلا کرتے تھے لیکن اب صرف اسکولوں کے طالب علم اور مدرس کبھی کبھی کتابوں کی تلاش میں اس کے تاریک سینہ پر کشتیاں اور ڈونگے دوڑاتے نظر آ جاتے ہیں۔ اس دریا میں مچھلیاں نہیں ہوتیں، صرف کتابیں ملتی ہیں اس لیے [illegible] مدرس اسے اللہ کا بہت بڑا انعام اور احسان سمجھتے ہیں اور اس کے طاس کو احسان کہتے ہیں۔ بہت چھوٹا دریا ہے۔ جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ پہلے خلیج لیگ میں گرتا تھا اب اس خلیج سے کچھ دور شمال کی جانب صحرائے کالاہاری کے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ علمائے جغرافیہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ اسے دریا کہنا چاہیے یا جھیل۔

دریائے کرشنا

ہندوسبھا کی ترائی سے عین شمال کی طرف آریہ سماج کی گھاٹیاں ہیں جن سے دریائے کرشنا نکلتا ہے۔ یہ دریا کچھ دور تک جارگو پربت اور ست پٹیا کے درمیان میں سے ہو کر پتھروں سے سر ٹکراتا شور مچاتا گذرتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ بہت کم اور گہرائی بہت زیادہ [illegible] اس کوہستانی علاقے سے نکل کر جب یہ میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کا پاٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا بہت بڑا دریا ہے اور [illegible] دریاؤں میں سے ہے جن کی وجہ سے اس صوبے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوسبھا کی ترائی کے ساتھ ساتھ کانگریس کے کوہستانی علاقوں کو بھی سیراب کرتا ہے لیکن اس کے بالائی حصہ میں چٹانیں کثرت سے ہیں اس لیے یہاں جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کا زیریں حصہ جہاز رانی کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے کرشنا کا طاس بہت زرخیز ہے اس کے بالائی حصہ کو پرکاش اور زیریں حصہ کو

---

[1] فردوسی نے محمود غزنوی کے متعلق کہا تھا ؎

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست	چہ گونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہ ہا زدم و اندروں ندیدم دُر	گناہِ قسمت ما بُد گناہِ دریا نیست

پرناپ کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ دریا بہت مقدس ہے چنانچہ دور دور سے لوگ اس میں اشنان کرنے آتے ہیں اور اس کا پانی بوتلوں میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ اس میں بہت چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں آملتی ہیں۔

ویرندر ندی اس دریا کی ایک مشہور شاخ کا نام ہے۔ یہ ندی بہت سبک خرام ہے اور سرخ و سپید سنگریزوں پر سے بہتی گیت گاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں اور مصفّے ہے اور اس کے کنارے کافی دور تک سبزہ زار پھیلتا چلا گیا ہے۔ پہلے شوقین لوگ صبح و شام ویرندر ندی کے کنارے آ کر اس سبزہ زار اور آبِ رواں کا لطف اٹھاتے، چھینٹے اڑاتے اور ڈبکیاں لگاتے تھے۔ لیکن اب اس کے کنارے خاردار جنگلے لگا دیے گئے ہیں اور خاص خاص لوگوں کے سوا کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ دریائے کرشنا جنوب کی طرف بہ کر خلیج مہاسبھا میں گرتا ہے۔

دریائے خورسند

یہ دریا آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر کچھ دور دریائے کرشنا کے متوازی بہتا ہے۔ کانگرسی سلسلہ کوہ کے قریب پہنچ کر یہ بھارگو پربت اور راست پڑا دونوں سے پہلو بچاتا ہوا دریائے پرمانند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی ترائی کو زرخیز بنانے میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے۔ سول نافرمانی کے موسم میں جب اونچے پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور کوہستانی ندی نالے بہ نکلتے ہیں تو اس دریا میں طغیانی آجاتی ہے اور اس کی موجیں کانگرسی کوہستان کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس کا پاٹ اچھا خاصا ہے لیکن زیادہ گہرا نہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک اس دریا کو بڑی تقدس حاصل ہے۔ اس دریا کے طاس کے لمبی رو کہتے ہیں۔ بالائی حصے کو آریہ گزٹ اور زیریں حصہ کو ملاپ کہتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ جہاز رانی ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا جنوب کی طرف بہتا ہوا خلیج مہاسبھا میں جا گرتا ہے۔

دریائے پرمانند

آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر اکالی جنگلات کے پاس سے بہتا ہوا مغرب کی طرف ہو لیتا ہے اور دریائے خورسند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی ترائی میں یہ دریا کچھ اس زور سے بہتا ہے کہ آس پاس کی زمین کو زیرِ آب کر دیتا ہے چنانچہ اس عمل کی وجہ سے اس علاقے میں جا بجا وسیع دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں جہاں مچھر بڑی کثرت سے پرورش پاتے اور ہندو فیور پھیلاتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک قسم کا بخار ہے جس نے پنجاب میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔

دریائے پرمانند کے دونوں کناروں پر بہت دور تک چٹیل پہاڑیوں اور وحشت ناک بیابانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان پہاڑیوں پر جو تھوڑی بہت زراعت ہوتی ہے حقوق کی برسات میں مینہ کا پانی اسے بہالے جاتا ہے۔ اس عمل کو آب بری یا بن کٹ (EROSION) کہتے ہیں۔ پنجاب کی زرخیزی کو بن کٹ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ نارنگ سر اور رنبیندر ناگ جو مشہور گرم چشمے ہیں اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔

کہتے ہیں زمانہ قبل تاریخ میں دریائے پرمانند کانگرسی سلسلہ کوہ میں سے بہتا ہوا کالے پانی میں جا گرتا تھا۔ پھر کچھ ایسے انقلابات ہوئے کہ یہ ہندو سبھا کی ترائی میں سے بہتا ہوا خلیج سرکار کے "گورے پانی" میں جا گرنے لگا۔ اس دریا کے طاس کو ہندو کہتے ہیں۔

دریائے حبیب

اس دریا کا منبع ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جغرافیہ والوں کا خیال ہے کہ سدِّ سکندری اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے بعض نامعلوم حصوں [illegible] کرنے کے لیے جو مہمیں بھیجی جا رہی ہیں انھیں اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو دریائے حبیب کا منبع بھی معلوم ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں یہ دریا مسلم لیگ کی وادی کو سیراب کرتا تھا لیکن اب اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور احراری کاہستان اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے درمیان بہتا ہے۔ بڑا تیز دریا ہے خصوصاً جب یہ سکندر ہونٹ کی مہیب چٹانوں سے ٹکراتا اور آبشار بناتا ہوا بہتا ہے تو بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس میں جگہ جگہ گرداب پڑتے ہیں۔ اس کی موجیں کف آلود نظر آتی ہیں۔ میدانی علاقے میں بھی پہنچ کر اس کی تیزی میں فرق نہیں آتا اور یہ اپنے زور میں کنارے کے علاقے سے بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ اس کے دہانے کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے [illegible] کانگرس میں یا اس کے قریب کے کسی سمندر میں گرتا ہے لیکن ابھی تک یہ بات تحقیق طلب ہے۔

دریائے ویرا

روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھرمی نرناری کو [illegible] ہے اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے میں ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا اب وائگ پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے چاندی کے ذرات ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے دوسرے مذہبی دریاؤں کی طرح یہ بھی غیر زراعت پیشہ دریا ہے یعنی اس کے کنارے زراعت کے بجائے صرف بنج بیوپار (?) ہوتا ہے۔

دریائے مرتضیٰ[2]

پہلے ترکی میں بہتا تھا۔ پھر افغانستان میں بہنے لگا۔ اب مستقل طور پر ہندوستان آگیا ہے۔ اس دریا اور اس کے معاون دریاؤں نے کسی زمانے میں وہ زرخیز علاقہ بنایا تھا جسے احسان کہتے ہیں۔ اب اس دریا کا طاس شاہباز کہلاتا ہے۔ جڑیا راس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ دریائے مرتضیٰ خلیج لیگ میں گرتا ہے۔

کانگرسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں مشتبل کانگرسی ندی

---

[1] سلیمان ساوجی نے دجلہ کی روانی دیکھ کر کہا تھا۔

دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست ‏ پائے در زنجیر کف بر لب مگر دیوانہ ایست

یہ شعر دریائے حبیب پر بھی صادق آتا ہے۔

[2] دریائے مرتضیٰ ترکی کا مشہور دریا ہے۔ اس کے کنارے ترکوں نے یونانیوں کو زبردست شکست دی تھی۔

منکہ ایک ....

خاندانی معتبر نائی ہوں ،

عبدالمجید سالک

ججمانو! میں ایک معتبر نائی ہوں، میرے دادا بادشاہی نائی تھے۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں میرے ہی دادا نے کرائی تھی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ سنا ہے کہ جب میرے دادا اٹاری سے شاد بامراد ہو کر واپس لوٹے ہیں تو مہاراج ان کی پیشوائی کے لیے قلعہ کے حضوری دروازے تک چل کر آئے تھے۔ اور دادا پر انعام و اکرام کا وہ مینہ برسایا تھا کہ کھاتے کھاتے تین پشتیں گذر گئیں اور اب بھی مولا کی مہربانی سے بیس بیگھہ زمین کا مالک ہوں۔ کھانے پینے کی کمی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے گزران اچھی ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ میرے بعد یہ خاندانی معتبری چلتی نظر نہیں آتی۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا۔ طور طریقے بدل گئے۔ پرانے زمانے کے ججمانوں کی یاد آتی ہے تو کلیجے پر اُسترا چل جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ یار دوست سمجھاتے ہیں میاں ہوش کے ناخن لاؤ۔ تم کس چکر میں پڑ گئے۔ جس طرح زمانے نے پرانے طریقوں کو مونڈ کے صفا چٹ کر دیا۔ اسی طرح آج کل کے فیشن بھی صاف ہو جائیں گے لیکن ججمانو! ذرا یہ اندھیر تو دیکھو کہ ہم لوگوں کا کوئی کام بھی ہمارے ہاتھ میں نہ رہا، ہمارے زمانے میں حجامت بناتے تھے تو نائی ختنہ کرتے تھے تو نائی زخموں پر مرہم لگاتے تھے۔ تو نائی، پچھنے اور سینگی لگاتے تھے تو نائی، شادی بیاہ میں کھانا پکاتے تھے تو نائی اور بر کے لیے کنیا اور کنیا کے لیے بر ڈھونڈتے تھے تو نائی، لیکن آج کل یہ کیا قیامت آئی کہ ہم لوگوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اور کل کے لونڈے چھاؤنیوں میں گوروں کی ڈاڑھیاں مونڈ مونڈ کر اپنے آپ کو نائی کہتے ہیں اور چار چار آنے بٹور لیتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ ہم لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ فتو موچی سے، اللہ بخشے بڑا کاریگر تھا، خاص کر کسوت بنانے میں تو سنا ہے ولایت تک مشہور تھا۔ اس سے کسوت سلوائی، اور جب وہ لایا تو اللہ دین تیلی کے ہاں دے آئے۔ اس نے پندرہ پندرہ دن کڑوے تیل میں ڈبو کر رکھی۔ اس کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے، اسے پونچھ پانچھ کے صاف کیا۔ چار استرے دو قینچیاں، ایک نہرنا، ایک مہندی وسمہ لگانے کی کٹوری اور ایک کٹوری۔ یہ سب چیزیں اس میں رکھیں اور سالہا سال کے لیے بے فکر ہو گئے۔ اب جو تم دیکھو تو آج کے نائی کمینے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ ماں ٹینی باپ کلنگ ولایت کے چار چار روپے کے استرے اور صابن اور پھٹکری اور وہ آٹا سا جسے پوڈر کہتے ہیں لیے پھرتے ہیں، جیسے کوئی نسخہ تیار کریں گے اور پھر ایک حجامت میں پورا ایک گھنٹہ غارت کر دیتے ہیں۔ ہاتھ کی صفائی کا نام نشان نہیں، بزرگوں کا ذکر تو کیا کیجیے مجھ روسیاہ کا ایک واقعہ سنیے۔ لالہ بھبھوتی سرن کے پتا سرگباش ہو گئے، بیٹوں، پوتوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا۔ لالہ جی نے مجھے بلا کر کہا، "ٹلیا، جو پرارتھنا کی اچھا تھی، وہ پوری ہو گئی۔ ذرا جلدی سے بھدن کر دو، اس سے فارغ ہو جاؤں تو بیسیوں کام اور پڑے ہیں"

بس میاں اللہ دے اور بندہ لے، میں نے کورا استرا جو ہاتھ میں لیا تو پچیس آدمیوں کو آدھ گھنٹے میں مونڈ کے رکھ دیا۔ قدردان ججمان نے پانچ روپے چہرہ شاہی میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور کہا "ٹلیا ہم جیسے ساہوکار تو ہزاروں ہوں گے پر تجھ جیسا نائی چار کھونٹ میں نہ

"بہت اچھا۔ ذرا سالک صاحب کو بتائیں۔" وقار نے کہا۔

ہم دونوں نے راستہ ہی پروگرام بنا لیا۔ "انقلاب" کے دفتر میں پہنچ کر وقار صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے [illegible]

"آپ کا اسم گرامی ماچوان ابراہیم ہے۔ فسادات سے بہاولپور میں آپ کی ساری جائداد تباہ و برباد ہو چکی ہے۔"

سالک صاحب نے مخلصانہ انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ایک مصیبت زدہ سوداگر کی طرح نہایت [illegible]

سے سالک صاحب سے مصافحہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" سالک صاحب نے کہا۔

میں سالک صاحب کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں طرف وقار صاحب تھے۔ سالک صاحب نے

نہایت ہمدردانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں مظلومیت کی تصویر بنا ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ سالک صاحب نے چاہا کہ وہ مجھ سے

بات چیت کریں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے ذہن میں معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ وقار صاحب سے دریافت تو کریں کہ یہ سوداگر [illegible]

جانتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے سالک صاحب کے ان الفاظ کو اس انداز سے سنا کہ گویا کچھ نہیں سمجھ رہا۔

"آپ اردو سمجھتے ہیں کیا؟" سالک صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے وقار صاحب سے دریافت کیا۔

"بہت کم۔" وقار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سالک صاحب اور وقار صاحب نے اب پنجابی میں گفتگو شروع کی۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں یہ سوداگر اپنی داستان

تباہی کا تذکرہ غیروں کی زبان سے سن کر مزید غمزدہ نہ ہو جائے۔

"وقار صاحب! آخر آپ پنجاب کیوں چلے آئے۔ یہاں ان کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ انفرادی مدد سے ان کی مشکلات

حل نہیں ہو سکتیں۔ بہتر ہے کہ انھیں کسی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا جائے۔"

"سالک صاحب! یہ بیچارے تو روٹی کو ترستے ہیں۔ اجتماعی اعانت کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ سردست آپ سے

جو کچھ ہو سکتا ہے کیجیے۔" وقار نے جواب دیا۔

میرے لیے اب ہنسی ضبط کرنا بہت دشوار تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا:

"راستہ میں مولوی غلام رسول ملا۔ میرے کو پانچ روپیہ دیا۔ اچھا مسلمان ہے۔ اب آپ ———"

سالک صاحب کی حالت اب قابل رحم ہو چکی تھی۔ وہ میرے سامنے ایثار اور ہمدردی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ وہ [illegible]

تباہی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ میں حیران رہ گیا کہ دوسروں کو ہنسانے والا سالک اپنے سینے میں ایک حساس اور درد مند

دل لیے ہوئے ہے۔

سالک صاحب نے کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھا اور دفتری کے حوالے کر دیا۔ دو منٹ تک کمرے میں خاموشی طاری

رہی۔ دفتری ایک روپیہ میز پر رکھ کر چلتا بنا۔

سالک صاحب نے وقار کی طرف روپیہ بڑھاتے ہوئے کہا: "ان سے کہیے کہ یہ حقیر رقم قبول کریں۔ کل انشاءاللہ تعالیٰ

ان کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔"

وقار صاحب نے روپیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔
سالک صاحب حیران تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا:
"مجھے ہاری لگتے ہیں!"
یہ تھی سالک صاحب سے میری پہلی ملاقات
اس عجیب و غریب تعارف کے بعد اسلام اور اشتراکیت، یوپی سیاسیات اور کانگرسی وزارتوں پر گھنٹوں بحث ہوتی
رہی۔ یہ تعارف اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر "بیہودہ" ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ سالک صاحب سے ایک ہی
ملاقات میں مخلصانہ اور محبانہ روابط قائم ہو گئے۔ چند ابتدائی ملاقاتوں میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ بچ گیا۔ دوسرا نتیجہ جو اس ملاقات سے
نکلا وہ یہ تھا کہ مولانا سالک کی انسانی ہمدردی، شرافت اور مسافر نوازی نے مجھے سالک کا گرویدہ بنا دیا۔

عاشق جالندھری

محمود نظامی

یہ سعادت بھی جالندھر کے حصے میں آئی تھی کہ جہاں اس کی مردم خیز خاک سے فردوسیٔ اسلام پیدا ہوئے وہاں ابوالمعانی میاں محمد صاحب عاشق کی مٹی کو بھی یہیں سے خمیر حاصل ہوا۔ بہت کم لوگ ان کے کلام سے واقف ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں جب کہ اردو ادب کے علمی اور فنی مطالعہ پر بہت زور دیا جا رہا ہے ان کی جلیل القدر شاعری اس امر کی مستحق تھی کہ کوئی صاحب نظر ان کے کلام کی صحیح حیثیت سے لوگوں کو روشناس کراتا۔ گو میرا یہ منصب نہیں کہ میں ان کے افکار و اشعار کے متعلق کوئی سیر حاصل تبصرہ کروں لیکن آج کی صحبت میں آپ کی خدمت میں ان کے کلام کے چند نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تعجب کسی صاحب ذوق کو اس میں دلچسپی کا سامان نظر آجائے اور وہ اس عالی مرتبت جلیل القدر شاعر کے جلیل القدر ادبی کارنامے کو تعلیم یافتہ طبقہ سے روشناس کرا کے ادب اردو کی قرار واقعی دیرپا اور معتنا بہ خدمت انجام دے سکے۔

عاشق جالندھری بستی غزاں جالندھر کے رہنے والے ہیں چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو حضرت عاشق کہاں کے ہیں
بستی غزاں میں رہتے ہیں بستی غزاں کے ہیں

ان کے نزدیک شاعری پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ان کی طبیعت کا ذوق ہے جو شعروں میں اپنے معنی اور نزاکت بیان کرتا ہے ورنہ عام زندگی میں وہ اردلی کے عہدے پر فائز ہیں جس کے ساتھ ساتھ پہلوانی کا بھی شوق ہے۔ اپنی پہلوانی کے متعلق ارشاد کرتے ہیں ؎

خوش ہو کے کہتے ہیں وہ مرے اونچ پر
معشوق ہم ہیں نواسی پہلواں کے ہیں

اپنے اردلی ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اچھی کہی کہ عشق کا مگدر اٹھایئے!
بندہ نو اردلی ہے فقط، پہلوان نہیں

یہاں پہلوان ہونے سے جو انکار ہے وہ ہماری تہذیب کے مطابق بطور انکسار کیا ہے ورنہ ان کی شاعری سے ان کی پہلوانی کسی طرح کم نہیں۔ آپ کی شکل و شمائل اور عادات و خصائل کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شعرائے اُردو

...روا مروا پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آپ کا رنگ جناب داغ سے ملتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ چہلک رو واقع ہوئے ہیں اور اس خصوصیت میں ...روف سے کسی طرح کم نہیں۔ پہلوانی میں آپ اپنے زمانے کے ناسخ ہیں، مزاج آتش کا پایا ہے، بد دماغی میں میر کے ہمسر ہیں اور ملنے میں ...ووق ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور خصوصیت جو غالب شاہ آبرو کے سوا کسی استاد کو نصیب نہیں ہوئی وہ آپ میں موجود ہے اور وہ یہ ...آپ بفضل تعالیٰ واحد العین ہیں اور اس رعایت سے سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں ؎

اک آنکھ ہے ہوس عدم سے مری دوچار
اک آنکھ وقف ہے ترے دیدار کے لیے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

کھلتے ہیں عشق میں کھل جاتی ہیں آنکھیں عاشق
میں تو کانا ہی رہا یار پہ شیدا ہو کر

ایک اور مقطع ہے ؎

گو کسی کام کا ہونا نہیں بھینگا معشوق — کانے عاشق کو ملے مفت تو مہنگا کیا ہے

ایک اور مقطع سنیے ؎

قیس و فرہاد نے عاشق کو نہ مانا مرشد — عقل کے اندھوں نے کچھ قدر نہ کی کانے کی

میرے خیال میں عاشق کی شاعری کے متعلق کوئی رائے دینے سے پیشتر میں آپ کی خدمت میں ان کی ایک غزل ...ناتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

ذائقہ چکھ کے وہ کہنے لگا بالائی کا — کاش میں چھوکرا ہوتا کسی حلوائی کا
پیٹ پھولا ہے ہوا سے مجھ ہرجائی کا — کیا کرے دائی یہاں کام نہیں دائی کا
اینٹھ جب اٹھتا ہے جنگل میں چٹائی لے کر — یاد آجاتا ہے نقشہ تری انگڑائی کا
باتوں باتوں میں اڑا لے گیا اور از تمام — آج اس شوخ نے سر مونڈ لیا نائی کا
میری بوسیدہ لنگوٹی پہ وہ کیوں ہنستے ہیں — جن کی پتلون میں پیوند ہے نکٹائی کا
دو ہی دن چلتے ہیں معشوق جو بازاری ہیں — اے خدا بھیج مجھے کوئی حسیں سائی کا

ایک اور غزل سن لیجیے تاکہ آپ کو رائے قائم کرنے میں دقت نہ ہو ؎

کچھ تو آزار محبت کی دوا دو مجھ کو — خود نہیں ملتے تو لبھائی سے ملا دو مجھ کو
یاں لنگوٹی بھی نہیں اور وہ مجھ کہتا ہے — سوٹ انگلینڈ سے دو چار منگا دو مجھ کو
دیکھو تم ساقی نہ یوں شربت دیدار سے تم — گر پیالہ نہیں لوٹے سے پلا دو مجھ کو
کھٹکھٹایا مرا دروازہ جو اغیار نے رات — ڈر کے وہ بولے کہ کھمبے میں چھپا دو مجھ کو

اس کلام سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ انھوں نے ایسے الفاظ اور خیالات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے جن کو شعرا

ادنیٰ اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ یہ امور مروجہ روش شاعری سے میل نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے عام شعراء ان کو سوقیانہ سمجھ کر ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو شامل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ عاشق نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ و خیالات کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوتی ہیں جن کو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکیں۔ شاید آپ میں سے کوئی صاحب عاشق پر الزام لگائیں کہ وہ معمولی قسم کے شاعر ہیں جو اپنے غیر مہذب اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں مگر جو چیز ان کی خامی اور نقص سمجھی جائے گی وہی میری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ کیونکہ ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور انسانی بول چال کو خود ان ہی کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں اور روزمرہ کے معاملات کا سچا فوٹو من و عن کھینچ دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کا بیان ہر درجہ دلچسپ اور نیچرل رہتا ہے اور تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

شیخ اندھے سے جو الجھا یا تو اندھے نے کہا
میں تو اندھا تھا ہی بڈھے تو بھی اندھا ہو گیا

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اندھے کے اندازِ تکلم کو کس قدر نیچرل انداز میں پیش کیا ہے۔

مشرقی شاعری میں عاشق کے دل کی حیثیت فاؤنٹین پن یا گھڑی سے زائد نہیں جسے وہ جیب میں ڈالے پھرتے ہیں اور حسبِ ضرورت کبھی کسی کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کبھی میز پر ڈال دیتے ہیں کبھی کہتے ہیں ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کبھی پھیری والوں کی طرح اس جنسِ بے مایہ کو گلی کوچوں میں سودا لگاتے پھرتے ہیں۔ جلال لکھنوی کہتے ہیں ؎

جلد دل کا فیصلہ کچھ ہو چکے
لے چکو سودا یہ جتنے کر چکے

خیر یہ تو خوانچہ فروش تھے جو سالم دل کے "سٹاکسٹ" تھے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دل کو کاٹ کاٹ کر ٹکڑوں کی صورت میں فروخت کر دیتے ہیں۔ غنیمت کہتے ہیں ع

کہ من سی پارۂ دل می فروشم

اور آپ نے خوانچہ فروش کی یہ صدا بھی سنی ہو گی ع

من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاہک سے سودا نہیں بنتا۔ قیمت پر تکرار شروع ہو جاتی ہے اور خوانچہ فروش اپنا مال اٹھا دوسری گلی میں "تازہ دل ٹکے سیر" کی صدا بلند کرتا ہے۔ ذوق کہتے ہیں ؎

مال جب اس نے بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

کبھی کبھی یہ چیز جیب سے گر کر کھو بھی جاتی ہے اور آتے جاتے کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ بیچارے مرزا غالب کا دل تو

...دن ان کی جیب کے کسی پھٹے ہوئے گوشے سے ٹپک پڑتا تھا اور ان کو شکایت کرنا پڑتی تھی کہ ع

کہتے ہیں نہ دیں گے دل اگر ہم نے پڑا پایا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شرقی عاشق کا دل ایک ایسی چیز ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عید بقر عید پر تحفہ کے طور پر ... جا سکتا ہے۔ "پھاڑی" ہیں ڈال کر گلی کوچوں میں بیچا جا سکتا ہے۔ جیب پھٹی ہوئی ہو تو گر بھی سکتا ہے اور اگر اٹھائی گیرے گھات میں ہوں تو جیب کو کتر کر اسے صاف اڑایا بھی جا سکتا ہے۔ اسی خوف سے عاشق جالندھری اپنا دل رومال کے ایک کونے میں مضبوطی سے باندھ کر رکھتے تھے مگر ایک مرتبہ ایک ایسی محفل میں چلے گئے جہاں چور نے باتوں میں لگا ان کا دل صاف غائب کر دیا۔ اب ان کو جو رومال کی ضرورت ہوئی اور ہاتھ جیب میں ڈالا تو کیسہ خالی، سر پیٹ کر اپنے محبوب سے کہتے ہیں ؎

تم نہیں تو کون ہے جس نے چرایا میرا دل
کوئی تو آخر اُچکا اس بھری محفل میں ہے

نہ وہ بزرگوار بھی گرگ باراں دیدہ تھے، ایسے مواقع کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے چنانچہ عاشق کہتے ہیں ؎

جانتا ہے کہ یہاں کون تلاشی لے گا؟
دل مرا یار نے نیفے میں چھپا رکھا ہے

حسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو انسان کا دل اس کی طرف ایک اضطراری کشش سے کھنچتا ہے۔ عاشق جالندھری کے دل میں تو حسن و لطافت کی دنیا آباد ہے۔ جب اس کی نظریں قدرت کی چمن آرائی پر پڑتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں حسن کا نشہ سا چڑھ جاتا ہے اور وہ عالم مستی میں جھوم کر قدرت کے ان دل افروز مظاہر کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہر جگہ رہتا ہوں میں حسن کا شیدا ہو کر
کہیں آنکھیں کہیں نقتو کہیں خیرا ہو کر

عاشق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب میں حسن کے ظاہری لوازم اور معنیہ خواص تلاش کرے۔ اس کی محبت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں سن و سال حسن و نگ کی تمام قیود عنقا ہیں کیونکہ خود لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

جمالِ شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداری است

رند لکھنوی کہتے ہیں ؎

نہ عارض نہ زلف و دو تا دیکھتے ہیں خدا جانے ہم تم میں کیا دیکھتے ہیں

اسی طرح جب انسان کا دل کسی شئے پر فریفتہ ہوتا ہے تو اس کے لیے عقل و خرد کے مجہول دائرے میں مقید رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا تجربہ ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عاشق جالندھری ابھی عشق پر زور نہیں رکھتے اور ان کا دل کائنات کے ہر اس ذرے سے وابستہ ہو جاتا ہے جس میں ان کے لیے ذرہ بھر بھی کشش کا سامان موجود ہے۔ انھیں اگر بچے سے محبت ہے تو بوڑھے سے بھی عشق ہے۔ اگر بھینگے سے الفت ہے تو گنجے سے بھی پیار ہے اگر وہ یہ کہتے ہیں ؎

آنا سُلا کے اپنے نواسوں کو جلد تم
ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہوں انتظار میں

تو یہ بھی کہتے ہیں ؎

کیا نہیں ہوتے کہیں ساٹھ برس کے معشوق — آئینہ لے کے تو دیکھو ابھی بگڑا کیا ہے

ممکن ہے آخری شعر پر آپ یہ اعتراض جڑ دیں کہ یہ خلافِ حقیقت واقعہ ہے مگر شاید آپ حافظ کا یہ شعر بھول چکے ہیں ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں
دیرینہ سالِ پیرے بُردش بہ یک نگاہے

عاشق ایک صاحبِ دل شاعر ایک جانباز عاشق ہے جو اپنے محبوب کا در کسی حالت میں نہیں چھوڑتا۔ فرماتے ہیں ؎

کیا خبر تھی مجھے دل دینے سے پہلے یارب
یار کا حلیہ بگڑ جائے گا لقوا ہو کر

اس شعر میں بالکل میر کا یاس و حرماں ہے۔ وہی درد و سوز ہے وہی اثر اور تڑپ ہے۔ اگر یہی شعر میر کی زبان سے نکلتا تو اس کے نشتروں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اسی جذبۂ وفا شعاری کے ماتحت اپنی ایک اور کیفیت کا ذکر کرتے ہیں ؎

وائے قسمت شامِ وعدہ اس قدر اولے پڑے
میرے گھر تک آتے آتے یار گنجا ہو گیا

عاشق جالندھری کا جذبۂ عشق و وارفتگی اس قدر بسیط ہے کہ اسے اپنے محبوب ہی کی ذات میں تجلیاتِ حسن کا پرتو نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نزدیک ہر وہ شے جو اس کے محبوب سے متعلق ہے حسن و دلکشی کی آماجگاہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اس عشوہ گر کی بھینس کے انداز دیکھ کر
قربان اونٹ اور تصدق گدھا ہوا

عاشق جالندھری کا رنگ اس قدر جدید ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پرانی روش کو یک قلم موقوف کر دیا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ سُنیے:۔

(۱) یہ پرانی طرز کے عشق کے معاملات کے برعکس اپنے اشعار میں جدید روشنی کے عشق کا حال قلمبند کرتے ہیں ؎

گر کوئی پوچھے تو اپنا باپ ہی کہنا مجھے — بات یہ میں نے ہے ان کو خوب سمجھائی ہوئی
پہلے دشمن کو پھر ان کے باپ کو راضی کیا — جب کہیں جا کر مری ان سے شناسائی ہوئی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

غیر سے کہنے لگے وہ دیکھ کر میری شبیہ — یہ ہمارے آنریری باپ کی تصویر ہے

(۲) ہمارے شعرا کی ایک بہت پرانی روش یہ تھی کہ وہ رقیب سے ہمیشہ خائف رہتے اور عورتوں کی طرح اس کے حق میں بد دعائیں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے مگر عاشق جالندھری رقیب سے ڈرنا تو درکنار الٹا اس سے جوتم پیزار کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ گو رقابت کے سلسلے میں انھیں اپنی زندگی کے بہت سے تلخ تجربات اٹھانا پڑے جیسے ؎

کیا تھی خبر رقیب ہے مجسٹریٹ بھی
ان کو بلا کے جیل میں جانا پڑا مجھے

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سر کرائیں تو سہی آپ عدو کا ننگا ——— میں بھی دیکھوں ہے سے پاؤں میں جوتا کیسا

اور سنیے ؎

رقیبوں کو انھی کے گھر پہ جا کر ڈانٹ آتا ہوں ——— سمجھتا ہوں کہ یہ چوہے نکلیں گے کبھی بل سے

(۳) غزل کی ایک مذموم روش صید و صیاد کے معاملات کا تذکرہ تھا۔ اس میں شاعر اپنے تئیں پرندہ بنا کر پنجرے میں ڈالتا تھا پھر بیچارہ کی جان کو سو سو صلواتیں سناتا تھا۔ آخر کار ان بچوں کو یاد کرتا کرتا جان بحق ہو جاتا تھا جنھیں گرفتاری سے قبل اس نے گھونسلے کے اندر اپنے انڈوں سے نکالا تھا۔ عاشق کہتے ہیں کہ قفس کے گوشے میں منتقل ہونے کے لیے اپنے تئیں پرندہ کیوں تصور کرتے ہو کیا انسان کو پنجرے کے اندر بند نہیں کیا جا سکتا چنانچہ وہ صیاد اور جال سے ڈرنے کی بجائے فخریہ کہتے ہیں ؎

جو ہوتے ہم کسی پنجرے کی زینت ——— وہ بالا شان ہوتی چڑیا گھر کی

اپنے مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

آہ سونا پڑا ہے چڑیا گھر ——— اس کی رونق بڑھائے گا اب کون؟

(۴) محبوب کے لباس کے متعلق ہمارے شعرا کی جو روایات ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اس کی جگمگاہٹ اور خوش پوشی کی کیفیت کا رونا جگہ جگہ نظر آتا ہے بلکہ اس کی آرائش و زیبائش کا تذکرہ بھی عام رہتا ہے۔ خواجہ آتش ؎

وہ ہیں مصروف آرائش نہ دیکھو کا تھا شیوہ اے دل
ارے بجلی بھی ہوتی ہے پری اور کے زیور میں

اسی طرح غالب کہتے ہیں ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ——— پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مگر چونکہ عاشق جالندھری کے محبوب کو اپنے باطنی اور ظاہری حسن کی وجہ سے ظاہری لباس کی ضرورت نہیں اس لیے انھوں نے سرے ہی سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سادگی دیکھے کوئی آ کر مرے جلاد کی
ہے فقط تن پر لنگوٹی ہاتھ میں شمشیر ہے

(۵) پرانے زمانے میں اگر کوئی شخص کسی کو سمجھانا بجھانا تو دوسرا وضعداری کے خیال سے بہ خاموشی تمام اس کی تلقین کو

سن لیتا۔ ہمارے شاعر بھی بچارے ناصح کی ہر بات کو سننے کے لیے تیار ہو جاتے مگر عاشق جالندھری کے نزدیک چونکہ محبت دو دو کا ایسا معاملہ ہے جس میں کسی تیسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں اس لیے وہ غالب کے برعکس "دیدہ و دل فرش راہ" کرنے کی بجائے اُلٹا حضرت ناصح کو فرش کرنا پسند کرتے ہیں ؎

بے دھڑک محفلِ زنداں میں جو آیا ناصح　　　بہرِ تعظیم اٹھا بانس کا ڈنڈا کیسا

اس پر بھی جب ناصح کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہوتا تو وہ اس کے ساتھ عملی مذاق تک سے نہیں چوکتے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

کیا تھی اسے خبر کہ ہے لوٹے میں شورا　　　ناصح کا حال وقتِ طہارت تو دیکھیے

(۶) یہ تو تھی غزل کے پرانے مضامین میں تبدیلی اب معنوی تبدیلی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اُردو کی عشقیہ شاعری میں کمان و تیر، خنجر و شمشیر کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ یہ ایسے تشبیہات ہیں جن سے ناز و ادا مراد ہوتی ہے اور یہ تشبیہات و استعارات ہمارے شعرا کے دماغوں پر اس قدر مستولی تھے کہ خود غالب چلا اٹھا ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مگر عاشق نے خنجرِ ناز اور شمشیرِ ادا کے مجہول استعارات کو بدل کر اپنے لیے نئی راہ نکالی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ادائے ناز کی گھوڑی اگر نہیں سرکش
نگاہِ شوق کا ٹٹو بھی بدلگام نہیں

آخر میں ان کی دو غزلوں کے چند شعر سن لیجیے ؎

آپ اُلجھے ہوئے ہیں کس شے پر　　　یہ لنگوٹی ہے تولیہ تو نہیں
تیرے ابا کی کیا مجھے پروا　　　تیرا ابا مرا خدا تو نہیں
خود سمجھ جائے گا ہماری بات　　　شیخ انسان ہے گدھا تو نہیں

کالکا کا ہو کہ ڈیرہ دون کا　　　ہر حسیں پیاسا ہے میرے خون کا
خود تو وہ چلتے ہوئے بھوپال کو　　　دے دیا مجھ کو ٹکٹ رنگون کا
اس قدر ہے گرمیِ عشقِ بتاں　　　ہے دسمبر پر بھی دھوکا جون کا
دم بدم کہتا ہوں ان سے حالِ دل　　　قافیہ ہے تنگ ٹیلیفون کا

اگر شیطان مرجائے

عطاء اللہ سجاد

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمانہ مردہ پرست واقع ہُوا ہے جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے اس کے خلاف ہزاروں زبانیں زہر اُگلتی ہیں۔ وہ اپنی بدکاریوں، غداریوں اور بے ایمانیوں کے لیے انگشت نما رہتا ہے (یہ اور بات ہے کہ ان الزامات کی صداقت یا عدم صداقت کا امتحان نہ کیا جائے) لیکن موت اس کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے مخالفین جب یہ سنتے ہیں کہ وہ دنیا کی فضا میں آخری سانس لے چکا ہے۔ تو اُن کا لب و لہجہ فوراً بدل جاتا ہے اور وہی شخص جو کچھ عرصہ سے پہلے ان کی نظر میں دنیا جہان کی برائیوں کا منبع ہوتا ہے دفعتہً حسن اخلاق اور دیانت و امانت کا دلکش پیکر بن جاتا ہے۔ اس دلچسپ تبدیلی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مرنے والا خود اس مدحت سرائی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور شاید اس کے دشمن دل ہی دل میں کہتے ہوں "وہ ایک ایسے جہان میں پہنچ گیا ہے جہاں ہماری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے ہمیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے منہ سے اپنی تعریفیں سُن کر غرور سے سر بلند کر سکے۔"

آپ اور آپ کے دوست کسی شخص کو تمام عمر حد درجہ کا بخیل اور کنجوس مشہور کرتے رہیں گے۔ لیکن جب وہ موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ تو آپ ہی میں سے کوئی شخص کہہ اُٹھے گا "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" دوسرے صاحب فلسفیانہ انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہیں گے "بھائی وہ آدمی بڑا دانا تھا، شہدوں کی طرح دولت لٹاتا نہیں تھا۔ اس کا اصول تھا کہ دولت کی نمائش نوسربازوں کا کام ہے" تیسرے صاحب کہتے ہیں "لوگ کہتے ہیں وہ دل کا بڑا سخی تھا۔ آج تک کوئی سائل دروازے سے واپس نہیں گیا" اور اس موقع پر وہ اپنی طباعی سے فائدہ اٹھا کر مرحوم کی سخاوت کے دو تین قصے ارتجالاً گھڑ دیتے ہیں۔ اور لوگ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا اپنا بہترین انسان کھو چکی ہے۔

محلّہ کے مولوی صاحب تمام عمر کسی آدمی کو کرشان بے ایمان اور دوزخی کہتے رہیں۔ اُن کی زبان اس کے خلاف سالہا سال تک تکفیر اگلتی رہے۔ لیکن جب وہ مرجاتا ہے تو مولوی صاحب خود اُسے غسل دیتے ہیں۔ اُسے کفناتے ہیں اور اس کے بعد اپنے مقتدیوں کے سامنے مہینوں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ "واللہ کیا مسلمان تھا۔ موت کے بعد چہرے پر جلال اور انوار کی بارش ہو رہی تھی۔ مرتے وقت زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مجھ سے کہنے لگے مولوی صاحب میرے کلمے کے گواہ رہیو" سیاسی لیڈر اپنے مخالفین سے ہمیشہ لفظی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ اُسے ملک کا غدار اور ملت کا دشمن بتاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مرجاتا ہے تو ایک عظیم الشان جلسہ جس میں انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر نظر آتا ہے منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں مرحوم کی ملی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ پسماندگان کے لئے صبرِ جمیل کی دعا مانگی جاتی ہے اور عوام کو بتایا جاتا ہے کہ قوم ...

کا ایک بہت بڑا ستون گر پڑا۔

انہیں حقائق کے پیش نظر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر شیطان آج مر جائے تو دنیا والوں کا رد عمل کیا ہو۔ شیطان ہی ایک ایسی ہستی ہے جسے خدا، اس کے فرشتوں اور کائنات انسانی نے ہمیشہ ملعون و مغضوب قرار دیا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے لغات میں جس قدر ملامت کے الفاظ ہیں وہ تمام شیطان پر صرف کئے گئے ہیں لیکن شیطان اگر آج فنا کا جام پی لے تو اس کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر یقیناً بدل جائے گا۔ آج جس قدر برائیاں شیطان کے سر تھوپی جا رہی ہیں۔ تقریباً اس سے دو گنی نیکیوں کا سہرا اُس کی لاش پہ باندھا جائے گا۔ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ایک جوش پھیل جائے گا اور بڑے بڑے اخبار نویس، شاعر، فلسفی، عالم اور سیاسی لیڈر، شیطان کو خراج تحسین ادا کریں گے۔ عوام ایک دوسرے سے اس کی صفات بیان کریں گے: "اجی کیسا دل گردے والا تھا۔ خدا اور اس کے سارے فرشتوں کے مقابلے میں آخر تک ڈٹا رہا۔ وہ تو عزرائیل نے موقع پا کر دبوچ لیا ورنہ یوں مر سکتا تھا۔

"آدم کو سجدہ کرنے کی بات ہی کیا تھی۔ اتنی سی بات پر خدا سے بگڑ گئی۔ وہ دن اور یہ دن یہ خدا کی مخالفت سے باز نہیں آیا"

ایک فلسفی اخبار کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے فرمائیں گے:۔

"دنیا کی ایک ایسی ہستی سے محروم ہو گئی ہے جس نے کائنات کا توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔ شیطان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے آدم کو جنت کی بے عملی اور بے کیف زندگی سے نکال کر اُسے حیات کی لذتوں اور رنگینیوں سے روشناس کرایا۔ اُس کی موت سے زندگی پھر نیکیوں کا گہوارہ بن جائے گی اگر ہم نے شیطان کی روح کو برقرار نہ رکھا تو مجھے ڈر ہے کہ دنیا ہنگاموں سے خالی ہو جائے گی اور ہم جمود اور بے حسی کے اُسی جال میں گرفتار ہو جائیں گے جس سے ابتدائے آفرینش میں حضرت شیطان نے ہمیں نجات دلائی تھی"۔

ایک اخبار نویس اس کی موت پر یوں تبصرہ کریں گے:۔

"حضرت عزرائیل سے ہمیں ذاتی تعارف حاصل تھا اور ان کی موت کی خبر قارئین کو پہنچاتے وقت ہمارا دل غم سے فگار ہو رہا ہے وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار نویس تھے اور پروپیگنڈا کا فن ان کی طباعی کا مرہون منت تھا۔ انہوں نے حوا کو بہکا کر آدم اور حوا کے خلاف جو کامیاب پروپیگنڈا کیا اس کا نتیجہ آج آپ کو اور ہمیں اس وسیع و عریض کائنات کی صورت میں نظر آ رہا ہے حضرت عزرائیل کی تمام عمر اِدھر اُدھر پروپیگنڈا کرتے گزری وہ اخبار نویسوں کے لئے منبع الہام تھے اور ان کی وفات صحافتی برادری کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ کی حیثیت رکھتی ہے"۔

بذلہ سنج شاعر اس پر دلسوز نظمیں لکھیں گے اور تو اور علماء کے طبقے میں بھی ہلچل مچ جائے گی اور وہ کہیں گے:۔

"شیطان گمراہ کر کے ہمیں اس بات کا موقع دیتا تھا کہ ہم کفر کے فتووں کے لٹھ سے ان کی اصلاح کریں لیکن اس کی موت نے ہم سے یہ موثر طریقہ چھین لیا ہے۔ وہ مر چکا ہے، اب دنیا میں حکومت نیکی کی ہو گی۔ افسوس کہ اب تقریریں کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی موضوع نہیں رہا"۔

سیاسی لیڈروں کو یہ خیال ستائے گا کہ شیطان کی موت سے سیاست کا بازار سرد پڑ جائے گا اور اس بات کا اثر لازمی طور پر ہماری اقتصادی حالت پر ہو گا۔ دنیا کے جنگجو ڈکٹیٹر اس بات پر افسوس کریں گے کہ اب جنگ کے لیے بہانے تراشنے کا فن انہیں کون سکھائے گا۔ وہ حسرت سے اپنے آلات حرب پر نظر کریں گے اور "ہائے شیطان" پکار کر خاموش ہو جائیں گے۔ البتہ فرشتے ضرور اس واقعہ پر مسرور ہوں گے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہیں گے "اچھا ہوا مر گیا۔ کم بخت نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اب جب تک خدا کوئی نیا شیطان نہیں بناتا ہم چین کریں گے" اور جبرائیل پکار اٹھے گا: "خاموش رہو۔ وہ ہم سب کا استاد تھا"۔

درباری شاعر

محمد فاضل

پچھلے دنوں سالک صاحب نے افکار و حوادث میں اور بعض دوستوں نے شیرازہ میں ایسے شعراء کا تذکرہ کیا تھا جو اپنی شگفتہ مزاجی اور [illegible] مزاح طبعی کے باعث اپنے ہاں کی علمی ادبی محفلوں کی جان ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تذکرے ادب کے لئے بڑے مفید اور پژمردہ دماغوں کے لئے [illegible] کا سبب ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست کی معرفت اسی قسم کے ایک بزرگ کے مختصر حالات مجھ تک پہنچے ہیں۔ جو قارئین شیرازہ کی نذر ہیں۔

آپ کا نام کرم دین اور وطن مالوف چکوال ہے، درباری شاعر تخلص فرماتے ہیں اور بزعم خود صرف شاہانہ درباروں میں ہی اپنا کلام پڑھنا اپنی شان کے شایان سمجھتے ہیں مگر افسوس کہ ایسے قدردان درباران کو میسر نہیں۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ میرا کلام سمجھنے والے لوگ [illegible] کر پیدا ہوں گے۔ شاہ جارج پنجم آنجہانی کی سلور جوبلی پر قصیدے اور نظم لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور "درباری شاعر" ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ کسی زمانہ میں مدرس بھی رہے اور حکمت سے بھی شغف ہے۔ بخار اور کھانسی کی مجرب گولیوں کے علاوہ چکوال اور جلوال کے گرد و نواح کے طلبہ کو "معجون شاعری" بھی عنایت فرماتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی روانی طبع سے مجبور ہو کر اپنے اس [illegible] کے صلہ میں میری ہجو ملیح بھی رقم فرما دیں۔

جہاں ایسے نادر روزگار شاعر ہوتے ہیں وہاں قدردان بھی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی قدر کرتے ہوئے "بزم ادب چکوال" کے قدرشناس اراکین نے آپ کو "امام دین الچکوالی" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ آپ گو اس خطاب سے خوش ہیں، مگر ہر نئے آدمی سے اپنا تعارف اپنے آپ کو "اقبال ثانی" کہہ کر کراتے ہیں۔

چودھری فضل حق صاحب نقیبر بی اے ایل۔ ایل بی سب جج خانیوال جب چکوال میں تھے تو ان کی علم دوستی اور شاعر نوازی کے باعث چکوال کو بھی شعر و شاعری کا زکام ہو گیا تھا۔ ان ہی کے ایماء پر ہمارے درباری شاعر نے "گلزار درباری" کے نام سے اپنا کلام طبع کرایا۔ چودھری ذکاء اللہ صاحب بسمل ایم اے اور محمد غالب صاحب اشک صحرائی نے دیباچے لکھے۔ چودھری فضل حق صاحب نے بھی تقریظ کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور استاد کرم دین کا ان کے ہم مشرب دیگر شعراء سے بالعموم اور استاد امام دین گجراتی سے بالخصوص موازنہ کیا۔ "درباری شاعر" خود فخریہ فرمایا کرتے ہیں کہ "میں امام دین کا استاد ہوں کیونکہ اس کا کلام (اس زمانہ کے کم علم لوگوں کے لئے) بے معنی ہوتا ہے اور اوزان کی قیود سے باہر نہیں ہوتا۔ مگر میں ان دونوں الجھنوں سے آزاد ہوں۔ وجہ یہ کہ امام دین کے کلام کی طرح میرے

کلام کو سمجھنے والا تو اس زمانہ میں کوئی ہے نہیں باقی رہا اوزان کا سوال سو نظیر اکبر آبادی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے

افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے مجھے "گلزار درباری" دستیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ ہر طرح کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا۔ جس قدر ان کا کلام مجھ تک پہنچا ہے وہ ذرا جگر تھام کر سن لیجیے

شاہ جارج پنجم آنجہانی کی سلور جوبلی پر جو "شاندار" نظم لکھی تھی اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

اے بادِ فلک ذرا لکھا کے پلک بہ منظوری حق کر ذکر شاہ کی داستان کا
درپردے قصہ تو ماضی حال مستقبل امر نہی مضارع کی گردان کا

یوں تو یہ نظم اپنی روایتی شان رکھتی ہے اور اپنے بحر کی طرح طویل تھی۔ افسوس! کہ میرا حافظہ اس کو محفوظ نہ رکھ سکا مگر ایک اور سن لیجیے۔ جس میں شاہ جارج کو خطاب کیا ہے اور شاہان سلف سے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تیری شان ہے سب سے بالا تو ہے سب سے نرالا اوہ میں ادنیٰ تو ہے اعلے
کیا ہے مرتبہ اس جگہ بابر ہمایوں، اکبر جہانگیر شاہجہان کا

ایک دفعہ چکوال میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا۔ ع "خود پرستی خدا پرستی ہے"۔ چکوال کے شعراء نے اپنی اپنی طبع آزمائی کی مگر میدان بالآخر ہمارے درباری شاعر کے ہاتھ میں رہا۔ ایک لمبی غزل لکھی جس میں سے صرف تین شعر مجھے یاد ہیں ؎

آٹا مہنگا ہے نمک سستی ہے — خود پرستی خدا پرستی ہے
چین مجھ کو نہیں ملا ہمدم — ظلم کی کیا یہ بستی ہے
شاعر درباری کو دید کی امید نہیں — دیکھنے کو پر نظر ترستی ہے

جناب عدم کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

دگرگوں اس قدر اب دل کی حالت ہوتی جاتی ہے
مری ہر سانس روداد محبت ہوتی جاتی ہے

یاران چکوال نے عدم کی یہ غزل جھوم جھوم کر درباری شاعر صاحب کو سنائی۔ آپ [illegible] ایک کمسن شاعر کی تعریف کر کے ان کے سینے پر مونگ دلی جائے فوراً ایک غزل لکھ دی [illegible] ؎

محبت جس کے ساتھ چاہے دنیا میں نباہتی ہے — مری ہر آہ دل جوئے حسرت [illegible]
عشق میں اپنی ہستی کا کچھ بھی نہیں پتہ باقی — خدایا اس کو میں کہاں [illegible]
جہاں میں سخن "شاعر درباری" پر ناز کرتا ہے — کہ اس کی ہر [illegible]

۱؎ حسرت صاحب داد دیں۔

پنجابی میں "جھر جھر کرنا" قریباً چھوٹا منہ اور بڑی بات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ "جھر جھر کرنا" یہیں زیادہ بہتر انداز میں پایا جاتا ہے
[illegible] درباری شاعر" کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ یہ شاعر جو "پنجتن پاک" کی تعریف میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں حقیقتاً پنجتن پاک
[illegible] ہو سکتے اور یوں ہی جھر جھر کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی آپ نے شاعروں کے اس جھر جھر کرنے کو نظم کرنا
[illegible] مسدس کی ابتدا کی جس میں "جھر جھر" کو نہایت خوبی سے نباہ گئے۔ فرماتے ہیں:

وہ بڑی شان والا قائم تخت اوپر پر پر پر پر
محمد رسول اللہ سرور در در در در در در
علی حیدر کرار شکن خیبر بر بر بر بر بر بر
حسنین شہر [illegible] تر تر تر تر تر تر
شاعر درباری کون تعریف ان کی کر سکتا ہے
صفت کی کرتے ہیں سب جھر جھر جھر جھر جھر جھر

[illegible] استاد کرم دین المتخلص بہ "شاعر درباری" یا "درباری شاعر" کا دم چکوال میں غنیمت ہے۔ ایسے [illegible] پیدا
[illegible] حیات ہیں۔ اس لیے اُن کی خدمت میں میرا مخلصانہ سلام پہنچے۔

۱۰
[illegible] اس آواز

[illegible] سے رات کے نو بجے تک [illegible] اور باقی
[illegible] دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے۔
[illegible] دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی [illegible]
[illegible] میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ آپ کی ضعیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی۔ اور استاد کو
[illegible] ایک دن اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے لوٹے اور کچھ نہ تھا۔ [illegible] مرحوم کا پاؤں
[illegible] جواب دیا کہ کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے۔ یہ فرمانے لگے "یہاں نلکا بھی ہے؟"

اُستاد بوٹے خاں گلزار کا حال

خضر تمیمی

آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصے سے اُردو ادب کی مستند کتابوں پر پیروڈی
کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خضر تمیمی نے آبِ حیات کی پیروڈی لکھی جو ڈائرکٹر آل انڈیا
کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے۔

جس وقت وہ صاحب، کمالِ ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے "بچ جاؤ" "بچ جاؤ" کی آوازیں بلند کیں۔ عندیہ تھا اس کے گھوڑے کا دانہ بنا ہے آبِ حیات میں بہ گویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد کا ذکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظمِ اُردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ جی یہی چاہتا ہے۔ کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ کیونکہ اس شعر کے پتلے کے گھوڑے کا بھی رونگٹا بیکار نہ تھا۔ اس واسطے میں لکھوں گا۔ اور سب کچھ لکھوں گا۔ ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ جھنڈے خاں پرچم کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ڈرل ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاوشوں سے بھی اندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ملحقہ ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں جن کے طلبا کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لئے زبان کی آبیاری کے لئے وہ اپنے اشعار کو بہ فرزندانِ معنوی شاعر کے ہوتے ہیں مشتاقانِ سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے۔ کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جوہرِ سخن کے پرکھنے والے جوق در جوق آتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ دو ماہ کے بعد پرچہ دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے۔ اور انہیں سُن سُن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ: پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا جبری طریقہ ہے۔ کیونکہ اول اول خریدار سخن جب ان شاہ پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدردانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلّم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے۔ وہ بڈھا استادِ سخن اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے مبتدی جبری شعر گوئی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا۔ وہ بھی طوعاً کرہاً اس فنِ شریف کو "جزو یست از پیغمبری" اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ اور کیا زمانہ تھا۔ یہ سب انہی باکمالوں کا صدقہ ہے

فارس کے سو مدرسوں میں نوّے مدرّس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلّص کے سوا نہیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

استاد بوٹے خاں گلزار کی والدہ کے جیتے جی اُن کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے ... مرحوم کو نئی دلہن سے زیادہ محبت تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلّہ میں ایک ... رکھا تھا۔ وہ ضعیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی۔ اور بوٹے خاں بھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے ... کے احکام اور ان کی فوری تعمیل کے منظر دور ہی سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بچپن میں ان کی والدہ ... گئی تھی۔ یہ چھوٹے سے ہی تھے دور رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے ہاں سے ایک روٹی لے کر چلتا بنا۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں کتّے کی آمد اور روٹی کی گم شدگی کی داستان کو ایسے دلآویز طریقے سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم جاتا رہا۔ اور انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد ... فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔

وحیدی صاحب (کہ مستند نشانی بزرگوں کی ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے خود بوٹے خاں کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے یاد کر کے اس کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خاں کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔ جھنڈے خاں مرحوم ... کی ایک آواز کے ساتھ سینکڑوں گردنوں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے نکاح ثانی کر لیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی ... ماہ پیشتر انہیں محکمہ تعلیم میں اٹکا گر ٹیچری مل گیا تھا۔ اس لئے آئندہ فراغت کے پیش نظر انہوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ لیکن ان کے شاگردان تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردان معنوی بھی تھے۔ پر شاباش ہے کہ ان میں سے بعض ... بوٹے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے تھے۔ اور جس سے جو کچھ بن پڑتا تھا۔ اپنے استاد زادے کی خدمت سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کا طرّہ دستار منشی جیون بخش اجل مرحوم کو ملا۔ جنہوں نے ہمت کی کمر باندھ کر ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں چندہ کر کے بوٹے خاں کے لئے ایک گھوڑا اور ٹانگا خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا بفراغت سے گزران کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر اکیس برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک لاہور میں کوچوانی کی۔ وردی میں امتیاز اور بقائے دوام کا تمغہ لگایا۔ اور نقارۂ فخر کی اس آواز کو کوئی نہیں دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی قانون شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے نو بجے تک ٹانگا چلاتے تھے۔ اور باقی وقت مشق سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے۔ ذکر انہیں ایک کھارے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلے والے مکان کی بیٹھک میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ آپ کی ضعیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی۔ اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں گنگا موجود ہے۔ ایک دن اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نور کے اور کچھ نہ تھا۔ اجل مرحوم کا پاؤں اس سے الجھا تو استاد نے کہا کہ "کیا ہوا؟" انہوں نے جواب دیا کہ "کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹھوکر لی ہے۔" پھر زمانے کئے بیان [illegible] ہے؟

جہاں رمضان رہتا تھا

مولانا اختر شیرانی ایڈیٹر رومان کی نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ پچھلے دنوں ایک صحبت میں مولانا کے تین عقیدت مند یعنی جناب خضر تمیمی، عزیزم عطاء اللہ سجاد اور راقم الحروف جمع ہوگئے اور باتوں باتوں میں اس نظم کا ذکر آگیا۔ مولوی خضر تمیمی کی جان پہچان کے لوگوں میں میاں رمضان ایک بزرگوار تھے۔ "ریحانہ" کے تذکرہ میں انھیں بے اختیار وہ یاد آگئے اور چند منٹوں میں یہ سانچے کی نظم لکھ ڈالی گئی۔ خدا کرے کہ اختر کی "ریحانہ" کے طفیل ہمارا "رمضان" بھی زندگیِ جاوید حاصل کرے۔

(سندباد جہازی)

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچے کا علمبردار تھا آزاد رہتا تھا
بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا
بشانِ قیس عامر صورتِ فرہاد رہتا تھا
جو اس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا

اور اس دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی چھپر تلے دن رات اس کی چارپائی تھی
یہی دو چار کپڑے تھے اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا یہی اس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کے پنواڑی سے اس کی آشنائی تھی
کبھی وہ اور کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی کوچے میں آوارہ دھواں ہے اس کے حقے کا
فضا کا ذرہ ذرہ نوحہ خواں ہے اس کے حقے کا
مگر دھندلا سا خاکہ کہکشاں ہے اس کے حقے کا
ابھی ٹوٹا ہوا نیچہ نشاں ہے اس کے حقے کا
وہ حقہ جس کے دم سے اس کو اطمینان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

ہے سرمہ بیدلوں کی آنکھ کا اس کا غبار اب تک
اٹھائے پھر رہے ہیں بیلچے کچھ خاکسار اب تک
یہاں چلتا ہے لنگڑا کر ہوا کا رہوار اب تک
جھکا دیتے ہیں سر تیمور سے عالی وقار اب تک
یہیں کہتے ہیں پہلے اس سے ایم اے خاں رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

(شیرازہ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۶ء)

ماڈرن غزل

حاجی لق لق

کیا ان کو حالِ دل سنانے سے فائدہ؟

ہوگا تو ہوگا نوٹ دکھانے سے فائدہ

نوکِ مژہ جو دل میں چبھی دل پھڑک اٹھا

کچھ تو ہوا ہے ٹیکہ کرانے سے فائدہ

دل گم ہے اپنا چور کا لیکن پتہ نہیں

عاشق کو کیا پولیس کے تھانے سے فائدہ؟

معلوم ہے دکھاتے ہیں وہ ہم کو سبز باغ

لارنس باغ شام کو جانے سے فائدہ؟

اب بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ میرے بزرگ ہو

کچھ بھی ہوا نہ شیو کرانے سے فائدہ

جو نیچے جیب کے ہے مری جاں اسے چرا

عاشق کا فاؤنٹین پن چرانے سے فائدہ؟

لق لق زمانہ ہم سے اٹھاتا ہے فائدے

ہم نے نہ کچھ اٹھایا زمانے سے فائدہ

ماڈرن غزل

ضمیر جعفری

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے
مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے

الٰہی خیر! دلِ زار و ناتواں کی خیر
کہ آج ان کا ہر انداز ہٹلرانہ ہے

نہ جاں کی خیر نہ قلب و جگر سلامت ہیں
وزارتِ رخِ دلدار کا زمانہ ہے

ترا وصال میسر ہو نقدِ جاں کے عوض؟
بڑی بلند تری "شرحِ آبیانہ" ہے

جمالِ دوست کی جاپان دوستی توبہ!
مثالِ چین مگر عشق "فدویانہ" ہے

ہے مدعائے حقیقی تو دیدِ ساقی کی
شراب خانے پہ پکٹنگ تو اک بہانہ ہے

تم آج کیوں یہ گورنر سے بن کے بیٹھے ہو
کہو کہو مری جاں کس کو آزمانا ہے

دلوں کا فرش بچھا ہے جدھر نگاہ کرو
تمھارا گھر بھی دلوں کا کباڑ خانہ ہے

نہ دیکھ آہ مجھے اے نگاہِ یار نہ دیکھ
کہ آج تیرا ہر اقدام "جارحانہ" ہے

مجھے ضمیرؔ خدا کے کرم سے کیا نہ ملا
مزاج گرم، طبیعت بھی شاعرانہ ہے

چل راوی کے پار

عاشق محمد غوری

چل راوی کے پار
سجنیا
چل راوی کے پار
نہ میں بابو نہ ہیں منشی، جاگ اٹھی ہے قسمت تیری
میں ہوں نمبردار
سجنیا
چل راوی کے پار

ریشم کالے سر پہ دوپٹہ کھدر کا ہو تیرا کرتہ
اور اونی شلوار
سجنیا
چل راوی کے پار
رہ میں ملا کر پھولوں والا میں تجھ کو اس سے لے دوں گا
پیسے کے دو ہار
سجنیا
چل راوی کے پار
روکھی سوکھی روٹی کھا کر لیٹ رہیں پیپل کے نیچے
پریم کی ہو جے کار
سجنیا
چل راوی کے پار
سو جائے گر قسمت اپنی یعنی پالیں ہم کو کھوجی
پھر جو کرے کرتار
سجنیا — چل راوی کے پار

غالب

پھر میں نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ تم نے سُنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سُنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور
پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو یہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی
بھانجی مری ہے؟ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلاؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔
توضیح بقید نام لکھو۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

بھائی!

ریمیا و سیمیا خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بوعلی یہ علم کچھ اس باب میں لکھتے۔ کیمیا اور سیمیا
دو علم شہرہ ہیں۔ جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ کیمیا اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ سیمیا ہے۔

جاں غم سیمیا نخورد گے
دل سوئے کیمیا نیاوردم

شعر با معنی ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟ زمان و زمانہ کو میں پاگل
ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زمان و زمانہ لکھا ہوگا۔

---

(۴) مرزا تفتہ

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس
مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا ہی کا درخت اُگ جائے
خدا تم کو سلامت رکھے، دکان بے رونق کے خریدار ہو۔

---

(۵) مرزا تفتہ

لاحول ولا قوة! کس ملعون نے بسبب ذوقِ شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار ہوں تو میرا خدا
مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق فہرر دو ردیفیں بجان در دولتیں لکھا تھا جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی
ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

---

(۶) میر احمد حسین میکش کے نام

بھائی میکش!

آفرین، ہزار آفرین۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خوے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے۔

دیکھو صاحب ع

تلف نہ ہر چہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی، اس کی تعریف، کے خرمے کہاں تک گے، اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمھارے خیال میں نہ ...
ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر آدے۔ لاحول ولاقوۃ ...
العلی العظیم۔ اگر بفرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے تو ہم ...
تازہ سے بہتر، بارہ سے بہتر۔ ۱۸۵۶ء

---

(۷) علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام

میری جان!

سُن! پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، بہ یک شد، یہ ہم زمین مینہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی شدت سے
برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں، دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں، تمھارے خط
کا جواب ضرور، لکھتے جاؤ۔ مرزا امتیاز علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی عیبت پر کیا موقوف،
مجھے آج سواری مل جائے کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے تو بس!

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ
گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا، ادھر
خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی
کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور ساٹھ
روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سُود ماہ بماہ لیا چاہے، مُول میں قسط اس
کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سُود جدا، مُول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آ گیا
گزارا مشکل ہو گیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش، صبح کی تبرید متروک

... کو نصیحت اور ملامت کی شراب و گلاب نوشی ... بائیس روپیہ مہینہ یا دوازدہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبدیلی شراب ... نہ ہو گے؟ کہا کہ جب تک وہ نہ چاہیں گے۔ پوچھا نہ ہو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ ... انہیں کہتا تھا کہ ... روپیہ آ گیا۔ قرض مقدار ادا ہو گیا ... کی تبدیلی بات کی ... پار آنے لگا۔

پھر ... صاحب نے وہ بے وقوفی اور کمالی پوچھی تھی ان کو یہ عبارت پڑھا دیا اور ... کو جو سلام کہنا ع

اسے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیکھا ہم کو یوں چڑاتے ہیں۔ در بیہ کے بیہودہ اور زندیق کو پڑھا کر مولوی مشہور ہوا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ... اور عرفا کے کلام سے حقیقت ... وجود کو اپنے ... ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک ... ہیں مشرک ... ہیں جو مسلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں ... وہ ہیں جو مسلمانوں کو الوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت۔ اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی علیہ السلام

برین زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنا ہو گا اور میں دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ سنئے مولوی صاحب! اگر ہم ہٹ دھرمی نہ کرو گے اور کتمانِ حق کو گناہ جانو گے تو البتہ تم کو یاد ہو گا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے جن روزوں میں تم علاؤ الدین خاں کو گلستان بوستاں پڑھاتے تھے اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں، نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو میں تھے، علاؤ الدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم با چشم پُر آب میرے پاس آئے ہیں۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں۔ تم نے بے جا کیا۔ آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین طفل سے گزر کر پیر ہفتاد سالہ کے واعظ بنے۔ تم نے کئی قافیوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے: چوں پیر شدی حافظ ..... الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے مجموعہ نثر جدا گانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں ؎

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را | تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
شراب ناب خورد و شد رہ جبیناں بیں | خلاف مذہب آنان جمال ایناں بیں
ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما
ساقی بگو وظیفہ حافظ زیادہ دار | کاشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں: ہائے دبی! ہائے مری۔۔۔۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک مرمت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

صبح یکشنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء

(نوٹ) اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خان نے نواب علاؤالدین خاں کے خط میں مرزا غالب کو لکھوایا ہوگا کہ اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

غالب نے جواب میں اسی پر طنز کی ہے۔

بحث و تکرار

سر سید احمد خاں

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عجیب آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں خفیف خفیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا اس کی گردن۔ اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں تو تکار تک نوبت آ جاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ

پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی ٹھیک ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہیئے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنوں۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو ہوش اخلاق اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کہتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردید کی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا شاید مجھے دھوکہ ہوا یا میں غلط سمجھا کو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہو کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کی اُلٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اُس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

چونکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آگے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو جلد ختم کر دو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خط و کتابت

اگر ہم اپنی قوم کے طریقہ خط و کتابت کی درستی پر بھی کچھ لکھیں تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ جس طرح ہماری قوم میں اور بہت سی فضول لغویات شامل ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ہماری سمجھ میں مذہب اسلام کی علاوہ اور پر اثر باتوں کو بے اثر اور کھیل بنا دیتی ہیں۔

جب ہم کسی خط کو پڑھتے ہیں تو اُس میں ایک بہت لمبا چوڑا القاب اور آداب پاتے ہیں ان دونوں میں صرف شاعرانہ الفاظ ثنا و صفت مکتوب الیہ کے ہوتے ہیں جو درحقیقت مکتوب الیہ میں نہیں ہیں۔ حالانکہ القاب میں یا تو بیگانہ وار (اگر مکتوب الیہ بیگانہ ہے) کوا یسا لفظ ہونا چاہیے جو خطاب کا شعور اور مخاطب کرنے کے لئے کافی ہو۔ یا اُس دلی تعلق یا ادب کو ظاہر کرتا ہو جو درحقیقت کاتب کو مکتوب الیہ سے ہو۔

آداب معلوم نہیں کیا لغو چیز ہے۔ ایشیا کے امراء اور بادشاہ ہمیشہ اس خیال میں تھے کہ جو ہم سے کمتر ہیں وہ بمنزلہ ہمارے غلاموں کے ہیں اور بدبختی سے وہ لوگ بھی اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے اور ہر قسم اور ہر موقع کی ملاقاتوں اور بات چیت میں دونوں اُسی

... بھرتے نہ تھے۔ اس سبب سے آپس کی تحریروں میں بھی وہ رسم جاری ہوئی جو خطوکتابت کے لئے زیبا نہیں ہے۔ فضول ... وقت ضائع ہونے کے سوا آداب کے لفظوں کی رعایت دلی مطالب علی الخصوص اُس زور یا جوش سے جو دل میں ہے ادا ... سکتے۔ قوم کے دل میں جو ایک غلامانہ انفعال پڑا ہوا ہے وہ دور نہیں ہو سکتا یہ ہم کو امید ہے کہ ہمارے اس آرٹیکل کے پڑھنے ... اور خطوط میں جو آداب لکھا جاتا ہے۔ اور نیز ادب میں اور غلامانہ انفعال میں جو فرق ہے اُس کو نظر انداز نہ کریں گے۔

اُس کے بعد نہایت شوق و ذوق سے اشتیاق ملاقات لکھا جاتا ہے اور خلوص عقیدت و محبت جتائی جاتی ہے جس کا ... میں ... اور واقعی نہیں ہوتا۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو اُس کو مقدمہ مطالب بنانے سے کیا مطلب ہے۔ اس رسم نے ایسا رواج ... دوست و دشمن دونوں کے خطوط کی طرز تحریر میں کچھ فرق و امتیاز نہیں رہا ہے۔ خط پڑھنے سے جو الفاظ محبت یا اشتیاق ... لکھے ہیں اُن کا کچھ بھی اثر دل پر نہیں ہوتا بلکہ ایک معمولی تحریر سمجھی جاتی ہے۔ جو دوست و دشمن سب کو لکھی جاتی ہے خود پڑھتے ... دل میں بھی اس سے زیادہ چکنے چپڑے الفاظ لوگوں کو لکھتا ہوں جن کا کچھ بھی اثر میرے دل میں نہیں ہے۔ ان رسموں نے ... کتابت کا جو سب سے بڑا نتیجہ ہے اور حالت مفارقت میں محبت و اخلاص کے اثر و بقا کا ذریعہ ہے۔ اُس کو بالکل خاک میں ... ہے۔

ہماری قوم کے مقدس لوگوں نے ان بنیادی تحریرات میں ایک اور مذہبی طرہ لگایا ہے۔ کوئی خط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ... خالی نہیں ہوتا۔ بہت سے بزرگ اپنے خطوط کے عنوان پر محمداً ثاً حامداً ثاً مصلیاً ثاً مسلماً لکھتے ہیں۔ لفافوں پر انشاء اللہ ... تعالیٰ ... بعینہ و کمال کرم تحریر فرماتے ہیں اور جن بزرگوں کا مذاق عمل اعمال کی طرف مائل ہے وہ لفافہ پر حروف تطبیقی لکھ دیتے ... خیال کرتے ہیں کہ ان الفاظ کی تحریر سے ہمارا خط ضرور مکتوب الیہ تک پہنچے گا۔ مگر اکثر دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی کچھ بھی تاثیر نہیں ہوتی ... بعض اکثر خط اڑا ہی لے جاتے ہیں جو اس سے بھی ادنیٰ خیال کے لوگ ہیں وہ لفافوں پر جو بہتر یہ دیگراں لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا ... اُن کے خط کو کھول کر نہ پڑھ لے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں ... نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقا اور ٹھیٹ سنت پر چلنے کا کام ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور ... مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اسی قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت اور منزلت ان کے دل میں ... اور بعض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے اُن کے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہو سختی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔

وہ بسم اللہ خط پر لکھتے ہیں مگر ان سے پوچھو کہ لکھتے وقت اُس پاک کلام اور مقدس الفاظ کے معانی اور مطلب کا کچھ بھی ... خیال اور دھیان تمہارے دل میں آتا ہے جس طرح اور لفظ شوقیہ و سخت و سست قلم سے نکلے جاتے ہیں اُسی طرح بے خیال بسم اللہ ... بھی لکھ دی بلکہ میں نے غلط کہا۔ شاید اگر کسی محبوب کو خط لکھا جاتا ہو تو الفاظ شوقیہ و محبت کا کچھ اثر دل میں معلوم ہوتا ہو تا۔ کسی کو سخت ... سست لکھنے میں بھی دل میں کچھ اثر غصہ کا پیدا ہوتا ہو گا مگر بسم اللہ لکھتے وقت خدا کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے بڑے بڑے شخصوں ... کو دیکھا ہے کہ شطرنج کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور خط پر حامداً لکھ رہے ہیں۔ ح۔ الف لکھا تھا کہ بولے وہ پیادہ مرا۔ وہ پیادہ ... میم۔ دال لکھی اور کہا وہ کشت۔ اتنے میں الف لکھا اور بولے وہ مات۔ غور کرو کہ اس طرح پر مذہبی مقدس الفاظ کا برتاؤ کیا۔

کچھ دل میں نیکی پیدا کر سکتا ہے۔

ہم نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ خدمت گار پر خفا ہو رہے ہیں: گالیاں دے رہے ہیں اور قلم سے خط کے سرے پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھ رہے ہیں۔ ایک گالی پر بسم اللہ اور دوسری پر حامداً اور تیسری پر مصلیاً لکھا جا رہا ہے۔

ہم نے ایسے خط بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھے دیکھے ہیں جن میں تمام دنیاوی مزخرفات بھرے ہوئے ہیں اُن کاموں کے کرنے کے حکم اور صلاحیں مندرج ہوا کرتی ہیں۔ اخلاقاً شرعاً ممنوع و حرام ہیں بعضے خطوں کا یہ فقرہ بھی یاد ہے کہ از دیگر حالات ہم مطلع فرمایند۔ لفظ دیگر کی تشریح ہم نہ کریں گے صرف مولوی کا یہ شعر پڑھ دیں گے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

پھر کیا ایسی سنت تحریری بجا لانے سے کچھ ایمان و اسلام کی برکت دل میں بیٹھ سکتی ہے

شاید یہ کہا جائے کہ یہ تو رندمشربوں کا حال ہوا۔ بزرگ و مقدس لوگوں کا لکھنا اس طرح پر نہیں ہے۔ غالباً یہ بات صحیح ہو مگر تجربہ سے۔ مشاہدہ سے۔ عقل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب مذہب کی مقدس باتوں کو دنیاوی باتوں میں ملا دیا جاتا ہے اور بطور مذہبی تقدس کے اُس کو نہیں برتا جاتا تو اُن کی کچھ عظمت اور اُن کا کچھ اثر دل میں نہیں رہتا۔ انصاف سے کہو کہ وہ لوگ جو رات دن تسبیح ہلاتے ہلاتے پھیرتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ دو باتیں کیں اور اللہ اللہ کہہ کر دانے اِدھر کے اُدھر کر دیئے۔ تین لغو باتیں منہ سے نکالیں اور اللّٰھم صلِّ پڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ انگلیوں کو وہ مشق ہو گئی کہ وہ کچھ پڑھیں یا نہ پڑھیں یہ دانے اِدھر کے اُدھر کرتی چلی جاتی ہیں۔ کیا ایسے برتاؤ سے خدا کے نام کی عظمت اور برکت دل میں رہتی ہے کیا اسی حالت میں خدا کا نام سنتے ہی خضوع و خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ ایسے برتاؤ سے خدا کا نام لینا اور کسی کو بدذات کہنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ اس کا۔

ہر کام میں خدا سے مدد چاہنا اور اُس کی طرف رجوع کرنا نہایت عمدہ مسئلہ ایمان و اخلاق کا ہے۔ مگر یہ ایک فعل قلبی ہے جس کے ساتھ ممکن ہے کہ زبان بھی شریک ہو۔ مگر صرف قلم سے لفافے کے سرے پر انشاء اللہ لکھ دینا چہ معنی دارد۔ نہایت عمدہ بات ہے کہ خط کے پہنچنے میں بھی خدا پر بھروسہ کرو۔ اُس سے مدد چاہو۔ مگر لفافہ پر انشاء اللہ کی چڑیا بنانے سے کیا مطلب ہے۔

میرے ایک دوست نے (جو اس قسم کے رسمیات کے نہایت پابند اور پرانے فیشن اور پرانے خیالات پر نہایت مستحکم ہیں) مجھ سے کہا کہ درحقیقت ایمان کی بات تو یہی ہے کہ جس طرح ہم خط پر مشفق مہربان ایک رسم کے موافق لکھتے ہیں اُسی طرح انشاء اللہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ جس طرح شہر کا نام لکھا پتہ لکھا۔ اُسی طرح انشاء اللہ بھی لکھ دیا۔ پس اب غور کرنے کی بات ہے کہ کیا ایسی صورتوں میں اسلام کی برکتیں نصیب ہو سکتی ہیں؟ یہ اسلام کے کام ہی نہیں ہیں۔ یہ تو شل اور رسمی باتوں کے رسمی کام ہیں۔ غیر مذہب کے لوگ جب ہمارے خطوں کے لفافے دیکھتے ہیں ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا احمق مذہب ہے جو یہ خیال بتلاتا ہے کہ ایسے لفظوں کے لکھنے

سے خوانلف نہیں ہوتا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صاحب، مذہب تو احمق نہیں مگر لکھنے والے احمق ہیں۔

بعضے دوست ہم سے کہتے ہیں کہ یہ سب صحیح مگر مسلمانوں کے خطوط پر ایسے الفاظ ہونے مسلمانی کی نشانی ہے مگر نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں کہ جناب ہم ہندوؤں کی طرح خط کے ماتھے پر قشقہ لگا کر اور گلے میں زنار ڈال کر مسلمانی چھپوانا نہیں چاہتے۔ اگر دل کی آنکھیں اندھی ہیں تو خط پر بسم اللہ کا قشقہ دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔

جناب رسول خدا صلعم نے اپنے فرامین پر بسم اللہ لکھی ہو، پھر کیا وہ نامے انہیں مضامین کے تھے اور انہیں مقاصد کے تھے جن مقاصد و مطالب میں تم اپنی روزانہ خط و کتابت کرتے ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے خطوط پر بسم اللہ لکھنی سُنت سمجھتا ہو تو نہایت بے ادب و گستاخ ہے اور کچھ بھی قدر و منزلت سنت کی نہیں جانتا۔ اسی بات کو تو ہم روتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو مذہب کی طرح نہیں برتتے بلکہ اس کا کھیل بناتے ہیں۔

یہودیوں کا بھی یہی حال تھا کہ محض ظاہری باتوں کو انہوں نے یہودیت سمجھی تھی اور اُن کے ہاں علما، وفقہا جو ربی اور توہن کہلاتے تھے صرف ظاہری باتوں پر چلتے تھے انہوں نے بھی اپنے ہاں دو فرقے قائم تھے ایک صدوقی جیسے سنیوں میں اہل حدیث اور وہابی اور شیعوں میں اخباری، دوسرا فریسی۔ جیسے سنیوں میں فقہی اور شیعوں میں اصولی۔ یہ دونوں فرقے ذرا ذرا سی باتوں پر بحث کرتے تھے۔ اور اسی کو کمال دینداری جانتے تھے۔ اس بات کی بڑی احتیاط کرتے تھے کہ بکرا اس قدر انگشت لمبی چھری سے تین رگوں میں ذبح ہو۔ مگر اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ آیا کہاں سے تھا۔ توریت کے بے طہارت چھونے اور بے لوبان جلائے کھولنے میں بہت احتیاط ہوتی تھی مگر اس بات کی کہ اس میں لکھا کیا ہے کچھ پروا نہ تھی۔ مکان پر۔ مراسلوں پر۔ چھاتی پر آیات توریت کے حروف مقطعات کا نقش لگانا بہت ایمان اور اتقا کا کام سمجھتے تھے۔ مگر جو بدی سینہ میں بھی بھری ہوتی تھی اُس کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ یہی حال بعینہ ہمارے زمانے کے مقدس لوگوں کا ہے۔

گول عمامہ، برج کی صورت کا عمامہ، عرب والوں کے عمامہ کی طرح کا عمامہ سر پر باندھے شملہ کئی انگل کا چھوٹے اُس کی تحقیق کئے اور ٹھیک گدی سے پیچھے لٹکائے، ریش مبارک ملنگھن پھٹکارے۔ قمیص مسنون پہنے اُس پر صدری عربی لگاتے اور اس پر عبائے کسروانی جس کو بعض کتابوں میں خسروانی منسوب الی کیخسرو کا فرباد شاہ فارس لکھا ہے زیب تن کئے مسجد یا خانقاہ یا کسی مدرسہ اسلامی میں تشریف رکھتے ہیں۔ بعضے نہایت سادہ سیدھا دیہاتیوں کا سا لباس اپنی سادگی اور محض للہیت اور خالص بے تکلفی جتانے کو پہنے ہوئے پھرتے ہیں۔ مگر پوچھو تو سہی کہ تمہارے دل بھی کسی لباس پر تکلف یا ملبوس سادہ سے آراستہ ہیں بجز اس کے کہ مسواک اتنی لمبی ہو۔ اور ڈاڑھی اتنی مٹھی۔ پائجامہ اتنا اونچا ہو اور کرتا اتنا نیچا۔ اور کچھ نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ سب ثواب اور جو کچھ دوسرا کرے وہ سب عذاب قل اتخذتم عند اللہ عھدًا فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون

ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم کو شائستہ ہونا چاہئے دنیا کے کاموں کو دنیا کی طرح اور دین کے کاموں کو دین کی طرح برتنا چاہئے۔ دونوں کو غلط ملط کر کر بگاڑنا اور مذہبی باتوں کو دنیاوی باتوں میں گڈمڈ کر کر غیر مذہب والوں کو ہنسوانا نہیں چاہئے۔ دنیاوی باتوں کے خطوط پر بسم اللہ نہ لکھنی درحقیقت اللہ کے نام کا ادب کرنا ہے۔ لفافے پر انشاء اللہ کی چڑیا نہ بنانی درحقیقت خدا پر بھروسہ کرنا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

ابن الوقت

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

ڈپٹی نذیر احمد

نوبل صاحب۔ میں نے آپ کے لئے نوکری حاصل کرنے میں جان بوجھ کر خود کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ میں نے عزت طلب ہندوستانیوں کو اکثر انگریزوں کی مدارات کا شاکی پایا۔ اور اگر آپ نوکری کی خواہش کریں گے تو میں ہر وقت کوشش کرنے کو موجود ہوں

ابن الوقت۔ میں آپ سے بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگ پشت ہا پشت سے شاہی سرکاروں کے متوسل ہیں۔ ان سرکاروں کی مدارات کا یہ رنگ تھا کہ چھوٹی بڑی کل خدمتیں موروثی۔ یہ کتنے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اولاد کی معاش سے بھی بے فکر تھے۔ میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے کچھ بیان کرتا ہوں۔ آپ اُن کو درست نادرست، واجب ناواجب جو چاہیں سمجھیں۔ برطرفی، معطلی، تنزلی کا نام بھی سارے قلعے میں کبھی کسی نے نہیں سُنا۔ داد و دہش انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ تیمور کی نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا ہی نہیں۔ شاہی تنخواہیں اولاد، اولاد کی اولاد پر تقسیم ہوتے ہوتے بعض کے حصے میں صرف پیسے رہ گئے تھے۔ اور بھی دو دو ڈھائی ڈھائی برس میں ملے تو ملے ورنہ اکثر تنخواہیں محض برائے نام تبرک کی طرح۔ صرف سرکار کی داد و دہش پر نوکروں کا گزر تھا۔ مگر وہ پیسے لوگوں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور دہلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے اُن کی تنخواہ کے بھی تھے۔ خواجہ محبوب علی خاں نے تخفیف کا قلم جاری کیا تو مفتی صاحب کا نام بھی زمرۂ ملازمان شاہی سے کاٹ دیا۔ مفتی صاحب تو مفتی صاحب، ایسے تین تین روپلی کی ان کے خدمت گاروں کو بھی پروانہ تھی۔ مگر مفتی صاحب نے جب سُنا تو دہائی دیتے ہوئے حضور تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کر ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب میں تو ایسی سرکاروں میں رہا ہوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا۔

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوا رخصت لے کر انہی دنوں حج کو گئے تھے۔ اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز۔ کسی حاکم سے اُن کی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بیچارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آ نکلتے ہیں اور اپنے حالات بیان کیا کرتے ہیں۔ اُن سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنے بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا، کہ کہئے۔ کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا؟ تو کہنے لگے۔ اجی اللہ اللہ کرو۔ کیسا سرمایہ۔ خدا جانے کیسے کیسے کتر بیونت کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی، مالی اُدھیڑ بے ڈالتی ہے۔ ورنہ خدا کا فضل ہے۔ میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے۔ بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے۔

میں۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں، از جانبی جنید، برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب۔ خدا جانے۔ لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہرچند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں۔ مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے اور لوگ میرا نام سن کر پکار اٹھتے ہیں۔ جی! وہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر۔

میں۔ آپ نے اصل سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا کہ شاید آپ رشوت لیتے ہوں گے۔

بھائی صاحب بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنگ مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔

میں ہیں تو سنا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں۔ اور آپ کے فرمانے سے بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔

بھائی صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے؟ ڈالی یا دورے میں گئے تو رسد یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی۔ یا شکار کو نکلے تو تانگے کے ہاتھی وغیرہ۔ یا خاص خاص لوگوں سے شاذ و نادر تحفہ تحائف۔ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا۔ رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں۔ اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ اور شاید کوئی میم والا صاحب ہوا اور میم ہوئی کفایت شعار جزرس۔ اور اس کے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دیئے۔ اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیلدار، تھانہ دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں۔ اور کتنے ہی دام کیوں نہ دیں، اصلی مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہیں تو ہاں اس کا بھی عجب نہیں مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی۔ مگر ان کے حصے کی بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ ان کے اردلی، خدمت گار، شاگرد پیشہ، پیشی کے عملے لے مرتے ہیں۔ اور صاحب کی آنکھ، کان، زبان بلکہ ہمزاد جو کچھ کہو، یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہمزادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا، تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو۔ اختیارات، حکومت، تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزت نہیں۔ اور میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کرا کے راضی کر سکتا ہوں، مگر مجھ کو ان کے نام کی کچھ ایسی چڑ سی آپڑی ہے کہ دو ہری دو ہری سواریاں رکھتا ہوں۔ خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں۔ مکان کا کرایہ، اخبار، کھانا، کپڑا، میرا سارا خرچ میرے بندوبست چلا ہے۔ سال میں سیکڑوں روپے تو ہسپتال، مدرسے اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے۔ یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں۔ لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں۔ مگر یہ مجبوری دفع ضرورت کے لئے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں، یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں چغلی کھانے کا موقع ملے۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنہوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ

جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا مستا رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چاہتا ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں کہ آخر زبردستی ٹھیل کر، دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو۔ اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ کلکٹر، جنٹ اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں۔ اگر یورپشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے اور نہ ملے تو رہے کہاں، تو احاطے کے باہر اترنا ضرور۔ اور احاطے بھی شیطان کی آنتڑی کہ جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے لوکسی نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چڑی تک پہونچی نہیں تو دل کی پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ بس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چھکوتیاں کرا دی ہیں، تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے دم لیا۔ اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگی تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا چپنے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے، خدمتگار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی سے تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بن بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو، لوٹنے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا۔ ادھر ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہو کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ آپ نہ چھوڑ کر اس کو متوجہ کیا۔ کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آ پڑے۔ چار و ناچار اچٹتا ہوا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہو، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھیے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں یہ کہہ کر وہ پھر اندر کو جانے لگا، تو آخر رہا نہ گیا اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں، اپنے سر پر؟ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تکیہ اور ایک بازو ندارد گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کیا بھروسہ۔ اتنی محنت کیوں

ضائع کی جائے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی بہ حکم لے کر نکلا کہ سر رشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں۔ کچھ بوسے نہیں اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر اُن کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں، اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے اُن کو خبر تھی چپراسی نے شاید یہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی اُن کی نظر نہ پڑی ہوگی! ضرور پڑی ہوگی۔ خیر! آخر آپ ہی سر اُٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب! حاکم بالا دست ہو کر اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل کی کرسی پر جو دوسری طرف تھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہیے قسم لے لو۔ تم خدا کے بندے ہو یقین مانتا، بس ڈنڈے پر الگ نھلگ جیسے اڈے پر کلدم۔ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوند! سر رشتہ دار حاضر ہیں۔ صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں۔ "اچھا آنے بولو" یعنی اچھا سر رشتہ دار سے کہو۔ چلے گئیں۔ اب میں منتظر ہوں۔ کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں، اور سر رشتہ دار مردود، آگے آگے آپ، پیچھے بستہ قلمدان لئے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا۔ سر رشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں "ول صاحب گرمی بوٹ"۔

میں: (گردن جھکا کر) ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں۔ اور دل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا۔ ارے ظالم! تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندہ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے ناظر اپنی بد ذاتی سے خس کو بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان۔ جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے، اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے۔ کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا جھیں رہا ہے۔ لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں۔ میں سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی؟ کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئیں یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں۔ اب سر رشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور میری اور صاحب کی بے تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ۔ جب سر رشتہ دار کاغذ پھیلا لگا صاحب کا منہ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں۔ "آپ کچھ کچھ" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا!" بالکل جھوٹ تھا۔ کس سسرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس سسرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی۔

تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک با مزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھائی چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے۔ صرف ماتھا پھٹول۔ وہ بھی اپنے سر کا چھلا اتارنے کے لئے۔ صاحب مجسٹریٹ چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سر رشتہ دار اور چپراسیوں کو میلا لئے پاؤں لوٹ آتا معلوم نہ ہوتا، تو مجھ کو کچھ شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی! یہ کا ہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے ہیں؟ آہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں، یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لئے مجھ پر تعینات ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں مکان پر تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے۔ اس میں سمجھ لینا۔ ہے تیا چھیا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوتا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ رہے۔ اتنے میں جمعدار نے پنسل اور پرچہ کاغذ نکال میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں جب میں قلم اٹھاتا تھا، بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ کر لیتے تھے۔ پہلے فرما دیجیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں۔ اسی کش مکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا۔ سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا۔ ایک کر پائدان پر پاؤں رکھ کر غڑپ بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیا بنا اردلیوں کو دکھا کر پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اٹھائی۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت ہی بگڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سر رشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورہ پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کماتے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے۔ مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہئے ان کے ساتھ بھی تو نہیں ہیں کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں۔ وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آگئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیے۔ جوں ہی مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے اللہ اکبر، ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی۔ کن وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔ دوسرے صاحب آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا آج کسی کی دال نہیں گلتی۔ تیسرے صاحب مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آچکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور مانند ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

سائمن کمیشن اور ہندوستان

محمد علی جوہر

بھائیو! یہ گلا تو میں نے پھانسی کے لئے رکھ چھوڑا تھا، مگر آپ مجھے شور مچا کر مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے تقریر میں آواز بلند کر کے یونہی پھاڑ ڈالوں۔ میرا گلا پڑ گیا ہے، میں کوئی طویل تقریر اگر کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا، لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے بھی نہیں اس لیے کہ مولانا حسرت موہانی خود ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ کمیشن کے ساتھ تعاون کے خلاف ہیں، لیکن دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں، یا اس کے ساتھ تعاون، یا عدم تعاون، کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اور عدم تعاون ہی کا نام مقاطعہ ہے حسرت صاحب مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن مجھے تعجب ہے کہ وہ مقابلہ کرانے کے لیے سر محمد شفیع اور حسن نظامی کے پاس گئے۔ (قہقہہ) لیکن آپ حضرات حسرت صاحب سے مایوس نہ ہوں یقینی نہیں ہے کہ وہ بھی سر محمد شفیع یا حسن نظامی جیسے ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنا جیسا کر لیں اور ان سے انگریزوں کا مقابلہ کرا کے ایک متوازی حکومت ہندوستان میں قائم کرائیں (قہقہہ)

ایک بزرگ تھے جن کو سماع سے بہت شوق تھا، ایک دوسرے بزرگ کو سماع سے نفرت تھی۔ جب ایک دن وہ اپنے دوست کے یہاں پہنچے تو محفل سماع قائم تھی، یہ دیکھتے ہی انہوں نے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا جس پر صاحب خانہ نے کہا کہ ذرا آنکھیں بند کر لیجئے (تھوڑی) دیر بعد کہا کہ اب آنکھیں کھول لیجئے اور بتائیے کہ آپ نے کیا دیکھا؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا رسول اللہ (صلعم) آپ کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس پر صاحب خانہ نے کہا کہ "رسول اللہ (صلعم) بھلا محفل سماع میں تشریف لاتے، اگر آنحضور اس کو جائز نہ سمجھتے؟" اس پر دوسرے بزرگ نے فرمایا کہ کیا معلوم منع ہی کرنے کو تشریف لائے ہوں" (قہقہہ) امید ہے کہ مولانا حسرت موہانی بھی لاہور اور درگاہ صابریہ پر محمد شفیع اور حسن نظامی کو اپنی حرکات سے باز آنے کے لیے ہی کہنے کو جاتے ہوں (زور کا قہقہہ) ان کو ہم سے کیوں شکایت ہے کہ ہم مالوی جی اور لالہ راجپت رائے وغیرہ سے مفاہمت کرتے ہیں۔ مالوی جی نے تو اختلاف ترک کر ہی دیا، اور کانگرس میں مفاہمت کی تائید کی۔ ہمیں امید ہے کہ لالہ جی اور ہندو مہاسبھا کے لیڈر بھی اسی طرح کانگرس کے فیصلوں کا اتباع کرنے لگیں گے۔ جب حسرت صاحب سر محمد شفیع اور حسن نظامی سے مایوس نہیں تو ہم بھی لالہ جی سے مایوس نہیں۔ (قہقہہ)۔

تعجب ہے کہ حسرت صاحب کو تعمیری کام کا اس قدر شوق ہو گیا ہے اور تخریبی کام سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ اس وقت ان کے علاوہ مولانا آزاد بھی موجود ہیں۔ میں ان دونوں صاحبوں کو یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۱۴ء میں ایک دن یہ دونوں صاحب میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اور چونکہ میں صاحب فراش تھا۔ میں نے اپنے زنانہ مکان میں انہیں بلا لیا تھا۔ اس وقت یہ ایک تخریبی کام کے لئے

مجھ سے کہہ رہے تھے اور میرا تعمیری کام پر اصرار تھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ تعمیری کام کرنے والا کوئی نہ کوئی پیدا ہو ہی جائیگا
ہم کو اس کا انتظار نہ کرنا چاہیئے اور جو خراب عمارت کھڑی ہوئی ہے اسے بلا تامل گرا ہی دینا چاہیئے اور جب تک کہ خراب عمارت
گرا نہ دی جائے گی، اس کی جگہ عمدہ عمارت کیسے بنائی جاسکے گی؟
حسرت صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ ترک تعاون کی تحریک میں ہم لوگوں نے تعمیری کام کو نظرانداز کر دیا تھا۔ ہم نے
گورنمنٹ کے کالجوں کو خالی کرانا چاہا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ودیا پیٹھ وغیرہ مختلف مقامات پر کھولے بھی، یہ ہمارا قصور نہ تھا، ان
میں طالب علم بڑی تعداد میں اب تک شامل نہیں ہوتے ہیں یا اہل ملک ان کے لیئے سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ پھر بھی بحمداللہ جامعہ ملیہ
احمد آباد اور بنارس میں ودیا پیٹھ قائم ہیں۔
تخریبی کام میں سب سے زیادہ پرجوش خود حسرت صاحب ہی تھے، لیکن ان تک نے کانپور میں ایک اسلامی مدرسہ کو
اس نے ترتیب دی تھی، اور بحمداللہ وہ مدرسہ بھی قائم ہے۔
اب بھی ہم کمیشن سے مقاطعہ کی آپ کو نمائش نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہم نے ہندو مسلمانوں کی مفاہمت کا تعمیری
کام بھی شروع کر دیا ہے اور اچھی خاصی کامیابی کے ساتھ جاری ہے، لیکن حسرت صاحب جو زیادہ تر تخریبی کام ہی کرتے رہے ہیں تعمیری
کاموں سے آگاہ معلوم نہیں ہوتے۔ سارا مکان ایک ساتھ ہی ڈائنامیٹ سے اڑایا جاسکتا ہے، لیکن کوئی مکان ایک دن میں تعمیر
نہیں کیا جاسکتا۔ تعمیری کام میں پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے، جو زمین کی سطح پر نظر نہیں آیا کرتی، ہم نے پہلے وہ بنیاد رکھی، پھر اس پر دیوارے
رکھنا شروع کیئے، پہلے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمانوں نے وہ تجاویز مرتب کیں، جن کی حسرت صاحب خود میرٹھ اور پشاور
میں تائید کر چکے ہیں۔ اور وہی ان کے مؤید نہیں ہیں، بلکہ ان کے نئے دوست سر محمد شفیع بھی ۲۰ مارچ کے جلسے میں موجود تھے اور ان
کے ان پنجابی اعزہ اور احباب کے کامل اتفاق سے جو جلسہ میں موجود تھے۔ دہلی کی تجاویز منظور ہوئی تھیں، یہی نہیں بلکہ سر محمد شفیع کا کہنا
تھا کہ یہ سب تجاویز خود انہی کی پیش کردہ ہیں، اور وہ اپنے زمانۂ وزارت میں انہیں ایک یادداشت کی شکل میں تحریر فرما چکے ہیں۔ ان تجاویز
کو مرتب کرنے کے بعد ہم آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے گئے اور بمبئی میں اس نے بھی قبول کیا، اور ان کے قبول کرنے والوں میں ہندو
مہاسبھا کے لیڈر مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور ایک بڑی حد تک ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے بھی تھے، اور لالہ لاجپت رائے بھی فرماتے
ہیں کہ وہ یورپ جانے سے پہلے ان تجاویز سے موافقت کا اپنے دوستوں کے سامنے اظہار کر چکے تھے۔ اور انہیں نے دوستوں کو بھی
انہیں قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ دوسرا زینہ اتحاد مذہبی تنازعات کے متعلق شملہ کانفرنس میں، افسوس ہے کہ کوئی فیصلہ نہ ہوسکا لیکن
حسرت صاحب جانتے ہیں کہ ہم نے جد و جہد کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ جب ہندو مہاسبھا والوں نے ہم سے مفاہمت نہ کی تو ہم
نے ان ہندوؤں کی طرف رجوع کیا جو کانگرس میں شریک تھے۔ اور الحمدللہ کہ کلکتہ میں ہم کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تیسرا زینہ تھا جو ہم نے چڑھایا
اس کے بعد ہم مدراس گئے اور وہاں تمام تنازعات کا فیصلہ ہوگیا۔ اور باوجود بہت سے اختلافات کے جن پر رات کے ڈھائی بجے
تک بحث ہوتی رہی، کانگرس نے ہماری ہی تجویز کو تسلیم اور قبول کیا۔ اور مالوی جی کی ترمیمیں نہ منظور ہوئیں۔ اس بحث میں ایک مسلمان کو بھی
حصہ لینا پڑا۔ خود ہندوؤں کو ہندو مخالفین کا جواب دینا پڑا۔ یہ چوتھا زینہ تھا جو ہم نے چڑھایا۔ اس کے بعد خود مالوی جی نے جو یقیناً ہندو
مہاسبھا کے سب سے بڑے ممتاز اور بااثر لیڈر ہیں، ہماری تائید کی کانگرس کی مجلس عاملہ کی جو اس کانگرس کے فیصلہ کی سارے ہندوستان

ہے تعمیل کرانے کی کوشش کرے گی، شامل ہو گئے۔ یہ پانچواں رد انقلاب چڑھایا گیا۔ کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟

۹۔ فروری کو دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ وہی تعمیری کام کرنا شروع کرے گی جس پر آج حسرت صاحب اس طرح مصر ہیں، یعنی ہندوستان کا دستور اساسی بنانا شروع کیا جائے گا۔

۱۲ فروری کو اور انجمنوں کی کمیٹیاں بھی شریک کی جائیں گی۔ اور اس کے بعد مارچ میں پورے ملک کا ایک کنونشن دہلی میں مجتمع ہو گا جس میں ہر ملت، ہر جماعت، ہر سیاسی فرقہ کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے، سب آئیں اور ہندوستان کا دستور اساسی تیار کریں کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟ اور کیا اس سے جلد بھی کوئی تعمیری کام ہو سکتا ہے؟

لیکن سوال یہ ہے کہ ۳ فروری کو جس دن کمیشن کے نحوس قدم ہندوستان کی سرزمین پر رکھے جائیں گے، اس دن کیا کیا جائیگا؟ کیا اس سے پہلے کوئی کامل مفاہمت ممکن ہے؟ اگر اس سے پہلے ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے، لیکن اس کے ہونے تک ہم ان خیالات کے اظہار کو ملتوی نہیں کر سکتے جو کمیشن کے متعلق ہمارے دل میں موجزن ہیں۔ ہماری غیرت اور حمیت کا بھی تقاضہ ہے کہ اگر ہم کمیشن کو ہندوستان آنے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم از کم تنا تو کر لیں جس کے کرنے کی یقیناً ہم میں طاقت ہے کہ اپنی دکانیں بند کریں اور اس دن صرف ان کے دوکانداروں کی دکانیں کھلی رہیں۔ اور یہ ہندوستانی کی دکان بند ہو۔

حسرت صاحب چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاکخانہ بنایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک جسے حسرت صاحب کمیشن کے منہ پر پھینکنے کے لیے ہم سے کہتے ہیں، ہم ایک پوسٹ کارڈ اس ڈاکخانے میں ڈال دیں جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے۔ یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ فروری کی ہڑتال ہی ہو سکتی ہے۔

کمیشن کے متعلق مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہم کو جیوری سے اتنی شکایت نہیں ہے، جتنی جج سے ہے۔ اگر جیوری میں سب کے سب ہندوستانی ہی ہوتے جب بھی اس کے سامنے ہم اپنے مقدمے کی پیروی کرنا گوارا نہیں کرتے، اس لئے کہ جج ہندوستانی نہیں ہے، بلکہ ایک غیر ملک انگلستان اور اس کا پارلیمنٹ اور اس کا کابینہ وزارت ہے۔ ہر شخص کو اپنے گھر کے انتظام کرنے کا فطرتی حق ہے، غیر تو غیر کوئی غیرتمند اپنے حقیقی بھائی کو اس بنا پر اپنے بیوی بچوں کا انتظام سپرد نہیں کر دیتا کہ اس کا بھائی اپنے بال بچوں کا انتظام اس سے اچھا کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسا بے غیرت اس جلسے میں موجود ہے جو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو بھائی کے حوالے کر دے تو بولے۔ یہی حال ملکوں کی حکومت کا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ انگلستان میں ہر محکمہ کا انتظام مساوی طور پر عمدہ نہیں، بعض محکموں کا انتظام جرمنی میں اچھا ہے، بعض کا فرانس میں اور بعض کا روس میں اور بعض کا امریکہ میں۔ لیکن کیا انگلستان کا کوئی محکمہ اس بنا پر کسی دوسرے ملک کی حکومت کے سپرد کر دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کا انتظام انگلستان کی حکومت سے بہتر کر سکے گی؟

ابھی حکیم سید وزیر حسن صاحب کا گلا خشک ہو گیا تھا، اور کتنے ہی لوگ اس وقت چلا رہے تھے کہ "ہم نہیں سنتے، ہم نہیں سنتے" اور غصہ کے مارے ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا، کیا حکیم صاحب اس کو گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے کسی دوست کا لعاب دہن ان کے گلے کو تر کر دیتا؟ ہرگز نہیں، اپنا گلا اپنے ہی تھوک سے تر ہوتا ہے، کوئی دوسروں سے اپنے منہ میں نہیں تھکواتا پھر ہم کس طرح غیروں کو اجازت دے سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کی حکومت کا دستور اساسی وہ تیار کریں اور ہم پردہ حکومت کرتے رہیں؟

اب مجھے صرف دو لفظ اور کہنا ہیں، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی پر خود قابض رہے اور اس کو خود خرچ کرے، پھر بھی اگر وہ کمزور ہوتا ہے تو ڈاکو اس کی پونجی کو اس سے چھین سکتے ہیں اور جب تک وہ کمزور رہے گا، وہ اپنی پونجی پر قابض نہ ہو سکیگا۔ دنیا میں ہزاروں ڈاکے پڑتے ہیں اور خود ہمارے ہندوستان میں ان کی کوئی کمی نہیں، لیکن کیا کبھی ڈاکوؤں نے بھی کوئی کمیشن بنا کر اس امر کی تحقیقات کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ جس ضعیف و ناتواں کی پونجی انہوں نے لوٹی ہے، وہ اب اس قدر قوی ہو گیا ہے وہ اپنی پونجی ان سے دوبارہ لے سکے؟ ایک ملک والوں کا دوسرے ملک والوں پر قبضہ کر کے اس ملک والوں پر حکومت کرنا یقیناً ایک طاقتور ڈاکو کا ایک کمزور شخص کی پونجی پر ڈاکہ ڈالنا ہے، جب تک وہ قوی نہ ہو سکے گا، اپنی پونجی اس سے دوبارہ نہیں لے سکیگا۔

ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس قدر قوی نہیں کہ ڈاکو سے اپنی پونجی چھڑا سکیں، اس کے لیے کسی کمیشن کے بھیجنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر تم ہم سے یہ پوچھتے ہو کہ یہ پونجی ہے کس کی، اس کا حقدار کون ہے تو ہمارا صاف جواب ہے کہ وہ ہماری ہے اور صرف ہم ہی اس کے حقدار ہیں۔ اگر ہم ڈاکو کو اپنے گھر سے نہیں نکال سکتے تو کیا ضرورت ہے اس کی کہ جس کوٹھڑی میں ہم خود بیٹھے ہیں، اس کا دروازہ بھی کھول دیں تاکہ ڈاکوؤں کا ایک کمیشن ہماری قوت کی آزمائش کرے اور اس کا امتحان لے۔ کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ اس کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا جائے اور یہی انشاء اللہ ۳ فروری کو سارا ہندوستان کریگا۔

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک

سرسید کی "بزم ادب" پکے پکے پرانے لائق پرستش بزرگوں کی گویا بچوڑ تھی۔ اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے جنھوں نے جا جمایا نقشہ یعنی پچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ان میں سے ہر فرد اپنے دائرہ کا مالک تھا اور مستقل ہستی رکھتا تھا۔ آج وقار الملک اور محسن الملک کی یادگار میں چند سطریں لکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بھولنے کے لائق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں گویا ان کے دست و بازو تھے۔ سرسید کے ساتھ محسن الملک کی نوک جھونک، ادبی رانہ و نیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد مرحوم "تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے، فتوحات ادبیہ کا بہترین سرمایہ ہیں جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے، میرے موضوع کے صفحات محدود ہیں ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہو گی۔

بہر حال کس کس کو یاد کروں۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ سبھی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہو گئی۔ سرسید کی "بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقش اول میں بافراط موجود ہیں، وہ افسانہ یاران کہن کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس کی پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڑھ کی یہ آخری بزم ادب ہمارے لئے دقت کی چیز اور نتیجہ خیز رہتی۔

غیر ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیئے۔ سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی باأثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی۔ شبلی نے "مولویت" علیگڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاق تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا

دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روش جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جن کو تاریخی حیثیت سے کم سے کم اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید کا درجہ مقناطیس صرف مربیانہ تھا۔ اس لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسرات بھی بمشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے۔ "چشمک" کا گزر نہیں۔ ایک واقعہ دلچسپ اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے لکھتا ہوں۔ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کاٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچے" کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

حالی بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے۔ ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آبحیات" اور "نیرنگ خیال" پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں "نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ بعض لٹریچر کے رتبہ کا طول و عرض بڑھ گیا، لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا۔ یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔" نیرنگ خیال میں کچھ داد دی ہے کیونکہ آزاد کے قلم نے "پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اعلیٰ معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔" تاہم ایک ہلکی سی چشمک ہے۔

ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے۔ "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود نشہ میں چور تھا، ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک فرد کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا، یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اسلئے بدمست بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔"

"تزک جہانگیری" کی ریویو میں شبلی فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے۔ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب تزک جہانگیری ہے۔" اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے ناقدانہ

باور سخن گسترانہ ہے۔ یعنی بے ضرر چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آ سکتی ہے۔

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جا رہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف موعود پر نگاہ رکھیے کا جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے وہ سمجھے میرا مطلب "سخندان فارس" سے ہے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"آزاد کا سخن دان پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ۔ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

مجھے تحریر فرماتے ہیں "آزاد کی کتاب دی" جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی بانک دینا قومی معلوم ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ ٹیکو تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارھویں میں جو میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔

میں نے لکھا میری غرض سخن دان فارس سے نہیں بلکہ آزاد کے "تذکرۂ شعرا" سے تھی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا، مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔"

یہ تجزیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں بساط ادب کے یہ شاطر مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے۔

نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے۔ ان کی بے دے زیادہ تر سر سید پر رہتی تھی لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا طبیعت میں منفوانہ رنگ غالب تھا۔ اس لئے شروع شروع سر سید کے اجتہادات سے ان کو جھجک سی تھی جو رفتہ رفتہ گئی اور اس طرح گئی کہ سر سید کے عقیدت کیشاں با صفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ فراخ دلی جس کے شواہد ان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے سر سید تک محدود نہ تھی اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ استشہاداً لیجیے۔

علیگڑھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے۔ اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور روادار لوگ آ آ کر جمع ہوئے ہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی اب تو ایسا بھول گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں" ان فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علیگڑھ گئے تھے ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شعاعی بنے ہوئے تھے۔ اور میدان کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا۔

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:۔

"جس طرح پچھلے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے۔ اسی طرح میری نظم گویا ندائے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے۔ اور میں اپنی پند ازیں

ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں۔"

گویا ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے۔

اب میں نفسِ مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں، یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے۔

لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں۔ معارف میں نامۂ حالی و شبلی کا سلسلہ ۱۸۹۰ء سے جاری ہے۔ ان خطوں میں حالی، شبلی کو اس خلوص اور اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گنواتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے۔ اخلاص کی آخری حد ہے، خط دیر میں ملتا ہے تو کہتے ہیں:

"اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔"

جس خط کو دیکھئے درد و محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے۔ لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی حامد شبلی سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں اور باوصف اس کے کہ انھوں نے جواب دے دیا ہے، قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڑھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ الندوہ میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں، اس لئے ایک رباعی موزوں کرکے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دے دیجئے گا۔

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا، فرماتے ہیں "انھوں نے (یعنی شبلی) نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے۔ سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔"

کتاب کی ترتیب، اصول استنباط اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے شبلی کو حالی نے "فاضل ادیب" محقق اور اگر وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر" کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ "جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ سے رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقہ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔"

شبلی "دستۂ گل" ہدیۃً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصودِ اصلی یعنی چشمک کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے جو آنکھیں

مدھشی کی عادی ہوتی ہیں ان کو تاریکی گوارا نہیں گزرتی ہے اسی طرح نفس انسانی کا رخ روشن اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے اس لئے میری اضافی تعریحات بے کار نہیں ہیں، بہر حال اظہار خلوص کی حد ہو چکی، پھر اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجئے۔

حیات جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں سر سید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سر سید ۱۰ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سر سید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعویٰ پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سر سید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔"

حالی کہتے ہیں کہ "اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سر سید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سر سید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ہے" حالی نے ایک ایک اعتراض کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سر سید کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے۔ اور جس میں نا قدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا، لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھئے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی الماموں نہ لکھی ہے یا لکھی ہے لیکن لکھنے سے پہلے "حیات سعدی" پیش نظر ہے، ایک عزیز کو لکھتے ہیں:-

> "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا۔ اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ ان کا یہ حسن ظن کہاں تک قائم رہا؟

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں "تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن حیات سعدی یا یادگار غالب کی طرف ہے تو "چشمک" کی یہ نہایت ہی پھیکی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر

ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں۔"

اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے۔

اب میں نفسِ مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں، یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے۔ لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں، معارف میں "نامۂ حالی و شبلی" کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ ان خطوں میں حالی، شبلی کو اس خلوص اور اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گنانتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے۔ اخلاص کی آخری حد ہے، خط دیر میں ملتا ہے تو کہتے ہیں:۔

"اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو
پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔"

جس خط کو دیکھئے، درد محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے۔ لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی حامد شبلی سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دے دیا ہے، قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڑھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ الندوہ میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں، اس لئے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دے دیجئے گا۔

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا، فرماتے ہیں "انھوں نے (یعنی شبلی) نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے۔ سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔"

کتاب کی ترتیب، اصول استنباط اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے شبلی کو حالی نے "فاضل ادیب، محقق اور اگر وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر" کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ "جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقہ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں"

شبلی "دستۂ گل" ہدیۃً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:۔

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی چشمک کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ جاذب نگاہ ہوتی ہے جو آنکھیں

روشنی کی عادی ہوتی ہیں ان کو تاریکی گراں گذرتی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کا رخِ روشن اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے اس لئے میری اضافی تصریحات بے کار نہیں ہیں، بہرحال اظہارِ خلوص کی حد ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجئے۔

حیاتِ جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۶ - ۷ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔"

حالی کہتے ہیں کہ "اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ہے۔" حالی نے ایک ایک اعتراض کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت تنقیدی، اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے۔ اور جس میں ناقدانہ اظہارِ خیال کے سوا درپردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا، لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھئے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی "المامون" نہیں لکھی ہے لیکن لکھنے سے پہلے "حیاتِ سعدی" پیشِ نظر ہے، ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

> "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفتہً بھیجی ہے، شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا۔ اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔" لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ ان کا یہ حسنِ ظن کہاں تک قائم رہا؟

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں "تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن حیاتِ سعدی یا یادگارِ غالب کی طرف ہے تو "چشمک" کی یہ نہایت ہی پھبتی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر

"مواد منظر انیس ..." میں اور ایک کافی حد تک "شعرالعجم" میں اختیار نہیں کیا گیا ؛ کلیات خسرو جس کی تہذیب و ترتیب بزم علی گڑھ آج کل کے معرکہ ادبی پر پیش پیش ہے اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے، کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاق حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے ؛

چشمک کی دوسری مثال لیجئے :۔

تذکرہ گلشن ہند کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں :۔ "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلامت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں اور اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح جیسا کہ دیباچہ گلزار نسیم کے حاشیہ ذیل میں تصریح کی گئی ہے۔ شبلی نے لائق چکبست کو لکھا تھا کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔"

میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے۔ ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے جس طرح یہ ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ ان کے لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کے تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے، لیکن اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو "چشمک" کی نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گولیاں غلاف شکر میں، اب ذرا قوی تر شواہد لیجئے۔ مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں :۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے۔ یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی لیکن یہ اس زمانے کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔"

اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقہ سے بالکل آشنا نہ تھے۔ آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھلائے جاتے ہیں پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیا جاتا ہے جس سے دراصل مداحی کو قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے،

ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی،
یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے اور اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ
سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے، لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ
خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور
غمازی ہے جو واقعہ نگاری سے بمراحل دور ہے۔"

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا لیکن جلدی نہ کیجئے اور لیجئے مآثر رحیمی کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے:-

"اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں
ہی گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی
یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُر فریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں
جس میں راست فہمی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب
کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی تخفیف کر کے لکھا جاتا ہے تو اس
غرض سے کہ محاسن کے یقین دلانے کے کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپاتا ہے
تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے،
اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے۔"

ابھی اور سنیئے۔ موازنہ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:-

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید
اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں
کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی
کر رہے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس
کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں
ہوتا۔ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید
کرتے ہیں۔ ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے
وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ در سلسلہ
تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے، اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے

ابھی تک اظہارِ خیال پر ایک نقاب پڑی ہوئی ہے، مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ باریک تاروں سے چھن چھن کر "چشمک" کی شوخیاں آپ کے ذوق پردہ دری کو اکسائیں گی، لیکن ذرا ٹھہریئے اس کا حسنِ عریانی دیکھنے کے لائق ہے، یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے۔ اب صاف صاف سنیئے۔ شبلی کہتے ہیں:-

"حیاتِ جاوید میں مولانا (حالی) نے سید صاحب کی ایک رُخی تصویر دکھائی ہے۔
اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے، لیکن اگر
یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ابتدائی شاعری
میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت
پیش نہیں کرتے تھے۔ بہر حال حیاتِ جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں:-

"اختلافِ آراء بھی کیا چیز ہے۔ حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب
سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خیر والناس فیما یعشقون مذاہب۔"

یہاں یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کا پُر فریب طریقہ سوانح نگاری "جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی خیانت اور بد دیانتی ہے" اور جس پر بار بار بے چینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے۔ دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصنیفات اسی دائرہ میں آجاتی ہیں۔ تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولانا نے روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی پر صنعت گری جہاں یورپ کے طرزِ تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے "موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی" لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوشِ انتقاد کا شکریہ! لیکن ایک نکتہ دان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جن میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں، کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں، وہ اکثروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی، لیکن افسوس ہے کہ حیاتِ جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں "دیکھا زاقوامِ جرائم پیشہ" یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بہ لحاظِ فن حالی کے جس انتقاد کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں؟ اس کا جواب مجھے خوف ہے غیر امید افزا ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عظمتِ خود ملک کے سب سے بڑے مورخ کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیاتِ جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک

ٹریوٹ نے ایک شریف ترانسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی، وہ آخشتے تھی ہو کر لکھی اور یہی وہ پہلو ہے سے ادبی معیار تحریر ہے جو ایمانی بالغیب کی حیثیت سے یوسپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہ غلطی ہے کہ حیات جاوید کا رئیس الندکرہ فرشتہ نہیں تھا۔ انسان تھا، لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنھیں انسانی کمزوری کہئیے غالب تھے، یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی رشتے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس قسم کی اخلاقی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور نقصی پہلو اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح ندوہ کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے۔ جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہ ہوگا اور جسے شبلی کی عملی نفسیت (سائیکالوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں قیاس نہیں ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے، اسلئے مصطلح جبہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کیجئے تو سرسید اور ان کے رفقا نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور ان کے زبردست اجتہاد کا انتہائی کارنامہ ہے کہ عدم اعتراف دراصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی۔ میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ عقائد کو جو جذباتی چیزیں ہیں معقولات سے بھڑانا جس پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے دراصل کہاں تک "دگر دل خانہ ہیں جو کھنچی چیز" کا مصداق ہے۔ میرا منشا صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے، کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے نامورانِ اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پرکالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی، دراصل جذبۂ رشک اس کی توہین ہے۔ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھ دی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا۔ لیکن کیا شعر العجم کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہئے؟ اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دے گی۔ نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے۔ اس لئے سردست اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہ رکھے گی۔ اس لئے حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں آج کل کی عامیانہ تہذیب (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنہ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں، لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگڑ، فن تنقید کا ایک سخت گستاخانہ فرض ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لئے چشمک کے وہ عقدہ ہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا پہلو کچھ دبا ہوا سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرہ معترضہ بار طبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں "چشمک" جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں، وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے، ایک زاویۂ علمی کا نوجوان سید الطائفہ جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے۔ ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے:۔

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں، جن قلم نے مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو وہ الفرائض، اجتہاد، ترجمہ قرآن یا امہات الامۃ کیلئے سنجیدگی عبارت، متانت کلام اور نفاست بیان کہاں سے لائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لئے سنجیدگی چاہئے، شوخی اور ظریفانہ عبارت، وسخیفہ محاورات موزوں نہیں"

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا حقیقی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے۔ آہا۔ آقائے اردو علامہ نذیر احمد۔ ایل ایل ڈی جو ملک میں السنہ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا، جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت معترض بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے، جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق ہوگا، جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"مستی نکالتیاں اور یار کرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایک مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے، نذیر احمد نے مرآۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لئے تھے رہا ان کی ظرافت جو انہی کا حصہ ہے اور جسے آپ نمکین یا نمک سمجھئے اور میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہوں گا جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے۔

صرف ایک مثال اور دیکھئے۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں نذیر احمد اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آرہی تھی۔ لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا۔ یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر ناز تھا۔ انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا عجم یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کی جاتی مگر وہ ہوتی حلیۂ فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی۔ بس ضرور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جو داؤ ان کو خوب رواں تھا یعنی فصاحت، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید محمود اور حالی وشبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے۔"

یہی بلاغت ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی و تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے اور یہی تصرفات ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مورخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے بسمارک کو نذیر احمد کا شیدائی بنا دیا تھا۔ سر سالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر پر ہیں طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے۔ چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتہً سرکاری ڈاک آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے۔ ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے، برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرائی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑتی ہے اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے۔ نذیر احمد کے نصاب ادب کا یہ وہ نمونہ تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جسے ہم اگلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بے نمکی روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر ستائشی جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے یعنی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے جو شواہد پیش کئے گئے ہیں ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے خلوص نہیں تھا۔ شبلی حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔"

پاؤں کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے وفور جوش میں جو رباعی لکھ کر بھیجی تھی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، شبلی الندوہ میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یوں رقمطراز ہیں:۔

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہرحال "چشمک" جو کچھ بھی ادبی حیثیت سے تھی۔ نجی کے تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے خوشگوار تھے جتنے دوست اخلاف و گلاف مقدمہ کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ ان چند صفحوں میں خصائص نفسی کے مختلف رخ ضمناً سامنے آگئے ہیں، ورنہ میری نہایت محض نشئہ لذت بعض احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس حیثیت سے اردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون ہے۔

شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں

محفوظ علی بدایونی

۱۱ر رمضان ۱۳۳۲ھ

اظہارِ تقدس مقصود ہو تو گنہگار اور اعلانِ تورع منظور ہو تو خطاوار۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے مدت العمر میں شاید ہی کبھی چھپ چھپ کر اور کنسوئیاں لے کر غیر عورتوں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا ہو، اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوا بھی ہو تو یقیناً پہلا موقع ہے کہ دو [illegible] پانچ عورتوں اور وہ بھی اونچے درجہ کی خاتونوں کی باتیں، اور وہ بھی ذاتی اور خاندانی گلے شکوے کرتے سنا اور سننے کے بعد یہی نہیں کہ اس کان سنا اس کان اڑا دیا بلکہ قلمبند بھی کر لیا۔ اور قلمبند بھی کر لیا تھا تو قلم دان میں بند نہ کیا بلکہ اب ڈھنڈورا پیٹنے بیٹھا ہوں۔

تمہاری اس بھری بستی میں مشکل سے کوئی سمجھدار متنفس ایسا نکلے گا جو شیخ سماء اللہ صاحب کو جانتا بلکہ اچھی طرح پہچانتا نہ ہو اور ایسا شخص تو اس سے بھی زیادہ مشکل سے ملے گا۔ جسے شیخ صاحب سے دوستی یا دشمنی، محبت یا عداوت کا اچھا یا برا تعلق نہ ہو، مگر آفریں ہے شیخ صاحب کو کہ انہیں نہ دوستوں کی دوستی کی پروا، نہ دشمنوں کی دشمنی کا کھٹکا۔ وہ اپنے حال میں مست اور اپنے خیال میں محو ہیں، اور اپنی شانِ رفعت نشان کے اعتبار سے اعلیٰ ادنیٰ دوست دشمن سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ وضعدار تو سینکڑوں ہزاروں دیکھے سنے، مگر وضعداری کی مد میں اس شخص نے حد کر دی کہ جو بات جس وقت پہلے دن کی تھی، بھلا اس کا وقت ٹل جائے اور جس ترتیب اور جس سلسلے شروع کی تھی بھلا اس میں فرق پڑ جائے۔ سیر کا جو وقت پہلے دن مقرر ہو چکا ہے، آندھی آئے مینہ آئے، اولے پڑیں، لو چلے، اس میں تبدیلی قیامت ہی آ جائے تو آئے، ورنہ کیا امکان۔ بڑھاپا آ گیا مگر وہی خم و چم، وہی آن و شان قائم ہے۔ وہی البیلی چال کہ جب چلتے ہیں دوستوں کے سر اور دشمنوں کے جگر پر پاؤں دھرتے جھومتے جھامتے ہی چلتے ہیں۔

عنبرا خاتون کے ساتھ ان کی شادی کا واقعہ میری، بلکہ مجھ سے زیادہ عمر والوں کی یاد سے بہت پہلے کا ہے۔ جس طرح یہ سچی بات ہے کہ شیخ صاحب ذات کے اونچے، اور بہت اونچوں سے اونچے ہیں، اسی طرح یہ بھی سچی بات ہے کہ بیوی ذات میں ان سے نیچی اور بہت گری ہوئی اور حد درجہ کی گری ہوئی ملی۔ لیکن اونچی ذات والی بیوی خدائی بھر میں ملنی ممکن نہ تھی۔ بیوی کی ذات اگر گری ہے تو میاں ہی کی ذات سے گری ہوئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں بیگموں اور خاتونوں کو عنبرا خاتون سے وہی نسبت ہے جو چھاچھ کو دودھ سے اور بھوسی کو گیہوں سے۔

جن پانچ عورتوں کی گفتگوئے باہمی کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ انہیں شیخ سماء اللہ صاحب کی صاحبزادیاں ہیں جو انہیں عنبرا خاتون

گئے دنوں سے ہیں۔ پانچوں باپ کے سایۂ عاطفت اور ماں کے آغوشِ محبت میں پل بڑھ کر ماشاء اللہ مرتب ہو چکی ہیں۔ اور اب اپنے اپنے گھروں کی مالک ہیں۔

مجھے تو خود اعتراف ہے کہ اشخاص کی عمر اشیا کی مقدار اور اجسام کے فاصلہ کا اندازہ کرنے میں مجھ سے ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ مقدار اور فاصلے اور عمر میں مردوں کی عمر کا اندازہ ہمیشہ ٹھیک ٹھیک کر لیتے ہیں، عورت ذات کی عمر کے اندازے میں وہ تک اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس لیئے میں ان خاتونوں کی عمریں بقید سال و ماہ و روز نہیں لکھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ قیاس و تخمین سے کچھ نہ کچھ کم زیادہ لکھ دیتا، لیکن کمی میں تو مضائقہ نہیں (اور مضائقہ کیسا اُن خاتونوں کی شکر گزاری کا باعث ہوتا) اگر خدا نخواستہ بندہ بشر ہے، کہیں زیادتی ہو جاتی تو قیامت ہی آ جاتی، یعنی انہیں مجھ سے مفت کی شکایت بلکہ عداوت پیدا ہو جاتی۔ سب مرد جانتے ہیں کہ جو باتیں عورتوں کو ایسی ناگوار ہوتی ہیں کہ نہ برداشت ہو سکیں نہ معاف، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی عمر کا تخمینہ بڑھا کر کیا جائے۔ اس لیے زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر قطعی خلاف مصلحت ہے کہ جس صنف میں آج کل اقتراعیات (سفرجٹ) جیسی بہادران دریچہ شکن پیدا ہونے لگی ہیں، اس کے پانچ افراد کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا لوں۔ آخر میرے مکان میں بھی تو در، دریچے، روشندان، چوکھٹ، کواڑ، چھپر کھپریل، خدا کے فضل سے سبھی کچھ ہیں۔ بیٹھے بٹھائے ہلکی پھلکی جان کو فکر مول لے میری بلا۔

یہ جو پان کھائے، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسّی اور ہاتھوں میں مہندی لگائے، ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ پہنے، ہلکا دھانی دوپٹہ اوڑھے، قطب کو پیٹھ کیئے بیٹھی ہیں، آسیہ بیگم ہیں۔ جو عمر و تجربہ کے اعتبار سے، چال ڈھال کے اعتبار سے، شکل و صورت کے اعتبار سے قد و قامت کے اعتبار سے سب میں بڑی ہیں۔ اور اسی لیے سب بہنیں انہیں بڑی آپا کہتی تھیں۔ قیافہ بتا رہا ہے کہ بچپن اور جوانی کے دو پَن عیش و آرام اور مسرت و اطمینان سے گذرے ہیں۔ تیسرا پن یعنی بڑھاپا آیا تو آلام و افکار کو ساتھ لایا جنھوں نے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ضبط کہتا ہے کہ خبردار، جو ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ چنانچہ آفرین ہے اس کوہِ وقار کو کہ چھاتی کے کواڑ بند کئے دل میں حسرتیں اور منہ میں گلگلیاں بھرے بیٹھی ہے، مجال کیا جو دل کا ترجمان زبان کو بنائے۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ پر جو سیاہ فام خاتون آدھی ساڑی باندھے اور آدھی اوڑھے سر کے جھبلے اور اینٹھے ہوئے بالوں میں کوڑیوں اور چھوٹے موتیوں کی لڑیاں لٹکائے گلے میں کہربا کے دانوں کی مالائیں، ہاتھوں میں عاج کی چوڑیاں اور پاؤں میں چپلیں پہنے بیٹھی ہیں، اور جو سب سے زیادہ مفلوک الحال اور شکستہ بال معلوم ہوتی ہیں، افری خانم ہیں جنھیں آسیہ بیگم تو افری کہتی ہیں مگر باقی اور بہنیں سانولی آپا کہہ کر پکارتی ہیں۔ افری خانم کے داہنے ہاتھ کو جو دھاریدار سایہ پہنے، ٹوپ اوڑھے، عینک لگائے ناک بھوں چڑھائے، سب سے زیادہ متین یا مغرور مگر یقیناً سب سے زیادہ متمول، الگ تھلگ بیٹھی، بلکہ بیٹھی ہیں یہ امری خانم ہیں جنھیں آسیہ بیگم تو امری اور باقی بہنیں نئی باجی کہہ کر پکارتی ہیں۔ آسیہ بیگم اور افری خانم کے سامنے اور امری خانم کی طرف منہ کیئے جو نیم مشرقی نیم مغربی وضع بنائے ننگے پاؤں ساڑی باندھے چھوٹا کوٹ پہنے، کالر لگائے، ٹوپ اوڑھے بیٹھی ہیں، یہ برعکس نہند نام زنگی کافور "حسینہ بیگم" ہیں جنھیں آسیہ بیگم اور امری خانم تو "حسینہ" کہتی ہیں، باقی سب بہنیں "دریائی بہن" دریائی بہن کہہ کر پکارتی ہیں۔ یہ چاروں بہنیں تو بیٹھی ہوئی ہیں، لیکن پانچویں، جو غالباً کیا، یقیناً، سب سے چھوٹی ہیں۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب آفری خانم کی پیٹھ پیچھے کھڑی ہوئی ہیں جو کبھی ٹہل لیتی ہیں کبھی ٹھہر جاتی ہیں۔ ان کا قد چھوٹا ہے، مگر جسم گدراد اور گٹھا ہوا۔ منہ میں سگریٹ، آنکھوں میں گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے جو اکثر ہنسنے تک ترقی کر جاتی ہے۔ ان کی وضع قطع تو امری خانم کی سی ہے، مگر مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ "امری خانم" تو متین و خاموش

حدیث الغاشیہ

مولانا ابوالکلام آزاد

مرد مومن کی فریقانہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا؟ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ پسند کیجیے کہ نیر الامور اوسطہا
کفر و اسلام، دونوں کو اختیار کیجیے۔ اہرمن اور یزداں دونوں کو رام کیجیے۔ ایک ہی طرف کیوں جھکیے۔ جب دونوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے، ہ عرف
کعبہ ہی کے کیوں ہو رہیے جب بتکدے سے بھی رسم و راہ ہو سکے؟ ایک ہاتھ میں زنار برہمن رکھیے اور دوسرے ہاتھ میں سُبحۂ زاہد۔ یعنی ایک ہاتھ
ایمان سے ملائیے اور دوسرا وقفِ مصافحۂ نفاق۔ یعنی ایک ہاتھ میں "جامِ فلاحی" اور دوسرے میں "سندانِ حرّیت"

درکفے جامِ شریعت درکفے سندانِ عشق!
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذَالِكَ ، لَا إِلَىٰ هٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هٰؤُلَاءِ ط (۱۴۳:۴)

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است — با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذَالِكَ سَبِيْلًا (۱۵۰:۴)

(بعض باتوں میں راہِ ایمان اختیار کریں گے اور بعض میں راہِ کفر، وہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں)

حقیقت یہ ہے کہ اس "جمع اضداد" کی راہ نہایت مشکل ہے۔ ایک ہاتھ میں جامِ باطل پرستی رکھیے اور دوسرے میں سندانِ حق پرستی
اور دونوں کو باہم زور زور سے ٹکرا لیجیے مگر شرط یہ ہے کہ باطل کے جامِ بلوریں میں بال تک نہ آئے اور سندانِ حق پرستی بھی ہاتھ سے الگ نہ ہو ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اوروں کی خبر نہیں مگر اپنی کمزوری کا تو ہمیں صاف صاف اعتراف ہے۔ اس شعبدہ بازانہ چابکدستی کی مشق کے لیے بڑی بڑی قابلیتوں
کی ضرورت ہے۔ یہ مقاماتِ عالیہ ہم تہی دستانِ کمال کو کبھی حاصل نہیں ہوئے۔

"اتنے میں خبر اُڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے
ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں
ہے؟ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔"

ابوالکلام

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این

الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسکین دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جزم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا جو سادہ و بے آمیز ہونے کے فطری طور پر زود ہضم ہوتا ہے اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہو گی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو سلق کی جگہ معدوں سے۔

مگر افسوس کہ دوسرے روز ہماری طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا (طبی کانفرنس) کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے۔ نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لیے تیار ہیں کہ "شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

حریفانِ خلوت نے "صحبتِ نیم شبی" کی مجلسِ خاص کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسار نہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ صبح کی مجلسِ عام کو بھی سرشاری اور بے خودی سے محروم نہ رکھا جائے کیونکہ بارہ دری سے نکل کر جو کچھ گزری اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں لے سکتا اور کیوں لے؟ لیکن اس میں شک نہیں کہ بارہ دری کے اندر تو سبھی مست تھے۔

بے خود اس دور میں ہیں سب حاتم

ان دنوں کیا شراب سستی ہے

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی مآب دوست نے پلائی تو مے درکوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظاروں کے لیے ولولہ انگیز تھا لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا کیونکہ ہم نے ۲۸ ری کو دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور پچھلے اکثر بے حال تھے۔ بارہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیانِ آزادی ملے جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا لیکن وہ رزولیوشن کا مطلب بھی نہ بتلا سکے! جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے بھی تو "رقصِ مغلوبہ" میں حصہ لیا تھا تو ایکا ایک ان کے سر میں خارش شروع ہو گئی حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں بلکہ پیشانی تھی۔ ؎

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو بعد کو یاد نہ آتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اسی معرکہ آرائی میں صرف ہوا ؎

پر بعد از انفعال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

بزرگانِ پنجاب نے فوراً اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور صحبتِ نیم شبی کی کسی کو خبر نہیں دی گویا اور تو تمام صوبوں کی قائم مقامی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا! سنا ہے کہ جناب (راجہ صاحب) اسٹیشن دوڑے ہوئے گئے کہ خدا کے لیے اور جو جی میں آئے کیجیے مگر روٹھ کر تو نہ جائیے ؎

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

خیر یہ تو اس "شبِ وصل" کی شام تھی اس کے ذکر کو کہیں جلد نپٹا دیجیے کیونکہ اصلی پر لطف حصّہ تو اس کے بعد آتا ہے جب کہ رندانِ بادہ گسار نے "حجلۂ بزمِ شبی" آراستہ کیا اور پٹڑکاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریک بیماں کی قسمتِ خفتہ کو مژدۂ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا ع

وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوابی تنہا

لو کر بیش بر از عیش ہے یعنی ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

چشمِ تصور سے کام لیجیے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں۔ لیلائے شب کی زلف کمر سے گزر چکی ہے۔ ایک کنجِ خلوت میں صحبتِ بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی ع

دھری شراب ہے بیٹھے ہیں جا بجا ساقی!

قبل اس کے کہ آپ کسی … رہنما الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور رند ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی "دوست" کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس جامِ عہد فراموش کو منہ سے لگاتے ہی بنی جو کسی کے "دستِ طلائی" نے پیش کیا تھا تو انصاف کیجیے آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟ اور یہ تو وہ مقام ہے کہ ہاروت و ماروت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے تھے ع

ساقیا مرنج از من عالمِ جوانی ہاست!

خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "ہمّا سرار" صحبتیں!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گزر رہے ہیں۔ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و نو آموز مدعیانِ حریت، پھر شغلِ مے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟

مست بر بسترِ من افتد و زنداں دانند

حالتِ مست کہ بر بسترِ ہشیار افتند

اب اُدھر کی سُنیے۔ یہاں تو شب زندہ داران بادہ گساری "صبحِ خمار" کی اعضا شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے اور اُدھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصولِ مقصد کے لیے جو تدابیرِ گوناگوں و بوقلموں اختیار کی گئی تھیں منجملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسے کے لیے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک بھی اتفاق تھا کیونکہ آج اسٹیج پر پردے سے جو پتلیاں نکلنے والی تھیں، وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں اس لیے ضرور تھا کہ (باصطلاحِ عوام) اس "تماشہ گھر" کے لیے ٹکٹ بھی مقرر کیا جائے۔ لیکن اس پر طرّہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لیے پہلے تو شرط لگائی گئی کہ صبح آٹھ بجے سے پہلے لے لیے جائیں، حالانکہ جاڑوں میں آٹھ بجے تک رات کی کہر سے فضا بھی صاف نہیں ہوتی۔ پھر ٹکٹ کے لیے تھیٹر کے صدر دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے یہاں جائیے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف پچھلے پاؤں پھریے!

یاں سے واں تو اس سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

اس سے غالباً مقصود اصلی یہ تھا کہ ان مشکلات کی وجہ سے آزاد خیال طبقے کی بھاری جمع نہ ہو سکے۔ یہ بھی خبر اڑی تھی کہ ایک جماعت کل کے لیے باہر سے ٹھیکے پر بلائی گئی ہے۔ ایک جماعت راوی ہے کہ پولیس کی قوت سے بھی کام لینے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن صبح کو پھر ان تمام انتظامات کے عمل میں لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے کہ جب خیموں میں باہم صلح کر لی ہے تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف؟ (ناظم پاشا) جب سالونیکا گیا تھا تو (کامل پاشا) بے فکر ہو گیا تھا کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فوج کی اصلی قوت ان کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو لیکن اس وقت تو مفرور ہے۔

بہرحال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا اور اس تماشے کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہمارے نشوونما دوست باہر نکلے اور رزولیوشن پیش کیا۔ وہ بیٹھے تو میجر (ریٹائرن) بلگرامی اٹھے اور تائید کی ع

یکے بد زدی دل رفت و پردہ دار یکے

اب نہ ۲۶ کے محرک تھے اور نہ مؤید ؎

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

۲۶ کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا۔ ان کی تقریر اتنی پُرجوش تھی کہ اس کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گذری اور ان سے کان میں کہا کہ خدارا ذرا لب و لہجہ نرم کیجیے۔ علی الخصوص یہ بات ہمیں کچھ اچھی نظر نہیں آئی کہ سارا زور "جوشِ محمد" اور "ملکین اللہ" کے ضلع پر وہ صرف کر رہے تھے اور تقریر صرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر شخصی ارادت ظاہر کرنے میں جاری تھی۔ حالانکہ بہتر تھا کہ انہیں تشخص و تعین کے وہ سب کچھ کہتے۔ ہم کو اعتراف ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے اس وقت قابلِ تعریف ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنی تقریر میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گو جلسہ ان کا مخالف تھا مگر غصہ تو وہ شے ہے کہ مردم شناسی کی مہلت ہی کب دیتا ہے؟

لیکن آج ان کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے ان کے جوش کے انگارے سے اپنی انگیٹھیاں روشن کی تھیں آج ان کو آغازِ تقریر ہی سے جمائیاں آنے لگیں۔ پرسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے۔ آج انھوں نے چاہا کہ ٹھنڈے پانی ہی کو واٹن گلاس میں بھر بھر کر تقسیم دیں۔ سوڈا بھی نہیں۔

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی چکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے احباب سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ بُو اور ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں ؎

مرا اے می فروش آں بے خودی نیست
مگر در بادہ آب کردہ باشی

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لیے اعتماد کیجیے لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ

قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی گو اچھی علامت ہو۔ یہ قسم سچی سہی پھر بھی ضرورت کیا ہے کھانے کی!

ہمارے دوست کو معلوم نہیں ہے کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھاتی ہیں بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دوسروں سے لی ہیں اس نکتے کو (خانخاناں) نے سمجھا تھا۔

بہ کیشِ صدق و صفا حرفِ عہد بیکار است — نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ

قبل اس کے کہ کوئی کچھ کہے خود ان ہی نے ڈیپوٹیشن کی تجویز کو ساری چاپک تک سے تعبیر کیا اور پھر واقسموا باللہ جہد ایمانہم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہ تھا کہ خود ان کا ضمیر بھی اس وقت عالمِ اضطراب میں تھا۔ اس لیے خود ہی اپنے سے کھٹکتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آج جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے اس سے ہمارے دوست کو خود بھی حیا آرہی ہے ؎

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں؟

رزولیوشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیے تھے جن نوجوانوں نے پرسوں اپنی گلابازی سرگرمِ تقریر میں دکھائی تھی آج ان کی گرج اس ہنگامے کے بپا کرنے میں کام آگئی۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ بیٹھ جاتا تھا مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا۔ آواز اُگلتے اُگلتے منہ دکھ جاتے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلغاری محاصرہ کی پلٹنیں اس بیکاری سے کچھ اکتا سی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹے کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لیے بارہ دری کے اسٹیج کو "بارنسٹن سرکس" کا تماشا گاہ فرض کر لیا اور لگے بے تکان قلابازیاں کھانے ؎

دل از تنگیِ شور بے ذوق زنہار — گہے طفلی شود مستانہ مے رقص

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئیں، گلے شدتِ شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرار نہیں۔ منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لیے آپس میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھنے اور پھر کف اڑانے۔ منتظمینِ جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لیے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے تختوں کو کوٹ رہا تھا۔

ایک رقصِ مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا اگر (مسز سری اور نگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پُرجوش نوجوانوں کی ایک [illegible] ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔

آسان اُردو

ڈاکٹر عبدالحق

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چلی تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی التجا کرنی پڑی ہے خدا کرے اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لئے سبق آموز ہے اس کا ذکر میں نے اس لئے کیا تھا کہ اردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے ہی آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیئے تھے کہ عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لئے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا "صدر پر الضباب نوازل ہے۔" آپ سمجھے کیا کہا؟ غزل جس کی زبان سبک فصیح اور عام فہم ہوتی ہے وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ لکھنے شروع کر دیئے جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا اثر اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا۔ اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنہ کے بعد کہا۔

"حلبیت کا ضماد کرو۔" وہ بیچارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب کے حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا "حلبیت کا ضماد کرو۔" وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہمے انھیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شرر سے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا۔ کہ یہ کیا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ خیر وہ تو ایک گنوار تھا، آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اس تقریر سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اس کا مطلب سمجھے۔ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے کہ "میتھی یا مینگ کا لیپ کرو۔" تو کیا ان کی شان میں بٹہ لگ جاتا اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آجاتا؟ اگر نہیں وہ مطب کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو

عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اگر عام بول چال میں یہ باتیں آگئیں تو شان کہاں رہی۔

یہی حال مولویوں کا ہے۔ وہ اپنی تقریر، وعظ یا بیان میں موٹے موٹے عربی یا فارسی کے لفظ اور جملے کے جملے مزے لے لے کر بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھتے ہوں لیکن دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرنے کا یہ بہت اچھا گر ہے۔

سرسید احمد خاں نے جہاں اور بہت سی برائیوں کو توڑا۔ جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ سرسید کی سادہ نویسی مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے اور انھوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض وقت انھیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال میں وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کس فکر میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے بھی اس پر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

ہم یوں لکھتے ہیں۔ اس لئے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اسی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان ہو تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور ایسے مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنھیں قبول عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت انھیں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کیے ہیں۔

ہم آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان ہے بہت مشکل ہے۔ اول تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اسقدر صاف اور روشن ہو اور اس کا ہر پہلو اسقدر رچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہی ہمارے خیال میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کونسا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ بعض وقت اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی رد و بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا۔ جو اس گر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب ایچ پیچ اور ہیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پرشکوہ لفظوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لئے پرشکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور شیخی جتانے کے لئے بھی۔ لیکن اثر اور دل نشینی کے لئے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں۔ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا حالی کے پاس ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی۔ فرمانے لگے کہ لوگ جیسے بولتے

AB
ABCD =
EFGHI =
JKLMN =
PQRS =
YZ
1

ہیں ویسے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ بولنے میں زبان کے سوا آدمی چشم و ابرو، ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسر نہیں اس لیے موزوں الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ لیکن اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں حسن پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا جس کا میں اشارتاً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد انھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لیے "بدلِ اشتراک"۔ ایڈیٹر کے لیے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا یعنی "احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی"۔ لاحول ولاقوۃ۔ یار دوست یا اردو دشمن اسے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تقلید انسانوں کی فطرت میں ہے۔ بعض اخبار والوں اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے اور عجیب و غریب واہی تباہی الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں۔ ایک ان کے مقلد اخبار کے ایڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا۔

"بعد از انقضائے دہور و مرورِ ایام و شہور"۔ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا لیکن یہ بہروپیا پن زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے نہ چلی۔

الفاظ کا جادو

عبدالماجد دریابادی

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی سرائے میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعثِ توہین، لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا ذرا بھی باعثِ شرم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ سرا مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی ہے، ولائتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اُس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں، لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ربط و ضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے بھٹیارے اور ہوٹل کے منیجر کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولائتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں؟ کسی مدرسہ میں آپ مدرس ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرار یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں، صاحبِ وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے دارالاقامہ میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ شبلی ہوٹل سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے قیمت ہیں، لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ "طبیہ اسکول" ہے اور مدرسہ تکمیل الطب اور مدرسہ منبع الطب اب تکمیل الطب کالج اور منبع الطب کالج ہیں۔ مدرسہ طبیہ و یاجیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام "طبیہ و یاجیہ کالج" ہے۔ طبی درسگاہوں کو چھوڑیئے، خود [illegible] مدرس گاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر مدرسہ چشمہ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب تو "چشمہ رحمت کالج" ہے اور وہاں کے صدر مدرس "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کر تو دیکھئے، فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں پرنسپل کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ آپ گلی میں کھڑے ہو کے گلی ڈنڈا کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما جائیں گے، لیکن جب آپ کرکٹ یا فٹ بال یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، تو اُس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے! مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو آپ اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے، لیکن جب آپ کے شہر میں باکسنگ (مکے بازی) کا مقابلہ ہوگا یا ہیوی ویٹ چیمپین آ جائیں گے تو ان کے کمالات کا تماشہ دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں چوری چھپے رہس یا نوٹنکی دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقاہت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجئے کہ ڈراما جیسے فن شریف کی شرافت و عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے اگر آپ کی شناسائی ہو گئی ہے تو اُس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف اپنے ہم عمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ کر ہی کرتے ہیں، لیکن چارلی چپلن اور میری پکفورڈ کے کمالات فن اور آرٹ کی جتنی داد جی چاہے دیجئے، علمی محفلوں میں بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی چلی جائے گی! نٹوں کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدانخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ ان سے ملنے میں شرماتے ہیں نہ ان سے تعلقات بڑھانے میں۔

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے، ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اُس کی جان ایک کر دیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں، یہی ذلت ہمارے لئے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے شریف و معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے۔ انگاس میں کسی کباڑیئے کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لیے باعث ننگ لیکن مال روڈ پر پیک ایلن کی کوٹھی پر گشت لگانے میں کوئی عیب، نہ شرم، اسلئے کہ پیک ایلن بھی تو کوئی کباڑیئے تھوڑے ہی، مسٹر اکستر ا اور نیلام ہے ہیں!

چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدنے تو جب نے والوں کی نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ڈیلیریو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف روکئے اور کیک، پیسٹری کی خریداری بنفس نفیس بے جھجک فرمایئے۔ اس لئے کہ ڈیلیریو حلوائی کنفکشنر ہے!

نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خرید نا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی ہوئی دوکان پر بیٹھ کر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق، کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر ریسٹوران پڑ جائے تو وہی عار، فخر میں تبدیل ہو جائے۔ "نائی" بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اُس کے اُسترے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں، لیکن وہی نائی جب اپنے کو (HAIR DRESSER) کہلانے لگے، اور اپنی چوراہے کی دکان پر "ہیر کٹنگ سیلون" کا سائن بورڈ لگا دے، تو وہی ناگوار آپ کے لئے بطیب خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔

عدالت کا پیادہ جب تک "چپراسی" یا "نوکر" ہے حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر "بیلف" کہہ کر پکارا جاتا ہے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ "بیلف صاحب" ہے! کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ سے ہم کلامی، لیکن وہی ذلیل اگر کسی (TANNERY) کا مالک کہلانے لگے تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے۔ اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا (BATA) کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل اعزاز! نسبتی کا سا ہو کار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو، آپ کی نظر میں محض "بنیا" ہے لیکن وہی بنیا اگر کسی بینک کا بیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے، تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا "مصاحب" آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت سے چغلی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے، لیکن صاحب کے "پرائیویٹ سیکرٹری" اور اے۔ ڈی۔ سی۔ کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و مستعدی رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا، اور آپ کے ذہن نے قصائیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں، اور دوسری نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن، ان فرنگی پنچایتوں کی بلندی پر رشک کرنے لگا۔

کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے، تو خبطی ہے، کودن ہے، کندہ ناتراش ہے۔

محض ملتا ہے، لیکن اگر کسی ایڈووکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے نظائر ساز ہیں۔ تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔ فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج محال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے۔ لیکن لنڈن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، ناولوں کے نام سے، سراغ رسانی کے افسانوں کے نام سے، سنسنی خیز خبروں کے نام سے رعشہ انگیز افتتاحوں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ ہر ہفتہ اور ہر روز، ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل، اور تہذیب و تعلیم یافتگی کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ لوہاری کا پیشہ اختیار کیجیے تو آپ اسے گالی سمجھیں لیکن مکینکل انجینیری کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جراح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ کس درجہ پست ہے۔ لیکن سرجن کے نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے۔ جلاہا اور [illegible] کے "جلاہے" آپ کے خیال میں پست و ادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکاشائر کے ہیں تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ بزاز گز ہاتھ میں لئے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں، ان کی کوئی عزت و وقعت یقیناً نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معززین بلند ہیں۔ بزرگوں کے سالانہ فاتحہ منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں ادارہ کے احاطہ میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم تاسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔

لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے۔ کسی ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو سے ملے کلکتہ آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اٹھائیں گے! اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کر لے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لئے یہ بھی کافی ہی نہیں کافی سے زائد ہیں۔ اپنی ذہنیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے۔ معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں لیکن جو لفظ، اور جو نام، فرنگیت کے واسطہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے زیادہ کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لئے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص صرف اسی دور یا جوجی کے لئے اٹھا رکھا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ فتح کر لئے جاتے ہیں۔ اور بالخصوص ہیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خط غلامی لکھا لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر و شر، حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار رہ کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشم التفات کدھر ہے۔ عزت بھی "صاحب" کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی دیں کا عطیہ اور دنیا بھی دیں کی بخشش، اب نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان مسلمان، سب رعایائے سرکار۔ اب مسلمان نہ زید ہے نہ عمر، نہ بکر، اور ہندو نہ رام ہے نہ کرشن، نہ گوبند، بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر "صاحب دین"۔

اسمائے نکرہ اور الفاظ عمومی کو بھی چھوڑیئے۔ قیامت یہ ہے کہ اعلام اسمائے معرفہ تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ "میاں کلو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا کہ پانی بھی کرتے پایا لیکن مینیجر بلیک (BLACK) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں۔ "کلو مہتر" آپ کے محلے ہی میں رہتا ہے لیکن پروفیسر بلیکی" (BLACKIE) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! لالہ گھاسی رام" بیچارے تو کچہری ہاؤس کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے لیکن بریگیڈیر جنرل ہے (HAY) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں۔ "میاں رمضانی" اور "میاں شبراتی" کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر مے (MAY) اور ڈاکٹر فرائڈے (FRIDAY) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں۔ "مٹھو" کہار "طوطا" کلو کاریا اپنی ہی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں لیکن سر بانڈ پارٹرج (PARTRIDGE) آپ کے صوبہ کے گورنر تھے۔ مسٹر کاک (COCK) اس وقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور سوان (SWAN) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں۔ آپ کی ماما کا لڑکا شیرا بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ کی امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (BULL) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے مسٹر لیمب (LAMB) اور مسٹر کڈ (KID) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ "دریا" و "سنگھ" غریب، کوہ ان جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (LAKE) دیکھتے دیکھتے ہی آئی آر کے ایجنٹ ہو گئے۔ لالہ کوہاری مل کے چلانے کو انقش نویسی کا کام بھی نہ چلا جسٹس اسمتھ (SMITH) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے۔ "شیخ جھاڑو" کی زندگی نوربانی کرتے کرتے ختم ہوئی۔ سر چارلس ووڈ (WOOD) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں! جنگلی کسیارہ بے چارہ گھاس ہی چھیلا کیا۔ سر جان فارسٹر (FARESTER) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

خدا حافظ

قاضی عبدالغفار

۱۹ تاریخ کی صبح کو ہمارا چھوٹا سا قافلہ سمندر کے ساحل پر احباب و اعزا سے رخصت ہو رہا تھا۔ بمبئی کے اور باہر کے بہت سے احباب جمع تھے، اور وہ تماشہ بھی ہو رہا تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان پھولوں کو یکجا وزن کر سکوں جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کیے ہیں، تب بھی ان کا مجموعی وزن ان ہاروں اور گلدستوں سے یقیناً کم ہوگا جو ۱۹ کی صبح کو میرے جسم پر لادے گئے تھے۔ گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ اتنے کہ بلا مبالغہ دم گھٹ رہا تھا، ہاتھوں میں گل دستے دیئے جا رہے تھے اتنے کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ مجھ پر سادہ لوح مسلمانوں کی عقیدت و محبت برس رہی تھی، اور خدا جانتا ہے کہ عقل سلیم مجھے ملامت کر رہی تھی۔ نفس ایک پختہ کار ڈاکو کی طرح جو کسی بڑے مہاجن کی دولت لوٹ کر خوش ہو رہا ہو، چاہتا تھا کہ میں اس کے تمام نزا... اس حیوانی میں غرق ہو جاؤں۔ مجھ سے داد چاہتا تھا کہ ذرا دیکھنا بمبئی کے یہ لکھ پتی اور کروڑ پتی تجھے کس طرح جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں! دیکھ تو وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں، وہ تیری توصیف میں رطب اللسان ہیں تو ان کی نظر میں ایک ارفع و اعلیٰ انسان ہے۔ اے بے وقوف۔ آ۔ میرے ساتھ چلا چل۔ تیرے لیئے دنیا میں اس سے بڑی نعمت کیا ہے کہ تجھ سے بہتر انسان بھی تیری تعریف کریں ... ... اس طرح ان سادہ لوح مسلمانوں کے منوں پھول ضائع ہو رہے تھے ... ... وہ ہار جو شب کی بیخودی میں مسل کر رہ گئے ہوں، وہ پھول جو اول شام کی بدمستیوں میں کچل گئے ہوں، وہ لڑیاں جو محبت سے گوندھی گئی ہوں اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں، ان سب میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے۔ بدمستی ہوتی ہے، بے خودی ہوتی ہے، کیف گناہ ہوتا ہے مگر دھوکہ اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھول گلے میں پہنائے جا رہے تھے، ان میں حظ النفس ہی نہیں فریب بھی تھا۔ پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین بھی تھی۔ پجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں میں پھول چڑھاتا ہے، تو وہ پھول اس کے انکسار عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ معبودیت کے طمطراق سے اس کا نفس محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن اب کہ قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہو گیا ہے، موجودہ ہنگامہ میں ظاہر پرستوں نے جوش ملی کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ بہت سے پھول ہوں، بہت سے ہار ہوں، اونچی آوازیں ہوں، تکبیر کے نعرے ہوں، جلوس کے ہنگامے ہوں اور تقریروں کے دریا بہیں، گویا کہ قومی جد و جہد کا فرض عین ادا ہو گیا!

قومیت کا صحیح تخیل قوموں کی زندگی کا سرمایہ ہے، وہی انسان کے تمدن کو روم و یونان و نینوا و اٹلی کے عہد مکر و فریب اور دور کیوں جائیں، خود ہندوستان میں حکومت مغلیہ کے عہد آخر کی تاریکیوں اور گہرائیوں میں گراتا ہے۔ آج ہندوستان کی قومیت کا تخیل قرآن کی الوہیت اور وید کی روحانیت کی ایک بوسیدہ تصویر ہے، وہ اس قدر پست ہے کہ اب کسی ذرا سے قومی کام کے لئے انگلستان کا سفر بھی منزلہ

صد تحسین و آفریں قرار پاتا ہے۔ گویا کہ جہاد کا بہترین محل یہی ہے جس کا کوئی ہندوستانی اقدام کر سکتا ہے، وہ پھول، وہ ہار، وہ قصیدے ستائش گری کا وہ اجتماع، محبت و عقیدت کی وہ نمائش سب کچھ مل گیا صرف اس لئے کہ کسی شخص نے تین ہفتہ انگلستان میں رہ کر دو چار ملاقاتیں کرلیں۔ دس بیس تحریریں لکھ دیں اور چند تقریریں ان میں اسلامی مسائل کے گھوڑے دوڑا دیئے جب تخیل کی پستی کا یہ عالم ہو اور نظر اس قدر محدود ہو کہ پی اینڈ او کمپنی کے پانی پر تیرنے والے عشرت محل پر چند روز سفر کرنا اور چند روز انگلستان و پیرس کی تہذیب و تمدن کی مینا کاریوں سے متمتع ہونا بھی ایک مجاہدہ قرار پائے تو جان لیجئے کہ اس قوم کا مرض پرانا ہے، اور اب علاج محض گرمیٔ سخن سے نہ ہوگا۔ کچھ آج نہیں میرے دل میں یہ خیال اکثر آیا ہے کہ آخر یہ تماشے کب ختم ہوں گے۔ تماشہ گاہ میں ہر شب کو تاج الملوک بکاؤلی کے سرہانے پہنچ جاتا ہے، لیکن صبح کو جب تماشہ ختم ہوا تو اس تاج الملوک نے بھی رات کے روغن کو گرم پانی سے دھو ڈالا اور بکاؤلی کی نرگس شہلا کا سرمہ بھی بہہ گیا۔ اس بدنصیب برِاعظم کے تماشہ گاہ میں شب و روز یہ تماشے ہو رہے ہیں۔ لمبی تانیں، بلند آوازیں، بہت سے خوبصورت ہار اور گلدستے، پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جلوس قوم کی بیداری کی روشن دلیلیں یہ ہیں! خدمت و مخدومیت کا تخیل وہ تاج الملوک ہے جس نے بکاؤلی کو محض خواب میں دیکھ لیا ہو اور ایک کاغذ کا پھول بنا کر دکھاتا پھرتا ہے کہ یہی میرا گل مراد ہے!

پندرہ دن کے اس بحری سفر کی نوعیت یوں تو وہی تھی جو ہر ایسے سفر کی ہوا کرتی ہے۔ صبح سے شام تک جبڑوں کا چلتا رہنا، معدہ کا ہندوستانی ریلوں کے تھرڈ کلاس کی طرح لدا جانا، سمندر کی صحت بخش ہوا میں انتہا کی شدت، راستہ میں ملنے والے جہازوں کا نظارہ، کہیں کوئی جزیرہ نظر آجائے تو اس کا تماشہ، سمندر میں کم یا زیادہ تلاطم ہو تو اپنے کمروں میں پڑا رہنا اور زندگی کا ایک گونہ بے لطف ہو جانا، موسم اچھا ہو تو جہاز کے عرشے پر تفریح و ورزش، دو چار ہمسفروں کے ساتھ چہل قدمی اور گپ، جہاز کے مختصر کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نئی نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے یا پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرے۔ جب کسی کا پہلا بحری سفر شروع ہوتا ہے تو ہمیشہ بڑے بڑے ارادے جہاز پر ساتھ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تو یہ خیال ہوتا ہے کہ سفرنامہ اور روزنامچہ تو ضرور ہی لکھا جائے گا۔ وہ ایک بڑی مفصل اور دلچسپ کتاب ہوگی جو ہندوستان واپس آکر شائع کی جائے گی۔ اور اگر دل میں ارمان زیادہ ہیں تو اس ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اچھا خاصہ اشتہار بھی دیا جا سکیگا اور اگر مفلس ہیں تو کتاب کو فروخت کر کے خالی جیب پر بھی کچھ احسان کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ارادے تو سب کچھ ہوتے ہیں اور جہاز پر پہنچ کر پہلا خیال میرا بھی یہی تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ مگر اس کی تکمیل صرف اتنی ہی ہوئی کہ کبھی کبھی ایک دو صفحے لکھے اور ان کو واپسی کے وقت تک نہ دیکھا! اب ان صفحات کو لکھنے بیٹھا تو وہ پرزے بھی یاد آئے۔ جہاز کی زندگی دلچسپیوں سے خالی نہ تھی، لیکن ان دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کالا آدمی کافی اہلیت نہیں رکھتا۔ پانی پر تیرنے والا عشرت محل جس کو عہدِ جدید کی اصطلاح میں "جہاز" اور "کشتی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، "سرود خانۂ ہمسایہ" اور "حسن رہ گزرے" کے تمام روح پرور کرشموں سے بھرا ہوتا ہے۔

غالب مغفور نے اس "جنتِ نگاہ" اور "فردوسِ گوش" کو دیکھا ہوتا تو ان کی "چو گوشیہ" سطح سمندر کی لہروں پر رقصاں نظر آتی! میں جب صبح سے شام تک جہاز کے ہر گوشے میں وہ خود آرائیاں دیکھتا تھا، تو نظر چرا کر گردن جھکا لیتا تھا۔ گویا کہ خطاوار میں ہوں۔ ایک دوست تو اپنے عہدِ جاہلیت کو یاد کر کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ یوں بھی فرماتے تھے کہ

عید ہوئی ذوق و لے شام کو!

اگر "نفسیات" کا کوئی مبصر ان جہازوں پر سفر کرے اور بشرطیکہ مقناطیسیت سے متاثر ہونے والے تمام جذبات کو بمبئی کے ساحل پر چھوڑ آئے تو وہ اس بار بردار فرمیجن "میں اپنی بصیرت کے لیے ایک وسیع میدان پائے گا۔ اس ہاتھی کی طرح جس پر ریشم کے ہزاروں تھان اور جواہرات کی سیکڑوں پوٹلیاں لدی ہوئی ہوں۔ ہمارا جہاز ہزار ہا میل کا سفر طے کرتا ہے اور بمبئی سے لے کر عدن و سویز و پورٹ سعید و ساحل فرانس و انگلستان تک یہ گراں مایہ امانت پہنچاتا ہے۔ کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا رہتا ہے مگر پھر بھی عرشہ کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں۔ جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک چکیں اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے۔ شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید گال، باریک کپڑے، خوبصورت بال، درخشاں جواہرات ان سب کی ڈھیریاں لگی رہتی ہیں۔ ہر کرسی پر ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس بھی ہوتی ہے۔ ایک لیڈی بحث کو روز دیکھتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں، اگرچہ وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ ان کے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ پس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا کہ وہ اس ٹکڑے کو اٹھائے اور ان کے سڈول شانوں پر ڈال دے۔ ایک دوسری بیگم صاحبہ میرے سامنے ہی ایک میز پر تشریف رکھا کرتی تھیں۔ ان کی نازک پاپوش کا تکمہ بار بار کھل جانے کا عادی مجرم تھا، مگر جب وہ کھلتا تھا تو ہمسایوں کا اضطراب قابل دید ہوتا تھا۔ ہر شخص دوڑتا تھا کہ پہلے یہ تکمہ میں لگا دوں۔ ایک دن ایک عجوزۂ سمندری کے پاؤں میں موچ آگئی۔ حادثہ اوپر کے عرشہ میں پیش آیا تھا کوئی صورت نہ تھی کہ ان کو اس ہال کمرے تک پہنچایا جاتا۔ آخر چند مجاہدوں میں سے ایک نے جرأت مردانہ کا اقدام کیا اور گود میں اٹھا کر اس بار عزیز کو نیچے پہنچا دیا۔

اس جلوہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں جن کو اپنی یورپین بہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ بارہ بجے تک ان خواتین کا پرشور ہجوم عرشے پر رہا کرتا تھا۔ شاید دنیا میں بمبئی کے پارسی بھائیوں سے زیادہ کسی قوم کو اس قدر چیخ چیخ کر بات کرنے والی خواتین نصیب نہیں۔ چیخنا صرف آواز ہی کا فعل نہیں ہے۔ کبھی کبھی بعض بہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے، ان کا لباس چیختا ہے، ان کی نگاہیں چیختی ہیں، ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چیختی ہے، ان کی ساریوں کا رنگ چیختا ہے، جنس لطیف کا یہ غوغا بازاروں کے عامیانہ چیخ و پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لئے بہت زیادہ دلدوز اور دردناک ہوتا ہے۔ منجملہ یہ ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی، شعر چیخ نہیں سکتا، بول سکتا ہے، تصویر چیختی نہیں مسکراتی ہے یا بسورتی ہے، اور اگر اس کا رنگ روغن چیخنے لگے تو سرے سے نظر فریب نہیں۔ بعض اوقات، ان پارسی بہنوں کا ادعائے شان نسوانیت میری نظر میں ان کو اس شعریت سے بہت دور پھینک دیتا تھا جو عورت کا صحیح مفہوم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نسوانیت اس قدر بلند آہنگ ہو سکتی ہے یا عورت اس طرح اپنے ڈھول اور نقارے بجا سکتی ہے۔ یورپ میں اس قسم کی خود نمائی سے نظر خوب آشنا ہوئی۔ وہ خودنمائی بے عیب اور بے لوث نہ تھی، تاہم اس میں یہ شعریت کو یکسر فنا کر دینے والا خروش بھی نہ تھا۔

اسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گو کہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دنیا سے دور پاتا تھا، تاہم دن میں ہر دفعہ جب رانی صاحبہ پر نظر پڑتی تھی، تو تخیل کا ایک عجیب ہیولیٰ پیش نظر ہوتا تھا۔ ایک طرف یورپین تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا

تھا دھنستی ہوئی ! - ناظرین میری اس اصطلاح سے درگذر فرمائیں - نسوانیت سے اکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں تاہم اس سے دور تھیں - بے پردہ تھیں مگر پردہ میں تھیں بے نقاب تھیں مگر نقاب میں تھیں - حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے تو اب بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے - از راہ تعصب نہیں کہتا، یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں - مگر یہ جوہر تہذیب و تمدن ان بازاروں میں بہت کمیاب ہے - جب اس ہنگامہ میں رانی کو دیکھتا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا جس کی ایک جھلک بھی یورپ کے مبصرین نفسیات نہیں دیکھتے۔ وہ محض فریب نظر کے مجنوں ہیں - ایک شب عرشہ پر ناچ ہو رہا تھا - رانی صاحبہ بھی ایک گوشہ میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں - میں ایک طرف کھڑا سوچتا تھا کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہو رہے ہیں، انسان کے محسوسات عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں ؟ یورپ کی عورت شب کے لباس میں جو اس کے لیے زیب و زینت کا منتہا ہے - گردن سینے کے انتہائی حدود تک کھلی ہوئی، بازوؤں بغلوں سے اوپر تک برہنہ، مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس کرنے کی بجائے درحقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے اور ایک دنیا ہے کہ اس سحر کاری پر مٹی ہوئی - برخلاف اس کے ہندوستان کی عورت تعلیم و تمدن و معاشرت میں چاہے اپنی یورپین بہن سے دو قدم آگے بڑھ جائے وہ اپنے لباس میں آداب حجاب و حیا کی پوری پابندی نہ کرتی ہو لیکن آنکھوں میں غرور نسوانیت - وہ تمکین حیا پھر بھی محفوظ رکھتی ہے جس کا وجود یورپ میں عام طور پر نظر نہیں آتا - تعصب نسل و مذہب سے قطع نظر میں نے تو یورپین اور ایشیا کی عورت کی تصویروں کو جب دیکھا، قلب نے گواہی دی کہ آنکھ اگر روح کا آئینہ ہے تو اس ذریعہ سے کالی عورت کی اعلیٰ روحانیت صاف نظر آسکتی ہے - ایک موٹی میم صاحبہ کو (غالباً فرانسیسی تھیں) ہر روز دیکھتا تھا کہ وہ دن میں دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں - ہر شام کو ان کے لباس میں جدت طرازیوں کا گوناگوں اضافہ ہوتا رہتا تھا - بے چاری وزن میں شوکت علی صاحب سے کم نہ ہوں گی - جسم نازک پر لباس فاخرہ کا ٹانکا اپنے میں تاب مقاومت نہ پاکر اور اس کشمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اس کے اندر پیدا ہوتی تھی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتا تھا - صحت جسمانی ماشاء اللہ ایسی تھی کہ ہم سے دائم المریض رشک کریں - اس دبیز جسم نے نسوانیت کی لطافت و نزاکت کو بالکل دبا لیا تھا، تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے پہن کر نکلتی تھیں تو از راہ غایت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں - قدم اٹھاتی تھیں تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی کہ کسی نے دیکھا یا نہیں - موٹی کمر لچک نہ سکتی تھی مگر پھر بھی لچکائی جاتی تھی - پنجوں پر چلنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ بھی ایک ادا ہے - لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا

یہ تو حال تھا لیکن نظر نصیبوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے .... یہ کیا ہے ؛ نسوانیت کا کیسا ادنیٰ تخیل ہے ؛ غرور نسوانیت کی کیسی بھدی تصویر ہے ؛ وہ غرور نسوانیت جس کا سارا سرمایہ جسم کی سفید کھال، خوشبودار پوڈر، اور باریک ریشم ہو، یقین جانیے کہ اس نسوانیت کی روح گم ہو گئی ہے - یہ کاغذ کی جاپانی قندیلیں ہیں جن کے اندر موم کی بتی گل ہو چکی ہے اور خالی قندیلیں ہوا میں جھول رہی ہیں لیکن کم نظر روشنی کے طالب نہیں، بلکہ قندیل کا کاغذ خوبصورت چاہتے ہیں۔

فریب حسن اور خود بینی کے ان نمونوں کا ذرا کالی رانی سے مقابلہ کیجیے جو دولت میں شاید تمام یورپین بہنوں سے زیادہ ہو گی - ثروت جاہ دنیا کے لحاظ سے اس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا - تعلیم و تہذیب و تمدن و معاشرت میں وہ لندن و پیرس کے بہترین نمونوں کے دوش بدوش تھی - تاہم چشم حقیقت بیں گواہی دیتی ہے کہ وہ سب سے مختلف، الگ، دور اور بلند تھی - دن کا اکثر حصہ عرشہ پر گذرتا تھا - بارہا ان کالی ماں بیٹیوں پر نظر جاتی تھی اور قلب پکار اٹھتا تھا کہ اگر قوموں کی کامیاب زندگی کے لیے عورتوں کی فطرت عالی اور خصائص حسنہ کی شرط لازمی ہے تو پھر میری قوم کا مستقبل ان کالی عورتوں کے ہاتھ میں محفوظ ہے - وہ کچھ ہی ہو جائیں، مگر ان کی فطرت آلودہ نہیں۔

چند گھنٹے ایک مولوی کیساتھ

نیاز فتحپوری

دنیا میں سانپ اور مولوی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخر الذکر کا یہ حال ہے کہ ؎

هر کرا جامهٔ مولوی بینی
در روش صد هزار مار انگار

مسجد کے مُلّا سے لے کر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس مولانا تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک چیز الا ماشاء اللہ سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ان کے ظاہر و باطن کا تضاد ہے یعنی جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اس کا باطن مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی "ہیئت وضعی" جس میں اس کا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف وگاہے تا گوش وگاہے تا بناگوش، لانبی پریشان داڑھی، زیرین و زبروت سیاہ، داغدار پیشانی، "نیم دامنی کا کرتہ"، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جزدان رومال اور "ناسمدانی" کے سب کچھ شامل ہے ایک ایسی پیٹنٹ وضع ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا منجانب اللہ اس پر ماموری ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلہ ارشاد و ہدایت دراز کر دے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

مولوی کی اوّلین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کی بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ "موجودہ مولوی" اسی "گزشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیات مولویت" سے بحث کرنا چاہے گا اس کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اس قوم کے ابتداء ظہور سے آغاز کرے۔ علمی و اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کرنے کی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔

مثلاً میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بن جاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار

اور کھانا ملتا تھا لیکن ان کی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقرعید، شبرات پر عیدیاں، بقرعیدیاں وغیرہ بپاس خاطر عزیز مسلمہ لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا۔ کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل۔ ہر لڑکے کو غضبہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے تو کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے۔ پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ رنگ کی جیب میں ڈال دی، کسی نے ہدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا اور انھوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل دیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تو مولویانی اور ملّا زادوں کے لیے بقال کی اچھی خاصی دکان بن کر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لیے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن ایک ماہر نفسیات غور کرے گا کہ ایسے معلّم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چل کر کس قسم کے "افراد قوم" بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود ہو گئی ہے لیکن اسی کی اولاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں ان کی تین بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قائد و رہنما بن گئے ہیں۔

اوّل الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی غایت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامۂ محفل ہوتی ہے جس میں یہ ایک منج کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ منجیوں کی، رہی بے ضرری سو اس کا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویرے کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علو حوصلگی معلوم! اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جس میں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب وہی فرسودہ و فذلیہ ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد وہ سوائے اذان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اوّل الذکر قسم کے مولویوں میں جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے "مشائخانہ" حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی "مشق سخن" شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں، گھڑے ہوئے کاذب افسانے مذہب و بانیٔ مذہب کے متعلق سنا کر اوّل اوّل "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا وعظ کہتا ہے اور جب وہ اپنی حیثیت بلحاظ ایک عالم ہونے کے "یکے از انبیاء بنی اسرائیل" کی طرح قائم کر لیتا ہے تو سراً و علانیۃً مرشد ہادی بن کر اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کے رجسٹر کھول دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۷۳۰ مرید اس کو حاصل ہو جائیں تاکہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی ہر ایک مرید سے وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے۔ یہ طبقہ

نہایت "خوش خوراک" "خوش پوشاک" ہوتا ہے اگر کسی ایسے قریہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اس کے "ذوقِ شکم" کو پورا کرنے والی مل سکتی ہیں تو پھر اس کے دسترخوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے :

صبح کا ناشتہ : نماز کے بعد ہی خمیری چائے سیر بھر دودھ اونٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین اُبلے ہوئے انڈے، چار کباب۔

دوپہر کا کھانا : مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بریانی، پسندے، باقر خانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر کا کھانا : سادہ چائے اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا : وہی جو دوپہر کو، مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ اشیا فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف "ال زکاۃ" پر بسر کرنا ہوگی تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ آج کل جلالی عمل کا چلہ کھینچ رکھا ہے اس لیے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دو رد ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔ عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید حسب مقدور نذرانہ اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے (جو بعد کو گھر پہنچ کر مولوی ہاشم کے روپے اور ملازادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے) لیکن یوں بھی قمیص، اچکن، تہمد اور ازاربند کے لیے طرح طرح کے سوتی اور ریشمی کپڑے "تحفتہً" آتے رہتے ہیں اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کی تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شانِ جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے، ایسا جبار ہے۔ اس نے جہنم اتنا مہیب بنایا ہے۔ وہ یوں اژدہوں سے ڈسواتا ہے، اس طرح آگ میں جلاتا ہے مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کر دیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا نہ بانی وبعد اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولانا اس کے وزیر باتدبیر، ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود ملنے ہی کرامات وخوارقِ عادات سے متعلق ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا۔ امسال بارانِ بے یوں پانی برسا دیا۔ فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا۔ جنات کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو دور کرا دیا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اوّل حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں ورنہ شام ہوتے ہی مولانا کا جائے قیام مردوں کے لیے "ممنوع الدخول" ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لیے وقف سمجھا جاتا ہے۔ پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ڈرتی ہوئی سہمی ہوئی آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مثنوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پرگوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو تعلیم و تلقین خصوصی کے لیے طلب فرماتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں "قاب قوسین او ادنیٰ" سے کم نہیں اس لیے یہاں کے راز اوّل تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً "کل یوم ھو فی شان" اور "اللہ جمیل و یحب الجمال" کا وعظ شروع ہو جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قائم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی فائدہ وہ بہتر طور پر حاصل کیا جائے۔ جہاں تک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے ان کا طریقہ بالکل مولوی سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب و فساد کا تعلق ہے اس طبقہ کا وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید میں تھی کہہ کر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا کھدر پوش ہوتا ہے، ولایتی چیزوں کا مخالف اور ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا عدو، ترقی کا حامی، تنزل کا دشمن اور یتیموں کا والی، غریبوں کا ملجا "سبھی کچھ" اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس رہتا ہے کہ شاید ہی کوئی عجوبہ ذہن کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام خیالات حریت اس کی تمام متعلقہ بیانیاں اس کی تمام سوراج پرستیاں صرف حب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اس کا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے اونچے درجوں میں سفر کرے۔ وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہنچانے جائے، جہاں پہنچے وہاں رسم مشایعت کے لیے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں اس کی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لے جائیں۔ جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کی طرف سے نکلے تو ایک عزور اور انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے اور جائے قیام پر ہر وقت زائرین کی آمد و رفت کا سلسلہ لگا رہے۔

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا "مہتمم خانہ" اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو نظم دنیا درہم و برہم ہو جائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولانا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آئندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہنچتا ہے تاکہ جس وقت وہ پہنچے تو سارا مجمع جو اس کا منتظر ہے گردنیں اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھنے لگے۔ وہ چوکٹھیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسند قلی اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامن دراز کرتا ہے۔ وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے گویا وہ اس ساری جماعت کا ناظم ہے، اس مشین کا گورنر اسپرنگ ہے جس پر پرزوں کی باضابطہ گردش قائم ہے۔ مولانا مولانا کی آوازوں سے اس کا سیروں خون بڑھتا ہے۔ دست بوسی سے اس کے جذبات فیاوت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جا کر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے، یہ حال ہے اس کی پبلک زندگی کا، لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہے؟ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے اس کا حال اس کی غریب بیوی سے پوچھیے جو ایک کنیز سے بد تر حیثیت رکھتی ہے۔ بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجیے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا کس طرح کا باپ، کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔ اس کا مذہب یکسر خود پرستی، اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور اور اس کی ذات از سرتا پا یادگار ہے ان فراعنہ کی جن کا حال تو کتابوں میں ہم کو نظر آ جاتا ہے لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس قدر تمہید کے بعد مجھ کو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیے جو عنوان سے ظاہر ہے میرے تجربات مولویوں کے متعلق

اس قدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ادبی حیثیت سے کم پُرلطف نہیں ہے۔

۲۵ / جولائی کو میں ہندوستانی اکاڈیمی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہنچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا۔ وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچکیلی نزاکت، یہ سب باتیں اس کی خوش سلیقگی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور صبر کر لیتا ہوں۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور بہت قریب ہو کر بیٹھ جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لیے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں بستر احرام بدستے و سبوئے بدست اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لے کر بلا پس و پیش اپنا محاذ انھوں نے اسی جگہ قائم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے۔ لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے اور انھوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کر کے اور مہر توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی تاب اور داڑھی کا خضاب جوہر چند طاؤسی ہو گیا تھا بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا غالباً عملِ جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اس کا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اس قدر اپنے سے قریب دیکھ کر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا اندازہ اس طرح قائم کیا کہ چہرہ اسی طرف رہے اور اس کے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب وہ اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے اپنے آپ پر گلچینی جمال کو حلال کریں لیکن بدقسمتی سے ایک صاحب جو ان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انھوں نے جو مولانا سے گفتگو

شروع کی تو پھر اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ ہر چند مولانا کی جبین پیشانی کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لے کر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور ان کی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہنچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی بینائی اور وضاحت کے لحاظ سے ابوالہول کی حد معلوم ہوتے تھے اس غریب مولانا کے آثار کو نہ سمجھ سکے اور برابر ان کی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ عزیز کو انھوں نے بیکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت نہ بدلنا تھا۔ وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں اس "سرمایۂ جان" کو بھی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ وہ کوشش کر کے اپنے ہاتھ کی معیوب ٹیڑھی انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ لے۔ وہ آواز میں ایک خاص قسم کا لوچ پیدا کر کے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں جھنکار پیدا کرنے کی سعی کرتے تھے وہ اپنی خوش دلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کے لیے کبھی کبھی لطائف بھی کہتے، فارسی کے اشعار بھی پڑھتے، بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری کوئی چیز نہیں اور یہی میرا مسلک تو یہ ہے کہ "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام" رام رام کہہ کر جس وقت مولانا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انھیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے کو دیکھ رہا تھا اور آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاعبانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انھی لوگوں میں سے ہیں جو ؎

این کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ مولانا کی خوش طبعی اب کافی طور پر بڑھ گئی ہے اور انھیں وثوق کامل ہو گیا ہے کہ سارے درجہ میں صرف انھی کی ذات ایسی ہے جس پر وہ خاتون مائل ہو سکتی (یا ہو گئی) ہے تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر بہ ادب عرض کیا کہ "اگر جناب اجازت دیں تو چند مسائل حضور سے دریافت کروں جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں۔"

وہ یہ سن کر دفعتہً چونک پڑے اور بولے "ہاں ہاں کہیے، ہم لوگ اسی لیے ہیں۔" اور یہ کہہ کر خاص پندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔

میں نے عرض کیا کہ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب صرف عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپ کی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت ہوتی ہے کہ کیا "عنادِ خانۂ ہمسایہ" اور "حسنِ گذرندہ" سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے؟"

یہ سن کر ان کے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی سرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدل کر بولے کہ "آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟"

میں نے کہا کہ "بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں؟ میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت

میں بازو پریس رہوں"

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی"

میں نے کہا "بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہے، سامنے ہی موجود ہے صراحت کی ضرورت نہیں، لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں اور آپ کو اس کا جواب عالم دین ہونے کی حیثیت سے دینا چاہیے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہو گیا اور وہ آستین چڑھا کر بولے کہ "تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو، یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں"

میں نے عرض کیا کہ "میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں"

اس تنقید کی تاب وہ کیا لا سکتے تھے، بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ "جانے دیجیے آپ بزرگ ہیں، اپنی طرف خیال کیجیے" اور چنیں و چناں، میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "مولانا اگر غصہ فرو ہو گیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو"

یہ سن کر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ "خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے، میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا"

میں نے کہا کہ "یہ بات شرعی مسئلہ ہے اور آپ کو بتانا پڑے گا"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انھوں نے کہا کہ "مولانا کیا حرج ہے، آپ کیوں نہیں بتا دیتے؟"

مولانا بولے کہ "آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بے وقوف بناتے ہیں ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرح......"

میں نے کہا "نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تک تو صرف گمان ہی تھا لیکن آج یقین ہو گیا کہ عنایت خانۂ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز لیکن 'حسنِ رہگذر' سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے"

مولانا بولے "یہ کیونکر آپ کو یقین ہو گیا؟"

یہ سن کر میں ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لے کر منہ بناتے ہوئے بیت الخلاء چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے اس لیے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی سرخ بیندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولانا نے فرمایا: "بیشک بیندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہیے۔"
میں نے عرض کیا: "لیکن مولانا! یہ تو آپ نے بھی دیکھا کہ ہے بڑی پیاری چیز اور خاص کر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے۔"
مولانا نے کہا: "حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش۔"
اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا۔ مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا۔ لیکن پیچھے پلیٹ فارم پر جا کر میں نے ان سے کہا کہ "مولانا خدا کے لیے صرف ایک بات کان میں سن لیجیے۔" مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کہنا مان لیا اور جب انھوں نے کھڑکی کے پاس آ کر اپنے کان قریب کیے تو میں نے عرض کیا کہ "مولانا اس میں شک نہیں کہ چیز اعلیٰ ہے کیا رائے ہے؟"
یہ سن کر انھوں نے میری گوشمالی کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔
اکاڈمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور اس دس منٹ کے راستے میں جس چیز نے میرے دماغ کو گھیرا تھا وہ مولانا کا واقعہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا ؎

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سجاد حیدر یلدرم

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا اور جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت تھا، مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہیے یہ تھی:

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں، اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو۔ میں غریب الوطن ہوں"۔

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اس کے قصے کا اثر ہوا ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے۔ وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں۔ وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ میں رات دن اسی فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا۔ کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں بظاہر اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں۔ اس کا کوئی دوست نہیں"۔ اگر یہ سچ ہے تو اسے مبارکباد دینی چاہیے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے

تو کوئی بدنصیب شخص! نہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر تحریر نہیں کر سکتا کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے کہ تنہائی میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں۔ یا جو ایسا مجھے کل دیتی ہے اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیروں دھاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا۔

" بھائی جان دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو" کیا اُس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصہ پر قصہ اور لطیفہ پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ! کیا اس بات پر بھی شکریہ ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کونسی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں۔ مگر کلی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہیں ثابت کر سکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کتنا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے ایک دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بطریق دوست کہتا ہوں یہ نہایت معقول آدمی ہیں، اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے۔ چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال سے کم نہیں ہے جب وہ آتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں۔ کوئی آ رہا ہے۔ قیامت نہیں ہے۔ اُن کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں تو وہ فوراً بکنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) "خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے! توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا:"

یہ کہتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا۔ (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

" آہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا مت بند کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی

تھی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو یہ کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہتے تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم انہیں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور سنیے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں۔ رات دن انہی کی فکر میں رہتے ہیں جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ محمد تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں۔ "ہاں بڑا خراب موسم ہے میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔" اگر بالعکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں "بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔" اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں، تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی؟" کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعارف: اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں شاکر صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امراء کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کے "شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے۔ جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن وہ کے چلے آنا دیکھو، میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایڈیٹر "معارف" سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی بائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ "جی ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سبزی کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر

مچھلی کا شکار کھیلیں گے، پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اُس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا خوش ہوا جب اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کاغذ کا پیڈ پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد۔ بجائے کاغذ کے ایک مخمل جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضروریات کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی گاڑ منڈ بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی، میرے پراں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ چند مرغان خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لیے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن۔ تن تن تننننانا۔ چھن۔ تاتن۔ تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ یار! یہ کیا ہے؟ اوہو! اب میں سمجھا۔ میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

"اُس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ آہا! مجھ کو صبا سے ہے امید، مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

واہ وا! سبحان اللہ! کیا غزل چھیڑی ہے! "اے ترک سوار نواح عرب یثرب نگری پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے وہ حبیب مرا مجھے واکی کھبریا لا دینا۔" بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہو گئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات! تم ہی میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آؤ۔" یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا: "ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل ..."

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟ ...... ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتا بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ

اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض؟

مگر پھر تو صبا کے نام نے دماغ ہی خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہت زلف بھی لاتی، تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال مجھے وہ فقرہ از سر نو

درست کرنا چاہئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی اُن بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پُر کرنے

کے لئے کافی ہیں، اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے"۔ یہ کیا؟

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے"؟ یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔

"آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے"؟ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے آیا ہے۔

میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیے۔ "اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوتی ہے اور بظاہر....."

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے"؟

"میں ہوں، شبن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو، تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آتے ہوئے

ہیں اور سرکار نہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں"۔

با دل نخواستہ میں اُٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف

کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ شبن صاحب

نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا

گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا، جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا۔

ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو

گئی۔ بہزار وقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے

چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:

"ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح

نئی معلومات اور نئی دنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں.....

دروازے پر پھر دستک۔ "کیا ہے"؟ "اچھا"!

دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں

اور کوششوں سے موجودہ....."

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے"۔

"اوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں"۔

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسا کر کے خطرات سے بچا نے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لا ینحل مسئلہ ......"

دستک۔ "کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں، اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا"۔

اچھا بھئی۔ لو ابھی آیا"۔

یہ کہہ کر میں کھانے کے لیے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں "چہرے پر تھکن محسوس ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟"

سوائے اس کے کہ آمنا و صدقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے مجھے رغبت نہیں، وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں: "سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کرو"۔

واپس کمرے میں آ کر تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں، اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں:

"زندگی اور موت کا لا ینحل مسئلہ"۔

اس کے متعلق کیا کہنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ "زندگی اور موت کا لا ینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا۔ اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں، تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے"۔ میں سچی بات کہوں گا کہ کچھ بھی نہیں لکھا"۔ تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ تو ایک صفحہ سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آ کر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ

دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ بس اُن احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں، میں اُن کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے ملتے ہی کہتے ہیں "میاں عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں"۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست آتے ہیں۔ وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں جب میں جواب دیتا ہوں، تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے، یا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں۔ وہ جب آتے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ع

"مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔ دروازے پر ایک گاڑی آ کے رُکی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرتا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لئے اس کے شکریے میں میں اس مضمون کو اسی نامکمل حالت میں چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں جب آتے ہیں۔ مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آئیے آئیے۔ مزاج عالی۔ بہت دن بعد تشریف لائے۔"

کم اِن مائی ڈیر سنہ ۱۶

خواجہ حسن نظامی

(۱)

ویل کم! آہا ہو۔ مائی ڈیر سنہ ۱۶ء اندر آئیے۔ ایک چکنیے، کم منہ اس کی چاء پیجیے، انگیٹھی گرم ہے ہاتھ سینکیے۔ ناک کو تو سردی نہیں لگتی؟ خنکی معلوم ہو تو اس کو بھی گرما لیجیے۔ مگر ہاں، آپ کی ناک۔ ہے بھی یا نہیں؟ سنہ ۱۵ء کے تو نہ تھی۔ اہل جرمنی نے وعدہ خلافیاں، عہد شکنیاں کر کر کے بیچارے کی ناک کاٹ لی تھی۔

بھائی، میرے گھر میں بریک فاسٹ کا تو کچھ انتظام نہیں ہے۔ تیرہ تیزی کی گھونگنیاں کھا کھا کر دن کاٹتا ہوں، تمہارے لیے ایک خانساماں سے کیک کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈی پھیکی چاء کی پیالی مانگ لایا تھا۔ یہ کندبے لو، نہیں وارد۔ صبر کرکے اسی کو نوش کر لو۔ زیادہ حرص ہو تو میدان جنگ میں جاؤ، وہاں سب کچھ ملے گا۔

ذرا سننا۔ خدا نے کہا تھا میں خود زمانہ اور وقت ہوں، کیا تم بھی خدا ہو؟ کیونکہ تم بھی ٹائم یعنی وقت ہو، مگر خدا بدلا نہیں کرتا، اور تم بارہ مہینے میں بدل جاتے ہو، لہذا معلوم ہوا کہ تم خدا نہیں ہو، پس جب تم خدا نہیں ہو، تو لاؤ، میرا کیک پھیر دو اور چاء کی پیالی بھی واپس دو۔

ہاں یاد آیا، میں تو مشرقی ہوں اور مشرق والے دے کر واپس نہیں لیا کرتے، اچھا خیر، کھا لو، نگل لو، نغوذ و، تمہیں کس نے بلایا تھا؟ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ آؤ بھگت کرنا تو اپنے محرم کی کرتا جو لاڈلا ہے، ہجری سنہ کا پہلا پیغام لے کر آتا ہے۔ تم سے مجھے کیا غرض، تم کو پادری صاحب کے ہاں جانا چاہیے تھا۔

لاحول ولا قوۃ۔ معاف کیجیے گا جناب، بھوک و مفلسی میں انسان کی عقل قابو میں نہیں رہتی۔ آپ ہمارے بادشاہ کی نشانی ہیں۔ ہر دفتر میں آپ ہی کا سکہ چلتا ہے۔ ہماری قوم تو آپ سے اس قدر محبت رکھتی ہے کہ ہر شخص دیوار پر آنکھوں کے سامنے آپ ہی کو لٹکاتا ہے۔

جنوری کی قسم میں تمہارا تابعدار ہوں، وفا شعار خادم ہوں، تمہارا کیا کہنا۔ بڑے اچھے ہو، کیسے گرم گرم کوٹ لاتے ہو۔ تمہارے آنے کی خبر سن کر ایک مہینہ پہلے خیرات بانٹنے والے مجھ کو لحاف بنوا دیتے ہیں، اور لحاف کے اندر مجھ کو ایسا آرام ملتا ہے جیسا بچھوہ کو اپنے خول میں۔

میری عادت خوشامد کرنے کی نہیں ہے، پر آج تو میں تمہاری خوشامد کروں گا اور کہو تو تمہارے بوٹ بھی صاف کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ لیکن یہ وعدہ کر لو کہ تم ۱۵ سنہ اور ۱۴ سنہ کی خونریزی کو بند کرادو گے۔

میاں مجھے اس لڑائی سے تو کچھ تکلیف نہیں، دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے مجھے اس سے کیا غرض؟ البتہ یہ بے آرامی ہے کہ سوئیاں اور رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے، جانتے ہو کہ میں دمڑی دھیلے کا آدمی ہوں، سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا۔ اب یہ دونوں اس قدر گراں ہیں کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ، یونہی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔

اگر تم لڑائی بند نہ کراؤ تو یہ دونوں چیزیں تو سستی کرا دو۔ بس میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہ خطاب چاہیے نہ کونسل کی ممبری، میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر اور کنویں کا پانی اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا چاہتا ہوں۔ کنویں کا پانی اس واسطے کہ نل کا پانی لوہے کے منہ سے آتا ہے۔ اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمی کا خون بہاتا ہے، اور میں خون خرابے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ لوہے کا پانی کہیں مجھ میں بھی فتنہ و فساد کا اثر نہ آجائے۔

---

(۲)

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا: خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ، جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکا دوں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحاتِ مکہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟" اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ، بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے، بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اُٹھانے والے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی، خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یونیورسٹیاں ہیں، سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سُن کر مجھ کو غصّہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھُدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہوگئے، بگڑ گئے، لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بے چارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبے کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعہ تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے۔ نماز پڑھ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا گیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوں گے؟

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ بوریے کے نیچے آب خورہ کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا یہ غافلوں کے لئے صور ہے، اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مرگیا، جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا ولیم میدانِ جنگ میں ہے، ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا۔

ہاں تو، "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا و یسٹ منسٹر ایبے یا ...... کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں، کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہکر مرحوم سے رخصت ہو ے

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے　　　قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اُٹھانے کا اور بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا، مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

گھریلو مشاعرہ

تاجور نجیب آبادی

اجی سن رہے ہو۔

نہوں۔ کیا تم نے کچھ کہا تھا؟

نہیں اب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

تو کہنے سے پہلے ہی ہم کیوں کر سن لیتے اور کیا سن لیتے؟

اچھا اب سن لو!

سناؤ، کیا سنانا چاہتی ہو۔

دیکھنا آپ نے سنا ہے لاہور میں ہزاروں سینما ہیں۔ وہی نا جنھیں ہمارے یہاں بائیسکوپ کہتے ہیں۔ ہیں نا؟

ہزاروں تو پورے صوبے میں بھی نہ ہوں گے۔

ہزاروں نہ سہی سیکڑوں میں تو کلام ہی نہیں۔

ہمیں تو اس میں بھی کلام ہے۔

پھر وہی کٹ حجتی۔ میں نے کوئی پٹ ہوؤں کی مردم شماری کی ہے؟

سینماؤں کی مردم شماری کی بھی ایک ہی کہی۔ آدمیوں کی مردم شماری ہوتی آئی تھی۔ سینماؤں کی مردم شماری تمھیں سے سنی ہے۔

تو رہے تم سے کوئی بات کرے۔

کھانے کی بات تو ہم سے ہر وقت کی جا سکتی ہے۔

تو میں خدانہ کرے بے ٹھکانے بات کیا کرتی ہوں۔ کوئی میرے دشمن پاگل تو نہیں۔

نہیں تم تو نہیں۔ اکثر بیویاں بے سر پیر کی بات کیا کرتی ہیں۔

اور شوہر؟

شوہر کمبختوں کو بات کرنے کی مہلت ہی کب دی جاتی ہے۔

انھیں بات کرنے کی مہلت ہی کون نہیں دیتا؟

وہی جس کی باتوں کا آغاز و انجام ازل و ابد سے وابستہ رہتا ہے۔

یعنی بیوی۔

چور کی داڑھی میں تنکا۔

یہ محاورہ اسی دن کے لئے یاد کیا تھا؟

نہیں بلکہ اس کا استعمال ایسے ہی موقعے پر کیا جاتا ہے۔

تو ہم چور ٹھہرے اور تم ساہ؟

تم چور نہ ہم ساہ۔ محاورات تو دراصل استعارات ہوتے ہیں۔

کل کو کوئی گالی دے کر کہہ دینا کہ گالی تو استعارہ ہوا کرتی ہے۔

تعلیم یافتہ لوگ استعاروں ہی میں گالیاں دیا کرتے ہیں۔

کسی دن میرے سر پر لٹھ رسید کر کے اسے بھی استعارہ بنا دینا

لٹھ بازی بھی ایک قسم کا استعارہ ہی ہے مگر ذرا جلی قسم کا استعارہ ہے۔

تو ان جلی اور خفی استعاروں کی مشق کے لئے میں ہی رہ گئی ہوں؟

اپنی سہیلیوں پر ان استعاروں کی مشق تم بھی کر سکتی ہو

بیچاری سہیلیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں تختۂ مشق بناؤں۔ میں تو یہ استعارے تم پر مشق کرنا چاہتی ہوں۔

شوق سے مگر پہلے ان استعاروں کو ہم سے سیکھ لو۔ ہمارا انداز تعلیم تم جانتی ہو "ڈائرکٹ میتھڈ" کے اصول پر ہوتا ہے۔

لٹھ بازی کے جلی استعارے کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی تم اگر اس قابل رہیں کہ ہم پر اس کا تجربہ کر سکو تو ضرور کر لینا۔

تم نے اس نگوڑے استعارے کی عملی تعلیم کس سے لی تھی؟

اپنے مرحوم استادوں سے۔

پھر تمہارا سر کیونکر سلامت رہ گیا؟

ہمارے سر کے گنگا جمنی بالوں میں جو یہ ٹیڑھی ترچھی شاہراہیں نظر آتی ہیں اسی تعلیم کی یادگاریں ہیں۔

تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ یہ شاہراہیں میرے سر میں بھی قائم کی جائیں۔

سر کی یہ شاہراہیں باغ جنت پر ختم ہوتی ہیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ استاد کی مار بدن کے جس حصے پر پڑ جاتی ہے اس پر آتش دوزخ حرام ہو جاتی ہے۔

بس معاف رکھو۔ مجھے اس رستے سے جنت پہنچنا منظور نہیں۔ تمھیں کو اس شاہراہ سے وہاں پہنچنا مبارک رہے۔

یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔ ہم اس شاہراہ سے جنت ضرور پہنچیں گے مگر تم جنت کے راستے سے کترا کر جہنم رسید ہو گئیں تو تمھارے بغیر جنت سونی جو نظر آئے گی۔

سونی نظر آئے یا آباد۔ میں تمھارے ساتھ جنت جانا بھی نہیں چاہتی۔

اور کہاں جانا چاہتی ہو۔

جہاں خدا لے جائے۔

خدا کرے کیا غرض پھیرے تمہارے درمیان حائل ہو؟

شاعری کا بحران کیوں ہونے لگا، مت پڑھا کرو بات بے بات شعر۔ مجھے یہ کلموہی شاعری چڑھ ہو گئی ہے۔ قرآن میں جبھی تو شعرا کو گمراہ بتایا گیا ہے۔ مولانا حالی ان مٹے شاعروں سے تنگ آ کے یہی فرماتے ہیں کہ ؎

گنہ گار تو بخشے جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

شاعری کا بحران متعدی ہوتا ہے۔ دیکھو تم بھی اس میں مبتلا نظر آتی ہو۔

مجھ سے ستر پہرے دور۔ تم ہی شاعر بنو۔ تمھیں کو یہ بیماری مبارک ہو۔

آخر تم ایک شاعر کی بیوی تو ہو۔ کہہ دو نہیں ہوں۔

ہاں ہاں میں کسی شاعر واعر کی بیوی نہیں۔ شاعر بھی کوئی آدمی ہوتا ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم شاعر ہیں اور نکاح کے رجسٹر میں لکھا ہے کہ تم ہماری بیوی ہو اور شاعر تمہارے خیال میں آدمی نہیں ہوا کرتا تو نتیجہ یہ نکلا کہ تم کسی آدمی کی بیوی نہیں ہو۔

میں کسی کی بھی بیوی نہیں۔ مت کہا کرو مجھے بیوی۔

تمھارا خدا بھلا کرے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ نان نفقہ، مہر وہر یہ سب آئے گئے ہوئے۔ اب ہم ہیں اور ہماری تنخواہ۔ اپنی بھوک کھانا اور اپنی نیند سونا۔ یہی تو ہم چاہتے تھے۔

جی ـــ کیوں نہیں چاہتے تھے۔ بس ایک تم۔ ایک تمھارا پاپا۔ باقی چھوٹا کل سنسار۔ میں اور میری تنخواہ۔ کیا کہنے تمہارے اور تمھاری تنخواہ کے۔ تنخواہ تمھاری کہاں سے آئی۔ میاں ۲۵ روپلی پاتے تھے۔ میرا آنا ایسا بخت آور رہا کہ اب ڈیڑھ سو مل رہے ہیں۔ بس اپنے پچیس نکال کے باقی سوا سو سیدھی طرح میرے میکے بھیج دیا کرو۔ رہا میرا سوا لاکھ روپے کا مہر اس کی جلد فکر کرو۔ رہے تمھارے بچے انھیں سنبھالو۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ ہاوڑا ایکسپریس کل صبح مجھے میرے گھر پہنچا دے گی۔ پھر بیٹھے شاعری بھگارتے رہنا۔

بچے ہم سنبھالیں؟ یہ کیوں؟ تمھیں ان سے کچھ واسطہ نہیں؟

کیا خدانخواستہ میں انھیں جہیز میں لے کر آئی تھی؟

تو کیا ہم شادی کے جوڑے کے ساتھ لے کے گئے تھے؟

مجھے نہیں معلوم لے کے گئے تھے یا نہیں۔ مجھ سے مت بولو۔ جبھی تو نانی اماں کہا کرتی ہیں کہ یہ مردوے نگوڑے

ہم تو دنیا بہشت نظر آتی انھیں منیوں نے اسے جہنم بنا دیا۔

اللہ بخشے ہمارے دادا میاں بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت آدمی کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لئے اس کا دماغ ٹیڑھا۔ مزاج ٹیڑھا۔ فطرت ٹیڑھی یہ خود ٹیڑھی ہے۔ اس کا ٹیڑھا پن کسی صورت نہیں جا سکتا۔ یہ جب سے دنیا میں آئی ہے جینے والوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ بس اس کے ٹیڑھے پن کا ایک ہی علاج ہے۔

کیا ہے وہ علاج؟ میں بھی تو سنوں! دیکھوں تو وہ تمھارے بہشتی بزرگ عورت کے ٹیڑھے پن کا کیا علاج بنا گئے ہیں۔

یہ پھر بتائیں گے۔ دو بج چکے ہیں۔ چوکیدار بول رہے ہیں۔ سونے بھی دو گی یا نہیں۔ اس مشاعرے کو پھر کے لئے اٹھا رکھو۔!

قرض و مقروض

سلطان حیدر جوش

ضرورت کے وقت ایک حاجت مند کو نقد یا جنس جو کچھ بوعدۂ واپسی کچھ مدت کے لئے دیا جائے قرض کہا جاتا ہے! قرض کی دو
قسمیں ہیں داد و ستد کے نقطۂ نظر سے، اور کاروباری اصول پر، جو کچھ دیا جائے قرض ہے لیکن امداد کے خیال سے اور محبت کے اصول پر، جو کچھ
دیا جائے مقراض ہے!

اگر آپ کسی دوست کو قرض دیتے ہیں تو دوہرا خطرہ پیدا کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ روپیہ کھو دینے کا خطرہ، اور دوست کھو دینے
کا خطرہ! ننانوے فی صدی دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" "نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے"!

اگر آپ دوست پر تقاضہ نہ کریں جب وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے شرمائے گا! اور اگر کریں تو گویا ہمیشہ کے لئے اُسے
کھو دیا۔ تقاضے کا نام آتے ہی وہ چراغ پا ہو جائے گا! ایک دوست کی امداد آپ شوق سے کریں مگر اسی قدر رقم کے ساتھ اُسے ممنون
بنائیں جس کے ضائع ہو جانے کا آپ کو بھی احساس نہ ہو: آپ دوست کی مدد کر سکتے ہیں مگر للّٰلہ قرض نہ دیجئے! آپ کی زبان پر اس
رقم کا نام آیا کہ اس کو صدمہ ہوا۔ قرض لینے والے اکثر رقیق القلب ہوا کرتے ہیں۔ آپ گویا اسے قرض دے کر اسے کشمکش میں مبتلا کر
دیتے ہیں، اُسے اپنی نگاہ میں ذلیل کر دیتے ہیں! اور وہ فطرتاً اس کو محسوس کرتا ہے! اگر آپ تقاضائے شدید کو کام میں لائیں گے تو
یقین رکھیے کہ آپ اس کی ہتک عزت کریں گے!!

ایک دوست قرض لے کر آپ کا ممنون منت ہو سکتا ہے مگر محض اس شرط پر کہ آپ اس کی واپسی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں!
اگر آپ وہ رقم کسی طرح واپس پا لیتے ہیں تو اس کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ آپ نے کوئی احسان کیا تھا وہ اس کو احسان سمجھنے سے قاصر ہوتا
ہے! جو کوئی دوست کو قرض دے کر ادائی کی امید رکھتا ہے ایک ایسی حماقت کرتا ہے جس کو کوئی منطق فعل مناسب ثابت نہیں کر سکتی!

واقعہ یہ ہے کہ ایک قرضدار دوست اگر کبھی شاذ و نادر، دوست کی رقم جو اس نے عین احتیاج میں قرض دی تھی واپس کرتا
ہے تو اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ قرض دینے والا دوست اس ادائیگی پر خاص طور سے اس کا ممنون ہو! فی الحقیقت دوست کو قرض
دینا قرض نہیں ہے "مقراض" ہے!

قرض صرف وہی ہے جو بازاری اصول پر دیا جائے! داد و ستد کی تجارت اسی وقت بار آور ہوتی ہے جب قرض ۵ سے
۱۰ فی صدی سود تک شرح پر دیا جائے اور ضمانت میں رقم قرض سے پندرہ گنی مالیت آڑ میں رکھ لی جائے! اس اصول پر

کابل میں بسنے والے زندہ رہتے ہیں تو ہر قسم کی عزت اور خطابات پاتے ہیں اور مرتے ہیں تو اپنے بچوں کے منہ میں سونے کا چمچہ دے جاتے ہیں! اس اصول کے خلاف عامل ہونے والے زندگی بھر فاقے کرتے ہیں اور مرتے وقت اُن کے گور و کفن کے لیے چندے کی ضرورت ہوتی ہے!

عام طور پر قرض لینے والے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو قرض لے کر ادا کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے، اور ایک وہ جو کیسے ہی اچھے ارادے رکھتے ہوں ادا نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ ایک ادا نہیں کرتے اور ایک ادا نہیں کر سکتے۔ غضب یہ ہے کہ تمام قرض لینے والے رقیق القلب اور زود رنج ہوتے ہیں کسی کے دل دکھنے سے قہر الٰہی کا احتمال علیحدہ رہا!

تیسری قسم قرض لینے والوں کی ایک اور بھی بتائی جاتی ہے۔ یہ حضرات قرض لینے کو ایک نہایت معزز و آرام دہ پیشہ سمجھتے ہیں معزز تو اس وجہ سے کہ بڑے بڑے مہاجن قرض دینے کے وقت "نواب صاحب" سے خطاب کرتے ہیں اور آرام دہ اس وجہ سے کہ بفضلہ نہ کسی کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کسی خدمت کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے: دلال اگر زندہ ہیں تو ہر طرح کا آرام گھر بیٹھے نصیب ہے! کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ روز رات کو خدا دے کھانے کو بلا جائے کمانے کو" درود کے طور پر پڑھا کرتے ہیں!

قرض لینے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب انسان اپنی حاجتوں کو اپنے مال یا اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا نہیں کر سکتا! ظاہر ہے کہ کسی کا حاجتمند ہونا قدرت کی وجہ سے ہے! جس کو خدا حاجت مند بنانا یا رکھنا چاہتا ہے اس کی امداد کرنا یعنی اس کو حاجت مند نہ رہنے دینے کی کوشش کرنا ایک فعل عبث ہے اور ایک حد تک مشیت ایزدی سے لڑنا ہے! گویا حاجت مند کو ہمدردی کے نقطۂ نگاہ سے یا امداد کے طور پر قرض دینا سوشیل گناہ ہے تو مذہبی گناہ بھی ہے! البتہ کاروباری اصول پر الم نامعت ہو جانے والے سود کے ساتھ قرض دینا منشائے قدرت کے موافق ہے کیونکہ اس طرح جس تباہی میں قدرت اُسے رکھنا چاہتی ہے وہ جلد سے جلد آ جائے گی! اب منشائے عالم اسباب کے موافق کاربند ہونا چاہتے ہیں یا خلاف؟ غالباً حماقت کو آپ حماقت ہی سمجھتے ہوں گے۔

ایک مہاجن کے قرض دینے کا رنگ مجھے عرصہ ہوا کہ نہایت پسند آیا تھا، وہ روٴسا اور متمول حضرات کو ۶ فیصدی سود پر قرض دیتا تھا اور ہر مرتبہ قرض دینے کے وقت اپنے پہلے قرضے کا حساب بیباق کر لیتا تھا! مثلاً اس نے ایک نواب صاحب کو دس ہزار قرض دیئے تھے، دوبارہ انھیں نواب صاحب کو قرض دیتے وقت اپنا گذشتہ قرضہ مع سود یعنی ۱۵ ہزار روپیہ وصول کر کے پانچ ہزار نقد اور دیئے اور بیس ہزار کا تمسک اسی شرح پر لکھوا لیا! دو تین دفعہ کے تبادلے میں بیس پچیس ہزار کی رقم نہایت خوش معاملگی کے ساتھ سوچتے سوچتے ایک لاکھ بن جاتی ہے! قرض دینے کا یہ طریقہ بہترین طریقہ ہے اور تاریخ بھی ایسے قرضے کا وجود ثابت کرتی ہے، ٹرکی کو مدت دراز سے یورپ اسی اصول پر قرضہ دیتا چلا آیا ہے نتیجہ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو کسی مصری صاحب فہم سے دریافت کر لیجیے ہمیں بھی بتانے میں کوئی مجبوری نہیں بشرطیکہ سنسر صاحب مدظلہ اجازت دیدیں۔

مختصر یہ کہ قرض اگر تقاضائے فطرت کالحاظ رکھ کر دیا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کاروبار کے اصول پر دیا جائے تو اس کو قرض کہا جائیگا ورنہ اور کچھ! اور کچھ میں مقراض محبت بھی شامل ہے اور حماقت محض بھی!

اس میں شک نہیں کہ کسی دوست سے اگر نہایت تہذیب کے ساتھ سلسلۂ ارتباط قطع کرنا ہو تو بہترین ترکیب یہ ہے کہ اس کو کچھ رقم قرض دیدی جائے۔ "القرض مقراض المحبت" میں نہ اگلے زمانے والوں کو شبہ تھا اور نہ موجودہ زمانہ والوں کو ہے!

مالدار کو قرض دینا اور پھر فیصدی سود کی شرح پر ذکاوت و ذہانت ہے۔ مفلس کو قرض دینا ابلہی و حماقت ہے: اور دوست کو قرض دینا مقراض محبت ہے!!

اِجتہاد و تحقیق

سجّاد انصاری

جہلا کی گمراہیاں ایک طرف، ان کے کسی انداز پر تبصرہ کرنا ہی حماقت ہے۔ قابلِ غور تو اس طبقہ کی زندگی ہے جس نے ادعائے علم و فن کی بدمستیوں میں حسن و قبح کا بھی ہوش کھو دیا۔ دنیا کا خیال ہے کہ اربابِ علم کی بے راہ روی عبرت انگیز ہوتی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں، اربابِ بصیرت کبھی ممنونِ عبرت نہیں ہوتے۔ ان کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ جس واقعہ کو عوام عبرت آموز قرار دیں وہ اسی کو ایک بے نیاز قہقہہ میں گم کر دیا کریں۔ حاملانِ علم و فن کی گمراہیوں سے عبرت نہیں تفریح حاصل کرنا چاہیئے۔ ان کی زندگی کی ہر لغزش مضحکہ خیز ہوتی ہے لیکن اس تماشے سے صحیح معنوں میں مسرور ہونے کے لیئے مخصوص دل و دماغ چاہئیں۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا، دنیا کی تضحیک صرف وہ بلند نظر انسان کر سکتا ہے جو عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کے ساتھ دنیا کے حقائق سے بھی آشنا ہو۔ حقیقت آشنا صرف وہ نظر ہے جو ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ کائنات کے ہر واقعے کو ٹھکرا دے۔ چشمِ گریاں اور نگاہِ عبرت اندوز، دل و دماغ کی محرومیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میرا مفہوم یہ ہے کہ میں مدعیانِ تحقیق کی لغزشوں پر اس لیئے تبصرہ نہیں کر رہا ہوں کہ دوسروں کو عبرت ہو، میں ایسا تنگ نظر نہیں کہ لوگوں کو تلقینِ عبرت کروں۔ مجھے صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا ہے جنہوں نے کائناتِ عالم کو ایک حد تک مضحکہ انگیز بنا دیا ہے۔ اگر کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان اشارات پر متبسم ہو سکے، اسے چاہیئے کہ مصروفِ ماتم ہو جائے۔ دنیا پر نہیں خود اپنی بدنصیبیوں پر کہ فطرت نے اسے ذوقِ تبسم سے محروم رکھا۔ میرا مخاطب وہ کج نظر اور کم فہم نہیں جو دنیا کے ہر واقعہ پر رونا چاہتا ہے۔ اگر کسی کو ماتم کرنا ہے، اس کے لیئے ہزاروں مشاغل ہیں اور ہزاروں مرحلے۔ جوانِ صالح، زاہدِ خشک، حسنِ پارسا، فریبِ تصوف، غرضکہ اس طرح کے تماشے عبرت انگیز بھی ہیں اور لائقِ ماتم بھی۔ لیکن ایک صحیح انسان ان پر ہنستا ہے البتہ حشر و نشر کے مراحل پر ان بدتوفیقوں کو ضرور ماتم کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کو خدا کے لیئے نہیں، بلکہ محض اس لیئے غیر دلچسپ بنا دیا ہے کہ عقبیٰ میں تمام مسرتیں دنیا کی اذیتوں کی جزا میں مل جائیں گی۔ ان کی دنیا اور عقبیٰ دونوں عبرت خیز اور ماتم انگیز ہیں۔

یہ بے بسی اس کے لیے باعثِ شرم ہو جاتی ہے۔ اسے مجبوراً کسی نہ کسی طرف اپنے قوائے فکر کو متوجہ کرنا پڑتا ہے۔ اس غرض سے کہ دنیا پر اس کی جہالت اور بے چارگی کا راز افشا نہ ہو، وہ لامحالہ عالمِ نامعلوم کے رموز کو ذاتی طور پر ممنونِ تحقیق کرتا ہے۔ نتائج معلوم، ژولیدہ بیانی، کج فہمی، بے راہ روی، نادانیاں، حماقتیں، جہلِ مرکب، نہ منزل کا پتہ، نہ جادۂ منزل کا ہوش، دماغ کے سامنے کوئی راستہ

نہیں، دل میں کوئی آرزو نہیں، الفاظ کا نہ کوئی مقصد ہے نہ مفہوم ان تمام عقدہ ہائے لاینحل اور افکارِ لایعنی کا نام فلسفہ رکھا گیا ہے۔ ہیگل اور کینٹ کے لیسے مطالب پسند ہرزہ سرا پیدا ہو گئے۔ انسان جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔ اس کے سامنے وہ مراحل آ گئے جن کو اگر اربابِ قضا و قدر بھی حل کرنا چاہیں تو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسان نے اپنے ادعائے تحقیق میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ نکات پیدا کر دیے جن کو وراصل مذہب و خدا سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن فلسفہ نازاں ہے کہ معمائے کائنات حل ہو گیا۔ اور اربابِ علم و فن مستکبر کہ ان کی عقدہ کشائی نے دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ خدا نے ہزاروں پیامبر بھیجے، مگر اربابِ تحقیق نے بلا تامل ان کی تکذیب کر دی۔ انہوں نے یہ امتیاز قائم کر دیا کہ پیامبر جہلا کی تشفی کے لیے ہیں اور حاملانِ علم و اجتہاد اربابِ نظر کے لیے۔ جہل مرکب رقص کرنے لگا۔ انسان نے اربابِ حل و عقد کو شکست دے دی، اور یہی نہیں نظامِ عالم اور حیاتِ انسانی کی لطافتیں بھی ہمیشہ کے لیے برباد کر دیں۔ [illegible] دل آویزی اس کے رموز میں مضمر ہے۔ نظامِ کائنات صرف اس لیے دلفریب ہے کہ وہ ایک طلسم ہے جس کی حقیقتیں افشا نہیں کی جا سکتیں۔ انسان حقائقِ کائنات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس وقت کائنات کے رموز منکشف ہوں گے، شیرازۂ عالم بکھر جائے گا قیامت۔ اسی وقت آئے گی جب انسان پر اس کی انسانیت کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ مسلّم حقیقت ہے، تاہم مضطرب اور برخود غلط ان طلسمِ کائنات کو توڑنا چاہتا ہے، اسے اس سے بھی تشفی نہیں ہوئی کہ وہ ایک ہیولائے مقدر ہے جس کا خاکہ بہشت کی فضائے لطیف میں تیار کیا گیا تھا۔ حیاتِ انسانی کی رنگینیاں اسے مسرور نہیں کر سکتیں۔ مشرق روحانی فضا سے مانوس ہے اس کا فلسفہ اگر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسی عالمِ قدس کی طرف جس کی رنگینیوں کے پرتو سے یہ دنیا معمور ہے ایک گروہ نے اسے حسنِ مطلق کا محض ایک پرتو قرار دیا۔ دوسرے نے اس کو اور اس کے خدا دونوں کو معاً متحد کرنا چاہا، لیکن مغرب: وہ کبھی اڑنے کا عادی نہیں، اس لیے اس کا فلسفہ بھی اسفل کی طرف آتا ہے۔ ڈارون مع اپنی استخوان پرستیوں کے عرصۂ علم و فن میں نمودار ہو گیا۔ اور کائناتِ انسانی دفعتاً ہی ازلی رنگینیوں سے محروم ہو گئی۔ مجھے حیرت تو مغرب کی رکاکت، مذاق، اور کثافتِ تخیل پر ہے۔ انھیں انبساط و مسرت اس تصور سے نہ ہوئی کہ ان کے اجسامِ خاکی کی پرورش فردوس بریں کی اس فضا نے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے، اس فضا کے ایک ذرہ کی بھی وقعت نہیں رکھتی۔ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین ہوتی ہے تو اس نتیجہ سے کہ انسان حقیقتاً ہیولائے ارتقائی ہے جس کی پرورش کنارِ فردوس میں نہیں بلکہ آغوشِ میمونی میں ہوئی تھی۔ حقیقتِ انسانی اسے مضطرب کر رہی تھی حقیقتِ میمونی نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ واقعتاً نظریۂ ارتقا صحیح ہے یا غلط۔ تخیلات اور توہمات کبھی صحیح یا غلط نہیں ہوا کرتے۔ ان کے لیے صرف لطافت و کثافت کا امتیاز ممکن ہے۔ اس حیثیت سے مغربی تحقیق و اجتہاد کی حقیقت تمسخر انگیز ہے۔ ان کے لیے یہ تصور لطیف نہ تھا کہ انسان عالمِ لاہوتی کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ صرف اس حقیقت سے مسرور و مطمئن ہیں کہ اس کی حقیقتیں میمونیت میں مضمر ہیں۔

اگر کسی حکیم نے خدا اور اس کے مظاہر کو بھی ممنونِ احسان کرنا چاہا، اسی تحقیق کو خضرِ راہ قرار دیا جس کے ذریعے ہر بنیادی مسئلے پر رد و قدح کی جاتی ہے۔ ڈیکارٹ اور برکلے حقیقتِ خداوندی کی طرف متوجہ بھی ہوئے تو اسی جہلِ مرکب کے ساتھ یقین کی جگہ پر علم ظنیات قلب محال ہو گئی۔ واقعی اطمینان معیارِ حقیقت ٹھہرا۔ یہاں بھی ہرزہ سرائیوں کا وہی انداز ہے جو دوسرے حکما کے انکار و الحاد کے مباحث میں قائم ہے۔ لطف و انبساط، سکون و مسرت، یقین و اطمینان فنا ہو گئے۔

وہ مسبب الاسباب جس نے اپنی حکمت کاملہ سے مگرمچھوں کی خاطر سمندروں کو بے شمار کمزور و ناتواں مچھلیوں سے بھر دیا ہے، جس کے لازوال خزانوں میں سے ہر بلی کو کبھی نہ کبھی کبوتر اور ہر سانپ کو کہیں نہ کہیں مینڈک میسر ہو جاتا ہے، مگر جس کے ہاں میرے لئے صرف مکھیوں اور مچھروں کی پلٹنیں ہیں اور وہ بھی میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ مجھے کھانے کے لئے .... (یہ برسی دریدہ دہنی! اصل بات یہ ہے کہ جب ہر شام کو فرمانبردار ملازم اس اونچی کوٹھی کے وسیع صحن میں شب نمبوں اور مسہریوں کی قطار کھڑی کرتے ہیں اور بائیں طرف بجلی کے پنکھوں کی لین لگاتے ہیں تو میں حسرت سے کہتا ہوں کہ انشاءاللہ وہاں مچھر بھوکے مریں گے مگر میرا خون آ کر چوسیں گے۔ مگر یہ تو روز ہی ہوتا ہے مجھے جلدی سے اپنا مضمون شروع کرنا چاہئے)۔

وہ احکم الحاکمین جس نے صاحب ضلع کے اوپر لاٹ اور لاٹ کے اوپر بادشاہ اور بادشاہ کے اوپر اپنے آپ کو اور اپنے اوپر ہمارے پٹواری کو حکمران مقرر کیا ہے (لعنت بکار شیطان! پھر وہی بے تکا پن! اصل بات یہ ہے کہ اونچی کوٹھی والے مجھ سے ساتھ والی دو گز زمین قیمتاً مانگتے تھے اور قیمت بھی اچھی دیتے تھے۔ مگر میں نے انکار کیا۔ جب خرید کے متعلق وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تو انہوں نے پٹواری کے ذریعہ سے حد برآری کرا کے وہ زمین اپنے احاطے میں مفت شامل کرالی۔ نتانشی تک مقدمہ کیا۔ اجمیر شریف سے خاک لاکر اس زمین پر بچھائی، داتا گنج بخش سے پانی لاکر چھڑکا، ختم قرآن اس موقعہ پر کرایا مگر نہ فنانشل نہ ولی نہ کلام پاک غرضیکہ کوئی بھی اس پٹواری کے مکن نیکون کے آگے دم نہ مار سکا۔ مگر یہ سب کچھ تو ہو چکا، مجھے مضمون شروع کرنا چاہئے)۔

حمیدہ :- ابا! آداب، آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

میں :- کچھ نہیں!

حمیدہ :- میں دیکھوں؟

(بغیر میری اجازت کے حمیدہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور جوں جوں پڑھتی جاتی ہے ناک بھوں چڑھاتی جاتی ہے)

حمیدہ :- (ختم کر کے) ابا آپ کا خط روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں تو اس قدر آپ کہتے ہیں، خود کیوں صاف صاف نہیں لکھتے؟ اور یہ مضمون تو کچھ اچھا نہیں۔

میں :- اچھا کہ برا، تم اب جاؤ مجھے لکھنے دو۔

حمیدہ :- اچھے ابا! خفا نہ ہوجئے یہ بتائیے کہ وہ کون بیوی ہیں جنہوں نے بہترین مسلمان خاتون کا تذکرہ آپ سے طلب کیا؟

میں :- حمیدہ وقت ضائع نہ کرو مجھے کام کرنے دو۔

حمیدہ :- (یہ میری وہ ۱۶ سالہ نعمت ہے جس کا عشر عشیر بھی اس اونچی کوٹھی کو میسر نہیں اور جس کے ہوتے باوجود غربت کے یہ دنیا میرے لئے ہزاروں جنتوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ حمیدہ کی شرارت کے مقابلے میں جنت کی نفاست لاکھ دفعہ قربان ہے) بھلا آپ اور مجھ سے غصہ! بتائیے وہ بیوی کون ہیں؟

میں :- کیوں پوچھتی ہو؟

حق الوسع سب کے لئے مساوی ہو، اور خدا کی خوشی کیا ہے!

میں :- اور نماز روزہ؟

بیگم :- مجھ سے جو پوچھتے ہو تمہیں بتاؤ کہ نماز روزہ آخر کیا ہیں،

میں :- عبادت ۔

بیگم :- اور بچوں کو اچھی طرح پالنا، صاف رہنا، ان کی گھر والوں کی، ہمسایوں کی خدمت کر کے خوش رہنا یہ کیا ہیں، کیا یہ عبادت نہیں؟

میں :- عبادت تو ہیں ۔

بیگم :- پھر کیا جس کو نماز روزہ میں خوشی ہو وہ وہ کرے جس کو اور کسی قسم کی عبادت میں خوشی ہو وہ وہ کرے ۔ مجبور کرنے کا یا جو ایک خاص قسم کی عبادت نہ کرے اُسے متہم کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟ شرط تو صرف یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ مقصود خالص خدا کی خوشی ہے؟

میں :- تم تو معتزلہ ہو ۔

بیگم :- معتزلہ وعتزلہ تو میں جانتی نہیں مگر بات ٹھیک کہتی ہوں ۔ اسلام رسوم کا نام تھوڑا ہی ہے ۔ صرف ایک قلبی کیفیت ہے، غیر مسلموں کو دنیا کے دکھ درد بے چین بنا دیتے ہیں اور ان کے پاس کوئی کلید ایسی نہیں جس سے وہ اس زندان سے نکل سکیں ۔ زندگی ایک تازیانہ ہے جو بار بار انہیں مجروح کرتا ہے، اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو بجائے تازیانہ کے سواری کا گھوڑا سمجھو ۔ خوب اس سے کام لو ۔ اگر اتفاق سے برا پڑا ہے کہ تمہارا گھوڑا گھوڑدوڑ والا نہیں بلکہ تانگے والا ہے تو اس سے ملول نہ ہو، جن کے پاس گھوڑدوڑ کے اسپ تازی ہیں ان کی طرف بہ نگاہ حسد نہ دیکھو، قلبی کیفیت یہ رکھو کہ ہمارے لئے سوال یہ نہیں کہ ہمیں مجروح یا بدرنگ یا پست قامت گھوڑا کیوں ملا بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ کچھ بھی ملے اچھا کام ہم اسی سے لے سکیں وہ پوری کوشش سے لیں ۔ تم مرد تو صرف نام کے مسلمان ہو، اصل میں زر و جاہ کے حریص ہو، تبھی تو یہ رسالہ والی اونچی کوٹھی ہر وقت تمہیں کھٹکتی ہے ۔ میں تو روز ان کے لئے بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں بہت دے اور وہ خوش رہیں ۔

میں :- تو کیا تم دعا کی قائل ہو؟

بیگم :- کیا جہالت کا سوال ہے!

میں :- کیوں؟

بیگم :- دعا میں اس لئے تھوڑا مانگتی ہوں کہ اللہ کبھی میرے کہنے سے مجبور ہو جائے گا ۔ صرف اس لئے مانگتی ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ مخلوق کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کا بھلا چاہیں اور یہی خدا کی خوشی ہے ۔ بلا سے دعا کا اثر ہو کہ نہ ہو، میرا اپنا دل تو زنگ آلود نہیں ہوتا ۔

میں :- واللہ باللہ اگر کوئی مولوی تمہاری منطق سن لے تو ابھی ڈبل کفر کا فتویٰ تم پر عائد ہو جائے ۔

خیر، گھر میں تو ان مولوی صاحب کے لئے بھی دعا ہی کروں گی مگر ساتھ ہی یہ بھی دعا کروں گی کہ یا اللہ اب تو ترکی کی طرح ہندوستان میں بھی کوئی ایسی تدبیر ہو کہ مولویوں کے وعظ اسی طرح زیر لائسنس ہوں جس طرح مسکرات کی فروخت ۔ بچارے مولوی ادہ دیانت داری سے اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور قوم ہے کہ صلواتیں سناتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہارے قول و فعل میں کس قدر فرق ہے تم نئی تو پردہ کی مخالف ہو مگر خود کس قدر سخت پردہ کرتی ہو، اسلام کو قلبی کیفیت بتاتی ہو مگر بچوں کو نماز کی تاکید ۔

اس میں قول و فعل کے فرق کی کیا بات ہے۔ کیا فیشن کے لئے آدمی کچھ نہیں کرتا، فی الحال مروجہ فیشن یہی ہے جو میرا ہے، کم از کم میری جماعت کا۔ مگر پھر تم نے مجھے بحث میں گھسیٹا۔ اسلام میں کم از کم میرے اسلام میں بحث منع ہے۔ کیونکہ بحث ایک لغو فعل ہے اور ہر مومن کو لغو سے پرہیز ہے۔ لو اب کھانے کے لئے آؤ۔ تمہارے لئے بہت اچھی کچوریاں تلواں گی۔

بیگم تو ٹہل دیں مگر میں نے ان کی گفتگو بھی لکھ لی۔ سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ان کی منطق بھی درست ہے تو کیا میرے گھر کی صحیح مردم شماری یہ ہے کہ دو بہترین مسلمان خاتونیں اور ایک جہالت کا پتلا مرد؛ اور کیا اکثر مسلمان گھروں کے اعداد اسی کے لگ بھگ ہیں، کوئی تعجب نہیں جو یہ درست نکلے ۔

ہم نہیں پٹے

تمکین کاظمی

کہتے ہیں "شرع کو شرم نہیں" جب ہی تو اشرف علی صاحب قبلہ نے بہشتی زیور میں نہایت صفائی کے ساتھ ایسی باتیں لکھ دیں جن کو پڑھ کر لوگ بگڑ گئے۔ بعضوں نے اس کا نام رکھ دیا "اشرفی کوک شاستر"۔ اگر ذرا غور کیجئے تو آپ قانون کو بھی بے شرم پائیں گے۔ کیسی کیسی فحش اور بے شرمی کی چیزیں آپ کو "تعزیرات" اور "ضابطہ فوجداری" میں نظر آتی ہیں۔ "مسلمانوں پڑھو اور عبرت کرو۔"

مگر ایک نکتہ سن لیجئے شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ کہ قانون پیشہ حضرات بھی بے شرم قانون پڑھ کر ذرا بے شرم ہو جاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کیسے۔ سنئے "جو "روح ظرافت" کی "ارواح لطیف" ور کو لتارٹ کے برش" انگوٹھی کی مصیبت کے بانی" "شریر بیوی" کے شوہر "تفویض" کے مفوضہ وکیل "حضرت مکرمی مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ال ال بی ہیں، یا تو طالب علمی کے زمانہ میں ایسے "سعادت آثار" جوان صالح تھے کہ بس قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور "پردہ" کے متعلق "آیات قرآنیہ" ڈھونڈا کرتے تھے مگر جب سے انھوں نے ال ال بی میں قدم رکھا ذرا بے شرم ہو گئے ہیں اور ایسی ہی بے شرمی کے مضامین لکھنے لگے ہیں۔ مگر غضب خدا کا اب تو اس بے شرمی کی انتہا کر دی کہ سب لوگوں کو دعوت دے دی کہ میاں آؤ اپنے پٹنے کی داستان سناؤ۔ بھلا کون سا شریف آدمی اپنی ایسی داستان سنائے گا جو شرم ناک ہو اور اس سے اس کی سبکی ہو جائے، مگر واقعہ یہ ہے کہ دوستی بری بلا ہے، جیسا شوکت تھانوی اور بھائی امین سلونوی نے مشتے نمونہ کہ کر دو ایک واقعات اپنے پٹنے کے لکھ دیئے، اور مجھ پر آفت نازل کر دی "سرپنچ" کے سالنامہ کے لئے لکھو۔ اس نادری حکم کی تعمیل میں اپنی بے عزتی ہی کی داستان شروع کرتا ہوں۔

تو جناب خدا آپ کو نیکی دے، ہم ذرا بچپن ہی سے نہایت غریب متین اور غایت سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ راستہ چلتوں کو خوانچے والوں کو، سبزی ترکاری والیوں کو سنا سنا کر ذرا عادت سی ہو گئی تھی اس لئے ہم نے ہر ایک کو سنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ والد ماجد کو بھی دق کیا۔ اس الم ناک واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ والد مرحوم تلجاپور کے تحصیلدار تھے۔ وہاں "تلجا بھوانی" شہرہ آفاق مندر ہے جس کے پجاری مہاراج "کاجی بابا" ہیں جنہیں گھوڑوں کا بہت شوق ہے۔ ہم نے دورے پر جاتے ہوئے ان سے ایک گھوڑی جو نہایت کم سن اور پورے قد کی بڑی مضبوط اور تیار تھی مانگ لی اور اپنے دورے پر اسی گھوڑی کو ساتھ رکھا۔ والد مرحوم کیونکہ گھوڑے کی سواری اچھی طرح نہیں کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں ایک دفعہ آپ کو کیا سوجھی کیمپ برخاست کر کے چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ تم ٹٹو پر بیٹھ جاؤ میں تمہاری گھوڑی پر سوار ہوں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی۔ ہم نے کہا جی کہ قبلہ گھوڑی بہت تیز ہے۔ منہ زور ہے۔ شریر ہے "بک" کرتی ہے "الف" ہوتی

ہے۔ مگر قبلہ نے سُنا ہی نہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ گھوڑی قبلہ کو پٹخے گی ضرور۔ اس لئے ہم نے محض اس خیال سے کہ گھوڑی قبلہ زمین پر اطمینان اور آرام کے ساتھ پہنچ جائیں "تنگ" کے بجائے "بکسوئے" کھول دیئے۔ سائیس نے ایک طرف کی رکاب تھام لی اور حضرت نے گھوڑی پر سوار ہو کر باگ ٹھیک کی اور گھوڑی آہستہ سے چلی۔ چند قدم چلنے کے بعد نہایت اطمینان سے الف ہو گئی۔ اور حضرت مع زین و رکاب گھوڑی کی پیٹھ سے سرین سے ہوتے ہوئے زمین پر آ گئے۔ سائیس نے دوڑ کر سنبھالا ہم بھی پہنچ کر پوچھنے لگے کہ ہوا کیا۔ مگر وہ بھی آخر ہمارے والد تھے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک شاندار طمانچہ رسید فرما کر بیک لفظ ہمیں پچیس صلواتیں سُنا دیں۔ ہم نے لاکھ لاکھ کہا کہ سائیس کی غلطی تھی اس نے تنگ نہیں لگایا تھا۔ مگر وہ سمجھ چکے تھے۔

بات گزر گئی مگر اس دن سے پھر کبھی حضرت نے نہ تو ہماری گھوڑی پر سواری کرنی چاہی اور نہ کسی بڑی گھوڑی پر سوار ہوئے۔ بازی بازی با ریش بابا ہم بازی اس کو کہتے ہیں۔

دوسرے شرمناک واقعہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک بڑے میاں جو نظم جمعیت و فوج بے قاعدہ کے ملازم تھے اور ہمارے محلہ کے رہنے والے تھے۔ ہمارے سر ہو گئے۔ تمہارے نانا جو خضاب استعمال کرتے تھے اس کا نسخہ لا دو۔ ہم نے نانی اماں سے نسخہ پوچھا مگر انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اماں جان بھی اس نسخہ سے واقف نہ تھیں۔ بڑے میاں سے کہا کہ "حضرت" وہ نسخہ کسی کو بھی معلوم نہیں، مگر وہ برابر مانگتے ہی رہے۔ آخر میں تھک کر ہم نے ایک ترکیب سوچی۔ حکیم بابا میاں سے بال اڑانے کا پوڈر مانگ لائے۔ اس میں چنبیلی کا تیل اور ذرا سی روشنائی ملا کر خضاب بنا دیا۔ اور شیشی بڑے میاں کے حوالے کر دی کہ حضرت یہی خضاب ہے جو نانا لگایا کرتے تھے۔ آپ پہلے ایک دفعہ اس خضاب کو استعمال فرمائیے۔ اگر پسند ہو تو میں اس کے اجزا لکھ دوں گا۔ بڑے میاں نے ترکیب استعمال پوچھی اور دعائیں دیتے ہوئے گھر رخصت ہو گئے۔

معلوم نہیں رات بھر انہیں نیند آئی یا نہیں مگر صبح صبح خوشی خوشی اٹھ کر بالشت بھر لمبی سفید بگلے کی ڈاڑھی کو خضاب لگایا اور جبڑوں کو خوب ملتے رہے۔ جب سوزش ہونے لگی تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر مسجد پہنچے۔ مسجد کے صحن میں حوض تھا۔ لوگ بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے حوض ہی پر بیٹھ کر ڈاڑھی کو خوب گھس گھس کر دھونا شروع کیا۔ دیر تک ملنے کے بعد منہ جو دھویا تو گچھے کے گچھے بال ہاتھ میں آ گئے۔ پہلے گال صاف ہو گئے پھر ٹھوڑی صاف ہو گئی۔ ادھر ادھر چند بال لگے رہے اور بس۔ نمازی وضو کر کے تیار ہو چکے تھے مگر حضرت کی ڈاڑھی نذر خضاب ہو گئی۔ اور آپ نے کندھے سے رومال اُتار کر اوڑھ لیا اور ایسے خانہ نشین ہوئے کہ چار مہینے تک قدم باہر نہیں رکھا۔ ہوتے ہوتے جب ذرا بال آ گئے تو کمرے میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ بھلا ہم ایسے اچھے آدمی کہاں جو انہیں مل جاتے۔ مدت تک ڈھونڈتے پھرتے رہے۔ ایک دن اتفاق سے ہم دارالشفا کی سڑک پر سائیکل سوار تھے اس سے بڈھے نے سڑک پر سے ایک پتھر اٹھا کر پھینک مارا مگر ہمارا اقبال دیکھئے کہ پتھر ہمارے مونڈھے کو چھوتا ہوا نکل گیا اور سیدھے جا کر پولیس کانسٹیبل کی پیشانی پر پڑا جو تھانے کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ غریب کانسٹیبل پہلے تو پتھر کی زد میں آ کر چکرا گیا پھر سنبھل کر سر سے بہتے ہوئے لہو کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا آگے بڑھا اور بڑے میاں کو دھر لیا۔ دو دن تک بڑے میاں پولیس کی حراست میں رہے۔ تیسرے روز نجات ملی۔ اس دن کے بعد سے بڈھے میاں نے ہمیں راستے میں دیکھا بھی تو منہ پھیر لیا۔

لوگوں کی ڈاڑھیاں اس طرح اڑا دینا یقیناً بُرا ہے۔ مگر آپ ہی کہئے کہ ایک بڈھا خواہ مخواہ سر ہو جائے کہ خضاب کا نسخہ لا دو

دراں حالیکہ نہ تو آپ کو نسخہ معلوم ہوا اور نہ کوشش کے باوجود معلوم ہو سکے۔ اور پھر آپ انکار کریں تو وہ جھوٹ سمجھے اور اصرار کرتا جائے تو آپ کس طرح پیچھا چھڑائیں گے۔ اس لئے ہم نے بڑے میاں کی داڑھی اڑا دی تا کہ نہ رہے داڑھی نہ لگے خضاب۔ اسی لئے تو میر نے کہا ہے کہ

کاٹ کر جڑ پھینک دو نخلِ تمنا کی امیر

تیسرا تکلیف دہ واقعہ یہ ہے۔ نقوش بینزیر سلسلہ کے اندھے فقیروں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ایک اندھا بڈھا فقیر ہاتھ میں لمبی لکڑی اور ہاتھ میں تیلی شمع لئے آٹھ بجے رات کو ہمارے دروازے پر سوال کیا کرتا تھا۔ کتے اس کو بھونک بھونک کر ڈرایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے کتے کی آواز نکالنے کی بہت مشق کی اور جب فقیر آیا تو گھر کے سامنے کھڑے ہو کر بھونکنا شروع کیا۔ مگر جناب یہ اندھے غضب کے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ کتا دو پاؤں کا ہے۔ چنانچہ نہایت تیزی کے ساتھ ایسی زور سے لکڑی رسید کی کہ ہم بلبلا اٹھے اور کئی روز تک ہماری پسلی میں درد رہا۔ اندھے کی لاٹھی سے خدا بچائے۔

ایک مولوی صاحب جن کا نام لکھوں تو فوجداری ہو جائے گی۔ ہمارے والد کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ اور حیدرآباد کے مشہور عالم اور فاضل تھے مگر ہم سے بہت خفا رہتے تھے۔ ہمیشہ ہمیں برا کہتے تھے۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی نہ آئی۔ کیونکہ وہ ذرا بدصورت اور گراں ڈیل تھے۔ اس لئے ہم ان کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کی شکایت والد مرحوم اور استاد مرحوم سے کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری کسی شرارت پر ایک بھری مجلس میں انہوں نے گالیاں دے دیں۔ ہم خاموش ہو رہے مگر موقعہ کی تاک میں تھے۔ گلزار حوض سوکھے حوض کی نکڑ پر ایک کتابوں کی دوکان تھی۔ جس کا نام یا تو حیدرآباد بک ڈپو تھا یا دکن بک ڈپو۔ بہرحال بک ڈپو نام ضرور تھا۔ اور یہ اس نام کی سب سے پہلی دوکان حیدرآباد میں قائم ہوئی تھی جس میں "شوکین" بھی تھے۔ اسی بک ڈپو کے چبوترے پر کرسی ڈال کر ہمارے مولوی جی بیٹھا کرتے تھے محرم کے دن تھے تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔ مجمع خوب تھا۔ مولوی جی کو بک ڈپو میں بیٹھا دیکھ کر ہمارے آگ لگ گئی۔ سامنے ہی ٹکسال "صراف" تھا اور اسی کے پاس ایک لالہ کی دوکان تھی جو پوری کچوری بنایا کرتا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر کڑھائی کے اس حصہ پر ہاتھ صاف کیا جو جل جل کر سیاہ ہو گیا تھا اور جس پر خوب سی کالک لگ گئی تھی۔ جب تمام ہاتھ کالا ہو گیا۔ ہم نے دستی سے ہاتھ ڈھک کر بک ڈپو کا رخ کیا۔ اور چبوترے پر چڑھ کر مولوی جی کے پیچھے جا کر سر پر سے ہاتھ پہنچا کر ان کے کالے منہ کو خوب کالا کر دیا اور بھاگ کر مجمع میں مل گئے۔ پہلے تو مولوی جی نے ہمیں پکڑنے کی کوشش کی اور دوکان سے کود کر ہمارے پیچھے بھاگنے لگے۔ مگر جب منہ کی کالک دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کئے تب کہیں بک ڈپو کے برابر کی دوکان پر جا کر اس کے پاس کے آئینہ میں اپنا روسیاہ دیکھا اور پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ اس کی شکایت انہوں نے والد سے کی۔ مگر ہمارا مذاق اتنا "ڈیسنٹ" تھا کہ جس نے سنا اس نے داد دی۔ مگر اس کے پانچویں روز روسیاہ مولوی نے ہمیں سٹی پل "افضل گنج" کے پل پر گرفتار کر لیا اور چار چھ طمانچے اس زور سے رسید کئے کہ اب تک اس کا مزہ یاد ہے۔ گال ہی تو سوج گئے۔

ضلع عثمان آباد میں ایک عہدہ دار تھے جو آج کل ایک بڑے عہدے پر ہیں۔ ان کے پاس ایک بڈھا تھا جو ذات کا "ڈھوا" تھا اور شیروانی پہن کر اس کے اوپر سے سوٹ کوٹ "صدریہ" پہنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے اسکول کے لڑکوں کو دکھا کر پکارا واسکوٹ بس لڑکوں نے بھی اس کا نام واسکوٹ رکھ دیا۔ اسے معلوم بھی ہو گیا کہ نام ہم ہی نے رکھا ان لڑکوں کو سکھایا ہے حضور بندگان عالی کی سالگرہ مبارک کا جلسہ تھا اور ہم سینئر طالب علم ہونے کی وجہ سے انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ یہ مسخرا اسکول کے کمپاؤنڈ میں

تھا تماشہ دیکھنے لگا۔ ہم کسی کام کے لئے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور قریب ہی واسکوٹ بھی تھا۔ دو ایک لڑکوں نے واسکوٹ
واسکوٹ چھیننا شروع کیا۔ بچے کم سن تھے اس مخرے نے ان کو چھوڑ دیا اور سیدھے ہمارے سر پر وارد ہو کر دو چار چانٹے رسید کر دیئے۔
جوانی اور پھر طالب علمی کا زمانہ۔ ان دنوں ہم بفضلہ تعالیٰ خاصے کھلنڈرے۔ تیسرے چانٹے پر اسے کوٹھے پر لاد کر دے ٹپخا اور دانتے گھونسے
رسید کئے کہ میاں واسکوٹ بلبلا اُٹھے۔ خیریت گزری کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ بڈھا واسکوٹ نہ جانے جیتا یا مرجاتا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ والدہ وغیرہ خالہ کے گھر مہمان گئی تھیں گھر پر صرف ملازمین تھے۔ اور ہم یار دوستوں نے ایک دفعہ سید صاحب
کا بکرا پکڑ کر ذبح کر دیا اور پکا دیا "بریانی"۔ بعض لوگ ڈرتے رہے کہ کہیں خون کے قے اور پاخانے نہ شروع ہو جائیں۔ کیونکہ عام طور سے مشہور
ہے کہ سید صاحب کا بکرا ذبح کر کے کھانے والا مر جاتا ہے۔ مگر ہم لوگوں میں کئی ایک سید تھے اور مکان بھی ہمارا تھا اور ہم صحیح النسب سید
تھے۔ اس لئے کچھ نہ ہوا۔ دو شیخ اور ایک پٹھان کھانے والوں میں شریک تھے۔ مگر ناتوان کی نکسیر پھوٹی نہ ہمیں چھینک آئی۔ بکرا اڑا کر جو مزا لگا
تو ہم لوگوں نے باضابطہ چوریاں شروع کیں۔ ایک دفعہ ایک دوست کے مکان سے دو اصیل مرغ اڑا لائے جو ہمارے دوست کے
والد نے بڑی محنت کر کے پالے تھے۔ ان کو کھایا تو بڑا مزا آیا۔ دوسرے روز کوٹلہ کے دروازے کے پاس ایک دکان والے نے
کئی اصیل مرغ پال رکھے تھے۔ ان میں سے دو اٹھا لائے۔ اور انہیں بھی چٹنی کر دیا۔ ہماری ماما کوٹلہ میں رہتی تھی، معلوم نہیں اس نے کہہ دیا۔ یا
وہ کانا ازخود تاک میں تھا۔ تیسرے دن عین موقعہ واردات پر اس نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ ہم نے مرغ چھوڑ کر اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ اندھیری
رات، صورت کسی کی بھی نظر نہیں آتی تھی مگر دیر تک خاصی کشتی ہوتی رہی۔ وہ کانا ذرا آدمی تھا خاصا تنومند اور جوان، دو تین گھونسے ہمیں ایسے
رسید کئے کہ مزا آگیا۔ ہمارے ساتھی بڑے ہوشیار تھے وہ فوراً چلے گئے تھے اور مسجد کے پاس کھڑے رہ کر ہمارا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے
بڑی دقت سے پیچھا چھڑایا اور فرار پر قرار کیا۔ قمیص اور واسکوٹ تو پارہ پارہ ہو گئی تھی، مگر سیدھا مونڈھا بھی جھول گیا تھا اور ٹخنے پر ایسی چوٹ
آئی تھی کہ کئی روز تک چلنے کے قابل نہیں رہے۔ اس دن سے ہم نے چوری کر کے کھانا چھوڑ دیا۔ اگر اس دو کانا ذار سے نہ پٹتے تو شہر بھر
کے اصیل مرغ ہضم کر جاتے۔ خیر اچھا ہی ہوا ورنہ چوری کی عادت ہو جاتی۔

کوٹلہ عالی جاہ میں ایک "الاوہ" ہے جسے "توتی الاوہ" کہتے۔ یہاں محرم میں عجیب و غریب کرتب کئے جاتے ہیں۔ کسی شخص کا
صرف سر طشت میں رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کے گلے میں تلوار آر پار نظر آتی ہے کسی کا نصف حصہ جسم نظر آتا ہے۔ یہ الاوہ محرم میں خوب معمور
رہتا ہے۔ ایک روز ہم بھی تماشہ دیکھنے گئے۔ الاوے کے سامنے ایک دوست کا کوٹھا تھا۔ اس پر بیٹھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے
کہ ایک امیر کے صاحبزادے الاوہ دیکھنے کے لئے ہاتھی پر بیٹھ کر آئے اور ہمارے کوٹھے کے سامنے ہاتھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے
عادت سے کہا بھی کہ میاں ذرا ہاتھی کو آگے بڑھاؤ مگر مہربان اور باور کیجئے جن جن ناموں کے ساتھ "بان" آتا ہے وہ بڑے بدمعاش
ہوا کرتے ہیں۔ اس فیل بان نے سنا ہی نہیں۔ ہم نے بھی ایک ترکیب سوچی اور گھر میں جا کر چولھے کے پاس سے پھکنی اٹھا لایا اور پسی
ہوئی مرچ لے کر پھکنی میں ادھر ادھر بھر دیا اور ایک طرف کاغذ لگا دیا۔ اسے لئے باہر نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہاتھی کی آنکھ میں مرچ پھونک
دیں وہ خود بھاگ جاوے گا۔ مگر جب ہم اس کے گھر کے دروازے سے نکلے تو میاں ہاتھی لید فرما رہے تھے۔ جب وہ فراغت
حاصل کر چکے تو ہمیں خیال ہوا کہ اب کون سونڈ کے قریب جا کر مرچ اچھالے۔ لاؤ ہمیں پھونک دو۔ چنانچہ پھکنی کو ایک طرف منہ لگا کر
پھونکا تو ساری مرچ اڑ کر معدے میں جا رہی۔ مگر اوپر جو صاحبزادے بیٹھے ہوئے تھے ان کے خدمت گار نے "ہیں مرچ لگی"

کرتے ہوئے دیکھ لیا، شاید ان سونٹوں سے آتش بازی لی تھی جو ہودے ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ اس خدمت گار نے ایک آتش بازی کا بڑا سا انار لے کر اس زور سے پھینک مارا کہ باوجود ہمارے پینترا بدلنے کے ہماری پیٹھ پر آلگا اور ہم دوڑ کر کوٹھے پر چڑھ گئے۔ ابھی ہم نے کوٹھے کی سیڑھیاں بھی نہیں طے کی تھیں کہ ہاتھی صاحب نے آگے بڑھ کر ایک دوکان سے سریں کو رگڑنا شروع کیا اور مہاوت نے آنکس مار مار کر اس کا سر الگ لہولہان کر دیا۔ آخر غریب ہاتھی نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا اور ہمارے سر سے بلا دفع ہو گئی۔ معلوم نہیں اس ہاتھی نے کہاں پہنچ کر دم لیا اور ان صاحب زادوں کا کیا حال ہوا کہ دوسرے اور تیسرے روز ہم نے "شیر دکن"، "صحیفہ"، "عثمان گزٹ" تینوں اخبار دیکھے مگر اس واقعہ کی تفصیل یا ان صاحب زادوں کو ضرر پہنچنے کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔

۴۷ء میں ہماری ایک عزیزہ مہمانی صاحبہ اور یوں اور اپنے صاحب زادوں کے گلبرگہ تشریف لائی تھیں۔ جب وہ گلبرگہ سے حیدر آباد کو واپس تشریف لے جانے لگیں تو ہم انہیں پہنچانے اسٹیشن گئے۔ رات کا وقت تھا۔ زنانے ڈبے میں صرف دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، ہمارے بھائی نے قلی سے سامان رکھوا دیا اور پھر زنانے کو سوار کرا کر خود دروازے کے اندر جا کر بر فور پاندان رکھنے لگا۔ ڈبے میں پہلے صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک بچاری بڑی بی تھیں جس کی سفید پوشی بوڑھی کا اظہار کر رہی تھی اور دوسری کوئی بڑی مزے دار عورت تھی۔ لڑکے کے اندر جانے پر اس غریب بیوہ نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر اس مزے دار نے بس ڈبہ ہی سر اٹھا لیا۔ سیکڑوں صلواتیں سنانے لگی۔ لڑکا تو خیر پاندان رکھ کر اتر آیا۔ مگر اس عورت کا چیخنا بند نہ ہوا۔ میں نے ڈبے کے باہر ہی کھڑے ہو کر سمجھایا کہ "بائی! وہ لڑکا تھا اس سے پردہ ہی کیا ہے۔ تمہیں گھورنے تھوڑا ہی آیا تھا پاندان رکھ کر چلا گیا" بس اتنا سنتے ہی اس حرافہ نے مجھے گالیاں دینا شروع کیں۔ اور وہ گالیاں شروع کیں کہ میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ خیر ہم نے صبر کیا اور گاڑی کے مارچ ہونے کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا۔ خالہ زاد بھائیوں کو دوسرے ڈبے میں بٹھا دیا اور ٹرین کے مارچ ہونے سے پہلے پھر اسی ڈبے کے پاس آ گئے۔ بیگم صاحبہ کھڑکی سے لگ کر بیٹھی ہوئی برابر گالیاں سنا رہی تھی۔ ٹرین کے حرکت کرتے ہی ہم اچک کر پاندان پر چڑھ گئے، اور کھڑکی کو بیچ میں لے کر دونوں ہاتھ ہم نے ان محترمہ کے گلے میں حائل کر دیئے اور نہایت اطمینان سے ان کا گال کاٹ دیا۔ اور اس شوخ نے اس زور سے چیخ ماری کہ سارا ڈبہ گونج گیا۔ چونکہ ٹرین تیزی سے گزرنے لگی تھی اور پلیٹ فارم ختم ہو رہا تھا اس لئے ہم نے اس بے ہودہ کارروائی کو ختم کر کے جلدی سے کودنا چاہا مگر اس حرافہ نے ایک زور دار چپت رسید کی کہ ہماری ٹوپی سر سے اڑ گئی اور ہم بدحواسی میں کود پڑے۔ شاہ آباد اسٹیشن پہنچ کر گاڑی رکی تو ان محترمہ نے اپنے اغوا کنندہ ساتھی کو بلا کر قصہ سنایا اور انہوں نے پولیس کو متوجہ کرنا چاہا مگر پولیس نے ان کو ہدایت کی کہ وہ گلبرگہ اسٹیشن کی پولیس کو مخاطب کریں۔ چونکہ وہ حضرت خود اس حرافہ کو کہیں سے اغوا کر کے لا رہے تھے اس لئے انہوں نے بھی کچھ زیادہ جرات نہیں کی اور بعد کو معلوم ہوا کہ اس حرافہ نے جو ذات کی ہندو تھی مگر کسی مسلمان کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ واڑی اسٹیشن تک برابر ہمیں گالیاں دیں۔ اور گھڑی گھڑی یہ کہتی تھی کہ سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایسا۔ گویا اس کے نزدیک سیکنڈ کلاس میں اس کا امکان تعجب انگیز تھا۔ گو ہماری یہ حرکت نہایت بیہودہ تھی کیونکہ اس ڈبے میں ہماری بیگم صاحبہ (جو عنقریب ہم سے منسوب ہونے والی تھیں) بھی بیٹھی ہوئی تھیں اور دوسری اعزا بھی مگر کسی نے اس حرکت کو دیکھا نہیں البتہ آواز سب نے سنی۔ گو یہ سخت بیہودگی تھی مگر اس سے زیادہ لطیف اور کوئی انتقام ہی کیا ہو سکتا تھا۔ ان گالیوں کا مزا اب بھی یاد ہے۔ اور اس لطیف انتقام کی لذت بھی۔

ان میں دو تین واقعے آپ کو بیہودہ اور شرمناک نظر آئیں گے مگر مجبوری ہے میں نے صرف واقعات لکھ دیئے ہیں۔ ان میں رنگ آمیزی نہیں کی۔ اس "سچ گوئی" کی علت میں آپ چاہیں جو کہیں۔

حال کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے مگر اس کی تفصیل مضمون کو اور طویل کر دے گی۔ اس لئے اسے کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔
مگر حضرات ان واقعات کو ذرا اپنی ہی حد تک محفوظ رکھنا۔ ع یہ راز ہیں زندگی کے اپنے تم اس کا چرچا نہ کیجئے گا

میں ایک میاں ہوں

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جاسکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں، جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کم بخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے۔ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے، تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے

دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے یہ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے مرزا بولے "کیوں بھئی خیر باشد؟" میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

"مرزا بھئی، کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہوگئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہوگئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ...." اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔ لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا!

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہوگئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے یعنی اب بےشک دوست آئیں، بےشک اودھم مچائیں، میں بےشک گاؤں، بےشک جب چاہوں اٹھوں، بےشک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو، نہیں گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہیے۔"

میں نے کہا "ہر روز، اور تم بھی!"

"کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا
تہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں جی چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا
تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے
بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی
ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا
لیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی:

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے۔ سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام و نشان تک
نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں
تیز کر رہا تھا۔ اس سے پوچھا:

"کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا، "حضور! آپ جانتے ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا
ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے "تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو
تھوڑا سا کام رہ گیا ہے بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا: "نقیٹر"
کہنے لگے: "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی، جمائی پر جمائی حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا: "اب بے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا: "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا: "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا، وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بے تاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا

پطرس

لگ جاتے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مدہم سی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقہ سے، قواعد ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ کہیں تھی ہاتھ کہیں اور ایک آدھ کام کا پتا اٹھا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپّا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوکدار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اٹھا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کہ منہ پہ سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں جہاں تک میں میں ہوں مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر

آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں!"

"دے جاؤ، چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھیے تو سہی۔

بہادر شاہ
اور
پھول والوں کی سیر

فرحت اللہ بیگ

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

"رعیت چو بیخ است سلطان است　　درخت اے پسر باشد از بیخ سخت"

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلّی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے سلطنتِ مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلّی کو اپنی سلطنت میں شریک کر لے۔ مرہٹوں کا زور ہوا۔ پٹھانوں کا زور ہوا۔ جاٹوں کا زور ہوا۔ انگریزوں کا زور ہوا مگر دلّی کا بادشاہ دلّی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جب تک دلّی بالکل تباہ نہ ہو لی اُس وقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلّی کے رزیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کر دے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کر لے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے بہت زور مارا کہ دلّی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر بورڈ والے اس پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلّی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مباحثے ہوتے۔ نوجوانوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا۔ مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی۔ جب بورڈ میں مسٹر ملکر نے کھڑے ہو کر کہا:۔

"عزیزو! میں پچاس سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دلّی کا قلعہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری طرف کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائے گا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔"

آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور جوان ہارے۔ دلّی کے بادشاہ کا اقتدار روز بروز کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اُس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ ویسی کی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

اپنے حال میں گرفتار۔ آخر یہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریب شہر والوں کی خبر لے۔ شہر والے جانیں اور ان کا کام جانے۔ خیر بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مال گذاری انہی دنوں میں آئی تھی وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا۔ ہندوؤں کو غلہ دیا۔ سر چھپانے کو جگہ دی۔ غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا۔ ابر پھٹا۔ سورج کا کونا دکھائی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اس کے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی۔

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے۔ صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو گیا بیلہ آباد ہو گیا۔ پنواڑیوں کا چھپیوں، بساطیوں، سوداگروں غرض ہر قسم کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئیں۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن برج[2] میں آ بیٹھے۔ شہزادوں کے لیے دیوان خاص کے صحن میں فرش ہو گیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے موتی محل خاص محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسے ایسی کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا۔ کوئی ہے کہ گھٹڑی بنا بہا چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پر سیدھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی ادھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی۔ تکلیں اڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[3] سے آگے نکل گئیں۔ پتنگ اڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکوؤں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا منگل ہو گیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر، بیکیں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفائے دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی[4] پہنچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے۔ کہا پیر و مرشد! پھول والوں کی سیر کا زمانہ آ گیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "ہاں

---

[1] جمنا کی ریتی کے برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اس کو بیلہ کہتے ہیں۔

[2] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اس کا ثمن برج لیکن دلی والے اس کو برُج کہتے ہیں۔

[3] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[4] دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شعر ہے ؎

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں

دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

ہوئیں۔ بہار کسوں، مجھولیوں اور بہلیوں میں وہ ٹھساٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[1] اور ماچیوں[2] میں پہلے تو اٹا اٹ سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو تین تین چھوکریاں اور ماماٗیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہو لئے۔ یہ لوگ قلعہ کے باہر ہی ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کی رتھیں، ڈولیاں، نیمے[3]، میانے، پالکیاں، چوپہلے، چنڈول اور سکھپال موتی محل کے برابر آ لگے۔ شاہزادہ ولیعہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ وگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناطیں کھینچیں جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں اُن کو بلحاظ اُن کے درجہ کی سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردا بیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین ساڑھے تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں، اُن کے پیچھے دوسری سواریاں۔ سب کے آخر میں نواب زینت محل[4] کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہنچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اُتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے وگلہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو لیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواری کے اِدھر اُدھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے کٹر کی دا پگڑیاں باندھے۔ ساتوں ہتھیار سجائے ساتھ ہو لیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ ان کا بھی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے، شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ۔ اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں۔ پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینب محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں گھونگر والے بال۔ ان پر سرخ پگڑیاں، پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندنے موٹے موٹے ہونٹ۔ لال لال دیدے۔ سُرخ گوٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی پوریں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زرِ بفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے۔ ایک چوب مارتی، دوسری پکارتی۔ ادب سے نگاہ روبرو، حضرت بادشاہ بیگم سلامت۔ سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں۔ ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسرے کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردا بیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس پہنے ہتھیار لگائے اپنی اپنی ساخت ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشعلچنیں۔ کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کپی۔ کسی کے ہاتھ میں دو شاخہ کسی کے ہاتھ میں پنج شاخہ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ کے باہر نکل کر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پر پڑ لیں اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھیر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر گُڑ[5] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔

---

[1] رتھ بہار کسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر ادرسوت کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اس کی سانگی اور اسی طرح پیچھے گھانس وغیرہ بھرنے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اس کو ماچی کہتے ہیں۔

[3] آدھی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے بڑی میانہ ہے۔ چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے۔

[4] نواب زینب محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلیخاں کے خاندان میں نواب شمشیر والدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولیعہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بادشاہ وہی کرتے۔ آخر انہی جا نفشانی نے رنگون پہنچا دیا۔ یہ بیگم جب نکلتیں ڈنکہ اُن کے ساتھ ہوتا۔ اسی لئے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں۔ لال کنوئیں پر نیا محل بنوایا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔

[5] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اُٹھتے ہی گُڑ کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خانساماں نے یاقوتی کی سربمہر پیالی پیش کی۔ مُہر توڑ کر یاقوتی نوش جان کی اور فرمایا۔ "اماں سب لوگ سدھارے"۔ عرض کی۔ "جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہو گیا۔ میر تزک[1] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے"۔ فرمایا "اچھا بسم اللہ کرو"۔ یہ حکم ہونا تھا کہ بگل بجا۔ ولیعہد بہادر کے لئے تام جھام۔ مرزا شاہ رُخ کے لئے تخت رواں۔ مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار دیوانِ خاص میں آ گیا۔ باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور اُدھر چوبدار نے آواز لگائی۔ "ادب سے تعظیم سے مجرا بجا لاؤ۔ حضرت بادشاہ سلامت"۔ شہزادوں نے تلوار میان سے نکال سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجا لائے۔ بادشاہ سلامت کے بعد ولیعہد بہادر۔ مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چترِ شاہی کھولا۔ دوسرے نے مورچھل لی اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی مثل بندی ہو رہی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک[2] سواروں کا رسالہ۔ رسالے کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہ رُخ کا تخت رواں۔ مرزا دارابخت کا تام جھام۔ ان کے پیچھے دوربا‌ش[3] اور دوربا‌ش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا آخر میں قلعے کے نوکر چاکر۔ بہیرہ بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[4] کے دلّی دروازہ سے یہ مثل بندی تو پرانے کوٹلہ پر جا کر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا۔ "حضرت پیر و مرشد ہمارا حق بھی مل جائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے آمین۔ اور صدہا سال یہ سایہ دلّی والوں کے سروں پر قائم رہے۔ آمین۔ خدا شہزادے شہزادیوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ بسیرا آ رہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں بسیر کی بہار دیکھ لیں"۔ بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپیوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے۔ کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے۔ تو شہدے دعائیں دیتے رخصت ہوئے اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہو گئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائے گی۔ رات کے بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلّی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا۔

[1] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرنے کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہی شخص تھے جن کو دربار میں چوب لے کر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آدابِ شاہی میں اونچ نیچ کی اور انہوں نے کھٹ سے چوب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی۔

[2] دلّی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔

[3] دوربا‌ش ایک خوبصورت رنگین شہتیر ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ سواری کے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کرے۔

[4] قلعہ کے دو دروازے ہیں لاہوری دروازہ اور دلّی دروازہ۔ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باولی کے کنارہ پر تھا وہ زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ہاں دلّی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

بھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ وقت کم تھا اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوتی تھی۔ ہاں بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے در کا راور دوکانیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گذرا ایک سناٹے کا عالم تھا مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک پھریری سی آئی اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آتے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گزریں گے کہ اسی سڑک پر سے گزرنا ہو گا مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہو گی۔ دلی والے تباہ ہوں گے۔ گولوں کی مار سے مقامات مسمار ہوں گے۔ اور بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین ہو گی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں پھر داخل ہونا ہو گا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قیدی ہوں گے۔ چاروں طرف سنگی پہرہ ہو گا۔ بیٹیوں، بھائیوں اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہوں گی۔ محل ویران ہوں گے اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہوں گی اور کس حالت میں ہوں گی۔

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گزر کر دلی دروازہ پہنچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر پڑ لیا۔ جو زنانہ سواریاں پہلے سے روانہ ہو کر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہو گئیں۔ کہاروں نے یہاں سے ذرا قدم تیز کر دئے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہنچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہنچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہو گیا۔ سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہو گیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے۔ وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سینکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے۔ تمام بتاتے۔ اُن کے کارنامے سناتے۔ اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار رو دیتے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا اُسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بد نصیب ہی ہو گا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا۔ ہوادار باؤلی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اُتر کر وضو کیا۔ شاہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ شاہزادیوں کے لئے باؤلی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر کے ہوادار میں آ بیٹھے۔ اور داروغہ نے عرض کی "جہاں پناہ باؤلی میں تیرنے کے لئے خادموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے؟" فرمایا "ہاں ہاں ہاں بلاؤ۔ وہ حقدار ہیں۔ اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملے گا۔ ضرور ملے گا۔" حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مجرا بجا لائے اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شاہزادیوں نے باؤلی میں روپے پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا اور ادھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ اس کے

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں۔ اُن کا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر میں بہادر شاہ مرحوم کا دل ایسا رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

جھرنے سے پچھلے اُٹھ کر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایاجی کا پنکھا اُٹھتا۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازے
مزار شریف پر چلا جاتا۔ جوگ مایاجی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رکتا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا
مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ ہر ڈیوڑھی پر پہرہ دار
کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پھاٹک پر تو ولّہ پلٹن کا پہرہ تھا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1]، قلماقنیوں[2]، اردا بیگنیوں[3]، حبشنوں اور گرجنوں کی
نشست ہوتی۔ بھلا کیا مجال کہ محل میں پرندہ تو پر مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے زنانہ کو راستہ جاتا تھا۔
غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو
گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی
روکار پر کندہ ہے

ایں در عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد
گفت دل سال بنا باب ظفر پائندہ باد

سنہ جلوس ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا ہوا۔ وہ تو کہو محکمہ آثار قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا ہے
خیر، تو صبح کی نوبت بجی ہی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل، نماز پڑھ، ناشتہ کر سب شہزادے شاہزادیاں،
بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب یہ تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھنے تھوڑی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام
لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو۔ اماں کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹھ کا؟" سب نے عرض کی۔
"پیرو مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اس وقت جھرنے پر بہار ہو گی۔" فوراً اردا بیگنی کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ ولّہ پلٹن کے
سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردا بیگنیوں قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ حبشنیں اور گرجنیں بیگمات اور شاہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔
اصیلوں، خواصوں اور سرتیوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شاہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان، حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد ہو گئی تھی پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھرتی جاتیں۔
لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں۔ اُن کا کام زنانہ میں پہرہ دینا تھا۔

[2] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہنچانے پر مقرر تھیں۔ ان کے لباس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان عورتوں کو شادی کرنا ممنوع تھا۔

[3] اردا بیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام پہنچاتی تھیں۔ ان کا صرف مردانہ لباس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے
تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھڑی کھڑی زبان میں کرتی تھیں۔ تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں دلی
میں ان کو تڑ بیگنیاں کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑی خاطر برادر ڈھنگی ہوں۔ ادہی پر سودا کا یہ
شعر صادق آتا ہو ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے   نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

باہر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں پہلے جہاز[1] پر جا کر دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ بُرجی[2] بیچ میں آگئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھ کے بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں اُترنا ٹھیک نہیں چپکی ہو رہیں۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھیر کر سب کے سب اولیا مسجد[3] پہنچے۔ مصلّوں پر نفلیں پڑھیں۔ اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ شاہزادوں کے ساتھ تھے آگے آگے سواری چلی۔ پیچھے پیچھے عورتوں کا بزغل روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنا دور ہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہنچ گئے۔

جس نے پہلے زمانہ کا جھرنا نہیں دیکھا اس نے دلّی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر مہرولی[4] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لئے تھا اور کیا ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ کر اس کا پانی نوکھی نالہ میں ڈالا تھا اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر سنہ [?] میں نواب غازی الدین[5] فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں، دالان اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھوم کے پر جھپٹر ہو گئے اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اسی لئے اس مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا بوسیدہ دالان ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے چھت میں درزیں [?] چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے گویا دالان میں مینہ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے اس میں چراغ رکھنے کے لئے سینکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگا دی ہے یا سونا پگھل پگھل کر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے ۱۳ پرنالے ہیں۔ پرنالوں میں سے ہو کر پانی جھجھر [?] پر آتا ہے۔ جھجھر کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی جھجھر پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی اُبل کر اس نہر میں آتا ہے۔ جہاں نہر ختم ہوتی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی منبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر

---

[1] شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے۔ اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے۔ اس سم کے متعلق عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ عام طور پر اس کو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے بُرجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں۔

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے صحن میں دو مصلے ہیں کہتے ہیں کہ ان مصلوں پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہما نماز پڑھا کرتے تھے۔

[4] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں یہ دلّی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں ذرا ابر آیا اور ان کی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے [?] قطب جانے کا نقیب ہے۔

[5] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دہلی کے وزیر آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنہوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چل کر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈ
کے دونوں طرف سے چار دیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنا میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔
خود محمد شاہ نے تو تینوں نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف پچ درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی
نے شمال کی جانب دوہرا دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنا کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنا کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے "امریاں"۔ پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت
کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۱/۲ ۲ گز چوڑا ہے۔ اور جھرنا کی مشرقی دیوار سے ملا کر اس کو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا
کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہوتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر
کہا ہے ؎

میں کہاں سنگِ دریا سے ٹل جاؤں گا ۔۔۔ کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا جھرنے کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں
مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنا کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا
ہے۔ ادھر ان کی سبزی ادھر نیچے گھانس کی سبزی۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنے میں چادروں کا گرنا، فوار
کا اچھلنا، پانی کا بہنا "اگر جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنکار، پپیہے کی پکار اور کوئل کی کوکو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنا ایک عجیب جگہ
تھا کہ ہر موسم میں ایک نیا لطف دکھاتا تھا۔ اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اس کی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ پھٹ کر حوض بن گیا۔ بند
سے دور جا پڑا۔ پانی کا رستا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہو گئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ سوکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر
ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگے گا۔ اس کے بعد جھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائے
گا۔ سچ ہے :۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو ہاں بادشاہ سلامت کے جھرنے پہنچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی ہنڈولا کھڑا کر اس میں مسند بچھا دی۔ ہوادار ہنڈولے کے پاس
جا لگا۔ بادشاہ اترا۔ اس میں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے آہستہ آہستہ ہنڈولے کو ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی
دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کہو اماں۔ کیا ارادہ ہے۔ اب تیر تنچا ہوتا ہے یا جھولا جھولتا ہے"

اچھا جھرنا میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اٹھاؤ۔ وہاں کا بھی مزہ دیکھ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں۔ یہ کہہ بادشاہ ا
کھڑے ہوئے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف بادشاہ سلامت ا

ؔ اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگا کر چنبیلیوں کی بیلیں چڑھا دی ہیں۔ پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔
ؔ قلعہ میں شاہزادے اور شاہزادیاں دونوں کو مردانہ فن سکھائے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہو گا جس کو تیر تلوار بندوق چلانا۔ سوار ہونا اور تیرنا آتا
بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی دیکھ لو آدھا قلعہ حوضوں اور نہروں نے گھیر لیا ہے۔

بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شاہزادیوں کے لئے دری، چاندنی اور قالینوں کے فرش کرکے تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کرکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پر جائیں۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی واہ! خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ۔" تاج محل[1] نے عرض کی "جہاں پناہ! ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کرکے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے۔ ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے۔" یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر کھڑی تھیں۔ ذرا سی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آگئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولھے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی۔ اب ہے کہ کوئی تو بیٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ دے رہا ہے۔ کوئی بہال اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسے کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی چھاج پر کچوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سامان سے لیس ہو گئے تو ہر ایک نے بڑھ بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے۔ فرمایا "نہیں۔ ہاں ابھی نہیں۔ جھولوں پر لوگ بیٹھ لیں اس وقت پکوان شروع ہو" یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی، ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجب قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں ان کی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے اُن سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سُرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی۔ یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سر پہ تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا کرتی۔ بادلے کی کا سبز زربفت کا پائجامہ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ۔ دانتوں میں مسی۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پرستان کی پری امریوں میں اُتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا تاج محل نے زینت محل کو بڑے بڑے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں۔ دونوں اٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے۔ تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی واہ۔ ایسا سوتا جھولا ہم کو تو پسند نہیں۔ بی ڈومنی[2] خانم اور دلدار کو بلواؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں جھرنا میں گھسی رہیں۔" یہ سنتے ہی دو دو بیگنیاں جا دونوں کو جھرنا میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شرابور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ بے قطب کی بہائی ہے۔" تو اس وقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر ادھر کھڑی ہو گئیں۔ اور شہزادیاں آ آ نز لانے آگئیں۔ ادھر انہوں نے ملار شروع کیا اور اُدھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ ڈومنی خانم اور دلدار تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر

---

[1] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ تھی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اس کو محل میں داخل کیا تھا اس وقت سے بادشاہ اس کی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اس کا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

[2] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کو کیا لکھا ہے۔ ڈومنی کے معنی "بڑھے منہ والی" ہے لقوے سے اس کا منہ ذرا پھیر گیا تھا جو املا میری سمجھ میں آئی ہے میں نے لکھ دی جو آپ کی سمجھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ڈومنی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے۔ آخر اسی سے لڑکر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہی گاتی تھی۔ دلدار اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی دو دنی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان دلی کی مشہور طوائفیں گزری ہیں۔

شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہو گی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں۔ بی نرمتی خانم اور دلدار کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا:

جھولا کن ڈارو۔ اے امریاں جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

رہیں اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنکارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں پڑیں چھنیاں چھنیاں

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں۔ چار مل گئیاں۔ جھول جھلیاں۔ جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

وہ نور کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں، وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی۔ وہ سہانا وقت۔ پتے پتے اور ٹہنی ٹہنی سے۔ جھولا کن ڈارو رے امریاں۔ کی آواز آ رہی تھی۔ مور درختوں سے اتر۔ جوش میں آ۔ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ غرض ایسا سماں بندھا کہ ایک دفعہ ہی فراٹے سے مینہ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا، واہ۔ اماں واہ۔ قلب میں مینہ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی۔ دلدار کوئی اور چیز ہو جائے اور ہاں تم سب ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ بجاؤ۔ کھاؤ پیو۔ کچھ لطف اٹھاؤ۔ یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے اُن پر شہزادیاں ہو بیٹھیں جب ذرا یہاں چھیڑ ہوئی تو دلدار نے دوسری چیز شروع کی۔

سنوں سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں [illegible] تیرے ساتھ

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

اب کیا پوچھتے ہو گرم گرم پکوان آ رہا ہے۔ کھا رہے ہیں۔ جھولا جھول رہے ہیں۔ کوئی اندرسے کی گولیاں منہ میں دبائے ہے کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے۔ مگر مارے ہے کہ جھول رہا ہے۔ مینہ برس کر نکل گیا تھا پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑاہی میں گری۔ تیل اڑا۔ اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" کی آواز نکلی کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا، تو کسی کے منہ پر۔ کوئی تو اوئی توبہ ہے۔ کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کم سہاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسروں نے پھر پکڑ یہ کہہ بٹھا لیا کہ واہ لیا۔ لوچ کوئی ایسا نازک بن جاتے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کر کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا؟

بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھپت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے باقی

پر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو۔ وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹڑیاں ڈالے۔ پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ بیسرا ملار چل رہا تھا کہ واہ جی واہ۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی، کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہو تی جاتی تھی کہ "تو برا نہیں اُترو۔ بہت جھول چکیں۔" اب ہماری باری ہے۔ لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ ذرا سُنیے۔

اماں۔ آڑو جامن گھُلے دھرے	اماں، میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں۔ تتا پانی بھرا دھرا	اماں میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں۔ دہانی جوڑا سِلا دھرا	اماں میں نہیں پہنتی میری ماں
اماں۔ بھائی بھاوج ملن کھڑے	اماں میں نہیں ملتی میری ماں

غرض چچا، پھوپی سے لگا ماموں اور سات قوں تک، سب ملنے کو کھڑے ہیں۔ مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تان اس پر ٹوٹی تھی کہ:۔

اماں۔ ساجن ڈولا لئے کھڑا	اماں۔ میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں جھرنا پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ ادھر بادشاہ سلامت جھرنا سے نکل امریوں میں آئے اور اُدھر شاہزادیوں نے کواڑ بند کر۔ ڈھیلے پائجامے اتار تنگ پائجامے پہن۔ دھم سے جھرنا میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ کوئی تیر رہی ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے اُڑا رہی ہے۔ بچے اُتھل نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ کچھ پھسلواں پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ نیچے گر کر قلابازیاں کھاتی ہیں۔ بچے ٹیں لت پت ہوتی ہیں حوض میں آ کر کود پڑتی ہیں۔ نہانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ نکلو۔ سارا پانی گدلا کر دیا۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا۔ سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ اِدھر اُن کے کپڑے لینے گئیں اور وہ اُدھر وہ دھم سے پھر نہروں میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوا۔ جھرنا کے دروازے کھُل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ تھوڑا بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنا سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف	خدایا ایں بود باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگِ سُرخ کی چار بارہ دریاں ہیں۔ بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے۔ بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں۔ جھرنا کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں۔ تھوڑی دور نہر گئی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصے ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے تختے ہیں۔ دوران تختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون

…ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں۔ چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے… کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کر بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا۔ پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا لئے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب میں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنے، امریوں اور باغ کے چھیڑ میں گذر گیا۔ شام کو جنگل محل میں آن کر وہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لائے۔

دوسرے دن قطب صاحب کی لاٹھ۔ علائی دروازے[1]۔ امام ضامن کے مقبرے، بھیم کی چھٹنکی[2]۔ کٹورے بیٹھے نیم[3]۔ بارہ بادشاہوں[4] کی قبروں کا چکر رہا۔ تیسرے روز جہل تن جہل من[5]۔ یکا ولی[6] کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا باغ[7] کی سیر کی۔ غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا۔ تھک کر چور ہو گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب کہیں جا کر نقل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آ گئی تھی۔ صرف جنگلی محل ا[ور] مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی۔ باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آ جاتی ہے۔ ادھ[ر] تاریخ مقرر ہوئی اور ادھر کارخنداروں، کارخانہ داروں کے ہاں تپا پڑی۔ حسب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خر[چ] ہو گیا۔ اب رہے دوسرے خرچ۔ تو وہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ جی چاہے اٹھاؤ، جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع… اجمیری دروازہ سے لگا قطب تک دکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ ن… لگے۔ مخمل کی برجی۔ اس پر زردوزی کے پھول، اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ سفید براق پہیے۔ ان پر رنگین بیل لی… ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھنگرو۔ سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ اندر بیٹھی سنگار کئے رنڈیاں… ہیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفاء گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کے کارچوبی زین پوش لیس ٹکی ہوئی لگامیں۔ گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے… اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے، سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں، ایک ہاتھ میں باگ… دوسرے میں چوہری۔ سوار ہیں کہ نشہ سواری کے انداز دکھاتے چلے جا رہے۔ غریبوں کا کچھ عجب رنگ ہے۔ صرف ایک تہمت بندھی ہے۔ نہ…

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاؤ الدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچے بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے

[3] چھٹنکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے۔ کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی اس کی قبر پر بھی اس پر نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے د… جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

[5] اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے۔ بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔

[6] جہل تن جہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے۔ سنتے ہیں رات کے وقت اس میں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

[7] اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گہرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے۔ گھنا ایسا ہے کہ د… بھی مشکل سے اس کے پتوں پر پہنچتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب و خیال میں (باقی…

کرتہ ہے نہ سر پہ ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا مٹکا سر پر اوندھا لئے سرپٹ اُڑے جا رہے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے۔ تختہ تختہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ لیموں سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں۔ پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور مٹکا قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صدی سے جو یہ ہین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہو گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس میں مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب رہیں عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں۔ باغوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ جس سرکاری باغ میں دلی والیاں جانا چاہیں۔ تو جانے دو۔ پردہ کرا دو۔ باہر پہرے لگا دو۔ کہ مرد اندر نہ جا سکے۔ آئے یہ جائیں اور باغ جا لے۔ انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے۔ اور پھر بھی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کوٹے تلاش کئے۔ بھلا قطب میں ٹھہرنے کے لئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے شاہی مکانات تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ اُمراء تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ پر لے لئے۔ غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ بھرنے میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اُتر گئے۔ لیکن جن کو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینہ برستا ہے برسنے دو۔ یہی قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اُس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئی تھیں۔ میوے مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے تو دوسری طرف کبابوں پراٹھوں۔ بریانی۔ مزعفر۔ اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار بڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ پیتے وہیں پھینک آگے بڑھے۔ بنو اڑن کی دوکان پر پہنچے۔ بی بنو اڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے کنگھی کئے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں لپٹے۔ سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے۔ دوسروں کو کھلائے۔ بیک فتو کی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دوکانوں سے گجرے لئے گلے میں ڈالے ساقی کے پاس ٹھہرے۔ دو دم حقہ کے مارے ایک دو پیسے دیئے۔ آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچہ۔ اُس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے۔ نے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دستے رکھی ہیں نئے پر خس چڑھا ہے۔ اور پر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں ساقی خود بھی سفید کپڑے پہنے سبز بنارسی سیلہ باندھے۔ لال پٹکا لپیٹے۔ کھڑے حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو پلانا ہو تو نے سیدھی کر دی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بھی نہیں آ سکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خیر جو تھا سو تھا۔ اچھی گزار گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہ رخ کا مزار باغ کے بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب یہ باغ کسی قدر چھدرا ہو گیا ہے۔

ش لفظ تو تہ بند ہے۔ اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کس کر   خود کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

انہوں نے بھی دو کش کھینچ لئے۔ ادھر کسی نے مہتال پر ہونٹ رکھے اور انہوں نے شعر پڑھنے شروع کئے

حقہ جو ہے حضور معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی بھرنے
...ے نفیری کی آواز آئی۔ لیجئے پنکھا اُٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنا کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں۔ کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلا پڑ رہا
ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ ارے بھئی
جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔"
پنکھا جھرنے سے اُٹھا شمسی تالاب سے ہوتا ہوا مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں، لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں
فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے آگے
ڈھول تاشے والے، روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے۔ لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول۔ کسی کے گلے میں تاشہ
میں چوبیں۔ ڈھول دھماں کرتا اس طرح گذرا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے زربفت کے پھریرے۔ مقیش کے پھند
کلابتوں کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹینیں۔ ایک لال ٹین کے سرے پر سنہرا ہلال۔ دوسرے
روپہلی چتر۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ اُن کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصا
بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر، اوپر کھپچیوں کا گنبد بنا، کپڑا منڈھ، پنی لگا، کاغذوں کے پھولوں سے سجا
دروں میں گیندئی پردے ڈال، ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں کو اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان
جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک ایک استاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد
بنے ہوئے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے۔ بھرے بھرے ڈنڈ۔ بھری ہوئی مچھلیاں۔ پتلی پتلی کمریں۔ جسم پر چست جانگئے۔ گلے میں سو
کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی نیزہ ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے کہیں پھری گتکا
ہو رہا ہے۔ کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے
نفیری والے اور اُن کے ساتھ دلی کے سقے سفید براق کپڑے پہنے۔ لال کھاردے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے
ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لئے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے
ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طبلہ سارنگی والے تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹ
عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تخت رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے، کارچوبی دوپٹے اوڑھے، پاؤں
گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سُرخ بانات کی وردیاں، اُن میں سفید بانات
کف اور کالر، شانوں پر فولادی جال، پاؤں میں کالی برجیس۔ ملک[1] کے چمڑے کے اونچے بوٹ، سر پر سُرخ منڈاسے، ہاتھوں
لمبے لمبے برچھے لئے، گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور

[1] (PATENTLEATHER) کو دلی میں ملک کہتے ہیں۔

کلاہ دعمامہ۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے کارچوبی ٹوپیاں۔ مدا خل ٹکے ہوئے نیچے چولی کے انگرکھے ایک برے پائجامے سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے پیچھے پیر اطلس کی پوپلی قطاریں۔ کم عمر گورے گورے لڑکے سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز اطلس کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجسیں سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے، ہاتھوں میں سبز چھریریوں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفاء اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اوڑھنے۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گندہ دار پگڑیاں۔ مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھڑیاں۔ ہشاش بشاش چلے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں موسری کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اٹھاتے۔ میلے کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی نوازوں کا گروہ۔ نفیری کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا تو دیکھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا۔ پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا۔ پنی چڑھا۔ آئینے لگا۔ پھولوں سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے، بڑوں۔ ہندو، مسلمانوں، غرباء، امراء غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی۔ بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھیلا یہ پیگیا جس کے پنکھے چلے۔ آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا۔ باجہ والے اور نفیری والے ہر گرہ کے سامنے ٹھیرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجہ والوں نے اپنے کمال دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے سقوں نے کٹوروں بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو سیلا ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا۔ کسی کو مندیل ملی کسی کو کرتے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفاء اور امراء مجرا بجا لائے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولی عہد بہادر نیچے اتر آئے۔ لوگ۔ کے کلے میں پھولوں کے پنکھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے، اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہنچ گیا یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر (۲۰-۲۲) تیاں مندر ہیں (یوں) کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھیں۔ بجلی بن کر الوپ ہو گئیں۔ اور یہاں آن پڑیں۔ باجہ بدھشٹر نے مندر بنوا دیا۔ مندر زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیدھو مل نے نیا

---

۳۵ شرفاء دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی جو غدر کے ہنگامے میں یاد لے کے نیچے سب ڈھیر ہو گئے۔ ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے ہماری ہوتی فوج کی شہیداں لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔

۳۶ دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں۔ اب یہ خاصی آباد جگہ ہو گئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پلنگ یا چا

نہیں جا سکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا
باب ظفر کے سامنے آکر ٹھیرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح
چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کہا "اماں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں جوگ مایا جی کے پنکھے کے ساتھ نہیں
تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمہارے بھائی کیا خیال کریں گے۔ مسلمان تھا۔ مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غ
اس لئے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آیا۔ نا۔ اماں، نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے
اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر درگاہ شریف تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہو گئے اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہنچے
دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ بیگمات کے لئے جہاز پر چلنیں پڑ گئیں۔ اور اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جل
مصاحبوں اور دہلی کے اکثر امراء و شرفاء کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سیکڑوں کشتیاں
اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں شاہی آتش باز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے باقی میں دہلی کے آتشباز اور شوقین
دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی کا چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھ

لہ میں نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ بادشاہ کو آتش بازی کا بڑا شوق تھا۔ آتش باز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جس میں قلعہ سے آتش بازی نہ جاتی
سے مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے ایک شمسی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول کی سیر میں تو
نہیں چھٹتی۔ ہاں سید حسن رسول نما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ اب حال ہی
روز نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور دہلی کے بڈھوں بڈھوں سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حا
میں۔ اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ دہلی والوں میں کیا تھ
اور کس طرح یہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان
نکل آئے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹
اینڈ سنز لمیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

لہ یہ بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ سلطان ش
التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زمان از غیب جان دیگر است

دہلی کے بادشاہوں نے آپ کے مزار کے گرد سنگ مرمر کی جالیاں، فرش اور دروازے بنوائے۔ دیواروں پر کاشانی
کرایا اور آس پاس مسجدیں اور حجرے تعمیر کرائے۔ خود مزار شریف تو کچے مٹی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے لئے دیا

گئے۔ اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آتے۔ ان سے فراغت ہوئی تو بھگی آتشبازی[1] کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2]۔ چھچھکے[3]۔ لٹو[4] اور خندکے[5] چلے۔ ہوائیوں کی شائیں سائیں۔ پھلکوں کی غائیں غائیں۔ لٹوؤں کی دھائیں دھائیں۔ خنتگوں کی زائیں زائیں اور قلموں کی سائیں سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا، ادھر پانی پر آتشبازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں اور چھچھوندریں۔ لوگوں کی جگہ چکرا در خنتگے۔ مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی۔ پیٹ میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر[6] اس سرے سے اُس سرے تک تماشے کا سلسلہ۔ ادھر سے دلّی والوں کے بجرے چلے۔ اُدھر سے قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچ کر دھواں دھوں ہونے لگی سمندروں کی لڑائی کا مزا آ گیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے۔ اور پانی میں روشنی کے عکس کشتیوں کے ساتھ۔ آتشبازوں کے ننگے ننگے جسم۔ کناروں پر خلقت کے ہجوم اُن کے غل آتشبازی کے عکس سے ان کے زرد زرد چہروں اور اوپر دھوؤں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیوں۔ آفتابیوں۔ اناروں۔ سہروں۔ جائی جوئیوں۔ بہت چھوٹوں اور رچہ نبیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آ گئیں۔ یہاں استادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ لسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ کر موسو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ بتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں اور پچ رنگی پھول دیں۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتھیلی پر چھوڑ لو۔ کیا مجال جو چر کس گئے۔ بڑے انار جو اُٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۶) عمدہ عمدہ سنگ مرمر کے تعویذ ہیں۔ ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے اور اُس کے پہلو میں آخری بادشاہان دہلی کے مزار بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے۔ اور اس کے ایک طرف اکبر بادشاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا اس میں بہادر شاہ نے اپنا سرداب بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں گے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی جہاں بزرگوں کا پہلو تو کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

[1] دہلی والوں نے آتش بازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسرے کلکاری۔ ان دونوں کا مطلب آگے آپ خود سمجھ جائیں گے۔

[2] بڑے اُڑن اناروں کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

[3] موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چھکہ بنایا جاتا ہے۔ اس کا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے۔ اُس کو ہلانا شروع کیا۔ جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دے کر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ نیچا رہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آ گئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا۔ کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض یہ آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے۔

[4] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے کولے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی۔ چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ چلاتے وقت چھچھوندر میں آگ دکھا۔ لٹو کو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی۔

[5] خدنگ کو دہلی والے خنتگ کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔

[6] بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں۔ پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو بیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے۔

ارہر کا کھیت

رشید احمد صدیقی

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے
منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس
داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی ہیر پھیر اور "چیز جواب"، "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور
ہیں وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلۂ مکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی
اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واقعہ لو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حق
خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں سنز پنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی
عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونو
ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر
جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہند
کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک فضلے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ان کو آپریشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے، گھنے بھوتنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے
ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلے پر غور کر رہے ہیں یعنی
ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلے میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی اور دوسرے دن
خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے، کسان کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اس کا بوسیدہ جھو
کے لیے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لیے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس
کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی رہتے ہیں، غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال میا
زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور رہی!

لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ لعنۃ حفظ ان [illegible] پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہوگیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ منیا کے ڈیلے کلو [illegible] کا فعل تھا، دونوں نے مکندیا کو ببانگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلانِ جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا، دونوں چیخ پڑیں۔ منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ خشک طہارت کا خیال رہا نہ نجاست کا۔ ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بٹیریں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ ——— گویا آبلی میں بم گرا۔

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لیے اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثارِ قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچا ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور دلجوئی [illegible] اس سے اظہارِ خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری حیثیت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گذرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ نقضِ امن ہوئے گویا اُردو پڑھنے کے سالہا سال یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لیے توانا و ارنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک حبشی گذرا اور ہم نے نہایت سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہوگئی ہوگی۔ اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں حامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا بولا۔ میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہوگیا۔ خوانچہ کے اندر جو ابھی سر پر رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے، خدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کام یونیورسٹی نے معلمین کے لیے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت، خوانچہ والا اور بریلی کے تحفہ امرود کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے حاجی بلغ العلیٰ کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کلی اور داڑھی کے علاوہ ع عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "جیب زینو بی" ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور "حال ابوالجنون" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت البزابہ" پر زور لگاتے رہے ان دنوں "قانونِ مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے۔ جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا سُنیے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے

یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی!

گردن ہلا کر "بجلوہ ریزی" "کل وہ بہ پرفشانی" "ریش اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں،
فرمایا "ابہکا کھیت"

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا بہ معاوضہ سخن فہمی کی داد دوں؟ کل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "قسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیے ہیں۔ اگر کوئی صاحبان کے نام ونشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے کسی نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور کسی نمبر میں بھی کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ غلط بحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا کون نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا؟ کہنے لگے جی نہیں وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنائیے گا ؎

تراکہ زور بیازوے تیغ زن باقیست   بجبر تیغ کہ آں حسرت کہن باقیست

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا یہ یہ ہے ؎

من آں علم و ہنر را با پرکاہے نمی گیرم   کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا "ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو۔ اچھا تمہارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا "اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار رہوگا۔ فرمایا "السلام علیکم!

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔

(۲) اگر عنوان بُرا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔

(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار۔

(۴) اگر کل بُرا ہے تو ناظرین ذمہ دار۔

خط وکتابت، و ترسیل زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

الشذری

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر ہمارے منہ سے نکل گیا کہ بھئی برار کے معاملہ میں انگریزوں نے حق اور انصاف کے گلے پر چھری پھیر دی تو حضرت اس کے یہ معنی کدھر سے ہو گئے کہ ہر وقت برار کے جھگڑوں سے ہمارا سر پھوڑا جائے۔

(ا)

"یار یہ برار کیسے واپس ملے؟" یہ ایک سوال تھا جو بھائی شذری نے شاید صبح ناشتہ سے پہلے پہلے سترہ مرتبہ مجھ سے کیا۔
"دیکھو جی!" میں نے تنگ آ کر کہا "تم نے جو ہماری جان زیادہ کھائی اور یہ برار کا برما پھر ہمارے کانوں میں چلایا تو یاد رکھو مجھ سے کوئی بُرا نہ ہو گا۔ آپ خود خیال کیجیے کہ برار کے جھگڑوں کو نہ تو ہم سمجھیں نہ بوجھیں۔ رہ گیا انگریزوں پر غم و غصہ کا اظہار کرنا سو وہ کر چکے اور پھر بارہا کر چکے مگر اب کان ہیں کہ کھائے جا رہے ہیں۔ کہو ہم اور ہمارے آبا و اجداد کیا اگر حضرت عیسیٰ بھی آ جائیں تو قوم انگریز تو ماننے سے رہی۔ اجی گرچہ بند کر دے اور برار نہ دے مگر مصیبت دراصل اور تھی۔ وہ یہ کہ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں برار کی واپسی کی فکر کسی کو ہوئی تو بس وہ کہ ، ایک تو خود حضرت اقدس و اعلیٰ یعنی برار کے مالک کو اور دوسرے بھائی شذری کو میری دانست میں اگر کہیں بھائی شذری برار کے رہنے والے ہوتے یا نہ سہی یہ کم از کم انھوں نے برار کو دیکھا ہی ہوتا تو نہ معلوم کیا غضب کرتے۔ کہنے لگے نہ ہوا میں (یعنی برار کا مالک) کچھ روز تک تو نقشے بنتے رہے اور یہاں دیکھنا پڑا اور بار بار دیکھنا پڑا کہ برار کا صوبہ مل کر سلطنتِ آصفیہ کتنی ہو جائے گی۔ یہاں تک غنیمت تھا مگر صورتِ حال اب یہ پہنچی کہ علی گڈھ کے ایک بورڈنگ کے کمرہ میں بیٹھ کر برار کی واپسی کی کوشش ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے صوبہ کی اتنے سے کمرہ میں بیٹھ کر جو واپسی کی کوشش کی جائے تو کونسی چیز ہے ایسی کمرے کی از قسمِ جمادات و حیوانات وغیرہ جو سلامت رہ جائے۔ کسے باشد! اگر اس نے بھائی شذری کے خیال کے مطابق ذرا بھی ان کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ ظاہر کیا کہ برار واپس نہیں ملے گا یا جلد نہیں مل جائے گا تو بھائی شذری نے اس سے یہ سوچ کر جھگڑنا شروع کر دیا کہ یہ اوّل درجہ کا بدمعاش ہے اور ہو نہ ہو برار اسی کی جیب میں ہے اور ابھی ابھی یہیں کا ہیں اس سے دھروا لو، مشتے نمونہ..... ایک روز کا ذکر ہے کہ پھر برار کا قصہ درپیش تھا۔ چائے پی جا رہی تھی۔ ایک اور صاحب بھی شریک تھے اور انھوں نے نہایت ہی متانت سے چائے کی پیالی میں شکر ڈالتے ہوئے کہا "مشکل ہے برار کا واپس ہونا"۔

تو موہ کہیے۔ "بھائی شندری نے کچھ بدک کر کہا" وہ کیسے۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیے کہ آخر کیسے انگریز ہمارا حضور نظام کا نہیں، صوبہ ہضم کر بیٹھے گئے۔ "تو کیسے؟" انھوں نے کہا "مجھ سے تو یہ انگریز ہے اس کے ہاضمہ کا یہ حال ہے کہ مصر اور قبرص ہضم نہیں کر گئے بلکہ پی گئے تو یہ برار کونسا تاہیر ہے۔" تن بدن میں بھائی شندری کے آگ ہی تو لگ گئی۔ دانت پیس کر اور منہ بگاڑ کے بولے "نہیں دب گئے نہیں ڈر گئے؟ اجی ان کے تو دیں گے باپ ——— آپ ہیں گے آپ ہیں گے؟" انھوں نے مسکرا کر کہا "جی آپ مدد کیجیے گا نا ..... آپ کا بس چلے تو روک نہ لیجیے گا۔"

"مذاق نہ کیجیے حضرت، یہ معدہ کا حلوا نہیں ہے یہ برار ہے۔ برار حلق میں سے نکال لیا جائے گا حلق میں سے" بھائی شندری نے ہاتھ سے نکالنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"اخاہ ——— وہ بولے "یہ کہیے یوں کہیے اب معلوم ہوا کہ حضور بھی کچھ تھکے حیدرآباد سے معلوم ہوتا ہے پاگئے اور لگے ہیں پر چھوٹنے۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ بس شندری آگ بگولا ہو گئے۔ اول تو انھوں نے ان تمام لوگوں کو صلواتیں سنائیں جو حیدرآباد کے وظیفہ خوار ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حق بجانب اور مستحق ہیں اور پھر اس کے بعد انھوں نے وہی کہا یعنی یہ کہ برار ان کی جیب میں ہے لے تو فوراً۔ نتیجہ اس کا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ بات بڑھی اور چینی کے برتنوں کے لیے میز چھوٹی ثابت ہوئی۔ ہم ہی کر کے بیچ بچاؤ کیا۔

آپ کہیں گے کہ تعلیم کے علمبردار، تہذیب یافتہ کالج کے طالب علم اور یہ ——— ! تو حضرت یہ زر زمین کے جھگڑے دراصل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے چوتھے روز کا لطیفہ سنیے۔

(۲)

چودھری صاحب کہنے لگے "یار مرزا دیکھو یہ حیدرآبادی کس قدر ملک کے غدار اور دشمن ہیں" یہ کہہ کر وہ حیدرآبادیوں کے نقصے دکھانے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بھائی شندری خفیہ طور پر اس کی تحریک کر رہے تھے کہ تمام کالج کے لڑکے گروہ اور انبوہ کی صورت میں واپسی برار کے معاملہ میں کالج کی تحریک کا جامہ پہنائیں اور سخت قسم کی ایجی ٹیشن پیدا کر کے ایک چٹپٹا سا جلسہ کر کے دھر لیں، تمام وائسرائے وغیرہ کو تار پہ تار، تار پہ تار۔ اس تحریک سے حیدرآبادیوں نے اور دراصل ہر اس نے جس کے سر میں سر تھا حصہ لینے سے انکار کر دیا اور اس کو توڑا لا بھائی شندری نے جہنم ہیں مگر حیدرآبادیوں سے الجھ پڑے۔

دیر تک بڑبڑاتے رہے اور تجویز یہ تھی کہ ایک ورکنگ کمیٹی بنے اور لوگ جمع ہو کر تدبیریں کریں اور دستور ہے کہ ویسے کوئی جمع نہیں ہوتا یعنی چائے کیک بغیر۔ چنانچہ شام کے لیے بھائی شندری اس کا انتظام کر رہے تھے اور جناب اسی وجہ سے میں بھی مجبوراً برار کی واپسی کا خوش آیند اور خوش کن تذکرہ کم از کم آج کے لیے سننے کو تیار تھا۔

حیدرآبادیوں کے خلاف جب بخار نکال چکے تو بری طرح سے مٹھائیوں اور پھلوں وغیرہ کی فہرست بنی کہ کتنی کون چیز آئے۔ ظاہر ہے کہ برار کی واپسی کے سلسلہ میں جب یہ تیاریاں ہوں تو سچے دل سے کیوں نہ دو ایک پڑوسی بھی اس قومی خدمت میں حصہ لیں۔

غرض دو دن میں حضرات کے مشورے سے کھانے پینے کی چیزیں تیار ہوئیں۔ بیرے کو بلا کر دو نوٹ دس دس روپیہ کے دیے گئے کہ ہاتا
سے سب چیزیں لا کر رکھ لینا۔ جب ہم کالج سے واپس آئیں تو سب موجود ہو۔

"کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟" ایک آخری نظر فہرست پر ڈالتے ہوئے پھر بھائی شندری نے بیرے کی طرف بڑھا دیا۔

"اصل چیز تو رہ ہی گئی۔" ایک صاحب نے پرچہ دیکھ کر کہا "واہ!" اور یہ کہہ کر قلم لے کر اس فہرست میں اضافہ کر دیا۔
بھنے یعنی پانچ روپیہ کا برا بھی آئے گا۔

بھائی شندری نے دیکھا اور اس مذاق پر خندہ فرمایا۔ قلم کی طرف بھائی شندری نے ہاتھ بڑھایا اور جب انھوں نے دیا
تو مسکرا کر ہاتھ جھٹک کر بولے:

"لاؤ جی قلم ادھر کاٹ دیں۔"

دوسرے صاحب بولے "واللہ کاٹ دو کاٹ۔ ورنہ عجب نہیں یہ لے آئے۔"

اس پر اور تفریح رہی اور مذاق ہی مذاق میں پرچہ اسی طرح بیرے کو دے دیا گیا۔

"کیا فائدہ" بھائی شندری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے ہی اول نمبر کا گدھا ہے۔ کھسکاتا پھرے گا۔" بیرا خواہ مخواہ
مگر بیرا چل گیا۔ مذاق تو مذاق ہی ہے انیس روپے کا سودا تو ویسے تھا۔ یہ پانچ روپیہ کا برا موقع اور مناسبت
کے لحاظ سے ٹانکا جا رہا تھا۔ (ریچ ہے نہیں)

(۳)

"برار آجائے قبضہ میں ......ن ......ن - ن - ن ......وہاں ٹیلی لی لی بی بی خونریزی شاہی" یہ مصرعہ اللہ کے فضل
سے اکثر ہمارے کمرے سے گونجتا رہتا تھا، رات کو، دوپہر کو، صبح و شام غرض وقت بے وقت یہ مصرعہ الاپا جاتا تھا۔ پھر نہانے
میں تو اس کا الاپنا اس قدر لازمی تھا کہ بیان سے باہر، بدن پر تیزی سے صابن کیا بلکہ یہ کہیے کہ بھائی شندری یہی مصرعہ مل مل کے نہایا
کرتے تھے۔ اس مصرعہ نے کیا کیا نہ سر پھٹول کی تھی۔ ایک روز بھائی شندری نے جماہی لیتے میں اس مصرعہ کو بھی شروع کر دیا
اول تو جماہی میں منہ پھٹا ہوا مشکل سے کوئی جماہی اس مصرعہ کے بغیر لی جاتی تھی) پھر اس پر انگڑائی بھائی شندری کی شیریں نہیں بلکہ نمکین
آواز کا رس آفریں ترنم نتیجہ یہ کہ "برار آجائے" تو صاف سنائی دیا اور اس کے بعد کا بقیہ حصہ جماہی کے تیز و تند طوفان اور حلقوم
کے غوغائے بے ہنگام میں انگڑائی کی کھینچا تانی میں قلابازیاں کھاتا کچھ اس طرح ادا ہوا کہ واقعی معلوم ہو کہ کوئی کتا نہایت ہی کامیابی
کے ساتھ خود تان سین سے داد لے رہا ہے۔ آپ جانیے کہ اچھے گانے والوں کے پڑوسی عموماً دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا برابر والے
کمرہ سے ایک پنجاب کی طرف کا موذی جس کے شاید معدہ کے بجائے بھی پھیپھڑہ تھا اس زور سے گرج کر بولا:
"کتے......ے......!"

کوئی اور بڑے زور سے برآمدے سے پکارا "باندھو" جماہی کے سلسلے میں بھائی شندری نے ایک انگڑائی بھی لی
تھی۔ وہیں کے وہیں ہاتھ چھوڑ دیے اور ایک "مطرپ" کے ساتھ منہ بند کر کے بولے "یہ کون ——؟"...... مگر سناٹا تیزی سے

باہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بحث و مباحثہ، قہقہوں کا شور برابر والے کمرے سے کچھ اس طرح بلند ہوا کہ جیسے معلوم ہو کہ وعظ، دنگا، لڑائی اور ہنسی مذاق سب کچھ معہ تبلیغ کے بیک وقت ایک ہی جگہ ہو رہا ہے۔

میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ طرفہ بحث بھائی شندری نے چھیڑ رکھی ہے۔ وہ یہ کہ تاجدارِ دکن کی سخت توہین کی گئی۔ محض اس وجہ سے کہ مصرعہ خود حضرتِ اقدس و اعلیٰ کی زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔ ادھر سے یہ عذر تھا کہ یہ حضرتِ دکن کا کلام ہے اگر آپ خود اللہ میاں کا کلام اس طرح پڑھیں "روئیں گے" تو ہم آپ کو بغیر بند ھوائے نہیں مانیں گے۔ کیوں؟ مبادا کہ آپ کاٹ کھائیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایک اور وہ یہ کہ مخالفین بضد ہو جائیں اس بات پر کہ کسی طرح بھی بھائی شندری برار واپس نہ لے سکیں۔ مگر کسی نے کہا اور خوب کہا کہ ع

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

وہاں اکیلے دوکیلے پیمبری حضرت موسیٰ کو مل گئی تو کیا ہوا یہاں بھی تو اس سے کم واقعہ نہیں پیش آیا۔ یعنی یہ کہ بیرا بازار سے برار لے آیا اور وہ بھی فرض!

(۴)

میرے سپرد بھائی شندری نے ایک اور کام کیا تھا وہ یہ کہ چند باثر دوستوں کو علاوہ تحریری دعوت ناموں کے زبانی بھی دعوت دے آؤں۔ چنانچہ آخری گھنٹہ جو کالج کا ختم ہوا تو بھائی شندری تو چلے کمرے کی طرف اور میں چلا اپنے کام پر۔ وہاں سے پھرتا ہوا واپس لوٹا۔ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں سخت شور ہے اور میرا کمرہ شاید بیر بہوٹی۔ لڑکے کالج کے بجائے اپنے کمروں پر واپس جانے کے میرے کمرے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ میں بھی دوڑا، ایک شور و غل ہنسی مذاق میں معلوم ہوا کہ بازار سے بیرا برار لے آیا ہے۔ کمرہ کے دروازے پر پہنچا ہوں بھیڑ کو چیر کر تو تصدیق ہو گئی۔ ایک پورا صوبہ کا صوبہ اور وہ بھی ایک کمرے میں آجائے تو کیا ہو!

میں کمرہ میں گھسا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کونہ میں ایک بڑے بھاری بورے میں برار رکھا ہے اور بیرے کو بھائی شندری ہاکی اسٹک سے بجا رہے ہیں۔ جوں توں کر کے بیرے کو چھڑایا۔ وہ بھاگا غریب کمرے سے نکل کر۔

مگر انصاف سے دیکھیے اس غریب کی کیا خطا۔ ایک دفعہ نہیں کوئی دس مرتبہ پٹ چکا تھا اس بنا پر کہ جو چیز بھی منگائی گئی تھیں ان میں سے کوئی چیز دام نہ ہونے کی وجہ سے نہ لا سکا۔ حکم تھا کہ لاؤ کہیں سے، بازار گیا ایک سے نہیں بلکہ کئی آدمیوں سے پرچہ پڑھوایا اور سب نے کہا کہ ہاں ٹھیک تو ہے پانچ روپیہ کا برادہ منگوایا ہے۔ کیونکہ آپ یقین کیجیے کہ پرچہ پر خط شکستہ میں لفظ برار اس طرح لکھا تھا "برادہ" یعنی برار کے آخری حرف "ر" دال کا دھوکہ ہوتا تھا اور آخری ڈیش "ہ" یعنی "۔" یہ حرف "ہ" کا۔ چنانچہ جس طرح بھی اور جہاں سے بھی غریب سے بن پڑا پورے پونے تین روپیہ کا برادہ لیتا آیا اس سے زائد کہیں مل ہی نہ سکا ورنہ مار تو بری بلا ہے وہ پورے پانچ روپیہ کا لاتا۔

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

دن بھر کے تھکے ماندے ہی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر "بندے ماترم" کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی غنیمت سمجھ کر جا پہنچتے ہیں جو حال بھی ہو، بیمار ہوں، کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور یہی وجہ ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں، ہمارے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ بھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں کبھی نثر میں کبھی نظم میں کچھ جملے کہہ رہے تھے، کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر دہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے:

"بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ——— تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ ہوں ——— سرگرمیاں ——— اب تیار ہو جاؤ ——— ہو ——— بیدار ہو ——— کہ تم کو ——— ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا ہمیشہ کا فیصلہ یا انجام دینا ہے ——— اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ——— (دوسری طرف گھوم گئے) تو اب ذلت ——— سے بیدار ہو ——— ہے ——— اور وہاں تم ——— برٹش گورنمنٹ ——— سوراج سودیشی ——— چرخہ ——— کھدر ——— (ریزرنگ کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹے میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے دکان پہ سے مٹھے کا نیچا لیا ہمراہیاں کے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے، اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقہ بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

کچھ کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے۔ نہ بدیشی گارڈ ہوتا نہ فارن ڈرائیور، نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے تھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ——— ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں جھنڈیوں اور گپیوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ "کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا "سوراج؟" جواب ملا "ہاں سوراج سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو، ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔" پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں، ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں، اور ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا "جناب سکنڈ تین روپے ہوتے"

لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا:

"جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیے ہے کانپور کا سیکنڈ کلاس۔"

بابو جی نے ذرا ترش رُو ہو کر جواب دیا:

"جناب والا! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیے مگر اسی کے تین روپے ہوں گے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجیے ورنہ جانے دیجیے۔"

میں: "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا؟"

بابو: "کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے۔"

میں: "یہ کہیے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

بابو: "لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی:

"سنیے تو جناب، ٹھہریے تو جناب، دیکھیے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیے، آئیے وہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجیے ——— اب وہ بھی نہ دیجیے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے، ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا "ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ، دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انھوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے: "لائیے صاحب لائیے، بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "درجہ دوم کانپور" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے:

"جناب والا! ابھی سوراج ملا ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجیے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

شوکت تھانوی

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انھوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اُلٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیاں مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے تھیلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے جبیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا:

"اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"

"معاف کیجیے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ "یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہوگا؟" مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے انھی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا کہ "بابی ہمکا نا ہیں مالوم" یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسینجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ "اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف" ہم نے گھبرا کر پوچھا:

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی، اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر کبھی لوٹے میں پانی لا کر کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔

خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بہ آواز بلند چیخنا شروع کیا "بیٹھنے والے مسافرو بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے۔"

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری
سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر غور کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی
شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم فی سمجھتے تھے۔ بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے
ہمارے بیٹھتے ہی دو تین دہقان گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے۔ ان سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے" اماں سیکنڈ کلاس
ہے، بھائی سیکنڈ کلاس ہے" مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے "ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے" ہم گھس آیا ہے۔
خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انھی اسسٹنٹ
اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا جس کا جواب انھوں نے اپنی سودیشی زبان سے مرحمت فرما دیا۔ "بیٹھیے جناب سب ہندوستانی برابر
سب بھائی ہیں، سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق
کو بھول جائیے سب کو برابر کا سمجھیے، جا بیٹھیے تشریف رکھیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی"۔ ہم یہ کھرا جواب سن کر
ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہو گا یا غسل خانہ میں جگہ
ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک کھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔
ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن
گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک
چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے
انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔
یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں
کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم
نہیں وہ کون سا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفران نعمت کا الزام
بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف
نعروں سے اچھل پڑے معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا
تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیے جنھوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری
ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش
زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب
نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ جھنڈی
ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی دے
رہا ہوں مگر تمھارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔
ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کرارا کر دیا۔ "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور

دو گھنٹے سے لکڑ فائر مین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے باسیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔"

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد لکڑ فائر مین کوئلہ کی گٹھڑی لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی مشکل تمام ایک لعبیر تو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا "روکو۔ روکو، گارڈ صاحب رہ گئے"۔ گاڑی رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا — لائن کلیر" ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا — لے لیا تھا" — گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو" گاڑی میں سیٹی بجانا ہوا۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لیے کہ اس سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس"۔ وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے غصہ ہم پر اتارا اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر کرو کہ یہ گاڑی ہی ہے تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو"۔ ان کا یہ جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون سا تھا؟"

ڈرائیور: "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟"

اسٹیشن ماسٹر: "ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آ گئی سب ہم پر آتی۔"

ڈرائیور: "دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجیے، نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم ان ہی کے نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے، خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ

لندھن کا عنابی دربار

ملّا رموزی

اے میلاد کی غزنوں پہ رونے والو!

کیا نہ سُنا تم نے کہ مبلغ ایک دربار بڑی شان والا منعقد ہوا بیچ شہر لندھن کے خاص واسطے رسم تاجپوشی بادشاہ کے، مگر یہ کہ یہ ہے بے خبری تمھاری اے بے خبری حد سے گذری ہوئی بہ سبب اس کے کہ نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے بیچ ہندوستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔

پس بیچ جس قوم کے ہوں لکھے پڑھے کم وہ یا بھرتی ہوں گے بیچ فوج کے یا ملازمت کریں گے وہ ایسے ٹھیکیداروں کی کہ بنائی ہوئی عمارتیں ان کی نہیں زندہ رہتی ہیں بلکہ مبلغ ایک سال، مگر یہ کہ اصل بے وقوف ہیں وہ جو بنواتے ہیں عمارتیں ایسے ٹھیکیداروں بے ہنر اور بے ایمان سے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا پہنچا اوپر اس جگہ کے تو تشریف لائیں بیوی نمبر ۲ ہماری ساتھ مہربانی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے دراز کرے خدا عمر اور زندہ رستی آپ کی اور مسٹر لائڈ جارج شاگرد قدیم آپ کے کی، کیا ہو گیا ہے آپ کو کہ اوپر ٹھیکہ داروں اس زمانہ کے کے غصہ ہو رہے ہیں آپ دراں حالیکہ جانتے ہیں آپ کہ بیچ اس زمانہ ہذا کے نہیں ہوتے تعلیم یافتہ مکمل علم والے جبکہ بیچ زمانہ طالب علمی کے پڑھائے جاتے ہیں مضامین کثرت سے تا دماغ خراب ہو جائے طالب علم ہندوستانی کا، پس جو طلبا کہ بیچ ایک وقت کے پڑھتے ہیں دس مضامین اور رسولہ کتابیں تو کیا خاک باخبر اور صاحب کمال ہوں گے وہ بیچ ایک فن کے، پس جب یہ حال ہو نصاب تعلیم کا تو کیونکر محنتی اور جفاکش ہوں نوجوان اس زمانہ ہذا کے، راستہ بتا وے اللہ مسلمانوں کو اسے راستہ اجمیر شریف کا اگر نہیں ہوتی دلچسپی ان کو معاملوں سیاسی سے اور ترک کرا دے اللہ عادت حقہ نوشی کی مسلمانوں پنجاب کے سے اور محفوظ رکھے اللہ باشندوں چین اور ارکان جمعیتہ اقوام کو افیون اور گانجے سے کہ تحقیق محال ہے یہ کہ پھر بادشاہوں ہیلاسلاسی حبشہ کے، کہ تحقیق ہے یہ مقولہ حکیموں ایران کے کا واسطے البیس کے کہ کہا ہے ع

"جو کہ شمشیر مارتا ہے سکہ ساتھ نام اسکے کے پڑھتے ہیں"

پس واد دیجیے ترجمہ اس مصرعہ کے کی مجھ کو اے شوہر میرے! پھر فرمایا کہ تحقیق جو جھگڑا کہ ساتھ شیعوں اور سُنیوں لکھنؤ شریف کے ہوا ہے، غم کھائیے اوپر اس کے کہ تحقیق مسلمان رہ گئے ہیں اب بیچ دنیا کے خاص واسطے تباہی کے بہ سبب بخیری تعلیمات

عجیب بے وقوف وہ عورتیں کہ ہو کر کم آمدنی خرچ کرتی ہیں وہ زیادہ اور پر لباس قیمتی اپنے کے، بھی اور پر لباس قیمتی اولاد اپنی کے
بھی اور پر تفریح سینما کے، بھی اور پر کھانے لذیذ کے سبب بے خبر تنگدستی اور قرضداری سے پس مثل تو کان دھر باتیں حکمت کی، اے
عورت اگر ہے تو عقل کی رکھنے والی کہ جو قوم کہ جاہل رکھے گی وہ عورتوں اپنی کو اور آزادی دے گی وہ قبل تعلیم کے، اسے
آزادی نامعقول نمونہ خانہ تلاشی سے گی ایسے گھرانوں کی پولیس بغیر وارنٹ کے، کیونکہ موافق قول حکیم بزرجمہر کے رواج دنیا شادی رضی
طرفین کے مفید ہے اور دیسی لباس مفید ہے واسطے عورتوں ہندوستان کی کے، بھی اختیار کرنا گھریلو صنعت کا مفید ہے
بھی ادھوری تعلیم و تربیت کا ہونا ایسا ہی ہے گویا کھے تو کہ بیچ بخار سخت کے ہذیاں بک رہا ہے مریض بخار کا، بھی اسی طرح
فائدہ دیں گے قوم کو رسالے ادبی اردو کے کہ تحقیق بجز ہفوات واہیات کے نہیں ہوتا اصل ادب بیچ ان کے، مگر غزلیں
مہمل اور افسانے اخلاق کے جلانے والے، پس قسم ہے غزلیں رُلانے والی کی کہ حوالات میں بھیجے جائیں گے وہ شوہر
تمام کہ بے پروا رہتے ہیں وہ بیویاں اپنی سے بسبب ناراضی اپنی کے، بھی تکالیف پہنچاتے ہیں وہ بیویاں اپنی کو، بھی اسی طرح
موٹر ڈرائیور بنائے جائیں گے دن حشر کے وہ شوہر جو زیادہ رہتے ہیں بیچ گھر خسر اپنے کے، محفوظ رکھے اللہ ہر ہندوستانی
کو خضاب لاجواب اور سسرال اپنی سے اور پاک کرے اللہ اسے رہائی دے اللہ بندرشوں خلاف شرع سے عورتوں
اس زمانہ ہذا کی کہ، کیونکہ شریک ہونا مسلمانوں کا بیچ کانگریس کے بغیر بصیرت سیاسی کے برابر ہے نہ شریک ہونے ان کے
کے، دور رکھے اللہ ہم کو اور بیوی نمبر ایک ہماری کو اجلاسوں "سلے جس لے تو کونسلوں" کے سے اور گولیاں کونین کی کھلاتا
رہے اللہ تعالیٰ خشک واعظوں اور جاہل میلاد خوانوں کو کہ تحقیق وجود ان کا بخار اور مراق ہے: بیچ حق قوم مسلمانوں کی کے اور
شوق دے اللہ ہندو مسلمانوں، دنیا تمام کو اتحاد و اتفاق کا، بھی طاعون پھیلا دے اللہ بیچ لیڈروں کے تا کم ہو جائے مقدار
لیڈروں کی کہ کثرت لیڈروں کی سبب ہے تباہی قوم کا۔

پس بعد اس گفتگو کے مصروف ہو گئے ہم اور بیوی نمبر ۲ ہماری بیچ تصاویر دربار لندن کے، اب کیا کیا اشارے
ہمارے جھنڈو گئے؟

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

کنہیا لال کپور

(دورِ جدید کے شعراء کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ن ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرماجیت ورما، عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں)

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گزرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ـــ

غالب (مسکرا کر): بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد، اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ......

کنہیا لال کپور

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟

عبدالحی نگاہ: ؎

عشق۔۔نے ہاں ہاں تمھارے عشق نے
عشق نے سمجھے! تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمھارے۔۔ عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمھارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب (طنزاً): بہت خوب بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔ ؎

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب : واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن ارشد : اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص : اجی ارشد صاحب ہیں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگِ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ن ارشد : توبہ! توبہ! اتنی کسرِ نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ" عرض کیا ہے ؎

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمع درم و دام نکل جاتا ہے

ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ میرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے
ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے
تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں،
(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب : ارشد صاحب معاف کیجیے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

حفیظ احمد غیظ : یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن ارشد : مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے ؎

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر) : صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود اس کے اس شعر کا
نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن ارشد : اجی چھوڑیے اس طرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب
ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص : میری نظم کا عنوان ہے "عشق"۔ عرض کیا ہے ؎

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلہ جوالہ ——— عشق
عشق ہے پیغام موت!

غالب : بھئی یہ کیا مذاق ہے نظم پڑھیے مشاعرے میں نثر کا کیا کام

ڈاکٹر خالص (جھنجھلا کر) : تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب : میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم، نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص : مرزا صاحب! یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل، تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب : رفعت تخیل، کیا خوب، کیا پرواز ہے ؎

میں نے اک عاشق سے پوچھا

اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص (چڑ کر) : عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب : مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر : اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے اس کے علاوہ دور جدید کی روح، انقلاب، کشمکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جدوجہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکلنے کو ٹھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی سبب ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن ارشد : خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوع سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سایے تلے

آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں

ہم پہ کیا گذرے گی اجداد پہ کیا گذری ہے

یہ جس میں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ مہدی علی خاں: بہت خوب — "یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے" ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ مہدی علی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، سنیئے عرض کیا ہے ؎

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہ قاف کو
دیکھنا — آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا

یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ ن ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غبیط سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غبیط: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیراجی: تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غبیط: آپ کی مرضی، تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے "لگائی" ہے

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرو چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غبیط بار بار مرزا غالب کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ ن ارشد: حضرات! میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے): بکواس ہے۔

م۔ ن ارشد: اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیراجی : میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"

غالب : بینگن ؟

ہیراجی : بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بیچارہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں ؟

غالب : معاف کیجیے گا، نظم پڑھیے۔

ہیراجی : عرض کیا ہے ؎

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو
کرشن کنہیا ڈھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھرتہ کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ جدید شاعری ہیراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن ارشد : اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما : میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب (حیران ہوکر) : شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے ؟

بکرماجیت ورما : مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعرا نے انھیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب : جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پہ اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پہ نہاتے ہوئے ایک پوربیے کا دوسرے پوربیے سے کہنا "ارے یار، تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجئے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے۔ خودداری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ———

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ ——— پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے ——— ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے ——— پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

دس بجے ——— صاحب بہادر، لیڈر۔

بارہ بجے ——— منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے، تو اب صرف دو منٹ پہ آ جائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ "کبھی آج ہم نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہو گا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتے کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ۔ واہ اس نہانے میں کیا مزہ ہو گا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا، میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پہ کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے یہ بھی غلط

سمجھنا چاہئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے۔ جس نے اُن کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی کی ٹیڑھی ہوئی نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا "ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ جونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اُسے ضرور نہانا چاہئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پر گئی اور نہا کر گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے، اور بیویاں بیوائیں بن گئیں، اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں، "اسے میں نہ دوں گا، اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے!"

نتیجہ:۔ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سولہ آنے درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہئے مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے۔ بغیر پروگرام کے آجکل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۱۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں:۔

"ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ............ جو غریب شخص ملبوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا ـــــــــــ

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا، کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "بابوجی، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہائیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" میں قلم چھوڑ میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تزکِ نادری عرف سیاحت نامہ ہند

رقم زدہ: اعلیٰحضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ سابق ابن شمشیر ابن شمشیر سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ

شفیق الرحمٰن

پیش لفظ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مؤرخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رُخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے یعنی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے، دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں اور قتلِ عام؟ قتلِ عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لی ہیں مثلاً شامتِ اعمالِ ما باصورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا، اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رُخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والیِ کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والیِ کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پروپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اُگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت بپھرے دریا میں آسئینہ پر عبور کرتے تھے۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی۔ بمشکل ہمیں باہر نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوئے۔ تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی پر قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند اُلّو دکھائی دیے۔ یہاں کا اُلّو ایرانی اُلّو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ اُلّوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہولیا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا لیتا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بلاگستاخی کہتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ اُلّو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو اُلّو شناس کے لقب سے نوازا اور اسے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ نمائشی رہی۔ بہر ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جنھوں نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر عبرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاءاللہ نادر شاہی حکم، نادری تہ، نادری موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والیِ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع فرما دیا۔

شہباز خاں اُلّو شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو اُلّو شناس بھی چست ہو گیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی انھیں دیکھا تھا نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:۔

براہِ افغانستان : خیبر ایجنسی ——— پشاور ——— لاہور ——— پانی پت

براہِ بلوچستان : سمہ سٹہ ——— بھٹنڈہ ——— دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ ——— چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ تمام اہلِ شہر فصیل تک بلکہ درۂ خیبر تک چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے

تھے۔ والیِ کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا لیکن ہم جانتے
تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے، یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر
ہم اہلِ ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں تب
اس کا جانا زیادہ موزوں ہو گا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے از راہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی
مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درّۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح
بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرندہ، چرندہ، درندہ انسان بلکہ نباتات و
جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوندِ باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ دور آ کر سعادتِ آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہو گا
کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دو سو مُہر طلائی نذر اور ایک مرصع گھوڑا بطور پیش کش نذرانا۔ ہم نے بھی ازراہِ مروت
ایک دونیم عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگانِ درگاہ تو بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے
رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے، نہایت نفاست پسند اور ربور زوافسم کا چوپایہ ہے، کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے
بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا، کچھ اور چیز تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سیّد بایزید ابنِ یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے
متلاشی ہیں۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہِ تلطف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا، وہ بے ہوش ہو گیا۔
اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے، لخلخہ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفوچکر
ہوا۔ ہم نے اہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوا دے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُرشوکت فیل جسم جانور
کا۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں
کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی فیل بان
علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

لطیفہ

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ
کی گدی کی پیشکش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں
کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر

مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے۔ گھمسان کا رن پڑا، گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کنی کترا کر گذر جاتیں، گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروزپور۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ اٹوشناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد دقت وصول کیا۔ شام کو اٹوشناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درۂ خیبر سے آتے ہیں انھیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے، ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے، سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا، ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچی بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ۔ کسی طبلچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذوق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ! سنا ہے کہ آپ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے۔ اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر

پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است۔ اچھا بھی چلو دلی دور است، بس!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (حسب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ ایسا ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات بے حد ذہین ہیں، ایک پری جبیں جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا، دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا، تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا۔ اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاستہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلّی آ دھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر، ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی، لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے، ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے، کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں، دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دوڑ سمندِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے

مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں سوائے بادشاہِ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہِ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا مان گیا۔ ہمارا فرزند علی قلی خاں باوجود بیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے' اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مُصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینان گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے، دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا، ہمیں گھیر لیا گیا۔ ہمارے دستخط لیے گئے' ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا۔ ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش بایان لے جانے کے لیے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔ ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی "قلی! قلی!" کیا دیکھتے ہیں کہ پسرِ خلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

"تم قلی ہو ——؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں —— بالکل ——" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حسِ مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی: "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں۔" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب نے عُرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے۔" وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرا لوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! ابا مجھے گھور رہے ہیں۔" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے' بازپرس کی تو بولا سرکس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا' چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا۔" ہم نے گرج کر کہا، "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر۔"

"ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں ——" اس نے ایسے عدم تعاون کے انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سُنی تھیں چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبرداخلاں کو وقت پر سوجھتی نہیں) عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا' وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے ایگری کلچر سُنا ہو گا وہ البتہ مشہور ہے ہم مُصر ہوئے تو

کہنے لگا آپ سُنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے، ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی دہلی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپّے چپّے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بعض بڑا کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے، ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا چُلّو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکّامِ شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلّو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمّل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے چنانچہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا "اباجان! معاف فرمائیے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے ـــــ"

ہمیں سخت غصہ آیا۔ یہ نئی پود ہمیں آداب سکھاتی ہے، یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ـــــ جب سے دلّی آیا ہے ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے ـــــ کیا ہے تیرے منہ میں ـــــ؟"

"پان کھا رہا ہوں ـــــ کسی نے دیا تھا ـــــ" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی سرکس والی لڑکی تو نہیں ـــــ؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے ـــــ" ہم نے فرمایا۔

"اباجان اس کی ٹھوڑی پر جو خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آجکل کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں ـــــ"

"اباجان محبت بُری چیز ہے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"اباجان! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ـــــ اس سے ـــــ"

"خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ ـــــ"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے، سمجھا؟"

"سمجھ گیا ـــــ اباجان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے؟"

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے؟

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحب حضوری حضرت سردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسب توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی :

۱۔ درۂ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے' وہاں سے دلی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں، سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے' غار ہائے الورا' الور میں' جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں، مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے' وغیرہ وغیرہ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں' دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں' کیا یاد کرے گا۔ لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایاں ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی

باتیں سُننے کے عادی نہیں ہیں، اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سُنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والد بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی: "شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں، ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں۔" علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تمہارے کنبے کے متعلق ابھی پوچھ رہی تھیں تم مغل ہو؟"

"مغل وغیرہ کا پتہ نہیں، ویسے ہم ابن شمشیر ابن شمشیر ہوتے ہیں۔" علی قلی بولا۔

"بہر حال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے۔"

"چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں۔" علی قلی نے بھولپن سے کہا۔ "وہ گیا چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہ وہاں دیکھ لینا۔"

"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آجایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ آبا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں۔"

"تجویز تو بہر حال اچھی ہے۔" وہ ناخلف بولا۔ "لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"

علی قلی بگڑنے لگا: "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں؟"

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے۔ تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم بقیہ گفتگو سُنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بیچارے علی قلی کو وہ نگنی کا ناچ نچائے گی کہ نرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا، اس نے بڑے پتے کی بات کہی: یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں، سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور رشام کو اس کے سانس میں سے رنگیں کی بو ہوتی ہے جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروب آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں خصوصاً چند گھونٹ بادۂ رنگین چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بوٹا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت آزار نے کے سلسلے میں بنایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور زنہر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی صبح کی

روشنی میں جب علی غلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے راز ہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا ہوا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دلی کا رخ ہی نہ کرتا تھا بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔
شیخ بوٹا نجر پوری کے ایسے نسخے بھی استعمال کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سید برادران (حسین علی خاں اور نہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے نفوذ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز ہم نے ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گران مملکتِ ہند" لکھا تھا۔ اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انھیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ یہی ایک جوڑی بادشاہ گر رہ گئی ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ ان ہی کے دم سے تو دلی میں رونق ہے۔ للہ انھیں چھوڑ جائیے کہ اگر البتہ حاضر ہیں:
"وہ تو ہم ملنا او نے خود لے سکتے ہیں ــــ" ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا، دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آ رہا ہے، آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے۔ یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا، معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھٹیاروں کی اوپن تراشا کرتا آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے، ملک اور قوم کی خدمت کر کے اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بھٹیاریوں کی اوپن تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہو گیا۔ ایک روز شومئی قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا جو خاک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی، گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر جا پہنچے، یہیں کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا، رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا، شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا، لاٹھی چارج ہوتے ہی خود ہی لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے

لاکھ درجے بہتر تھا۔ چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا۔ پہلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔ خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے۔ زمانہ سازخاں معروض ہوا کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ بردلتاری سا معلوم ہوتا ہے کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں رپے پیسے والا ہے۔ یہ تو عجب جاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے۔ ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصّہ لینا

ان دنوں الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلو شناس معروض ہوا کہ ہم دلّی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں۔ جب ہم نے اس کو بُرا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا۔ تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا۔ چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا۔ دو کمال درجہ ضدی نکلے۔ ایک کو زد و کوب کرایا تو مانا۔ دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی۔ حُقّہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی۔ لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا۔ رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہردلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو نادم پشیمان ہوئے۔ افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دلّی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

اُلو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ

الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا، لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں، آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجیے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباء اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بشیر اسمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا، یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً اتر گیا پتہ نہیں کیا بات ہے، ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا لیکن میرشا کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ الٹو شناس بھاگا بھاگا آیا، بولا محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات ادھر ادھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے، ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم نے دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہوا۔

ہندی وزراء سے شکر رنجی

الٹو شناس اور محمد شاہ کے وزراء کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزراء کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ الٹو شناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے، بولا اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوا لی جائے۔ ہم مان گئے۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابنِ شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے، دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں، اس نے انگریزی حروف میں محض "ایم۔ ایس رنگیلا" لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا۔ معروض ہوا کہ محاسبِ اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے، پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

"ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟" ہم نے پوچھا۔

"وزیرستان سے!" وہ بولا۔

"اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟"

"یہ یونہی ہے۔"

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خاں صاحب گیرہ وار کی شادی پر گئے، دولہا کی عجب درگت بنی ہوئی تھی۔ پہلے تو اسے برا بھلا کہتی رہیں پھر زدو کوب

کہنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا، سوچا کہ ان بن ہوگئی ہے لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔
نکاح سے قبل ہم نے دولھا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں، کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آ گئے۔ جب دولھا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر "پھنس گیا" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔
تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصّوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اُڑا دی تھی کہ بانو خاں کا خواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور ہی رکھتے، ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔
خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دورانِ گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اُف، اُوئی، اللہ، توبہ، ہائے، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اُٹھتے، بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسنے دیے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا۔ پھر قابل منگا کر وہ تمام کانفیڈینشل خطوط دکھائے جو ہندی امرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی)

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انھیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلّی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں، جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اتروانے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدّت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے

کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، افیمت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے —— خاتون موصوف کو
گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا۔ دربار میں اس نے "نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی" والی
رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ
کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور
شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ
وقت کزنوں کے ساتھ گذارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس
ہے اور باقی چیزیں آ ہی جاتی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے۔ اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے ؎

ساٹھویں سال میں قدم آیا | زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی | غمزہ و ناز و دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پہ ہوا ہے، دیر تک آئینے کے
سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسب معمول
نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آ کر اسے دُرّے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی دُرّانی ہے،
چنانچہ اسے معاف کیا اور قیافہ شناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بستہ معروض ہوا کہ روئے پُر نور پر وہ ہیبت جلال طاری ہے کہ
نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتون موصوف میں ضرورت
سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرح حسینہ کو اپنے
ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دور دور رہنے لگے۔ خاتون مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک
جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!

جامعۂ فرقانی

آج صبح ملّا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعۂ فرقانی کا صدر ہے آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ
ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان
طلباء کو طفیلیے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے، کورس پورا کرنے

تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات، ابوالفضائل، ابوالفضیلت عموماً سرکاری کاموں، جامعہ کے معلمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات بنے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ اس ملک میں شکل صورت نہیں ہوتی، صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے والوں کے علاوہ ایک کثیر کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سند پار بھیج دیں تاکہ وہ عرب واپس و سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے تبھی اس ملک میں بیچاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مُلّا فرمان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:

"حضرات! کبھی روز سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات و الاصفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاجِ بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دلّی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب خان صاحب بین الاقوامی سطح پہ ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ افغانی صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں۔ شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل ——— خیر جانے دیجیے ——— ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں لیکن ہماری شامتِ اعمال ——— معاف کیجیے ——— اچھا تو حضرات ——— مولانا نادر شاہ صاحب ———"

ہم کو اس بدتمیز مُلّا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہا۔ یہ تو کبھی مولانا! ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔ ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا:

"پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل مُلّا ایف اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اوّل تو ہمیں آپ حضرات کی ربوں صحت پر تعجب ہوتا ہے، رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گذار رہا تھا، دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گذر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے۔

حضرات واطفال! ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا انھیں زد و کوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گذری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر، آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا، کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے، یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے! پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا، وہ لوگ خوب سر دھنتے اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں، گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں، غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا، ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے، غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا، رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی ملا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی۔ ہم دیر تک بولتے رہے، ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا، اچانک چند بدتمیز طلبا کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

ملا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا "نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے ———"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے سے کھسر پھسر ہونے لگی "کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں ———" ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے ———" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا "ہم خود شہنشاہ ہیں"۔

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں ——— خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں" ایک برخوردار بولے۔

"ہاں!" ہم نے فرمایا "جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے"

"صاف صاف بتائیے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب ———"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا "ہم شہباز خاں اُلّو شناس کی بائیں جانب ہیں اور ملا فرقان اللہ کی دائیں جانب ———"

"کیا آپ ایران سے آئے ہیں ———؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے "ہاں ہاں برخوردار! اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعۂ معاش کیا تھا ———؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھایا تھا لیکن اس سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اُترنا شروع ہوا۔ میز پر ہمارا مکا اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ ملا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ بھاگنے لگے۔

نوازنا ملا فرقان اللہ کو

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی ملا کی شرارت ہے، پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی کٹی تقریر کروانا پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ ملائی کا ڈھونگ ہے، خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم

بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خورد و نوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ مُلّا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کنبہ کمہار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گذشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گذارنا پڑیں چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ افواہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقرا کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں اُتو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکیں۔ مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گذر رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر، شلجم وغیرہ پھینکے گئے، ایسی کئی وارداتوں کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپِ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں، یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دُور سے "نادر شاہ مُردہ باد" کے نعرے سُنائی دیے، اسی وقت غیظ و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کرو۔ یہ تھا وہ "قتلِ عام" ـــ ہم چاہتے تو باقاعدہ تلوار بھی استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی۔ ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زد و کوب کیا تھا اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے ـــ کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی ـــ

یہ شعر ہم نے پہلے سُن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع ـــ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی ـــ سُنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پُرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پُرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی، سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ بات پھر

جاگتے رہے تھے، گرمی زیادہ تھی، ہمارا دل پسیج اٹھا، بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چمپت ہوئے۔ خیر! اب تلوار میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرادی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہوا ہے بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص، یعنی کرائیں جو اُمرا کے سبب ہو۔ پھر سوچا اہلِ دلّی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں، تیمور کا قتلِ عام تین دن رات تک ہوتا رہا تھا، بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے، ایک آدھ نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے، ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تنگ چکے تھے، مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطف انھیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا، وہ فوراً بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاءاللہ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے، مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا، اچانک ہم نے اپنے اُوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا، ہمارا دم گھٹنے لگا، گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے، ہڑبڑا کر اٹھے۔ دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر سعادتِ دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

واپسی کا قصد

ایک کباڑیئے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ پہن سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلّی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خراٹے لیتے ہیں، صبح کی چائے اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اُٹھتے۔ قیلولے کی عادت نتیجہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے، ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا سلونا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آبا و اجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تفریح اور قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ سیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ہمارا دلی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے از راہِ مروت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس ملک میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپ تیز رو پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے۔ تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والیٔ کابل سے نجات

والیٔ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے سب لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹ پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے، البتہ کچھ پوستینیں، دُنبے یا گلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والیٔ کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونق آدمی ہے۔ دنیا کی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لو لگانی چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بوٹا شجرپوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستعفی ہو کر تارک الدنیا بنے بیٹھے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا۔ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب وہ ہند گیا تو کرکری ہوگی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر از راہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باکا، دو سو مقامی مینڈھے، دو نبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیموں نچوڑ سے رہائی پائی۔

ختم شد

تتمہ

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں ایسی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیتِ ایزدی ہرگز نہ تھی، اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور راتوں رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ———

ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھیے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور، ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

سعادت حسن منٹو

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی۔ یہی جی میں آیا کہ گھر سے نکل، ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل ——— باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا پر جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا۔ بجلی کے کھمبے پر دیکھا۔ پرنالے پر دیکھا، شہ نشین پر دیکھا، چھجے پر دیکھا۔ غرضکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد ——— یہ لکڑیوں کی ٹال ہے ——— پاکستان زندہ باد، نوٹا فٹ مہاجر ہیئر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد، یہاں تالے مرمت کیے جاتے ہیں ——— پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے ——— پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال ——— پاکستان زندہ باد، الحمد للہ کہ یہ دکان سید انوار حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ——— پاکستان زندہ باد ——— یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے...... یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجیے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی، میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا، "یہ الٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا، "دیکھتے نہیں ہو؟"

میں نے دیکھا ——— پنکھے کا رُخ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی ——— میں نے زور کا نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور لسی پیے بغیر آگے چل دیا۔

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں ہی میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے، یہ پوری والا کدھر سے آ گیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو لیکن بورڈ وہی تھا، سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا، آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا، "کیا سوچ رہے ہیں آپ بابوجی! گرما گرم پوریاں ہیں۔"

میں نے کہا، "لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو یہاں جوتوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی ——"

پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا۔ "جوتوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چھپنے کے بجائے وہ بڑی ترتیب سے انھیں ادھر ادھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا —— "یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔"

میں نے قدم تیز کر دیے۔

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اُردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔

تحریر خوشخط تھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر "آرائش" ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلق سامان ہو گا ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں "ماحضر" لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام "پاپوش یانہ" تھا یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا "زمہریر"۔ ضرور قلفیوں کی دکان ہو گی۔

میں نے خوش ہو کر "پاکستان زندہ باد" کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ٹھیلہ گاڑی دیکھی۔ پوچھا "یہ کیا ہے؟" جواب ملا "ہوٹل —— چلتا پھرتا ہوٹل تھا۔ جہاں نان پکانے کے لیے انگیٹھی اور توا موجود، چار سالن تیار، شامی کباب تلنے کے لیے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے برف، لیمونیڈ کی بوتلیں، دہی کا کونڈا، لیموں نچوڑنے کا کھٹکا، گلاس پلیٹیں غرضکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گما دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا "کیا ہوا! بچہ ہے۔ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ہی تو ہوتا ہے ایک روپے کا نوٹ، کہیں گر پڑا ہو گا۔ خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔"

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے الجھ گیا اور کہنے لگا "تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے آج کل ——" یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا۔ "روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟"

میں نے جواب دیا: "جی ہاں! بہت بُری طرح پیٹ رہا تھا بیچارے کو۔"

"بیچارہ اس کا اپنا لڑکا ہے۔"

"کیا کہا؟"

"باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے۔ دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔" اور قدم بڑھا دیے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لیے چلّا رہے ہیں اور اندھا دُھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سُننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ "تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں ——— دلی میں جوتا چل گیا ——— لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا ——— پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ "آج کا تازہ "نوائے صبح" ——— آج کا تازہ "ابوالوقت" ——— آج کا تازہ "سنہرا پاکستان"۔"

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گذر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ، سنجیدہ اور متین صورت، ایک ہاتھ میں تھیلا تھا، دوسرے میں اخباروں کے بنڈل۔ میں نے پوچھا:

"کیا آپ اخبار بیچتی ہیں؟"

مختصر جواب ملا: "جی ہاں!"

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا ایک غول کا غول نمودار ہوا۔ بھونک رہے تھے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے، پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن سی سی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں بھنکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں ان کا خیال تو رکھنا چاہیے۔ جو پناہ گیر ہیں ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں ——— اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے قدم بڑھانے شروع کیے۔

میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی تین رنگوں میں، ایکٹرس کا جسم نیم عریاں تھا۔ نیچے یہ عبارت درج تھی:

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اوپر کی تصویر سے ہو سکتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

دوسرا اخبار کھولا۔ ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی۔ مضمون یہ تھا:

ہم ایک موٹر خریدیں گے

احمد ندیم قاسمی

کہتے ہیں موٹر سازی کے کارخانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہو رہا ہوگا۔ ہماری قسمت میں تو وہی کھڑکھڑاتے ہوئے پہیوں والی بے ڈھنگی سی ٹمٹم ہی لکھی ہے۔ جس پر سوار ہو کر انسان کی قوتِ خودی اور غرورِ نفس کو کچھ اس طرح ٹھیس پہنچتی ہے کہ جی میں آتا ہے ابھی جا کر موٹر میں سوار ہو جائیں۔ اور ٹریفک کے اصولوں سے بے پروا ہو کر شکرموں سے ٹکراتے، یکوں کو ٹھکراتے، سائیکلوں کو کچلتے ہنکاتو کو ڈھاتے پیدل چلنے والوں کو پیستے ہوئے کہیں نکل جائیں ——— بہت دور، جہاں ٹمٹموں کا نشان تک نہ ملے۔ جہاں موٹر ہی موٹر ہوں نرمیلے ہارنوں والے۔ شیشے کے بنے موٹر ٹمٹم پر بیٹھتے ہی اکثر اس قسم کے خیالات ہمارے دل میں آئے۔ اور کئی دفعہ ہم نے اس خرِدجال پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو موٹروں پر فخر کرتے ہوئے محسوس کیا۔ لیکن پہیے کی اچانک چیخ یا ٹٹو کے اچانک بیٹھ جانے سے اکثر ہمارے یہ خواب مادی دنیا کے شور و شغب میں کھو جاتے ہیں، اور ہم کوچبان پر دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن ارادہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے۔ ایسا موٹر جس میں ڈرائیور کی سیٹ عام سطح سے ڈیڑھ گز اونچی ہوگی۔ تاکہ دنیا کو معلوم تو ہو سکے کہ مشین کے ناخدا کہاں تشریف فرما ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر ایرا غیرا اال روڈ پر اڑتا پھرتا ہے۔

موٹر خریدکر پہلے ہم اپنی اہلیہ محترمہ کو مبارکباد دیں گے۔ ان کے لئے موٹر کی پچھلی سیٹ ریزرو کر دی جائے گی۔ شاید اس طرح ان کی پیشانی کی شکنیں کم ہو جائیں گی اور ہمیں کھانا وقت پر مل جایا کرے گا ——— مابعد شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا جائے گا کہ آج جناب ...... صاحب نے موٹر خرید لیا ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ منٹ دو منٹ کے بعد اپنے اردگرد دیکھتا جائے۔ ورنہ اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو صاحب موصوف اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کیونکہ مالک موٹر کو حق حاصل ہے کہ وہ کائنات کے جس حصے میں چاہے موٹر چلائے۔

اس کے بعد پٹرول میں عرق گلاب اور روح کیوڑہ ملا کر انجن میں ڈالا جائے گا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیگم کو ریشم کی رسی سے باندھ کر بٹھا دیا جائے گا۔ کیونکہ رفتار کی تیزی یا کسی حادثہ سے ان کے باہر جا پڑنے کا خطرہ ہوگا۔ ہم خود چلکہ تھام کر تیج گھما دیں گے اور موٹر کا پنجر چیختا ہوا آگے بڑھے گا۔ آخر یہ خاموش خاموش شرمیلے شرمیلے انجنوں والے موٹر کس کام کے ہیں۔ چپکے سے کھسک جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ کوئی صاحب ادھر سے موٹر پر سوار نکل گئے۔ ہمارا موٹر چیختا چلاتا، دھاڑتا اور ٹھنکاتا ہوا

لہ اس مضمون میں موٹر کا لفظ مصلحتاً صیغۂ مذکر میں استعمال ہوا ہے۔

چلے گا۔ سڑک پر یقیناً تماشائیوں اور اہلِ ذوق حضرات کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں گے۔ ہم ہر ایک سے سلام لیتے جائیں گے۔ مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر۔ ہارن بجا بجا کر۔ اور پھر کسی پینٹر کی دوکان پر جا کر رُک جائیں گے۔ اور وہاں سے اس مضمون کے دو تختے بنوا کر موٹر کے آگے پیچھے لٹکا دیں گے:

"جو صاحب موٹر میں سوار ہونا چاہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں"

اس طرح سیاسی دنیا کی عظیم الشان تحریک سوشلزم کا پرچار بھی ہوتا رہے گا اور آنے والی نسلیں بھی ہمیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا کریں گی۔

جہاں "کیپ لیفٹ" (بائیں جانب رہو) لکھا ہوگا، وہاں ہم موٹر کو دائیں طرف سے لے جائیں گے۔ جہاں "موٹر ند سٹے" لکھا ہوگا وہاں "ویٹ دے" سے جائیں گے۔ جہاں "نو پارکنگ ہیر" کا تختہ لٹک رہا ہوگا۔ وہیں موٹر کھڑا کریں گے۔ آخر دو آنے کی لکڑی کے ایک معمولی سے تختے کے دو الفاظ سے ڈر کر ہمارا چار ہزار روپے والا موٹر کیسے رک سکے گا؟ جہاں پانچ میل رفتار کا حکم ہوگا وہاں پچاس میل پر چھوڑ دیں گے۔ جہاں "آہستہ چلاؤ" کا حکم ہوگا وہاں ساٹھ ستر۔ اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار پر چلائیں گے۔ اوّل تو انشاء اللہ ہم اسے الٹنے ہی نہ دیں گے۔ اور اگر الٹ بھی گیا تو پھر سیدھا ہو سکتا ہے۔

یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ موٹر گیرج میں کیوں رکھے جاتے ہیں۔ کیا ان کے مالکوں کو ان کی یاد نہیں ستاتی؟ ہم تو موٹر کو اپنے پاس سے ایک پل کے لئے بھی جدا کرنا گوارا نہ کر سکیں گے۔ کھاٹ کو اس کے انجن سے باندھ کر سو رہیں گے۔ ورنہ اس کے اندر ہی پڑ رہنے میں کیا حرج ہے۔

جو لوگ آج کل ہمیں ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہماری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ ہمارے موٹر کو شہر کے دیگر موٹروں میں ایک امتیازِ خصوصی حاصل ہوگا۔ اور اس طرح ہم جدھر جائیں گے ہمارے لئے راستہ صاف ہوگا۔ ٹریفک کے اصول ہماری مرضی کے تابع ہوں گے۔ قوت دنیا کی سب سے بڑی حکمران ہے۔ کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا۔ ایک دفعہ ایک مسافر ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک شیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ آتے ہی کم بخت نے مسافر کی گردن دبوچ لی اور کہنے لگا "بتا شیر انڈے دیتا ہے یا بچے دیتا ہے؟" مسافر جانتا تھا کہ ہز میجسٹی کنگ آف جنگل اپنی قوت کے بل بوتے پر اس کی معلومات کا امتحان لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر میرے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جس سے بادشاہ سلامت کی بادشاہت کو ٹھیس پہنچی تو دم بھر میں انجر پنجر بکھر کر رہ جائے گا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "حضور شیر مرضی کا مالک ہے۔ کبھی انڈے دے دیتا ہے اور کبھی بچے دے دیتا ہے۔" اور اس طرح اس کا چھٹکارا ہوا۔ موٹر خرید لیں تو ہماری مثال اسی شیر کی سی ہوگی۔

موٹروں کا طوفان مہذب دنیا کی طرف سے ہم غیر مہذب کالے لوگوں کی طرف امڈا چلا آ رہا ہے۔ کہتے ہیں قیامت کے دن داورِ حشر کے سامنے ہر شخص اپنے اپنے موٹر میں سوار ہو کر حاضر ہوگا۔ اس طرح پروردگارِ دو جہاں کو لاتعداد گیرج بنوانے پڑیں گے۔ جس نے "کن" سے دو عالم کی تخلیق فرما دی۔ اس کے آگے دس بارہ کروڑ سنگل گیرج بنانے میں کیا دیر لگے گی۔ لیکن بیچارے فرشتوں پر جو آفت آئے گی اس کا تصور کرتے ہی دماغ میں موٹر چلنے لگتے ہیں۔

آہ ——— موٹر ——— موٹر! اکثر چاندنی راتوں میں جب فضائے خموش میں ہر طرف قدرت کی دلفریب نیرنگیاں بے نقاب ہو کر رقص کرتی ہیں۔ جب کائنات سکوت کے پردوں میں چھپ کر مستقبل کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جب چوراہوں سے ٹریفک کے سنتری چلے جاتے ہیں۔ جب

مال روڈ پر اکّے دُکّے موڑ لہراتے ہوئے سامنے سنہرے مدھم غباروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ جب کسی تنگ گلی میں بے روزگار گریجوایٹ میونسپل کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں بیٹھ کر کسی بیمہ کمپنی کی ایجنٹی کے لئے درخواستیں لکھا کرتے ہیں۔ جب قدرت کے "افکار و حوادث" اور "معاملات" کے متفکر یعنی کالجوں کے برخود غلط نوجوان خواب میں کریموں اور پوڈروں کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ اس وقت اکثر ہم خیال ہی خیال میں موٹر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا موٹر زمین کو چھوئے بغیر تھرکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم چلے جاتے ہیں —— دور دھندلے افق کے پار —— لاانتہا وسعتوں میں —— اور پھر بوقلموں فضاؤں کو چیرتے —— تاروں کو چومتے ۔ کہکشاں کی پکی سڑک پر تیرنے لگتے ہیں۔ نورانی سنتری ہمیں آگے سے ہٹ ہٹ کر راستہ دیتے جاتے ہیں۔ کائنات سنہرا غبار بن کر ہمارے موٹر کے پہیوں سے لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے ہم اُڑتے جاتے ہیں، بڑھتے جاتے ہیں، اور آخر چاند کے مرمریں قرص سے ٹکرا جاتے ہیں ——! اور جب ہماری آنکھ کھلتی ہے تو بیگم ہمیں فرش پر سے اٹھا کر کھاٹ پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہوتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں "ہمارے موٹر کو نقصان تو نہیں پہنچا؟" اور جواب ملتا ہے کہ "آج آٹا ختم ہو گیا ہے میری بالیاں گرو رکھ کر کچھ پیسے لے آؤ نکھٹو"۔ —— آہ —— قدر ناشناس دنیا۔ تیرے پاس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں، تیری لٹمٹوں کو آگ لگے۔ تیرے یکے جل جائیں، تیری سائیکلیں پنچر ہو جائیں، تیری ریلیں پچک جائیں، تیرے ہوائی جہاز زمین سے چمٹ جائیں تیرے پاس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں —— ایک موٹر —— یا ایک موٹر کا نمونہ —— یا ایک موٹر کا پنجر —— جو صرف رینگ سکتا ہو —— جو صرف —— جو صرف کھڑا رہ سکتا ہو —— ایک موٹر —— بس ایک موٹر!

لیکن پھر بھی ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے اور جس طرح پہلے بیان کر دیا گیا ہے ہم اُسے اسّی نوّے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلایا کریں گے۔ اگر وہ کبھی اُلٹ کر ٹوٹ گیا تو ہمارے احباب کا یہ فرض ہوگا۔ کہ اس کے پُرزے لندن کے عجائب گھر میں لے جائیں جن کے پاس سنگِ مرمر کے ایک تختہ پر موٹر کی شکل بنا کر نیچے یہ حروف کندہ کرائیں:-

"ایک ایسے گریجویٹ کے موٹر کے پُرزے جس نے اپنے موٹر کے غرورِ نفس کی
حفاظت کے لئے ٹریفک کے اصولوں کی مخالفت کی اور آخر اسی راہ میں
شہید ہو کر حیاتِ جاودانی پا گیا۔ خدا کرے اسے آئندہ زندگی میں ایک موٹر نصیب ہو!"

دماغ چاٹنے والے

ابراہیم جلیس

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہہ دیتا ہوں کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔۔۔۔ یہ جملہ تو بالکل رسمی ہے۔ اس کے معنی و مفہوم اور اس کی اہمیت پر غور کئے بغیر خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس جملے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور اس لئے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی ۔۔۔۔ ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں کہ اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں کہ صاحبان ۔۔۔ میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی، اور نہ اب ہوئی ہے، اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے خواستگار ہوں کہ مجھے معاف کیجئے اور خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیئے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شائد میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں، تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت ہی نہیں ہے جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک (پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر) کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی ۔۔۔۔ اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرأت کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے، جتنی کہ اخلاقی بزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لئے دل گردے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تن آسان بھی ہوں۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے تکلے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر از راہِ انصاف آپ فرمایئے کہ سید شاہ ضیاءالحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟

مجھے اپنے دوست محمد ریاض خاں پر بے حد غصہ آتا ہے کہ جس نے سید شاہ ضیاءالحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاءالحسن سے کسی شخص کا تعارف ہوگا وہ دن اس شخص کے لئے یقیناً ایک منحوس دن ہوگا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز

"میاں تم کب آئے ؟"

میں جواب دیتا ہوں "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں۔ میں تو پانچ سال سے کسی مہینے سفر پر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں "اوہ، وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں" میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں" وہ مصر ہو جاتے ہیں "ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بمبئی میں؟"

اب میں اُن سے کس طرح بحث کروں۔ اس لئے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں "اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں) وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں "ہاں میں نے کہا تھا نا۔ اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں" جی تو چاہتا ہے کہہ دوں، جھک مار رہا ہوں۔ مگر چونکہ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لئے جواب دیتا ہوں "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں" فرماتے ہیں "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا، آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟" ایسے سوال کے بعد اپنا اور اُن کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے۔ مگر انسان ایک بندۂ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے پینشنکار ہیں۔ مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے بھی ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو ادھر کئے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے ٹھیک برابر دماغ چاٹتے رہتے ہیں مگر پرسوں میں نے انہیں بڑا چکمہ دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پکارا

"میاں۔ ارے ٹھہرو۔ ٹھہرو بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کئے اور نامپلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادر طریقت ہمارے ایک پڑوسی بزرگ بھی محکمہ مالگذاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی۔ اسی لئے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گزارتے ہیں۔ روزانہ رات کو کھانے کے بعد آ جاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں ـــ

"سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے؟"

میں کوئی حافظِ اخبار تو نہیں ہوں۔ اس لئے عمداً اخبار اُن کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ مگر وہ اخبار چوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں، اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تو سناؤ۔ انسان ہندوستان پر کب بلّہ بولنے والا ہے؟"

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمّل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ نہ تو اسٹالن کو باؤلے کتّے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہئے۔ میرا جان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا فالتو ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے۔ حضرت مجھے سونے دیجئے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے ناجائز فائدہ تو نہ اٹھایئے۔

ضیاء الحسن کے ایک چوتھے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں ہر فن مولا کہتے ہیں۔ مگر انہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر، بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصور، بہت اچھے گویے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ بلبل ترنگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے مرض" میں گرفتار ہیں۔ جب کبھی میں انہیں نظر آ جاتا ہوں تو بس پکڑ کر زبردستی موٹر میں بٹھا سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چائے سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر پہلا ہی سگریٹ جلاتا ہوں کہ وہ اپنی تازہ نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ واہ کہنے لگتا ہوں۔ پندرہ بیس تازہ منظومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں۔ رومانوی افسانے، سیاسی افسانے، تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔

دو بج گئے۔ اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیرِ بحث آ جاتی ہے کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کھچے مقالے، تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے بھیجئے اب پانچ بج گئے۔ شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ نثر نظم کے سے وزنی پروگراموں کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس لئے لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا آیا۔ کھانے کھاتے ٹیبل ٹاک ہوتی ہے۔ نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ مگر اس پر بھی مصوری کے شہکار دکھانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ گلستان ہے، یہ نسیم جونیئر کی تصویر ہے"

"یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔ جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے"

"میری یہ تینید و سے کی تصویر ——— اب کے سال بمبئی کی آرٹ اگزبیشن میں بھیجی جانے والی ہے"

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ دو بجے سے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر رات کے پانچ بج گئے۔ اب بلبل ترنگ پر بھیرویں بجانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب میں کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ ایک مسجد سے موذن کی اذان گونجی۔ فرمایا "ارے دیکھا تم نے۔ آرٹسٹ کو گردشِ شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اچھا، ارے تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کر دوں"

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ ——— مگر نہ تو میں سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں، کیونکہ میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے!

اب مجھے یہ کرنا چاہئے کہ جب بھی مجھے دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں۔ تاکہ پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے گا تو پھر گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو گی۔

ضیاء الحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بہت بچپن سے میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے بابا کی کپڑے کی دوکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ اس کا

رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے۔
"بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کروں؟"

"کیا چھوٹے لڑکے کو گرجا کے اسکول میں بھیج دوں؟ یا اپنے سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں؟"
"کیا راج پھوڑے کا اپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟"
"کیا دیوان خانے کی دیوارا ینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی ٹھکوا دوں؟"
"کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟"

غرضیکہ رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لئے کوئی نہ کوئی صلاح مشورہ کرنے ضرور آ نکلتے ہیں اور محض اس لئے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیاء الحسن نے، پیشکار تحصیل نے، بڑوسی بزرگ نے، آرٹسٹ نے۔ اور ـــــ خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہئے اس لئے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

ابھی ابھی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس لیے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا صاحب جوں والا زرد رومال سر پر باندھے عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یا الٰہی [illegible] ——— یہ میں کون سے شہر میں آگیا ہوں۔

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہے اور اس کی ٹانگ پر سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے۔ قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا:

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں!"

آنا سُن کر میں چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار سے میں گذر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لیے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔
نوٹ: کھانا کھانے کے لیے پچھلی گلی سے تشریف لائیں۔"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان میں سے ورزنگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دوکان کی پیشانی پر سُرخ الفاظ میں لکھا تھا:

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آگیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا:

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپروائی سے کہا:

"دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور انھیں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کم سن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا:

"اباجان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں مگر آپ سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں۔" اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کان سہلاتے ہوئے کہا:

"بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔"

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا اور کہا:

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجیے ——— مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے!"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل یعنی میرا بھی بھائیوں کی دکان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر اُبل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پلڑوں میں پرندے ڈال کے انھیں تول رہا تھا۔ فوارے کی داہنی جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا:

"ہیلو بے بی! ہاؤ سویٹ بے بی! او ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیے۔ نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

اے اللہ کے درویشو! اتنا سُننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری۔ جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا ؂

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" گیا ہوں

میرے حواس ابھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ میں انھیں ٹھکانے پر لانے کے لیے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سب سے ذرا دو دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ جواب میں حسبِ سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انھیں دیکھ کر میرے نیچے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لیے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا۔ لیکن یہاں آ کر عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لیے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا:

"داتا کے دربار چلیے گا جناب؟"

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

"سرکار پلک جھپکنے میں پہنچاؤں گا۔ پندرہ برس پاور کا گھوڑا ہے۔"

میں نے مڑ کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا:

"جھوٹ بکتا ہے۔ میں صرف ایک ہارس پاور ہوں۔"

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے گھومتے گھومتے میں شہر کی ایک بستی میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے۔

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا

"لے لی" کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا

بعد فنا تھے دونوں کے مرقد جدا جدا

لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا

کیا؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے

وے منڈیا سیالکوٹیا!

پہلے قوال اُٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ انھوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیے ستمگر تیرے لیے

اس پہلے ہی مصرع سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے اور آگے چل پڑا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تاکہ میرے حواس باطنیہ حواس خمسہ سے لطف اندوز ہوں!"

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا:

"بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوش حال لوگ دسترخوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پُراسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا:

"ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ انھوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے

چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالۂ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے۔ اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کیے۔ پانچ روپے حوالات کے داروغے کو دیے، پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو یہاں کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر ایک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوشِ جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے بٹوے میں ڈالی، بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کیے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا:

"براہ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیے اور اگر آپ
ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہیے کہ چائے ایش ٹرے میں لائے۔"

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے۔ بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر انھوں نے ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ دو ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گذر گئے ؎

من کا پنچھی بول اٹھا ہے
بول سجن تیری جیب میں کیا ہے؟ — جیب میں کیا ہے؟
میری جیب کی بات نہ پوچھو
ہائے کوئی پیسہ نہیں

....

اب میرے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہ تھی چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا۔ مصری شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا:

"پہلا درویش!"

میرا اتنا ہی جواب سن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام

ہو یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔
رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔
"نیکی کر دریا میں ڈال"
خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دُم نکل آئی ہے
میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا۔ کہیں گانا ہو رہا تھا۔
میری گٹھڑی کو لاگا چور
مسافر بھاگ ذرا

....

اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکیے میں آ کر دم لیا ہے اور انشاء اللہ اسی جگہ دم دوں گا۔"
یہ قصہ سُن کر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا:
"بھائی! خدا کے لیے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے۔ میں نیا نیا اخبار کا اڈیٹر ہوا ہوں۔"
ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصّے کا!

جشنِ جمہوریت کی ایک دوپہر

غلام احمد فرقت کاکوروی

گورستان عیش باغ لکھنؤ کے چمن نمبر ۵ میں دور تک قبروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ درمیان میں جو حصہ قبروں کی زد سے بچا ہوا ہے۔ اس پر چھوٹی چھوٹی چوکیوں کو ملا کر کچھ اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ اس نے چبوترے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس چوکی مار چبوترے پہ ایک میلی کچیلی دری بچھی ہے۔ چوکیوں کے پستہ قد پاؤں میں جکڑی ہوئی چار چھڑوں پر ایک سفید پٹی چادر اس طرح تان دی گئی ہے کہ اس نے خود بخود شامیانے کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے ہیں۔ اس ننھے منے چبوترے پر گنتی کے چار پانچ افراد بیٹھ کر بارش یا دھوپ سے اپنے کو کم و بیش محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ بقیہ ساٹھ ستر مدقوق اور کرم خوردہ افراد جو اس وقت اس گورستانی جنگل میں منگل مناتے نظر آ رہے ہیں۔ مختلف ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہیں۔ ان نحیف الجثہ حضرات کے چیسے اور ڈھیلے عنبرناک جسموں سے کافور کی بو آنے لگی ہے۔ تین چار حضرات شامیانے کی بغل میں بیٹھے پرانے گڑ کی ڈلیوں کو توڑ توڑ کر ننھی ننھی کنکریوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس ٹولی کے عقب میں کچھ فاصلے پر چار عرق کشیدہ جسم اپنی مدک، چرس اور گانجے کی نگالیوں کو کلی اور غرارہ کرانے میں مصروف ہیں۔ ایک جگہ بڑی سی دیگ میں چائے کی یخنی بن رہی ہے۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر اس میں جھانک بھی لیتے ہیں تاکہ باذوق کی جھک بیرنجی کی تیاری اور عدم تیاری سے باخبر رہیں۔ اتنے میں قبرستان کے پھاٹک سے کچھ لوگ کندھوں پر شاہی وقتوں کے کرم خوردہ دوشالے ڈالے ہاتھوں میں عصا اور بغل میں کابکیں دبائے داخل ہوتے ہیں۔ وضع قطع سے یہ لوگ اس گروہ کے معززین معلوم ہوتے ہیں۔

قبرستان کے پھاٹک پر وقتی کا ایک بڑا سا سائن بورڈ آویزاں ہے جس پر جشنِ جمہوریت ۱۹۵۱ء جلی حرفوں میں لکھا ہے چنانچہ ہر نو وارد پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر اس سائن بورڈ کو اس طرح پڑھتا نظر آتا ہے جس طرح سینما کے علتی تماشہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے گیلری کی تصاویر پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ کچھ لوگ سپاٹ قبروں پر چادریں بچھائے بغل میں کابکیں

رکھے سینک سلائی پونڈوں کو ہاتھ روک روک کر احتیاط سے تراش رہے ہیں کہ گنڈوں کی سبز چھریوں
کی زد سے محفوظ رہے انہی میں ایک صاحب افیون کے فضائل بیان فرما رہے ہیں!

منّے۔ سچ کہئے گا میر صاحب۔ اس معجونِ حقیقی نے چنیا جان کیا شے پیدا کی ہے۔

میر صاحب۔ اے حضرت کیا کہنے۔ نوشدارو کہئے "بل کن" آبِ بقا۔

منّے۔ حضور والا اس کے فضائل کے لئے دفتر چاہیں رنگت پہ نکھار، قوت پہ بخشش۔ علم پہ سکھائے۔ شب زندہ دار دل و دماغ حاضر۔ پھر پیتے ہی رگ رگ میں طاقت دوڑ جائے۔ عضو عضو میں خون کے عوض طاقت نظر آئے۔

میر صاحب۔ ارے میاں یہ کرامت کیوں نہیں بیان کرتے کہ چاہے ہوش نہ باقی رہے اگر دن زمین سے مل جائے مگر نیند کا آنا حرام۔ ادھر چسکی پی ادھر مراقبہ میں گئے۔ پھر انجام پر نگاہ کیجئے تو یعنی کہ افیونی کی موت پر تو فرشتوں نے رشک کیا ہے، قبلۂ عالم انجیل میں دیکھئے تو جگہ جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔

آگے بڑھ کر فضا میں طلسم ہوش ربا گھوم رہی ہے۔

صف آرائی شروع ہوئی، میمنہ و میسرہ و قلب و جناح و ساقہ و کمین گاہ چودہ صفیں مثل سدِ سکندری کے آراستہ ہوئیں۔ سواروں کے آگے پیادے جنگ کے آمادے دیوار فوج تھے۔ سوار دریائے لشکر میں موج در موج تھے۔ گھوڑے برابر تھوتھنی سے تھوتھنی اور پٹھے سے پٹھا، دُم سے دُم، سم سے سم ملائے ہوئے تھے۔ نقیب جو آگے بڑھ آتا تھا اس کو پیچھے ہٹاتے تھے۔ گھٹے ہوئے کو آگے بڑھاتے تھے دم بدم باجے زری بجتے تھے۔ مرکب الف ہوتے تھے۔

(واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک ساتھ فضا میں یہ آوازیں ارتعاش کرتی سنائی پڑتی ہیں)

"یہ سوچ کر ایک تیغ اٹھا کر تخت سے شاہ یار کے مارا کہ سینے کے پار ہو گیا۔ غلغلہ اس کے مرنے کا برپا ہوا، پھر افراسیاب نے اپنے ہاتھوں کو ہلایا، برقیں دسوں انگلیوں سے لپک کر گریں اور پھر ہمراہیان شدید کے خرمنِ ہستی کو جلا کر خاک کر دیا۔ بڑی دیر تک شور و غل رہا۔ جب وہ ہنگامہ برطرف ہوا افراسیاب گنبد پر آیا۔ حیرت نے تعظیم کی افراسیاب نے کہا اے حیرت یہ تمہارا بھینا بی بہار کا پہلا سحر تھا کہ شدید آپ میں نہ تھا۔ یہ تمہاری ذات سے اتنا بڑا لشکر میرا ہلاک ہوا۔"

(پھاٹک کی سیدھ میں کچھ فاصلہ پر بعض حضرات بحث و مباحثہ میں مصروف ہیں)

ایک۔ اماں۔ دتی سنا کہ کوئی شاہ صاحب پیر محمد صاحب کے ٹیکے پر ٹکے ہیں اور مردے زندہ کرتے ہیں۔

دوسرا۔ نہیں واللہ۔

تیسرا۔ سنا تو میں نے بھی ہے لیکن یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ پرسوں فتو کی لڑکی کی خبر اڑ گئی کہ وہ مر گئی، باپ جائی کا جو حال تھا نہ پوچھو۔ اماں فضل پانی والے کے بڑے لڑکے فجو کو تو بیاہی تھی، فجو کا برا حال تھا چنانچہ شاہ صاحب کے پاس سب اس کی میت کو لے گئے دوسرے دن شام کو لڑکی بھلی چنگی آ گئی۔

چوتھا۔ اچھا تو آج بلیماروں میں چل کر دیکھیں گے واللہ یہ تو معجزہ ہو گیا معجزہ۔ کچھ تفصیل بھی معلوم ہوئی۔

تیسرا۔ یہ مرزا صاحب بیٹھے تو ہیں۔ اماں مرزا چھوٹو فا۔

پہلا۔ اماں ہاں مرزا صاحب بیان کرو نا۔

(کئی انجوئی کھسک کھسک کر قریب آجاتے ہیں)

مرزا صاحب۔ بھائی صاحب وہ شاہ صاحب یہاں کی مخلوق تو ہیں نہیں۔ کہیں عرب درعرب کی طرف کے ہیں۔ مگر پرسوں جو معجزہ دکھایا ہے قسم قرآن کی پروفیسر معشوق علی بھی اس کے آگے مات۔ جب سے ٹپکے ہیں بہت مخلوقات انھیں دیکھنے چلی آ رہی ہے۔ اماں وہ جیتا ہے کہ معاذ اللہ سنا ہے کہ دن ہی دن دکھائی پڑتے ہیں، ادھر شام ہوئی۔ ادھر غائب۔ صرف معصوم سواریوں کرنے آتے ہیں۔ حالانکہ کسی وقت (وقت) اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔

پہلا۔ اماں فجو کی لڑکی کا واقعہ بیان کرو۔ سلے اِدھر اُدھر کی اڑاتے۔

مرزا صاحب۔ دی چھری تلے دم لو۔ سنی سنائی تو واللہ مجھے بھی یقین نہ آتا لیکن آنکھوں دیکھی ہے تو جھوٹ بولنے والے پر خدا کی مار۔

دوسرا۔ تو ہوا یہ کہ جونہی لاش شاہ صاحب کے سامنے رکھی گئی۔ انھوں نے پہلے تو اس کا سر اپنا اپنی طرف کیا۔ ان کے بعد فجو کے باپ اور اس کے شوہر کو بلایا اور کچھ کان میں کہا۔ اس کے بعد زور زور سے بولے "تو تیار ہو نا؟" اس کے بعد جب ان دونوں نے ہامی بھرلی۔ حلف حلفی ہو گئی تو شاہ صاحب نے ایک استرا نکالا اپنا سر کاٹ لیا۔ قسم قرآن کی یہ دیکھ کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پھر اسی حالت میں ایک بکرا جوان شاہ صاحب کے سرہانے بندھا تھا۔ اس کا سر کاٹ لیا۔ اس کے بعد اپنے دھڑ پر بکری کا سر رکھا اور بکرے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی خوب گتھم گتھا ہوئی۔ ہوتے ہوتے دونوں کے سر سے ایک شعلہ زرد رنگ کی گرمی جو نہایت چمکیلی تھی۔ ایسی چمکیلی کہ گوہر شب تاب اس کے آگے مات۔ رفتہ رفتہ اس زری کا ڈھیر بن گیا اور اس ڈھیر کو اچانک ایک چڑیا نے جو جھپٹ کر نہ جانے کہاں سے آگئی لے اڑا۔ بس مفت چڑیا کو شاہ صاحب نے جھٹ پکڑا اس کا کباب سیخ کیا اتنے میں جو دیکھتے ہیں تو شاہ صاحب کے سر اقدس پر تمام انھیں کا سر تھا۔ شاہ صاحب نے جھٹ کباب فجو کی لڑکی کے منہ میں رکھ ہی تو دیا۔ کباب کا منہ میں رکھنا تھا کہ وہ "لا الہ اللہ" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک دُور کی آواز۔ اماں چھوٹے مرتے اور اولاد چھوڑ گئے۔

دوسری آواز۔ اماں چھبن صاحب کہاں تھے؟ واللہ تمھاری تلاش میں تو کنوؤں میں بانس ڈال دیئے۔ پچھلے سال نہیں ملے تھے۔ تب کا دن اور آج کی گھڑی ہے کہ عید کا چاند ہو گئے۔ پھر پچھلے اتوار حاجی مرزا کے یہاں بھی پانی میں نظر نہیں پڑے۔ اور آج بھی کچھ بجھے بجھے نظر پڑتے ہو (نکالی پڑھتے ہوئے) لو ایک چھینٹا ابھی اعنی صاحب پی کر گئے ہیں تم بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔ واللہ مدت سے تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے چھینٹوں کو ترس گئے۔ یاد ہیں بنے نواب کی محل والی صحبتیں۔ اماں کیا زمانہ تھا (بغل میں ایک ساتھی کا شانہ ہلا کر) فجو صاحب دیکھتے ہو۔ یہ کون صاحب تمہارے سامنے آرم یار کھڑے ہیں۔

فجو صاحب۔ جی ہاں ملاحظہ کیا۔ میں نے تو قسم ہے قرآن کی اسی مارے ان سے میل ملاقات ترک کر دی کہ جب گھر پر جاؤ تو یہ حضرت ندارد۔ اماں ہم تو کہتے ہیں زندگی چند روزہ ہے۔ ہنس بول کر گزار لو۔ نہ جانے کس وقت وہاں سے بلاوا آجائے۔ نہ آج جشن آزادی کے موقع پر پوسٹر کے ذریعہ ان تک ہمارے اس جلسہ کی بھنک پہنچتی۔ اور نہ یہ آج یہاں دکھائی پڑتے۔ اماں ہاں ذرا یہ تو بتانا کہ جلسہ ہے کے بجے سے ۱۲ بجے مجھے بٹیر کو گولی کھلانا ہے۔

وہی صاحب ۔ اماں خیر تو ہے نصیب اعداء ۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا افتاد گزری ۔

ججو صاحب ۔ پرسوں شمن صاحب کے بڑے شد کرنے میں بیڑ مکھی کھا گیا شب بھر طبیعت بدمزہ رہی ۔ بس یوں صبح ایلچہ ایلچا مر جاتا چوبند تو ہو گیا ۔ مگر اب بھی وقفہ سے اونگھ جاتا ہے ۔ حالانکہ مکھی کھاتے تھائیں سنے ذان سے ادھا وہیں نے کرا دی تھی ۔

ایک آواز ۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے ۔ آپ سب ادھر شامیانے کی طرف کھسک آئیں ۔

دوسری آواز ۔ ٹھہرو یار آتے ہیں ۔ ذرا نگالی دھو لیں ۔

تیسری آواز ۔ لو صاحب جلسہ تو شروع ہو گیا ۔

چوتھی آواز ۔ اماں اچھے آغا چل کر ذرا ان کی بھی سن لو ۔

پانچویں آواز ۔ اماں تمہیں قسم ہے ذرا دیکھو تو ہر شخص چوکی پر بیٹھنے کے لئے کتنا بے چین ہے مجتیٰ کیا انھا سا شاہانہ نان رکھا ہے ۔

تیسرا ۔ اماں برس برس کے دن تو ایک بدھی لے کر بانس ہی دا س پہ ٹانگ دی ہوتی ۔

پہلا ۔ واللہ کیا پیٹ بھروں کی سی باتیں ہیں ۔ بیٹروں کی کاکن کے دام میسر نہیں چلے ہیں ادھی بدھی نصب کرنے ۔ اماں دیکھ رہے ہو شامیانے کا خرچہ کس شکل سے نکلا ہے ۔

چوکی پر کی ایک آواز ۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے ۔ میں اس کی صدارت کے لئے اچھے آغا صاحب کا نام پیش کرتا ہوں ۔

(سامعین کی چاؤں چاؤں کے ساتھ)

ایک آواز ۔ لو بنے صاحب رہ گئے ۔

دوسری آواز ۔ کیوں صاحب دلائے جانی آغا صاحب سے کس چیز میں کم تھے جو انھیں صدر نہیں بنایا گیا ۔

تیسری آواز ۔ اماں کیا جھک جھک لگا رکھی ہے ۔ نگلے دانت اب بیٹھنے سے رہے ۔ خوشی کے موقع پر بے فضول کی باتوں سے کیا حاصل ۔

چوتھی آواز ۔ اچھا صاحب آپ جامے سے باہر نہ ہوں لیجئے ہم چپ ہوئے جاتے ہیں ۔ اب جو زبان سے بولے اس پر تین حرف ۔

شامیانے سے صدر کی آواز ۔ چھٹن صاحب ۔ آپ کچھ فرمائیں گے ؟

چھٹن صاحب ۔ (باقر مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۔ جو ایک طرف چوکی پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں)

مرزا صاحب ۔ واللہ پہلے آپ شروع ہوں ۔ میرا نمبر تو آپ کے بعد ہی ہو گا ۔

باقر مرزا ۔ جناب صدر نے تو آپ سے درخواست کی ہے نہ کہ اس ناچیز سے ۔

صدر ۔ مرزا صاحب واللہ معاف فرمائیے گا قسم ہے قرآن کی آپ کچھ اس طرح کیری کی طرح پتوں میں چھپے چھپائے بیٹھے تھے کہ آپ تک نگاہ ہی نہیں گئی تو پھر لیجئے نا ۔

چھٹن صاحب ۔ (مرزا صاحب سے) واللہ بس اب شروع ہو جائیے کچھ کلمات آپ فرماویں ۔ کچھ کھڑے ہو کر میں کہہ دونگا ۔ پھر تو اچھے آغا اپنا حق ادا ہی کریں گے ۔

مرزا صاحب بڑے تکلف سے اٹھ کر پہلے تو ہر چہار طرف جھک جھک کر کورنش اور تسلیمات عرض کرتے ہیں ۔ پھر صدر کو مخاطب

ہو کر اشارہ سے اجازت دیتے ہیں۔

صدر۔ بسم اللہ۔

مرزا صاحب ۔ بھائیو! آج پورے ایک سال کے بعد ہم لوگ دوبارہ جشنِ جمہوریت منانے کی غرض سے اپنے آبا و اجداد کے اس پرانے بیٹھے پر جمع ہوئے ہیں گردو پیش مرنے والوں کی روحوں پر نظر ڈالیں تو ایک بات عرض کروں کہ اس پچھلے ایک سال کے عرصہ میں ہمارے بہت سے ساتھی ہم سے بچھڑ کر پیوندِ خاک ہو گئے تاہم اس بات پر جس قدر بھی اظہارِ مسرت کریں کم ہے کہ اگرچہ وہ پاک روحیں ہم میں موجود نہیں تاہم وہ ہم سے دور بھی نہیں۔ وہ ہم عاشقانِ صادق میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہم میں موجود ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ہم میں اور ان حضرات میں اگر بُعد ہے تو صرف گز دو گز کا کہ ہم اوپر بیٹھے جشنِ آزادی منا رہے ہیں اور وہ اپنی ڈھائی گز کی تربتوں میں بیٹھے بیٹھے جشن کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے طبقے کی حکومت سے وفاداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے (جلسے سے واہ واہ سبحان اللہ، قسم قرآن کی کیسا گوشہ نکالا ہے جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور مرزا صاحب جھک جھک کر سلام کرتے ہیں)

حضرات! عمائدینِ حکومت مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ ہم اور ہمارے جملہ رفقا جن میں سے بیشتر اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ان کو حکومت سے صرف اس بات کا شکوہ ہے کہ جب سے ہمارے دیس کے نیتاؤں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہے اس وقت سے کاکن کے دام بہت چڑھ گئے ہیں جس کے سبب ہماری پالیاں بے رونق ہو کر رہ گئی ہیں۔ پیٹ بھر کاکن میسر نہ ہونے کے سبب ہمارے اکثر چوٹی کے بٹیر گذر گئے لہٰذا ان بے زبانوں کی طرف سے ہم اس جشنِ آزادی کے موقع پر حکومت سے دادرسی کے طالب ہیں دوسری چیز اس سلسلہ میں یہ عرض کرنے کی ہے کہ خاتمۂ زمینداری کے معاملے میں عمائدینِ حکومت کی طرف سے جو اقدامات عمل میں لائے جا رہے ہیں ان کی ضرب بھی براہِ راست ہم ہی وفاداروں پر پڑ رہی ہے جو باوجود مالی مشکلات کے آپ کی ہر خوشی کو اپنی خوشی اور ہر غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں کیونکہ بڑے بڑے زمیندار جن کے علاقوں میں ہر فصل میں بٹیروں کا شکار لگتا ہے۔ ان کے مٹنے کے سبب ہمارے ہاتھ پاؤں کٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہم تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ ہماری حالت ایک یتیم بچے کی سی ہو گئی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اچھے بٹیر بازار میں آنا بند ہو گئے جو کبھی آٹھ دس آنے کو ملتا تھا یقین جانئے کہ اب وہ پانچ سات روپے میں بھی میسر نہیں آتا۔ درحقیقت زمینداروں کی تباہی ہماری تباہی ہے اور ہمارے مظلوم طبقے کی تباہی زمینداروں کی تباہی ہے۔ کیونکہ نواب [illegible] صاحب اور بھورے نواب صاحب جن کو ہم سے سالہا سال سے چھٹوں پر اتوار میں ہوا کرتی تھیں خاتمہ زمینداری کی آواز سنتے ہی بند ہو گئیں اور حضور یہ واقعہ ہے کہ خاتمہ زمینداری کا اعلان کر کے سرکار نے نہ صرف زمینداری کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ ہمارے ڈربے بھی پھونک دیئے ہیں۔ ہمارے بٹیروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے مگر ہم عمائدینِ حکومت کو یقین دلاتے ہیں اور وہ چاہے اسے باور کریں یا

نہ کریں مگر اس مادی دنیا سے گزرنے کے بعد زمیندار، پھر زمیندار ہی رہتا ہے خواہ اس جور و تشدد گزرنے والوں کا کچھ ہی حال کیوں نہ ہو۔ چنانچہ عرض کرتا ہوں ؎

مرنے کے بعد بھی نہ ریاست کی بو گئی
دو گز زمین پا کے زمیندار ہو گئے

(چہار جانب سے سبحان اللہ۔ مکرر ارشاد، ماشاء اللہ قسم قرآن کی طبیعت خوش کر دی، واللہ مرزا کیا کیا حق ادا کیا ہے ہو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

ایک دور کی آواز۔ مرزا صاحب! واللہ سیری نہیں ہوئی پھر ارشاد ہو (مرزا صاحب جھک جھک کر اور دوہرے ہو ہو کر شعر کو دہراتے جاتے ہیں اور سلام کرتے جاتے ہیں۔

تو اس سلسلہ میں مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا ہے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جہاں ہماری سرکار کی طرف سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بڑے بڑے فارم اور بڑے بڑے مرغی خانے کھولے جانے کی اسکیم ہے وہاں کچھ فارم ایسے بھی کھولے جائیں جہاں ہم بٹیروں کا شکار لگا کر اچھی بٹیریں حاصل کر سکیں۔

ایک آواز۔ حضرت، کچھ افیون چرس، مدک اور گانجے والوں کی زحمتوں پر بھی روشنی ڈالتے چلئے۔

مرزا صاحب۔ (سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) تو جن دوسری چیزوں کی طرف میں ارباب حکومت کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادھر بعض حضرات نے مجھے آن کر بتایا کہ ادھر کچھ نشے پانی پر بھی سرکار کی طرف سے بندشیں عائد ہوئی ہیں۔ جس کے سبب دوکانداروں نے افیون، چرس، مدک اور گانجے سے شوق رکھنے والوں کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ جو سرکار برطانیہ کے دور میں بھی نہ تھیں۔ منشیات پر محصول بڑھ گئے ہیں، افیون بازاروں سے عنقا ہو گئی ہے۔ جس کے سبب ہمارے بہت سے رفقاء کار رشتۂ حیات منقطع ہو گیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذہ ہم کو داغ جدائی دے گئے جس کے سبب ہم ان کے فیضان صحبت سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا اس جشنِ آزادی کے موقع پر ہمارا مطالبہ ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹیوں اور گاؤں پنچایتوں کے ذمہ داروں کو سرکاری طور پر توجہ دلائی جائے کہ وہ اس ضمن میں ہم کو سہولتیں پہنچائیں، اور بٹیروں کی دوا دارو کے لئے جہاں شہروں اور دیہاتوں میں مریضوں کے ہسپتال قائم کئے جا رہے ہیں۔ وہاں بٹیروں کے لئے بھی سرکاری شفا خانے کھولے جائیں اور ان شفا خانوں میں ہمارے ان آدمیوں کو جگہیں دی جائیں جنھوں نے اپنی عمر کے بہترین حصے بٹیروں پر ریاض کرنے میں صرف کر دیئے ہیں۔

(صفِ سامعین سے سبحان اللہ، واہ واہ، کیا نکات بیان کر رہے ہو۔ مرزا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور فاضل مقرر گھوم گھوم کر ہر طرف دوہرے ہو ہو کر سلام کرتا ہے)

کئی آوازیں۔ جزاک اللہ، جزاک اللہ۔

مرزا صاحب۔ (سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) تاکہ ہمارے طبقے کو بھی احساس ہو کہ ہم آزاد ہوئے۔ ہمارے رہنماؤں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور آئی۔ اور ہماری غلامی کی بیڑیاں کٹیں۔

صدر۔ (مرزا صاحب سے) واللہ کیا کیا ہی کمال رہے ہو۔ قسم قرآن کی ختم تقریر پر چھٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے دو پیچ میری طرف سے۔

(سامعین میں سے کئی آوازیں۔ مرزا صاحب دو پیچے ختم تقریر پر چھٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے میری طرف سے بھی قبول فرمائیے گا)

مرزا صاحب۔ (سلسلہ کلام کو ختم کرتے ہوئے) ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

(سامعین کی صفوں سے پھر ایک شور اور ایک غوغا بلند ہوتا ہے اور "واللہ مرزا صاحب حق ادا کر دیا۔ کیا تیور سے تقریر کی ہے" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور صدر سبحان اللہ اور واہ واہ کے ساتھ مرزا کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہیں اس کے بعد)

صدر۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر) نواب چھٹن صاحب جو ہمارے شہر کے مشہور و معروف بٹیر باز ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بٹیروں کے معرکے خود بھی ہیں۔ آپ کے سامنے اپنے زریں خیالات پیش کریں گے۔

چھٹن صاحب۔ (اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر اور صدر سے مخاطب ہوتے ہوئے) بھائی مجھے معاف کرو۔ اب کون سا گوشہ مرزا صاحب نے چھوڑا ہے جس پر بولا جائے بہر حال آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (جھک کر سلام کرتے ہوئے اور اشارے سے اجازت طلب کرتے ہوئے)

صدر۔ بسم اللہ چھٹن صاحب۔

چھٹن صاحب۔ بھائیو! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لونگا۔ مجھے شراب کی بندش کے سلسلے میں صرف اتنی سی بات عرض کرنا ہے کہ ادھر بعض اضلاع سے میرے دوستوں کے خطوط آئے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ وہاں سرکار کے حکم سے شراب کی خرید و فروخت موقوف ہو گئی ہے حتیٰ کہ بٹیروں کے لئے جیسے دو چھے برانڈی کی ضرورت ہوتی ہے تو سونے کے بھاؤ بھی برانڈی میسر نہیں آتی۔ تو حضرات حکومت کے اس اقدام کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے کیونکہ اس موذی شئے کا استعمال شرعاً ناجائز اور مذہباً حرام ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھی سختی کیا کہ جنور تڑپ تڑپ کر مر جائیں مگر دو بوند شراب نہ ملے۔ چنانچہ پرسوں کانپور سے بڑے آغا نے لکھا ہے کہ ان کا پیارا بٹیر برانڈی دو بوندیں میسر نہ آنے کے سبب راہی ملک عدم ہو گیا۔ پیارا مرحوم کی جیتی ہوئی پالیاں آپ کے سامنے ہیں۔ وہ اس وقت کم از کم ہماری نگری میں بڑا عزت دار بٹیر تھا۔ لہٰذا اس کے اس طرح تڑپ کر مر جانے کا میری دانست میں کیا اپنے کیا پرائے سبھوں کو غم ہو گا (جلسہ گاہ سے اظہار تاسف کی آوازیں) لہٰذا اس ضمن میں حکومت کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ اتنی سختی بنی نوع انسان تو گوارا کر لے گا۔ مگر پرندوں کے بس کی بات نہیں جو وہ ان سختیوں کو برداشت کریں۔ وہ تو اپنی جان ہی سے گزر جائیں گے۔

ایک صاحب۔ (صف سامعین میں کھڑے ہو کر) جناب چھٹن صاحب آپ کی یہ اطلاع غلط ہے۔ دواخانوں میں بطور دوا ہر وقت اور ہر جگہ شراب مل سکتی ہے۔ یہ خبر حکومت کے کسی بدخواہ کی اڑائی ہوئی ہے کہ پیارا شراب نہ ملنے کے سبب مر گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا کوا بیٹھ گیا تھا جس کے سبب دم گھٹنے سے اسکی وفات واقع ہوئی اس مداخلت کو معاف فرمایا جائے۔

چھٹن صاحب۔ اچھا کیا آپ نے اس غلط فہمی کی وضاحت فرما دی بہر حال میں حکومت سے اپنے اس مطالبہ کو واپس لیتا ہوں اور اب اپنی

تقریر ختم کرتا ہوں۔ نیز جناب صدر سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ضمن میں اگر کوئی شکایت رہ گئی ہو تو بتا کر ہم کو شکریہ کا موقع دیں۔ چار بجے ننھے نواب صاحب کے یہاں جشنِ آزادی کے سلسلے میں پان ہے۔ اور اس وقت ڈھائی بجنے کو ہیں۔

صدر۔ حضرت۔ ان تقریروں کے بعد جو جناب مرزا صاحب اور چھٹن صاحب نے کیں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں آپ کے قیمتی وقت کو ضائع کروں جب کہ چار بجے آپ سب حضرات کو ننھے نواب صاحب کے یہاں بھی چلنا ہے۔ تاہم طلسم ہوشربا میں ایک مقام پر بے ثباتیٔ عالم کے بارے میں بہادری اور جرأت کی تلقین کی گئی ہے چنانچہ اس عبارت کی روشنی میں آپ کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت آپ اپنے مطالبات کی دھن میں پاگل ہو رہے ہیں۔ طلسم ہوش ربا میں ایک جگہ آیا ہے۔

"تلوار کی آنچ مشہور ہے گیلے سوکھے دونوں جلتے ہیں سر گردن میں لاگ ہے یہی غضب کی آگ ہے۔ زندگی دو لونگ نام ہیں نام کر لو اے فوج افزا! لڑ بھڑ کر سرخرو ہو۔ جس کا قدم ڈگمگایا وہ کہیں آبرو نہ پائے گا۔"

یہ ٹکڑا میں نے طلسم ہوشربا سے آپ حضرات کے سامنے اس غرض سے پیش کیا کہ اس وقت ہم کو اپنے آبا و اجداد کی پرانی روایات کو زندہ رکھنا ہے۔ ان کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنا ہے۔ اسی کے لئے مرنا اور اسی کے لئے جینا ہے اور جدید سرکاری کی باد حوادث کے جھونکوں سے مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے۔ اس وقت ہم کو پورے عزم اور بے باکی کیساتھ اپنے مطالبات حکومت کے روبرو پیش کرنا ہیں خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اتنے میں ایک شخص نے قبرستان کے پھاٹک سے جلسہ گاہ میں باآواز بلند اعلان کیا "ارے بھاگو۔ دوڑ آگئی کسی بدبخت نے مرزا کی تقریر کی پوری پوری رپٹ چوکی پر کرا دی؟" یہ سننا تھا کہ جلسہ گاہ میں ایک بھگدڑ مچ گئی گرتے پڑتے افیونی، مدکیے اور چرسئے کابکیں اور پیالیاں چھوڑ چھاڑ کر قبروں کی آڑ اور جھاڑیوں میں چھپ گئے جلسہ ختم ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دو مسلمان سپاہی سرخ پگڑیاں باندھے۔ اپنے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھتے عین اسی وقت پھاٹک کے قریب سے گزر رہے تھے جس وقت کہ جلسہ گاہ میں آغا صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔

ٹائم ٹیبل

احمد جمال پاشا

جب اسکول کھل گئے پڑھائی شروع ہو گئی اور سبق یاد کرنے کا زمانہ آیا تو رفتہ رفتہ ہم نے بھی طے کیا کہ اب تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ پروگرام سے ہمارا مطلب ہر سال یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک ایسا نظام حیات جو عملی جدوجہد کا ایک ایسا زندۂ جاوید نمونہ ہو جس سے طالبعلموں کی آنے والی نسلیں ابدالآباد تک فیضیاب ہوتی رہیں اور جس میں اگر مناسب حد تک تبدیلیاں گوارا کر لی جائیں تو وہ ہر قسم کے پیشہ ور اور پرائیویٹ حضرات و خواتین کے لیے قابل قبول ہو سکے جو عملی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے رہنے کے باعث کچھ اس قسم کی کتابیں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" "کامیابی آپ کے قدم چومنے کے لیے بیقرار ہے" معرفت چھنامل بکسیلرز اینڈ پبلشرز "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" "رہنمائے روزگار با تصویر" "مکمل مرغی خانہ" "رضیہ کا شاہی دسترخوان" "کراماتِ اُتو عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی" پڑھنے کے عادی سے ہو جاتے ہیں اور خالی وقت میں دریا میں چھلانگ لگانے اور خودکشی کرنے کے تازہ ترین طریقوں پر غور کرتے رہتے ہیں۔

اس پروگرام میں اتنی رعایت ضرور کی جاتی ہے کہ یہ پچھلے سال سے ذرا مختلف ہو ورنہ یہ بالکل اسکولی بن کر نہ رہ جائے۔ 'اسکولی' سے میری مراد میرے اپنے 'اسکول' سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پوپلا چپراسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی گھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں اور وہ دن دہاڑے اونگھا کرتا ہے۔ اسی سبب اکثر گھنٹہ بھی اونگھ جاتا ہے اور اس کے چونکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پیشتر اور کبھی بعد میں بجتا ہے جس سے اسکول کا سارا نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکے یا اساتذۂ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ جائے گا مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا ہے۔ گھنٹہ تو اسکول کے سب سے ذمہ دار فرد کو بجانا چاہیے جو اسکول کے اعمال و افعال کا جوابدہ ہو اور وہ فرد واحد سوائے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کون ہو سکتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر یہ خوشگوار فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹس یا وائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے اور ہونے والے بیشمار فائدوں کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچا لیں گے جس کو آج کل فیشن کی اصطلاح میں "چھوٹی بچت" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے اور شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ "اسکولی" میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جن کا یادداشت سے براہ راست تعلق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے

جس کے سامنے "ببا" لگا ہوا ہے اور انٹرول میں وہاں دو چار خوانچے والے بھی اپنا سودا فروخت کرنے کے شوق میں جمع ہو جاتے ہیں لہٰذا کثرت سے شور ہوتا ہے۔ اس شور کے سر پر وہ کمرہ ہے جسے عرفِ عام میں "اُردو کلاس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی پہچان اس کے وہ واحد مولوی صاحب ہیں جو صبح سے آکر پڑھانا، اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی گوشے پر ہماری یادداشت کی تہمت ہے کہ یہاں پر ہمارے بچپن سے اردو پڑھائی جاری ہے مگر مسلسل دیکھنے کے بعد بھی آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کون پڑھا رہا ہے اور کون پڑھ رہا ہے۔ تقریباً اسی قسم کی مثالیں ہمیں دوسرے گوشوں سے دوسرے مضامین کے بارے میں آسانی سے مل جاتی ہیں مگر اس پر کچھ کہہ اس وجہ سے نہیں سکتے کہ اسی اسکول نے بڑے بڑے نامور پیدا کیے اور پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔

میرا یہ خود کاشت پروگرام ایک باضابطہ ٹائم ٹیبل کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس ٹائم ٹیبل سے مختلف ہو سکتا ہے جو عموماً اسکول والے زبردستی طلبا کے اوپر لاد دیا کرتے ہیں اسکول والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نہایت انسانِ کامل قسم کا ٹائم ٹیبل پیش کر کے کچھ فاغل سے ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت مقرر کر دیا گیا ہے اس کے آس پاس گھنٹہ ضرور بجے گا البتہ اس سے تھوڑی دیر بعد یہیں لڑکے ضرور آئیں گے۔ اگر ماسٹر صاحبان غیر ارادی طور پر آ گئے ہیں تو وہ وقت گذاری کے طور پر ادھر اُدھر کے بے ربط سوالات، سیاسیاتِ حاضرہ پر تبصرے، موسم پر رننگ کمنٹری، ہیڈ ماسٹر وغیرہ کے اعمال و افعال پر بہت سخت نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ (جو اگر ہم لوگ کریں تو ضرور حرام خور کہلائیں) بار بار بے اختیار اپنے معصوم ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کریں گے۔ ایسے موقعوں پر تجربہ ہے کہ اگر لطیفہ ذرا بہت شور ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اس قسم کی "اُتری" کارروائیوں میں اگر تھوڑی سی تبدیلی محسوس بھی ہوتی ہے تو وہ فن کے اعتبار سے ورنہ تکنیک تو بالکل وہی رہتی ہے مثلاً بڑی جماعتوں میں غیبت کرنے والے کے منہ سے جماعت کے اندر خاص طور پر اور جماعت کے باہر عام طور پر منطق، استدلال، ہیئت، نقد، شعور، لاشعور اور بے شعور وغیرہ مبہم اصطلاحیں سنائی دیتی ہیں اور عام طور پر اس کا اثر آنے والے امتحانوں پر بہ حیثیتِ مجموعی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

یہ تو عمل ہوا اور اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پر عمل بھی کرنا چاہیں تو کبھی لڑکے غائب اور کبھی استاد، اجتماعِ ضدین کے اس عمل میں سارا سال گذر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ اسی ٹائم ٹیبل کو نئے کاغذ پر ٹائپ کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا ہے تاکہ تازہ واردانِ بساط بھی پچھلی بہاروں سے مفت میں فیض یاب ہو سکیں۔

اس قسم کے ٹائم ٹیبل سے ہم کیوں علاقہ رکھیں جس میں صبح سے شام تک ایک ہی استاد، ایک ہی لڑکے اور ایک ہی قسم کے کمرے ہونے کے سبب ہم فلم کی اصطلاح میں نئے چہروں کو بالکل ترس جاتے ہیں۔ استاد لڑکوں کی نقل و حرکت سے نالاں، لڑکے استاد کی صورت سے بیزار مگر دونوں ایک دوسرے سے رحم کے طالب، ایک کو دوسرے کے فعل پر رحم آ رہا ہے مگر فعل جاری ہے۔ کیونکہ ٹائم ٹیبل بتاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے بھیج دیے گئے ہو تو اب کم سے کم چراغ جلے تو گھر لوٹو۔ یہ ٹائم ٹیبل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہ عام طور پر ٹائم ٹیبل ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ریلوے کا ٹائم ٹیبل جسے خریدنے کے بعد آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مصرف کیا ہو، جس کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو اکثر رشک و حسد کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے جو اس کو سونگھ کر سارے دن کی آنے اور جانے والی تمام گاڑیوں کا زائچہ زبانی کھینچ دیتے ہیں۔ اس قسم کے ٹائم ٹیبل پر سوائے عمل کے سب کچھ ہو سکتا ہے اور عمل اس وجہ سے نہیں کہ یہ عمل سفلی کے مترادف سمجھا گیا ہے جس میں ناکامی کی صورت میں عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے نقل سے عمل کی نوبت آنے ہی نہیں پاتی۔

ہاں تو ایک تو ہوا یہ ٹائم ٹیبل جس کو ہم زیادہ سے زیادہ دیکھتے دیکھتے کسی نہ کسی دن پنسل سے نوٹ کر لیتے ہیں یا پھر کسی لڑکے سے نقل مل جاتی ہے۔ مگر اس نقل سے عمل کا کچھ کردار نہیں اُبھر پاتا یعنی اس کے بعد بھی جس دن جماعت میں سب کے سامنے ڈانٹ پڑنے سے ہم کو اپنی بے قاعدگی کا احساس ہو جائے کہ ہم غلطی سے حساب کے بجائے جغرافیہ کے کلاس میں اپنے کو پا رہے ہیں یا ہر سیکنڈ ایر میں اور اٹھائے فرسٹ ایر سے جا رہے ہیں یا خالی گھنٹے میں تواریخ کی کلاس ملنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور تواریخ کے گھنٹے کو خالی سمجھ کر گھر کھانا کھانے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر ہنسی اُڑ جائے، سب کو ہنستا دیکھ کر ہم بھی ہنس دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج پھر گھر جا کر ہم کو ٹائم ٹیبل کی اصلاح کرنا ہے تاکہ اپنے ایک ذاتی اور کامیاب قسم کے پروگرام بنانے میں حتی الامکان مدد مل سکے۔ ایسے آزمائشی دور میں جبکہ ارادہ پکا، نیت صاف، دل حرکت و عمل پر آمادہ ہو، ترقی کرنے کی خواہش بیدار ہو کر انگڑائیاں لیتی ہو اور اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ نچلا نہ بیٹھنے دیتا ہو تو گھر پر سارا وقت اس ٹائم ٹیبل کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے جس کو ہم نے کبھی اسکول میں نقل کیا تھا اور جس کی بنا پر اب ہم ایک کامیاب ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں کسی نے سچ کہا ہے مصیبت کے دن سدا نہیں رہتے اور کسی کی محنت اکارت نہیں جاتی اور آخر کار ہماری بے سپاہیانہ جدوجہد رنگ لاتی ہے۔ وہ ٹائم ٹیبل کسی میز، الماری یا کرسی کے نیچے کسی پرچے، کتاب، کے ٹائٹل پیج یا کے اشتہار یا اقتصادیات کی کاپی کے اس مقام پر بالکل صحیح حالت میں جہاں پر ہم نے حساب کے گھنٹے میں کاٹا گولا کھیلا تھا اور پچھلی اتوار کو اسی صفحہ کے بائیں طرف دھوبن کے کپڑے لکھے تھے۔ ہمارا گمشدہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے جس پر مسلسل غور و فکر کے بعد اکثر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آخر یہ کہا کیا گیا ہے۔ خود اپنی عبارت ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ لکھا کچھ ہوتا ہے اور پڑھنے میں کچھ آتا ہے۔ اس قسم کی مبہم عبارتوں کا پڑھنے لکھنے پر بھی بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے ناشدنی موقعوں پر یہی حصہ سب سے بہتر رہتا ہے جو جلدی میں لکھنا بھول گئے تھے مثلاً ایک بالکل موٹی سی بات ہے کہ اب رہ رہ کر یاد کیا جا رہا ہے کہ انٹرول کہاں ہے؟ باوجود اس کے کھو جانے کے ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ کہیں نہ کہیں پر انٹرول بھی ضرور تھا مگر جو شخص دن میں تین چار انٹرول منائے اس کے لیے یوں بھی اصلی انٹرول کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصلی انٹرول اس کو کہتے ہیں جس کا وقفہ مختصر اور بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر کوئی روک تھام نہیں ہوتی مگر اس وقت تو انٹرول کی تلاش خود ایک انٹرول ہے۔

غرض ایک تفصیلی چھان بین، تنقید و تحقیق، غور و فکر کے بعد ہمارے ذہن میں عین ہمارے تصورات کے مطابق ایک نہایت ہی واضح نقشہ اس پروگرام کا بن گیا جس کے نہ ہونے سے ہم کو اپنی زندگی عرصے سے نہایت فضول معلوم ہونے لگی تھی اور اکثر اس کے مصرف پر ہم اپنے دل میں غور کرتے اور دماغ سے سوالات کرتے اور جواب نفی میں آتا، تن بدن میں مایوسی کی ایک لہر کو دوڑنا پڑتا، بے اختیار اپنی بے بسی کا خیال آ دھمکتا ہے۔

اس پروگرام نے ہمارے خون کی روانی میں ایک تیزی پیدا کر دی، ایسی تیزی جس نے نوجوانوں کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا لہٰذا بے اختیار اکڑ کر بیٹھ گئے۔ دو چار بار بے اختیار پہلو بدلے، عجب عجب منہ بنائے لیکن اگر کوئی ہم کو اس وقت دیکھتا تو قطعی یہ اندازہ لگا لیتا کہ اس وقت ہم بے حد خوش و خرم ہیں۔ ایسی فطری خوشی جو طبیعتوں کو موسیقی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

چنانچہ شگون کے طور پر ایک آدھ سیٹی بھی بجا ڈالی اور اس کی دُھن پر ایک فلمی راگ بھی چھیڑ دیا کیونکہ سر کے اوپر سے ایک طیارہ بھاگ چکا تھا اور اب جو کچھ رہ گیا تھا اس کی حیثیت دفتری خانہ پُری سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے انجام دینے میں اب ہم قطعی جلد بازی سے کام لینا نہ چاہتے تھے اس لیے ہم نے طبیعت کو لطیف بنانے کے لیے نہانے ہی میں اپنی بہتری سمجھی نہانے کے بعد بہترین کپڑے پہنے، اخبار دیکھا، کون فلم کہاں لگا ہے۔ ایک دیکھا ہوا فلم دیکھنے کی خواہش دوبارہ بیدار ہوئی سائیکل اٹھائی سینما کا رُخ کیا۔ موڈ اچھا اور طبیعت آمادہ تھی اس لیے اکثر راستے میں سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیتے اور سائیکل بالکل ایسی چلنے لگتی جیسے "پاکستانی سیاست"۔ پھر جلد ہی اس کی باگ قابو میں لانے کے لیے ہینڈل کو دوبارہ اپنی کمان میں لے لیا۔ راہ گیر بھی مطمئن ہو گئے اور تماشائی بھی منتشر۔

فلم دیکھ کر لوٹے تو ایک قسم کی تکان سی محسوس ہوئی اس لیے پروگرام دوسرے دن بنانے کا ارادہ کر کے سو گئے۔ شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ ایک ماہ کی مسلسل محنت، لگاتار غور و فکر کے بعد ہم نے ایک پروگرام تیار کر لیا۔ اتنا مکمل ٹائم ٹیبل تو ہم پچھلی بار بھی نہ تیار کر سکے تھے۔ اس میں اوّل تو ہم نے یہ خیال رکھا کہ پچھلے سال جو غلطیاں امتحان پاس کرنے کے سلسلے میں ہم سے سرزد ہو گئی تھیں ان کے دوبارہ ہونے کا احتمال نہ رہے۔ غلطیاں ہونا بُرا نہیں لیکن اگر غلطی نئی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ اس میں شرمندگی کا موقع نہ رہتا ہے ورنہ کچھ مناسب نہیں رہتا۔

ہمارا یہ ٹائم ٹیبل نگی پیمانے پر تیار کیا گیا تھا اس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پروگرام کیا اچھا خاصا کرفیو آرڈر تھا جس کا نفاذ مثل مارشل لاء کیا گیا تھا۔ اس ٹائم ٹیبل میں جس قدر بھی مفید مشورے ممکن ہو سکتے تھے ہم نے اپنے آپ کو دے ڈالے تھے۔ اپنی صحت اور اصلاح کا کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا تھا کہ یہ ٹائم ٹیبل ہے یا کسی لیڈر کی الیکشن سے قبل ہونے والی تقریر۔ یہ دراصل کچھ حسبِ ذیل سا تھا مثلاً روزانہ:

۴ بجے (صبح کاذب) نیند سے اٹھ بیٹھنا (اگر ممکن ہو تو پونے ۴ ہی بجے سے) اگر بیدار رہنے کے روزمرہ میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو بیداری کے لیے احتیاطاً گھڑی کا الارم لگا دیا جائے یا غسل خانے کا پائپ کھلا چھوڑ دیا جائے (ہر طرح ناکامی کی صورت میں چوکیدار کو آواز لگانے کی ہدایت کر دی جائے)

۴۔۰ تا ۴۔۵: حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرتے، غسل کرنا، عبادت کرنا

۴۔۵ تا ۴۔۱۵: میل بھر کی دوڑ اور صبح کی سیر (واپسی پر چنے کا پانی پی کر پڑھنے بیٹھ جانا)

۴۔۱۵ تا ۷۔۱۵: دل لگا کر پڑھنا

۷۔۱۵ تا ۷۔۲۵: ناشتہ کرنا

۷۔۲۵ تا ۹۔۳۵: وہ تمام مضامین پڑھ ڈالنا جو آج اسکول میں پڑھائے جائیں گے اور اسکول کا کام کرنا۔

۹۔۳۵ تا ۹۔۴۵: کھانا کھا کر کپڑے تبدیل کر کے کتابیں کاپیاں درست کر کے اسکول روانہ ہو جانا تاکہ ٹھیک ۱۰ بجے اسکول پہنچ جائیں۔

۱۰۔۰۰ تا ۴۔۰۰: اسکول میں، جس میں انٹرول میں کھیل اور خالی وقت میں مطالعہ فطرت میں دلچسپی لینا، اخبار پڑھنا، جن اساتذہ کے پاس امتحان کی کاپیاں جانے کا احتمال ہو ان سے تعلقات استوار کرنا، ان کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ وغیرہ بلکہ حسب نک۔

۴-۰ تا ۴-۱۵ : اسکول سے گھر واپس آنا، کپڑے تبدیل کر کے ناشتہ کرنا۔

۴-۱۵ تا ۴-۴۵ : سیر و تفریح

۴-۴۵ تا ۸-۰ بجے شب : وہ سب پڑھ ڈالنا جو آج پڑھایا گیا تھا۔

۸-۰ تا ۸-۵ ؍ ؍ : رات کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنا۔

۸-۵ تا ۱۲-۵ ؍ ؍ : مسلسل سبق یاد کرنا۔

۱۲-۵ تا ۴-۰ ؍ صبح : سونا۔

ہفتہ کے دن اسکول سے واپسی پر اگر سینما یا میچ دیکھنے چلے جائیں یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے لیے کافی ہاؤس وغیرہ کا ایک آدھ چکر لگا لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا لیکن مناسب ہوگا کہ حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ اتوار اور چھٹیوں میں درمیانی وقفہ (اتنا ہی) امتحان کے پرچے تیار کرنا، گھڑی سامنے رکھ کر ان کی مشق کرنا، حل شدہ پرچے پڑھنا، گیس ورک تیار کرنا، ماسٹر صاحب کے اپارٹمنٹ پر پہنچ جانا وغیرہ۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک ایسا جامع پروگرام تھا کہ اس کو محض دیکھ کر ہی بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر اس ٹائم ٹیبل کے کچھ حصوں پر عمل کرنے کی بھی کوشش کی گئی نہ جانے کیسے کیا ہوا کچھ کہا نہیں جا سکتا لکھنا تنا ضرور علم ہے کہ اسی غور و فکر میں رفتہ رفتہ سال تمام ہوا اور جو کچھ نتیجہ برآمد ہوا اس نے دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اس "ٹائم ٹیبل" میں کیا ایسی چیزیں پھر بھی رہ گئی تھیں جن کو اگر شامل کر دیا جائے تو ایک کامیاب "ٹائم ٹیبل" تیار ہو جائے جس پر عمل کر کے پہلا "ایلا" دن ایہ پلان" کامیابی کا منہ دیکھ سکے۔

لب عیسی

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر

(محمد عبداللہ صدیقی)

ہنسنے اور ہنسانے کے لئے مخصوص دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا۔

اُردو شاعری میں جب سے غزل خاں شروع ہوئی ہے ہنسی کی باتوں پہ شاعر ہنستے اور رونے کی باتوں پر روتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ ظرافت بھی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو ادب و شعر کے جوبن پر ایک بہار ہمیشہ طاری رہی ہے۔ دبی دبی مسکراہٹوں سے دل کی کلیاں چٹکتی اور بلند قہقہوں سے زعفران زار کھلتے رہے ہیں۔ اور جب تک دُنیا قائم ہے یہ باغ اسی طرح لہلہاتا رہے گا ؎

ظریفانہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہجو، ہزل، طنز، تحریف، تمسخر اور بدیہہ گوئی وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ مَیں نے اس مقالے میں ہر قسم کے شاعروں کا تذکرہ کیا اور اُنکے کلام کے نمونے دیکر ان پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ان شاعروں کے پہلو بہ پہلو جو اس میدان کے شہسوار ہیں وہ قابلِ ذکر شاعر بھی آ گئے ہیں جنہوں نے محض سیر و تفریح کی غرض سے اس دشت کی سیاحی کی ہے۔ تاہم یہ جائزہ مکمل نہیں ؎

اس مضمون کی تقسیم یُوں سمجھئے کہ قدماء کا دَور میر جعفر زٹلی سے شروع ہو کر ریختی گو شعراء پر ختم ہو جاتا ہے۔ اودھ پنچ کے اجراء سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی ان دونوں دوروں کے درمیان سنگِ میل ہیں۔ ان سے لیکر موجودہ دور تک یہی دور چلا آتا ہے۔ رنگ و آہنگ میں جو جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں اُن کا ذکر اپنی اپنی جگہ آئیگا مختصر یہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے رہے ہیں مگر ؏ ہر گلے را رنگ و بُوئے دیگر است

جعفر زٹلی

"اردو نظم میں جعفر زٹلی کو پہلا ظریف شاعر یا ہزّال مانا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ عالمگیر کا آخری دور ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں دربار کی زبان فارسی تھی اور اردو کا رواج بہت کم تھا، اس لیے ان کی شاعری میں زیادہ فارسی کے الفاظ بلکہ پورے پورے فارسی کے مصرعے پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس دور کے مذاق کا تعلق ہے، ہر وہ بات جس سے انسان ہنس پڑے خواہ وہ فحش ہی کیوں نہ ہو مزاح و ظرافت تصور کی جاتی تھی۔ نثر و نظم دونوں میں جعفر کا انداز بالکل ایک سا ہے۔ زٹلی کی ہجویات سے نہ صرف روسا بلکہ بادشاہ اور شہزادے تک ڈرتے تھے۔ انھوں نے 'شرارت' کے نام سے جو مضمون نثر میں لکھا ہے، اس میں بہت سی اچھوتی اصطلاحات ہم کو ملتی ہیں۔ شعر و سخن کے میدان میں بھی انھوں نے انوکھی اضافتیں اور نئے نئے محاورات استعمال کیے ہیں۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح از فرقت کاکوروی ص ۲۹)

میر جعفر زٹلی حقیقت میں ایک ظریف عوامی شاعر تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کا آبائی وطن دہلی تھا یا نارنول (ضلع میرٹھ) بہرحال وہ ۱۶۵۹ء میں بعہد شاہ جہان پیدا ہوئے اور ۱۷۱۳ء میں چوّن سال کی عمر پاکر عالمگیر کے عہد میں انتقال کر گئے۔ انھیں شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا، بچپن ہی سے اشعار موزوں کرنے لگے اور رفتہ رفتہ فنا فی الشعر ہو گئے۔ چونکہ اشعار میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی اس لیے لوگ پسند کرتے تھے۔

میر جعفر نے ابو اسحاق اطعمہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بھی ایک پرانے ہزّال تھے اس لیے آپ نے بھی یہی رنگ اختیار کر لیا اور اس میں ایسے کامل الفن ہوئے کہ ان کی شاعری اور ہزالی کا ایک خاص معیار قرار پا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ابو اسحاق اطعمہ ایک جابر استاد تھا، لڑکے اس کے تشدد سے عاجز آ گئے تھے۔ میر جعفر بھی استاد کے ستم رسیدہ اور آفت کشیدہ تھے۔ انھوں نے استاد کے خلاف پہلے تو ایک نظم 'بھوت بڑا ہے' کے عنوان سے لکھی پھر کچھ اور لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے میر جعفر کو بیک بینی و دو گوش اپنے مکتب سے نکال دیا۔

میر جعفر نکل تو گئے مگر سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔ گویا بارود کو آگ لگ گئی۔ فوراً ایک ہجو نامہ لکھا۔ جس میں مولوی صاحب کی جی کھول کر ہجو کی۔ اس کا ابتدائی بند یہ ہے ؎

کہتا ہوں ہجو سے نامے کو نادر سخن ستی — سُن مرحبا کہو گے مجھے اس بچن ستی

مشہور ہے یہ بات کفو سے زمن ستی — ہجو سے کو شیخ جی نے دفادی تھی فن ستی

رنس کا کروں بیان سنو جان و تن ستی

یہ ہجو نامہ جیسا کہ تذکرہ خندۂ گل میں لکھا ہے بہت مشہور ہوا کہ شہزادہ کام بخش کے کانوں تک پہنچا اور میر صاحب طلب ہوئے۔ چونکہ نظم میں ہجو کے ساتھ ہی ظرافت کی [illegible] چاشنی بھی [illegible] اس لیے شہزادہ بہت خوش ہوکر [illegible] کی خدمت میں جعفر کو دے دی۔ جس سے معلوم

ہو گیا کہ جعفر زٹلی نہایت اچھے شاعر ہیں تو شہزادہ نے امتحاناً ان سے ایک غزل کی فرمایش کی انھوں نے تعمیلِ ارشاد کی اور غزل کہی جس میں کے ایک دو شعر یہ ہیں :

از عاشقِ بیچارہ مکن نخرہ و گھونگھٹ	تا کے بود ایں گرمیِ بازار جو ہے تو
تا چند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی	یہ رنگ پتنگے کا اوڑن ہار جو ہے تو

شہزادہ نے غزل پسند کی اور اس کی بدولت میر صاحب کی شہرت ایک سے دہ چند ہو گئی۔ مگر خالی شہرت سے کام نہیں چلتا ضرورت تھی کہ نقد و جنس سے کچھ ان کی امداد کی جاتی مگر ایسا نہ ہوا۔ میر جعفر کا دل تنگ ہو گیا اور اب ان کو مورچھل کی خدمت بار ہو گئی انھوں نے فوراً اس خدمت کی ہجو لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں :-

توبہ ازیں وسوسۂ مورچھل	دمبدم از دمدمہ جاں در خلل
توبہ ازیں مسکن روزن فراخ	روز و شب آوازۂ پھس پھوں ٹپاخ
توبہ ازیں مسکن پرشور و شر	مرحلہ پرخطر و خوف و ڈر
پرخس و خاشاک بہ سر ٹوکری	نزد خرد بہتر ازیں نوکری

جعفر ازیں کوچہ دریں مورچھل
شرم حضوری بکن و لوٹ چل

شہزادہ کو جب اس ہجو کا حال معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے۔ جب ان کو یہ خبر ہوئی تو انھوں نے شہزادہ کو بے ڈالا ہجو لکھی اور دل کھول کر لکھی ایک شعر یہ ہے :-

زہے شاہ والا گہر کام بخش	کہ غچی بزد کرد و پچی دبخش

اس کے بعد نوکری سے بیزار ہوئے اور دکن کی طرف چل دیے مگر بدقسمتی ہر جگہ ساتھ تھی یہاں بھی روزگار نہ ملا تو جھنجھلا کر یہ غزل کہی :-

تنہا شدی اندر سفر کہہ جعفر اب کیسے بنے	افتادی اندر بحر و بر کہہ جعفر اب کیسے بنے
در بیکسی تا بودۂ با درد و غم آلودۂ	مفلس شدی و در بدر کہہ جعفر اب کیسے بنے
از ہجو آں سلطان خود کردی پریشاں جانِ خود	درماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسے بنے
اسباب غم برداشتی تخمِ فلاکت کاشتی	اکنوں کجا آں سیم و زر کہہ جعفر اب کیسے بنے

اتفاق سے جس زمانہ میں یہ پریشان روزگار دکن کی خاک چھانتے ہل ہانکتے کودوں چھانکتے پھر رہے تھے اسی زمانہ میں نواب کوکلتاش خاں ستارہ کی مہم پر گئے۔ جعفر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نثر کا ایک رقعہ لکھا نواب پر بڑا اثر پڑا۔ اپنے یہاں ملازم رکھ لیا مگر صرف کھانا ملتا تھا نہ کپڑا مقرر ہوا۔ اور نہ کپڑا بنانے کے لیے کوئی پیسہ ملا۔ مجبوراً ایک منظوم عرضداشت لکھی ؎

حضور جہاں شاہ گیتی پناہ ۔۔۔ زبیداد جُواں زُٹل داد خواہ

جُواں پڑ گئیں در قبا و ازار ۔۔۔ نئی آئی مشکل بہ دتی دیار

اُدھی رات تن بیچ اُٹھی کلبلی ۔۔۔ چوں دیدم کہ فوجاں جُواں کی چلی

لڑائی پڑی جُواں سے وقت رات ۔۔۔ جُواں کا چلا منہ اور چلا میرا ہات

رکت کی جویں میری پیاسی پھریں ۔۔۔ کہ حیران و ہلکان مجھ کو کریں

لہو میرا پی پی کے موٹی ہوئیں ۔۔۔ بغل بیچ دشمن مری ہو رہیں

جُواں مارتے مارتے شب گزشت ۔۔۔ وَلے یک جُواں از میاں کم نگشت

کروڑوں جُوئیں اور اکیلا منم

دونوں ہاتھ سے ناکجا می زنم

خیر اتنا ہوا کہ یہ عرضی منظور ہوئی اور کپڑے بنوا دیے۔ مگر چند روز بعد اور اسباب پیش آئے اور یہ وہاں سے بھی جدا ہو گئے۔

میر صاحب کی زندگی نہایت مفلسی اور مفلوک الحالی پریشان روزگاری میں بسر ہوئی۔ مگر وہ زمانہ کی زبردستیوں سے عاجز آ کر کبھی ہیچ نہ اُٹھتے تھے۔ بلکہ نہایت آزادی اور خوشدلی سے ان تمام سختیوں کو برداشت کرتے تھے۔ اسی طرح ان کا مشغلہ شاعری خاص کسی کی مدح و ذم کا پابند نہ تھا۔ وہ ذاتی خصومت کی بنا پر کسی کی ہجو نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس سے تفریح و انبساط مقصود ہوتا تھا۔

میر جعفر کی شادی بدقسمتی سے ایک بدصورت اور بدسلیقہ عورت سے ہوئی۔ اس نے ان کی زندگی تلخ کر دی۔ اپنی مصیبت کا دکھڑا اس طرح روتے ہیں ؎

کھول گھونگٹ کیا دیکھوں بیچ ۔۔۔ دھنپت بیٹھا گھونگٹ بیچ

لاکھ روپیہ مہر بندھایا ۔۔۔ ایسا مہنگا دھنپت پایا

گھونسی گھانسی لنڈی منڈی ۔۔۔ منہ ایسا جوں سانپ کی کُنڈی

بالوں کا کیا کروں احوال　　جیسے خچر کی ہوئے یال
دانتوں کا کیا کروں بچار　　ٹوٹے پھوٹے اور اجاڑ
ہونٹوں کا کیا کروں بیان　　جیسی کہ نانبائی کی نان
بات کہے پر نہ آئے بول
جیسے باجے پھوٹر ڈھول

اور پھر چند دن بعد سے

جھگڑا رگڑا ایسا پسارا　　ماگے جوتے مارگ مارا
دے دھما دھم ایدھر اودھر　　اب میں مولا جاؤں کیدھر
انجر پنجر ٹوٹن لاگے　　مردے زندے سوتے جاگے
بجلی ہے یا آگ بگولا　　جیسے نام خدا کا بھولا
نت اٹھ گھر کے باسن پھوڑے　　آگ لگان پانی کو دوڑے
کام کرے تو ایسا کرے　　چولھے کی ہانڈی کھڈی دھرے
جیسا مجھ کو ناچ نچایا　　جیسا کیا میں ویسا پایا
جعفر پیارے اب کیا کیجے　　تن من دھر تقدیر کو دیجے
کرم میں لکھا تھا سو پایا
ناحق میں یہ نند مچایا

اُن کی ظرافت اگرچہ ہزل کے درجہ پر پہنچ گئی ہے اور خوش طبعی مسخراپن کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مسخراپن ہو ظرافت ہو ہزل ہو کچھ ہو اس درجہ کی ہے جس کا جواب بڑے بڑے اہلِ کمال نہیں دے سکتے۔ اُن کے ایک لفظ میں ظرافت اور خوش طبعی کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے۔

جن دنوں میر جعفر کوکلتاش کے یہاں رہتے تھے ایک روز یہ اتفاق پیش آیا کہ مرزا سلیمان کی اہلیہ مرزا سے ناراض ہو گئیں۔ میر جعفر کو خبر ہوئی۔ یہ جانتے تھے کہ مرزا کی بیوی اونچے گھرانے کی عورت ہے اور یہ دبیل ہیں انھوں نے چند قطعے لکھ ڈالے جو ہجو بھی ہیں۔ سامان تفریح بھی۔ پند و نصائح بھی۔ عزت بھی۔

جعفرا در جہاں معاذ اللہ — ہر کہ محتاج نان زن باشد
نتواند کہ ضبط بنشاند — گرچہ عفریت اہرمن باشد

جعفرا مطلبے کہ زن بکند — آہ آں زن زنست مردک خر
آرزوے دلش بہ دل ماند — خود بپے نان خراب و رسواتر

بہ زن کردن در افتادم بگرداب پریشانی — دل و دین رفت و نسیاں شد رہ و رسم سخندانی
بلے خوش گفتہ مصرع جعفرا ایں ازرہ فطرت — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

مرزا سلیمان کو جب خبر ہوئی تو بہت بگڑے اور کوکلتاش خاں کے پاس پہنچے۔ میر جعفر کی سخت سے سخت شکایت کی مگر انھوں نے ہنسی میں ڈال دیا اور ٹال دیا۔

ایک موقع پر کوکلتاش خاں نے غنیم کو سخت شکست دی۔ اور بہت کچھ مال غنیمت پایا۔ جب مال غنیمت تقسیم کیا تو آدھا مال خزانۂ شاہی میں بھیج دیا اور آدھا سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بیچارے سپاہی تو تھے نہیں کہ کچھ ان کو بھی ملتا۔ میر جعفر کو سخت رنج ہوا۔ نواب کے پاس پہنچ کر کہا کہ مجھ کو بھی حصہ دیجیے۔ کہا تم سپاہی نہیں۔ مرد میدان نہیں پھر حصہ کیسا۔ خیر اُس وقت تو جعفر خاموش ہو گئے۔ مگر دوسرے دن ایک تصنیف کیا ہوا رستم نامہ لیکر پہنچے اور نواب کو سنایا جو یہ ہے۔

من آں رستم وقت روئیں تنم — کہ دہ پا پڑ از مشت خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر — برآرم دو ما از سر مور بیتر
کشم گردن پشہ را در کمند — مگس چند را می در آرم بہ بند
بپوشم اگر جوشن جنگ را — ہزیمت دہم پسوے لنگ را

بہ صد حملہ بالِ مگس بر کنم	قطار دو صد مور بر ہم زنم
دریں دور ثانیٔ رستم منم	تنا سا بہ گرز گراں بشکنم
چناں بشکنم رشتۂ خام را	کہ سازم خجل رستم و سام را
تہمتن منم گر کشم تیغ خشم	تراشم بہ دو ضرب یک موئے چشم
چو بیند مرا شوم بقّہ بقّہ کند	چو از گربہ مرغے کہ کڑ کڑ کند

بیا جعفر ایں قصہ کوتاہ کن

بہ سمتِ جنابِ سخی راہ کن

اتفاق کی بات ہے کہ میر صاحب جب بہ فخریہ رجز سنا رہے تھے اسی وقت خبر آئی کہ مغلیہ فوج مغلوب ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئی ہے کوکلتاش خاں کو بڑا صدمہ ہوا۔ اور ایسے بگڑے کہ میر صاحب کو نکلوا دیا۔ اس طرح میر صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ دو نظمیں لکھیں جس میں سے ایک میں اپنی شانِ استغنا کا ذکر تھا دوسری میں نوکری کی برائیاں تھیں چنانچہ دوسری نظم یہ ہے:۔

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہووے کھوکری	تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
ہر روز مجرا اُٹھ کریں در کار یک سُو کر پڑیں	بے شرم ایسے لڑ مریں یہ نوکری کا خبط ہے
دس بیس مجرے ہیں گئے دس بیس بخشی نے لیے	دس بیس میں جھگڑے کیے یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے	اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں	یارا ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے

ایک مرتبہ میر صاحب کے یہاں چوری ہو گئی اور کچھ بھی باقی نہ رہا غصہ میں یہ نظم کہی۔

دلاور مفلسی سب سے اکڑ رہ	بہ عالم بے کسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ	پھٹی پگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شلوار نباشد کس کو غم ہے	لنگوٹا باندھ کر سب سے اکڑ رہ

ایک دفعہ لوگوں نے صلاح دی کہ کوکلتاش خاں سے عفو جرائم کی درخواست کرو انھوں نے ہرگز منظور نہ کیا اور یہ نظم لکھی :-

اے تونگر این محسل آبشورہ تابکے   شربت قند و گلاب کورہ کورہ تابکے

کج کلاہ و قرب شاہی عز و جاہ و سال و ماہ   پاندان نقرہ و زریں کٹورہ تابکے

کُلّ شیءٍ ھَالِکٌ جعفر زباں را بندکن   ایں سخنہائے زٹل پھک اپھکوڑہ تابکے

اورنگ زیب کی وفات پر میر صاحب نے دو مرثیے لکھے ایک نہایت متین ہے دوسرا اُن کے رنگ کا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :-

اورنگ زیب مر گئے نیکی جگت میں کر گئے   تخت اور چھپر کھٹ دھر گئے آخر فنا آخر فنا

متوا خدا کی یاد میں رکھا اورنگ آباد میں   خبر لی گئیں بغداد میں آخر فنا آخر فنا

تذکرہ خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ جب اعظم شاہ تخت نشین ہوئے تو شعرا کے ساتھ میر صاحب نے بھی سکہ نظم کیا اور وہ نہ صرف بادشاہ کو پسند ہوا بلکہ خاص و عام کو پسند آیا۔ بادشاہ نے انعام میں خلعتِ فاخرہ اور ہاتھی اور ایک لاکھ روپیہ دیا۔ مگر ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچنے بھی نہ پائے اور تمام روپیہ راستہ ہی میں صرف کر دیا۔

میر صاحب کے کلیات میں اگرچہ فحش بہت زیادہ ہے پھر بھی وہ انواع و اقسام ظرافت نظم و نثر سے مملو ہے چنانچہ

۱- گفتگو نامہ نثر جس میں اردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا محل صرف نہایت خوبی سے بتایا گیا ہے۔

۲- رقعات نثر جن میں تلازمے اور طرح طرح کی شوخیوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

۳- عدالتی تحریریں نثر اپنے خاص الخاص رنگ میں جن میں تلازمے ظرافت شوخیاں اپنے اپنے محل پر سبھی کچھ ہیں۔

۴- شرارت نامہ جس کو شاہی یادداشتوں اور تزک کے طرز پر مرتب کیا ہے اور اس میں ضرب الامثال کو اس صورت سے صرف کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۵- مصطلحاتِ زمانہ۔ یہ لغت کے طریق پر ہے۔ زمانہ کی رسم و رواج اور ضرورت کے موافق اس میں الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں اگرچہ اس کو دیکھ کر میر صاحب کے کمالِ ظرافت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ مگر اس کی ایجاد کا سہرا غالباً عبید زاکانی کے سر ہے۔ اُن کی لغت بھی اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اور اقسام کی نثریں بھی پائی جاتی ہیں۔

حصۂ نظم۔ جس میں ظرافت، واقعات، ہجویات، رقعات، دستور العمل، پند و نصائح، رجز، نسخہ جات، مثلے، غزلیات، مورچھل نامہ، گھوڑے نامہ مسدس، ظفر نامہ مراثی، پیش نامہ، تضمین قطعات، اُردو فارسی سبھی کچھ ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اگرچہ اُن کا کلام اُن کے رنگ میں سراپا انتخاب ہے مگر ضرورتاً تھوڑا سا انتخاب پیش کرتا ہوں :-

سودا

مرزا محمد رفیع سودا جن کی شیوا بیانی کی بڑی دھوم ہے اور جن کی ہجو نگاری نے اپنے معاصرین کا ناک میں دم کر دیا تھا مرزا محمد شفیع کے فرزند تھے جو کابل سے دہلی میں آ کر تجارت پر بسر اوقات کرتے تھے۔ وہ ۱۱۲۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور اپنے زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے بعد شعر و شاعری میں شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ قسمت کی خوبی اور شگفتہ مزاجی نے شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے خطاب ملک الشعرائی دلوایا۔ خاندانِ تیموریہ کے چراغ اقبال کی روشنی ذرا مدھم ہوئی تو دہلی سے فرخ آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے جہاں وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کا دور دورہ تھا۔ یہاں بھی ان کی شایانِ شان عزت ہوئی۔ وہ عالمِ شباب سے پیری تک لکھنؤ میں رہے اور ۱۱۹۵ھ میں یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔

میر انیس کے پردادا میر ضاحک سے خدا معلوم کس بات پر چل گئی کہ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے ہجوؤں کی بھرمار رہنے لگی۔ سودا کی شاعرانہ معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا ایک ایک اعتراض کے سو سو جواب دیتے تھے اور انھیں سے ان کی ظریف المزاجی اور بذلہ سنجی کا پتہ چلتا ہے امتدادِ زمانہ سے میر ضاحک کی محنت تو ضائع ہو گئی۔ سودا کی کہی ہوئی ہجویں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ یہ ترجیع بند میر ضاحک کی ہجو میں ہے ؎

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام — کیوں کیا کرتا ہے ہجوِ خاص و عام
آپ کو کہتا ہے تو سیّد ہوں میں — جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں — ہو اگر ختم رسالت کا کلام
کون ہے تیری سیادت کا مقر — جانتے ہیں خاص سے لے تا عوام
تیرے والد کو ہوئی تپ ایک سال — تب حکیموں نے بہ تشخیص تمام
دق سمجھ کر یہ دوا تجویز کی — شیرِ خر با قرص کافور ایک دام
مول لے اک مادہ خر پینے لگا — ہر سحر اس شیرِ خر کا بھر کے جام
آخرکار اس مرض کے بھی لئے — وہ جو مادہ خر تھی اُس کی آئی کام

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحمِ مادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

سُن تو ٹک اے نصف انساں نصف خر / ہم نے کیا سیّد نہیں دیکھے مگر
بیش و کم تجھ میں نہ دیکھا عقل و حمق / نطفہ کی ترکیب کا ہے یہ اثر
گھر سے اپنے کھا کے جاوے جس کے ہاں / جاتے ہی مانگے ہے اس سے ماحضر
عقل کہتی ہے کہ کھانے پر نہ کھا / حمق کہتا ہے کہ ہیضے سے نہ ڈر
سیّد اے میر مثلث آپ کو / کہنا اتنا ہو کے بے خوف و خطر
ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

ایک دوسری ہجو جو میر ضاحک کے متعلق لکھی ہے اس کا ایک بند دیکھئے۔ متانت پناہ مانگتی ہے ظرافت انگشت بدنداں ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا / بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
مجلس میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا / تب شیخ سدو اس پر غصہ کو کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

میر ضاحک کی ہجو میں ایک مخمس کی ابتدا اس بند سے ہوئی ہے ؎

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر / ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے نو لڑ ہو اگر بچۂ بندر / گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر
روٹی تو کما کھاوے کسی طرح مچھندر

بڑھاپے کی شادی پر ایک مخمس لکھا ہے جس سے ان کی انتہائی ظرافت کا پتہ چلتا ہے:۔

نائن کہے ہے شرم سے دولھا ہے سرنگوں / اب کیونکہ تیل رُوئے مقدس کو میں ملوں
شانہ کروں میں ریش کو یا وسمہ سے رنگوں / جی کی امان پاؤں تو اک بات میں کہوں
منھ کو کلنگ اپنے لگاتے ہیں شیخ جی

الغصہ شیخ جی کی جو حرمت خدا گنوائے — بارہ برس کی چھوکری باجا بجاتے لائے
آئے دولھن کے گھر سے جو مقنع میں منہ چھپائے — جیسا ہمارے کہنے کو خاطر میں وہ نہ لائے

اپنے کیے کو تیسا ہی پاتے ہیں شیخ جی

جورو کہے ہے شیخ سے اے شیخ تم سنو — چھوے کو تم نے دی ہے دغا چپکے ہو رہو
میں جانتی ہوں تم کو کہ تم فیلسوف ہو — سودا زیادہ کیا کہے ہے بات گو مگو

جیسے ہیں ویسے جوتیاں کھاتے ہیں شیخ جی

کسی مولوی نے فتویٰ دے دیا کہ کوا حلال ہے۔ سودا کو ظرافت کے لیے ایک مسالہ ہاتھ آیا۔ فوراً ایک ہجو لکھ ڈالی۔ اور وہ وہ اوکیا سنائیں کہ آج تک دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے — کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر و نہی میں کرنا محال ہے — جو فقہ داں ہیں سب کو یہ اُن کا خیال ہے

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

حامی انھوں کے قول کا ہوئے ہے چاند خاں — اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شک رہا ہے کوے کی حلت کے درمیاں — ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

یارو لبو ہو تم اسی دیر خراب میں — بیٹھا اٹھا کرو ہو سدا شیخ و شاب میں
حلت رکھے ہے زاغ کسو بھی کتاب میں — جتنی کتب ہیں فقہ کی اُن کے جواب میں

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

فدوی ایک پنجابی شاعر تھے رسمی معلومات شاعرانہ بھی اچھی خاصی تھی۔ اتفاق سے اُن سے اور سودا سے کچھ بحث ہو گئی۔ سودا نے اس غریب کی اتنی ہجو کی کہ عاجز آ گیا۔

جہاں میں کون بناتا ہے اُلو بننے کا　　کسی سے بن کوئی آتا ہے اُلّو بننے کا
بہت ہی جان کھپاتا ہے اُلو بننے کا　　بنا مجھی کو یہ آتا ہے اُلّو بننے کا
کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے اُلّو بننے کا

کیا ہے خرچ بنانے میں اُس کے میں یہ ہُنر　　نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرہ بھر
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے ہے نر　　جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے اُلّو بننے کا

میں کاریگر ہوں اٹا وہ کا سب پہ ہے ظاہر　　جو کچھ کہے کوئی کرتا ہوں پیٹ کی خاطر
وہ بوم بننے میں گر نقص سے ہو کچھ ماہر　　تو اُس کی شکل کروں اور جانور کی پھر
عجیب شور مچاتا ہے اُلو بننے کا

غرض کہ اسی طرح ایک مولوی صاحب کشمیری کی ہجو میر ہاتف کی مذمت مرزا فاخر مکین کا خاکہ مولوی ندرت کشمیری کی لڑکی کی تذلیل اور تضحیک اُن کے یہاں موجود ہے جو بوجہ طوالت کے نہیں لکھی جاتیں۔

اگرچہ یہ کہنا زیادتی ہے کہ ہجو بھی داخل ظرافت ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجو نگار بھی تمام مسخرا پن اور ٹھٹھول طعن و طنز و تشنیع کے ذرایع کام میں لاتا ہے اور اسی سے ایک صورت ظرافت کی پیدا ہو جاتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو میں سودا نے اپنے عہد کے فوجی نظام پر چوٹ کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اُٹھ گئے ہیں دانت　　جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سِن　　پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے　　شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

گھوڑے کی سُستی

اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں　　دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید　　تھا بسر و سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار

پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں — شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

مرہٹوں کی فوج سے مقابلہ کے لیے گھوڑے کا مالک اس پر سوار ہو کر جس شان سے نکلا تھا اس کی تصویر اس طرح اتاری ہے :-

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں — دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ — ٹک ٹک سے پاشنہ کی مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلاتے تھا سئیس — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

میدانِ جنگ میں پہنچنے پر جو کیفیت گزری ؎

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر — دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف — القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے کا مالک مفلسی کی وجہ سے دانہ تک فراہم نہیں کر سکتا ؎

نے دانہ و گیاہ نہ تیمار نے سئیس — رکھتا ہوں جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ تو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد — امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

گھوڑے کی بھوک کی شدت ملاحظہ ہو ؎

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا — چو کے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ سپار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ   ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹیکے ہے بار بار

اس کی ناتوانی کا حال ؎

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے   میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں   دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ   خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

میر

خدائے سخن میر تقی میر کے تفصیلی حالات اور واقعات کے لیے ذکرِ میر، فیضِ میر، نکات الشعرا، کلیاتِ میر، آبِ حیات اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ملاحظہ فرمائیے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے بزرگ حجاز سے ہجرت کر کے دکن پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں آئے پھر آگرہ میں قیام کیا۔ میر وہیں ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دہلی چلے آئے۔ انھیں کے زیرِ سایہ پرورش پائی اور تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ برسوں وہاں رہے اور نوے برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

میر نہایت نازک مزاج، خوددار، خود پسند، بیحد قانع اور متوکل شخص تھے۔ ہر صنفِ شعر پر قادر تھے۔ تمام اساتذۂ فن نے ان کو استاد تسلیم کیا ہے۔ چھ دیوان غزلوں کے، دو واسوخت، کئی مخمس اور مثنویاں مثلاً شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوشِ عشق، معاملاتِ عشق، خواب و خیال، شکار نامہ، اژدر نامہ اور تذکرہ نکات الشعرا ان کی یادگار ہیں۔

میر نے سودا کی طرح ہجویں بھی لکھی ہیں مگر سودا سے کمتر درجہ کی ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر وزیر آغا "میر نے ذاتیات کے جھگڑوں میں الجھنے کی بجائے اپنے ماحول کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے گھر کا جس انداز سے مضحکہ اڑایا ہے اور جس طریق سے اس کی جزئیات پر نظرِ غائر ڈالی ہے۔ وہ بیحد قابلِ تعریف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ "گھر" کی یہ ہجو میر کے رنگِ طبیعت کے عین مطابق ہے لہٰذا یہاں وہ اپنی شاعری کے مقامِ بلند پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میر دراصل نہاں خانۂ دل کے شاعر ہیں اور اپنے شعر میں ماحول کی عکاسی کی بجائے داخلی طریقِ کار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے "گھر" میں ایک لحظہ کے لیے جھانکتے ہیں تو دراصل اپنے نہاں خانۂ دل میں جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کے انتشار اور بے قراری کی طرح "گھر" کی ابتری اور بے ترتیبی بھی ان کے لیے دلچسپی کا موجب ہے۔ اور یہاں ان کے قلم میں وہی

روانی پیدا ہوتی ہے جو ان کی غزلیات کا مابہ الامتیاز ہے۔ علاوہ ازیں "گھر" کی ان ہجویات کے مطالعے سے میرؔ کی وسیع القلبی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ خود کو نشانۂ تمسخر بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے" (اردو ادب میں طنز و مزاح ص[illegible]) اس مثنوی کے چند شعر دیکھئے ؎

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال　　اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا لکھے مینہ سقف چھلنی تمام　　چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　سو شکستہ تر از دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھر کا

کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں　　پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر　　گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے　　برسے ہے اک خرابی گھر در سے

ایک چھپر ہے شہرہ دلی کا　　جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں　　سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے　　سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا　　پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان　　ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو — پائے پٹی لگائے کونے کو
ایسے ہوتے ہیں گھر ہیں تو بیٹھے — جیسے رستے ہیں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتوں کا رستا — کاش جنگل میں جا کے ہیں بستا
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جز جز میں اس کی بیٹھ گیا

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا!
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

میر اپنے گھر یا ماحول کا نقشہ کھینچنے میں جتنے کامیاب ہیں۔ افراد کی ہجو کہنے میں اتنے ہی ناکام ہیں۔ بعض بعض ہجوؤں میں تو وہ فحش اور گالی گلوچ کی حد تک چلے گئے ہیں اور خاصے اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہجویں اثر سے خالی ہیں۔ "خواجہ سرا" اور "بلاس رائے" کی ہجویات میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔ ہجو اکول کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اک ہے پُر خور آشنا بے پیر — سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر
صدمنی دیگ ہے شکم اس کا — نفس اژدہا ہے دم اس کا
آنت شیطان کی ہے اس کی آنت — دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت
گال کلّے سے پھر توے سے سیاہ — کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ
توند کالی جو کھول جائے لیٹ — آہنیں ہے تنور اس کا پیٹ
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی — چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی
کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اس کے چوتڑوں پر پیاز
خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شب کو نان ہالۂ ماہ،
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹی بھی کھائے جاتا ہے

بھوک کا بوڈلا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
دہر کا جلنا آگ سے مانوں — بھوک اس کی جلے تو میں جانوں
جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روح توشے کی روٹی میں ہو گی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے — مرگیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جائے
گور میں بھی کفن نگل جائے

مرغ باز

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ایک کے منہ میں مرغ کی منقار   ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے   تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے   بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

لشکر

جس کسی کو خدا کرے گمراہ   آوے لشکر میں رکھ امیدِ رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ   جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ
فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس   بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس   چیتھڑوں بن نہیں کسی کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ
مفلسی سے رہا ہے کس میں حال   خورش و خواب ہیں گے خواب و خیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال   زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

"ہجو نااہل" میں اپنے کسی حریف سے دو دو چونچیں کی ہیں ۔

سنو اے اہلِ سخن بعد از سلام   چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخمِ حرام
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے   بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے

شاعری کو میری ہو گئے جانتے — تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں با وقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — دردمند و عاشق دلریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ

ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے — تد توں یہ لونڈے آنے مجھ کنے

ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں سخن میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سال سا ہے فورتر

کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود — قلیۂ دہ روزے سے بھی بدنمود

باپ اس کا سخت ناداں نادرست — کوڑی کی سی گندی بی تفاق وست

مستی اس کی ساری اب جھڑ جائیگی — دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے

ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی — پودنے کی سی ہے اس کی ضامنی

یہ قبول خاطر و لطف سخن — دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور — اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

میں نے الٹی اجگروں کی دم میں صف — ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار — گو یہ نا سید کہے ہے کیا چمار

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر — شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
اُلّو ہے اور اُلّو کی مادہ بھی ہے

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے انھیں اس قسم کی ہجویں کہنے پر مجبور کیا گیا۔ ورنہ وہ اسے دل سے پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے طرزِ زندگی اور طرزِ احساس کو سماج کے طرزِ زندگی کے مقابل رکھ کر دونوں کا موازنہ کرتے تھے اور فیصلہ بھی اکثر اپنے خلاف کرتے تھے۔ وہ پی اوپر ہنستے بھی تھے اور اپنے آپ پر طنز بھی کرتے تھے۔ ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور بیزاری شامل ہو۔ بلکہ یہ طنز میرؔ کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔ یہاں لاکر وہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ ملا دیتے ہیں۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت[1]" اب آپ میرؔ کے کچھ شعر ایسے سُن لیجیے جن کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے۔

کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوانہ تھا — کتنا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو — ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ

اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں — میرؔ صاحب کو دیکھئے جو بنے

بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا — کسو وقت پاتے نہیں اس کو گھر

تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا — جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا

ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میرؔ جی تم جو سلامت ہو — شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمھارے کیا رو دیں

میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو — رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی

کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے — میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو

تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی — آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں

---

[1] مضمون "میرؔ جی" از محمد حسن عسکری مطبوعہ ساقی میر نمبر صفحہ ۲۷

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے — جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار — تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

وحشت ہے بہت میرؔ کو مل آیئے چل کر — کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میرؔ کو ٹک — خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

سودا ہو تب ہو میرؔ کو تو کریے کچھ علاج — اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں — جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کس طرح میرؔ جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب ان کے پیرہن پر

انشا

سید انشاء اللہ خاں، حکیم ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ان کے بزرگ نجفِ اشرف سے ہندوستان آ کر دہلی میں بس گئے تھے اور اپنے علم و فضل کی بدولت دربار میں رسائی حاصل کر کے سلسلۂ امراء میں داخل ہو گئے تھے۔ سید انشاء اللہ خاں کی ولادت نواب سراج الدولہ کے عہد میں ۱۷۵۶ء اور ۱۷۵۷ء کے درمیان مرشد آباد میں ہوئی۔ مولانا عبدالحی گل رعنا میں فرماتے ہیں:-

"ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں فضیلتِ علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی۔ یہ بھی بلا کے ذہین تھے۔ تھوڑے دنوں میں فارسی اور اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کر لی۔ طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی۔ شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے۔"

شاہ عالم کے زمانہ میں انشا باپ کے ہمراہ دہلی آئے اور شاہ عالم کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ اس وقت (۱۷۷۱ء - ۸۲) سلطنت کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ دربار نام کا دربار تھا۔ باقی اللہ کا نام۔ چار و ناچار چند روز نباہی اور اپنی خوش مذاقیوں اور گل افشانیوں سے اس وادیٔ خزاں رسیدہ کو گل و گلزار بنائے رکھا۔ یہاں سے طبیعت اچاٹ ہوئی تو لکھنؤ

کا رُخ کیا جہاں شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ نے باپ کے درباری ہونے کا لحاظ کر کے قدر کی اور غربت کے آنسو پونچھے۔ گر چند روز بعد نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے اور اس قدر مقرب ہوئے کہ نواب کو ان کے بغیر کسی وقت چین ہی نہ آتا تھا۔ لکھنؤ کی فضا نے انشاء کے بگڑے ہوئے مذاق کو جو دہلی کی صحبتوں میں خراب ہو چکا تھا کچھ ایسا نوازا کہ ان کے اصلی جوہر تمسخر، پھکڑ اور شہدپن کے غبار میں چھپ گئے۔

لکھنؤ میں انشاء اور مصحفی میں بڑے معرکے ہوئے جن کی تفصیل آبحیات اور دوسرے تذکروں میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :-

"ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور سازوباز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور جمانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشاء، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اوّل اوّل شاعرانہ چشمک رہی۔ بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ اور فحش و پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاء نے وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آئی۔" (مقدمہ تذکرہ ریاض الفصحا)

انشاء کی طبیعت ہنگامہ پسند ضرور تھی لیکن لکھنؤ میں اس معرکہ کی ابتدا خود مصحفی کی طرف سے ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں لکھنؤ کے مروجہ مذاق کے مطابق عجیب قوافی و ردیف کی طرح دی گئی۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مقطع تھا ؎

تھا مصحفی بہ مائل گریہ کہ پس از مرگ — تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

کسی نے اس شعر میں تصرف کر کے یوں کر دیا ؎

تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو پس از مرگ — تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

مصحفی سمجھے کہ یہ انشاء اور ان کے ہوا خواہوں کی شرارت ہے۔ انھوں نے ایک فخریہ غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہو دعوائے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو — برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

اک طرفہ خر سے مجھ کو بڑا کام ہے کہ ہائے — سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

اے مصحفی ز گوشہ خلوت بروں خرام
خالی است از برائے تو خود جائے شاعری

انشاء کی طبیعت اس وقت تک صاف تھی۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر مصحفی کے پاس غلط فہمی رفع کرنے گئے۔ لیکن مصحفی نے لاپروائی سے جواب دیا واپس آ کر انشاء نے بحرِ طویل میں مصحفی کی ہجو کہہ ڈالی۔ یہ اس مناقشے کی ابتدا تھی اس کی انتہا وہ ہوئی جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

اسی زمانہ میں ایک اور مشاعرہ ہوا۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مطلع ہے:

سرِ مشک کا تیرا تو ہے کافور کی گردن — نے موئے پری ایسے نہ بہ حور کی گردن

انشاء نے ایک طویل قصیدہ میں اس پر اعتراضات کیے۔ بعض شعر یہ ہیں:

سن لیجئے گوشِ دل سے مری مشفقانہ عرض — مانندِ بید غصہ سے مت تھرتھرائیے

کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر — مُردے کے پاس زندوں کو لا کر سنگھائیے

ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں — دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

آخری شعر میں در پردہ مصحفی پر چوٹ ہے جو بقولِ آزاد مسّی ملا کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے دانت سیاہ تھے۔ اس کے بعد انھیں ردیف قوافی میں خود غزل کہی ہے:

آئینے کی گر سیر کرے، شیخ تو دیکھے — سر خر کا، منہ خوک کا لنگور کی گردن

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن — رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشاءؔ — تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

مصحفی کب چپ رہنے والے تھے۔ انھوں نے جواب میں ایک قطعہ لکھا اور خود انشاء کی غزل پر بہت سے اعتراضات وارد کیے۔ غرض مناقشہ نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اور مصحفی کے شاگردوں میں سے گرم اور منتظر نے علاوہ اور ہجویاتِ رکیک کے ایک مثنوی "گرم طمانچہ" لکھی جس کے جواب میں انشاء نے بھی ایک مثنوی لکھی اور اس میں مصحفی کے ساتھ غریب مصحفن کو بھی شامل کر لیا۔ ایک باقاعدہ جلوس مرتب کیا گیا۔ ایک شخص ہاتھی پر بیٹھا ایک گڈے اور گڑیا کو لڑاتا جاتا تھا اور شعر پڑھتا جاتا تھا۔

مصحفی کے ہوا خواہوں نے بھی جلوس کا جواب جلوس سے دینا چاہا مگر شہر کے کوتوال نے روک دیا۔ مصحفی کی شکایت پر نواب وزیر آصف الدولہ نے انشاء کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ انشاء حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ربیع الاول $\frac{۱۲۱۲}{۱۷۹۷}$ھ میں نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اور یہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ کی فضا کے متعلق انشاء خود دریائے لطافت میں میر غفر غینی کی زبان سے فرماتے ہیں:

"جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو کہو تو اس میں کچھ لطف نہیں رہا۔ مجھ سے سنئے ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم

پہلے بہتر مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر صاحب، پھر حضرت میر درد صاحب جو میرے بھی استاد تھے وہ لوگ تو سب مر گئے، ان کا قدر دانی کرنیوالے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ویسے ہی شاعر ہیں اور دلّی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے تخم تاثیر، صحبت اثر۔ سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تمہارا خان مان کس دن شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے اور وہ دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیے کہ ضرب زید عمراً کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پری زاد تھے۔ ہم بھی گھورنے جاتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے، مرزا مظہر جان جاناں کے روز مرے کو نام رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری رنگین کا ایک استاد جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔"

میر انشا ضرورت سے زیادہ شوخ اور ظریف تھے۔ بعض اوقات حدِ اعتدال سے بڑھ جاتے تھے۔ اس لئے ۱۸۱۰ء میں نواب سے بگڑ گئی اور اس نے حکم دے دیا کہ دربار کے سوا کہیں نہ جائیں دربار میں بھی بن بلائے نہ آئیں۔ اسی پابندی کے عالم میں ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔

انشا کی تصانیف میں دریائے لطافت سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کلیات میں ایک فارسی، ایک اردو اور ایک بے نقط دیوان، مثنویاں، قصیدے، رباعیاں وغیرہ شامل ہیں۔ سب میں ان کے تمسخر اور مزاح کی شان موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشا ظرافت ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ وہ اگر اس کے سوا کچھ بھی نہ کہتے تب بھی ان کا علم و فضل اتنا ہی مسلّم ہوتا جتنا اب ہے۔

انشا کی شاعری کے متعلق مولانا آزاد کی اس رائے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پہ قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی ہے وہاں ٹھکانا نہیں۔"[1]

ان کی ظرافت کے اقسام گنانا ایک قسم کی دانستہ غلطی ہے۔ جو شخص بات بات میں ظرافت کے دریا بہا دے، کوئی کہاں تک اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ پھر بھی ریختی کو ان کے ظریفانہ انداز کا سب سے بڑا نمونہ سمجھئے۔ بعد ازاں مارواڑی وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ بہر صورت ہم ان کی ہر قسم کی ظریفانہ شوخیوں میں سے کچھ نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ نظم کا حصہ شروع کریں۔ ان کے کچھ لطائف لکھے دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے از راہِ تکلف و تصنع نہ تھا بلکہ ان کی فطرت یہی تھی۔ ان کا وجود ان کی ہستی محض ہنسنے ہنسانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ جس رنگ میں کوئی شعر کہتے ہیں۔ یا جس قسم کی ظرافت سے کام لیتے ہیں اس میں کسر باقی نہیں رکھتے۔ کیا مجال کہ کہیں اعتراض کی ایسا نظر بھر کر دیکھنے کی بھی گنجائش نکل آئے کوئی غلطی سرزد ہو۔ معاذ اللہ۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر انھوں نے اسی رنگ میں مشق کی ہے۔ اور یہی رنگ عمر بھر رہا ہے۔ وہ انتہا کے شوخ، حاضر جواب تھے۔ چنانچہ چند لطیفے درج کرتا ہوں۔

ایک دن نواب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے صافہ یا پگڑی علیحدہ رکھ دی سر گھٹا ہوا تھا نواب کے دل میں جو ترنگ اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک ٹیپ دی۔ آپ نے جلدی ٹوپی سر پر رکھ کر کہا۔ بزرگوں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا بڑی بری بات ہے۔ نواب

[1] تذکرہ خندۂ گل

نے کہا کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سنا تھا ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان دھولیں لگاتا ہے۔

ایک مرتبہ نواب نے دفتر والوں کو حکم دیا کہ بھئی سب خوشخط لکھو اور جو کوئی غلطی کرے گا فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ اتفاق کی بات ایک بڑے قابل مولوی صاحب نے فرد حساب میں اجناس کا سین بھول کر اجنا لکھ دیا۔ نواب صاحب نے کہیں دیکھ لیا۔ مولوی صاحب نے اس کے معنی بتانا شروع کیے اور تاویلوں کے انبار لگا دیے۔ نواب نے انشاؔ کو اشارہ کر دیا۔ انشاؔ نے یہ رباعیاں نظم کر کے پڑھیں اور غریب مولوی کو دیوانہ کر دیا۔

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا — یہاں ابر نعات کا گرجنا کیسا
گو ہوں اجنا کے معنے جو چیز اُگے — لیکن یہ نئی اپج اپجنا کیسا

اجناس کے بدلے لکھیے اجنا کیا خوب — قاموس کے عدد کا گرجنا کیا خوب
از روئے لغت نئی اپج لے لی ہے — اس تان کے بیچ کا اپجنا کیا خوب

اجناس کے موقعن پہ اجنا آیا — سلمائے علوم کا یہ جبنا آیا
اجنا چیزے ست کاں بر دید نہ زمیں — یہ تخم لغت کا لو اپجنا آیا

نواب نے کہیں روزہ رکھا تھا اور یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی نہ آئے۔ پہرہ لگوا دیا تھا مگر انشاؔ کو کوئی ضروری کام تھا۔ آخر عورتوں کا لباس بدل ناک پر انگلی رکھ نواب کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ نواب نے چونکہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی نہ آئے۔ اب یہ پہنچے ذرا تیوری پر بل آئے انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

میں تو کہتی تھی نہ رکھ اے مرے پیارے روزہ — بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

ایک مرتبہ لب دریا چلے جا رہے تھے ایک حویلی نظر آئی جس پر یہ تاریخ لکھی تھی ع

حویلی علی نقی خاں بہادر کی

کسی نے کہا کہ انشاؔ دیکھو کیا تاریخ کہی ہے ذرا اسے رباعی تو کر دو تو انھوں نے فی البدیہہ کہا ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لُر کی — حویلی علی نقی خاں بہادر کی

قائمؔ جو ان کے معاصر تھے انھوں نے انشاؔ کی ہجو کہی انشاؔ نے صلے میں پانچ روپیہ دیے اور کہا ؎

فائق بے حیا چو ہجوم گفت — دل من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم — دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

گیان چند ساہوکار کی مارواڑی میں ایسی ہجو لکھی ہے کہ تلوار تیغ تیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس کی عزت تک کا خون بہا دیا گیا ہے۔ جرأت کشلوں وغیرہ کی ہجوؤں میں پوری پوری مثنویاں نظم کر دیں۔ مصحفی سے الجھے تو ایسے ہی الجھے وہ وہ اوکھیاں کہیں کہ توبہ ہی توبہ ہے۔ انشاء کے لیے کوئی بھی ضروری نہ تھا کہ وہ جب ہزل یا ظرافت یا ہجو کا ارادہ کرتے تبھی ایسے شعر لکھتے نہیں غزل کہتے اس وقت بھی یہی عالم تھا۔ قصیدہ لکھتے تو بھی یہی رنگ غالب رہتا دو چار شعر اس قسم کے سنئے اس کے بعد ریختی کا رنگ دیکھئے۔

لیا گر عقل نے منہ میں دلِ بیتاب کا گٹکا — تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

صنم خانہ میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا — لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا
یہ سچ سمجھو کہ انشاء ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا — نہیں شعر و سخن میں کوئی اس کی ساکھ کا جوڑا

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا — ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا
سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا — تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں — میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے — یہ تو بیچاری آپ ننگی ہے
ڈر و وحشت کی دھوم دھام سے تم — وہ تو ایک دیونی دینگی ہے

خیال کیجئے کہ کیا آج کام میں نے کیا — جب اُن نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا — جب ہم سے آنکھوں گا صاحب سلام میرا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں راجہ کے کنڈ پر — بن کر مہنت گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خیر — تو یوں دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر
کدا اوے نشے کے مرے رخش کو — میاں ساقی اس سلفے کوڑے کی خیر
ہنسایا جو میں نے تو بولے نہیں — نظر آتی کچھ اس لنگوٹے کی خیر
لگا بیٹھے انشا کو ٹھوکر تو ایک — ارے اپنے سونے کی توڑے کی خیر

رادھکا کو چین کیا آوے کنہیا جی بغیر — واقعی کا فور اُڑ جائے اگر فلفل نہ ہو

جس پاس کہ سو لاکھ روپے کا بھی نہیں ملک — اس شخص پہ اصلا نہیں نواب کی پھبتی

تبت یدا ابی لہب پڑھ کے اک عزیز — یک چند بھاگ کر کسی کونے میں دب رہے
لوگوں نے ڈھونڈ کر انھیں پوچھا تو بولے آپ — واللہ مورے بھاگنے کا بھیو سبب رہے
ہے مالہٗ و ما کسب آیا اشتر آن میں — ان مال ہوے یعنی سو وہ ما کسب رہے
اہل و عیال کھائیں پئیں پھر کہاں سے کچھ — ٹھنکار ہی کی فکر بھیو روز و شب رہے

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اُتارئے — اور تان کر چٹاخ سے اک دھول مارئے

یہ آپ حسن پہ اپنے گھمنڈ کرتے ہیں — کہ اپنے شیش محل میں ہی ڈنڈ کرتے ہیں

یہ جو بوڑھا سا ہے دربان تمھارا اے کاش — کوئی چور آوے اور اس کی کوئی گردن مارے

آغا وہیں جو تازہ ولایت سورات کو — مطرب کو ڈوم کہتے ہیں بولے کہ دوم ہے

کیوں نہ لڑکے سب کہیں ہوا تمھیں اے شیخ جی — ہے جھوجی کی سی صورت یہ ڈرانی آپ کی

ہر دم یہ موچھ آپ کی اے شیخ تکیہ ریش — دکھلاتی ہے مجھے دنب الفار کی شبیہ

وہی پی کہاں وہی پی کہاں یہی ایک رٹ ہے جو ہے سو ہے — مہاراج چوٹ سی لگتی ہے مجھے اس پپیہے کی ٹیر سے

سانولے پن پر غضب ہے وضع بسنتی شال کی — جی میں ہے کہہ بیٹھئے اب جے کنہیا لال کی

غرضکہ اسی طرح بات بات میں ظرافت اور بھونڈ پن کرتے تھے۔ ریختی ان کا کوئی خاص رنگ نہ تھا بلکہ اپنے دوست میاں رنگین دہلوی کے اتباع میں تفنن طبع کے طریق پر یہ بھی لکھ ڈالی۔ اور لکھی تو ایسی اور اتنی لکھی کہ آج پورا ایک دیوان موجود ہے۔ ان کی ریختی میں خصوصیت سے یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ جان صاحب کی طرح تصنع اور آورد سے سراسر پاک ہے۔ خاص دلّی کی بیگمات کا روزمرہ ہے۔ اکثر اشعار ایسے ذومعنی ہیں جو ریختی اور ہزالی دونوں رنگوں کا نمونہ ہیں جنہیں دیکھنے والے خود سمجھ سکیں گے۔

میں کیا کہوں دوگانا اُس کل کے دوڑنے سے — جو حال ہو گیا ہے اس پانوں کی تلی کا

ہاتھوں سے تیرے ہیں تو کمبخت عاجز آئی — جو کام ہے نگوڑا تیرا سوہلبلی کا

انشاء سوائے اپنے اللہ کے جہاں میں — ہے کون کھونے والا اس دل کی بیکلی کا

اللہ کرے سلامت جم جم رہے یہ بیڑا — ہے جس کے دم قدم سے دنیا کا سب بکھیڑا

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہیں بہت سا لیکن — کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا

اپنے کوٹھے پہ کچھ اس ڈھب سے زنیلا کہ مری — لے گیا جان اڑا ایک کبوتر والا

ہے یہ سختی کونسی منزل انشاء اس کا نام تا — ڈر سا میرے دل کے اندر اس منزل میں بیٹھ گیا

اپنا جو دکھاتا ہے ہمیں زور نگوڑا — صدقے اسے کر ڈالئے در گور نگوڑا

میں چیخ پڑوں کیوں نہ جو لے انگلی میں اپنی — ڈالے مسل انگلی کی مری پور نگوڑا

تو قیامت بے سُری ہے حد بُرا تیرا گلا — خوش نہیں آتا ہمیں بی فاختہ تیرا گلا

آگ پینے کو جو آئیں تو کہیں لاگ لگا   بی بی ہمسائی نے دی جس میں مرے آگ لگا
نہ بُرا مانے تو لوں نوچ کوئی مٹھی بھر   بیگما تیری کیاری میں نیا ساگ لگا
شوق سے سونگھ لے انشا مرے بو بالوں کی   دے چنبل خور کے ہونٹوں میں تو اک ناگ لگا

مشک کی طرح سے گال اپنے پھلاتا کیوں ہے   ارے او سقہ کے لونڈے تو نہ پانی چھلکا

بس بلائیں مری نہ لے چٹ ہٹ   اے دگانا تو ایک ہے نٹ کھٹ
دم دلا سا عبث نہ دے آنا   چل پچی دور ہو پرے بھی ہٹ
چوٹ اک دل کو لگ گئی انشا   جب سنی اُس کے پانوں کی آہٹ

انشا سے ملتے کیوں نہیں عشق ہو بھلا تو دیر کیا   جی ہی پہ کھیلے ہو تو پھر لوگوں سے ڈرتے ہو عبث

سارے بھوتوں سے پرے ہے یہ مواخواجا خبیث   مجھ کو گھورا ہی کرے ہے یہ مواخواجا خبیث

کالے بادل نہ گھر آتے تو ارے او لوگو   آبرو آج مری مفت میں کیوں کھوتی صبح

کان کی لو میں گھسی موٹی سی بالی کیونکر   جس کا ہو سوئی کے ناکے سے بھی ننھا سوراخ

بلائیں میں نے جو لیں اُن کی کل چٹاخ پٹاخ   تو کس مزے سے کہا بیگمانے چل گستاخ

اری بی ایک ہی عیار ہو تم   ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم

میں تو کچھ کھیلی نہیں ہوں ایسی کچی گولیاں   جو نہ سمجھوں گی زناخی جان تیری بولیاں

بلا سے اگر آئی ہولی کہارو   نہ مجھ سے کرو بولی ٹھولی کہارو

رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی — اب تو نوبت بھی اٹھو اجی باجی باجی
لے لو اس کوٹھری میں میرے وڑانے کے لیے — اک عبا اوڑھ کے بن بیٹھیں میں حاجی باجی

ناحق ناحق مجھے جلاتی کیوں ہے — گھر میں مرے آگ لینے آتی کیوں ہے
آئی تو نہیں ٹھہرتی یہ رنجش ہے — بے فائدہ یاں تو آتی جاتی کیوں ہے

متفرقات

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر — فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

ٹک شیخِ سیہ رُو کے تبسم کو نہ دیکھو — معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے توا گرم

ہے شیخِ سیہ چہرہ جو مجلس میں پھُدکتا — یاروں کو ہے یاں روٹی کے لنگور کی سوجھی

دیا نامۂ سید انشا تو ان نے — دہتر جڑی اک سرنامہ بر پر

گھر سے باہر تمھیں آنا ہے اگر منع تو آپ — اپنے کوٹھے پہ کبوتر تو اڑا سکتے ہیں

کالی بلا کی شکل بنا کر جھپٹ نہ جا — ہیں نے کہا کہ دور ہو مجھ کو نہ تھام چھوڑ

بڑی داڑھیوں پہ نہ جا دلا، یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا — یہ شکار کھیلے ہیں بر ملا انھیں ٹٹیوں کی تو آڑ ہیں

انشا تو اینڈتے ہیں پڑے میکدے کے بیچ
کہیو سلام زاہدِ شب زندہ دار کو

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے والد کا نام ولی محمد اور دادا کا شیخ درویش محمد تھا جو موضع اکبر پور کے رہنے والے تھے۔ مصحفی ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں، تکمیل شاہجہان آباد میں ہوئی۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ دہلی اور لکھنؤ پہنچ کر دور ہو گئی۔ یہ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء کے قریب نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ دلی سے آنے والے بہت سے شعرا فیض آباد اور لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے۔ مصحفی ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آخر یہیں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں انتقال کیا۔

مصحفی شاعرانہ کمال اور علم و فضل میں اپنے معاصرین میر، سودا اور انشا وغیرہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ میر انشا کی وساطت سے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں داخل ہوئے اور کچھ درماہہ بھی مقرر ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکہ جما اور دوسرے باکمالوں کے ساتھ لوگوں کی زبانوں پر ان کا نام بھی آنے لگا۔ اس پر ان کے معاصرین رشک کرنے لگے۔ حسد و نفاق سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ باہم چشمک رہنے لگی۔ پہلے ظرافت اور پھر ہجو کے ناپاک اور گندے ہتھیار استعمال ہوئے۔ سید انشا کی شوخیوں اور بے اعتدالیوں نے ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ وہ کچھ کہلا کر چھوڑا کہ آج ان کو ہزل اور ہجو گوئی کا استاد ماننا پڑتا ہے۔

انشا اپنی رنگین مزاجی، بذلہ سنجی اور زمانہ سازی کی وجہ سے مرزا سلیمان شکوہ کے مزاج پر حاوی تھے۔ مصحفی سے بگڑے تو اپنی چکنی چپڑی خوشامدانہ باتوں سے مرزا سلیمان شکوہ کو بھی ان سے بددل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تنخواہ کم کر دی۔ اس پر غریب بڈھے نے جل کر یہ شعر کہے ؎

چالیس برس کا ہے یہ چالیس کے لائق	تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے	ہم بھی تھے کبھی روز میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر	ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اس واقعہ کے بعد انشا اور مصحفی میں رنجش کی ایسی گرہ بیٹھ گئی کہ بات کا بتنگڑ بن گیا اور ہجوؤں کا لنڈورا اتنا کھلا کہ توبہ ہی توبہ۔

مصحفی تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے ناقد بھی تھے۔ ان کے اردو اور فارسی شعرا کے تذکرے اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ نہایت ذکی، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزلوں کی غزلیں کہہ کر دو دو روپے کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ جہاں کوئی مشاعرہ ہوتا یہ بہت سے شعر اسی زمین میں کہہ کر رکھ لیا کرتے اور پھر گاہکوں کے ہاتھ حسبِ حیثیت شعر فروخت کر دیتے۔ اس کے باوجود تین تذکرے، چھ دیوان اردو کے اور ایک دیوان فارسی کا ان کی یادگار ہیں۔

مذ کلیات میں شاعرانہ تعلّی کی بے شمار مثالیں قصیدوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں میں ملتی ہیں اور انھیں محض رسمی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل مصحفی ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھے۔ تعلّی تو محض جذبۂ خود پرستی کی تسکین کے لیے ایک ذریعۂ اظہار ہے لیکن یہاں محض خود پرستی کا دبا ہوا جذبہ ہی اُبھرنے کے لیے بے چین نظر نہیں آتا بلکہ معاصرین سے چشمک ان سے مقابلہ، کبھی ان کی شہرت اور قبولِ عام کا اعتراف، کبھی ان کی ہمزگی کا دعویٰ، کبھی ان کے میدان کو مکمل کرنے کا اعلان کہیں ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کے لیے دلیلیں اور شواہد اور اس سلسلہ میں ان کی تضحیک اور ہجو، غرض طرح طرح کی کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک طرف خاص طور سے میر اور مرزا ہیں۔ دوسری طرف مصحفی اور ان کے شاگردوں میں گرم اور منتظر ہیں۔ یہ دونوں شاگرد وہی ہیں جو انشاؔ کے معرکے میں بھی پیش پیش تھے۔ میر اِن کے شاگردوں سے براہِ راست کبھی بدمزگی کا موقع نہ آیا۔ لیکن سوداؔ کا رنگ عام طور پر لکھنؤ اور دلّی میں دونوں جگہ یکساں طور پر مقبول تھا اور مصحفی خود بھی اسی رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ نہ ان کی طبیعت میں وہ شگفتگی تھی جو سوداؔ کو فطرت نے بخشی تھی نہ ایسا کوئی مربّی اور سرپرست انھیں نصیب ہوا کہ اس کی داد و دہش یا کم از کم سرپرستی انھیں ایک طرف فکرِ معاش سے فارغ کر دیتی اور دوسری طرف ایسے حریفوں کا منہ بند ہو جاتا۔ مصحفی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ بڑی ناانصافی اور ظلم ہوا ہے۔ وہ معاصرین میں اپنے علم و فضل اور فن لیاقت کے اعتبار سے کسی کو اپنا مقابل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ واقعہ ہے رنگین اور انشاؔ کو چھوڑ کر اس وقت کوئی دوسرا شاعر اس علم و فضل کا مالک نہ تھا — لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ قدر دانی سے محروم رہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انھوں نے تعلّی کا یہ انداز اختیار کیا۔ وہ چاہتے تو ہجو گوئی پر بھی اتر آتے۔ لیکن اس کا انھوں نے بار بار اعتراف کیا ہے کہ ان کے بس کی بات نہیں۔ شاید ایسا کر لیتے تو ان کی طبیعت کی تلخی اور المناکی کسی حد تک کم ہو جاتی۔" (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۲۶-۲۷)

اس پر ستم یہ ہوا کہ ان کی منکوحہ بیوی ایک لڑکی جن کر مر گئی۔ اس کے بعد مصحفی نے ایک زنِ مدخولہ بے نکاح و متعہ سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن اس کے چال چلن سے گھبرا کر قطع تعلق کر لیا۔ ایک تیسری عورت سے رشتہ جوڑا تو وہ کو چہ گرد نکلی اور چند روز بھی گھر کی چار دیواری میں نہ بیٹھ سکی۔ اس نے کسی دلّال کے بہکانے سے مصحفی سے جدائی طلب کی۔ ان دونوں عورتوں میں سے ایک کا نام شاید عصمت تھا جس کے متعلق مصحفی کہتے ہیں ؎

ہے حیف تو یہ کہ باجمال چوں حور ، عصمت اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں برعکس نہند نام زنگی کافور

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے اور کچھ کرتے تو صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بے کلی تو اک دن یارب مر جاویں گے یونہی عصمت عصمت کرتے

اس کے بعد ایک اور عورت سے بقولِ خود زنا سے بچنے کے لیے متعہ کیا۔ لیکن اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس محرومی پر اپنے فرزندانِ معنوی یعنی نظم و نثر کے دفتر دیکھ کر جی خوش کرتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مصحفی کی طبیعت میں تلخی اور زہرناکی اور بڑھ گئی اس کے باوجود ان کے کلام میں ظرافت کے اس قسم کے نمونے ملتے ہیں ؎

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ — لکھنؤ میں حسن کی بندھی ہے پوٹ

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخیٔ طبع کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس غزل کے چند ظریفانہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

پانی بھرے ہے یارو یہاں قرمزی دوشالا — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے — کافر کا فتنۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں — انگی کے رنگ سے جب واں تک کمر ہو لالا

اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا — چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا

سرگرم سیر گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا — نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا

چنے عاشق نہ کیوں اس کے ممولے — کہ چشم شوخ اس کی ہے ممولا
جزاک اللہ بنایا تو نے صیاد — قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا

انشاء کی منہ زوریاں اور ستم ظریفیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو مصحفی نے یہ رجز کہہ کر انشا کو چڑایا ؎

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدت — وہ شخص ہے واللہ کہ مجنوں مرے آگے
ہیں گوز سمجھتا ہوں سدا اس کی صدا کو — گر بول اٹھے اوبی کی چوں چوں مرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر — طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گو خصم بنے اسود افیوں مرے آگے

اپنی پرانی چارپائی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے — گور ہے یا کنواں ہے کھائی ہے

پٹی پائے تمام ناہموار — اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار
ڈھانچ ہے اس کا بسکہ اول جلول — کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چول
پائے ہیں کھنگی سے زرد و سیاہ — سیرووں کا ہے حال پھر بھی تباہ
بسکہ ہے ڈھلڈہلی و پوچ و لچر — چول کو روز چاہیئے پچر
اور کستا ہوں جس دن ادوائن — اک ذرا اس گھڑی تو جائے ہے تن
لیک جس وقت اس پہ پاؤں دھرا — جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا
بان کی اس کے کیا کروں تعریف — تھا وہ بافندہ بسکہ ذات شریف
چھید رکھے ہزار بانوں میں — وہیں گرہیں بے شمار بانوں میں
گر گدیلے کا اس پہ ہو بستر — تو بھی چبھتی ہے پھانس جوں نشتر
آکے جب رات اس پہ سوتا ہوں — کرکے ضامن کو یاد روتا ہوں
یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے — جس کو کہتے ہیں ٹولی لنگڑی ہے
نیچے اونچے جو اس کے ہیں پائے — ہیں معلّق زمیں پہ پڑوائے
بسکہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا — مارے غصّہ کے میں نہیں سوتا
جب کہیں آدھی رات جاتی ہے — اونگھ کے مارے نیند آتی ہے
کیونکر اس پر کوئی دوگانہ ہو — گر رہے مجھ سا جو یگانہ ہو
طول میں میرے قد سے ہے کمتر — عرض میں میرے تن سے ہے لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو — بس مسافر کی کیا سمائی ہو

اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر

یہ تو مصحفی کی چارپائی تھی، اس میں کھٹملوں کی افراط کا حال سنئے :-

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط — تلخ ہے ان سے اپنا خوابِ نشاط
کافروں نے یہ سر اٹھایا ہے — سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
بسکہ بے چین ہوں میں ان کے ہات — نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں — اِدھر اُدھر پڑا اُچھلتا ہوں
پائنچہ میں کبھی گھس آتے ہیں — کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں — کان پہ ان کے رینگتی نہیں جوں
لہو پی پی زبس ہوئے موٹے — ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
الغرض شام سے ہو شب بیدار — کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موٹے موٹے چُن چُن کر — چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پہ جو کر کے تلاش — کر دیا گھر کو خانۂ نقاش
ہے بجا بسکہ ہیں یہ زیاد — کہیئے راون کی ان کو گر اولاد
دوڑنے میں زبسکہ ہیں چالاک — میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
کوئی آساں ہاتھ آتے ہیں — گھائیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ان کی بُو سے دماغ عاجز ہے — بلکہ دودِ چراغ عاجز ہے

دشمنِ جاں یہ مصحفی کے ہیں
تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

اب مصحفی کے مکان کی حالت دیکھیں

اپنے رہنے کا جو ہے مکان — ہے بعینہ وہ صورتِ زنداں

اس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر — سیر یلدا کی وہاں کرے ہے نظر
نہ تو روزن نہ اس میں جالی ہے — دن رہے جیسے رات کالی ہے
جائے بول اس کے در کے آگے ہے — جو ہر مغز کو جلائے ہے
خاکبازی ہے اس کی چھت کا کام — خاک اس سے جھڑا کرے ہے مدام
گر نظر جائے جانب دیوار — نظر آتی ہے چینٹیوں کی قطار
رات دن جی صفا کو ترسے ہے — اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے — اپنی صورت کو بھول جاتا ہے

مصحفی جائے سینہ چاکی ہے
گھر نہیں یہ تو برج خاکی ہے

آخر میں مصحفی نے اپنی ناخوشگوار زندگی کی جس طرح ہنسی اڑائی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں — تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے — بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں — باطن میں ولے کریم کے نوکر ہیں
یہ عید نہ بقر عید نہ روزے نہ دھار — ہم بھی عجب اک نعیم کے نوکر ہیں

دی بانٹ محل میں چن چن کے تنخواہ — اور ہم کو بہانوں میں ہی ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم — لا حول ولا قوۃ الا باللہ

دیئے آغا نے روپے چالیس گر — فوت تنخواہ کر گیا یہ خبر
بھاگتے چور کی لنگوٹی سے — مصحفی ہاتھ گر لگے کر صبر

لعنت میں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا جتنے ہیں رنڈی باز تو اُن کا ہے پیشوا

باقی نظمیں اور قطعے بھی نہایت فحش اور رکیک ہیں۔ دیوان انگیختہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور اخلاقی اعتبار سے یہ کوئی زیادہ مستحسن نہیں۔ اس میں ریختی کی ایک سو بارہ غزلیں ہیں۔ رباعیات، فردیات، قطعات، مسدس اور مخمس اس کے علاوہ ہیں۔ رنگین نے ایک شعر میں اپنے آپ کو ریختی کا موجد اور انشا کو منہ چڑانے والا بنایا ہے ؎

ریختی کہنی اجی رنگین کی یہ ایجاد ہے منہ چڑاتا ہے موا انشا جیا کس واسطے

اس کے باوجود ان کی ریختی میں شاعری کا کوئی بڑا کمال نہیں البتہ اس سے ایک طرف اس ذہنی زوال اور پستی کا پتہ چلتا ہے جس میں اس وقت کا معاشرہ گر چکا تھا اور دوسری طرف اس نفسیاتی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جو عام طور پر صحت مند راستوں کے بند ہو جانے پر انسانی جذبات کو غلط راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ اظہار خیال کے اس غیر فطری ذریعے سے طوائفوں کی زبان کی نزاکت و نفاست اور ان کے خاص محاورات محفوظ کیے گئے ہیں۔ حمد اور غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے ؎

واری ترے جاؤں میں خالق ہے تو خلقت کا کیا مجھ سے بیان ذرہ ہوئے تیری قدرت کا
کچھ مجھ کو گناہوں کا خطرہ نہیں محشر میں چھوڑوں گی نہیں دامن خاتون قیامت کا
اب آٹھ پہر تجھ سے مانگوں ہوں دعا یہ میں بندی کو پڑے ہو کا رنگین کی نہ چاہت کا

مجھ پہ طوفان نہ رکھ چاہ کا چل دُور دوا جھوٹ سے منہ کا تری جائے گا اُڑ نور دوا
ایک تو شکل ڈرانی سی تری ہیچ سی تسپہ یوں گھور کے دیدے مجھے مت گھور دوا

رات باتوں میں یہاں تو نے گزاری آنا صدقے تیرے کسی ڈھب سے اُسے لاری آنا
سوچ اس کا نہ ہو گر مجھ کو تو پھر کس کو ہو جانتی تو نہیں کیا پاؤں ہے بھاری آنا
آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے مجھے اس کی چاہ روز و شب رہتے ہیں اشک آنکھوں سے جاری آنا
ہو نہ جو مجھے سو ہو بندی ملے گی سٹر ملی وصل کی اس سے زباں اب تو میں ہاری آنا
اُٹھتے ہی صبح کو آجاتی ہے رنگین کے پاس کہیو سب حال مرا میں ترے واری آنا

چلو چل کر قطب صاحب میں جھولا ڈال کر جھولیں دوگانہ مینہ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا
کروں قربان میں پشواز کو جالی کی کرتی پر دوگانہ مجھ سے اٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ دامن کا
ہلا کر سر کیا کر بات تو مجھ سے نہ ہنس ہنس کر زناخی مارتا ہے مجھ کو ڈورا تیری گردن کا
جوانی سے وہ پھل پائے الٰہی حف نظر میری وہ کون انساں ہے جو خوش نہیں رنگیںؔ کے جوبن کا

نیند آتی نہیں کمبخت دوانی آجا اپنی بیتی کوئی کہہ اپنی کہانی آجا
ہاتھ پر تیرے موئے کس کے ہے چھلّے کا داغ دی ہے یہ کس نے تجھے اپنی نشانی آجا
بال ماتھے کے جو ڈورے سے لیے ہیں تو نے شکل لگتی ہے بڑی آج وڑانی آجا
غم ہے رنگیںؔ کو نہ میرا یونہی اس کے پیچھے مفت برباد ہوئی میری جوانی آجا

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

زخم کھا کر جو میں تڑپا تو لگا یوں کہنے اچھا اچھا تو تڑپ کر مری تلوار کو توڑ
ہے یہ گر دل ہی پر اس کی تو سلیماں ڈیڑھ ڈال ایک دل کے لیے مت خاطرِ دلدار کو توڑ

جب کہا میں نے کہ میرے گھر چلو تب مری گوئیاں نے اے رنگیںؔ پکار
گال پر انگلی کو رکھ کر یوں کہا میں ترے گھر جاؤنگی اے دور پار

دوڑی لینے کو میں اسے کس دم پاؤں میں میرے موچ آئی کب
ہرگز آتی نہیں ہے سانچ کو آنچ پیش جاوے گی یہ بُرائی کب

کل جو میں نے کہا زناخی سے جی میں آتا ہے تجھ سے کیجے عیش
تو لگی کہنے وہ اے رنگیںؔ بس بس اب مجھ کو مت جلا و طیش

زہر کر دیتی ہے وہ کھانے کو لڑ کر مجھ سے روز　　آج سے میں ساتھ اس کے کھانا کھاؤں دوپار
کیا گئی گزری ہوں میں ایسی کہ جاؤں دوڑ کر　　اور منا کر ساتھ اپنے اس کو لاؤں دور پار
اُس نے ہمسائے میں آ کر گھر لیا تو کیا ہوا　　اب اسے آواز میں اپنی سناؤں دور پار

کہاں تک سنوں کان تو اُڑ گئے　　تری سنتے سنتے حکایات روز
گئے ہیں مرے گھر میں سب تجھ کو تاڑ　　کیا کر نہ رنگیں اشارات روز

یارب شبِ جدائی تو ہرگز نہ ہو نصیب　　بندی کو یوں تو چاہے تو کولھو میں پیل ڈال

تیس دن میں کسی سے ملتی نہیں　　ہوں ملاقاتِ گاہ گاہ سے خوش

بھیجتا روز ہے رنگیں مجھے پیغامِ سلام　　اور میں آگاہ ہوں اس حرف و حکایات سے کم

کوئی پیس کر خوب سی لال مرچیں　　ترے دونوں دیدوں میں بھر جائے آ تو

یوں بولتی ہوں بول بڑا خاک چاٹ کر　　گوئیاں کی طرح جھاڑو کی تیلی نہیں ہوں میں
ہیں حرفتیں بھری مری رگ رگ میں کوٹ کر　　رنگیں تری طرح سے رنگیلی نہیں ہوں میں

اب تجھ سے خدا سمجھے تو ہے زہر کی اگ گانٹھ　　تجھ پر کہیں بجلی پڑے درگاہ کی گوئیاں

بولے وہ آؤ گے کب میں نے تب ان سے یہ کہا　　بندی ہرگز نہیں اب تک کہیں مہمان گئی
زہر لگتی ہے مجھے تیری یہ چھل بازی　　یاں ترے آنے سے باجی تجھے پہچان گئی

مارا پتھر پہ سر اور سینے پہ پتھر مارا — پر ترا دل نہ ملا ہم نے بہت سر مارا
دل کو رنگیںؔ کے لیا یوں تری اُلفت نے دبوچ — باز نے جوں کوئی رنگین کبوتر مارا

نشاں رہ جاتا ہے مردوں کا باقی — گیا فرہاد لیکن بے ستوں ہے

یہ جو بیماری ہے اپنی عشق کہتے ہیں اسے — زر نہیں، رجعت نہیں، وحشت نہیں، سودا نہیں
بے سرانجامی ہے جاوے شیخ کعبہ کس طرح — خر نہیں، خرقہ نہیں، ٹوپی نہیں، کرتا نہیں

چنے ہم نے دانتوں کے ہوتے نہ پائے — بنے پوپلے تب چنے ہاتھ آئے

رنگیںؔ نے "مخمس رنگین" کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں دو منظوم خط اور تین داستانیں ہیں۔ ایک حصہ میں پھکو طوائف کی ہجو بیان کی گئی ہے۔ آغاز میں اپنی جوانی اور خوبصورتی کا تذکرہ ہے۔ پھر عشق طاری ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن جب وہ کج ادائی کرکے بے وفا ثابت ہوتی ہے۔ تو دل کو سمجھاتے ہیں کہ تم ایسی بے سلیقہ اور بھدی عورت پر جان دیتے ہو جس کے خستہ مکان سے بدبو آتی ہے اور جس کا سراپا یہ ہے:

کہوں کیا سر کو اور موہاٹے سر کو — کوئی گھسٹائے جیسے ناریل کو
یہ تھا اس اوہدی پیشانی کا عالم — کہ دیکھے سے جسے تنگی کرے دم
ہوائیں دیکھ ان کانوں کو حیران — جذامی کے سے تھے سوجے ہوئے کان
بہم تو دیکھ یوں اوس کی بھوؤں کو — کہ چھپکلیاں لڑتے ہیں جس طرح دو
زبس پڑ بال تھے آنکھوں کے اندر — تو یوں دیکھے تھی جیسے گھور کے بندر
یہ تھی پہ ناک رخساروں میں بیٹھی — کہ جوں ہو مینڈکی جوتے پہ بیٹھی

زبان کی تشبیہ بہت ہی فحش ہے۔

زنخ ایسی تھی جیسے پکا پھوڑا — ذقن جیسے کہ پھوٹے پہ دو دوٹا

گر اس کی جدھر دیکھو ادھر تھی   بغل سے چوتڑوں تک سب کر تھی
عجائب اوس اُجالی کی تھی اُگیا   غرض یہ ہے کہ جالی کی تھی اُگیا
نظر آتی تھیں اس میں چھاتیاں یوں   کہ اُرنے اوپلے جالی بیچ ہوں جوں

سبع سیارۂ رنگین کا تیسرا حصہ سبحۂ رنگیں کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سو رباعیاں ہیں۔ جو سب کی سب الٰہی بخش خاں معروف کی ہجو میں ہیں۔ چند ایک حسب ذیل ہیں ؎

معروف تو ہے شعر و سخن کا محتاج   پر ہجو کو خلق کی وہ موجود ہے آج
اس کی وہ مثل ہوئی بقول رنگین   چوہا نہ سمائے بل میں اور باندھے چھاج

معروف کے پاس ہے نہ سیم اور نہ زر   اوقات بسر کرتا ہے وہ اپنی بشر
رنگین ہے ان دونوں یہ صورت اُس کی   کانا ٹٹو ہے اور بدھو ہے نفر

معروف یہ چاہتا ہے کعبے جا کر   حج کر کے یہاں کہائے حاجی آکر
سُن کر یہ قصد اس کا رنگین نے کہا   بلّی چلی حج کو لاکھ چوہے کھا کر

معروف

یہ وہی معروف ہیں جن کی ہجو میں سعادت یار خاں، رنگین نے سبحۂ رنگیں نامی کتاب میں پوری ایک سو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کا نام نواب الٰہی بخش خاں تھا اور یہ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں رہتے تھے۔ درویشوں اور صوفیوں کی مجالس میں [illegible] کی وجہ سے آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر کے عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگے تھے۔ شعر و شاعری کا ابتدا سے شوق تھا۔ مولانا آزاد نے آبحیات میں انھیں ذوق کا شاگرد بتایا ہے حالانکہ وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے اور ذوق کے استاد بھائی تھے۔ انھوں نے دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ جو ہنوز طبع نہیں ہوئے۔ ۱۲۴۲ھ میں انتقال ہوا۔

معروف کوئی ظریف شاعر نہ تھے لیکن انھوں نے دیوانوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی کتاب تسبیح ذرّہ کے نام سے ترتیب دی ہے جس کا سو شعر ہیں اور تمام کے تمام معشوق کی سبزہ رنگی کی تعریف میں ہیں۔ اس التزام اور ندرت کی وجہ سے وہ ظرافت خیز اور تفریح طبع کا سامان بن گئے ہیں۔

چند شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

کیسے تھا سبزہ رنگ اک دم بھروسہ اپنے جینے کا ــــــ نشانی گر ترا ہوتا نہ چھلا سبز مینے کا

بسکہ سبزہ رنگ ہے قاتل مرا ــــــ نت ہرا رہتا ہے زخم دل مرا

کون یہ لے کے ہاتھ میں سبز کمان آگیا ــــــ ابروئے سبزہ رنگ کا پھر مجھے دھیان آگیا

حرف سبز اب ترے منہ سے ہے نکلتا بے ڈھب ــــــ سبزہ رنگ آج ہے تو زہر اگلتا بے ڈھب

قتل کی کچھ مرے سبزہ رنگ کر تدبیر آج ــــــ دل مرا چاہے ہے بہر سبزۂ شمشیر آج

سبزہ رنگوں کے فریبوں میں دل آیا بے طرح ــــــ عشق نے پھر سبز باغ اس کو دکھایا بے طرح

جبکہ طفلی میں اماموں کا بنایا تھا فقیر ــــــ تھا اسی دن سے دعا گو سبزہ رنگوں کا فقیر

دلا مت دوڑ تو ان سبزہ رنگوں کی صفائی پر ــــــ پھسل جاتا ہے اکثر آدمی کا پاؤں کائی پر

کائی مل دو تم مجھے آگے خدا شافی ہے بس ــــــ دل جلوں کو سبزہ رنگوں کے یہی کافی ہے بس

دھیان میں یوں ہوں سبزہ رنگ کے غرق ــــــ جوں نشے میں ہو کوئی بھنگ کے غرق

تری سبزہ رنگ ایسی صورت ہے صاف ــــــ زمرد کی گویا کہ صورت ہے صاف

سبزہ رنگوں پہ نہ اپنا ہو کہیں جی مائل ــــــ اس برس رنگ ہے نوروز کا سبزی مائل

کیوں غش نہ سبزہ رنگ پہ دل سے مدام ہوں ــــــ میں حضرت امام حسنؓ کا غلام ہوں

آج یہاں کل وہاں گزرے یوں ہی جاگ ہمیں ــــــ کھوے ہے ہر سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہمیں

کہتے ہیں معروف کو ایک دفعہ معلوم ہوا کہ بھورے خاں آشفتہ نے ایک شعر کہا ہے جس میں ہری چگ کا لفظ آیا ہے (جو ایک جانور ہوتا ہے) اس وقت تک یہ لفظ ان کے ذہن میں نہ آیا تھا، اس لیے سو روپیہ دے کر یہ لفظ ان سے خرید لیا اور موزوں کیا۔

اے سبز رنگ ہاتھ سے لے میرے پان تو ــــــ یہ برگ سبز تحفۂ درویش جان تو

چمن میں زہر لگتی ہے مجھے آواز طوطی کی ‏ ‏ ‏ یہ حالت غم میں ہے ان سبز رنگوں کے مرے جی کی

سبز رنگوں سے محبت ہے مجھے دن رات کی ‏ ‏ ‏ چاہتا ہوں ہر جگہ سرسبزی اپنی بات کی

اس بڑھاپے میں بھی کم ہوویں گے لہری ہم سے ‏ ‏ ‏ سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہم سے

یارب سبزہ رنگوں سے اب دل میں غم بھر آیا ہے ‏ ‏ ‏ کیجو خیر اس بستی کی یہ سبز قدم پھر آیا ہے

دور طراوت آنکھوں میں ہے دائم چھاتی ٹھنڈی ہے ‏ ‏ ‏ یاد میں سبزہ رنگوں کے دل کیا ہے سبزی منڈی ہے

بقا

شیخ بقاء اللہ خاں بن حافظ لطف اللہ خاں خوش نویس اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ اردو میں شاہ حاتم اور فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے۔ مولوی عبد الغفور نساخ نے اپنے تذکرہ سخن شعرا میں انہیں غلطی سے میر درد کا شاگرد دیکھا ہے۔ ابتدا میں غمگین تخلص کرتے تھے۔ بعد میں بقا بن گئے۔ ترک وطن کرکے لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہیں میر اور سودا سے معرکے ہوئے مگر دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اسی بنا پر ہجو کہنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بے حد خوش مذاق اور ظریف الطبع تھے اس لیے نوک جھونک میں ظرافت کا رنگ پیدا کرکے نئی روح پھونک دیتے تھے۔ بعض مہذب ہجووں کے چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ میر تقی میر نے یہ شعر لکھا ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں ندیاں سی بہتیاں تھیں ‏ ‏ ‏ سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا کو گمان پیدا ہوا کہ میر صاحب نے اُن کے ان دو شعروں سے دوآبہ کا مضمون اڑا لیا ہے ؎

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے ‏ ‏ ‏ دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابی میں ‏ ‏ ‏ ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

بس پھر کیا تھا بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ یہ قطعہ لکھ ڈالا ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا ‏ ‏ ‏ اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو

اے خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے ‏ ‏ ‏ اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

اس کے بعد میر سے ایسی چل گئی کہ ایک اور قطعہ کہا ؎

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر — اس میں ہوئے جو نام شاعر کا
لے کے دیوان پکارتے پھریے — ہر گلی کوچے کام شاعر کا

ایک جگہ میر اور مرزا دونوں کو لے ڈالا ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا جب کہ ہم نے زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

تھے ہم استاد ترے در پہ وے بیٹھ گئے — تو نے چاہا تھا کہ ٹالے نہ ٹلے بیٹھ گئے

آئینہ دیکھ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں — اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

میر ضاحک

میر ضاحک کا نام میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ تھا۔ میر حسن دہلوی کے والد اور میر انیس کے پر دادا تھے۔ علم عربی و فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ نظم و نثر خوب لکھتے تھے۔ بغایت فہیم، درویش مزاج، نیک خو، توکل پیشہ، مزاج پسند، ہزل دوست، بذلہ سنج اور نکتہ رس تھے۔ ترک روزگار کرکے تیس پینتیس سال آزادانہ زندگی بسر کی۔ موسیقی سے رغبت اور شعر و شاعری کا شوق تھا۔ نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ مگر ناقدری نے دل توڑ دیا تھا۔ اسی وجہ سے قدیم رنگ عاشقانہ ترک کرکے ہزل گوئی اختیار کر لی تھی۔ مگر اس میں بھی زبان عجیب و غریب ایجاد کی تھی جو بقول میر حسن آدم سے لے کر اب تک کسی نے استعمال نہ کی ہوگی۔ مولوی ساجد اور مرزا سودا کی ہجووں میں جولانیٔ طبع اور قدرت زبان کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ اہل زمانہ سن کر پھڑک گئے۔ مگر افسوس کہ ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ چالیس پچاس شعر سے کم کی غزل اور ہزل نہ کہتے تھے۔ اس کے شروع میں تھوڑی نثر بھی ضرور لکھتے تھے۔

ان کی غزلوں کے چند اشعار قاضی عبدالودود صاحب نے بڑی تلاش سے فراہم کیے ہیں، وہ حاضر ہیں ؎

عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی ‖ گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے ‖ ہوا کا بھی بمشکل واں گزر ہے

ہوا ہے راہ چلنا سب کو دشوار ‖ خطر ہے گر پڑے سر پر نہ دیوار

جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر ‖ پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال ‖ کہ بت خانہ چل سکتا نہیں چال

کسی سودے کو واں گر کوئی جائے ‖ خدائی ہو تو پھر جیتا گھر آئے

زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدو ہے ‖ اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

عجب کیا ہے اگر حاتم یہاں آئے ‖ نو فاروں کی طرح وہ سوم ہو جائے

سوائے تو دہ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

میر حسن کی تصانیف سے مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار ارم، مثنوی قصر جواہر اور مثنوی رموز العارفین چھپ چکی ہیں۔ کلیات ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اس کی تقسیم اصناف سخن کے اعتبار سے اس طرح ہے۔

(۱) غزلیات (۲) مثنویات (۳) قصائد (۴) رباعیات (۵) مثلثات (۶) ہجویات (۷) متفرقات مثلاً ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس وغیرہ (۸) فردیات۔

مثنویاں چھوٹی اور بڑی مل کر تعداد میں گیارہ ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں اشعار کی مجموعی تعداد گیارہ اور بارہ ہزار کے درمیان ہے۔ عام طور پر میر حسن اپنی مثنوی سحر البیان کی وجہ سے مشہور ہیں۔ دکا ہی شاعری میں ان کا کوئی درجہ نہیں۔

کمترین

کمترین کا نام پیر خاں تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کمترین نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی سرکار میں ملازم تھے اور اپنی استعداد کے موافق شعر خوب کہتے تھے۔

میر تقی میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہزل کی طرف ان کی طبیعت کا میلان بہت زیادہ تھا۔ وہ خود بھی کہتے "ہجو ہاسے رنگ رنگ شعر کا نکلے" کہتے ہیں اور انہوں نے ایک شہر آشوب بھی لکھا جس میں ہر قوم کی ہجو کی تھی۔ اس کے یہ چند شعر تذکرہ میر تقی میں درج ہیں ؎

تو خصم گن کر مشلچن نے کیے	تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دیے
پلائیں مفت نصرانی تو تاڑی	اگاڑی اصطبل کے جا پچھاڑی
یہ متصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے راتوں کو	تو کیوں پیسے کماتے ہیں یہ نقلیں کر براتوں میں
دیکھو پکوان والی کی مزاجیں	خصم کے روبرو دیتی ہے شاخیں
کے بیر، دو گے ہم کو نازک بدن پیارے	تم بادشاہ ہند ہو ہم کمترین پیارے

ہُدہُد الشعرا

عبد الرحمٰن نام تھا اور پورب وطن۔ کسی وجہ سے دہلی آ گئے۔ حکیم آغا جان صاحب عیش کے پڑوس میں مکان لیا اور وہیں لڑکے پڑھانے لگے۔ عجیب وضع قطع تھی۔ گھٹا ہوا سر۔ اس پر لمبی لمبی جٹائیں بالکل کھٹ بڑھیا معلوم ہوتے تھے۔ کان میں بقول شخصے بچھو ندر لٹکائے۔ دو شاخہ نوکدار زاویہ نما داڑھی پر چنبیلی کا تیل ملے اپنی جھوجھ میں خوش و خرم رہتے تھے۔ حکیم صاحب نے ہدہد تخلص تجویز کیا۔ ان کی فرمائش سے کبھی کبھی نعرے بے ہنگام بلند کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہادر شاہ کی تعریف میں یہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا ؎

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کر دوں	تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلا کر دوں
جو آ کے ریز کرے میرے آگے موسیقار	تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سرا کر دوں
جو سرکشی کرے آگے میرے ھما آ کر	تو اس کے نوچ کے پر شکل نیولا کر دوں
میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لیے	فلک کہے ہے مقدر میں با جرا کر دوں

بہادر شاہ نے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہدہد الشعرا، منقار جنگ بہادر کے خطاب عطا فرمائے اور سات روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ایک مرتبہ مکان نہ ملتا تھا۔ آپ نے یہ عرضداشت نظم کر ڈالی ؎

جز ترے شاہنشہ کہہ کس کے آگے روئیے | کس سے کہیئے جاکے یہ غم کو ہمارے کھوئیے
تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار | ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں پوسیئے
حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر | کاش کہ ہم سیکھتے اس سے بنانے بوسیئے
سنگلاخ ایسی زمیں ہے دیکھ لے دل تا کجا | فکر کیجئے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے
رشتہ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہووے دراز | یا خدا کھلتے رہیں جب تک جہاں میں ہوئیے
دیجئے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے | مارتا پھرتا نرا ہدہد ہے ٹانک ٹوئیے

ایک دفعہ تنخواہ نہ ملی۔ انھوں نے نظم کی۔ ٹانگ توڑ کر دربار کے ایک معزز عہدہ دار میر ساماں راجہ دیبی سنگھ کی معرفت ایک درخواست گزران دی ؎

جہاں میں آج دیبی سنگھ تو راجوں کا راجہ ہے | خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آج راجہ ہے
سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی | تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجہ ہے
شکم اہلِ جہاں کے سب ہی شکرانے بجا لاتے | دمامہ جاکے تیرا گنبدِ گردوں پہ باجا ہے
کسی کو دے نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا | مگر ہدہد کو دے دے کیوں یہی ہدہد کا کھاجا ہے

دو قطعے ملاحظہ فرمائیے ؎

ہدہد کا مذاق ہے نرالا سب سے | انداز ہے اک نیا نکالا سب سے
سر دفترِ لشکرِ سلیماں ہے یہ | اڑتا ہے سخن میں بالا بالا سب سے

راست آئینوں کو نفرت ہے کج آئینوں سے | تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا
آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہدہد آیا | غل ہوا پیشرو ملکِ سلیماں نکلا

حکیم آغا جان عیش کے اشارہ پر ہدہد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ایک بے معنی غزل پڑھی اور کہا کہ غالب کے انداز میں لکھی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

طہماسپ قلی نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت ناجی زندہ تھے۔ مولانا آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں :-
"نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار دہلی کا رنگ، شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور ناز پروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ آئے"۔
یہ دو بند آزاد نے مجموعہ نغز سے کر نقل کیے ہیں۔ اس شہر آشوب میں نادر شاہی حملے سے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم بھی کیا ہے اور ہندوستانی فوج کی بزدلی اور عسکریت کے زوال پر طنز و تعریض بھی کی ہے ؎

لڑے ہوئے تو برس بیں ان کو بیتے تھے | دعا کے زور سے دائی دوا کی جیتے تھے
شراہیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے | نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا | کہ میں نشان کے ہاتھی اُپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا | ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ غلہ و بقال

بعض تذکروں سے چند دیگر متفرق اشعار جن پر ناجی کی شوخ مزاجی کی مہریں لگی ہوئی ہیں ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ زور لفظی ہیر پھیر پر ہے ؎

بے نواؤں سے نہ مل اے موکرمت پیچ کھا | مونڈ سر لڑکوں کو کرتے ہیں وہ اپنا بالکا
رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تک بہلا | چلی جاتی ہے فرائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
اگر ہو وہ بت کافر کبھی اشنان کو ننگا | بھنور میں دیکھ کر جمنا اسے غوطے میں جا گنگا
نہ ٹوکو یار کو کہ خط رکھاتا یا منڈاتا ہے | مرے نشہ کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے
جو کوئی کچھ کہے پگھل جاوے | شمع رو ہے ہمارا موم کی ناک
ہمیں تو بوسہ نہ دینے کہا نہ کہہ کے دیا | جنھوں سے وعدہ کیا ہے انھیں چراتے ہیں
انا الحق بولنے لگتا ہے اس کے زخم کا بسمل | کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے
یہ تو طالب زر کے ہیں اللہ یاں خدا کا نام ہے

جان ہے جیوڑا ہے دلبر ہے
پر یہ مشکل کہ طالب زر ہے

لب جاں بخش آگے تیرے سخن
جو مسیحا کا نام لے خر ہے

جہاں دل بند ہو ناجی کا وہاں آوے خلل کرنے
رقیب لاولد ناصح گویا لڑکوں کا باوا ہے

اس کے رخسار دیکھ لیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

ملنے کو نوخطاں کے واعظ برا کہے ہے
مجہول ہیں یہ باتیں ہم خوب جانتے ہیں

نمکین حسن دیکھ کر پی کا!
رنگ گل کا مجھے لگا پھیکا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو
ہمارے سینے میں تودا ہوا ہے تیروں کا

نہ پوچھو خود بخود ہے عارض خورشید کی خوبی
لیا ہے ذرہ ذرہ حسن مہرویاں سے کر چندا

مت کر آزاد دام زلف سے دل
بال باندھا غلام ہے تیرا

محبت سوں علی کی دیکھ ناجی
ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی
جھنوں کی آن پہنچی لڑمرے وہ ایک چھلے پر

آج تو ناجی سجن سے کر تو اپنا عرض حال
مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہو سو ہو

زلف کیوں کھولتے ہیں دن کو صنم
مکھ دکھایا ہے تو نہ رات کرو

وظیفہ راگنی کے سر میں زاہد اکفر ہے پڑھ مت
نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نام تھا اور نظیر تخلص۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے باشندے تھے۔ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس ہلچل میں دہلی سے نکلے اور آگرہ پہنچے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آگرہ میں روضہ تاج گنج کے قریب رہتے تھے اور معلمی پر بسر اوقات تھی۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں نو کتابیں لکھیں۔ ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ (۱۶ اگست ۱۸۳۰ء) کو آگرہ میں انتقال کیا۔ عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب زندگانیٔ بے نظیر میں ان کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

نظیر نہایت خلیق، وضعدار، صلح کل، زندہ دل اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ جوانی میں نہایت شوقین تھے۔ شہر کے تمام میلے ٹھیلوں کھیل تماشوں اور جلسے جلوسوں میں شرکت کرتے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ زبان پر حاکمانہ قدرت اور تخیل میں بلا کی وسعت و دراکی تھی۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساس و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ وہ نہایت ذہین، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بات بات پر بڑی بڑی نظمیں کہہ دینا ان کے نزدیک معمولی بات تھی۔ اشیاء کے ہر رُخ، ہر پہلو اور زاویہ کو پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ شہر کی مشہور چیزوں، کھانوں، عمارتوں، میلوں، تماشوں، تہواروں اور بازیگروں وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر مصوری اور جزئیات نگاری کا حق ادا کیا۔ دنیا کی بے ثباتی، اہل جہان کے طور طریقوں، رسم و رواج، دولت، مفلسی، چوری، عیاشی، تماش بینی، بھنگ، چرس، موسموں کے تغیر و تبدل اور مناظر قدرت کو کئی کئی رنگوں میں پیش کر کے ہمہ گیری کا ثبوت دیا۔

"نظیر کے ہاں لفظوں کی وہ افراط ہے کہ ایک ذخار دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ معانی کی وہ بہتات کہ شہوار موتیوں کا انبار نظر آتا ہے۔ بیان کی سلاست ایسی کہ کہیں رکاوٹ کا نام نہیں۔ بندش کی وہ چستی کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے تصویر کشی اور محاکات کا یہ عالم کہ جب تاج گنج کے روضہ کی تعریف ہم پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش و نگار اور ایک ایک جالی کو دیکھ لیتی ہیں۔ جب ریچھ والے کی تعریف نظر آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک قلندر کان چھدوائے سر پر بڑا سا پگڑ باندھے ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لیے ریچھ کے بچے کی کیل پکڑے اس کو نچا رہا ہے اور اپنے سونٹے سے اس کو سدھا رہا ہے۔ دنیا کی بے بقائی اور عالم کی بے ثباتی کے اشعار سامنے آتے ہیں تو دل کو یقین آ جاتا ہے کہ روپیہ، پیسہ، دھن دولت، مال و اسباب سب ہیچ ہے۔ ہم اور ہماری خواہشات لایعنی، ہماری بود بے بود، ہماری ہستی عین نیستی ہے۔ دیوالی کی تعریف پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ در و دیوار پر چراغاں ہے۔ مٹھائی کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ بھڑبھونجے کھیلیں بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی رسم و رواج کے پابند رومالوں میں کھیلیں باندھ باندھ کر لیجا رہے ہیں۔ جواری اپنے اپنے اکھاڑوں میں اترے ہوئے ہیں۔ چھ، نو آٹھ کے داؤں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شوقین مزاج گھوم رہے، بازار کی رونق کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ بعض بڈھے اپنے بچوں کی انگلی پکڑے دکان دکان دکھاتے پھر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ غرضکہ اسی طرح ہر ایک نظم میں جزئیات سے بحث کرنا نظیر کا خاص حصہ ہے۔" (تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۲۹ – ۲۲۸)

نظیر کو اُردو کی نیچرل شاعری کا موجد مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے فن تقابل و تماثل کو اردو میں

نظیر کے سوا شاید آج تک کسی دوسرے نے نہیں برتا۔ ان کی ظرافت کا کمال سچی بات سیدھے سبھاؤ کہہ دینے میں ہے۔ وہ "بقول نیاز فتحپوری چگاڈ" تھے۔ دل کی لگی سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انھیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔
نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے۔ اچھا اس لیے کہ اس میں ہر قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج [illegible] خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاقِ صحیح کو ناگوار نہ ہو بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فن کار کی طرح انھوں نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔ سودا کا فن طنز کا فن ہے۔ ظرافت اس کا ایک رنگ ہے۔ نظیر کا فن ظرافت کا فن ہے۔ طنز اس کا آہنگ ہے۔ نظیر نے کسی کی ہجو نہیں کی۔ ان کے لہجے میں نرمی، [illegible] اور دھیما پن ہے۔ سودا خاکہ بنا کر رنگ بھرتے ہیں اور کسی رنگ کا بڑا سا دھبہ ڈال کر تصویر کو مضحک بنا دیتے ہیں۔ نظیر آئینہ بند ہیں۔ انھوں نے چاروں طرف آئینے نصب کر کے ایک چہرے کے مختلف پہلو روشن کیے۔ ان پہلوؤں کا تضاد چٹکیاں لیتا اور گدگداتا ہے اور ہماری حسِ لطیف کو حظ [illegible]
نظیر نے ایک تماشائی کی طرح جس طرح دنیا کو دیکھا دوسروں کو دکھایا۔ ان کی نظر سیر کرتی، ہر منظر سے لطف اٹھاتی اور ہر کیفیت سے حظ حاصل کرتی ہے۔ نظیر کی ظرافت ہلکی پھلکی اور خوشگوار ہے۔ وہ ہنسی کو خوشی پر، تعریض کو طعن پر، مسرت کو ٹھٹھول پر ترجیح دیتے ہیں۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ ان کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نظر میں حکیمانہ گہرائی نہیں۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انھیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے فساد پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی کو انھوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعرا نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا۔ نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لیے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ ننگا کر سکتے ہیں، تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انھیں گوارا نہیں"[1]

ذیل کے اشعار میں ملا پر تعریض ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ملا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں ‍ ‍ ‍ حلوا کہیں کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں
مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے ہیں ‍ ‍ ‍ شکر کا حلوا سنتے ہیں تو دوڑے جاتے ہیں
کہتے ہوئے یہ دل میں اہا ہا ری شب برات

وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے ‍ ‍ ‍ یہ آئیے دیکھیے داڑھی لگائے سن کی سی

---

[1] "اردو شاعری میں طنز" از شوکت سبزواری مطبوعہ علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر (۱۹۵۳ء) مع اضافہ

نظیر اکبرآبادی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں — اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بڑھاپا

آگے تو یہ پری زاد یہ کہتے تھے ہمیں گھیر — آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر — جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے — وہ کونسے گُرو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے — پر جھڑ گئے دُم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تندرستی

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں — پھر سو طرح کے عیش ہیں اور سے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں و یا فاقہ مستیاں — سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

فقیروں کی صدا

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا — دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا

ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا — دولت جو ترے یاں ہے نہ کام آئے گی بابا

پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائے گی بابا

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات — کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات

دینے سے اسی کے ترا اونچا رہے گا ہات — اور یاں بھی تری گذرے گی سو عیش سے اوقات

اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائے گی بابا

دانا کی تو مشکل کبھی اٹکی نہیں رہتی — چڑھتی ہے پہاڑوں کے اوپر ناؤ سخی کی

اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی — تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی

خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائے گی بابا

دُنیا کے تماشے

کھول ٹک چشم تماشا یار باشی پھر کہاں — یہ شکار و صید یہ شکرے و باشی پھر کہاں

مال و دولت سونا رُوپا تولہ ماشے پھر کہاں — دم غنیمت ہے بھلا یہ بود و باشی پھر کہاں

دیکھ لے دنیا کے غافل یہ تماشے پھر کہاں

خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے — آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے

بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے — شاہ مسرور غنی شاہ و گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجیے ۔۔۔ اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجیے

اولیا، انبیا اور رب کی خوشامد کیجیے ۔۔۔ اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجیے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام ۔۔۔ وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام

بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام ۔۔۔ خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہولی

ملنے کا ترے رکھتے ہیں ہم دھیان ادھر دیکھ ۔۔۔ بھاتی ہے بہت ہم کو تری آن ادھر دیکھ

ہم چاہنے والے ہیں مری جان ادھر دیکھ ۔۔۔ ہولی ہے صنم ہنس کے تو اک آن ادھر دیکھ

اے رنگ بھرے نو گل خندان ادھر دیکھ

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا ۔۔۔ کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا

رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا ۔۔۔ ان سب جگہوں کے گرنے سے آیا جو بچ بچا

وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلتی زمیں خوار ۔۔۔ عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار

آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار ۔۔۔ گرنے کا مکر کر کے اچھل کو وہ ایک بار

اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی　　آٹا جو پالکی ہے تو ہے دال نالکی
آٹے ہی دال سے ہے درستی یہ حال کی　　اس سے ہے سب کی خوبی جو ہے حال قال کی
سب چھوڑو بات طوطی و بدری و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

جب آدمی کے پیٹ میں جاتی ہیں روٹیاں　　پھولے نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں　　سینہ اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں　　کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن پہ نہایت مہین ہیں　　سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے　　پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسہ ہی فوج پیسہ ہی جاہ و جلال ہے　　پیسے ہی کا تمام یہ رنگ روال ہے
پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

پیارے تمہارے اور تو عاشق ہیں نوجوان　　اک ہم ہی بوڑھے سب سے ہیں او پیر ناتواں
وہ تو رہیں گے، ہم ہیں کوئی دن کے میہمان　　بس سب کو چھوڑ ہم سے ملو کس لیے کہ جاں
پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
از شاخِ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

یہ نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملیں سو کھا جا　　تاش اور بادلے ہیں اکبار جگمگا جا
پاپی بخیل مت بن داتا سخی کہا جا　　اک دم تو اپنا ڈھکا من مانتا بجا جا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال و دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جب ملی روٹی ہمیں سب نورِ حق روشن ہوئے　　رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے　　اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے　　حسن یہ دو دن کا ہے جان ہنس لے بول لے

تازگی جی کی اور ترے تن کی　　واہ کیا بات گورے برتن کی

جھمکا نظر آتا ہے ہر اک عیش کی شے کا　　دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہے روپے کا

مرشد و مولا سے پوچھا میں نے اے پیر زمن　　میری کچھ لگتی نہیں اللہ سے دل کی لگن
سن کے بولے وہ بتائیں ہم تجھے اس کا جتن　　جا شتاب اور جلد سبزی لیکے اک دو چار من

نظیر کی نظموں کے مقابلے میں غزلیں کسی قدر پھیکی ہیں۔ پھر بھی چند منتخب اشعار جن پر شوخی اور ظرافت کی چھاپ ہے یہاں درج کیے [illegible]

لو نہ ہنس ہنس کے تم اغیار کے گلدستوں سے　　اتنی ضد بھی نہ رکھو اپنے جگر خستوں سے
پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر　　کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

کہا جو تم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو　　کہا کہ اس لیے تم یاں جو غل مچاتے ہو
کہا لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم　　کہا کہ تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو
کہا جو حالِ دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر　　کہا غلط ہے یہ باتیں جو تم بتاتے ہو
کہا جتاتے ہو کیوں ہم کو روز ناز و ادا　　کہا کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو
کہا کہ عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے　　کہا خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو
کہا کہ روتے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا　　کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو　　جس کی نوید پہنچی ہے رنگِ بسنت کو
میں ہنس کے اس لیے منہ چومتا ہوں غنچہ کا　　کہ کچھ نشانی ہے اس میں تمہارے دہن کی سی

نظیر آ گئے ہم کو ہوس بھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

جان صاحب

میر یار علی نام، میر امن لکھنوی کے فرزند اور نواب عاشور علی خاں لکھنوی کے شاگرد تھے۔ نہایت ہنس مکھ، ملنسار اور خلیق انسا[illegible] تھے۔ جب تک لکھنؤ میں رہے پریشان حال رہے۔ ۱۸۵۷ء میں مجبوراً ترکِ وطن کر کے دلی چلے گئے۔ مگر وہاں بھی پاؤں نہ جم سکے۔ بھوپال پہنچے [illegible] وہاں بھی بدنصیبی ساتھ رہی۔ آخر دانہ پانی نے زور کیا اور نواب کلب علی خاں کی قدردانی رام پور کھینچ لے گئی۔ پھر وہیں رہ پڑے اور ۱۲۹۴ھ [illegible] میں ۶۳ برس کی عمر پا کر وہیں پیوندِ زمیں ہوئے۔

جان صاحب نے شروع ہی سے ریختی گوئی کی مشق کی اور اس کے سوا دوسری کسی صنف میں کوئی شعر نہیں کہا۔ وہ مشاعروں میں بھی بالکل زنانہ لباس پہن کر جاتے اور اس انداز سے پڑھتے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے۔ اس کے باوجود ان کی ریختی میں آمد کم آورد زیادہ ہے۔ اسی تکلف کی وجہ سے رنگین اور انشاء کی سی روانی اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں ؎

وہ تھے استاد ان سے جان صاحب تجھ کو کیا نسبت　　کیا پر نام روشن ریختی نے تیری نسبت کا

لفظی رعایتیں ان کے یہاں اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات کلام بے مزہ ہو جاتا ہے۔ فواحشات کا بھی زور شور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان عرصہ تک چھپنا قانوناً بند رہا۔ آخر انتخاب شائع ہوا۔ بقول مولانا عبدالباری آسی "اس میں شک نہیں کہ باوجود اس آورد اور تکلف کے ان کے یہاں بیگماتی زبان، لکھنؤ کے روزمرہ، شیریں کلام عورتوں کے محاورات، رسوم و رواج کا اس قدر ذکر ہے کہ متقدمین میں کسی کے یہاں بھی نہیں۔" (تذکرہ خندہ گل صفحہ ۱۴۸)

جان صاحب کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

خالی کھیلنے میں وہ خالا نہیں رہتا　　در گور مرے پاس رزالا نہیں رہتا

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت　　سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

کھلا جنگل میں آکر حال ان چڑیوں کی چوں چوں کا　　ہر اک عاشق کو دیتی ہیں یہ پرسا اپنے مجنوں کا

تم اگر دو گے نہ تن پیٹ کو روٹی کپڑا　　کیا خدا کے بھی نہیں گھر میں ٹھکانا میرا

بچی کے واسطے جو کھلونے منگائے ہیں　　گھر والا گھر کو کہتا ہے بتخانہ ہو گیا

دلوایا شب برات میں مُردوں کا فاتحہ　　لوٹے گھڑے پہ بدھنی پہ مٹکے مٹھور پر

نہ دیکھ دولہا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر　　نئی نویلی دلھن ہے بچی ابھی تو دو چار دن حیا کر

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعی رنڈی کو گھر میں ڈالا　　بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

لگائی سوسن نے ایسی مستی کہ جیسے بطخ نے کھائی کیچڑ　　کسی نے مارا ہے منہ پہ پتھر نہیں یہ آئی ہے پان کھا کر

نصیب سیدھا اگر ہے میرا چمکتی نکلے گی کھاٹ اس کی　　وہ سکھ نہ پائے گی جس نے بھیجا ہے اُلٹی پٹی تمہیں پڑھا کر

جو سنتا مرتا ہے فرہاد لوگو شیریں پر — وہ بس کی گانٹھ تھا خسرو بھی زہر کھا جاتا
میں بات کرتی جو اپنوں میں تم سے اے صاحب — ذلیل ہوتی تو بندی تمھارا کیا جاتا

کس کے تم غم میں بن گئیں مُردہ — اُودی در گور کیا یہ حال ہُوا
تو صنوبر سے دوستی کر کے — موئے شمشاد کیا نہال ہُوا

کھانا چبا کے خوب نہیں ماں سے پان کا — منہ کی کہیں کھلائے نہ چسکا زبان کا
بیڑا تو بی اٹھایا خدا سرخرو کرے — سرسبز ہوں پتہ جو لگے خاصدان کا

پیٹ سے اچھے نکالے تم نے پاؤں — ایک گھر سے دوسرا پیدا کیا

کھیر الکڑی کیا بچوں کو مری بھابی نے — ان کو وہ کوسنا اب تک نہیں بھتیا بھولا

اے بُوا پتھر کا دل ہے اس موئے بے پیر کا — تھا نکھٹو گھر میں خالق کے مری تقدیر کا
کیا کیا ہے دھوپ میں باندی نے سر اپنا سفید — آج تک آیا نہ شیریں کو پکانا کھیر کا
اشرفی خانم کی چوری لے پری خانم کھلی — ہے بنایا توڑ کے توڑا مری زنجیر کا

پیسہ تھا پاس رہتے تھے ہر آن آشنا — یا دُور دُور کرتے ہیں اے جانِ آشنا

کرتا رہا وعدہ تو یونہی دھوکے دھڑی کا — مانوں گی میں اقرار نہ اب ایک گھڑی کا

دور بھی کر او ماما کلو — کوسا ہوگا کوسا ہوگا
سوکھا ساکھا گورا گورا — کملو کا گھر والا ہوگا

بچی جو موئی میری داماد بہت رویا — مرنے پہ کھلی الفت ناشاد بہت رویا

ٹیسوں کا بال بال پہ اب تھانہ ہو گیا — کنگھی جو کی تو سوچ سکے یہ شانہ ہو گیا

لیلی اسی تو نے پائی ہے کیا ٹوٹی کلموہی — مجنوں کی طرح مردوے دیوانہ ہو گیا

طے کیا عشق کا جھگڑا نہ کسی قاضی نے — اس عدالت میں موا کوئی نہ عادل آیا

کہدی مہتاب سے مہرن نے ملاقات کی بات — ہیٹ کی ہلکی ہے اک دن نہ پچی رات کی بات

رات کو خواب میں لیلی نے کہا بندی سے — تو نے پھر زندہ کیا نام مرا میرے بعد

سچ میں کہتی ہوں نبی بخش برا ہے داماد — رکھے عزت مری بچی کی خدا میرے بعد

کارخانہ میں خدا کے ہے کسے دخل ہوا — بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد

مرجاؤں تو نہ آئے وہ بندی کی گور پر — کیا ہوں گدھی میں جان دوں بہرام گور پر

جو ہران کے کھلے ہیں بہوؤں پر — چھریاں نندیں ہیں اور کٹاری ساس

بولوں بڑھ کر تو ذبح کر ڈالے — ہے وہ جلاد بی ہماری ساس

بد زبانی نہ کرو ان سے بڑھی بوڑھی ہیں — ساس سسروں سے دلہن جان ہے درکار لحاظ

ہر کسی سے نہ الجھ جان بقول آتش

بات بڑھ جاتی ہے کھو دیتی ہے تکرار لحاظ

نازنین

مولوی عبدالغفور نساخ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ یہ تخلص علی بیگ دہلوی کا تھا جو ذوق کے شاگرد تھے اور رجان صاحب سے بہتر ریختی کہتے تھے۔ مگر تذکرہ نگار صابر کا مصنف نازنین کو عورت قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "غلط فہمان اداشناس کی نظر میں یہ تخلص ہے مرزا علی بیگ نام جوان خوش اسلوب رستم تواں بزور و قوت سہراب طاقت کا۔ نازنینان کشور جمال اس کے حسن یوسفی پر اگر زلیخائی کا دم بھریں کچھ دور نہیں اور نازک نہالان گلشن حسن اس کے گل رخسار کی نازکی سے اگر آپ کو غنچۂ رگ ریز تصور کریں تو کیا عجب ہے۔ اس کے خم کے آگے زور آزمایان ورزش خانہ طاقت کا سر جھکتا ہے۔ اور اس کے نعرۂ مردانہ کے سامنے شیر جولاں بیشۂ شجاعت کا دم بند ہوتا ہے۔ اس حیلہ آفریں شعبدہ ایجاد کا ناز و انداز و غمزہ طرازی و عشوہ سازی گاہ عشاق بے قرار سے لطف کے پردہ میں جان کا خواہاں ہونا اور گاہ اغیار نامحرم کی بغل میں بے تکلف سونا ــــ وغیرہ" بہرحال یہ صاحب ۱۲۷۱ھ تک دہلی میں زندہ موجود تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ لیکن اب دیوان ناپید ہے۔ صرف تذکروں میں کلام ملتا ہے۔ استاد ذوق کے قطعۂ تاریخ کے لفظ لفظ سے محبت و عقیدت کا آبحیات ٹپکتا ہے ؎

نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا — گیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے — اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رلایا — کہ اس پردہ میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کاملوں سے ہے الفت — غم ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی

لکھی ان کی تاریخ اور یہ ہوا غم
میاں ذوق کو میں ہوا آپ روئی

اسی رنگ میں ایک اور قطعہ دیکھئے ؎

نازنین اتنا بھی ہرجائی پنا — یہ تمہارے آگیا کیا دھیان میں
روز اک دھگڑے کی ہیں مہمانیاں — روز رہتی ہوں اسی سامان میں

ریختی میں عریانی زیادہ ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تا کا ‏ ‏ بڑا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

میں اپنے سر کو دھوتی ہوں بڑا اور یہ تماشا ہے ‏ ‏ موا بیٹھا ہے کیا خوش خوش کہ دن آیا تقاضا کا

کوئی بیٹھا ہو تجھے ہے کام اپنے کام سے ‏ ‏ اے نگوڑے آدمی کیا تو تو حیواں ہو گیا

سونا کبھی شوہر کو میسّر نہیں ہوتا ‏ ‏ عورت انھیں باتوں سے تر اگھر نہیں ہوتا

اے زنانی مردوا ہے بدگماں ‏ ‏ تو نہ کہہ باتیں ہمارے کان ہیں

دس گھر تو چھٹ چکے ہیں کہاں تک کروں خصم

کس جا بٹھائے دیکھئے اب آسماں مجھے

بیگم

تذکرہ چمن انداز اور ماہ درخشاں میں لکھا ہے کہ ان کا نام رشک محل تھا۔ پنجابن تھیں جو واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے متاع میں آئیں۔ اور پھر انتزاع سلطنت کے بعد بادشاہ کے ہمراہ کلکتے چلی گئیں۔ وہیں انتقال ہوا مرزا ریختی کہتی تھیں۔ چند شعر جو تذکروں میں ملتے ہیں درج کیے جاتے ہیں ؎

نہ بھیجوں گی سسرال میں تم کو خانم ‏ ‏ نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمھارا

مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو ‏ ‏ یہ احساں ہے سر پر دوگانا تمھارا

ہوا بال بیکا جو مرزا ہمارا ‏ ‏ تو پھر سنگ ہے اور شانا تمھارا

گھر سہ گانہ کے دوگانا مری مہمان گئی

میں یہ انگاروں پہ لوٹی کہ مری جان گئی

(تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۱۲۹)

عصمت

یہ تخلص امجد علی خاں کا تھا جو حسین علی خاں لکھنوی شاگرد محمد علی خاں متیتا کے فرزند تھے اور ریختی نہایت عمدہ کہتے تھے تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۳۲۲ میں ان کے چند شعر ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں :-

جو کم سنی میں دیکھ چکی منہ ہزار کے — بیٹھے گی کب بھڑوسے پہ وہ ایک یار کے
بی تم نے کیوں کنوار پنے میں چبائے پان — موتی سے دانت بن گئے دانے انار کے
نرگس کی چھوکری کا وہ دیدہ ہوائی ہے — کندن کو سارائے دیا گھنا اتار کے

بتیجے اے بوا اچھا نہیں مردوں کی صحبت کا — کھلے گا نو مہینے بعد گل اس عیش و عشرت کا
نہ لیتی نام تک ہرگز نکھٹو کا کبھی انا — مگر کچھ پاس ہے مجھ کو بڑے بوڑھوں کی عزت کا
نگوڑے شیخ نے پھر آج افیوں لے کے کھائی ہے — میں ڈرتی ہوں بوا پھر سامنا ہوگا قیامت کا
تری خاطر میں گھر سے دن دہاڑے آتی ہوں ورنہ
کسی نے آج تک آنچل نہیں دیکھا ہے عصمت کا

محسن و عنقا

یہ دونوں تخلص خانپور کے محمد محسن خاں کے تھے جو ریختی گو تھے اور عرصہ تک لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی زبانوں کے لطف کے ساتھ سماج پر طنز، شوخی، شرارت، رمز، کنایہ سب کچھ موجود ہے۔ فواحشات کم ہیں۔ خیالات انوکھے اور طرز بیان میں جدت ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ہوتا بسم اللہ سے آغاز ہے دیوان کا — راز سربستہ ہے وہ باجی درِ قرآن کا
ابنِ مریم تھا ثنا خواں باعث قرآن کا — کیوں نہ ہو قرآں پہ قربان دل انسان کا
پہلے نفرت تھی ہُوا پھر اس سے الفت ہو گئی — ہو گیا یوسف بھی شیدائی زلیخا جان کا
چشمِ یکتائی سے دیکھو تم اگر کبھی اسے — خالقِ اکبر ہے مطلب رام اور بھگوان کا

گلشنِ نعتِ نبیؐ میں بلبلِ دیوانہ وار
ہے ترانہ سنج محسنؔ اس گلِ یزداں کا

سراپا عصمت ہیں اور حیا ہیں یہ شرم باجی شعار اپنا — وہ بھڑوا ننگا ہے مسخرا ہے بنائیں ہم نوج یار اپنا
ہے یاد بندی کو بھی وہ لٹکا پھرے گا بھڑوا وہ بھٹکا بھٹکا — نہیں لنگوٹے کا کچھ بھی کھٹکا، ہو کوئی دشمن ہزار اپنا
بگاڑوں گی میں بھی حال گھر کا، وہ ڈالیں مجھ پر وبال گھر کا — کھلائیں رنڈی کو مال گھر کا، نکالیں مجھ پر غبار اپنا
ہے آنے ڈولی کھلا ہوا بی، امام باڑہ بھی کربلا بھی — لنگوٹے لڑتے ہیں کیوں بوا جی حساب کر لیں کہار اپنا

پھر گیا طبلہ بجانے آج گوہر جان کا — کیسا ننگا ہے لنگوڑا باب چندر بھان کا
خاک گائے گا لنگوڑا شیخ اپنی بزم میں — جانتا سُر ہی نہیں بھڑوا جو اپنی تان کا
کیوں نہ رنجیدہ ہو محسنؔ دو مہینے سے ہُوا — خط نہیں لاہور سے آیا الٰہی جان کا

عجب بلا میں پھنسی ہوں گوئیاں میں اس لنگوٹے سے دل لگا کر — یہ دونوں پھوٹیں جو رات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر
کھلے ہیں ایام حیدری کے پڑی ہے گھر میں وہ شیخ جی کے — جلائیں گے ہم چراغ گھی کے ضرور مسجد میں آج جا کر
بلا کی شوخی زبان میں ہے ستم کا جادو بیان میں ہے — وہ موہنی آن بان میں ہے کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

بگاڑے کیا کیا وزیر بیگم، نگاہ خونی کے تیر بیگم — بنایا دل کو اسیر بیگم، کمان ابرو چڑھا چڑھا کر
بگاڑتی کیوں ہے اپنا جوبن، ہے چند روزہ ہوائے گلشن — نہ سر پہ مستی نہ پان ساقن، اری دیوانی خدا خدا کر
بہار گلشن عیاں ہے اس میں ادائے بلبل نہاں ہے اس میں — وہ عنقا بیگم زباں ہے اس میں کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

کرے گا خاک موا آنکھ اور ناک کی شرم — نہ جس کی آنکھ میں مطلق ہو ماشا کا لحاظ

وہ اُلٹے اُلٹے سبق سُنانے کہ مار ڈالا جلا جلا کر — بگاڑا کسبی نے ان کو باجی سکھا سکھا کر سکھا سکھا کر
بُوا یہ بیگم ہے لکھنؤ کی، بڑی ہے معصوم اس کی گفتگو کی — ذرا جو آنکھ اس سے دو بدو کی تو اس نے مارا جلا جلا کر
سگھڑ سیانی تو ہو کے جانی، اخراب کرتی ہے زندگانی — جوانی ہوتی تو ہے دوانی، مگر نہ یوں شرم بھون کھا کر
کہاں سے لائے گا دم موا وہ، بڑا ہی ضمانہ ہے بُوا وہ — سراپا شگفتہ موا ہوا وہ، چرس نگوڑی اڑا اڑا کر
ہو رو برو کی کہ دو بدو کی، نگوڑی ہے بات آبرو کی — اُڑا کے دہلی میں لکھنؤ کی، بگاڑا کیا کیا بنا بنا کر
یہ ریختی ہے پری ہے یا گل، زباں ہے باجی کی مست بلبل — سرود میں ہے بہار سنبل، شمیم محسن اُڑا اُڑا کر

حسین بھی ہیں جوان بھی ہیں، جبیں پہ شاہی نشان بھی ہیں — ادائیں بانکی ہیں آن بھی ہیں، میں واری ان کو نہ ٹال گوہر
سخن کی دلھن بہار پر ہے، بہار مضمون اُبھار پر ہے — کلام محسن نکھار پر ہے غزل کی حسرت نکال گوہر

ناچنا رنڈیوں کے سامنے ننگا ہو کر — زیب دیتا نہیں مرشد کو یہ آقا ہو کر
جائے گا شیخ نگوڑا بوا سیدھا ہو کر — شوخیاں کرتا ہے مجھ سے بوا کٹنا ہو کر
کرلی مغلانی کی بھی چھوکری رسوا ہو کر — باز آتا نہیں دولھا میرا بوڑھا ہو کر
جب سے کنجڑن کو کیا شیخ نے شیدا ہو کر — رہ گیا سوکھ کے انجور کا چھلکا ہو کر
کیا کہوں کو کلا بیگم کی کہانی گوئیاں — پڑ گئی زاغ کے بس میں موئی عنقا ہو کر

کچھ نہیں شاہِ گستاخ سے امیدِ وفا ۔ لگتا محسن ہے مجھے زہر کی پڑیا ہو کر

پڑی لنگوڑی چمار کے بس، کمہار کے بس، کہار کے بس ۔ بجائے واحد ہزار کے بس، مگر نہ ہرجائی یار کے بس
نہ رُخ کی سرحد میں آپ جائیں، نہ مار کانوں کی آپ کھائیں ۔ نہ دیدہ دانستہ آپ آئیں ہمارے گیسو کی مار کے بس
ہوا تھا گوہر سے پھر جھگڑا کا ہے خام پارا بڑی لڑاکا ۔ کوئی نہ بندا ہوا خدا کا، ہو ایسی بے شرم نار کے بس
نہ آئی چھپا کلی نہ مالا ہے کب سے چمپت لنگوڑی خالا ۔ ہمارا زیور کھٹائی ڈالا، ہو نوج کوئی سنار کے بس
خدا جو ہم اس سوار پر ہیں، تو خالہ وہ کب قرار پر ہیں ۔ ذرا وہ پھولوں کے ہار پر ہیں میں ریش انور کے خار کے بس

ہیں چلتے پُرزے کرتے ہیں ہر بات کا لحاظ ۔ حرکات کی بھی فکر ہے سکنات کا لحاظ
مانا کہ پردہ والی سے کچھ بات ہی نہیں ۔ کیوں بات بات پر ہے مسمات کا لحاظ
کرو صفائی باجی کہ دولھا ہیں بے خطا ۔ کرتے نہیں عدو کی روایات کا لحاظ
افسوس تو یہی ہے کہ عفت ہوا نہیں ۔ محسن نگوڑے مارے کو کچھ بات کا لحاظ

بس اسی غم میں ہمارا کنجِ دل تاریک ہے ۔ وہ نہیں بھڑوا جلانے کا سرِ مدفن چراغ
دولھا بھائی گر پڑیں ٹھوکر لگے یا چوٹ آئے ۔ کیوں نہیں رکھتی ہو دُلھن تم پسِ چلمن چراغ

دکھاؤ تن تن گھڑی نہ موہن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
ہے چند روزہ یہ حسن و جوبن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

نہ رہ تو بیگم بوا کشیدی، جو رکھے رنڈی موا وہ شیدی
تو تو بھی جا جا کے کھیل ساون، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

یہ میخ پردہ میں گاڑ باجی، کسی سے مت تو بگاڑ باجی
اٹھے گا یا [illegible] سے چلمن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

اکبر الہ آبادی

آپ طنز و ظرافت کی شاہراہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورا نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آ
کے مشہور قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری سکولوں میں پائی اور انگریزی کی لیاقت اپنے شوق اور محنت سے حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں
تحصیلدار مقرر ہوئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے ۱۸۸۸ء میں جج کے عہدے پر پہنچ گئے۔ آخر حکومت سے خان بہادر کا خطاب حاصل کرکے ملازمت
سے سبکدوش ہوئے۔ الہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ بڑے خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ شوخی اور ظرافت ان کی سرشت میں شامل تھی اور اس کا
اظہار بات بات میں ہوتا تھا۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں اپنا کلام وحید میاں کو دکھایا کرتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ محسوس
کر اب تغزل میں چمکنا مشکل ہے۔ اس جادہ سے ہٹ کر تفنن، سیاست اور تصوف کی راہ پر پڑ لئے اور اس کے لیے مغربی تمدن کی بے راہ روی
تنقید کا ایسا نیا میدان ڈھونڈا کہ اس کے موجد بھی ہوئے اور خاتم بھی۔ ۱۸۷۷ء میں جب منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے ہفتہ وار اودھ پنچ نکالا تو
میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ نثر میں بھی شگوفے چھوڑے لیکن اقلیم شاعری میں تو یہ زمین ایسی اپنائی کہ شعر کا حقیقی دعویدار اب تک پیدا
بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی" ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا
پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے ان کو جانا مگر اس حیثیت سے کہ
روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں، ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں"

طنز و مزاح اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی طنز مجبور انسان کی دل ٹھنڈا کرنے والی طعن و تشنیع نہیں بلکہ گفتار
گرمی سے بجلی بن کر گرتی ہے ظرافت بھی ان ہزالوں اور فحاشوں سے بالکل الگ ہے جن کے دیوانوں کا سرمایہ ان کی ہرزہ سرائی اور
ہیں۔ وہ دلوں کو خوش کرتے، چہروں پر تبسم لاتے مگر جذبات سفلی کو بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ جوانی تک شوخی جوان رہی۔ عمر کا
ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی، صبح
کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی جمال
کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا۔ سوز عشق نے سینہ کو گرمایا۔ ذوق عرفان نے دل کو تڑپایا اور نور معرفت کی شعاعیں خود
مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکاچوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو بات ہے کہ ان کی ظرافت
صرف ظرافت ہے بلکہ پند و نصائح اور قومی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی زوال، رسوم، تاریخ، سیاست وغیرہ کا مجلّا اور مصفّا آئینہ ہے۔
چٹکیوں اور گدگدیوں سے دل کو ایک سچی خوشی اور روح کو صحیح فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور آدمی اس سے اچھا اثر قبول کرتا ہے۔ حق با
کی تلخی اور پند و نصائح کے زہر کو خوش بیانی اور مزاح نے شہد و شکر کے شربت کی مانند ایسا خوش مزہ اور گوارا کر دیا ہے کہ اس
سیری نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طنز و ظرافت اور طعن و تشنیع سے اکبر نے اصلاح قوم کا جو کام کیا ہے وہ کسی واعظ سے نہ ہو سکا۔

اکبر نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اپنے مخصوص رنگ میں نہایت لطیف ظریفانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ خود مذہب کے پابند تھے اس پر مشرقی وضع کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اس لیے آپ کے کلام میں وہی جذبہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما رہے جن کا تعلق بدمذاقی، اندھا دھند تقلید، بے تمیزی اور تنگ نظری سے ہے وہ جہاں مغرب کی کورانہ تقلید کی مخالفت کرتے ہیں وہاں ان لوگوں کے بھی خلاف ہیں جو مذہب کی آڑ میں دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے قطعات، رباعیات اور غزلیات میں ظرافت کی وجہ سے انگریزی الفاظ کا کافی استعمال ہے۔ نئی اور انوکھی تشبیہات ہیں۔ مخصوص محاورے، بولتی صنعتیں ہیں۔ قافیوں کی بہار ہے۔ پھر خاص خاص مطالب کو ادا کرنے کے لیے خاص خاص الفاظ اصطلاحیں ہیں مثلاً مِس، شیخ، سید، اونٹ، کلیسا، گرجا، کلیسا، مندر، بت، صنم، دیر، حرم، بتکدہ، کالج، صاحب، برہمن، لالہ، بدھو، جمن، گلو، شیخو، ریل، انجن وغیرہ اور یہ عام چیزیں ادبی نقطۂ نظر سے اس لیے اہم ہیں کہ اکبر نے انھیں بڑی قدرت، چابک دستی اور ہوشیاری سے مخصوص اصطلاحی حیثیت دے کر استعمال کیا ہے۔ ان میں ایک سلیقہ اور نفاست بھی ہے اور خوبی و لطافت بھی۔ سرسید کی تحریک، کانگریس، خلافت، گاندھی، علی برادران، یونیورسٹی کی تحریک، متوسط طبقے کی بدلتی ہوئی معاشرت، ہندی اردو کی کشمکش، مسجد و مندر کی آویزش، غرض اس دور کی کوئی تحریک اور کوئی تہذیبی مسئلہ ایسا نہیں جس کی دلکش اور غیر فانی تصویر اکبر کے کلام میں موجود نہ ہو۔

سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے، لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے۔ قدم قدم پر پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی اور جو اتنے معتقد و باادب نہ تھے وہ تو جھنجھلا اٹھتے۔ بس خدا جانے اتنا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لیے یعنی سترِ حال کے لیے، اخفائے خیال کے لیے ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا بڑے کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی۔ جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی، ہندو و مسلم، سنی شیعہ، سب کی صحبت میں اور مسجد اور مندر، کالج اور سکول، خانقاہ و میکدہ، کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے، ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے۔ اسے جھانکتے، تانکتے، اس کو جانچتے اس کو بھانپتے۔ ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے، لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب، بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گزرتے۔ کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو پچھ ہوئیں سہی[1]	[illegible]
سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار	شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف۔

”موسم“ کا اشارہ زیادہ تر سیاسی ماحول کی جانب ہے اور ”ہواؤں“ سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں انھیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لیے ایک جال بچھا دیا ہے جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

---

[1] کلیاتِ اکبر میں ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر | جال کسے گا کھال کے اندر

باون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا — لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں — ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں

اس قبلہ روجاعت کا انتشار دیکھو — اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں

اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

"قبلہ روجاعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ باون اگر نہ ہو تو دستہ چلے کس چیز پہ؟

سرکار نامدار کے بعض "نیکنام" محکموں اور سررشتوں کی ذہانت، طباعی، قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ غریب شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کارگزاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صدہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں، آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی راہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب [illegible] ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی معدوم کا اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ پتہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں [illegible] کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال۔ خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے۔ کمر کا حال ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکیٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا؟ مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لیے مخصوص تھوڑے ہی تھا جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے زین و قہاب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ کر دیتے۔" (مقالات ماجد)

اکبر کے یہاں ہر قسم کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اوّل وہ ظرافت جو ہر زمانہ اور ہر دور میں قائم رہنے والی ہے۔ دوسری [illegible] جو ہنگامی واقعات اور زندگی کے تقاضوں سے متعلق ہے۔ تیسری وہ جو محض تفریحاً ہے اور جس سے ہر طبقہ کے افراد محظوظ ہو سکتے ہیں [illegible] شاعری میں اگرچہ بذلہ سنجی کا عنصر زیادہ ہے مگر اس کو زیادہ تر طنز یا مزاح کی تخلیق میں حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بیشتر حصہ کلام [illegible] وہ ہے جس میں اسلوب کی نسبت خیال اور مواد پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ رعایت لفظی، محاورہ بندی، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت [illegible] [illegible] الفاظ کی آمیزش اور دوسروں کے اشعار میں تحریف و تصرف سے طنز کا بھرپور وار کرنے میں خاص مدد لی گئی ہے۔

علامہ یوسف علی کے خیال میں اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف پرزور الفاظ میں مشرق کی آواز تو بلند کی، مذہب کے زوال پر [illegible] [illegible] ریاکاری اور بے ہودگی کے خلاف اپنے جذبات منظر عام پر لانے کی کوشش بھی کی لیکن تمدنی ابتری کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ [illegible] [illegible] ملازمت کی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ان سے یہ توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ وہ کھل کر کوئی بات کہتے یا اصلاحی [illegible] پیش کرتے پھر بھی انھوں نے طنز و مزاح کے پردے میں ان رجحانات کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا جو ان کی دانست میں قابل مذمت تھے [illegible] طرح ان کی پوشیدہ طنز نے جس میں روح افزا گدگداہٹ پائی جاتی ہے مغربی تہذیب کے سیلاب کی تندی اور تیزی کو کم کر دکھا [illegible]

میں دیماپن پیدا کر دیا اور اپنی ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کو یکسر فنا ہونے سے بچا لیا۔
اکبر کی کلیات سے طنز و ظرافت کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔
مہدی سوڈانی کے جہاد کے بعد مصر کو انگریزوں کے پنجے سے چھڑانے کی خاطر عرابی پاشا نے مصر میں جہاد کا اعلان کیا۔ ہندوستان کی
سرحدوں پر بھی جہاد کے فتوے شائع ہوئے۔ یورپ کے سیاست دانوں نے جہاد کو ہوّا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا
وہ طبقہ جو سرکار پرست اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھا جہاد کے بارے میں عجیب و غریب توجیہات کرتا تھا جن میں سے اکثر لغو ہوتی تھیں
اکبر نے برق کلیسا والی نظم لکھ کر اس پر بڑی کامیاب طنز کی ہے ؎

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار — ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید — قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں — گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے — دل کش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں — سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی — بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق — ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی — سر کے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا — یا حفیظ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے — ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں ساماں اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دل زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانہ پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
ہیں تو تہذیب ہیں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ ہیں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ اور یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تجھ کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر ایم اے کرے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہر چرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

۱۸۹۵ء

عدو کی شست سے بچتے نہیں ہیں — یہ کالے ہیں مگر کوتے نہیں ہیں

اب تو بھس بھس کر دیا اور چل دیے گودام کو — جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں
اب بی اے کی طلب تفسیر کا کس کو خیال — فکرِ روزی ہو رہی ہے فخرِ رازی اب کہاں

رئیس لیڈروں پر طنز ہے

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے — محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

نہ سرگرمی پولس کی ہے نہ جاری مارشل لا ہے | کوئی شورش نہیں ہے ہر طرح سے خیر سلا ہے
یہ کلکتہ کی شوخی اور ڈھاکہ کی ادا سنجی | وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ لفظی گیند بلا ہے

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا | چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تقدیر کو خدا | دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج | کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر | بندہ بنا دیا ہے تجھے حبِ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج | راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر | کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آوے اگر آپ کو سفر | گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی | وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آوے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی | جس سے خجل ہو نورِ رخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی | کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کی چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنین | عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رکئے اگر تو ہنس کے کہے اک بتِ حسین | ویل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام | پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے | سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا

ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

۱۸۸۸ء

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

مسلمانوں نے خود ہی مقاماتِ مقدسہ فتح کرا کے ترکی کو تباہ کیا۔ پھر وفد لے کر ولایت پہنچے۔ اس پر اکبر نے یوں طنز کی ہے

بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں
غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں

تعلیم کی خرابی کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اس کا مضر اثر ذکور سے زیادہ اناث پر پڑتا ہے

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہیں وہ لیڈی اور ناچنے کو ریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے قضیے کو شیعہ سُنّی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی

بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انہیں فرنگی کے پاس پہنچے
وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو ہو وہ بھی نیٹو

فلک نے آخر یہ سن کے سب کی کہا کہ تم سب ہو مستِ غفلت
سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پہ چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

شیخ کہتے ہیں کہ پیروں کی پرستش بھی ہے فرض
ماسٹر کہتے ہیں اللہ کو بھی یاد نہ کر

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں
اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو چھوڑ دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو کہ نہ ہو

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی
قوم کی حالت میں اس سے کچھ جِلا ہو یا نہ ہو

مری تقریر کا اس ممن پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

پردے کا کیا ہے خود اڑنگا پیدا
خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا

کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے
نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

کہا یہ فخر سے واعظ نے دیکھو سادگی میری — نہیں شوقِ نمایش کچھ پہنتا ہوں گزی گاڑھا
کہا اکبر نے میں بھی یونہی کر لیتا نمود اپنی — عطا کرتا خدا مجھ کو جو یہ تن توش یہ داڑھا

ایسا شوق نہ کرنا اکبر — گورے کو نہ بنانا سالا
بھیا رنگ یہی ہے اچھا — ہم بھی کالے یار بھی کالا

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل — وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات — دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں — دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا — ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے چخ — اور شیخ کے گھر میں پنجگانے کی ہے چخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے — گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے چخ

تہمد پہ ہے شبہہ و حقارت کی نظر — پتلون پہ غصہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی کہ ننگے پھرئے اکبر — شاید پڑ جائے اُن کی رغبت کی نظر

جو سُن چکے مری غزلیں تو بولے لا چندہ — جو ہنہنایا ہے اتنا تو تھوڑی لید بھی کر

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی — نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

آگئے انجن کے دن ہے کیا چیز — بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

آپ کی فرقت میں کل میں رات بھر سویا نہیں — لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اوجالے پہ چوکتا بھی نہیں

چپکوں دنیا سے کس طرح میں — عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں — کالج نے کہا کہ توند ہوں میں

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں — جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

حال دنیا سے بےخبر ہیں آپ — گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے — چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آگیا غصہ — لگے کہنے یہ پھینک کر دُھسا
ہے تمھاری نمود بس اتنی — جس طرح ہو پڑی پہ بڑ پہ لید

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں — اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بےخوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ — گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر — انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اضافہ ہوتی مجھ سے گندم پہ مے　　　یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق لوٹے جو دانت　　　عوض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

رہا کرتا ہے مرغِ فہم شاکی　　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں خاکی
چھری سے اُن کی کٹوا کر فلک نے　　　خدا جانے ہماری ناک کیا کی
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے　　　کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

سوال اب یہ عبث ہے جب ہے تیلو نو کی ارزانی　　　چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کچہریوں میں ہے پرستش گریجویٹوں کی　　　سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی　　　خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

شیخ صاحب دیکھ کر اُس مِس کو ساکت ہو گئے　　　ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چت ہو گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا　　　آپ بی۔ اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پُل　　　بائیسکل پہ گزریں گے ہم پل صراط سے

ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست　　　داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرتِ واعظ ہیں خوب شخص　　　یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

اُردو کے تین رُبع کے مالک ہنود ہیں　　　پھر کیا سبب جو اُس سے اُنھیں انحراف ہیں
یعنی اُردو ہے چیز انھیں کے مذاق کی　　　اُردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہیں

شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قتِ دل — ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر آپ کالا لوگ ہیں

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے — دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

اب کہاں تک بتکدے میں صرف ایماں کیجیے — تا کجا عشقِ بتانِ سست پیماں کیجیے
ہے یہی بہتر علیگڈھ جا کے سید سے کہیں — ہم سے چندہ لیجیے ہم کو مسلماں کیجیے

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیمِ نسواں سے — بجز اس کے کہ با وا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ان کو کیا کام ہے مروت سے — اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں — ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے — شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے — اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

دہر کے بوسہ دن کا رخ رنگ ماہ کا — چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

پردہ در کی رائے سن کر بیبیاں کہنے لگیں — اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

جو وقتِ ختنہ میں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر — مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام — ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی۔اے ہو گئے

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم — اللہ کی مار اس پہ علی گڈھ کے حوالے
قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس — کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہہ کر ۔۔۔ یہ بے وقوف ہے مرنے کا ذکر کرتا ہے

—

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولوی ۔۔۔ کس کو سونپیں تمھیں اللہ نگہبان ہے

—

میرے لیے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام ۔۔۔ اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

—

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انھیں ۔۔۔ پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

—

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ ۔۔۔ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

—

ختنہ قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم ۔۔۔ مہرِ ابراہیم باقی دینِ ابراہیم گم

—

میری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت ۔۔۔ ترکِ لاحول پہ مجبور ہوا جاتا ہوں

—

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ ۔۔۔ گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

—

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے ۔۔۔ کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

—

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور ۔۔۔ کہ ترکی سے دشمن سے جا کر لڑیں

تہِ دل سے ہم کوستے ہیں مگر ۔۔۔ کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

—

کریما بہ بخشائے بر حالِ بندہ ۔۔۔ کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ

—

عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں ۔۔۔ دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

—

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے ۔۔۔ اسی سے شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

—

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی   اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی

وہ تو گرجا پر گرا اور یہ گیا کعبہ کو پھاند   شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے   اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

کچھ الہ آباد میں سامان نہیں بہبود کے   یہاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

کاش کر لے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور   کیک نو روز ہے اک رات تمنجن بھی سہی

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے   لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی   یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی   چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا   پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

رشتہ در گردنم افگندہ سیٹ   می برد ہر جا کہ میزاست و پلیٹ

ہوا آج خارج جو میرا سوال   کہا میں نے صاحب سے با صد ملال

کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ   وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ

یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی   مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی

کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے   تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں　　مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر　　کہنے لگا بتائیے تیشے کو کیا کریں

شراب اڑتی ہے مجلس میں رواں ہے خون تقوے کا　　مزا ہے اب تو رندوں کو نہ مفتی ہیں نہ قاضی ہیں

نام اللہ و رسول اب تو میں کم سنتا ہوں　　پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں

یاد کرتا ہے گزشتہ باثر لاحول کو　　شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطان ان دنوں

مجال کیا کوئی کہہ دے خوشامدی مجھ کو　　اسی سبب سے بہت سہل ہے جناب کی مدح

لاکھ رٹے کر رہے جاتے ہیں اللہ و رسول　　دیر کا کورس برہمن نے مگر کم نہ کیا

اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا　　خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں　　حجاب اُس کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا　　نقاب الٹ ہی دی اُس نے یہ کہہ کے کرہی لے گا مرا موا کیا

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل　　خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں　　لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور　　ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

چرخ نے پنشن کمیشن کہہ دیا اظہار میں　　قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

مفتیٔ شرع نہ ہوں لیڈرِ اسلام تو ہیں بوئے مسجد نہ سہی کیمپ کے گلفام تو ہیں

اس شرط پہ ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی قبر بن جائیں وہ کرے تزئین اُن کی ہم کریں

اولڈ مزا ہر طرف بدنام ہیں بنگ بدھو وارثِ اسلام ہیں

میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں مارچ میں بلبل ہوں تو جولائی میں پروانہ ہوں

قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

خوب لڑوایا ہم دل کھول کر مار ڈالا راویوں نے قوم کو

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پہ ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

وہ دل کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے
کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

کمیٹی میں چندا دیا کیجیے ترقی کے ہجے کیا کیجیے

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جنابِ قبلہ میں کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

تاکیدِ عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

تہذیب دم بخود ہے طمع کی گھسیٹ سے
حضرت بھی کام لینے لگے مار پیٹ سے

بجرے کے نغمے کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے
دیس کو جس نے بھلایا یہ وہی کھماچ ہے

سیٹھ جی کو فکر تھی ایک اک کے دس دس کیجئے
موت آ پہونچی کہ حضرت جان واپس کیجئے

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان
خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

یہ مصرع قافیے ہی کے لیے ہے خوب اے اکبر
جو اُجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں پیرس تو باقی ہے

ان کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی
کیمپ میں غل مچ گیا مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

شکم سے حضرتِ انساں نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

تھے معزز شخص لیکن انکی لائف کیا کہوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی ہے سب ناگفتنی

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی
اب تک میں بچا تھا آج پی لی

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں اُن کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر "استاد جی" نہ ہوں

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے
مسجد سے ہم نکل گئے گیہوں کی چاٹ میں

دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردّی — بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں — کہتے ہیں فیس لیجیے اور آہ کیجیے

قوم پر ممبری کا فیصلہ ہوا — کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا — اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز — جغرافیہ میں عرش کا نقشا نہیں ملا

خدا کی راہ میں اب ریل چل گئی اک دن — جو جان دینا ہو انجن سے کٹ مرو اک دن

وصل کا اُس بتِ خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں — صرف بوسہ میں بھلا سلف گورمنٹ کہاں

رسمًا تو ایک بوسہ ہے کافی دمِ وداع — لیکن مزاج تر ہے تو دو تین کیوں نہ لیں

شیطان نے ترکیبِ تنزل یہ نکالی — ان لوگوں کو تم شوقِ ترقی کا دلا دو

کافی ہیں امیروں کو قوانینِ گورمنٹ — مذہب کی ضرورت تو غریبوں کے لیے ہے

دل میں اب نورِ خدا کے دن گئے — ہڈیوں میں فاسفورس دیکھیے

دلیری سکھاتی ہیں ہم کو یہ کہہ کر — جہنم سے ڈرنا بڑی بزدلی ہے

برگڈ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے — مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو تلوار نکالو

ضبطی پرچۂ توحید ہوئی خیر یہ ہے
قل ہو اللہ احد ضبط نہیں خیر یہ ہے

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

حج کو کیونکر جائیں کارِ خانگی کو چھوڑ کر
اتنی فرصت ہو جو چہ ہوں کی تو بلی کیا کرے

شیخ جی کے دو نو بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

بابو ہمیں نکل گئے اس عہد میں تو خیر
رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامہ سے باہر ہے یہ پاجامہ سے باہر ہے

تعلیم اس کی اچھی جو گھر میں اپنے خوش ہو
مذہب اسی کا بہتر جس کو پولس نہ پکڑے

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے
جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا
شکر کر روٹی تو گیہوں کی رہی

نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور صورت ہے
وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بسکٹ ہے

لکھا ہے اور افاداتِ مہدی میں موجود ہے۔ نظموں میں وہ ایک خاص انداز سے مسائلِ حاضرہ پر طنز کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں زیادہ تر الہلال، زمیندار اور ہمدرد میں کشاف اور دوسرے ناموں سے شائع ہوئیں اور اپنی جذباتی اپیل اور طنزیہ کیفیت کے باعث بے حد پسند کی گئیں ـــ شبلی نعمانی کی ان طنزیہ نظموں میں مزاح کے عناصر بے شک کچھ زیادہ نہیں ابھرے۔ تاہم تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی سعی میں انھوں نے بالعموم کامیابی حاصل کی ہے۔ یوں بھی صحافت کی دنیا میں اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہنگامی واقعات پر طنز کرتے وقت ایک ایسا خاص انداز اختیار کیا جائے کہ بات ملک کے زیادہ سے زیادہ افراد پر اثر انداز ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر شاعر قادر الکلام ہے اور اس کے طنزیہ لہجے میں زہرناکی کے وہ عناصر موجود نہیں جو ردِ عمل کو تحریک دیں تو اس کے دل اور قلم سے نکلی ہوئی بات دور دور تک اثر کرے گی۔ شبلی نعمانی کی بہت سی طنزیہ نظمیں اسی قبیل کی ہیں کہ اگرچہ ان کا موضوع ہنگامی واقعات کے سوا اور کچھ نہیں تاہم ان کے پس پشت خلوص کا ایک ایسا بحرِ بیکراں موجزن ہے کہ وقت گزر جانے کے باوجود ان کا اثر زندہ و تازہ ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو نمونہ تو صحافتی مزاح کا پیش کرتی ہیں لیکن جن کے ڈانڈے ادبی مزاح سے بھی جا ملتے ہیں۔" (اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۳۴۸)

شبلی کی چند زندہ رہنے والی نظمیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں جن میں وہ ندوۃ العلماء کے اختلافات کو جنگِ زرگری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو "درس گاہ دغا کا خال"، مسلم لیگ کو بے کار اور بے عمل جماعت اور "سینۂ ملک پر بھاری سل"، مسلم لیگیوں کی حکام رسی اور خوشامدانہ حکمتِ عملی کو "تمہید سجدہ ہائے جبینِ نیاز" اور لیگ کے مطالبۂ سوشل اپیل حکومت کو غلامی کی منزل اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ کر ہدفِ طعن بنانے پر

مولویوں کا شغلِ تکفیر:-

اک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ — کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں — ہر چند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے ہٹے جاتے ہیں آزاد — وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہو جاتے ہیں برہم — ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا — یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد — کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں؟
جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوء ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

مولانا شبلی کانگریس کے حامی ہونے کی وجہ سے سرسید کے سیاسی مسلک کو پسند نہ کرتے تھے۔ مسلم لیگ چونکہ علی گڑھ والوں ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔ اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ لیگ کے ابتدائی اجلاسوں میں چند قرار دادیں منظور کی جاتی تھیں جن میں لجاجت اور التجاؤں کا زور ہوتا تھا اس واسطے اس کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔

پونا میں لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ لیکن کوئی موزوں صدر دستیاب نہ ہوتا تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ صدارت قبول کریں لیکن عین وقت پر وہ بھی تشریف نہ لائے۔ مولانا شبلی کو طنز کا اچھا خاصا موقع ہاتھ آگیا اور انھوں نے ذیل کی نظم کہی ؎

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
اس وقت پاس آپ کا ہونا ضرور تھا

ہرچند لیگ کا نفس واپسیں ہے اب
اس سعی دور وزہ پہ جس کو غرور تھا

وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ ہی
ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا

وہ دن گئے کہ تبکدہ کو کہتے تھے حرم
وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا

وہ دن گئے کہ شارعِ اول کا حرف حرف
ہم پایۂ کلام سخنگوئے طور تھا

وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر زماں کے بعد
گویا کہ اب امام زماں کا ظہور تھا

اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی
اس نقش سیمیا میں نظر کا قصور تھا

اس دست مرتعش میں نہ تھی قوت عمل
اک کاسۂ تہی یہ سرِ پرغرور تھا

یہ لمعہ سراب نہ تھا چشمۂ بقا
یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا

آئینِ بندگی میں تملق کی شان تھی
اخلاق و صدق شیشۂ مکر و زور تھا

ان کی دکان کی وہ ہوا اب اکھڑ چلی
جن کے گھروں میں جنس وفا کا وفور تھا

اب یہ کھلا کہ واقف سر تھا اسی قدر
جو جس قدر مقام تقرب سے دور تھا

ہر دم براورانِ وطن کی برائیاں
ظاہر ہوا کہ فتنۂ اربابِ زور تھا

سب مٹ گیا سیاست سی سالہ کا طلسم
اک ٹھیس سی لگی تھی کہ شیشہ یہ چور تھا

لے دے کے رہ گیا تھا سہارا بس آپ کا — یہ جسمِ مُردہ منتظرِ نفخِ صور تھا
امید تھی کہ اب کے بدل جائیں کے اصول — مٹ جائے گا نظام میں جو کچھ فتور تھا
ہو گی کچھ اب نظامِ حکومت پہ گفتگو — جس دن کا منتظر کہ ہر اک باشعور تھا
دیں گے برادرانِ وطن کو پیامِ صلح — آویزشِ عبث سے ہر اک دل نفور تھا
یہ کیا ہوا کہ آپ نے بھی بے رخی سی کی — کیا آپ کو بھی رازِ نہاں پر عبور تھا
یا یہ سبب ہوا کہ پراگندہ تھا مزاج — از بسکہ "آستانہ" میں شورِ نشور تھا

ممکن ہے اور بھی ہوں کچھ اسباب ناگزیر
یہ سب سہی یہ آپ کو آنا ضرور تھا

اس نظم میں طنز اتنی شدید اور تیز ہے کہ ایک بار تو بڑے سے بڑے مخالف کے پاؤں بھی اکھڑ جاتے ہیں ؎

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن؟
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن
خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں وہ ہوں — آپ تو فرمایئے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جا کے کی تھی جو کچھ گفتگو — ماحصل اس کا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن
سعیِ بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق — اُس میں کچھ حصّہ ملے ہم کو بھی بہرِ پنجتن
یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار — لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی سرکار زمن
لیکن اب تو آپ کی بھی کھلتی جاتی ہے زباں — آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن
اب تو مسلم لیگ کو بھی خواب آتے ہیں نظر — اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن

ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی — تھا یہی تو منتہائے فکرِ یارانِ وطن
آپ نے بھی اب تو نصب العین رکھا ہے وہی — کانگرس کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن
آپ بھی تو جادۂ استبداد سے اب ہیں منحرف — اب تو [illegible] آپ کے بھی ہے شکن

جب یہ حالت ہے تو پھر ہم [illegible]
منکرِ بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

خطاب بہ احرار

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا — قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر — ٹوٹ جانے کا طلسمِ اثرِ استبداد
ہاں مگر ایک گزارش بھی ہے یہ قابلِ غور — یہ تو فرمائیے اس باب میں کیا ہے ارشاد
بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن — شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد
آبلہ قابلِ نشتر تھا یہ مانا لیکن — دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا — خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ افراد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توجیہِ خیال — نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشہ و زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم — خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے تباہ — یوں ہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا — یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیشِ نہاد

بھاپ پُر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہو گا فصّاد

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں سڑک سیدھی کرتے ہوئے کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصّہ مسمار کر دیا تھا جس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ گولی چلی اور بہت سے مسلمان شہید ہوگئے۔ مولانا نے اس موقعہ پر کئی پرجوش نظمیں لکھیں جو ضبط ہوگئیں۔ شہید ہونے والوں میں چند معصوم بچے بھی تھے جن کے متعلق حکومت کے کارندے عجیب عجیب توجیہیں کرتے تھے۔ مولانا نے اس پر تعریض کرتے ہوئے جو نظم لکھی اس کا یہ شعر آج تک لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے ؎

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انھیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

حکومت نے اس آگ کو دبانے کے لیے بعض علماء سے اپنے حق میں فتوے حاصل کیے جنھوں نے کہا کہ جو حصّہ گرایا گیا ہے وہ دوسرا ہے۔ اسے مسجد کہنا غلط ہے۔ علماء کے اس اختلاف پر مولانا نے تجزیہ و تعریہ کے عنوان سے اس طرح چوٹ کی ؎

ہمیں جس چیز نے کھویا وہ تفریق و تجزی تھی
یہی وہ شے ہے جو بربادیٔ مسلم کے درپے ہے

مگر اب تو در و دیوار تک اس کا اثر پہنچا
وضو خانہ الگ اک چیز ہے مسجد الگ شے ہے

مولانا بعض اوقات خوش طبعی کا ثبوت بھی دیتے تھے چنانچہ ۱۹۱۰ء میں وہ کسی کام سے الٰہ آباد گئے۔ اس وقت ان کی ٹانگ ایک بندوق سے زخمی ہو چکی تھی۔ اکبر الٰہ آبادی نے انھیں کھانے کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خاص رنگ میں لکھا ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی،
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی

تکلیف فرماؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

حاضر ہو جو کچھ دال دلیا
سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

مولانا نے معذرت کرتے ہوئے جواب میں یہ دلچسپ پیرایہ اختیار کیا ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا اچھلتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

بعض غزلوں کے یہ شعر بھی دیکھئے جن میں کس قدر شوخی ہے ۔۔

خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا — لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا

ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی — یوں تو ظاہر میں مقدس تھا بہ شیدائی تھا

تیس ۳۰ دن کے لیئے ترک مے و ساقی کر لوں — واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تیری خاطر سے ہیں یہ بھی کر لوں

اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں

دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی — خوب گذرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

اہل ثروت سے یہ کہہ دو کہ مبارک ہو تمہیں — الحمد اللہ ابھی ملک میں ہیں ایسے فروش

احرار کا طریق عمل ہے اگر یہی — پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

اسی قسم کے اشعار کی بنا پر جو مولانا نے ایک خاص وقت، مخصوص سیاست اور موضوع پر لکھے ان کو طنز نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اصل میدان یہ نہیں تھا۔ اس رنگ کو بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے زیادہ گہرا کیا۔

حالی

مولانا الطاف حسین حالی انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے اور خواجہ ایزد بخش کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع تھا کہ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ علم و ادب کا شوق فطری تھا۔ ۱۸۵۴ء میں گھر بار چھوڑ دہلی چلے گئے اور مولانا نوازش علی سے تعلیم حاصل کی۔ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ شاعری میں اگرچہ غالب کے شاگرد تھے مگر انھیں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا اچھا موقع ملا جس سے ان کے علمی و ادبی ذوق کو اور بھی جلا ہوئی۔ ملازمت کے سلسلہ میں دلی کے علاوہ لاہور میں بھی رہے مگر یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے ۔۔

رہے لاہور میں آکر سو جانے ‏ ‏ ‏ یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام ‏ ‏ ‏ کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

آخر ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیا سے رحلت فرمائی اور پانی پت میں درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے احاطہ میں جگہ پائی۔
حالی مصنف بھی تھے، نقاد بھی اور شاعر بھی۔ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر مسدس حالی (مد و جزر اسلام) لکھی جو ان کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید کے علاوہ ان کے مقدمۂ شعر و شاعری کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا کی طبیعت میں سادگی، خلوص اور شرافت تھی۔ وہ بڑے پاکباز اور نیک دل انسان تھے۔ ان کی ہر بات میں بھی نیکی، خلوص اور دھیما پن ملتا ہے۔

حالی کا کلام بظاہر قہقہوں سے خالی ہے۔ غدر ان کے لیے ایک ایسا نفسیاتی سانحہ تھا جس نے ان کی سادہ زندگی کو خوشی سے محروم کر دیا۔ ان کے لبوں پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے لیکن اس مسکراہٹ میں صرف افسردگی ہی نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں یا اندرونی خلش اور دل کی ٹیس ہے جو مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "حالی کے کارنامے خونِ چمن ہیں لیکن ان میں چمن کی رنگینی اور خون کی گرمی نام کو نہیں۔" (تنقیدیں ص ۲۱)

اس کے باوجود "طنز و ظرافت میں انھوں نے کمال دکھایا ہے، مگر ظرافت کو مسخرہ پن، ہزل یا فواحشات کی حد تک نہیں جانے دیا بلکہ بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی تک محدود رکھا، حکیمانہ ظرافت کی تصویر کھینچ کر دکھا دی اور اس متانت کی وہ صورت بنا دی جس پر سے ہزاروں شوخیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک غور کیا جائے مزاح اور خوش دلی کے پیکر مجسم کی بے تعداد تصویریں نظر کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ ظرافت سے حقیقی مقصد ظرافت حاصل ہوتا ہے۔ بعض جگہ عبرت کو اس انداز سے ظرافت کا ہمدوش کیا ہے کہ دیکھنے والا اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اس کے آنسو بھی ساتھ ہی نکل آتے ہیں۔
وہ لوگ کثرت سے ملیں گے جن کے یہاں صرف الفاظ کے رنگ و روغن سے ظرافت کے مجسمے چمکائے جاتے ہیں اور ان کے حصول سے سخت غفلت کی جاتی ہے۔ مولانا حالی کے یہاں وہ قالب بے جان اور مجسمہ بے روح نہیں ہیں۔ ان کی ظرافت کو گدگدیاں کیئے یا چٹکیاں، دل و دماغ اس سے مسرور ہو جاتا ہے اور روح کیف نشاط سے مخمور۔ مگر ظاہری متانت کبھی جانے نہیں پاتی۔" (خندۂ گل ص ۱۹۲، ۱۹۱)

چند نمونے ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف ‏ ‏ ‏ طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں ‏ ‏ ‏ جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ ‏ ‏ ‏ سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر ‏ ‏ ‏ نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں ‏ ‏ ‏ لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر | کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل | قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

مولانا کے طنز کی بہترین مثال "کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" والی نظم ہے۔ فرماتے ہیں ؂

دو ملازم۔ ایک کالا اور گورا دوسرا | دوسرا پیدل۔ مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں | کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت | گو کہ میں کالے کی اک مُکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت سنگین کی | آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی | چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس | ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونو کی سنی جب سرگذشت | تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیقِ مرض | اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے | کر نہیں سکتا حکومت ہند پہ وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند | کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

اور دیکھیے ؂

کہتے ہیں ایک امیر زادے کو | تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں | لازمی ہیں وہ اس میں بھی سب تھیں

بولا کہ عادت اس لئے کی ہے یہ اختیار　　چھٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک　　آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار　　منت سے مجھ سے کبھی ملتا نہیں ٹکا

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا　　کب تک لے نادان یہ حب مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ　　ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح　　زر لٹا نا رائیگاں اور اس قدر
آج ہی گویا نصیب دشمناں　　آپ کا دنیا سے ہے عزم سفر

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف　　تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال
کہا فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور　　جہاں ہو آتش تصدیق و روغن اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل　　نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے　　فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطہ ملعون تھا یہی جس کی بدولت　　تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا
بس بھی اسے اک باغی طاغی کے علی الرغم　　اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خضیب ایک غلام حبشی تھا　　جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنت مصر کی باگ اس کے حوالے　　نااہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
بارٹی[1] گئی یہ ایک برس نیل کی رو میں　　یہ حادثہ آ اس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون　　ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

[1] کپاس کا کھیت

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ کشور — مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی حکومت

لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج — واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت

فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاندار — قبضہ میں ہے واں عورتوں کے دولت و مکنت

اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی — سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

غیبت کرنے والوں کی ہجو مولانا ایک رباعی میں اس طرح فرماتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں

اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں — خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

فضول اور بے مقصد شاعری کو مولانا "تپ دق" اور خلافِ تہذیب شعر کہنے والوں کو "جہنمی" سمجھتے تھے۔ ایسے [illegible]

شعرا کی نسبت ان کا مقولہ ہے ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں — کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں

گویّے امیروں کی نورِ نظر ہیں — ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں

مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں

خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے بف نظر علم انشا ہمارا

حالی جیسے ثقہ عالم جب بزم رنداں میں قدم رکھتے ہیں تو [illegible] داستان کو ایک گونہ میں رکھ کر شیخ واعظ اور محتسب پر اس طرح طنز کے تیر برساتے ہیں ؎

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے — اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

دیکھیے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے — یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

واعظو دین کا خدا حافظ — انبیا کے ہو تم اگر وارث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز — سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی — ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

شیخ اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی — بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ — قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس نے کبھی نہیں ہے — ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مالِ دنیا

اہلِ حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر — سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

افسوس اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا — خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
امت کو پھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر — اسلام ہے فقیہو! ممنون بہت تمہارا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں — پر آیا جب امتحان کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہیے اب کیا ہے صلاح — فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکا — ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے — سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

پوچھا جو کل انجامِ ترقی بشر — یاروں نے کہا یہ ہے [illegible]
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب — ہو جائیں گے کھیل [illegible]

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم — سمجھو کہ وہاں ہے [illegible]
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت — یا ہے کوئی مولوی [illegible]

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظ نے انھیں [illegible]
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے [illegible]

کہنا فقہا کا مومنوں کو ہے دیں — سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد — یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے — پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت — اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

واعظو! ہے ان کو شرمانا گناہ — جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
چھیڑ کر واعظ کو حالیؔ خلد سے — بستر کیوں اپنا چھکواتے ہیں آپ

خبر بھی ہے تمھیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر — ہیں آپ جو کہ بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ — منہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن — سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

ریاض خیرآبادی

سید ریاض احمد نام، ریاض تخلص تھا۔ ان کے اجداد کرمان شاہ (ایران) کے رہنے والے تھے۔ عزیزوں کے جلے ... اس خاندان کے بعض افراد شاہی ملازمت میں منسلک ہو کر ہندوستان آئے اور سیتاپور، بارہ بنکی اور خیرآباد وغیرہ علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ریاض ... (۱۸۵۳ء) میں بمقام خیرآباد پیدا ہوئے لیکن ان کے بچپن اور جوانی کا زمانہ گورکھپور میں گزرا جہاں ان کے والد سید طفیل احمد سرکاری ملازم ... ریاض کے مشہور شعر ہیں ؎

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے　　بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا　　نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھپور ہو جانا

ریاض مدرسہ عربیہ کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر شاعری میں پہلے اسیر کے اور اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ زندگی ... پولیس کی ملازمت سے کی لیکن جلد ہی ملازمت ترک کر کے اخبار نویسی شروع کر دی۔ سب سے پہلے ۱۸۷۲ء میں "لمع رحمانی" کے نام ... ایک مطبع قائم کر کے "ریاض الاخبار" اپنے وطن خیرآباد سے جاری کیا۔ اس کے بعد وہیں سے روزانہ "تار برقی" نکالا۔ ۱۸۸۵ء میں خیرآبادی ... شعر و سخن کا ایک ماہنامہ "گلکدہ ریاض" جاری کیا لیکن ۱۸۸۱ء میں ریاض الاخبار کو مستقل طور پر گورکھپور میں منتقل کر لیا۔ ۱۸۸۳ء میں "فتنہ" ... "عطر فتنہ" ۱۸۸۴ء میں روزانہ مسلح کل اور پھر گلچیں جاری کیا۔

ان اخباری ذمہ داریوں کے ساتھ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۱ء میں ریاض نے رینالڈس کے دو ناولوں لوز آف دی حرم اور رس ... کا ترجمہ (انگریزی نہ جاننے کے باوجود) "حرم سرا" اور "نظارہ" کے نام سے کیا۔ ایک ناول کا سلسلہ "تصویر" کے عنوان سے "ریاض الاخبار" ... شروع کیا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا۔ ناول ناشاد بھی ان کی یادگار رہے۔

ریاض نے ۲۰ جولائی ۱۹۳۴ء (۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ) کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ ایک نغز گفتار شاعر ہی نہیں ... بلکہ اعلیٰ درجے کے نثار، خطیب سحر کار، رند وضعدار، مسلم دیندار اور وطن کے سچے پرستار بھی تھے۔ ان کی طبع رواں کسی بات کی پابند نہ تھی ... تغزل کے بادشاہ، خمریات کے امام، اقلیم نازک خیالی کے شہریار، بلند پایہ طنز نگار اور ثقہ مزاح نویس بھی تھے۔ ان کی میٹھی میٹھی چٹکیاں، ... چٹکلے، دل میں پیوست ہو جانے والے طنز و تعریض کے تیر، انوکھی اور پھڑکتی ہوئی اصطلاحیں، بولتے ہوئے محاورے، کشتِ زعفران ... والے جملے اور شوخ اشعار ہر قسم کے حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔

"انشا پردازی کے سلسلے میں ریاض کے دو معرکے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا معرکہ اودھ پنچ اور اس کے ایڈیٹر منشی سجاد ... سے ہوا۔ اودھ پنچ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس اخبار سے ٹکر لینا کیا معنی رکھتا تھا۔ اس کے طنز اور ظرافت کا جو ...

دینے کے لیے سجاد حسین کی سی ذہانت، شوخی اور برجستگی درکار تھی۔ ریاض کے قلم نے اس سلسلے میں بڑی بڑی جولانیاں دکھائیں۔
دوسرا معرکہ میرٹھ کے مشہور اخبار طوطیٔ ہند اور اس کے ایڈیٹر سے رہا اور معرکۂ اودھ پنچ کی طرح اس مرتبہ بھی میدان ریاض کے ہاتھ رہا۔
ان معرکوں ہی کی بدولت ریاض کی انشاپردازی کی شہرت ہوئی۔ اس دوران میں انھوں نے کبھی ذاتیات کو بیچ میں آنے دیا اور نہ کبھی عامیانہ زبان
و بیان کو دخل دیا۔ اخبار ہفتہ وار تھا۔ لیکن ریاض کی تحریروں میں ایسا لطف تھا کہ پڑھنے والے [illegible] کے لیے بیتاب [illegible] رہتے تھے۔"
(لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۶۲۱)

عقیل احمد جعفری نے ریاض کے مختلف مضامین جمع کر کے "نثر ریاض" کے نام سے شائع کئے ہیں۔
میر اور مصحفی کے رنگ تغزل کی پیروی کرتے ہوئے ریاض نے خود غزل میں ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس میں خمریات، شوخی،
معاملہ بندی، جذبات نگاری اور نفسیاتی تحلیل و تجزیہ، معرفت و حقیقت، شانِ استغنا اور طنز و ظرافت وغیرہ عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ شوخی
اور خمریات تو ان کے دو ایسے محبوب موضوع ہیں کہ انہی دو محوروں پر ان کی بیشتر شاعری گردش کرتی ہے۔ مولوی سبحان خاں عظیم گورکھپوری لکھتے ہیں:۔
"منشی ریاض احمد سر سے پاؤں تک اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہیں سکتے تھے۔ میں نے اردو کے پچاس شاعروں کا
کلام اوّل سے آخر تک دیکھا ہے جس میں ان کا ابتدائی، متوسط اور آخری دور سب شامل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ابتدائی کلام ہے۔ اب متانت آ رہی
ہے۔ اب متانت آ گئی۔ لیکن ریاض کی شوخی کا قدرت کی طرف سے ایسا پختہ رنگ تھا جو کبھی پھیکا نہ پڑا۔"
ان کا دیوان "ریاض رضوان" کے نام سے اور اشعار کا انتخاب "میخانہ ریاض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دیوان کے دو حصے ہیں۔
پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۰۸ صفحات ہیں اور اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار چھ سو پچاس کے قریب ہے۔ دوسرا حصہ مختلف اصناف
سخن کا مجموعہ ہے۔ یہ ۲۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔
ریاض کے یہاں قدامت کے ساتھ وہ انبساط، وہ شوخی، وہ شگفتگی، وہ دلکشی اور رندانہ مضامین کی افراط ہے کہ بعض نقادوں نے
خمریات ریاض کو مطائباتِ ریاض کا نام دیا ہے۔ ان کے دیوان میں کم و بیش ۱۲۶۶ شعر شراب کے موضوع پر ہیں۔ جن لوگوں نے ریاض کو دیکھا ہے
ان کا کہنا ہے کہ "وہ یکسر بہار تھے۔ بذلہ سنجی ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا کلام حد درجہ دلنشیں اور شوخ ہے
ان کی ساری کائناتِ فکر جوش و سرمستی میں رچی ہوئی ہے۔ شیخ اور زاہد پر جو طنز انھوں نے کئے ہیں وہ ایسے دلنشیں اور پُر لطف ہیں کہ شاید
اس کی داد خود محتسب بھی دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے اسلوب بیان میں شوخی ہے۔ اس شوخی میں محاکات اور محاکات میں میناۓ و ش زاہد و محتسب
کی نورانی صورتیں چلتی پھرتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ صحنِ میخانہ کا جو نقشہ وہ پیش کرتے ہیں اس کو پڑھ کر انسان ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہے جہاں
فردوس کی ہوائیں، کوثر و تسنیم کی روانی، ساغر و مینا کی کھنکیں اور طوبیٰ کا ترنم ساری کائنات پر چھایا ہوا ملتا ہے۔ اس فضا میں جب وہ واعظ
سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :۔

ارے واعظ کہاں کا لامکاں عرشِ بریں کیسا چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

تو بڑے سے بڑا زاہد خشک بھی سوچنے لگتا ہے کہ ذرا چڑھا کر آزمائش تو کروں کہ کہاں پہنچتے ہیں۔" (علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر صفحہ ۶)
مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاض کی رندی و سرمستی صرف ان کی شاعری تک ہی محدود تھی۔ خود انھوں نے زندگی بھر شراب کا ایک قطرہ تک

نہیں چکھا تھا۔ وہ روزہ اور نماز کے پابند بڑے سچے مسلمان تھے۔ ان کی پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں رہ کر کوئی مے طہور سے دستکش رہے ۔

توبہ کے پاس نے روکا لب کوثر مجھ کو   آج پینے کو طبیعت مری چاہی کیسی

اپنی تصویر انھوں نے ان اشعار میں کھینچی ہے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن   ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

کچھ عجب طرح کے ہیں رند ریاض   آپ پیتے نہیں پلاتے ہیں

رندانہ مزاجی کی وجہ سے ریاض واعظ کی پگڑی اچھالتے اور اس پر طنز سے مسکراتے ہیں کہ وہ کم نظر اور کوتاہ بین مجاز کے طلسم سے [illegible] حقیقت کی دنیا میں نہیں آنا چاہتا بلکہ ظاہر پرست ریاکار اور ابلہ فریب ہے ع

توبہ کے گھر میں روز رہی مہماں شراب

ان کی شستہ ظرافت، لطیف اور سبک شوخ نگاری کے چند نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے ؎

دستِ شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض   بیٹھ کر یادِ خدا میں جھومتا جاتا رہا

یاں وہ لے دے ہوئی آکر کہ الٰہی توبہ   ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا

یہ دن ہے حشر کا ہو کر رہے گا وہ جو ہونا ہے   ارے جھوٹے کچھ اب قول و قسم سے ہو نہیں سکتا

چھپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے   بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا

مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا   جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

چن چن کے آج شیخ نے انگور کھائے   اب کیا رہا ہے تاک کا حاصل نکل گیا

واعظا انگور میں ہے دخترِ رز رو بہ نقاب	آنکھیں پھوٹیں جو اُدھر تاک لگائے کوئی

ہمارا عیب کھلتا ہے نہ کھلتی ہے چھپی بوتل	ہمارے کام کیا کیا جامۂ احرام آتا ہے

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ	بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

منہ زیرِ تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا	بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا

کاتب اعمال نکلے کام کے	مل گئے دو دو شریک الزام کے

اتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی	گرہ میں دام نہ ہوں گے ادھار پی ہوگی

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے	ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

بانس پر میکدہ میں تجھ کو چڑھایا اے شیخ	پھر بھی اُونچے تری مسجد کے منارے نکلے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے	ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

چھیڑ کر مجمعِ زہاد کو ڈرتا ہوں ریاضؔ	کہنہ مسجد کے عوض ہو نہ مرمت میری

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی	میکدے سے اب پرانی جائے گی

اُتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا	طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
ناصح کا منہ ہو بند چکھا دو شرابِ خلد	ساقی ذرا ریاضؔ کی بوتل اٹھا تو لا

سُن کے یہ قبلے سے ابر اٹھے تو پینا ہے ثواب	لٹ رہا تھا میکدے میں ہم نے بھی لوٹا ثواب

آگے کچھ بڑھ کر ملے گی مسجد جامع ریاض
اک ذرا مڑ جائیے گا میکدے کے در سے آپ

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

یہ مئے تلخ ترے منہ سے لگی ہے کہ نہیں
سچ بتا دے ارے زاہد کبھی پی ہے کہ نہیں

کیا ادھر ہو کے بہا ہے کوئی دریائے شراب
جھومتی قبلے سے کیا مست گھٹائیں آئیں

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

آئیں گے جب فرشتے تو منہ کھلے گا اس کا
بوتل کوئی چھپا کر رکھ دے مرے کفن میں

شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا
ہے بہت ہی بدمزہ اچھی نہیں

بڑے موقع سے تھی ہر چند وہ جنت سے باہر تھی
حرم سے ہٹ کے رستے میں ملی مے کی دکاں مجھ کو

جھومتی قبلے سے آئی تھی ستم ڈھانے کو
وہ گھٹا جھک کے اڑا لے گئی میخانے کو

در توبہ نہیں جو بند بھی ہو
کھلا ہر وقت میخانے کا در ہے

کیسا پینا کہاں کی توبہ !
اب میں ہوں خدا ہے بیخودی ہے

شرماؤ ریاض میکشی سے
لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے
تم بھی جا کر جوان ہو جاتے

شور واعظ کم نہیں ہوتا ہے تو للکار دے
اک ذرا او قلقل مینا بلند آواز سے

یہ میکدہ یہ بھیڑ یہ انبوہ یہ ہجوم، ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

شریک اس میں کیا ہوگا آبِ زمزم بھی ریاضؔ نے پس توبہ کبھی جو پی ہوگی
ہجوم دیکھ کے سمجھے یہ روزِ محشر ہم کھلی دکان کسی مے فروش کی ہوگی

خدمتِ میخانہ کر لے ورنہ شیخ رائگاں یہ زندگانی جائے گی
پینے آئیں تو فرشتہ خود ریاضؔ حور کے دامن میں چھانی جائے گی

شراب خانے میں ہے رنگ میکشوں کا وہی نہ خانقاہ نہ وہ اہلِ خانقاہ رہے

توبہ کر کے آج پھر پی لی ریاضؔ کیا کیا کمبخت تو نے کیا کیا

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

کہتی ہے اے ریاضؔ درازی یہ ریش کی ٹٹی کی آڑ میں ہے مزا کچھ شکار کا

گاندھی بھی اپنے کام میں آندھی سے کم نہیں کم ہوں تو کام دیں یہ نسیم بہار کا

بوتل چرا کے لاتے تھے ہم میکدے سے روز موقع ملا تو رات کو خم بار سر بنا

ہزاروں عیب چھپاتی ہے میری ریش سفید چرائے کوئی خم مے مجھے بتا دینا

خم سے نہ ہوں وہ سیر میں چلو میں سیر ہوں بہ ظرف شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی وہ سر پہ لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

وہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی — راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

بن کے مہمان ایک رندِ روزہ دار آنے کو ہے — شام ہونے کو ہے میرے گھر ادھار آنے کو ہے

میکدے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے ریاض — دے کے اک جام کوئی لے تیس روزوں کا ثواب

اس شیخِ کہن سال کی اللہ ری بزرگی — جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

اے پیرِ مغاں دخترِ رز عمر رسیدہ — بوڑھا ہوں مئے نورِ نظر چرخِ کہن کی

کالی گوری کوئی نہ چھوڑی — افیوں کھا کر پی لی۔ توبہ

کس شوق سے شریکِ جماعت ہوئے تھے ہم — دیکھا سلام پھیر کے تو شیخ جی نہیں

سر ہے ترا بجائے سبو جھوٹ کیوں کہوں — واعظ حرام چیز کبھی میں نے پی نہیں

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے — آج شیشے میں اسے ہم نے اتارا کیسا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید — مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا — واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

اچھوتے جام ہیں مدت سے کچھ الگ رکھے — کسے پلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا

محفلِ وعظ میں بیٹھا سرِ منبر واعظ

لا کے خم کوئی بٹھا دے نہ سرِ خم مجھ کو

شیخ صاحب سوئے میخانہ ریاض آتے ہیں آج
فرشِ راہ میکدہ دستار رہنے دیجئے

جلوۂ ساقی وشے جان لئے لیتے ہیں — شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں

نہ لوں راہ میخانہ کس طرح زاہد — یہ بادل جو سر پہ مرے چھا رہے ہیں

کعبہ ہیں نظر آئے جو صبح اذان دیتے — میخانہ میں راتوں کو ان کا بھی گذر دیکھا

گھٹا اٹھتے ہی بوچھاریں یہ ہم پہ — ارے واعظ کہاں تک ہم پیئے جائیں

ہم رند سمجھتے ہیں اسے انجمن وعظ — جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا
میخانہ میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر — مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

جام چھلکانے لگے بھر کے مئے کوثر سے آپ
حضرت واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

اپنی بڑی بڑی اور کھڑی مونچھوں کے بارے میں جو کبھی بل کھاتی ہوئی، کبھی تنی ہوئی ایک وقت کئی انچ کی تھیں۔ فرماتے ہیں ؎

چوٹیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں — میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں

وضع رندانہ رہے ریش رہے صاف ریاض
خوف کی چیز ہے اس وقت مسلماں ہونا

اقبال

جانے کتنے سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی رہی پھر کہیں جا کر ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ اقبال پیدا ہوئے ——— ایک کامیاب تعلیمی زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں بغرضِ تعلیم انگلستان روانہ ہوئے۔ وہاں مشہور مستشرقین پروفیسر براؤن، نکلسن وغیرہ سے استفادہ کیا۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر انگلستان آ کر بیرسٹری کی سند لی۔ ۱۹۲۲ء میں ان کو نائٹ ہڈ یعنی سر کا خطاب ملا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اقبال ایک وسیع النظر شاعر تھے۔ انھوں نے فلسفۂ مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ فارسی ادب کے بھی عالم تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی ڈگر سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری میں ایک آفاقی پیغام ہے۔ انھوں نے غور و فکر کی نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ اقبال کا نکتہ رجائی اور زندگی سے بھرپور ہے۔ ان کی تصانیف زبان زدِ عام اور مقبولِ خواص و عوام ہیں۔

اقبال بنیادی طور پر حکیم و فلسفی ہیں اگرچہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے طنز و ظرافت کو ایک مستقل موضوع یا فن کی حیثیت سے نہیں اپنایا لیکن ان کا کلام طنز و ظرافت سے خالی بھی نہیں۔ انھوں نے سماج کی بے بصری اور مسائلِ حیات کی طرف سے برتی جانے والی انسانی غفلت پر متعدد جگہ ایک ماہر طبیب کی طرح طنز کے نشتر چلائے ہیں اور ان کی عام شاعری کی طرح ان کی ظرافت بھی ایک بڑے تعمیری مقصد کی حامل ہے۔ انھوں نے صرف انھی چیزوں پر انگلی رکھی ہے جو بطورِ خود قبیح و مذموم اور ناروا ہیں اور انھی ہنگاموں کو موردِ الزام قرار دیا ہے جو عقل کے نزدیک قابلِ گرفت ہیں۔ طنز و مزاح سے ان کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ذاتی و شخصی منافرت نہیں بلکہ ان نقائص و ذمائم کی اصلاح ہے جو قومی ترقی کے راستے میں روڑا بنے ہوئے تھے۔

ابتدا میں بے شک ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کی پیروی کی اور انھی کے رنگ میں کہا مگر بہت جلد اس کو ترک کر دیا کیونکہ اقبال کی بلند نظر ہنگامی قدروں کے مطالعے کی متحمل نہ ہو سکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے ...... میں "گدھا" کے نام سے چند "پکوڑے" نذر کر پیش کیے۔ یہ قطعات مرغوب ایجنسی کی طرف سے شائع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس نظم کا نام "اکبری اقبال" رکھا اور اسے پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں، شعر بجاتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہیں۔

میں نے ان کو آدمی اس لیے کہا کہ لوگ آدمیت کی عینک لگاتے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا ان کے لیے مبارک ہو جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی، سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی، یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں۔

ہندوستان کے آدمی جیران کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اِن دنوں شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔

اقبال ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آ آ ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں؟

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آ گئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہیں۔ جن کا نام اکبر ہے' جو الٰہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے۔ اکبر اشاراتِ ربانی کے حامل ہیں۔ اکبر گوگمیا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے اکبر کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے' ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نبایا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے دیکھیے ان حروف کے پردہ سے کیا نکلنے والا ہے۔

ہندوستھان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو' عبرت کے لیے دل خوش کن آگاہی اور تنبیہ ہو۔ اکبر اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوتی ہے اقبال نے اکبری نقش قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکھ دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ "کشتیاں چکر اٹھیں گی' بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے" فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔"

اب وہ اشعار دیکھیے ؎

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں   مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے — واں ایک کے تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں — مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف — "پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند! — غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض — کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے — جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتنی
تقریر کو کھڑی ہو کلو میاں کی بیوی — پردھان ہو سبھا میں بنسی کی دھرم پتنی

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر — ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے بیری
خفیہ پولس میں جب سے حد ہو گئی ہے قائم — ہندو ہیں بڑا افسر مسلم ہیں آنریری

تعلیمِ مغربی ہے بہت جرأت آفریں — پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط — آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں — ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدّا سا جانور — اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

کہی اچھی نقیبِ انجمن نے — وہ سمجھے گا اسے جو کارواں ہے
خدا واحد ہے دو ناظم ہیں اپنے — دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں — ملّا کا محتسب کا خدا کا نبی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانہ میں — مضموں نگار بیوی کا سی آئی ڈی کا ڈر

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگدست — تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِّ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا لیا — تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

جنابِ شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی — عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لیے
ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے — جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لیے

ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
"کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لیے"

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بِل پیش کیجیے"

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک — چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی — آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

انھوں نے اجتماعی زندگی کے مصائب کو بے نقاب کرنے میں کہیں شدت، زہرناکی، تلخی اور شدیدگی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنز کی نشترکاری دل کے پار نہیں ہوتی بلکہ صرف کسک سی پیدا کرتی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتے اور تاریک زندگی میں بھی نئی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دین کی محدود تعبیر اور امامت کے مفہوم کی تنگی پر اس سے زیادہ تنقید کیا ہو سکتی ہے ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن لہجہ کی ہمدردی نے اس کو معاندانہ عیب جوئی اور نکتہ چینی کی بجائے لطیف طنز میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کے یہاں شروع سے آخر تک مقصدی پہلو نمایاں ہے۔ وہ اپنے مقصد کے اظہار میں پوری دلسوزی اور خلوص سے کام لیتے ہیں۔ ان کی فطری تحمل مزاجی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے ان کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی زیادہ اور ظرافت کم ہے۔ وہ اپنے شکار پر وار کرنے میں عموماً بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظم "نصیحت" اس کی بہترین مثال ہے اس میں انھوں نے طنز کا ایک انوکھا پیرایہ اختیار کیا ہے ؎

میں نے اقبال سے ازرہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز

در حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پرور ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

عافیت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا بات جو سچ ہے بتاؤں جو نہ ہو فاش یہ راز

ڈھب سے مجھے قوم فروشی کا کوئی یاد نہیں

اور پنجاب میں ملتا کوئی استاد نہیں

اقبال کی طنزیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ "سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ وہ کہیں بھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے بلکہ بڑے سنجیدہ انداز میں اور ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ زندگی کی ناہمواریوں کو اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا سے شکوہ کرتے وقت، ابلیس اور انسان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے، مُلا کی سرشت پر چوٹ کرنے کے دوران میں وہ کہیں بھی ظرافت کو سستی جذباتیت کے حوالے نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کے دھیمے تبسم کی رفاقت میں پیش کرتے اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

اقبال کی طنز کو ان دائروں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو کسی حوض کی شفاف سطح پر ایک کنکر کے ارتعاش سے نمودار ہوتے اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طنز کا پہلا نشانہ ان کی اپنی ہی قوم ہے لیکن یہاں وہ کہنے کی باتیں کسی کھردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار سے اپنے پُرشفقت ہاتھ ناظر کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے عقب میں طنز کے زہر آلود تیر چھپتے چلے آتے ہیں اور ناظر ان کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی نظمیں "نصیحت" اور "مُلا اور بہشت" اسی زمرے میں شامل ہیں۔

اقبال کی طنز کا دوسرا دائرہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں ؎

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے،

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

اس دوسرے دائرے میں نمودار ہونے والی طنز کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ مزاح سے بے نیاز نظر آتی ہے اور اگرچہ یہ چیز اصولاً طنزیہ کلام کی خلاف ورزی ہے تاہم بیان کا تیکھا پن بات کی تلخی کو قابلِ برداشت ضرور بنا دیتا ہے۔

اقبال کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبال ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تفہیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خالقِ کائنات سے ان کا براہِ راست خطاب اپنے اندر رندی و بیباکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیر و نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے بہت بلندی پر سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

انھوں نے اجتماعی زندگی کے مصائب کو بے نقاب کرنے میں کہیں شدت، زہرناکی، تلخی اور شوریدگی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنز کی نشتر کاری دل کے پار نہیں ہوتی بلکہ صرف کسک سی پیدا کرتی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہوتے اور تاریک زندگی میں [illegible] حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دین کی محدود تعبیر اور امامت کے مفہوم کی تنگی پر اس سے زیادہ تنقید کیا ہو سکتی ہے:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن لہجہ کی ہمدردی نے اس کو معاندانہ عیب جوئی اور نکتہ چینی کی بجائے لطیف طنز میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کے یہاں شروع سے آخر تک مقصد [illegible] ہے۔ وہ اپنے مقصد کے اظہار میں پوری دلسوزی اور خلوص سے کام لیتے ہیں۔ ان کی فطری تحمل مزاجی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے ان کی طنز [illegible] سنجیدگی زیادہ اور ظرافت کم ہے۔ وہ اپنے شکار پر وار کرنے میں عموماً بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظم "نصیحت" اس کی بہترین مثال ہے، اس میں انھوں نے طنز کا ایک انوکھا پیرایہ اختیار کیا ہے:

میں نے اقبال سے ازرہِ نصیحت یہ کہا — عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل — دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے — تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
ختمِ تقریر پہ ہے تجھ کو مقامِ محمود — پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے — پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن — اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں — چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے — تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی — تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں — پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا — بات جو سچ ہے بتاؤں جو نہ ہو فاش یہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا کوئی یاد نہیں

اور پنجاب میں ملتا کوئی اُستاد نہیں

اقبال کی طنزیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ "سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شلوں کا امیازی نشان ہے۔ وہ کہیں بھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے بلکہ بڑے سنجیدہ انداز میں اور ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ زندگی کی ناہمواریوں کو اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا سے شکوہ کرتے وقت، ابلیس اور انسان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے، ملا کی سرشت پر چوٹ کرنے کے دوران میں وہ کہیں بھی ظرافت کو سستی جذباتیت کے حوالے نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کے دھیمے تبسم کی رفاقت میں پیش کرتے اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

اقبال کی طنز کو ان دائروں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی حوض کی شفاف سطح پر ایک کنکر کے ارتعاش سے نمودار ہوتے اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طنز کا پہلا نشانہ ان کی اپنی ہی قوم ہے لیکن یہاں وہ کہنے کی باتیں کسی کھُردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار سے اپنے پُرشفقت ہاتھ ناظر کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے عقب میں طنز کے زہر آلود تیر چھپتے چلے آتے ہیں اور ناظر ان کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی نظمیں "نصیحت" اور "ملا اور بہشت" اسی زمرے میں شامل ہیں۔

اقبال کی طنز کا دوسرا دائرہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں ؎

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

اس دوسرے دائرے میں نمودار ہونے والی طنز کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ مزاح سے بے نیاز نظر آتی ہے اور اگرچہ یہ چیز اصولاً طنزیہ کلام کی خلاف ورزی ہے تاہم بیان کا تیکھا پن بات کی تلخی کو قابلِ برداشت ضرور بنا دیتا ہے۔

اقبال کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبال ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تفہیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خالقِ کائنات سے ان کا براہِ راست خطاب اپنے اندر رندی و بیباکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیز نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے بہت بلندی پر سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے ؎

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی   خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر   مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا   مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

یہ "حرفِ شیریں" ——— خالقِ کائنات سے مخاطب ہونے کا یہ البیلا انداز قطعاً اقبال کا اپنا انداز ہے لیکن شاید اس انداز کی کامیابی کی اصل وجہ وہ ظرافت ہے جو ان اشعار میں ایک برقی رو کی طرح دوڑتی ہے اور جو ناظر کے لبوں پر بھی ایک شریر سا تبسم پیدا کر دیتی ہے۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح صفحہ ۱۲۱-۱۱۹)

ان اشعار میں دیکھیے یورپ کی بے پناہ چالوں اور اس کے بے شمار منصوبوں پر کتنی گہری طنز ہے۔ ؎

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ   مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے   بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مسولینی اپنے حریفوں اور معترضوں کو منہ توڑ جواب دیتا ہے اور ان کی ابلہ فریب سیاست اور تہذیب کی پردہ دری کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم   بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں   ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم   تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں   راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے   اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

تو نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام   تو نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی!

کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا اس کے قریب ہی ایک چبوترے پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی رات ہی رات میں وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اقبال نے اس موقعہ پر مسلمانوں کے مذہبی جوش پر حسب ذیل طنز کی ہے

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

چند اور طنزیہ نمونے ملاحظہ فرمائیے

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زحمت پی گیا سب لہو اسامی کا

—

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے کردار بے سوز گفتار واہی

—

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمھارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومن آزاد خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل   جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت   بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے   تہِ دیوارِ مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی   فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
ہے حق میں غلاموں کے یہی تربیت اولیٰ
موسیقی و صورت گری علم نباتات

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملا ہو غازی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے   حریتِ افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدہ پارس   چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر   چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و بہشت و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے مسجد میں جب وقتِ قیام آیا

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد محکمہ ڈاک میں افسر اعلیٰ تھے۔ یہ بھی ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس محکمہ میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ جا کر بی۔ اے کی سند لی۔ وہیں نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے۔ ان سے سفارشی خط لے کر حیدر آباد دکن گئے جہاں کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ فوج سے دارالترجمہ میں پہنچے اور چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گئے۔ سیر ظلمات، فسانۂ لندن، سنہری گھونگا اور لارڈ کرزن کی تالیف خیابانِ فارس کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ میر عثمان علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے اور ہوم سیکرٹری کے عہدہ تک ترقی کی۔ یہاں انھیں جن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا ان میں سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، عزیز مرزا، شرر، ڈاکٹر سید حسین بلگرامی، نواب عماد الملک، نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مولوی محفوظ علی بدایونی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق شامل ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں کو حیدر آباد کی فضا راس نہ آئی مجبوراً انھیں وطن واپس آنا پڑا۔

یہاں ان کے والد وزیر آباد سے ہفتہ وار اخبار زمیندار جاری کر چکے تھے یہ بھی اس میں شریک ہو گئے اور اسے لاہور لے آئے۔ طرابلس اور بلقان کی جنگ اور مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے واقعے نے مہمیز کا کام کیا۔ اخبار روزانہ چھپنے لگا اور مولانا ظفر علی خاں کے زورِ قلم سے کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ نوجوان تھے؛ پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں ان کا طوطی بولتا تھا؛ ایک زندگی میں کئی زندگیاں جمع تھیں۔ وہ بلند پایہ ادیب، آتش بیاں خطیب، بیباک صحافی، قادر الکلام شاعر، زبردست سیاست دان اور پنجاب کے سب سے بڑے نڈر رہنما تھے۔ ان کے دل میں قوم کا سچا درد تھا۔ وہ مسلمانوں کا دکھ درد محسوس کرتے، ہر مصیبت میں کام آتے، ہر آگ میں کود پڑتے اور اپنی حریتِ فکر اور آزادیِ رائے سے بے شمار ساکن فضاؤں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔ وہ سراپا حرکت و حرارت تھے۔ ان کا ایک ایک لمحہ ہنگامہ خیزیوں میں گزرتا تھا۔ صحافت، سیاست، تقریر، تحریر، ادب، شاعری اور تالیف و ترجمہ کے معرکوں میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور یہی روشنیِ طبع ان کے لیے بلا ہو جاتی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی "زمیندار" کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند ہو گئے۔ وہاں سے ایک ادبی ہفتہ وار پرچہ "ستارۂ صبح" نکالا مگر وہ جلد غروب ہو گیا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی زمیندار پھر افقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ ساتھ ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کی مہم شروع ہوئی اور کانگرس اور خلافت کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ مولانا نے ان تحریکوں میں سرگرم حصہ لیا اور اب جو شعلہ بیانی اور گرفتاریوں کا سلسلہ چلا تو چلتا ہی گیا۔ مولانا کی مجموعی قید کوئی بارہ سال کے قریب ہو گی۔ آخری عمر میں مرکزی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔ آخر طویل علالت کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو یہ سازِ ہستی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جذبۂ توحید سے سرشار تھے۔ اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے تھے۔ مسلمانوں کو ہر جگہ سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریز کو بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ اس سے ہر میدان میں ٹکر لی، ہر معرکہ میں اس سے دست و گریباں ہوئے۔ اس کی پاداش میں جانی و مالی نقصان بھی اٹھایا۔ کئی بار پریس کی ضمانت ضبط ہوئی۔ سالہا سال تک جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند رہے لیکن آن کے عزم و ہمت

ظفر علی خاں

میں فرق نہ آیا۔ جس چیز کو غلط سمجھا اس کی ڈٹ کر مخالفت کی لیکن جس بات کو صحیح جانا اس کی تائید و حمایت میں پوری جرأت سے سینہ سپر رہے۔ انھوں نے ہر تحریک میں حصہ لیا۔ ہر سیاسی جماعت سے رشتہ جوڑا لیکن اپنی شخصیت اور انفرادیت کو ہر جگہ نمایاں رکھا۔ بقول شورش کاشمیری "کانگرس میں گئے تو برہنہ تلوار اس سے نکلے تو ذوالفقار۔ مجلس خلافت کی روحِ رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دو دو ہاتھ کیے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کے کدال سے گرا بھی دی۔ اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی بٹھا دی۔ لیگ میں تھے تو کرشتہ کب ہو گئے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھا مگر طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔"

مولانا ظفر علی خاں نظم و نثر میں ایک بدیع اور خاص طرز کے موجد تھے۔ انداز بہت شگفتہ، شوخ، پُر سطوت اور رعب دار تھا۔ نظموں کے متعدد مجموعے حبسیات، نگارستان، بہارستان، چمنستان وغیرہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ بیشتر نظمیں ہنگامی تاثر کی پیداوار ہیں لیکن ان کا انداز اتنا بے پناہ ہے کہ ان کو اُردو شاعری کے ذخیرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ پاکیزہ زبان اور صحیح محاورات کے استعمال سے کیسی ہی مشکل، کھردری اور بنجر زمین کیوں نہ ہو شاداب کا مینہ برسا دیتے تھے۔ قافیے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرتِ بیان سے انھیں اوزان و بحور کی زنجیروں میں باندھتے۔ اکثر نظموں میں قافیہ ہی مضمون کا رہبر ہوتا ان کے یہاں جذبات دو ہی قسم کے ہیں۔ تعریف اور تعریض ——— مولانا کے بعض ممدوحین تھے جن کی شان میں انھوں نے نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے جو ان کے طنز و تضحیک کا نشانہ بنے۔ ان میں اکثر ایسے بھی تھے جو کسی وقت مولانا کے ممدوح رہ چکے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ ہجو و طنز کا سرمایہ دار ہے۔ بقول شورش کاشمیری "جہاں تک معتوبین کا سوال ہے ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائداعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو بھی ان کے قلم کی زد میں آ چکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھول دیے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔"

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خاں نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی۔ گو ان میں ذاتیات کا زہر بھی غایت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجوؤں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو بنیا پن، قادیانی نبوت اور راپنوں کی کاسہ لیسی ہے۔ کہیں کہیں دشنام بھی ہے لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں اور دل آویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرتِ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ "زمیندار" ان کے ایام صحت تک ایک ادارہ رہا۔ کئی آئے اور کئی گئے ——— عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش اور نصر اللہ خاں عزیز، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے۔ بعض نے ملیحگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک و طعن کا ڈول ڈالا لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا جو سامنے آیا مات کھا گیا۔

عجیب زمانہ تھا۔ مسلمان رہنما تحریکِ خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے ———

میں فرق نہ آیا۔ جس چیز کو غلط سمجھا اس کی ڈٹ کر مخالفت کی لیکن جس بات کو صحیح جانا اس کی تائید و حمایت میں پوری جرأت سے سینہ سپر ہو گئے۔ بالخصوص نے ہر تحریک میں حصہ لیا۔ ہر سیاسی جماعت سے رشتہ جوڑا لیکن اپنی شخصیت اور انفرادیت کو ہر جگہ نمایاں رکھا۔ بقول شورش کاشمیری "کانگرس میں گئے تو برہنہ تلوار اس سے نکلے تو ذوالفقار۔ مجلس خلافت کی روح رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دو دو ہاتھ کیے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کے کدال سے گرا بھی دی۔ اتحاد ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی۔ لیگ میں تھے تو گرفتہ نہ ہو گئے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھا مگر طبیعت کا انداز جنوں کا نوں رہا۔"

مولانا ظفر علی خاں نظم و نثر میں ایک بدیع اور خاص طرز کے موجد تھے۔ انداز بہت شگفتہ، شوخ، پُرسطوت اور چاکانہ تھا۔ نظموں کے متعدد مجموعے حبسیات، نگارستان، بہارستان، چمنستان وغیرہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ بیشتر نظمیں ہنگامی ماثر کی پیداوار ہیں لیکن ان کا انداز اتنا بے پناہ ہے کہ ان کو اُردو شاعری کے ذخیرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ پاکیزہ زبان اور صحیح محاورات کے استعمال سے کیسی ہی مشکل، کھردری اور بنجر زمین کیوں نہ ہو شاداب کا مینہ برسا دیتے تھے۔ قافیے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرت بیان سے انھیں اوزان و بحور کی زنجیروں میں باندھتے۔ اکثر نظموں میں قافیہ ہی مضمون کا رہبر ہوتا۔ ان کے یہاں جذبات دو ہی قسم کے ہیں۔ تعریف اور تعریض ——— مولانا کے بعض ممدوحین تھے جن کی شان میں انھوں نے نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے جو ان کے طنز و تضحیک کا نشانہ بنے۔ ان میں اکثر ایسے بھی تھے جو کسی وقت مولانا کے ممدوح رہ چکے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ ہجو و طنز کا سرمایہ دار ہے۔ بقول شورش کاشمیری "جہاں تک معتوبین کا سوال ہے ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائد اعظم، ابو الکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو بھی ان کے قلم کی زد میں آ چکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستار فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خاں نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی۔ گو ان میں ذاتیات کا زہر لعابیت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجووں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو بنیا پن، قادیانی نبوت اور راہبوں کی کاسہ لیسی ہے۔ کہیں کہیں دشنام بھی ہے لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے، عمدہ ترکیبیں اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرت کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ "زمیندار" ان کے ایام صحت تک ایک ادارہ رہا۔ کئی آئے اور کئی گئے ——— عبد اللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبد المجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خاں میکش اور نصر اللہ خاں عزیز۔ یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے۔ بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک و طعن کا ڈول ڈالا لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا جو سامنے آیا مات کھا گیا۔

عجیب زمانہ تھا۔ مسلمان رہنما تحریک خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے ———

مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی یں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ "انقلاب" مرحوم ان معرکوں کی مل آویز فصل تھا، سالک نے انقلاب پر چوٹ کی ع

مجموعہ انقلاب کا اقبال و نون ہیں

انھیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجراء میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خان نون کا ہاتھ ہے۔ بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا۔ انقلاب کے ہم نوا ادھر بیاز مندانِ لاہور یعنی مہر و سالک کے علاوہ تاثیر، تبسم، حفیظ، پطرس اور ان کے ساتھی ——— ادھر تنہا ظفر علی خان ——— ادھر افکار و حوادث ادھر فکاہات ——— وہاں کئی لکھنے والے، کوئی شذرہ لکھ رہا ہے، کوئی افتتاحیہ اور کوئی افکار و حوادث کے محل سے پتھر برسا رہا ہے ——— اور مولانا ہیں کہ تن تنہا لڑ رہے ہیں ——— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام نقاش ہوتا ——— پھر ایک نام نہیں کئی نام ——— ادھر افتتاحیہ لکھا ادھر فکاہات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولتی ہوئی منظم ——— گا ہے ماہے حسرت نے بھی ہاتھ بٹایا اور ایک آدھ دفعہ اختر شیرانی نے بھی عکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں ——— مگر ظفر علی خان بلا کے شہسوار تھے ——— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا ؎

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوجِ صحافت پر

یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرعے ہو رہے ہیں، ادھر طعن توڑا جا رہا ہے، اُدھر سے جواب آں غزل آ رہا ہے۔ کہیں مصطفٰیٰ سرگرم نوا ہے، کہیں چھینی آتش فشار ——— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں ہفتوں یہ دور رہا ——— حریفانِ بذلہ سنج حریفانِ دشنام ہو گئے تو بات مطلع سے مقطع پر آ گئی ——— غنیم ہیچ رنگ ہے اور مولانا فاتح ——— ع

ہم تھے حریفِ بذلہ، وہ دشنام کے حریف

ابھی ایکی دیکھتے کیا ہیں کہ محاذ پھر گرم ہو گیا۔ مولانا نے لکھا ؎

انقلابات ہیں زمانے کے ——— مہرِ و سالک کے انقلاب کو دیکھ

اب جو مصرعہ اٹھایا تو مشاعرہ ہو گیا ——— ایک غزلہ، دو غزلہ، سہ غزلہ ——— نظم و نثر کی فراوانی ——— انقلاب کے سبھی ساتھی ادبی اور مولانا کے تمام رفیق سیاسی ——— سالک نے لکھا:

"خلافت کی بلیاں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں"

مولانا نے جواب دیا:

"کیوں حضرت اخلافت کے ابوہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"

اور پھر یہ معرکے محض مہر و سالک تک ہی محدود نہ تھے ——— ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض حوادث و وقائع پر ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں۔ شہسواریوں کی بغاوت سے متعلق "زمیندار" میں افتتاحیہ لکھا تو اس کا سر آغاز تھا ؎

جنگ کا کب ہے سلیقہ کسی شنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مسٹر جناح سے بگڑ گئے ——— قلم اٹھایا، اداریہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ؎

کیوں کر اس کی نگہِ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیٹھ گئی۔ ؎

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کی ضد
منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر
دہلی اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ——— علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں حضرت علامہ اقبال نے روزنامہ "احسان" کے ظفر علی خان نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ "مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے" لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے ؎

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کا کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے
آبروئے ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی کے بہر کاب تھے تو ان کے قصیدے لکھے، مثلاً ؎

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن رو بیٹھے تو پھر منتے نہیں ——— زاویۂ نظری بدل گیا ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

بالفرض مولانا کا تمام کلام ان شعری سانحات سے بھرا پڑا ہے۔"

(نقوش، شخصیات نمبر)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کو استعمار کی بھینس کا انڈا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

صدرِ اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام ——— لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے ——— اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لیے شمپین بھر لی جام میں ——— ہند کے رندانِ دردآشام کو ٹھرا دیا
میوہ خوری کے لیے چُننے لگے جب گول میز ——— رکھ لیے خود مغز، چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا
بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدت کے بعد ——— اور بڑی دقت سے اصلاحات کا انڈا دیا

(۱۲ر جنوری ۱۹۳۵ء)

اخبارِ مفت پڑھنے والے نونہالوں پر بالواسطہ چوٹ کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں ؎

پھٹکری سے مجھ کو مطلب ہے نہ ہرڑ سے غرض ——— رنگ بے داموں ہی اس دامن میں چوکھا آئیگا
کارڈ اک بیرنگ لکھا ہے نمونے کے لیے ——— بند ہو کر ڈاک میں اخبارِ مفت آجائے گا
اک نئے پرچے کی میں ہر روز کر لیتا ہوں سیر ——— یوں ہی قاصد سال بھر نامے پہ نامہ لائیگا
کونڈی ڈنڈا مجھ رنگیلے کا سلامت چاہیے ——— بھنگ ہر چیلے مرا داتا مجھے پلوائے گا
ہے غرض پرچے سے مطلب اس کے مالک سے نہیں ——— مجھ کو اس سے کیا وہ اس کو کس طرح چھپوائے گا
کاغذی کا بل کرے گا کس طریقے سے ادا ——— اور چھپائی کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا
فرض ہے اس کا صبوحی میری پلوائے مجھے ——— بالیاں بی بی کی بیچے پرچہ بھجوائے مجھے

(۹ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

فوق

منشی محمد الدین فوق کشمیری الاصل تھے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت [illegible] امتحان تھا، سیالکوٹ میں جا کر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر چند دن جموں میں رہ کر پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۰۱ء میں اپنا اخبار پنجۂ فولاد جاری کیا جو ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو ۱۹۱۳ء میں ہفتہ وار اخبار کشمیری بن گیا اور ۱۹۳۴ء تک [illegible] اور اہلِ کشمیر کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۱۴ء میں رسالہ طریقت جاری کیا جو چار سال تک رہا۔ ۱۹۱۶ء میں رسالہ نظام جاری کیا مگر وہ جلد بند ہو گیا۔

منشی محمد الدین فوق بہ یک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ مورخ بھی تھے اور صحافی بھی۔ ان چاروں خصوصیتوں میں انھوں نے نام پیدا کیا۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے۔ کشمیر کا یہ سب سے بڑا شاعر اور مورخ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

فوق صاحب نے ایک نفقہ انسان کی طرح زندگی بسر کی۔ ساری عمر اخبار نویسی کی یا تاریخ پر بیش بہا کتابیں لکھیں۔ ایک مورخ میں جس قسم کی متانت ہونی چاہیے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن متین اور سنجیدہ ہونے کے باوجود جب کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں کھلتے تو اس وقت آپ کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اخبار نویس کی حیثیت سے بھی آپ کو قارئین کی دلبستگی کا خیال رکھنا پڑتا تھا چنانچہ شروع شروع میں لطائف و ظرائف کے نام سے آپ کے اخبار میں ایک مستقل کالم ہوتا تھا جس پر آپ کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا ؎

رونی صورت ہو کوئی لاکھ ہنسا دیں اس کو
دل پھڑک جائے لطیفہ وہ سنا دیں اس کو

آپ کی تالیفات میں دو کتابیں "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" اور "استادوں شاگردوں کے لطیفے" بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ لطیفہ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

کبھی کبھی حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر آپ طنز و مزاح کے تیر بھی برساتے تھے جو بے حد کامیاب ہوتے تھے۔ اس قسم کی [illegible] سے آپ "خفتگانِ کشمیر" کو بیدار کرنے کا کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص قسم کی لطیف طنز و ظرافت پائی جاتی ہے مگر آپ کی طنز و ظرافت سمجھنے کے لیے الفاظ کی غرابت کے پردے ہٹانے اور ہر واقعہ کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے اور یہ بات آپ نے خود ہی ہر نظم کی ابتدا میں بیان کر دی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آ جائے تو آپ کی طنز و ظرافت پوری طرح دل میں اتر جاتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

۱۹۱۹ء میں لاہور کی نکلسن روڈ پر بمبئی ہیئر کٹنگ سیلون کے نام سے مسٹر محمد اسماعیل باربر کی ایک نفیس [illegible] دکان تھی جس میں مس [illegible] ایک نوخیز خوبصورت یوریشین لڑکی انگریز عورتوں کے بال سنوارنے پر ملازم تھی۔ ایک پنجابی نوجوان اس کو دیکھ کر وارفتہ ہو گئے۔ ربط ضبط بڑھایا، کچھ بے تکلفی بھی پیدا کی مگر سرکارِ حسن نے عشق کی گستاخیوں کو اس سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ فوق صاحب نے اس واقعہ پر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ؎

اتفاقاً کل میں جا نکلا نکلسن روڈ پر
جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے [illegible] کے لیے

جو اور مدعا ہو وہ کہیے جناب شیخ — یہ "چھوڑ دیجیے" کی صدا چھوڑ دیجیے

پہلا سا اب وہ حسنِ تکلم نہیں رہا — ہر روز بھانت بھانت کی سُنتے ہیں بولیاں

عریاں کیا ہے شاہدِ مضموں کے جسم کو — مسکی ہوئی ہیں آج حسینوں کی چولیاں

اے وائے شاعری کہ تخلص مسیح ہے — لیکن جو شعر ہیں وہ مریضوں کی ڈولیاں

یقیں اے دل نہ کر تو حضرتِ واعظ کی باتوں کا

یہ لمبی داڑھیوں والے بڑے عیار ہوتے ہیں

وہ شست باندھ کے کہتے ہیں لیجیے حضرت — یہ تیر آپ کلیجے کے پار دیکھیں گے

پہلی ہی ضربِ آہ سے چکرا گیا فلک — سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لہار کی

اے شیخ گو نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم — اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو

وعظ تو میں نے سُن لیا اب یہ مجھے بتائیے

آئیں اگر وہ سامنے ذوقِ نظر کو کیا کروں

اب اس شکوے سے کیا حاصل کہ رہبر خود غرض نکلا

پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں!

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم

کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

زمانہ حال کے برہمنوں پر کتنی اچھی طنز ہے۔

بڑے شکّی بڑے وہمی پھر اس پر یہ قیامت ہے — نہ ہاری ماننے والے نہ جیتی ماننے والے

کوئی رازِ خفی پنہاں نہ تھا جن کی نگاہوں سے — وہی اب اونٹ کو بیٹیوں میں ہیں پہچاننے والے

فراخی میں خدا جانے کہاں تک پاؤں پھیلاتے — جو اتنی تنگ حالی میں ہیں لمبی تاننے والے

بنا لیتے ہیں صافی اپنی دستارِ فضیلت کو — بہم مل بیٹھتے ہیں جب یہ گاڑھی چھاننے والے

عدل یہ تھا حسن والوں سے بھی ہوتی باز پرس — کیوں فرشتوں کو اسیرِ چاہِ بابل کر دیا

نمازِ صبح سے پہلے نہ کی تدبیر حُقّے کی — تمھارے گھر میں فریادی رہی تقدیر حُقّے کی

وہ مدح کی کہ سنتے ہی قاصد ہوا ہُوا — ہم نے اڑا اڑا کے کبوتر بنا دیا

اے کاش اس کو مجھ کو باہم گلے ملا دیں — دو آدمی یہاں کے دو آدمی وہاں کے

نون کا تمسخر اڑایا ہے، دیکھیے۔

خالقِ خلق نے پرکار کو گز بھر کھولا — دائرہ کھینچ دیا ناف کا نقطہ لے کر

گز بھی بے کار رہا بازوئے خیّاط کے ساتھ — ناپیے آپ ہی حضرت اسے رسّا لے کر

ڈوب جانے کا جنھیں خوف ہے گردابوں میں — مشک پر تیرتے ہیں نام وہ اس کا لے کر

رستہ مرگھٹ کا تو ہے اور طرف کوائے جوش — یہ کدھر جاتی ہے صحت کا جنازہ لے کر

تم اب تو جوش سیہ کاریوں سے باز آؤ — تمھاری ڈاڑھی میں حضرت سفید بال آئے

غیر کی تصویر پر کہتے نہیں اشعار ہم — بے زباں پر کیا کریں تیغِ زباں کا وار ہم

دوبارہ وہی بات کیوں پوچھتے ہو — اگر تم کو ثقلِ سماعت نہیں ہے

ہمارے عشق نے مفہوم لفظوں کا بدل ڈالا
کہ جو دم پر بنا دے ہم اُسے ہمدم سمجھتے ہیں

حشر کا اے حضرتِ واعظ یہی مفہوم ہے
زندگی کے بعد دیکھیں گے تماشا ایک اور

آپ بے وجہ مدعی کیوں ہیں
آپ کا اس سے مدعا کیا ہے

ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے اور انہی سے مشورۂ سخن لیتے تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ ان کی زندگی نوابانہ فضاؤں میں بسر ہوئی۔ وہ تفریحاً شعر کہتے تھے، مقصد ہنسنا ہنسانا اور سماجی بے اعتدالیوں کو نشانۂ طنز بنانا تھا۔ وہ جب کوئی بات اپنے ظریفانہ رنگ میں ہو کر کہتے تو گوناگوں دلچسپیاں پیدا کر دیتے۔ ان کی شہرت اودھ پنچ سے شروع ہوئی اور مشاعروں سے ان کا کلام زبانِ زد خاص و عام ہو کر چھا گئی۔ اب وہ قبر کا کونا آباد کر چکے ہیں۔

میونسپل الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کو نام نہاد رہبری اور قومی ہمدردی کے بہانے اپنی عزت اور آبرو لٹا کر دیوانہ وار ووٹ کی تلاش میں جو دربدری حاصل ہوتی ہے اس کا نقشہ ظریف نے ایک مسلسل نظم میں کمال طنز و ظرافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو ؎

واہ بی میونسپلٹی جان کیسا کہنا ترا
تو چچی لیلیٰ کی عاشق تیرا مجنوں کا چچا

اپنی خودداری کو کھو کر تجھ پہ جو عاشق ہوا
پھر زبانِ حال سے اس کو یہی کہتے سنا

بس کہ دیوانہ شدم عقلِ رسا درکار نیست
عاشقِ میونسپلٹی را حیا درکار نیست

اس کے بعد ووٹ طلب کرنے والوں کے راستے میں جو دشوار گزار مقامات آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے ؎

سب سے پہلے ان کو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا
شیخ بدھو نام تھا اور تھا جلاہا قوم کا

دھوتی باندھے مرزئی پہنے تنا بیٹھا ہوا   اک سٹراٹی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا

جاتے ہی تسلیم کی جب اس کو باصد احترام

منہ کو ٹیڑھا کر کے بولا "کوہے بائیکم سلام"

اس جگہ سے اُٹھ کے گھر پر ایک صاحب کے گئے   دس برس ناکام رہنے پر ہوئے تھے جو بی۔ اے

ریلوے میں تھے ملازم خود بھی تھے چلتے ہوئے   آپ کی تنخواہ تو کم تھا ٹھاٹھ تھے لیکن بڑے

انگلش اسٹائل پہ رہنے کا جو ان کو شوق تھا

بوٹ بیڑی پاؤں میں کالر گلے کا طوق تھا

دیکھ کر صورت کو ان کی اس طرح کہنے لگے   آئی ایم ویری بزی ٹیک سیٹ جلدی بولیے

پھر ادھر ٹہلے اُدھر ٹہلے گھڑی کو دیکھ کے   اپنے کُتے سے کہا کم اون اُن سے کو آوے

پھر کہا یو آر کنٹری ڈیٹ ہٹ نو بولڈ مین

تم کو اپنی ووٹ کیسے دیگا صاحب اولڈ مین

اس نظم میں بعض بعض جگہ معنوی اور ظاہری پیروڈی کا دلچسپ امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب میونسپل الکشن کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لیے حاضر ہوتے ہیں تو وہ مجتہدانہ اُردو کا کمال دکھاتے ہیں۔ ظریف لکھنوی ان کے مخصوص طرزِ گفتگو کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں"

ووٹ دے دوں گا عوض میں آپ کو تحسین کے   اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے

حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے   اس سے کم لینا مرادف ہے مری توہین کے

ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجیے

ہے یہ کارِ خیر بس تعجیل فرما دیجیے

”مشاعرہ“ کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے اس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ اس میں انھوں نے ”مقامی بولی“ کو اپنے اشعار میں جگہ دے کر

اور ہیئت مکالموں کی ایک مخصوص ظریفانہ کیفیت کی مدد سے نہ صرف کرداروں کو اُبھارا ہے بلکہ مقامی رنگ کو بھی واضح کیا ہے ؎

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آجکل حد سے سوا ۔۔۔ چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا ۔۔۔ مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہدِ ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آگئی جانِ علوم

ہے بہت تکلیف وہ شاعر کی وہ جنسِ عجیب ۔۔۔ جو سنانے کے لیے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب ۔۔۔ شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب

چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت ترا سہال میں

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہے اک بیٹری ۔۔۔ ہر طرف شاعروں نے جہاں سن کے غزل اک ڈھال دی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی ۔۔۔ سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان سے بڑھ گئی

جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزردہ ہے
سب کو خوش کرنا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

تیری پالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں عوام ۔۔۔ گرد تیرے طائفے کے اک گنوار دل اژدہام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقتِ شام ۔۔۔ واہ وا کا شور پھر جھک جھک کے وہ تیرا سلام

جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرع کے دانے پر لڑائی دیکھنے

اس طرح تعریف کرتے ہیں نری اکثر گنوار ؎

بھائی مولا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں ۔۔۔ اس جگہ ساعر بڑے بڑھیا ہیں مادر جاد ہیں

ان سبھوں میں سیکھ بدلو اک جگت استاد ہیں ان کو ہر زد کے کئی گھلیں منہ زبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گھلیں جھاڑ دیں

ساٹھوں نے ہو کے سر زندہ بیاجیں پھاڑ دیں

پیسے والوں کی سمجھ میں آ گئی ہے اب یہ بات صرف بے جا آج گانے کا ہے بالکل واہیات

جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات

پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لیے

اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لیے

طریقہ زبان اردو کے سچے بہی خواہ تھے۔ وہ ان لوگوں کے سخت خلاف تھے جو نئی روش اختیار کر کے اردو کو خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ظریفانہ رنگ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں

علم میں جھینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں

لکھنؤ دہلی انہی شہروں پہ کیا موقوف ہے ہر جگہ اہل زباں ہیں بے زباں کوئی نہیں

یا تو کپڑے بھی پہنا کر کبھی دکھلاؤ ہمیں یا تو باندھا نہ کرو شمع کا عریاں ہونا

مامقیماں وہ دریا پہ میرا پڑھنا ان کے چہرے کا وہ غصے سے گلستاں ہونا

صفت تو دیکھیے ہر چند ہمت خود مونث ہے زنانہ یہ پہن کر جامۂ مردانہ آتا ہے

ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر ستم بھی کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں

"سفرنامۂ عراق" ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگ سخن کے تمام پہلو نمایاں ہیں۔ ہم سفر مستورات کا ذکر ہے تو خالص بیگماتی زبان میں ہے

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پہ اُترے یہاں پہ کوئی کہاں اس کی لاش پر

نوکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان بول رہی ہے۔ وہ ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو جہاز کے خلاصیوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اس کی

کوئی نہیں سُنتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

کھلا سبیں ہیں کون سُنتت ہمری بات ہے — کپتان سے کہی تو سُسر پچھاڑ کھات ہے

اور جب خود اپنا قصہ نظم کرتے ہیں تو اپنی زبان ہے اور اپنا بیان ؎

اسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

ذیل میں ان کے ظریفانہ کلام کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے ؎

جنوں میں کیوں چلا میں دوڑ کر بھولا جو دم میرا — حماقت کی نشانی بن گیا نقشِ قدم میرا
شمیمِ زلفِ مشکیں سونگھ کر نکسیر پھوٹی ہے — ترے بالوں کی بُو سے ناک میں آیا ہے دم میرا
وفورِ شوق میں معشوق کو دے دے پٹکتا ہوں — کوئی خلوت سرا لے نازمیں دیکھے اُدھم میرا

میاں فرہاد و مجنوں شیخ چلی ہیں جو لڑتے ہیں
یہ کہتے ہیں عرب میرا وہ کہتے ہیں عجم میرا

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلیٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا
مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصوّر خانساماں تھا
خیالِ یار جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا
جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اُڑتے ہوئے دل کا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
ظریف اس کو طلسمِ بحرِ ہستی کیا نظر آتا
جو عاشق ان کا کچھوے کی طرح سر در گریباں تھا

نفع اتنا تو ہوا اس میڈیکل کالج سے
تیرے بیمار کے پینے کو دوا آتی ہے

رنگ غصہ میں بدلتے ہیں وہ گرگٹ کی طرح
حسن کی اپنے دکھاتے ہیں کرامات مجھے

دال دھوئی ماش کی کھالی ہے نازک خوئے دوست
بالش و بستر سے مجھ کو آ رہی ہے بوئے دوست
کم حقیقت نیش زن اغیار ہیں بیٹھے ہوئے
دیکھ لو دیکھے نہ ہوں تم نے اگر پسوئے دوست

جناب شیخ گئے اسپتال بہرِ علاج
ملاحظہ ہو ذرا یہ ادائے رندانہ

مؤذن کی صدا سن کر جو مستِ ناز چونک اٹھا
تو یہ سمجھا کسی بلی نے پکڑی ٹانگ ٹیاں کی

کیا کرتے ہیں استعمال جو کھانے میں پاپڑ کا
رہا کرتا ہے ان کے پیٹ میں اک شور گڑبڑ کا

کہا معشوق کو قاتل تو بھنگی کیوں نہیں کہتے
یہ کیا جلاد ہو سکتا ہے مہتر ہو نہیں سکتا

فلک نما ہے بلندی میں آبلا دل کا
جواب شیش محل ہے دو منزلا دل کا
حوادثات کی چپتیں بہت کراری ہیں
کہیں دماغ نہ ہو جائے پلپلا دل کا
ظریف حشر میں ہوگی تلاشیٔ اعمال
فرشتے کھول کے دیکھیں گے پوٹلا دل کا

ہاں اے نگہِ کونسل وہ زور کا کنٹر دے　　جو خان بہادر کو مدہوشِ وفا کر دے
کس طرح سے پھر لڑکے ایماں پہ رہیں قائم　　وہ برقِ کلیسا جب اسکول میں لیکچر دے
کیا فرض ہے ہم اس پر ایمان ہی لے آئیں　　ہر روز خبرِ مہمل جو دستِ ریوٹر دے

دعوئے عہدِ وفا و عشق دشمن ہو گیا　　وصل میرا رہ گیا ان سے کرسمس ہو گیا

یہ سمجھ کر بھی بغیر اس بزم کے سیری نہیں　　ان کے ہاں گھٹنے کی عزت ہے مگر پیری نہیں

بڑھاپے میں انھیں تعلیمِ انگریزی کی سوجھی ہے　　جنابِ شیخ کو بھی فتنہ انگیزی کی سوجھی ہے

شیخ جی کیوں وردِ یا موجود یا مقصود ہے　　آپ کا مقصود راہِ عشق میں موجود ہے
جس کے گھر میں کل کے کھانے کے لیے موجود ہے　　آج وہ فرعون ہے شداد ہے نمرود ہے
کیا ہوا ہم کو اگر نانِ شبینہ بھی نہیں　　آپ کی خاطر تو اے صاحب ٹرنوجود ہے

اللہ اللہ کس قدر سہمے ہوئے رکھتے ہیں پاؤں　　خاکِ عاشق کیا ہے گویا جرمنی بارود ہے
کہتے ہو کھا جائیں گے کچا ترے دل کو یہ کیا　　وہ بھی ہے اک ناشپاتی یا کوئی امرود ہے

میرے سنبھلنے کی فکریں تو بعد کی ہیں　　پہلے ذرا تم اپنا پتلون تو سنبھالو
شام و عراق و ٹرکی سب ہیں تمھاری خاطر　　مرقد کی فکر کیا ہے چاہو جہاں بنا لو

بھاگنے کی ہے یہاں راہ نہ پٹنے کی سکت　　آہ لائی ہے کہاں حسرتِ دیدار مجھے
میں وہ پنڈت ہوں کہ اس دور کے اکثر مہراج　　دور سے دیکھ کے کرتے ہیں نمسکار مجھے
آج کل مدِ نظر ہے مجھے صحت کا خیال　　ورنہ پینے سے تو ہرگز نہیں انکار مجھے

جنابِ شیخ کی دستار ہے یا دامنِ تقویٰ — کوئی شے میکدے میں اڑ رہی ہے دھجیاں ہوکر
لڑکپن ہی میں جن کو دل چرا لینے کی عادت ہے — ڈکیتی پر بھی آ جائیں گے وہ شاید جواں ہوکر

کہہ رہا ہے یہ آپ کا انکار — نوبت آئے گی ہاتھا پائی کی
ہائے تقریبِ وصل کیا ہوگی — ان کو عادت نہیں مٹھائی کی
سچ تو یہ ہے کہ شیخ جی تم نے — کاٹ لی ناک پارسائی کی

آنکھوں نے رو کے نام ہی بالکل ڈبو دیا — گنگا کا گھاگرا کا اٹک کا چناب کا
شیخ اشتہار بانٹتے پھرتے ہیں شہر میں — نیلام ہونے والا ہے ٹھیکہ شراب کا

اور رکھا کیا مجھے پالش کا صلہ کیا ملتا — حضرتِ بوٹ کی سرکار سے ٹھوکر کے سوا

قدِ موزوں کو جانتا ہوں کھجور — شاعری مجھ کو کر نہیں آتی

تیری نگہ کے واسطے اے فتنہ جو نہیں — دل ہے ہمارے پاس مگر فالتو نہیں

ہم اور عرضِ مطلب ان سے عدو کے گھر میں — دیکھیں تو بال کتنے رہتے ہیں آج سر میں
دل جس پہ مبتلا ہے بس ہے وہی دل آرا — مانا ہیں داغ رخ پر مانا ہے گنج سر میں
کہتے نہ تھے کہ دیکھو دشمن سے دور رہنا — اب کیا بتائیں تم کو کیوں درد ہے کمر میں

ڈر ہے جنابِ احمق جوتے نہ کھائیں اک دن
چھپ چھپ کے روز قبلہ جاتے ہیں ان کے گھر میں

جوش ملیح آبادی

شاعرِ انقلاب شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی سنہ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر احمد خان بشیر اور دادا نواب محمد احمد خان احمد دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام الدولہ تہور جنگ، فقیر محمد خان گویا (شاگرد ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی لیکن بعد میں اپنے وجدان و ذوق ہی کو رہبر بنایا اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔ اب ان کا شمار عصرِ حاضر کے ان شعرا میں ہے جو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں:

روحِ ادب، اوراقِ سحر، مقالاتِ زریں، جذباتِ فطرت، آوازۂ حق، جنون و حکمت، سنبل و سلاسل، عرش و فرش، فکر و نشاط، حسینؑ اور انقلاب، شاعر کی راتیں، آیات و نغمات، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، حرفِ آخر، سیف و سبو، پیغمبرِ اسلام، اشارات وغیرہ۔

تقسیمِ ملک سے پہلے جوش دہلی سے ماہنامہ "کلیم" نکالتے تھے۔ تقسیم کے بعد ماہنامہ "آج کل" کے چیف ایڈیٹر ہو گئے مگر بھارت میں اپنا مستقبل تاریک دیکھ کر نومبر سنہ ۱۹۵۵ء سے کراچی آ گئے ہیں اور پاکستان کے شہری بن گئے ہیں۔

جوش کے کلام میں شکوہِ الفاظ کے ساتھ ساتھ بڑی رنگا رنگی، وسعت اور تنوع ہے۔ حقائق و معارف، حسن و عشق، خمریات اور طنزیات غرض کہ کیا نہیں ہے۔

طنز میں ان کی ایک مخصوص روش ہے جس کا اظہار نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں ہوتا رہتا ہے مگر ان کی طنزیات میں جوش و خروش اور نفرت و حقارت زیادہ اور لطافت و گہرائی کم ہے۔ وہ ملّا اور شیخ کی پگڑی محض اس لیے اچھالتے ہیں کہ وہ ان کی رندی کے راستے میں روک ثابت ہوتے ہیں اور ان کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ وہ مہاجن کے حرص و ہوا کا مذاق اڑانے اور انسان کی عالمگیر ناہمواریوں کے مضحک پہلو دکھانے میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی طنز و ہجو کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

زاہد رہِ معرفت دکھا دے مجھ کو — یہ کس نے کہا ہے کہ سزا دے مجھ کو
کافر ہوں! ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص — اب اس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی — سر پہ چپٹا مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
کہنیاں تکیے کے اندر سوزن سے دھنستی ہوئی — چُست صدری اُٹھ کے پر توند کے پھنستی ہوئی
ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا — قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا

(مہاجن)

الاماں خانقاہ کی دنیا　　　معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند　　　یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا　　　کام لیتے ہیں سکہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال　　　ہر بُنِ مُو ہے ایک دستِ سوال
کون بہتر ہے ایزدِ باری　　　ان کا تقویٰ کہ میری میخواری (خانقاہ)

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں　　　اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ　　　دولت انھیں دے دو تو قیامت کر دیں

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا　　　مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا
انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ در رکھوئے ہوئے　　　سینٹ کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے
خال و خد سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار　　　لرزتی چہروں میں تن بننے کے ارماں بیقرار
الاماں! یہ زینتیں موزے ہیں گو اُترے ہوئے　　　ذوق ہے گھنگرو کا گیٹس پاؤں میں پہنے ہوئے
ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار　　　اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار
پاؤں کھنچے ہو دمِ گلگشت کس کس ناز سے　　　اے میں قرباں رن میں نکلو گے اسی انداز سے

شغلِ زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ملتی نہیں

(نازک اندامانِ کالج)

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ　　　پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہّاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ　　　ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الہ

لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

ڈالیاں، تحفے، سفارش، مے، شباب — آئی سی ایس کو کلیدِ فتح باب
"فیملی ممبر" بنے تھے اس کے ہاں — چشمِ مغرب میں شعورِ سن کہاں
الغرض چلے جو صاحب اپنے گھر — تھے یہ "ناکارہ سلیپر" ہم سفر
آپ سے پہلے ملاؤ اس سے ہاتھ — لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت ۱۹۰۴ء میں پونچھ (کشمیر) کے ایک گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں لاہور آ کر بی۔ اے کا امتحان دیا اور معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا لیکن کچھ دنوں بعد کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کر دی اور عصرِ جدید، نئی دنیا، جمہور، استقلال اور پیغام وغیرہ جرائد میں ادارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کولمبس کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خان انہیں لاہور لے آئے اور یہاں حسرت نے زمیندار، انصاف، احسان، احرار، شہباز، شیرازہ، تہذیبِ نسواں اور دیگر اخبارات کے اداروں میں کام کیا اور سندباد جہازی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔

دوسری جنگ کے شروع میں فوجی اخبار کے ایڈیٹر ہو کر برما اور ملایا گئے مگر واپس آ کر روزنامہ امروز کی ادارت سنبھالی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو یہاں سے مستعفی ہو کر ریڈیو پاکستان میں قومی پروگرام مرتب کرنے پر ملازم ہو گئے مگر پھر لاہور آ گئے اور نوائے وقت میں "سرِ راہے" کا کالم لکھنے لگے۔ اس دوران میں آپ کو دل کا عارضہ ہو گیا اور آپ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

حسرت ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نویس اور طنز نگار بھی تھے۔ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ سیاست کے نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے اس لیے ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور نت نئی سیاسی تحریکات پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب روشنی ڈالتے اور سیاسی شخصیتوں کے بظاہر سنجیدہ مگر چھپے ہوئے مضحک پہلو نمایاں کرنے میں کمال کر دکھاتے تھے، اس سلسلے میں آپ نے مندرجہ ذیل تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں:۔

جغرافیہ پنجاب جدید، مردم دیدہ، دو ڈاکٹر، کیلے کا چھلکا، زرنیخ کے خطوط اور مطائبات وغیرہ۔ پربت کی بیٹی، اقبال، کشمیر اور سرگزشتِ اسلام بھی آپ کی چند قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

حسرت طنز و مزاح کی تخلیق میں مبالغہ، موازنہ، واقعہ، بذلہ سنجی، جگت بازی، تحریف و تصرف اور لفظی اُلٹ پھیر وغیرہ تمام ہتھیاروں سے کام لیتے اور ٹکسالی زبان استعمال کرتے تھے، اس لیے ان کے طنز و مزاح میں ہر قسم کے رنگ ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر نثر ہی میں لکھتے تھے لیکن جب کبھی موج میں آتے تو ان کے مزاحیہ کلام میں اشعار بھی ٹیک پڑتے تھے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
یہ بھینسیں، آہ یہ بھینسیں!
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے
مرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آنکلتی ہیں
لیے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے باوا کا
کہا سوسن نے مجھ سے
کہ میری روح کا نغمہ مرے صندوق میں ہوگا
میں بھول آیا ہوں گچھا چابیوں کا آج دفتر میں
جو امرت سر سے اپنے مجھ کو حصہ آپ دے دیتے
کسی کا کیا بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا

مجید لاہوری

مجید لاہوری کا خاندانی نام عبدالمجید چوہان اور قلمی نام نمک لاہوری تھا۔ ۱۹۱۳ء میں بمقام گجرات پیدا ہوئے اور ۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ ذریعہ معاش صحافت تھا۔ کراچی سے پندرہ روزہ نمکدان نکالتے اور روزنامہ جنگ میں فکاہی کالم "حرف و حکایت" لکھتے تھے۔ نمک پاشی کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ باقی کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ تصویریں (غزلیں)، کالی نمک (مزاحیہ نظمیں)، نمک پاشے (مزاحیہ مضامین)، دور آسمان (غزلیات)، جلترنگ (کلام)، سفرنامہ۔

مجید لاہوری کی سنجیدہ شاعری بھی اگرچہ بے حد قابلِ قدر ہے مگر انھوں نے مزاحیہ نظم و نثر میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ وہ طنز و مزاح کو شیر و شکر کرکے ملک کے ہنگامی واقعات اور معاشرے کے بعض نئے اور غیر صحت مند رجحانات کو ہدفِ ملامت بناتے اور بھرپور وار کرتے ہیں۔ تحریف و تضمین کے حربے سے بھی کام لیتے ہیں لیکن ان کے پاس موضوعات اور مواد کی کمی نہیں۔ وہ اپنے خیالات کو دلکش انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ خندہ ایکٹ، مردم شماری کے بعد، آزادیوں کا دور ہے، دستور بن رہا ہے، گدھے، اک پیسے میں چار دیکھو، دے خدا کی راہ میں، گل شیر خاں کو ووٹ دو، یہ کیسی آزادی، گڈ بائی، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، نئے بھکاری، ملک اپنا ہے راج اپنا ہے، کل بھی ہم آزاد تھے آج بھی آزاد ہیں۔

بنام جہاں دار جان آفریں، عید مبارک، وغیرہ اس کی اچھی اور کامیاب نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔
”میں کہ ایک منسٹر ہوں“ ان کی بہترین طنزیہ نظم ہے جس میں انھوں نے ہمارے حکمران طبقہ کی اس ذہنیت کا خاکہ اڑایا ہے جس کے تحت وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور بے جا نئے ہر پھٹے میں ٹانگ اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ چند شعر دیکھیے:

مرغیوں پر بھی میں کر سکتا ہوں اظہار خیال — اور سناتا دن پہ بھی ہوں نقل ہیں ہر گرم مقال
ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں — اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں
ہومیوپیتھک ہو یا دندان سازی کا کمال — باغبانی ہو کہ ہو بزازی و درزی کا کمال
بات پھولوں کی ہو یا قومی ترانے کا بیاں — چاٹ ہو یا ہو مسالے کی کہ ہو اردو زباں
بو علی سینا کی حکمت بات افلاطون کی — ایگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی
داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز — ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبط محمود و ایاز
مسئلہ تاریخ کا ہو یا مباحث علم کا — فلسفہ گلقند کا ہو یا ہو تقدس علم کا
کشتۂ فولاد ہو یا شربت و بینا ہو — ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا — شوق ہے دل میں اگر قرآن کی تفسیر کا

جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں مفکر مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تقسیم کے بعد ہمارے معاشرے کو جن نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا ان کا خاکہ اس طرح اڑاتے ہیں:

ہلاکت خیزیوں کی میہمانی ہے جہاں میں ہوں — نہ آبا ہے نہ باوا ہے نہ نانی ہے جہاں میں ہوں
بس اک شے موت ہے جو نرخ سے ملتی ہے بے راشن — وگرنہ ساری چیزوں کی گرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی تک ”پگڑیوں“ میں ہے شکوہ تاج سلطانی — ابھی تک رشوتوں کی حکمرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی ہیں چور بازاری کی سینہ زوریاں باقی — غریبوں مفلسوں کا خون پانی ہے جہاں میں ہوں

ماڈرن آدمی کا ایک [illegible] نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم کی کتنی اچھی پیروڈی ہے ؎

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ ملا جس کو گھر نہ گھاٹ

وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہے سر پہ کھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ

موٹر میں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

[illegible] ایک نظم "گداگری بند ہوگئی تو" اپنے بھرپور تاثر کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ اس میں انھوں نے بعض خودغرض رہنماؤں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے کہ وہ قوم و ملک کی ترقی و بہبودی کے نام پر سادہ لوح عوام کو لوٹنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں ؎

مجھ کو دلا تا دلا! ہوگا تیرا بھلا! مجھ کو دلا تا دلا!

اے پلاٹوں کے مالک تری خیر ہو
اے الاٹوں کے مالک تری خیر ہو

کوئی کوٹھی دلا، کوئی بنگلہ دلا!
چھاپہ خانہ دلا، کارخانہ دلا!

پمپ پٹرول کا یا سنیما دلا!
بس نہیں کوئی تو بس کا اڈہ دلا!

قوم کے نام پر مجھ کو دلا تا دلا

ہوگا تیرا بھلا

بامِ گردوں پہ تیرا ستارہ رہے
زندگی میری کیوں بے سہارا رہے

میرے کشکول میں لیڈری ڈال دے
کر ٹکٹ مرحمت ممبری ڈال دے

کوئی مل یا جننگ فیکٹری ڈال دے
کوئی ہوٹل کوئی کمپنی ڈال دے

قوم کے نام پر مجھ کو دلا تا دلا!

ہوگا تیرا بھلا

حاکمِ رنگ و بو میں تو پھولے پھلے
نام کا تیرے دنیا میں سکہ چلے

قد آدم پوسٹر تھا جس کا عنوان تھا:

"آل انڈیا ضیافت کانفرنس"

اس میں لکھا تھا کہ اکتیس نومبر کو رات کے بارہ بجے ایک عظیم الشان جلوس نکلے گا جو شہر کے مختلف حصوں سے گذرتا ہوا قبرستان میں ختم ہوگا وہاں مقامی مقتدر سبزی تازہ قبروں میں کفن کھسوٹیں گے اور اپنے نام نہاد مذہبی وقار کی آڑ میں مار ... سے بے فکر ہو کر اس مشغلہ کو طلوع آفتاب تک جاری رکھیں گے۔ اس کے بعد کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگی ... جلوس ... میں سوار ہونے کی آسان ترکیب ... تین مرکزی مہمانوں کے ساتھ تین سو مقامی میزبانوں کی شرکت۔ پلاؤ متوری کے نئے مستند طریقے "چندہ متوری کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جاتے" ایک اہم مطالبہ۔ اشتہار کی چھپوائی اور کاغذ وغیرہ کا خرچ بارہ روپے مگر لیبی کے لیے پیدے کی قیمت تین سو روپیہ ۔ ایک پوشیل ڈکار سے بچھ ہزار روپیہ ہضم وغیرہ وغیرہ۔

طنز و مزاح کا یہ ہتھیار بے حد نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ عوام کی اکثریت میں ... کا احساس پیدا ہو گیا اور یہ بات رفتہ رفتہ مرکزی خلافت کمیٹی تک جا پہنچی۔ وہاں سے ایک وفد جو مولانا معظم علی، مولانا عرفان اور ایک اور صاحب پر مشتمل تھا، امرتسر پہنچا اور انھوں نے ڈاکٹر کچلو سے ملنے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور ایک خفیہ رپورٹ مرتب کی۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے اخبار غدیر افت پنچ جاری کیا اور طنز و مزاح کے پردے میں خوب چاند ماری کی۔ حسن اتفاق سے مولانا ظفر علی خاں امرتسر گئے، وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف ہو کر انھیں زمیندار میں لے آئے۔ یہاں ترجمہ کی مشق بھی ہو گئی اور آپ انواع و اقسام کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن بھی دینے لگے۔

علامہ حسین میر اچھے برے شاعر کے کلام میں تحریف کر کے اسے اپنا لینے کا ڈھب خوب جانتے ہیں۔ آپ کی مزاح نگاری کا پیش منظر تو عموماً پلاؤ، قورمہ، تنجن، بریانی، کوفتے، مرغ مسلم جیسے مرغن کھانے ہوتے ہیں لیکن اس کا پس منظر ایک ترکش ہوتا ہے جس کے زہر میں بجھے ہوئے تیر مشرق و مغرب کی سیاست، ہندوستان کی داخلی و خارجی حکمت عملی، غرض پرست ملکی لیڈروں، دکاندار صوفیوں اور نائشی پیروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری جدید ظرافت کی خوبیوں سے معمور ہوتی ہے۔ ایک نقاد کے خیال میں "سچ تو یہ ہے کہ ان کے علم و فضل پر ان کی مزاحیہ نگاری نے پردہ ڈالا اور مزاح نگاری کے لیے ان کی مجبور مزدوری سنگ راہ بن رہی ہے۔"

(بہارستان صفحہ ۶۲)

اقبال کی مشہور نظم "مرغ اسیر کی فریاد" بانگ درا میں موجود ہے اس کی پیروڈی "لیڈر کی فریاد" ملاحظہ فرمائیں:

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ — وہ کانگرس کے چندے سب مل کے کھانا
وہ آشرم کے بھوجن وہ سیر موٹروں کی — پھلوں میں لد کے آنا پھولوں میں لکھے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — وہ دیویوں میں مل کر بھارت کے گیت گانا
بھارت پجاریوں کو بلوا کے آشرم میں — چرخے کی شرن لے کر تکلے کے گن بتانا

آتا ہے یاد مجھ کو ....

اپنی ہستی سے گزر چکا ہے جو دنیا میں فروغ　　زرِ شلغم کی ہوئی دیگ میں کشتہ ہو کر

پیشتر ہستیٔ مطلق سے مقاماتِ فنا

بچۂ مرغ نے طے کر لیے انڈا ہو کر

ایک غزل کے تین شعر —

مدتوں کھاتا رہا ناداریٔ قلت کا غم

تب ملے جا کر کہیں شب دیگ کے شلغم مجھے

المدد اے جذبۂ مرغِ مسلم المدد

آج قورمے میں مچانا ہے ذرا اودھم مجھے

اپنے مطبخ کا بناؤں آنریری منتظم

گر کہیں مل جائیں ہنڈن برگ یا ویسم مجھے

ایک غزل کا مطلع —

میں شہیدِ دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری!

خانساماؤں کے کندھوں پر اٹھے میت مری

ایک غزل کا حاصل غزل —

آرزو انگیز ہے جاناں کے مطبخ کی فضا

جو دھواں چمنی سے اٹھا عشق پیچاں ہو گیا

مزدور جو ہیں ان کے لئے کام ملے ہیں　　اور مال تجارت کے بہت دام ملے ہیں
صنعت کو بھی کچھ اوج کے ایام ملے ہیں　　دولت کے تو دیدار ہمیں عام ملے ہیں

پردے میں فراغت کے مگر قحط نہاں ہے
یا دھوپ کے پردے میں بارش کا سماں ہے

اب آئے کہاں اطلس و کمخواب کی چادر　　اک چادر عصمت ہے رہا ہے آپ کی چادر
جی میں ہے یہی پہن لیجئے بس خواب کی چادر　　یا شب کو چرا لیجئے مہتاب کی چادر

بیٹھے ہوں تو ملبوس ہوں عریانی تن سے
مر جائیں تو آزاد رہیں منت کفن سے

چینی گئی ایسی کہ وہ باہر ہے نہ گھر میں　　افسوس کہ اب بحر ہوا شیر و شکر میں
اس لب پہ شکر خند نہیں آج نظر میں　　شیرینی بھی باقی نہیں اشعار خضر میں

کہتا ہے کہ یہ فن سخن کھیل نہیں ہے
ترکیب زباں ہو کہ یہاں تیل نہیں ہے

• ہاتھ کی روانی " خضر تمیمی کی ایک لاجواب نظم ہے۔ یہ حضرت اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم " آب لو ڈور " کی پیروڈی ہے۔
اس میں کسی شیر و سخن خواں دوست کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے ۔

یہ ہے آج ہی رات کی داستاں　　کہ تھے مہماں میرے اک مہرباں
غریبانہ کھانوں کو وہ دیکھ کر　　ہوئے صورت باز کچھ تیز پر
مجھے ٹالنا اس کا دشوار ہے　　کہ درد نظر کا یہ اصرار ہے
دکھاؤں میں حضرت کے کھانے کا ڈھنگ　　لکھوں ان کے لقمے اڑانے کا رنگ

وہ جبڑوں میں بوٹی مسلتا ہوا — اُسے پن چبا کے نگلتا ہوا
وہ کلّوں سے ٹیلے بناتا ہوا — اور آنکھوں کو پیچھے چھپاتا ہوا
لبوں پہ زباں کو پھراتا ہوا — لپٹتے ہوئے پھیل جاتا ہوا
مسکتا، سمٹتا، سرکتا ادھر — لپکتا، لٹکتا، مٹکتا ادھر
بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا — وہ غازی سے یوں کھانا کھاتا ہوا
سمجھ کر مرے گھر کو جائے دغا — نہ زاہد، نہ مقلد، نہ عابد نہ جا
غرض اس طرح ہیں مرے مہرباں — بس اب دیکھیں شاعرِ نکتہ داں

وہ سودا و اکبر کا آب و ذوق
یہاں [illegible] کی بے زبانی کا زور

سارنگی اور طبلہ

یہ چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی اور ناظر" کی پیروڈی ہے —

دنیا بھر کے بے فکروں نے کل بزمِ سرود سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سارنگی گھبرائی تھی

بسمل کی رگِ جاں بنتی تھیں طاؤس کی تاریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا حقے نے دھوم مچائی تھی

رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے زہاد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی گانے آئی تھی

یاں اشکوں سے پُر سارنگی واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی واں ہاتھوں کی بن آئی تھی

واں تھاپ کے ابر گرجتے تھے نغموں کی پھواریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے کہرے نے قنات لگائی تھی
اڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں تھی چال صبا کی مستانہ
تقدیر سے بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر دیوانہ
سارنگی بولی طبلے سے تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو
آواز تمہاری کوے سی اور شکل چھلاوے سی تیری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے نم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو
لعنت ہے تمہارے جینے پر آرام نہیں عزت بھی نہیں
میں گودوں میں جا پلتی ہوں تم سر اپنا پٹواتے ہو
ہے خام ابھی تک عشق ترا کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یا تان اڑی اک میٹھی سی واں تھام کے دل رہ جاتے ہو
میں راج دلاری البیلی ناری ہوں پریم کنھیا ہوں
تم مونڈی کاٹے مردک ہو ہر جا پر دھکے کھاتے ہو
تہذیب تمہیں منظور نہیں اور عقل کہیں دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے ہو جاتے ہو
نازوں سے پلی شہزادی ہوں میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبس دوام کے قیدی ہو صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو

ہے ملکہ موسیقی سے مجھے نزدیک تریں تجھ سے رشتہ
ہم راہ پہ تجھ کو لاتے ہیں جب لے میں بھٹک سی جاتی ہو

میں آذر عشق کی تابش سے دل محفل کے گرماتا ہوں
طاؤس طنبورے کو تجکو دن میں تارے دکھلاتا ہوں

یہ سن کر شمس الدین وڑے تلوار میاں سے اچل جائے
یاں طبلہ تڑ بتا رہ جائے سارنگی روتی رہ جائے

چمکار کے سارنگی سے کہا تم سیدھی سادھی بھولی ہو
زیبا نہیں گر یوں منہ میں تمہارے افغانوں کی سی بولی ہو

طبلے کے وکیل مطلق نے واں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں خوں کی لہروں سے گر محفل بھر میں ہولی ہو

تم زنجبیار کے شہزادے سارنگی سا رنگی ٹھہری
پھبتی ہی نہیں شہزادوں کے گر ایسی بولی ٹھولی ہو

خاموش ہوئیں پھر سارنگی اور طبلہ صمٌ بکمٌ تھا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب دھولی ہو

القصہ بچھڑے دوست ملے نے جھگڑا تھا نے شکوہ تھا
نے تن تنا تن تن تن تنی نے تاکڑ تاکڑ دھیا تھا

عاشق محمد غوری

پروفیسر عاشق محمد غوری لاہور کے حکیم محمد بلال الدین کے فرزند ہیں۔ تاریخ پیدائش ۲ ستمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ فارسی، انگریزی، اردو تینوں زبانوں کے ایم۔ اے ہیں۔ مشغلہ درس و تدریس ہے۔ [illegible] وہ سکھ نیشنل کالج لاہور کے لیکچرار رہے۔ [illegible] سے دیال سنگھ کالج میں رئیس شعبہ فارسی ہیں۔ نہایت خاموش اور متین آدمی ہیں۔ شاعری سے خاص لگاؤ ہے۔ پرانی قدروں کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے جدید شاعری کے خلاف اکثر صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مسلمہ ادبی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو شاعروں کو راہ پر لانے کے لئے پیروڈی کا حربہ استعمال کیا ہے اور اس میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔ وہ تنقید کے کڑوے گھونٹ کو گوارا بنا کر پیش کرنے کے لئے ظرافت کی چاشنی ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی تحریفات ہمارے لئے عموماً دلچسپی اور جاذبیت کا باعث ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "ان تحریفوں کا معیار اتنا بلند ہے کہ تحریف کے کسی جائزے میں بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

صادق قریشی نے ایک نظم سلمیٰ لکھی تھی۔ پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی پیروڈی کر کے اصل کی جذباتیت کا بڑی بے رحمی سے مضحکہ اڑایا ہے۔ ذیل میں دونوں نظمیں ملاحظہ فرمائیے:-

سلمیٰ

میں نے اک تصویر بنائی

نیچے لکھا نام کسی کا

سلمیٰ

سلمیٰ شرم و حیا کی دیوی

پیکر اک اخلاص و وفا کا

سلمیٰ

جانے کب چپکے سے سلمیٰ

آ گئی سب کی آنکھ بچا کر

کتا

میں نے اک دن کھیر پکائی

اُس کی خوشبو پا کر آیا

کتا

کتا شرم و حیا سے عاری

پیکر گویا حرص و ہوا کا

کتا

جانے کب چپکے سے کتا

آ گیا سب کی آنکھ بچا کر

اندر

سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا کر
اپنی اس تصویر کی کر لی
چوری
سلمیٰ! خوب رہا یہ دھوکا
تم نے تو اک چیز چرائی
نقلی
اصل ہے دل کے آئینے پر
کاغذ پر تھی نقل اُتاری
یوں ہی
اُس کو نہیں چوری کا خطرہ
ہمت ہے تو اس کو چراؤ
آؤ

(صادق قریشی)

اندر

سب چیزوں سے دھیان ہٹا کر
میری تھی جو کھیر کی تھالی
کھالی
کتے! خوب رہا یہ دھوکا
تم نے تو اک چیز ہے چاٹی
نقلی
کھیر ہے اندر الماری میں
تھالی میں تھی تیچ جمائی
یوں ہی
اُس کو نہیں کتوں کا کھٹکا
ہمت ہے تو اُس کو اڑاؤ
آؤ

(عاشق محمد غوری)

اقبال نے بچوں کے لئے ولیم کوپر کی ایک نظم اردو میں منتقل کی تھی جو "ہمدردی" کے عنوان سے بانگ درا میں موجود ہے۔ اس کا پہلا شعر:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی ہو بہو نقل اتار کر ہمارے لئے ہنسی کا سامان فراہم کیا ہے اور جھوٹی ہمدردی کا مذاق اڑایا ہے ؎

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا — مُلّا تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — جوئیں چننے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح امکاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سن کر ملا کی آہ و زاری — الو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — احمق ہوں اگرچہ میں تمھی سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں پیش یہ گھونسلا کروں گا

اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل — اک رات یہیں کرو بسیرا

اُلّو ہیں وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

غالب کی ایک غزل ہیں تضمین کے ذریعے ظرافت کا رنگ بھرا ہے۔ صرف دو بند دیکھیے :-

اس پھلنے سے مدعا کیا ہے

میں نے تجھ کو بھلا کہا کیا ہے

تجھ پہ نازل ہوئی بلا کیا ہے

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

منہ میں ہر وقت پان رکھتا ہوں

جیب میں پستان رکھتا ہوں

ناک رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں

"میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"

کیا دن کو روشنی ہوتی ہے راتوں کو اندھیرا ہوتا ہے

اور مچھلیوں کا دریا میں یا پیڑوں پہ بسیرا ہوتا ہے

او ولیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی مرحوم ہی کی ایک غزل تھی "دیکھے کوئی بہارِ گلستانِ آرزو" کی پیروڈی میں نئے نئے قافیوں کی بہار دیکھیے ــ

مژدہ ہو آج تم کو مریضانِ آرزو ۔۔۔ لاحق مجھے بھی ہو گیا یرقانِ آرزو

مائل ہوا ہے اک بتِ ترسا پہ دل مرا ۔۔۔ کہتے ہیں جا بسا ہے مسلمانِ آرزو

سب کاروبار چھوڑ کے سڑکیں ہوں ناپتا ۔۔۔ دینا تھا کچھ نہ کچھ مجھے تاوانِ آرزو

ملا کے وعظ کا ہوا اثر مجھ پہ کس طرح ۔۔۔ سر پر مرے سوار ہے شیطانِ آرزو

میرا رقیب مجھ سے مرنے کے ہے قریب ۔۔۔ پُر سرفوں سے اس کا ہے دالانِ آرزو

گردن مروڑ ان کی یا دانے کھلا انھیں ۔۔۔ چلا رہے ہیں دیر سے مرغانِ آرزو

میرے جنون نے اسے لینے دیا نہ چین ۔۔۔ وہ چینِ حسن ہے تو میں جاپانِ آرزو

مجروحِ عشق ہو کے رہے گا وہ سنگدل

عاشق نے بھی ہے سونت لی کرپانِ آرزو

اکبر لاہوری

آپ ۱۹۱۰ء میں بھٹی راجپوتوں کے ایک گاؤں مرل پار میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں لاہور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر دریائے راوی کے اس پار واقع ہے۔ آپ کے والد مولوی ابراہیم خاں جو پولیس انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اردو، عربی، فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ اردو اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک ضخیم جلد میں ہیر رانجھے کے قصے کو از سرِ نو نظم کیا ہے۔ اکبر لاہوری کو دراصل شعر و شاعری کا ذوق اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ تعلیم دیال سنگھ کالج لاہور اور یونیورسٹی لا کالج میں پائی۔ جنوری ۱۹۳۱ء سے صوبائی مجلسِ قوانین سے وابستہ ہیں۔ آج کل

اسسٹنٹ سیکریٹری ہیں۔

آپ طنز و مزاح کے لئے کوئی خاص موضوع تلاش نہیں کرتے۔ زندگی کے روزمرّہ واقعات میں جو کچھ پیش آتا ہے اسی کے متعلق کچھ کہہ دیتے ہیں۔ چھپنے چھپانے کا زیادہ شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گمنام ہیں۔

جب آپ اسمبلی کی تقریروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے تو ملتان کے ایک سید صاحب کا نام من و عن لکھنا ہوتا تھا۔ ہر سوال کے ساتھ پورا نام ہر قرارداد کے ساتھ پورا نام اور ہر تقریر کے ساتھ پورا نام۔ مگر ان کا نام بہت طویل تھا۔ "مخدوم زادہ خان بہادر سید ــــ" سے تو خیر شروع ہوتا تھا لیکن نام کے بعد دو ایک لفظ زائد لکھنے ہوتے تھے۔ ترجمہ کے علاوہ بار بار سطر ڈیڑھ نام کی نذر ہو جاتی تھی۔ آپ نے محض نام کی طوالت سے تنگ آ کر کہا ــ

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ۔۔۔ سنتے آئے ہیں بزرگوں کی یہ رٹ
آج لمبی راہ پر چلتا ہے کون ۔۔۔ ہوں نظر کے سامنے جب شارٹ کٹ
دیکھ لو خادم نہ کہلائے کبھی ۔۔۔ پیرزادے بن گئے "مخدوم" جھٹ

اسمبلی کے ممبر صاحبان دن رات آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بعض وطن دوست اس سے پریشان بھی ہوتے تھے۔ آپ نے ایسوں کی تسلی کے لئے کہا ؛۔

آ بتا دوں تجھ کو اے ہمراز، اک رمزِ حیات ۔۔۔ جس کو سن کر رہبرانِ قوم بھی کہہ دیں کہ "ہاں!"
لڑنے بھڑنے کے لئے پیدا کیا انسان کو ۔۔۔ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

یہ حضرات کسی سے اپنی نکتہ چینی سن کر برافروختہ ہو جایا کرتے تھے۔ اصلاحِ احوال کی طرف کم متوجہ ہوتے تھے۔ آپ نے چند مصرعوں کا مکالمہ لکھا ؛۔

فرّاش ؛ حضور، ہال کا قالین ہے بہت گندہ
جو حکم ہو کسی ماہر سے صاف کروا لیں
قانون ساز ؛۔ مٹھہر کہ مجلسِ قانون بیٹھنے کو ہے
اُسی سے کیوں نہ یہ قانون پاس کروا دیں

ہمارے ہاں کے قابلین کو جو گندہ کہے

وہ بدزبان سزا پائے اور ڈنڈ بھرے

یہی حال بعض انتظامی شعبوں کا تھا مستعد پُرجوش اور دردمند اہلکار نیم مردہ بے حس اور بے خیال افسروں کی افسری کے بوجھ تلے کراہ رہے تھے۔ اس پر آپ نے کہا :۔

حافظؔ کے زمانے میں کچھ لوگ حماقت سے ــ بالان گدھے والا کس دیتے تھے گھوڑے پر

اور جس کی اذیت سے سُنتے ہیں کہ وہ گھوڑا ــ رہتا تھا مصیبت میں چلتا تھا تو رُک رُک کر

اکبر کے زمانے کا دستور نرالا ہے ــ دیکھا کہ گدھے صاحب اسوار ہیں گھوڑے پر

اور لطف یہ ہے کوئی فریاد نہیں سُنتا ــ چابک پہ مگر چابک ہنٹر پہ مگر ہنٹر

تم دیر سے مانو گے ہم نے تو یہ مانا ہے

وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

ایک دن اخبار میں نکلا کہ ایک نادار کنگال عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے فاقوں سے تنگ آکر خودکشی کا اقدام کیا تھا مجسٹریٹ صاحب بہادر نے اُسے پچاس روپیہ جرمانہ کر دیا۔ اس پر آپ نے کہا :۔

ایک روٹی کے نہ ملنے سے ہوا مایوس وہ

اور ڈھونڈی اپنے ہاتھوں ہی سے مرگِ ناگہاں

کل عدالت نے سنایا اُس کو اپنا فیصلہ

جمع کروا دے خزانے میں وہ نو سو روٹیاں

سا تھ ہی اکبر سزا یہ دی ہے مجھ مجنون کو

جج کو فاضل اور اسلامی کہوں قانون کو

اگلے دن ماڈل ٹاؤن میں ایک بھینسے نے آدمی کے ٹکر ماری اور آدمی بیچارا مر گیا۔ آپ نے اس پر کہا :۔

اِک بھینسے اور انسان کے ٹکراؤ میں یہ نکتہ پنہاں ہے
جو رہ جائے وہ بھینسا ہے جو مرجائے وہ انسان ہے

ہمارا ماحول کچھ ایسا ہے کہ لوگ اپنی پیش رفت کے لئے چاروں طرف درخواستیں داغتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنی جگہ کی نسبت اوپر والی جگہ کے زیادہ موزوں ہوں۔ وہ حکام کو جا جا کر پریشان کرتے ہیں کہ ساتھ نام چھوڑ کر مجھے ضرور فلاں اسامی پر لگائیے۔ اس رجحان پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

راجہ کے دربار میں بھانت بھانت کے لوگ — کچھ راجہ کے لاڈلے، کچھ پرجا کے یوگ
اک منڈل کے منتری، ایک سبھا پردھان — اک جنتا کی جوت ہیں، اک سینا کا مان
ہر گھوڑے کی پیٹھ پر اک افسر اسوار — صوبے داروں سے بھرا، راجہ کا دربار
ہر ماتھے کی ریکھ میں راجہ کا پرتاب — کون اُٹھائے چھتر کو، تھامے کون رکاب؟
اتنے راجہ بن گئے، پرجا نظر نہ آئے
اکبر اب یہ سمے ہے تو پرجا رہ جائے

سینماؤں میں سگرٹ کی بندش ہوئی تو آپ نے بعض سگرٹ نوشوں کی بے چارگی پر اس طرح طعن کیا ؎

دو چار کش لگا کے جو سگرٹ کے دیکھتا — دیتا سرور قلب کو سوز و گداز فلم
سگرٹ ہوا ہے بند تو دل کا یہ حال ہے — جیسے کہ پڑھ رہا ہوں دو رکعت نماز فلم

اپنا اپنا قاتل

ایک غالب تھے کہ قاتل نے کیا قتل اُن کو — اور کی قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ایک اکبر ہے کہ اُس پر بھی آفت بیتی — لیکن اس عہد کے قاتل کی ریا سے توبہ
کی مرے قتل کی اخبار میں تردید اُس نے — اور کرا دی مرے احباب سے تائید اس نے

نازش رضوی

سید امام علی نازش رضوی یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں جنگ عظیم کے دوران آپ نے ایران اور عراق عرب میں سرکاری خدمات انجام دیں۔ اور ۱۹۲۲ء میں وطن واپس آ کر صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۲ء تک آپ دلکش، بہارستان، تازیانہ، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، روزنامہ سیاست اور جمہور وغیرہ اداروں میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد کامل دس سال ہز ماسٹرس وائس گراموفون کمپنی کے دہلی دفتر میں شعبۂ ادب اور نشر و اشاعت کے رکن رہے۔ دہلی اور لاہور کے قیام میں آپ نے چند کتابیں تصنیف کیں جن میں حرب و ضرب، بزم و رزم، روح المعانی اور سرمایۂ نازش تو سیاسی و ملی نظموں، غزلوں، گیتوں اور مرثیوں پر حاوی ہیں۔ باقی دو مجموعے ایٹم بم و دیگر افسانے اور شاہ صاحب کا ہاتھی مزاحیہ افسانوں پر مشتمل ہیں۔ شہادت نامہ، کارزار اور رنگین افسانے ابھی زیر طبع و تالیف ہیں۔

نازش صاحب اخبار نویسی کے زمانے میں تو ضرورتاً اور بعد میں فرمائشی پر ارژنگ۔ ملا سہ پیازہ۔ ابو نواس۔ ملا رازی ــ اور مفو دھوبی کے قلمی ناموں سے زمیندار، سیاست، نمکدان، ریاست، تازیانہ، امروز، ایشیا، نوائے وقت وغیرہ میں مزاحیہ نظمیں لکھتے رہے جن کا مجموعہ "مزاح و عبر" کے نام سے مرتب ہوا تھا اور اس کا دیباچہ چراغ حسن حسرت مرحوم نے لکھا تھا مگر وہ گذشتہ طوفانی برسات میں سیلاب کی نذر ہو گیا۔ اس وقت جو چند نمونے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے طنز و مزاح میں "عبرت" شامل ہے جس سے وعظ کی سی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ظرافت دب کر رہ گئی ہے اس سے مخاطب صرف مسکرا سکتا ہے۔ نازش صاحب کے نزدیک جس شعر پر ہنستے ہنستے چہرے کا حلیہ بگڑ جائے وہ مزاح کے ذیل میں نہیں آتا۔ دیکھئے موجودہ چور بازاری، جھوٹ، ملاوٹ اور لوٹ پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ملے کچہری میں اک روز شیخ خیراتی — ہے اک زمانے سے ان کی مری علیک سلیک
نہیں ہے جھوٹی گواہی سے اجتناب انہیں — کیا نہ آج تک اس پر کسی نے اٹیک
علاوہ اس کے امیروں کے ہیں یہ سپلائر — کہ مال کرتے ہیں یہ ان کی حسب منشا پیک
ہو جس میں فائدہ وہ کام کر گزرتے ہیں — کبھی فرنشہ میں جا کر نہیں یہ ہوتے بیک
حجاز جاتے ہیں ہر سال سونا لانے کو — یہ بزنس آج تک ان کی کبھی ہوئی نہ سلیک
یہ حج کے دن بھی ہیں "لبیک" کے عوض کہتے — "خدا کے گھر میں فقط ربنا بلیک! بلیک!"

تیری اعجاز بیانی تم عیسیٰ کی حریف
ہیں ترے حسنِ تکلم میں سب اندازِ کلیم

کیا یہی مسلکِ درویشی ہے او دشمنِ فقر
کیا حقیقت میں طریقت کی یہی ہے تعلیم

اپنا کردار بدل آہ میں سچ کہتا ہوں
آج افعال سے تیرے دلِ ملت ہے دونیم

تو وہ قطرہ ہے صدف نے جسے رد کیا
تو کہاں اور کہاں آبروئے دُرِ یتیم

غزل

حسنِ الفت کا راز کیا جانے
ناز پرور نیاز کیا جانے

یہ غلط ہے کہ اس زمانے میں
مولوی ساز باز کیا جانے

غزنویت میں گم ہوئے باری
قدر اپنی ایاز کیا جانے

میری درگت کا راز وقتِ سرود
کوئی طبلہ نواز کیا جانے

اپنے گھر کی خبر نہ ہو جس کو
وہ میرے دل کا راز کیا جانے

غمِ ملت میں حال باری کا
ہر کوئی بندہ نواز کیا جانے

آج سہ پیازہ کے بغیر یہاں
کوئی اوصافِ پیاز کیا جانے

پنڈت ہری چند اختر

ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم زیادہ تر لاہور میں حاصل کی۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔ ابتدا ہی سے ادب و شعر کا ذوق تھا۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ساری عمر ادبی محفلوں کی جان بنے رہے اور دوستوں کے لیے قہقہوں کا سامان فراہم کرتے رہے۔

ابتدا میں تین چار سال اخبار نویسی کی۔ ہفتہ وار "پارس" کو پارس بنایا۔ "پھول" اور "تہذیب" میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ پنجاب پبلک مرکزی محکمہ اطلاعات، جنگی پبلسٹی اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے اور دہلی یا چنڈی گڑھ میں رہتے تھے وہیں یکم جنوری [illegible]ء کو انتقال ہوا۔

پنڈت ہری چند اختر نہایت خوش ذوق، سخن فہم، پختہ کار اور باکمال شاعر، زبان اور فن کی باریکیوں کے ماہر لطیفہ و نفیس طنز و مزاح کے صحیح معنی میں اجارہ دار تھے۔ وہ لطائف و ظرائف کی پوٹ، بے حد خوش طبع، زندہ دل، شائستہ اور پابند اخلاق آدمی تھے۔ ان کی شاعری چند غزلوں اور چند نظموں سے زیادہ نہیں مگر جو کچھ کہا کسی دوسرے کے لیے کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مزاحیہ اشعار کہنے، دوسروں کے کلام کی پیروڈی کہنے اور شعراء کے پڑھنے کی نقل اتارنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ افسوس کہ ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔ چند اشعار دیکھیے ؎

ابھی تو یہی دیکھنا چاہتا ہوں　　نہیں چاہتا ان کو یا چاہتا ہوں

مری نیتوں پر نظر رکھنے والو　　بتا دو کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں

نہ سمجھا کوئی جس کو وہ حرف ہوں میں　　غلط ہو چکا ہوں مٹا چاہتا ہوں

میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں　　وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

———

زمانے کو کیا دیا دینے والے　　ہمیں تو نے ترخا دیا دینے والے

زمانے کو تو ہیں بھی دیں مال و زر بھی　　ہمیں تو نے چرخا دیا دینے والے

———

بیٹھتا ہوں تو درد اٹھتا ہے　　درد اٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہوں

———

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ　　کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا

کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ　　کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں، کہا تم اونٹ پر بیٹھو　　کہا کوہان کا ڈر ہے، کہا کوہان تو ہوگا

———

چلو چل کر دکھا لائیں تمھیں ٹیگور کی داڑھی　　بڑی ہی شان کی داڑھی بڑے ہی زور کی داڑھی

———

نعمتوں کو دیکھتا ہے اور ہنس دیتا ہے دل　　محو حیرت ہوں کہ آخر کیا ہے میرے دل کے پاس

سید محمد جعفری

سید محمد جعفری اس دور کے ذہین ترین طنز نگار شاعر ہیں۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور اب ایک ذمہ دار افسر ہیں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ہماری معاشرتی کمزوریوں کے لئے ایک بے رحم آئینہ ہے ع

وہی کہتے ہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

ان کے طنز میں تلخی نہیں نرمی ہے، علمیت بھی ہے اور شعور بھی۔ وہ افراد کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ اداروں اور اجتماعی زندگی کی خامیوں پر انگلی رکھتے اور اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی [illegible] پر کچھ اس انداز سے ہنستے ہیں کہ پڑھنے والا مزے لیتا اور ان کے ہمنوا ہو جاتا ہے۔ وہ غالب اور اقبال کے مصرعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے شوخیوں میں رچے ہوئے ذوق کی بدولت ظرافت میں دل آویزی اور انوکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے طنز میں شگفتگی اور زندہ دلی ہے۔ وہ جس نظام کے کل پرزہ ہیں اس کے خلاف بھی متواتر احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ لال فیتہ، موٹی موٹی سفارشیں، نمائش، سیاسی نعرے، غرض اور ریا کے سجدے۔ کلرک کا کردار، آزاد شاعری، یوا ین او اور بعنگیوں کی شہرتاں غرض کوئی چیز ان کی زد سے باہر نہیں۔ وہ جب ان اقتدار پسندوں کو دیکھتے ہیں جن کا حلق اخوت اور مساوات کے سیاسی نعرے لگاتے خشک ہو جاتا ہے لیکن ان کا عمل پھر بھی اس کے سراسر خلاف رہتا ہے تو وہ اپنی نظم "وزیروں کی نماز" میں نماز کے خالص سیاسی اور خود غرضانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے یوں طنز کرتے ہیں ؎

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر — جبکہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر

وہ مصلّوں پہ مسلط تھے بحُسنِ تقدیر — تھے "ربزرو" ان کے مصلّے یہ مساواتِ کبیر

آج کل یہ ہے نماز، اور کبھی وہ تھی نماز

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

صفِ اوّل میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز — یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز

تجھ سے اے خالقِ کل چھپ نہیں سکتا ہے یہ راز — تو حقیقی، وہ مجازی مجھے دونوں سے نیاز

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں"

کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے ساتھ لائے تھے مصلیٰ وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"
کون کہتا ہے کہ ہم لائق دربار نہیں

ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے
کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے

خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر
"مان لیتا کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر"

یو، این، او کی کارگزاری پر جعفری سے بہتر طنز شاید کسی اور سے نہ کی ہوگی۔ صرف دو بند ملاحظہ فرمایئے۔ اس نظم کی پوری فضا میں غالب کے مصرعے جس آب و تاب سے جگمگا رہے ہیں اس کی داد نہیں دی جا سکتی ؎

یو، این، او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے وعدۂ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے
گرچہ بڑھ آتا فلسطیں میں خود اپنی زد ہے ایسی قوموں سے خفا ہے جن کی رنگت زرد ہے

کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

ڈالیے اس کے گزشتہ کارناموں پر نظر وادیٔ کشمیر کے قضیے کو ٹالا کس قدر
فیصلہ کا وقت جب آیا تو بولا حیلہ گر ٹلے تولوں سنتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

"ایسی باتوں سے وہ "عمرو" بدگماں ہو جائے گا"
یہ نہیں سوچا کہ بدنام جہاں ہو جائے گا

جعفری نے کراچی کا نقشہ بھی اس کے حقیقی خد و خال میں پیش کیا ہے۔ یہ خد و خال اگر مضحکہ خیز ہیں تو اس میں جعفری کا کیا قصور؟

صرف دو تین بند دیکھئے ؎

اے کراچی ململ اور کھملی کے دیرینہ وطن — سب کو یہ دو نعمتیں ملتی ہیں تجھ سے تحفتاً
اور شہید ناز ہو جاتے ہیں گلگوں پیرہن — کب ملک ہم سے تغافل کب تلک بیگانہ پن

سرد مہری اور گرمی کا نرمی کیا آسرا
سندھ صوبہ کی وزارت کی طرح موسم ترا

تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کہاں — حسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں
پر دلِ وحشی کو مل سکتی نہیں پھر بھی اماں — آ کے لٹ جاتا ہے بازاروں میں "کھوا پہلوان"

پھر نہ دنگل کام آتے ہیں نہ کوئی داؤ پیچ
ساری دنیا ہے مریضِ عشق کی آنکھوں میں ہیچ

ہیں ترے نقار خانے میں بہت سی بولیاں — اس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطیٔ شیریں بیاں
یعنی وہ اردو جو ہجرت کر کے آئی تھی یہاں — جنگ آمادہ ہیں اس بیگم سے گھر کی باندیاں

اس کی قدر و منزلت سے دل ترا بیگانہ ہے
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"

بھنگیوں کی ہڑتال کا ایک منظر دیکھئے ؎

بھنگیوں کی آجکل ہڑتال ہے — کہتر و مہتر کا پتلا حال ہے
گردشِ دوراں نے ثابت کر دیا — رفعِ حاجت بھی بڑا جنجال ہے
ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی — سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے

ظریف جبلپوری

۲۶ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بمقام کٹنی (ضلع جبلپور) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے حامد رضا نام رکھا لیکن بچپن ہی سے ظریفانہ شعر کہنے کی بدولت ظریف مشہور ہوگئے۔ نسیم بھرت پوری رشتہ میں ان کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ ظریف اپنے وطن ہی میں ملٹری انجنیئرنگ سروس میں ملازم ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ کہتے ہیں اور مصرعوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جنگ اور ہندوستان، مادرِ وطن، غریبی، بلیک مارکیٹ وغیرہ مشہور ہیں۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے۔ تمام اشعار میں جنگ، گرانی، سیاست پر طنز [illegible] چھیڑ چھاڑ ہے۔

ہماری قبر کے تختے چرا کے کہتے ہیں ۔۔۔ ہے کنٹرول کی لکڑی گراں نہیں معلوم؟

پھانسی منصور کو لگائی ہے ۔۔۔ وہ سمجھتا ہے نیک ٹائی ہے

فردوس تک کے در کھلے ماہِ صیام میں ۔۔۔ اور وا اگر نہ تھا تو تمہارا ہی در نہ تھا

عشق میں اور کیا ہو حبسِ دوام ۔۔۔ ہجر خود انڈمان ہے پیارے

ہم آپ ہوں گے نہ ہوگا عدو رہے گی کمی ۔۔۔ کہ جیسے تانگے ہیں اک ہم نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ کی یاد بن گئی اکسیر ۔۔۔ خاک میں مل گئی ہماری یاد

سونا مہنگا ہے تو پھر تانبے کے سکے ہی سہی ۔۔۔ نوٹ اور وہ بھی پھٹا ہو مجھے منظور نہیں

کیا نمک اٹھ گیا زمانے سے ۔۔۔ پھیکا پکوان کھا رہا ہوں میں

کیا نمک پاشی کرے جب سے ہے نمک پر کنٹرول ۔۔۔ ہنس رہے ہیں زخمِ دل خالی نمکداں دیکھ

عقلیں درست ہو گئیں مہنگائی کے سبب ۔۔۔ سب بیوقوف جنگ میں چالاک ہو گئے

کیا سیاست ہے کہ ہیں وہ جنگ سے بیزار بھی — غیر کی جانب بھی ہیں اور غیر جانب دار بھی

کپڑا اردو پوش ہے عریانی چھپائیں کب تلک — چند اک دن میں لنگوٹی بھی اتر جائے گی

کپڑا اگر ملے تو گریباں بھی چاک ہو — کیسے پھروں میں چاک گریباں کئے ہوئے

میرے بالوں سے وہ الجھتے ہیں — ان کی زلفوں میں پھنس گیا ہوں میں

ڈھونڈتے ہیں وہ میرے سجدوں کو — سنگ در پر بڑی کھدائی ہے

اک غیر تھا کہ پا گیا دس سال کی سزا — اب کوئی درمیان میں حائل نہیں رہا

میں تو پنٹ ہی لوں گا تم منہ سے "ہاں" تو کہہ دو — آخر عدو، عدو ہے یا تیس مار خاں ہے

زاہد و رند دونوں یکساں ہیں — اپنی اپنی مگر طبیعت ہے

ترے ایمان کی نیّا بھٹکتی پھرتی ہے زاہد — کبھی کوثر کی موجوں میں کبھی گنگا کے دھاروں میں

محفل کی عنایت سے ظریف سخن آرا — وہ داد ملی ہے کہ کھجایا نہیں جاتا

ان سے ملنے کو جو پوچھا تو تنک کر بولے — تم تو سنتے ہی نہیں کہہ تو دیا عید کے دن

پڑھتے پڑھتے ہو گئے کالج سے اوورایج ہم — نوکری کرنے کا بھی اب ہم کو ڈر جاتا رہا

دریائے ظرافت میں طوفاں کچھ ایسا ظریف اٹھ آتا ہے — اشعار ہمارے سن سن کر سب ہی ہا ہا کرتے ہیں

شب فراق جسے عاشقی میں کہتے ہیں — وہ رات خود نہیں آتی بلائی جاتی ہے

سپیچوں میں گوٹے کناری کی باتیں ——— بہو کی کفایت شعاری کی باتیں
پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں ——— غرض ہر بیاہی کنواری کی باتیں

بلیڈ اور ٹائی پہ "پُرلٹ" ہو رہی ہے
مگر عطر و ریشم کی آہٹ ہو رہی ہے

فرقت کاکوروی

غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔اے بھی اس دور کے تحریف نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ آپ دہلی کالج میں تاریخ کے لیکچرار ہیں۔
آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مداوا (تنقید)
۲۔ ناروا (ترقی پسند مصنفین کے خاکے)
۳۔ صدف و بدف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (تاریخ اور تمام مزاح نگاروں پر تبصرہ)
۵۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مداوا اور ناروا میں آپ نے جدید شاعری کا خاکہ اڑایا اور ترقی پسند شاعروں کے کلام کی پیروڈی کر کے ان کے رنگ کو اتنا تیز کر کے پیش کیا ہے کہ مہملیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تحریفات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ اکثر مقامات پر شعوری کاوش کی زیادتی اور ظرافت کی کمی نظر آتی ہے۔ اور نظمیں محض نقل بن کر رہ گئی ہیں۔
ناروا کا ایک نمونہ دیکھئے۔ سلام مچھلی شہری کا تعارف کراتے ہوئے کہ "آپ سلام ہیں اور آپ کی شاعری وعلیکم السلام ہے سر دست آپ کی شاعری پر تفکر کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں لیکن جب بھی شاعری اردو میں باقاعدہ ترجمہ ہو کر آئے گی تو یقیناً ایک اضافہ ہو گی۔ اس وقت دنیا ہمارے اس نوجوان شاعر، ادیب اور مفکر کے رتبے کا صحیح اندازہ لگا سکے گی ۔۔۔ وغیرہ" ان کی ایک نظم کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں :۔

بنگال کی رقاصہ

ناچتے ناچتے ——— پائل کے بغیر
جسم عریاں ہی رہے

مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ میری دانست میں اس نظم کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان ناہمواریوں میں بھی ہے جو "بڑی بی" کے الفاظ اور کردار سے پیدا ہوتی ہیں"۔

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ — ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
کسی سے بھی رکھی نہ اس نے عداوت — کہ پیشہ تھا اس نوجواں کا شرافت
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا — خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
نہ رو رو کے بے حال ہو اے دلہن تو — کر اس قدر آہ رنج و محن تو!
وہ جنت میں خوشیاں منائے گا مت رو — وہ حوروں سے اب دل لگائے گا مت رو
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا — مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا — ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی تو لانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ — ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
منگانا ذرا شوربا اور حسالہ — بڑھانا ادھر کو ذرا یہ پیالہ
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا — خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا — خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنا نہ روئے — بچاری نہ بیکار میں جان کھوئے
اری بوٹیاں نہیں سالن میں تیرے — یہ چھچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ — ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
دلہن گھر میں چورن اگر ہو تو لانا! — نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا

نہ کریں اتنے نزرد اتنا بیماری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

راجہ مہدی علی خاں کی ایک اور نظم "اس سے اور اسی سے" بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے کسی قسم کی نکتہ چینی کئے بغیر دو مقابل تصادم کو محض دو تصویروں کی صورت میں پیش کر کے کامیاب طنز کی گئی ہے ؂

زمیں کے چاند ترا حسن آسمانی ہے
ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے

زہے نصیب کہ تو ہو مری شریکِ حیات
ہو تیرے جلووں سے رخشندہ زندگی کی رات

ہے میرے اجڑے ہوئے گھر کو انتظار ترا
تو اے بہار اسے آکے رشکِ خلد بنا

گھر آؤں گا جو سرِ شام ہو کے میں بے حال
نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گال

کھلے ہیں ہونگے ترے ہار میری باہوں کے
چمک اٹھیں گے ستارے تری نگاہوں کے

کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشیں گفتار
مرے چمن میں ہمیشہ رہے گا حسنِ بہار

کھلے گی دل کی کلی روح شادماں ہوگی
بہشت ہوگی اسی گھر میں تو جہاں ہوگی

قدم مادر فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

(۲)

خدا کے واسطے کھولو بھی آ کے دروازہ
میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا

اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف
تو پنکھا جھلئے ذرا اٹھ کے کیجئے تکلیف

یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے
بھلا اگنی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے

الٰہی کون یہ پانی کاٹے گا اتنا بل
خدا کے واسطے کر نل کو بند اسے کاہل

چپاتیاں میرے اللہ سب کی سب کچی
تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی

بس اٹھ بھی اب کہ نئی ایسا برا تو حال نہیں
یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں

دبا دے پیر مرے اٹھ کے اٹھ بھی اٹھ او سست

خوجی

رتن ناتھ سرشار

[illegible] افسانہ (فسانۂ آزاد) کی اس شخصیت (ہیرو آزاد ہے) ۔۔۔۔ اس [illegible] خوجی ایک [illegible] ہے جو ایک بڑے نواب کے مصاحبوں میں شامل تھا۔

"خوجی یا خواجہ بدیع الزماں یا خواجہ بدیعا ایک [illegible] شخص ہیں [illegible] بڑھے [illegible] اپنے آپ کو جوان اور کبھی بالکل لڑکا سمجھتے ہیں۔ گز بھر اتنے (اگر ہوا چھو جائے تو گر پڑیں) دبلے پتلے ایسے کہ کوئی بچہ چپت جڑ دے تو سات لڑھکنیاں کھائیں۔ بدصورت اس قدر کہ کوئی دیکھ لے تو ڈر جائے مگر سمجھتے یہ ہیں کہ میں نہایت موٹا تازہ [illegible] طاقتور، نہایت خوبصورت ہوں۔ جو [illegible] ایسا کرے [illegible] مرتبہ پٹے، جوتیاں کھائیں، مگر خم ٹھونک کر مکرر لڑنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ساتھ ہی عقلمندی کا بھی دعویٰ ہے۔ حالانکہ پرلے [illegible] کے بیوقوف ہیں۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور کسی جگہ تک سے تک ملائے بغیر نہیں رہتے۔ فارسی خوب بولتے ہیں، اتنی خوب کہ کبھی تو سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ بات بات پر بہروپیا [illegible] نکالنا آپ کا خاص وصف ہے حالانکہ قزولی کی کبھی خواب میں بھی شکل نہیں دیکھی۔ بہادری کا یہ عالم ہے کہ مارتوں کے پیچھے اور بھاگتوں کے آگے۔ "ہمت ہمت کی اور وہ بھی عمر میں ایک مرتبہ تو ڈرنے ڈراتے کسی مردے کے ناک کان کاٹ لیے۔ غرض کہاں تک بیان کیجیے خواجہ صاحب کی ذات میں [illegible] سب خوبیاں [illegible] ہو گئی ہیں۔"

۔۔۔۔ خوجی افیمی آدمی لڑکی کا نام سنتے ہی ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے کہ خدا ہی خیر کرے۔ ہم سمجھے تھے کہ دل لگی کرتے ہو۔ یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ توڑا چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم لاکھ عالم و فاضل سہی پھر لڑکے ہی تو ہو۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش آپ کی اور دعویٰ یہ کہ شہر کی جا کر روسیوں سے لڑیں گے۔ لے تیری قدرت۔ میاں ہوش کی دوا کرو، عقل کے ناخن لو ۔۔۔ ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی تو ٹائیں سے مر جائیے گا۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ ارے میاں خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی یہ مر گیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر بھی دھم سے گرا۔ دائیں دائیں کی آواز بادل کی کڑک کی طرح گونجتی ہے۔ تڑ پڑ۔ میاں الگ رہے اور ایک دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ کا گولہ آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولہ پھٹا اور بہتر ٹکڑے ۔۔۔ دس دس آدمیوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اڑا دیا۔ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو کہیں تلوار چلنے لگی تو اُف اوہ بے موت جان جاتی ہے ۔۔۔۔ بس کہیں وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔ ۔۔۔ ارے توبہ ارے توبہ خدا بھلے مانس کو جنگ کے میدان سے بچائے گے۔"

میاں خوجی میں ایک وصف یہ تھا کہ بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو، یہ جھپٹ ہی جائیں۔ غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تو شہ زور پر جو ان کو اٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ لڑھکنیاں کھائیں

لے مولانا تاجور نجیب آبادی (پیش لفظ خوجی کے کارنامے)

چاہے کچھ مزنکل جائے مگر یہ ہارنا نہیں چھوڑتے۔

وہ یہ وصف یہ تھا کہ پٹ پینک، جھاڑ پونچھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، مگر ممکن کیا کہ ذرا اف کریں وہی تیور وہی دم خم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ان کی ٹوپی کو ان کے سامنے اُٹھا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا ان کو تاب کہاں؟ آتے ہی بھینکا اور ہاتھ سے گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا یہ دبلے پتلے نیم آدمی ہوا کے جھونکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچ اور زور سے زمین پر پٹکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اس نے ایک گھونسہ جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت۔ وہ چھپٹ کر رسید کئے ایک ادھر ایک اُدھر اور آسمان کو ایسی باپ کہ یہ مہر اور سے جیت پاوت نامیں لو مشنے سے کالر سے سے بھلا کسان کی جورو ترشونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی آپ نے پکارنا شروع کر دیا قسم بابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو اس وقت ان دونوں کی لاش پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہیئے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے دور میں آپ رہا ورنہ اتنی قرولی بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ہات ترے کی نابکار کھڑا تو رہ کیدی دو زخی . . .“

— خوجی اور ایک ڈاکٹر کی دو دو چونچیں:۔

خوجی:۔ (ڈاکٹر سے) کیوں میاں ڈاکٹر کہاں ہیں اس وقت؟

ڈاکٹر:۔ آپ اپنا مطلب کہیئے۔

خوجی:۔ ابی تو تم سے کیا واسطہ عجیب قطع کے آدمی ہو۔ دخل درمعقولات دینا کیا معنی تم بس اتنا بتا دو کہ ڈاکٹر کہاں ہیں؟

ڈاکٹر:۔ لاحول ولاقوۃ

خوجی:۔ لاحول ولاقوۃ

ڈاکٹر:۔ کوئی ہے نشتر لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

خوجی:۔ کوئی ہے نشتر لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

کمپونڈر:۔ اجی کیا بک بک لگائی ہے۔ یہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں میاں۔

خوجی:۔ آداب عرض کرتا ہوں . . . . .“

سرائے میں بے بھاؤ کی پڑیں مگر خوجی کی اکڑ فوں وہی رہی:۔

”ایک دن پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کا ناک میں دم کر دیا . . . . افیمی آدمی . . . ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرات نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا اور انہوں نے پینک سے چونکتے ہی غل مچایا . . . تو آس پاس کے لوگوں کی نیند حرام ہو گئی چور کا گمان ہوا لینا جانے نہ پائے۔ چور چور۔ ارے میاں کہاں؟ کدھر؟ کس رخ؟ لینا پکڑ لیا ہے۔ دیکھو بچ کے رہنا بھئی مسافرو ہوشیار . . . سرا بھر میں ہلڑ مچا ہوا ہے . . . میاں خوجی نے جو لینا لینا جانے نہ پائے، چور ہے چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کر دیا کہ ہائیں! ہائیں! خبردار جانے نہ پائے . . . او چور او کیدی ٹھہرا رہنا! یہ خبر ہی نہیں . . . کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے . . . قد تو حضور کا ماشاء اللہ پون انچ کا اور دم خم یہ کہ . . . قرولی کی حضرت نے عمر بھر صورت بھی نہ دیکھی ہوگی مگر بات بات پر قرولی اور قرابینچیے کی فکر رہتی ہے کوئی اس مسخرے سے اتنا پوچھے کہ اب قرابینچیے کا فقن کہاں؟ شیر بچہ بانسے آپ نے کس کو دیکھا؟ قرولی کس کی کمر میں نظر آئی مگر ان کو بک دینے سے مطلب ہے۔ خیر میاں خوجی جو گرائے تو چھ کٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لپک ہی پڑے . . . گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں کہ لینا۔ لینا . . . لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے۔ بھلا بے بھلا پکڑ لیا۔

ہے۔ سعدیاری نے کہا میاں کچھ خبر ہے ہوش کی باتیں کرو۔ اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔ پنینک میں سوجھ گئی کہ چور آ گئے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑتے
دوڑتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اڑا اڑا دھوں۔ میاں خوجی گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہو گئے۔
کمہار نے للکارا کہ چور چور۔ اٹھنے کرتے تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا کہ ارے دوڑو چور کا پکڑا لیوں[1] ... سب کے سب دوڑ پڑے
کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے ہے کوئی بید گھماتا ہے کوئی لکڑی ہلاتا ہے ... اندھیری رات گھٹا ٹوپ اندھیرا چھو طرح چھایا ہوا کسی کو کیا معلوم
کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی ... بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے زناٹے کے ہاتھ لگائے ... خوجی کی سٹی بھولی ... خوب چٹ پٹا چلے
تو ایک مسافر نے کہا بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ تو خوجی ہیں جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں۔ چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی کے
بالشتیے میاں خوجی ہیں ... !

الغرض میاں خوجی کی جان بچائی مگر کب جب کچھ دم نکل گیا۔ انجر پنجر الگ ہو گئے۔ جب لوگوں نے چپت گاہ کو خوب سہلا دیا تو میاں
خوجی چلے ... "

"اب خوجی صاحب جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ بات ترسے گیدی کی بڑا آزاد بنا ہے ... مردود ہاتھا پائی کا
پڑا ہے خبر کیا اور ہماری خبر ہی نہیں لی ... بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی کم۔ چلے آتے گر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑے
ہیں۔ جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے پکارا ... خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دیں۔ اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے"

خوجی :۔ ہاتھ پاؤں! ہونہہ۔ یہ لو سہے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندہ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے پچاس آدمی گھیرے
ہوئے تھے ... ایک کم نہ ایک زیادہ!"

راوی :۔ درست۔ اس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گنتے بیٹھتے ... مارے چپتوں کے برا تو گئے تھے۔ مگر بے حیائی بلا در
جھاڑ پونچھ کر پھر موجود۔

خوجی :۔ واللہ میں اس وقت پھلجھڑی بنا تھا ... بس یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے اور ہم جو
پھرا کر کس کو اٹی دی دھم سے زمین پر گرا کسی کو کولے پر لاد کر مارا۔ کھٹ سے چپر کھٹ کی پٹی پہ۔ دو چار میرے رعب میں آ کے تھر تھر
کے گر ہی تو پڑے۔ دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی۔ یہ ڈھیلکی کھائی وہ بھورا۔ ادھر تکا ادھر ابھرا۔ جو سامنے آیا اس نے نیچا دیکھا جو
منہ چڑھا، منہ کی کھائی ... خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ آدمی دکھا تو دیجئے۔

راوی :۔ خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو خوب معلوم۔ ہے گر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا، بے غیرت جوتی خورا سارا بھر میں تو اس سرے
سے اس سرے تک کوئی نہیں نظر نہیں آتا۔ اس ڈینگ پر پھٹکار!"

جس طرح پنینک نے کہار سے میاں خوجی کی مرمت کرائی اسی طرح اس کے طفیل نواب کی ایک ملازمہ براز عفرانی نے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیا
اور اسی پنینک کی بدولت کائی برس بھی ہو آتے اور نہ جانے کہاں کہاں جا بیٹھے اور درگت بنوائی۔ دل پہ کہار، بزاز اور براز عفرانی کا خوف بیٹھ گیا۔ جہاں
پر سوار ہونے کی شرطوں میں جہاں یہ خوف نمایاں ہے وہاں آپ کی دوسری دلچسپ خواہشیں بھی ظاہر ہوتی ہیں جو ان کے کردار کا ایک اہم جز ہیں۔

---

[1] چور کو پکڑ لیا۔

پہلی شرط :- ——— قرولی ہم کو ضرور لے دیجئے اور ایک ذرا بنچہ بھی ہمارے پاس رہے ....

دوسری شرط : برس بھر کے صرف کے لیئے افیم اپنی جانب کو دیجئے۔ میں اپنے لادے لاد پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے موت انشاء عقیل ہو جاؤں گا۔ آپ از عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں، مگر بندۂ درگاہ بے افیم پیئے ایک قدم نہ چلیں گے۔ وال پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے کہاں ڈھونڈ ھتے پھریں گے۔

تیسری : اتنا بتا دیجئے کہ وہاں پر از عفرانی کی سی ڈنڈیل دوپیاں تو نظر نہ آئیں گی ؟ ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔ اف فوہ لا حول کیا کس کس کے لائیں لگائی ہیں اور کیا تان تان کے نکتے بازی کی ہے کہ پلیتھن ہی نکال ڈالا۔ روح پر صدمہ ہے واللہ روح پہ !

چوتھی :- رات میں ہم اب تمام عمر نہ اتریں گے اور جو جہاز پر کمہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ ابھی اتفاق ہے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم۔ کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ بنڈا ٹوٹ گیا تو کمہار انجر پنجر ہی الگ کر دے گا۔ لہٰذا کمہاروں کی صحبت آج سے القط

پانچویں :- جس رئیس کی صحبت میں بزاز آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔ اس میں لالہ نین سکھ ہوں یا لالہ بلدیو۔ ابھی بزاز تو ٹھہرے زمین کے گز۔ سب کہیں گھوما چاہیں، مگر ہم بہت دیکھ بھال کر جائیں گے۔

چھٹی :- جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کا بھی ہوش تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانجی ہوس پہنچائے۔ ذرا یہ دریافت کر لیجئے گا۔

ساتویں: ٹٹو پر ہم سوار نہ ہوں گے۔ اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

آٹھویں: بیٹھے بٹھائے رو رکھیں

نویں: ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجئے۔

دسویں: مورچے پر ہم نہ جائیں گے۔ بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے تعلق رہے۔ اور لوٹ مار میں جو کچھ بھی ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے۔

گیارہویں: حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعا۔

بارہویں :- گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

تیرہویں جو ہم خدانخواستہ حبشت میں داخل ہوں تو لاش کو ہندوستان پہنچوانا اور جہاں والا مرحوم کی لاش دفن ہے وہاں ہی دفنانا۔ لیکن ہم کو خود ہی نہیں معلوم کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور تھے کون ؟ آپ ذرا پتا لگا لیجئے گا اور قبر برابر بنوائیے گا اگر ان کی قبر نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر ہو بس اسی کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے !

چودہویں : پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے اتنی شرطیں اگر قبول ہوں تو خیر۔ ورنہ نہ خوجی نہ میاں آزاد !"

حاجی بغلول

منشی سجاد حسین

حاجی صاحب نے سفرِ حج کی زحمت، تو خدانخواستہ کبھی خواب میں بھی نہ اٹھائی تھی۔ ہاں طامس کوک کی بدولت ہزارہا بندگانِ خدا کو اللہ کے گھر کا جانا ان سے ... دیا تھا۔ یہی حق کمیشن آپ کے نزدیک گھر بیٹھے کم سے کم ایک حج تو ہضم کر دینے کو کافی تھا۔ پس اگرچہ بہالے حضرت خدا کی عنایت سے صرف بمبئی تک کے حاجی تھے، اگرچہ سفر ایسا مقبول ہوا تھا کہ واپسی کے بعد ہی سے خلقت نے بے سوچے سمجھے، محض چند زمزمیوں، مسرشے کی گرکیوں، کھجوروں اور زیتون، زرد روغن ملتان کی چپاتی، سمندر دریا کی اکالیب تا خداؤں کی مہربانی، دریائے شور کی کہانی، جہازیوں کی چند اصطلاحوں اور بدوں کی چند بدسلوکیوں کے قصے، سبز عمامے، نیلی پوشاک اور رسول کی ڈاڑھی میں عمل اور عصائے حلی کو صحیح مخرج سے ادا کرنے کی دستاویز پر بمصداق ظن المومنین خیرا، معتبر، مستند، باضابطہ سرٹیفکیٹ یافتہ حاجی اور وہ حاجی جس کو حج اکبر نصیب ہو چکا ہو، مان رکھا تھا۔

اس نقب نے کچھ تو لوگوں کی لاپروائی اور ضعیف الاعتقادی اور بہت کچھ حاجی صاحب کی بہ نفس نفیس سعی بلیغ سے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ تمام نامی اسم گرامی کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ادب ناشناس زبان کا کاہل بدون اس مقدس شارح کے نام لیتا تو سننے والوں کو اس کی بے ادبی پر سخت تعجب برہمی و ناخوشی ہوتی اور خود بدولت تو مارے غصے کے جامۂ انسانیت سے باہر، نیلی پیلی آنکھیں بحر احمر کی مچھلیاں، ڈاڑھی کے بال وسبل کی مونچھیں، چہرہ آفتاب ملک عرب کی طرح تمتمایا ہوا، منہ پر بحر ظلمات کی طرح کف، بے پایاں مزاج میں مد و جزر کی بلاخیزی، جزبیب زیتونی لے کر بلا احرام و عمرہ اس بیچارے پر اس طرح جھپٹ پڑتے کہ صفا اور مروہ کے دوڑنے والے بھسنڈی رہ جاتے اور اگر سعی نہ تانگوں پر قدمی چال کے ہاتھوں اس تک دسترس نہ ہو سکتا تو رمی جمار میں تو کسی طرح تامل نہ فرماتے۔ اس تکلیف فرمائی اور اہتمام بلیغ کا سبب صرف ترفع ذاتی نہ تھا بلکہ اس غصے کا بخار یوں بھی ہوتا تھا، جو آپ کے والدین خصوصاً والدہ بزرگوار اور جناب مولوی بدرالدجی صاحب پر آتا تھا جنھوں نے پیدائش سے کئی سال قبل بمد پیشگی بطور ضمیر قبل الذکر آپ کا نام نامی ایسا رکھ چھوڑا تھا جس کی خرابی مادر شفقہ بڑی انا اور محلے کے گستاخ بازاری لونڈوں کے ہاتھوں ایسی ہوئی تھی کہ بدون لفظ حاجی لگائے نام لینا باتفاق جمہور نہایت گستاخی قرار دیا گیا تھا۔

نیچر نے بھی صورت شکل بنانے میں توجہ خاص مبذول رکھی تھی۔ مثل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکیدار کے سپرد نہ کی تھی، بلکہ دستِ خاص کی صنعت تھی۔ سر اگرچہ چودہ انچ کے دور سے بال دو بال ہی زائد تھا مگر گدی کی جانب بہت اونچا ماہولال کی چڑھائی کی طرح، پیشانی کی طرف ڈھلا پڑا۔ پیشانی پست پیچھے کی جانب جھکی، ابرو چھوٹے مگر بے حد بڑا درکا وا کے۔ آنکھوں پر مثل سائبان خس پوش۔ آگے کو ابھرے۔ بینی شاید قلتِ

فرصت سے ایسی مختصر بنی تھی کہ بال معدوم، نتھنے صرف تہ خانے کے روشندان، اوپر کا لب چھوٹا، نیچے کا جبڑا مع زنخداں آگے کو ابھرا، رخسارہ کی ہڈیاں بڑی، اوپر کے بہ نسبت نیچے کی پوانی بڑی، اس پر رسولی ڈاڑھی نور علیٰ نور، چہرے کو زیب و زینت بنائے ہوئے، پتلی گردن اس قدر نحیف زیب اقدس با ایں ہمہ اختصار آرزوؤں کے گنج شہیداں (یعنی سینہ) پر جاذب کش، بازو اور ہاتھ فی الجملہ و بلے، شانے ڈھیلے و انگلیاں لکھنؤ کی جیبی گنڈیاں، شکم مبارک کا بیضاوی دور سینے سے سوا، ٹانگیں چھوٹی موٹی، اوپر کا دھڑ بڑا دانہ خوری کی طرح پر قدمی چال۔ یوں تو حضرت کے انسان ہونے میں کسے محل شک ہو سکتا ہے؟ مگر مورخین حکمت اساس میں اختلاف تھا۔ منقولی بہ نظر اختصار از راہ انسانیت آپ کا سلسلۂ نسب بلا شائبہ و سلسلہ حضرت آدم سے ملاتے اور معقولی انسان اور بوزینہ کے سلسلۂ گسستہ کی ایک کڑی بتاتے مگر اس میں کلام نہیں کہ بروقت غیظ و غضب جب حاجی صاحب لب پان خوردہ و کھول کر کسی آفت زدہ پر چوٹ کرتے اس وقت ڈارون[1] کے مسئلے کی ضرور تصدیق ہو جاتی ۔۔۔

۔۔۔ فرائض مذہبی کے ادا و قضا کا نیا ہی کھاتہ کھولنا کچھ ضرور نہیں۔ ہاں کبھی کبھی اگر ایسی بلاؤں میں پھنستے تو صرف ایک کلی پر اکتفا کر کے بے وضو نماز ادا کر لی چلیے مہینوں کی چھٹی ہو گئی۔ تارک الصلوٰۃ کے الزام سے نیچے رمضان سے اور آپ سے باپ مارے کا بیر تھا۔

۔۔۔ آپ جانیے اس طرح مجسم ظرافت قدوم میمنت لزوم سے پبلک جلسے اور خوش طبع مزاجوں کے پرائیویٹ مجمع کیونکر خالی رہ سکتے تھے؟ بڑا ہی بے ضابطہ وہ جلسہ ہوتا جہاں حضرت رونق افروز نہ ہوتے اور انتہا کی پھیکی بے مزہ وہ محفل شمار کی جاتی جس میں آپ اپنی مضحک صورت و سیرت سے چہل پہل نہ پیدا کرتے۔ پریسیڈنٹ چیرمین اور اسپیکر آئیں یا نہ آئیں مگر حضرت ضرور صدر کرسی پر ڈٹے ہوں گے۔ ارباب نشاط، تماشائی، اہل محفل ہنوز جمع بھی نہ ہوئے، بلکہ ابھی فراش نگوڑے شامیانے کی ڈوریاں کھینچ رہے ہیں، فرش کی شکن نکال رہے ہیں اور آپ کی سواری ڈھمیکی کرتی، آپہنچی۔ پھر لطف یہ کہ دنیا کا کوئی مسئلہ معاملہ آپ بلا واقفیت و اجازت بچندیت بٹیر کی طرح بولنے کو موجود۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی تجویز پیش ہو اور آپ مخالفت یا کم سے کم ترمیم پیش نہ فرمائیں۔ محفل میں گانے والوں کو بے وقت چیزوں کی فرمائش سے زچ کر دیتے۔ صبح کا وقت اور شام کلیان کی فرمائش، دوپہر رات اور بھیرویں پہ اصرار ۔۔۔ اگر کبھی کوئی صدا پسند آئی تو مجرے کی تال ورنہ جب تک گانا سنتے سانگیے طبلچی پر آوازوں کی بوچھار فرماتے رہتے۔ گن ریا اتنے بڑے کہ عمر بھر آپ کو سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی۔ کے موضوع لڑکے ادراک کی لیاقت نہ آئی۔ راگ راگنی کس جانور کا نام ہے۔ اس پر نائک ہونے کا دعویٰ کہ امجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا آپ کے نزدیک طفل دبستان :۔۔۔"

لکچر

صبح گجردم جبکہ منادر روز یعنی شمس عالم افروز نے نقارۂ گیتی پر چوب شعاع لگائی اعلان کر دیا کہ ہر عاقل و فرزانہ، مجنون و دیوانہ حماقت گاہ دنیا کی سیر و تفریح کو نکلے ۔۔۔۔ اعلان ہو گیا خلق خدا کی ملک بادشاہ کا آج پانچ بجے شام کو جناب آرے بھاری القاب، مولوی قاضی، مفتی، منشی، سیاح جہانیاں جہاں گشت جہاندیدہ حاجی بلغ العلیٰ صاحب کی مدنی، ثم لکھنوی قحط کے متعلق لکچر موعود دیں گے۔ ہاں اور بہت سی باتیں دین و دنیا کے متعلق بتائیں چلو چلو، خود اور اپنے ساتھ دوست احباب، انڈوں، بچوں، چینگی پوٹوں صاحب سلامتیوں، جان پہچانیوں، ایرے غیرے بچکلیانیوں، اڑوسیوں پڑوسیوں، اہل محلہ، راہ چلتوں کو لیتے آؤ۔ پھر ایسا موقع عمر بھر نصیب نہ ہوگا۔ کرم دھم۔ کرم دھم:

---

[1] اس حکیم کی رائے ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہے۔

اس اعلانِ ظرافت کی آواز حاجی صاحب کے بڑے بڑے کانوں تک بھی کہیں پہنچ گئی . . . ضبط قرار نے راہ فرار لی ۔ ریشے ریشے میں سیاب داخل ہوا . . . اور آپ اچھے خاصے پُرکمل ہو گئے ۔

آج کئی گھنٹے منہ ہاتھ دھوتے سر ، لگانے ڈاڑھی میں کنگھی کرنے ، برزخ مقدس سنوارنے میں صرف فرمائے اور سامنے آئینہ رکھ کے عمامے سے بہت دیر تک گاؤ دریاں کیں ، باندھا کھولا ، پھر باندھا پھر کھولا ۔ مگر کسی طرح پیچوں کی چولیں نہیں بیٹھتیں جہاں چاہیئے وہاں آتا ہی نہیں . . . کئی دفعہ سر سے اتار تخت پر دے پٹکا آخر او نفر کرکے آئینہ جنا دیلہ پھر لے بیٹھے . . . عمامہ العجائز میں داغ جگر میں آخر جب بہت مجبور ہو گئے تو ناپ شتاب جس طرح بنا ارج برسر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد کہہ کر لپیٹیں کا مصدر گردانتے ہوئے سر سے بلا ٹلی ۔ ڈاڑھی پر کئی دفعہ ہاتھ پھیر کے جریب نہتوفی پر نیل لگایا ۔ رومال سے جوتے کی گرد جھاڑ کے بائیں کندھے پر ڈالا اور چل کھڑے ہوئے کرسیاں بچھیں کچھ بھی نہ چکی تھیں کہ آپ بطور ضمیر قبل الذکر جا پہنچے اور سیدھے کرسی صدر کی کرسی پر جائداد موروثی کی طرح قابض ہو گئے ۔ زہے قسمت ان کی جن کو اس روز زیارت نصیب ہوئی ایک چھاہو اگھڑا کرسی پر دھرا تھا زمین سے ایک ٹانگ دو اور دوسری انچ اٹھی ہوئی ۔ عمامہ بنر ہے یا شراب کے نگین پر گھاس کی ڈاٹ لگی ہے ۔ کرسی پر انسان ہے یا تپائی پر جلا ہوا تنہر ڈارا ۔ آپ کندے تولے ، کہنیاں میز پر رکھے آگو دار جھکے بندوق کے گھوڑے کی طرح ڈیڑھ پائے پر چڑھے مستعد بیٹھے ہیں ۔

. . . . جب . . . لوگ امید سے زیادہ آ چکے ۔ حضرت نے بلا اجازِ صدر و تقریرِ تمہیدی کرسی چھوڑی ، جریب ٹیکی ، عبا کے دامن آگے سے درست کیے . . . ریش متبرک پر مکرر سہ کرر ہاتھ پھیرا . . . رومال سے منہ پونچھا ، کھانسے کھنکھارے ، جماہی لی ، کئی دفعہ منہ کھولا اور بند کیا بالآخر یوں تقریر شروع کی ۔

. . . کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم (گھبراہٹ میں الرحمن الرحیم کی تخفیف بول دی) اما بعد کہتا ہے یہ حقیر پر تقصیر کیا نام کہ شیخ فردوسی گلستاں میں کہہ گئے ہیں ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ۔۔۔۔۔ کہ یاراں فراموش کردند عشق

(چیرز)

آج کل کیا نام کہ پانی نہیں برستا (سکوت پانچ منٹ) قحط پڑ گیا ہے بڑا افسوس ہے کچھ نہیں پیدا ہوا ، کھانے کو کہاں سے آئے ؟ بقول شیخ کے اونٹ کے منہ کو زیرا (چیرز) اس ملک سے برکت کی باتیں اٹھ گئیں ۔ نہ اگلی سی برساتیں ہوتی ہیں نہ گرمی ہوتی ہے نہ جاڑا ، اور نہ کیا نام کہ باپ کو بھائی بیٹے کو بہن ، دوست کو دوست نہیں پوچھتے ۔ (وقفہ تین منٹ) بھائیو غور کرو کون کون باتیں کہی جائیں ۔ تم سب سمجھدار ہو سمجھ جاؤ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ دوستی بڑی عمدہ بات ہے اور اس میں شک نہیں ایک حد تک سب کو کرنا چاہیئے زمانہ بڑا لگا ہے کیا نام کہ دوست برائیاں کرتے ہیں ۔ قسم ہے اللہ پاک کی ہمارے ملک عرب میں غلہ تو کم ہوتا ہے مگر دوستی زیادہ ہوتی ہے ۔ وہاں کی کس کس بات کی تعریف کی جائے ۔ شام کے مردے کو کب تک روئے (چیرز) کیا نام کہ بس دیکھ لیا سب کو ۔ اس ملک میں بڑی خرابیاں ہیں ۔ اسی سے دوستی و محبت ۔ کے نہ ہونے سے دل میں جنبش نہیں ہوتی ۔ لوگ دوست کو بنا کر مزے لیتے ہیں اور جلا جلا کر لطف اٹھاتے ہیں (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ میں آپ سے کون بات یہ ہے جو خیال کرنا چاہیئے ۔ کیا نام کہ (وقفہ پانچ منٹ) ہاں تو میں کیا کہتا تھا ؟ ہک آواز آگے آئی آیت ۔

.....حاجی - پھر کیا نام کہ اس میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
در بیشہ گماں مبر کہ خالیست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

کیا نام کہ دیکھئے وکیل بیرسٹر لوگ ایک ادنیٰ سی بات کو کتنا بڑھاتے ہیں اور مقدمہ والوں کا کتنا روپیہ برباد کرتے ہیں اور ایک بات اور کہوں -

آتا جاتا کچھ نہیں کرنے چلے تقریر ہیں ـــ مقدمہ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے اور صلاح دیدیتے ہیں بمقدمہ چوپٹ کرا دیتے ہیں بلکہ عرضی دعویٰ تک صحیح لکھنا نہیں جانتے - مال کا مال گیا بارے گال کا جیتے - خدا کی عنایت سے ایک دفعہ اس ناچیز حاجی کو اتفاق ہوا پر ایک صاحب نے ایسا ڈبویا کہ تھاہ نہ ملی - کیا نام کہ کتا چڑھے اونٹ کاٹے (وقفہ تین منٹ) پس یاروں ان سے دور بھاگو - یہ سب روپیہ کھا لیتے ہیں آدمی غلہ کہاں سے لے سب تو سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا کرتے کرتے خرچ ہو جاتا ہے (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے میں تمہارا رازق ہوں - وہ تو کھانے کو دے ہی گا سب کچھ کھانے کو پیدا کیا گیہوں، مٹر، جو، چنا، اناج اور میوہ ترکاری گھاس پھوس جنگل پہاڑ - دریا سمندر - بھیڑ بکرے چیتے، لومڑی، کتا، بلی - فبای آلاء ربکما تکذبان - تو کس کس بات سے انکار کر سکتے ہو شکر کرو کیا نام کہ شکر ـــ

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اور اس نے تمہارے واسطے کیا نام کہ گھر بار محل کھپریل چھپریل (چھپہ کھپریل) جھونپڑے - مچان بھٹ، یانی سب دیئے ہیں رہو اور اس کی نعمتوں پر شکر بھیجو (وقفہ لا متناہی)

کچھ تو اس معقول تقریر - زعفران زار کشمیر کے اثر اور کچھ طول طویل سکوت نے لوگ سمجھے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا - ایں ہیچ تمام شد کارِ حاجی نظام شد - کئی منٹ انتظار کر کے کئی جلد باز اٹھ کھڑے ہوئے اور باوجود حاجی صاحب کی "ہاں ہاں" کے جلسہ خود ہی برخاست ہو گیا - کرسیوں بنچوں کی چرخ چوں سے حاجی کو وحشت لوگوں کے اس طرح کھڑے ہونے پر بے حد نفرت ہوئی، خیالات میں پراگندگی ہذیان، زبان میں میں لکنت آئی اور بڑی بات یہ کہ دو ایک نے یہ صدا سنائی حضرت اب تکلیف نہ فرمائیے - جلسہ برخاست ہو گیا، حاجی نے پھر ایک دفعہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا - صرۂ دماغ کے کونے سے ٹٹولی ٹٹال کر ایک آدھ ریزگی نکالی - مگر نقادان سخن و صیرفیان اپیچ فہم و فراست کے دیوالہ نکل جانے کے خوف سے دکان بڑھا چکے تھے - مجبوراً ناچار سکۂ قلب کی طرح واپس دل ہی میں رکھ لی اور داہنے بائیں نیچی نظروں سے دیکھتے رومال سے منہ پونچھتے مجمع کو چیرتے نہایت ناخوش و برہم جیتھڑوں سے جان سے خفا اس طرح رفو چکر ہوئے کہ دوست احباب نیاز مندسب تلاش ہی کرتے رہے -

چچا چھکن نے تصویر ٹانگی

امتیاز علی تاج

چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمے کیا لے لیتے ہیں، گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آ بے لونڈے، جا بے لونڈے، یہ کیجیو، وہ دیجیو۔ گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جاؤ، پرسوں پرلے روز کا ذکر ہے، دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا۔ اس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی۔ کل شام کہیں چچی کی نظر اس پر پڑی۔ بولیں: "چھٹن کے ابا، تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھہرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟"

"ٹانگتا اور کون، میں خود ٹانگوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے۔ رہنے دو، میں ابھی سب کچھ خود ہی کیے لیتا ہوں۔"

کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اتار، چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا: "بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آ۔" ادھر وہ دروازے سے نکلا، ادھر مودے سے کہا: "مودے! مودے! جانا امامی کے پیچھے۔ کہیو تین تین انچ کی ہوں میخیں۔ بھاگ کر جا۔ جا لیجیو اسے راستے ہی میں۔" لیجیے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی اور اب آئی گھر بھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا: "او ننھے! جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا۔ بنو! جاؤ اپنے بستے میں سے چپٹی نکال لاؤ۔ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہو گی ہم کو۔ ارے بھئی للو! ذرا تم جا کر کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں آ کر لگا دے۔ اور دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹن بیٹے! چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر۔ کہنا ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے۔ اور کہیو، وہ جو ہے نا آپ کے پاس، کیا نام ہے اس کا۔ اے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ ٹلول۔ اللہ جانے کیا تھا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا۔ تو یوں کہہ دیجیو کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے، وہ ذرا دے دیجیے، تصویر ٹانگنی ہے۔ جائیو میرے بیٹے! پر دیکھنا سلام ضرور کرنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ اچھا؟ .... پر تم کہاں چل دیے للو؟ کہا جو ہے ذرا سیڑھی ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ مودا مل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اے لو! سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟ جانا میرا بھائی جلدی سے۔ ہوا کی طرح جا اور دیکھیو بس گز سوا گز ہو سُتلی۔ نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیے ہے۔ لے آیا؟ او ودو! ودو کہاں گیا؟ ودو! میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے۔ یوں نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ۔ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا۔"

لیجیے صاحب خدا خدا کر کے تصویر ٹانگنے کا وقت آیا، مگر ہونی شدنی، چچا اسے اٹھا کر ذرا وزن کر رہے تھے کہ ہاتھ سے چھوٹ

گئی۔ کرکر شیشہ چور چور ہوگیا۔ "یہی ہے!" کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وقت کی بات انگلی میں شیشہ چبھ گیا۔ خون کی تلی بندھ گئی۔ تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا شیروانی کی جیب میں۔ شیروانی اتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں۔ کبھی اس سے ٹکر کھاتے ہیں کبھی اُس سے۔ "سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈ کر نکال لے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔ اور کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اتار کر رکھی ہے۔ بھئی بڑے......"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہتے ہیں "اسے بھئی رہنے دینا۔ مل گئی شیروانی۔ ڈھونڈ لی ہم نے۔ تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا۔"

آدھے گھنٹے تک انگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا اور تمام قصے طے کرنے پر دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے، سیڑھی آئی، چوکی آئی، شمع لائی گئی۔ چچا میاں سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں اور گھر بھر زیریں (ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) یہ بار ٹکرے کی صورت میں اوپر بیٹھے ہوئے کیل کانٹے سے لیس کھڑے ہیں۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی تو چچا میاں نے اس پر قدم رکھا۔ اوپر پہنچے۔ ایک نے کرسی پر چڑھ کر انہیں کیلیں بڑھائیں، ایک قبول کر لی۔ دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا۔ سنبھالا ہی تھا کہ کیل ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ کھسیانی آواز میں بولے "اے لو۔ اب کم بخت کیل چھوٹ کر گر پڑی! دیکھنا کہاں گئی؟"

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر کیل تلاش کر رہے ہیں اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں۔ "ملی؟ ارے کم بختو ڈھونڈی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پر کھڑا کھڑا سوکھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو اندھو!"

یہ سن کر سب کی جان میں جان آتی ہے تو پہلی کیل ہی مل جاتی ہے۔ اب کیل چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ! اُلو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا؟"

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا اور کیل گاڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ بھول بیٹھے ہیں کہ ماپنے کے بعد کیل گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا۔ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ شاید نشان نظر آ جائے۔ ہر ایک کو الگ الگ نشان کھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری اُلو گدھا کہہ کر کرسی سے اُتر جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ آخر پھر چھٹی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پینتیس انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ بارہ اور بارہ اور کے انچ اور؟ بچوں کو زبانی حساب کا سوال ملا۔ باآواز بلند حل کرنا شروع کیا اور جواب نکالا تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ۔ ایک نے دوسرے کو غلط بتایا۔ اسی تُو تُو مَیں مَیں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی۔

اب کے چچا چھٹی سے نہیں ماپنے، ستلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر پینتالیس درجے کا زاویہ بنا کر ستلی کا سرا

کونے تک پہنچانے کی کوشش میں ہیں کہ کیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں کہ اسی کوشش میں زمین پر آ رہتے ہیں۔ کونے میں ستار رکھا تھا۔ اس کے تمام تار چچا جان کے بوجھ سے یک لخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

اب چچا کی زبان سے جو منجھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سننے کے قابل ہوتے ہیں مگر چچی روک دیتی ہیں اور کہتی ہیں: "اپنی عمر کا نہیں تو ان بچوں ہی کا خیال کرو۔"

بہت دشواری کے بعد چچا جان از سر نو میخ گاڑنے کی جگہ متعین کرتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے اس جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھی ہاتھ کے انگوٹھے پر۔ آپ "سی" کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نیچے گرتا ہے کسی کے پاؤں پر۔ ہائے ہائے اور اف اوہ اور مار ڈالا شروع ہو جاتی ہے۔

چچی جل بھن کر کہتی ہیں: "یوں میخ گاڑنا ہوا کرے تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دے دیا کیجیے۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں۔ اور نہیں تو۔"

چچا نادم ہو کر جواب دیتے ہیں: "یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے۔ یعنی ہو گیا جس پر یہ طعنے۔ بے جا رہے ہیں؟ بھلا صاحب کان ہوئے۔ آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کریں گے۔"

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوتی۔ میخ پر دوسری چوٹ جو پڑتی تو اس جگہ کا پلستر نرم تھا۔ پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے دیوار سے ٹکرا کے گر جاتے۔ اگر غیرت والی ہوتی تو چپک کر رہ جاتی۔

اس کے بعد از سر نو جستجو اور رسی تلاش کی گئی اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی اور کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی۔ وہ بھی کیسی؟ ٹیڑھی بینگی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پہ آئی کہ اب سر پہ آئی۔ چاروں طرف گز گز بھر پلستر کی یہ حالت گویا چاند ماری ہوتی رہی ہے۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور، نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آخری سیڑھی پر سے دھم سے جو اترتے ہیں تو کہاری کی بچی کے پاؤں پہ پاؤں۔ غریب کے ڈبل لگی۔ تڑپ ہی تو اٹھی۔ چچا اس کی چیخ سن کر ذرا سراسیمہ تو ہوئے مگر پل بھر میں داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر بولے "اتنی سی بات تھی لگ بھی گئی۔ لوگ اس کے لیے مستری بلوایا کرتے ہیں۔"

مرزا جی

ایم اسلم

مرزا جی جھونپڑے میں بیٹھے محلوں کا خواب دیکھا کرتے اور گنج قارون کی تمنا دل میں لئے رہتے۔ مدت سے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ بہت دولت کماتے ہیں۔ بس! ہر وقت اسی دھن میں لگے رہتے کہ کسی طرح بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہو جائیں۔ آخر ایک دوست کے توسل سے یہ آرزو پوری ہو ہی گئی۔ اسی روز سے ہوائی قلعے تعمیر ہونے شروع ہو گئے۔ پہلے ماہ کی آمدنی کا بجٹ تیار ہونے لگا۔ دن بھر بیگم سے یہی بحث رہتی۔ کبھی کبھی دونوں میں تکرار بھی ہو جاتی اور کبھی اڑوس پڑوس والوں کو بھی دخل دینا پڑتا۔

کمپنی والوں نے تمام نشیب و فراز سمجھا دیئے تھے کہ کامیابی کے لئے دوسرے سے کچھ اس قسم کی باتیں کرنی چاہئیں کہ وہ آسانی سے مائل ہو سکے۔ سوچنے لگے کہ سب سے پہلے کس پر کمند ڈالیں۔ اتفاق سے ایک سوداگر سے کچھ علیک سلیک تھی۔ لوگ انہیں خانصاحب کہتے تھے۔ چنانچہ قرعہ فال انہیں کے نام پڑا۔ صبح ہوتے ہی اس کے ہاں جا دھمکے۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا۔

"سنا ہے آپ بیمہ ایجنٹ بن گئے کہئے کچھ کامیابی بھی ہوئی؟"

آپ مسکرا کر بولے۔

"آپ جانتے ہیں ہم ٹھہرے سپاہی لوگ یہ قلم گھسیٹوں کے کام بھلا ہم کیا جانیں۔ کمپنی کے منیجر صاحب بہت روز سے مجبور کر رہے تھے ان کی بات رد نہ کر سکے۔ آخر ماننا ہی پڑا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے" خانصاحب نے کہا۔ "وقت بھی کٹے گا اور روپے بھی ملیں گے۔"

"اسی خیال سے تو آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ارشاد؟"

"گو بات کہنے کی تو نہیں لیکن ذاتی تعلقات کے پیش نظر کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔" آپ نے ذرا مسکرا کر اور دو ایک بار پلکیں جھکا کر کہا

"ہاں! ہاں کہئے؟"

"گستاخی معاف! ہم کئی روز سے آپ کو کچھ مضمحل سا دیکھ رہے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی موذی مرض اندر ہی اندر گھن کی طرح آپ کو کھائے جا رہا ہے ....؟"

"ہمیں کیا ہے؟" خانصاحب تڑک کر بولے "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میری صحت تو بہت اچھی ہے؟"

"معاف فرمائیے!" آپ بولے "یہ محض احساس کی بات ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قدرت نے آپ کو طبیعت پر جبر کی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ لیکن نیازمندوں کی نگاہ سے کوئی بات اوجھل نہیں رہ سکتی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ ہزار چھپائیں۔ لاکھ ہنستے چہکتے نظر آئیں۔ لیکن چہرہ کسی وقت دل کے رازوں کا انکشاف بھی کر دیا کرتا ہے۔ ہم اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ ہاں جب آپ کے پیارے پیارے بچوں کا خیال آتا ہے تو اس وقت جو ہم پر گزرتی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں........؟"

"اجی حضرت!" خانصاحب نے مسکرا کر پوچھا "کیا ہوا ہمارے بچوں کو؟"

"قبلہ!" آپ نے جواب دیا "ہمیں بچوں کا فکر کیوں نہ ہو۔ ہونی اور شدنی تو ہر وقت ساتھ لگی ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ نصیب اعدا اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر ان معصوموں کا کیا ہوگا۔ زمانے کا رنگ بھی آپ سے کچھ چھپا نہیں۔ سگوں کی آنکھیں پھرتے دیر نہیں لگتی کہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کے ہاں دولت کا مینہ برستا ہے۔ لیکن یہ کرامت تو ساری آپ ہی کی ہے۔ پھر دولت تو ڈھلتی چھاؤں ہے۔ اس کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں کہ ہمیشہ قیامت تک آپ کی ہی دہلیز پکڑے بیٹھی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں فرماتے ہیں کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت۔ اور اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں کہ موت کسی کو اطلاع دے کر نہیں آتی۔ کوئی آج گیا کوئی کل۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ آپ بنک میں روپیہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن بنک بھی جب چاہے دیوالیہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کروا لیں۔ آپ کے مرنے کے بعد پسماندگان کو ایک معقول رقم مل جائے گی اور آپ کے بچھڑ جانے کا جو صدمہ انھیں ہوگا اس کی کچھ نہ کچھ تلافی بھی ہو جائے گی۔"

"بہت اچھا" خانصاحب نے پیچھا چھڑانے کو کہا "سوچوں گا؟"

"لاحول ولا قوۃ!" مرزا جی بولے "کب سوچیں گے آپ؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہے۔ اور گورستان والوں کی چاندی ہو رہی ہے۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ کاروباری آدمی ہیں۔ یہ سودا بھی کر دیکھئے.......؟"

"سودا کیسا؟" خان صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔

"اجی واہ!" مرزا جی نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے بہتر سودا اور کیا ہوگا۔ بلیس پچیس ہزار کا زندگی کا بیمہ کروا لیں۔ شاید دو ایک قسطوں کے بعد ہی وارے نیارے ہو جائیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اجی مطلب تو بالکل صاف ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کل حضرت ملک الموت علیہ السلام جھاڑو پکڑے بیٹھے ہیں۔ کون جانے جو آپ بھی کوڑے کرکٹ کی طرح لپیٹ میں آ جائیں؟" مرزا جی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

خان صاحب نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور مرزا صاحب نے کہا۔

"موسم کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے تو ہم یہ کہیں گے کہ آپ بچوں کی زندگی کا بیمہ کروا ڈالیں۔ آپ جانتے ہیں بچے کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط نہیں کرتے۔ آجکل جس نے کھانے پینے میں بے احتیاطی کی وہاں کوچ کا ڈنکا بھی بجنے لگا۔ آپ تو ماشاء اللہ بڑے سیانے آدمی ہیں۔ اگر آپ سوچیں تو یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ لیکن اگر ایک دو کی آہی گئی تو وہ امر ربی ہے کسی کی مجال نہیں کہ دم مارے۔ اگر بچوں کی زندگی کا بیمہ ہو چکا ہوگا تو گھر بیٹھے آپ کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی جو تجارت سے سال بھر میں بھی نہ ملے۔ بچوں کا کیا ہے۔ بچے تو خدا اور بھی دیدیگا۔ دیکھئے حضرت! یہ باتیں آپ کے سوچنے کی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سوداگری میں بھی جھمک ہوتی ہے اور

آپ کو خدا نے جو عروج عطا کیا ہے آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ساری برادری آپ سے جلتی ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ دوکان اور گھر اور گھر میں جو مال اسباب ہے اس کا بھی بیمہ کروا لیں۔ کون جانے! کسی وقت کوئی حاسد رات کے اندھیرے میں چنگاری ہی ڈال جائے اور سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے۔ لیکن اگر بیمہ کروا رکھا ہو گا تو ایک بار چھوڑ ہزار بار جلے۔ اجی روز جلے۔ آپ کی پیزار کو۔ اصل سے زیادہ رقم تو آپ کو مل ہی جائے گی۔ حضرت! آج دنیا میں نہ کوئی قرابت داری کو دیکھتا ہے۔ نہ کسی کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ آج پردھان وہ ہے جس کے پاس دولت ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ عقلمند کو بس اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

اس عارفانہ تقریر کا اثر جو خانصاحب پر ہوا ہو گا۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

قاضی جی

شوکت تھانوی

(دروازہ پر دستک)

اجمل:- "جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟"

بیوی:- "کون اجمل بھائی؟ میں آ رہی ہوں دروازہ کھولنے۔"

اجمل:- "(داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ کہئے کیسے مزاج ہیں۔ دیر سے آیا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟"

بیوی:- "کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو ہوا کیا ہے اور کس طرح۔ اب یہ دھن سوار ہوئی ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے۔"

اجمل:- "فلم کمپنی پر قبضہ؟ ان کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دم کدھر۔"

بیوی:- "یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر میں شاید ہی دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دعویٰ یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دنیا ہی لوٹ لیں گے۔"

اجمل:- "مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟"

بیوی:- "اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماری کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑوں گا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔"

اجمل:- "اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟"

بیوی:- "جاتے کہاں، اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ جاؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آ جائے۔"

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی:- "آہا۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔ نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں۔ بلکہ اب یوں سمجھ لو کہ یا تو ہم فرعون بن گئے ورنہ جولاہے ہی رہے۔ وہاں سارے ہی ستیا ناس سہی مگر دوست پھر اٹھ گئے وہ ترکیب تمہارے ہم چشموں کے ذہن میں آئی ہے قسم خدا کی۔ نہ کسی کان سنی نہ سننے کی کان۔"

اجمل:- "اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے۔"

بیوی:- "فلم کمپنی کھل رہی ہے۔"

قاضی جی:- "کھل رہی ہے یا یہ سمجھو کہ بس کھل گئی۔ خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے بیٹی۔ یہ سونا بنانا ہے۔ دیکھ لینا یہ دلدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے موٹریں اڑاتے پھر رہے ہوں گے۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی کہ زندگی گویا یونہی برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل:- "یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ کو اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ؟"

قاضی جی:۔ "بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیز من بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں دراصل تھا ہی اس کام کے لئے آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم؛"

اجمل:۔ "یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ؟"

قاضی جی:۔ "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفراللہ؛"

اجمل:۔ "استغفراللہ؛"

قاضی جی:۔ "نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رخ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں یا میں چغد ہوں یا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بجا فخر کرنا چاہئے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے؛"

بیوی:۔ "میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لئے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے؟"

قاضی جی:۔ "ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت؟ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو۔ جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس بامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق؛"

اجمل:۔ "اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے؟"

قاضی جی:۔ "یہی تو خوبی ہے۔ اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی ہے جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک بڑا سا ٹانگہ ہے۔ جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گزر رہا ہے اور تانگے والا گاتا جا رہا ہے۔

لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فرفر جائے

میرا تانگہ فرفر جائے   میرا گھوڑا ہنہنا کھائے

دم لہرائے   چال دکھائے

لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فرفر جائے

پھول سی ہلکی ہلکی سواری   ہیں والی ری

بیوی:۔ "(ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے؛"

قاضی جی:۔ "لاحول ولاقوۃ۔ اگر اس طرح سے گی تو میں سنا چکا۔ سمجھنے کی تمیز ہے نہیں اور بھئی اللہ اور ارے اللہ شروع کر دیا تم کیا جانو فلم کے گانے اسی طرح ہوتے ہیں۔ یہی گانا جب سازوں کے ساتھ چلتی ہوئی دھن کی شکل میں آئے گا تو دیکھئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے؟"

اجمل:۔ "بھائی ذرا سی بیٹھے بیٹھے مجھے تو بیحد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں؟"

قاضی جی: ۔ "ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دم بخود رہ جاؤ گے سن کر۔ خیر گانوں جانے دو ان کا لطف تو سازوں ہی پر آئیگا مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا ہوا جا رہا ہے کہ ایک موٹر بہک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور اپنی عالیشان کوٹھی میں لے آتا ہے اور تیمارداری کرتا ہے وہاں صاحب ایک واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہوش آ جاتا ہے۔"

بیوی: ۔ "(ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے۔"

قاضی جی: ۔ "خیر خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے اگر خدا کے لئے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو۔ یہ بڑا پر لطف موقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے۔ الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا۔"

بیوی: ۔ "تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت۔"

قاضی جی: ۔ "لیجئے یہ ہوئی بے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہو گا مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا یعنی بھینس بولی گویا بھینس نے کوئی معقول سا جواب دیدیا خیر تم سے تو مجھے اسی قسم کی توقع تھی مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری سے کہدیں کہ کس قیامت کی روانی ہے اس قدر تالیاں بجیں گی اس مقام پر کہ تم ہی صد فیصد اندازہ کر سکو کہ خدا مجھ کو نظر بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل: ۔ "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی جی: ۔ "نہ سہی۔ ارے بھئی سنی کیا ہے تو نہ سہی اب کریں گے اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کہ دنیا منہ دیکھ کر رہ جائے گی اور فرض کر لو کہ نصیب دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی: ۔ "ہاں اور کیا تمہارے لئے تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی: ۔ "لیجئے یہ آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا مگر معلوم نہیں پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے۔ یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہو گیا اور اگر پاکستان کو آپ میرے لئے کوئی دھونس سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجئے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔"

اجمل: ۔ "پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

قاضی جی: ۔ "فرمائیے فرمائیے۔ آپ کے لئے تو ضروری ہے کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں بہرحال آپ کے جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمائیے۔ میں سننے کیلئے پیدا ہوا ہوں۔ وہ۔ وہ ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

اجمل: ۔ "قاضی جی بھائی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسا کام کیجئے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو۔"

بیوی: "اور کیا کمانا ہی چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔"

قاضی جی: "خدا کے لئے کبھی تو مجھ نادار سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو یقین آئے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں۔ میری رفیقہ حیات ہیں۔ میری شریک غم ہیں تو اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرتی ہیں وہ نہایت مہمل جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتایئے میں تھانیداری کیسے کر سکتا ہوں۔"

بیوی: "اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے۔"

قاضی جی: "ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا عقل کی پوٹ بیوی ملی ہے ہم کو بھی یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ بنفشہ انسان کی گردے میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں۔"

بیوی: "بس ٹھیک ہے۔ اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر آخر فلم کمپنی کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔"

قاضی جی: "یہ تو صاحب قائل کرنے کا نہایت ہی بیہودہ طریقہ ہے کہ مثالیں دے کر قائل کیا جائے مگر تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ گانے تیار کئے ہیں یا نہیں۔"

بیوی: "خدا کے لئے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

قاضی جی: "کیا مطلب یعنی اس قدر لغو ہیں اس قدر مہمل ہیں جب تم اپنی حقیقی۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ہاتھ ـــ نہ ـــ نہ ـــ وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دستِ خویشتن فریاد۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کر دوں تو تھوک دیجئے میری اوقات پر۔"

(غصے میں چلے جاتے ہیں)

ہے بقول بعض ادویہ کا اشتہار دینے والوں کے "تہذیب مانع ہے"۔

بادشاہ اسلئے یا وکی زمانہ سے مردانے میں آئے اور وزیر با تدبیر سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اس نے کچھ دیر تامل کیا، پھر کہا جہاں پناہ! مجھے بارش کا پانی پینے کا بہت شوق ہے، اپنے گھر کے پرنالے کے نیچے دو گھڑے بھرے رکھے ہیں، ایک حضور منگوا کر ڈال دیں، ایک میں ڈال لوں۔ پھر ہم بھی ان ہی سب کی طرح ہوجائیں گے۔ پھر ہمیں کوئی بھی دیوانہ نظر نہ آئے گا۔ ایک حمام میں سب ننگے۔

بعض وقت یہی جی میں آتا ہے کہ چھوڑ دو سارے دھندے۔ قصر حکومت کی دہلیز پر جبہ سائی کرو اور گورنری نہ سہی تو ایگزیکیٹو کونسلری ہی سہی اور وہ بھی نہیں تو ایک منسٹری ہی سے مرو۔

ہندو مسلم اتحاد کیسا؟ تم بھی سب پھاگن کے ہوری کھیلو، گالیاں یوں ہی کھاتے ہو خود بھی دینے لگو، کیسی کانگرس اور کس کا سوراج، کیسا چرخہ اور کہاں کا کھدر، سب پر لعنت بھیجو۔

(۳۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

آج مسز بسنٹ دولت مشترکہ ہند کے قانون کا مسودہ لے کر ولایت گئی ہیں جس کا حشر معلوم ہے کہ کیا ہوگا؟ اسے ایسے شخص کے سپرد کیا جائے گا جو پارلیمنٹ کے مسودات قانون کی غلطیاں درست کرتا ہے۔ اس کی مثال تو بعینہٖ اس شخص کی سی ہے جو راستہ میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا، لوگوں نے پوچھا کیا تلاش کرتے ہو؟ کہا کہ بھائی ایک نعل مل گیا ہے، تین اور اسی طرح مل جائیں تو گھوڑا خرید لوں۔

گویا مسودہ قانون میں صرف نحو کی غلطیاں نہ رہیں گی تو مسودہ ضرور فوراً پاس ہوجائے گا۔

(۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

لکھنؤ کے اشتہار میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا نام بھی درج ہے۔ اللہ اللہ اس پھلواری میں بھی مدت کے بعد پھول آئے ہیں۔

(۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں اس صوبہ کا نام صوبجات متحدہ رکھا گیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اس سے زیادہ صوبجات غیر متحدہ کے نام کا کوئی صوبہ پنجاب کے سوا مستحق نہ ہوگا۔

(یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

یورپ پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور عام خیال ہے کہ ہر مسلمان کا گھر سو دو سو بیویوں اور باندیوں کی حرم سرا ہے۔ اس لئے یورپ کی شوقین لڑکیاں جن کی طبیعت بوس و کنار کو سینما میں دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے، اس نئی دنیا کے حسن و عشق کی کولمبس بننا چاہتی ہے جس کا نام مشرق ہے اور اس نئے راستہ کی واسکوڈاگاما ہونے کی خواہش مند ہیں جو "راس امید" سے ہو کر ایک مسافر کو مشرق تک پہنچاتا ہے۔

(۲۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں جن کا اصول صحافت یہ ہے کہ "ایک پیسہ لوں گا ایک گالی دوں گا" یا جن کی آمدنی کا ذریعہ ان کے

گندے اشتہارات ہیں جن کے پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی بہتوں کا بھلا ہوتا رہتا ہے

مولانا شوکت علی راقم الحروف کے بڑے بھائی ہیں، لیکن اگر بعض مہربان دوستوں کے اس خیال کو مان لیا جائے تو راقم الحروف ان چند ہستیوں میں سے ہے جو پوپ (ایک انگریزی شاعر) کے قول کے مطابق "ترکوں کی طرح کسی بھائی کو تخت کے نزدیک نہیں آنے دیتیں"

راقم الحروف اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو کتنا ہی چھوٹا بنانا چاہے تاہم ان کی ہستی اس قدر بڑی ہے کہ کسی طرح وہ ایک معمولی انسان کے درجہ پر نہیں آ سکتے اور یہ خیال جس قدر ان کے جسم کے متعلق صحیح ہے اس سے کچھ زیادہ ان کی روح کے متعلق درست ہے۔

ایک ایسا شخص جو چار من پکنے کی لاش کو روزانہ چھ چھ مرتبہ دفتر خلافت کے سہ منزلہ بالاخانہ پر پہنچا کرے یا اتارا کرے اور روزانہ صدہا دو کانوں کا چکر لگایا کرے اور دو دو آنہ (پیسہ) دوکان سے لے جاکر (یاتھیں وصولی) دوکان تبھیلا رہے۔ یقیناً ایک متحرک پہاڑ ہے اور یہ ان کی قوت ہے جو اس پہاڑ کو متحرک کرتی ہے جس وقت سب مایوس ہو جاتے ہیں، اس وقت تنہا یہ ایک ہستی ہے جو ہم سب کی مردہ امیدوں میں از سر نو جان ڈالا کرتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ ہم سب نے خلافت کے لئے کام کیا ہے لیکن اگر یہ معاملہ کی تہ میں سچائی تلاش کی جائے تو جس طرح فرانس کے خود مختار بادشاہ لوئی چہاردہم نے اپنے قانونی مجسٹریٹ سے جو "قوانین سلطنت" کا بار بار ذکر کرتا تھا کہہ دیا کہ "سلطنت! وہ تو میری ذات ہے" اسی طرح شوکت بھی کہہ سکتے ہیں کہ "یہ کام تو تنہا میں نے کیا ہے" کیونکہ تنظیم خلافت کی ابتدا بھی وہی تھے اور انتہا بھی وہی ہیں۔

فی الحقیقت انہی نے اس تحریک کو شروع کیا اور آج بھی جب کہ سیٹھ چھوٹانی کی بددیانتی اور شردھی و سنگھٹن کا مسلمانوں پر اثر دیکھ کر پس پردہ کام کرنے والے ہاتھ سے بے خبر لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ تحریک خلافت کا خاتمہ قریب آ لگا ہے۔ شوکت نے ہی تنہا اژدر ہین کی طرح اس تمام وزن کو اپنے مضبوط اور خم نہ کھانے والے بازوؤں پر سنبھال رکھا ہے وہ خواہ کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر ایک مضبوط اور صندی فرزند رہیں اور ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر لوگوں کو لوٹنے کا راز کچھ انہیں کو معلوم ہو۔

(۱۴ر اگست ۱۹۲۵ء)

آج باجہ کے متعلق باجہ سے بھی بلند آواز ان مسلمانوں کی ہوتی ہے جو مشکل سے کبھی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے ہوں گے اور گئوکشی کے لئے بعض اوقات وہی آج سب سے زیادہ جوش کا اظہار کرتے ہیں جو کل تک ہمارے ساتھ ولایت میں خوب بیف (گائے کا گوشت) اڑایا کرتے تھے۔

(۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

ظرافت

ظفر علی خاں

اہلِ آئرلینڈ اپنی ظرافت و بذلہ سنجی کے لیے بڑے شہرۂ آفاق ہیں اور یہ ملکہ ان میں خداداد ہے۔ لکھے پڑھے تو ایک طرف رہے وہاں کے اجڈ گنوار بھی بے ساختہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سن کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ دلکشا مذاق وہی ہے جس میں چشمۂ صافی کا سا قدرتی ابال موجود ہو جس کا رنگ قندیل کی طرح خود بخود جھلکے، بناوٹ آئی اور اس کی سب لطافت جاتی رہی۔

پچھلے دنوں آئرلینڈ کی ایک میونسپل کمیٹی نے حسبِ ذیل رزولیوشن پاس کیا تھا جس کا لطف لائقِ شنید و قابلِ داد ہے۔

"حکم ہوا کہ ایک نیا جیل خانہ بنایا جائے اور اس کے لئے تمام مسالہ پرانے جیل خانہ کے ملبے سے حاصل کیا جائے لیکن جب تک اس نئے محبس کی عمارت تیار نہ ہو لے پرانے محبس کی عمارت بدستور قیدیوں کی سکونت کے لئے کام میں لائی جاتی رہے۔"

یہ تو میونسپل کمیٹی کے روشن خیال اراکین کا لطیفہ تھا۔ اب ایک گنوار کی پھبتی کی بانگی ملاحظہ ہو جو اس نے ایک قہوہ خانہ میں حاضرین کی پہیلیاں دہری کرنے کے لیے چھوڑی تھی۔

قہوہ خانہ میں چند امریکی گویے بیٹھے ہوئے تھے۔ دورِ شراب چل رہا تھا۔ ایک گویے نے، جو لافزنی کے فن میں یگانۂ روزگار تھا، باتوں باتوں میں اپنے مخاطب یاد دلایا کہ جب پہلی دفعہ میں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی رسیلی تانیں اڑانی شروع کیں تو حاضرین پر وجد کا ایک عالم طاری ہو گیا اور انہوں نے مجھ پر اتنے گلدستے پھینکے اور اس قدر پھول برسائے کہ میں اس طرح گل میں دب گیا۔ اور اگلے دن اگر میں چاہتا تو گل فروش کا ایک کارخانہ انہیں پھولوں کے ڈھیر سے کھول دیتا۔

ایک آئرش گنوار سے جو اس میز پر بیٹھا ہوا پرٹ کا مضمون اڑا رہا تھا امریکن گویے کی یہ شیخی نہ سنی گئی، اور وہ بے تحاشا بول اٹھا کہ اس کمال میں تو میں تم سے کہیں بڑھا ہوا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے کھلے میدان میں مجلس کو گانا سنایا تو اس کے صلے میں انہوں نے مجھے ایک دو منزلہ مکان دے دیا۔

امریکن: سڑی تو نہیں ہو گئے ہو۔ دو منزلہ مکان دے دیا اور گانے کے صلے میں، کیا لغویات ہے!

حیرت کدۂ لاہور

پرنسپل ہنری مارٹن کے محیر العقول کارنامے
انجمن حمایت اسلام کا پُراسرار سکوت

دلم بہ پاکیٔ دامان غنچہ می لرزد   کہ بلبلان ہمہ مستند و باغبان خاموش

طوسی کی روح کو مژدہ ہو کہ لاہور بیجاپور ہوگیا اور دنیا جہان کے بربط اور چنگ اور رباب اور ارغنون ابراہیم عادل شاہ کے پردۂ سوز و سرود سے منتقل ہو کر اسلامی کالج لاہور میں جمع ہو گئے ——

مطرب خوشنوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

سنتے ہیں کہ غنا نبیتِ نفاق ہے۔ کم از کم اسلامی روایات تو ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ رات دن کا تجربہ اگر موسیقی کے نفاق اندوز ہونے پر شاہد نہ ہو تو کم از کم اس بات کا تو گواہ ہے کہ جہاں یا جا بجا سُریلے نغموں کی زیر و بم سے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ مطرب کی صدائے سامعہ نواز صاعقہ ریزِ محفل ہوئی تو بیت کدۂ دل کے چھوٹے بڑے تمام جذبات رقص والہانہ ہو گئے۔ باور نہ آئے تو ایک دن گیٹی تھیٹر میں جا دیکھئے۔ رات بھر جناب معلم الملکوت ہمرکاب نہ رہیں تو سہی۔

لیکن کہاں کا اسلام اور کیسی انسانیت۔ سنت بالائے طاق۔ کتاب حوالۂ جزدان۔ تجربہ و مشاہدہ پا در ہوا۔ یہاں تو اصرار ہے کہ مسلمانوں کے اس دار العلم میں نصاب تعلیم جہاں فزکس اور کیمسٹری، تاریخ اور ریاضی، ادب اور فلسفہ سے مزین ہو، وہاں اس کا طغرائے منشور قوالی و طبلہ نوازی بھی ہو کہ عمر خیام اور محقق دوانی کے ساتھ ہارمونیم نواز ریزہ کا ہونا بھی مثلث ارتقائے مارٹنی کا زاویۂ الراس ہے۔

جناب مارٹن صاحب کے ایک حاشیہ نشین پیرزادہ عبدالرشید صاحب ایم ملک التفاتاتِ زمانہ سے تین ہفتہ اور محض تین ہفتہ کے لئے ریواز ہوسٹل کے ہنگامی منتظم مقرر کر دئیے جاتے ہیں۔ دنیا نے تادیب و تخلق میں جو عظیم الشان کارنامے جناب پیرزادہ صاحب کی قوت قدسیہ سے اس عرض مدت میں سرمایہ اندوز بطون و ظہور ہوئے ہوں گے ان کی تفصیل سے تو ہم آشنا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ کالج کے طلباء ابتدائی کے چند طلبہ نے ان کارناموں کی یادگار میں آپ کو ایک سپاسنامہ پیش کرنا چاہا اور از بس کہ سپاسنامہ کی تمنیت اس سلسلے سنانے والے کفش زریں کی مترنمانہ مشاقیت کے بغیر کامل و مکمل نہ ہو سکتی تھی جس نے حکومت عالیہ کے جبین نیاز پر تیوریاں چڑھا دی تھیں اور یہ وہی تیوریاں تھیں جنہیں پیرزادہ صاحب کے زمانۂ اڈیٹری میں رسالہ "طریقت" کے ایک پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مضمون نے پیدا کیا تھا۔ اس لئے ضرور ہوا کہ ایک مجلس عیش و طرب بھی برپا کی جائے جس میں قوالوں سے خلاف اخلاق گانے گوائے جائیں۔ طبلہ بجوایا جائے اور وہ دھما چوکڑی مچوائی جائے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کالج کے کسی عہدہ دار کو کالج کی طرف سے انجمن حمایت اسلام کے شعبۂ تعلیم کی مجلس منتظمہ کے استمزاج و استصواب کے بغیر کسی قسم کا کوئی ایڈریس نہیں دیا جا سکتا اور اس بارہ میں مجلس صوفیہ کا ایک باقاعدہ رزولیوشن کتاب الاحکام میں محفوظ ہے۔ یہ تو خیال نہیں ہو سکتا کہ مسٹر مارٹن اپنے مددگار خاص جناب پیرزادہ صاحب بہادر کے بست و کشاد کے زمانہ منتظمی ریواز ہوسٹل کی عدیم النظیر و فقید المثال عرق ریزیوں پر اس درجہ لٹو ہو گئے تھے کہ کالج کے آئین و ضوابط کے انقیاد کی حس بھی اس شیفتگی کے سحر کو باطل

افکار و حوادث

عبدالمجید سالک

یورپ سے آئے دن اس قسم کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں حد سے زیادہ طویل القامت انسانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے یا پست قامت لوگوں نے اپنی جماعت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان انجمنوں میں عام لوگوں سے لے کر بڑے بڑے معززین تک شامل ہیں۔ ہندوستان میں ابھی انجمن سازی اس نوبت تک نہیں پہنچی لیکن کچھ مدت گزری حیدرآباد میں ایک کانے صاحب نے ایک جدت فرمائی تھی۔ وہ سن لیجیے۔

ان یک چشم گل صاحب کو جو دل لگی سوجھی تو آپ نے چپ چاپ گھر میں بیٹھ کر شہر کے تمام کانوں کی ایک فہرست تیار کی۔ دیکھا تو ان میں بڑے بڑے معزز آدمی اور سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ آپ نے ان سب لوگوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیے اور اپنے مکان پر کھانے پر مدعو کر لیا۔ یہاں تک کہ ہاتھ دھلانے اور کھانا کھلانے پر جو آدمی مقرر کیے وہ بھی سب کے سب کانے تھے۔

وقت مقررہ پر کانوں کی بھرمار شروع ہوئی۔ جب تک صرف ایک دو کانے تھے کسی کو چنداں خیال نہ آیا لیکن جب چالیس پچاس کانے جمع ہو گئے تو ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بلکہ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ بعض کو اس ستم ظریفی پر غصہ بھی آیا لیکن وہ یہ سمجھ کر پی گئے کہ چلو اس مجمع میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جو انھیں محض یک چشمی کی وجہ سے چشم حقارت سے دیکھے۔

جب تمام ہم چشم جمع ہو چکے تو کانا بہشتی کانے میزبان کے حکم سے کانے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے لگا۔ کانا تو تھا ہی لیکن پانی کی دھار ایک معزز مہمان کے ہاتھوں کے بجائے اس کے کپڑوں پر جا پڑی۔ اس نے تاؤ کھا کر بہشتی سے کہا "ہوش میں آؤ۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟" بہشتی نے برجستہ جواب دیا کہ "ہاں صاحب دونوں پھوٹ گئی ہیں۔ لیکن ایک میری تھی اور ایک آپ کی۔"

وہ معزز یک چشم صاحب اس گستاخی کی تاب نہ لا سکے اور اٹھ کر بہشتی کے ایک جڑ دی۔ اس وقت بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہ تھا سب کانے پوری مساوات کے ساتھ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ بہشتی نے بھی ترکی بہ ترکی ہاتھ سے جواب دیا۔ لپا ڈگی شروع ہو گئی تو کانوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ کانے کی نگاہ یوں بھی دزدیدہ ہی ہوتی ہے۔ شاعر نے شاید کسی کانے ممدوح ہی کی شان میں یہ مصرع کہا ہے کہ ع

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

کرنا خدا کا کیا ہوا کہیں شہر کے لوگوں نے اس عجیب و غریب دعوت کے متعلق سن گن پالی۔ انھوں نے کیا کیا کہیں سے تین چار ٹھیلے بٹھے ہنڈے روشن کر کے باہر گلی میں رکھ دیے اور صدہا لوگ کانوں کی رخصت کا نظارہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ جب یہ لوگ

کھانا کھاکر اور اپنے ہم چشم میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ بعض بدتمیزوں نے آوازے بھی کسے لیکن وہ احد العینیوں کی یہ جماعت ایک ایک آنکھ پھڑ پھڑا کر گزر گئی اور گھر میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔

بلجین کانگو سے ایک خبر موصول ہوئی ہے کہ وہاں کے مردم خور وحشی ایک ڈپٹی کمشنر کو پکا کر کھا گئے۔ خدا جانے ان مردم خوروں کی حسِ ذائقہ کو کیا ہو گیا۔ جب کچا ڈپٹی کمشنر اس قدر کڑوا اور بد ذائقہ ہوتا ہے تو پکا ہوا جانے کیسا ہوگا۔ ہندوستانی باورچیوں کی ترکیب کی طرح ان مردم خوروں کو ڈپٹی کمشنر پکانے کا بھی خاص نسخہ معلوم ہو۔

کانگو کی ہمسائیاں اس دن آپس میں باتیں کر رہی ہوں گی "بی بہن آج تمہارے ہاں کیا پکا ہے؟"

"بہن آج تو ایک ڈپٹی کمشنر پکایا تھا۔ کہو تو تھوڑا سا شوربہ پیالی کر بھیج دوں"

"ہاں بہن ذرا سا بھیج دو۔ چکھ کے تو دیکھوں مزہ کیسا ہے۔ میں نے تو پچھلے مہینے ایک پادری پکایا تھا صبح سے شام تک ہنڈیا آنچ پر رہی مگر کم بخت بوٹیاں تھیں کہ چمڑ چمڑ۔"

وہ کہتی ہوں گی "واہ بہن۔ وہ پادری کوئی بڈھا کھوسٹ ہوگا نہ گلے نہ سڑے۔ ننھے کے ابا خود جنگل جا کر ایک جوان جہان ڈپٹی کمشنر پکڑ کر لائے تھے۔ ایسا نرم کہ ہنڈیا میں ڈالتے ہی گل گیا اور "وہ" اور منے نے کھا کر ایسے خوش ہوئے کہ انگلیاں ہی چاٹتے رہ گئے۔ ایسی چیزیں نہیں روز روز ملتی ہیں۔ کب سے نیا ڈپٹی کمشنر آئے اور کب پکے۔"

بلجین ڈپٹی کمشنر کے ہم قوم دوسرے ہی دن گنج ہو کر ان وحشی مردم خوروں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا صفایا کر دیا۔ افسوس نہ تو ان لوگوں کو آدم خوری سے ذوق تھا اور نہ غالباً آدم خوروں کا گوشت ہی اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ بڑے مزے کی ضیافت ہوتی اور یہ گوشت ڈبوں میں بند ہو کر ولایت تک بھیجا جاتا۔

واقعہ نہایت ہولناک ہے لیکن یہ ڈپٹی کمشنر کو پکا کر کھانا بہت دلچسپ رہا۔ آئندہ ڈپٹی کمشنروں کو کسی قدر احتیاط سے رہنا چاہیے۔ اگر کہیں لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا گوشت مزے دار ہوتا ہے تو چند روز میں نسل ہی منقطع ہو جائے گی۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کوئی حکیم صاحب تھے جنھوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رسی کے ایک سرے سے پردہ نشین خاتون کی کلائی کو باندھ دیا جاتا اور دوسرا سرا پردے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچا دیا جاتا۔ حکیم صاحب نباضی میں اس قدر ذکی الحس واقع ہوئے تھے کہ رسی پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور تشخیص مکمل کر کے نسخہ لکھ دیتے تھے۔

ایک دن یار لوگوں کو دل لگی سوجھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے حکیم صاحب کو بلا کر لے گئے۔ گھر کے اندر رسی کے ایک سرے سے ایک بلی کی ٹانگ کو باندھ دیا اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھما کر عرض کی کہ حضور مریضہ کی نبض دیکھیے۔ حکیم صاحب نے رسی پر انگلیاں رکھیں اور فرمانے لگے کہ "مریضہ نے کچا گوشت کھا لیا ہے اور وہ ابھی ہضم نہیں ہوا۔" یار لوگ بے اختیار ہنس دیے اور حکیم صاحب کے کمالِ نباضی کے قائل ہو گئے۔

ایک فوجی نامہ نگار کا بیان ہے کہ میں نے آسام میں ہر طرف بانس ہی بانس کا دور دورہ دیکھا۔ سب سے پہلے میری نظر بانس سے بنے ایک دروازے پر پڑی۔ دروازے میں سے اندر داخل ہوا تو بانس کا بنا ہوا ایک احاطہ تھا جس میں بانس ہی کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جھونپڑیوں میں گیا تو بانس کی بیڑیں اور بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں جن پر بانس کی نرم چھال کے بنے ہوئے گدے بچھے تھے۔

صرف یہی نہیں بلکہ باورچی خانے میں مرغی کے چوزے بھی بانس ہی کی ٹوکریوں میں بند تھے اور ہوٹلے اور کھوکھلے بانس کا ایک گلاس نما برتن پڑا تھا جس میں گھی ڈال رکھا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی بانس ہی کے ٹکڑے کا بنا ہوا تھا۔ آگے چل کر میں نے پانی کے نل دیکھے وہ بھی بانسوں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ بانس کی کشتیاں، بانس کے بچھے، ٹیے، پوٹے، سنہری پل۔ غرض جس طرف دیکھا بانس ہی بانس نظر آئے۔

یعنی بانس، رہنے سہنے، بیٹھنے اٹھنے، بچھانے، جلانے نیز بات چیت اور دریا کو پار کرنے میں خوب کام دیتا ہے۔

اس فوجی نامہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ بانس کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ بانس کا سالن، بانس کا اچار۔ جو بانس صرف چند گھنٹے کا اگا ہوا اور نرم ہو اس کو تراش کر پانی میں ابال لیتے ہیں۔ پھر اس کے چھلکے کاٹ کر اور نمک مرچ مسالہ ڈال کر سالن پکا لیتے ہیں اور بانس کا اچار تو مدیر افکار نے بھی بار ہا کھایا ہے اچھا خاصا لذیذ ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے آئندہ سکولوں میں امتحانوں میں لڑکوں سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اونٹ اور بانس میں کیا فرق ہے؟

بعض شہروں میں لیڈروں کے جلوس اونٹ پر نکالے جاتے ہیں اور بعض اخبار نویس بھی لیڈروں کو خوب بانس پر چڑھاتے ہیں۔ لہٰذا اونٹ اور بانس کا تعلق ہماری ملکی سیاسیات کے ساتھ بھی بہت گہرا ہے۔ اگرچہ جو شخص پہلے ہی اونٹ پر سوار ہو اسے بانس پر چڑھانا بیکار ہے لیکن بہ حال لیڈروں کے نخرے برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

مثلاً ہمارے ایک اخبار نویس بھائی آج سے کئی سال پہلے جب میرپور گئے تو وہاں کے لوگوں نے گاڑی یا موٹر کی بجائے انھیں اونٹ پر سوار کر کے ان کا جلوس نکالا۔ اس جلوس کے آگے آگے ایک نوجوان رضا کار نہایت لمبا سا بانس اٹھائے جا رہا تھا جس کے اوپر خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔

لہٰذا ہماری سیاسیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں —— اونٹ اور بانس!

چند سال ہوئے پہلے یورپ سے اور پھر ہمارے ملک کے مختلف حصوں سے تبدیلِ جنس کی خبریں آنے لگیں۔ اب ترکی سے خبر آئی ہے کہ اچھی خاصی استانی لڑکیوں کو پڑھاتے پڑھاتے مرد بن گئی۔ بقول شاعر ؏

یہ مادرین تو آ کے نر ہو گئیں

اور اس کے بعد اس نے مردانہ لباس پہن کر ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے لیا کہ وہ مرد ہے۔

اب ڈیرہ اسماعیل خان سے خبر آئی ہے کہ وہاں ایک سکھ صاحب کی شادی ہوئی۔ بڑے چاؤ چونچلوں سے ایک چاندنی بہو بیاہ لائے۔ جب دلہن سسرال پہنچی تو پہلی ہی رات سردار لاڑا سنگھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ ان کی بیوی بیوی نہیں بلکہ بیوا ہے۔

سکھ اپنی بات چیت میں ہر مؤنث کو مذکر بنا لیا کرتے ہیں مثلاً کوے ہیں دالا ڈال دو۔ جیل میں ہم نے اکثر سنا کہ سکھ قیدی مٹی کر خاکا کہتے ہیں لیکن مؤنث کو مذکر بنانے میں ڈیرے کے سردار جی نے کمال کر دیا کہ بیوی بھی لائے تو مذکر ہی لائے۔

اب یہ دونوں بریاں بھوی حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں اور اگر نہ کریں تو کیا کریں۔ بقول میرزا غالب ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

وہ بار بار دلہن سے پوچھتے ہیں تو برائے وصل کردن آمدی یا برائے فصل کردن آمدی۔ وہ بیچاری گم سم ہے کچھ جواب نہیں دیتی۔ سکھ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو اس بھونگی ناٹھنگن کا معاملہ فوراً اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔

یہ سُن کر کلیجہ منہ کو آگیا کہ بنگال میں آموں کی فصل تباہ ہوگئی ہے اور یو۔پی میں بھی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَستَغفِرُنا مِن کُلِّ بلاءِ الدنیا والآخرۃ۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی شامت ہے۔ جو قوم کفرانِ نعمت کرتی ہے وہ نعمت سے محروم کردی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے کو نہایت فیاضی و دریا دلی سے آموں کے ٹوکرے بطور تحفہ بھیجتے تھے۔ دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں اور آموں کی فصل میں برکت پڑ جاتی تھی۔ آج خست کا دور دورہ ہے لہٰذا فطرت بھی خسیس ہو رہی ہے۔

مولانا نصراللہ خان عزیز نے جو کبھی مدینہ (بجنور) کی حیثیت سے یو۔پی میں گنگا کنارے آم کھایا کرتے تھے، لاہور سے ایک اخبار "زمزم" کے نام سے جاری کیا ہے۔ پالیسی تو وہی دھوتی پرشادوں کی سی ہے یعنی آپ حسبِ معمول کانگرس عاقع ہوئے ہیں۔ لیکن اس سیاسی بدمذاقی کے باوجود آموں کے بے حد رسیا ہیں اور یہی ذوق ان کے اور ہمارے درمیان مشترک ہے۔ زمزم جاری کرتے ہی آپ نے اس میں آمیات کا ایک کالم قائم کر دیا ہے جس میں حسبِ سابق آم اور گنڈا اور خربوزے کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔

اسی کالم سے معلوم ہوا کہ کوئی صاحب آم کے بجائے پنجاب میں خربوزہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، وہ خربوزے کی کیا کیا خصوصیات شمار کراتے ہیں:

"سرگاؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ بیل کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ زمین اس کو چھاتی سے لگا کر رکھتی ہے۔ اس کا رنگ کتنا خوش نما ہوتا ہے۔ اس کے اندر گٹھلی نہیں ہوتی۔ گلا نہیں پکڑتا۔ اس کا چھلکا آبلے نہیں ڈالتا۔"

لیکن تقریباً یہی خصوصیات کھیرے اور ککڑی میں بھی موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بدمذاقی کسی کے باوا کی جاگیر نہیں۔ مولا جس کو دے۔ جس پھل کے نام کا جزوِ اوّل "خر" ہو۔ اس کو پھلوں کا بادشاہ قرار دینے والا انسان تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔

خربوزے کو یوں تو پہلے ہی کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ہر دلعزیزی کی بنیاد ریت پر ہے۔ جہاں پانی کا ایک چھینٹا پڑا یہ بنیاد بہہ گئی اور خربوزے صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہو گئے اور اگر کہیں کہیں باقی بھی رہے تو پھوٹ کی شکل میں اور پھوٹ ہی وہ چیز ہے جس نے ہندوستان کو غیروں کا غلام بنا رکھا ہے۔

آم کی مقبولیت کی بنیاد سیمنٹ پر ہے۔ جتنا پانی پڑتا ہے اتنی ہی مضبوط اور پائیدار ہوتی جاتی ہے۔

کیا آپ نے نہیں سنا خربوزے کا نام لیتے ہی گدھے کا خیال آتا ہے صرف اس لیے نہیں کہ اس کا جزوِ اوّل خر ہے بلکہ خربوزے کے حمل و نقل کے لیے بھی زیادہ تر گدھے کام میں لائے جاتے ہیں اور آم! آم کی بہنگیاں یعنی یہ ثمرِ بہشت انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔

حرف و حکایت

سندباد جہازی

دیر بھارت کی روایت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کی۔ اس میں ایک رباعی کے یہ دو مصرعے بھی تھے۔

مے خواہی تند و تیز و رنگ بسیار
ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

ہرچند کہ مولانا نے ان مصرعوں کا ترجمہ انگریزی میں کر کے ممبروں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن مدراسی اور بنگالی ممبر یہ سمجھے کہ کسی تند و تیز قسم کی وسکی کا ذکر ہے جو جنت ہی میں ملتی ہے اور بافراط ملتی ہے۔

مولانا آزاد کا معاملہ تو یہ ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تحریر ہو یا تقریر ایک آدھ شعر ضرور لاتے ہیں اور جب تک شعر نہ آئے انھیں خود بھی لطف نہیں آتا چنانچہ آج بھی جبکہ پوری پارلیمنٹ میں ان کی زبان کی نکتہ طرازیوں کی داد دینے والا کوئی نہیں، وہ اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں ؏

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

مولانا کی وضع داری مسلم لیکن وہ یہ انداز کب تک نبھائے جائیں گے۔ کہاں ہندوستان کی پارلیمنٹ اور کہاں ساقی کوثر کا ذکر۔ رطل گراں اور پیر مغاں کی حکایت۔ شحنہ و محتسب کی داستان۔ ان لوگوں کی تربیت مختلف قسم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کا انداز نگاہ اور ہے، اسلوب فکر اور۔ انگریزی میں ہزار سمجھانے کی کوشش کیجئے ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ یہ اسی شراب کا ذکر ہے جو یورپ سے آتی ہے۔ اور بلومریا بھولا رام کے ہاں ملتی ہے۔

از فرنگ آمدہ شہر فراواں شد است

مشہور لطیفہ ہے کہ ایک صاحب بہادر اُردو سیکھ رہے تھے۔ ایک موقع پر اُن کے سامنے میر کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

صاحب بہادر نے فرمایا ہم سمجھ گیا۔ ہم تم میر سب کو جیل خانہ بھیجا مانگتا۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے ہندوستان کی پارلیمنٹ کے اکثر ممبران صاحب بہادر سے بھی گئے گزرے نکلیں گے۔

پاکستان اگرچہ اس معاملے میں غنیمت ہے لیکن سچ پوچھئے تو اگر پاکستان کی پارلیمنٹ میں بھی فارسی کے اشعار پڑھے جائیں تو بہت کم لوگ انھیں سمجھ سکیں گے۔ اور تو اور اس معاملے میں مغربی پنجاب کی اسمبلی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ فارسی پڑھتے ہیں وہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ممبر نہیں بنتے بلکہ نیل بیچتے ہیں یا لڑکوں کو پڑھاتے ہیں یا پھر کلرکی کرتے ہیں اور ایک اچکن ایک کوٹ اور دو پتلونوں میں ساری عمر گزار دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ قانون ساز مجالس کے ممبر بنتے ہیں سیکرٹری اور وزارت کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں۔ وہ فارسی نہیں پڑھتے۔ شعر نہیں سمجھتے اور ان میں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہیں پڑھتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ پڑھیں اور سمجھیں تو تقریریں کیونکر کر سکیں۔ سوالات کا جواب کیسے دے سکیں۔ دنیا میں بعض کاروبار ایسے بھی ہیں جنھیں خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لئے ان سے بے خبر ہونا ضروری ہے۔

ایک واقعہ یاد آ گیا کہ کسی اچھے گھرانے کے نوجوان نے ملازمت کی درخواست دی جس میں لکھا تھا کہ میں فلاں جاگیردار کا بیٹا ہوں۔ فلاں نواب صاحب میرے ماموں ہیں۔ اور فلاں جج صاحب میرے چچا ہوتے ہیں۔ میرے پردادا ضلع کے حاکم تھے اور ان کے دادا کو شاہی عہد میں پنج ہزاری منصب حاصل تھا۔ جس افسر کے پاس یہ درخواست پیش کی گئی تھی اس نے یہ کہہ کے درخواست واپس کر دی کہ ہمیں نسل کشی کے لئے نہیں بلکہ کلرکی کے لئے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ یہ صاحبزادے کچھ عرصے کے بعد اپنے صوبے کی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔

۱۹ مارچ

جنگ نامۂ وزارت

بدہ ساقی آں مے کہ نادم زنیم — قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
مجھے بادۂ مشکبو کر الاٹ — مے ارغواں کا سبو کر الاٹ
عبس ہے نہ ذکرِ محتسب نہ ڈر — ہیں دونوں پڑے مست اور بے خبر
ہے مفتی و شیخ اور میر و وزیر — کمندِ ہوا و ہوس کے اسیر
ہے دلشاد عمارت کے خوابوں میں گم — توکل کے زریں سرابوں میں گم

ہوا گرم ہنگامۂ کار راز — نظر آئی دشوار راہِ فرار
وہ گالی کے چھرّے وہ طعنوں کے تیر — گئے آن کی آن میں دل کو چیر
کمند اژدھائے مسلسل شکنج — دہن بادکردہ پئے تاراج گنج
بڑا لطف اس ہاتھا پائی میں تھا — مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا
لڑی بڑھ کے جاگیر جاگیر سے — لیا کام نیزے کا تدبیر سے
اُدھر خوب کرسی سے کرسی لڑی — مری سمت سے کس میری لڑی
بڑھے دونوں جانب سے آتش بیان — بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں
بہت خوب اخبار والے لڑے — مقالے سے بڑھ کر مقالے لڑے
نہ پائی کرشمے ہیں نہ چوہے ہیں آگ — مگر خوب کھیلے لنگوٹی میں پھاگ

پلا ساقیا بادۂ لعل فام — لنڈھا دے مے ارغوانی کا جام
مے احمریں سے کھلا دے چمن — بیادِ شہیدانِ خونیں کفن
ہوا ختم جب گیر داری کا دور — ٹو اُسنے کا دور اور لغاری کا دور
اٹھا اور ان سے تیغ و سناں چھین لے — یہ دو وٹوں کے گرز گراں چھین لے

میرا دور ہے اور تیرا دور ہے
زمین اور ہے آسماں اور ہے

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن دنوں وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ گرمیوں کے دن [illegible] شام کا وقت تھا۔ کوٹھی کے صحن میں ململ کا کرتہ پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ سامنے کرسیاں بچھی تھیں۔ جو آتا کرسی کھینچ کے بیٹھ [illegible] اہل محفل میں ہر قسم کے ہر لوگ تھے۔ شاعر، اخبار نویس، ادیب، کلرک، پہلوان گفتگو سیاسیات سے شروع ہوتی۔ بیچ بیچ میں آپ نشہ ہوں کے فلسفے اور [illegible] رشتوں کا بھی ذکر آ گیا۔ لیکن یہ محفل بالآخر لطیفوں اور پھبتیوں پر ختم ہوتی۔ اور دوسرے موضوعوں کی طرح ان میں بھی علامہ اقبال کا حصہ سب سے [illegible] ہ تھا یعنی انھوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کئے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ اور کبھی کبھی طبیعت لہراتی تو پھبتیوں پر پھبتیاں اور لطیفوں پر لطیفے کہتے چلے جاتے [illegible] لیکن ان پھبتیوں سے محض خوش وقتی مقصود تھی۔ نہ اُن کے دل میں کسی کے خلاف عناد یا دشمنی کا جذبہ تھا نہ وہ دوسروں کا دل دکھانا چاہتے تھے [illegible] جب ہے کہ جن لوگوں پر پھبتیاں کہی جاتی تھیں وہ خود بھی داد دیتے تھے۔ ایک صاحب پر جو علامہ کے خاص نیازمندوں میں تھے سب سے زیادہ [illegible] عنایت تھی یعنی سب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کہی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے بعض اقربا نے ان سے کہا تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں

سچّی باتیں

عبدالماجد دریابادی

خوب گزرے گی جو ......

"پیکنگ ۱۱ راگست۔ پیکنگ کی شہری حکومت نے آج سے فال گیری اور ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا پیشہ اختیار کرنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اور یہ حکم دے دیا ہے کہ یہ پیشہ ور اپنے روزگار کا کوئی اور ذریعہ تلاش کریں۔ یہ حکم پیکن ایوننگ نیوز میں شائع ہوا ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ شہر میں اس وقت ۸۸ فال گیرے موجود ہیں۔"

مضائقہ نہیں۔ جو پیکن کی مقامی سرکار اس جوتش دشمنی پر تُل گئی۔ ایسی ناقدری سرکار کے حدود سے فوراً ان ہنرمندوں کو خود ہی باہر چلا آنا چاہیئے اور سیدھے رُخ ہندوستان کے اس صوبہ کا کرنا چاہیے جہاں کا وزیرِ اعلیٰ اپنی جوتش نوازی میں نام پائے ہوئے ہیں! قدم اس سرزمین پر رکھیں تو عجب نہیں کہ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں اور قدر دانی کے مزے اٹھائیں۔ ہندی جوتشیوں اور چینی کاہنوں کا سنگھٹن ایک قابلِ دید سماں پیدا کرے گا۔ ہند و چین کے اتحاد کا ایک نیا منظر! بہ قول شخصے

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے "فرزانے" دو!

(۲۹ راگست ۵۸ء)

"اُمّتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں"!

امریکہ کا مشہور اور بین الاقوامی دو کالمی پرچہ "لائف" (۴ راگست ۵۸ء) پیشِ نظر ہے۔ ص۳۶ سے ص۳۹ تک تین صفحوں کے ایک ایک کالم۔ امریکہ (سن فرانسسکو) میں ایک بادشاہ اور ان کی تین وقتی "شبانہ داشتاؤں" کی تصویروں اور تذکرے کے لئے وقف ہیں۔ بادشاہ نے ایک شب چھوڑ کر جب وہ اپنی شادی شدہ ہمشیر کے ہاں مہمان رہے۔ باقی تین راتیں شہر کی تین حسیناؤں کے ساتھ کھانا کھا کر اور رقص کر کے گزاریں، اور ان سب لڑکیوں نے شاہ کے "دلکش" ہونے کا بیان رپورٹر کو دیا ——— پہلی مس (عمر ۲۰ سال) سے شاہ نے استعارہ کی زبان میں فرمایا کہ میں تمہارا پرستار ہوں، دوسری مس (عمر ۲۵ سال) نے جو اشتہاروں میں اپنی تصویر دینے کا کاروبار کرتی ہیں تجربہ کے بعد کہا کہ "یہ بادشاہ بڑے اچھے رقّاص ہیں"۔ تیسری مس صاحبہ (عمر ۳۰ سال) تجربۂ شبانہ کے بعد یوں گہر افشاں ہوئیں کہ "ہم کھاتے اور ناچتے رہے۔ بادشاہ بڑے اچھے قصہ گو ہیں۔ مجھے تو بے تکلفی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بادشاہ ہیں، اور میں انہیں یور مجسٹی کہہ کر خطاب نہ کر سکی"۔

اس ساری داستان کے بعد آخر میں صرف اتنا سُن لیجئے کہ شاہ ذی شان کوئی فرنگی نہیں، آپ ہی کی ملت کے ایک رکن رکین

شاہ محمد رضا فرمانروائے ایران ہیں!

بے بس سرکار

ریلوے وزیر کی زبان سے مزاجیہ سچائیں:-

"جون کے مہینے بھر میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس دہلی سے مدراس صرف ایک دن اپنے صحیح وقت پر پہنچی"!

کیا کوئی مخالف اگر انتظام ملک کے بدنام کرنے کو کوئی بیان گڑھتا تو وہ اس حقیقتِ حال سے کچھ زیادہ ہوتا؟ اور ہاں نہیں

ریلوے وزیر صاحب نے اسی مزاجیہ سچائیں فرمایا:-

"میں نے ریلوے بورڈ کو لکھا ہے کہ کچھ تو کارروائی کریں جس سے وقت کی پابندی ہونی ہو نہیں تو کچھ تو ہونے لگے"!

سبحان اللہ! یہ کوئی شوکت تھانوی کوئی مزاحیہ افسانہ سنا رہے ہیں نہیں لکھ رہے ہیں۔ ریلوے کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر ملک کی سب سے زیادہ ذمہ دار مجلس کے سامنے پوری سنجیدگی سے فرما رہے ہیں کہ وقت کی پوری پابندی تو ہمارے بس کی بات ہی نہیں (وہ تو گئی انگریزوں کے ساتھ) اب اگر کچھ تھوڑی بہت بھی کہیں نظر آ جائے تو وہی بہت غنیمت ہے! قناعت کی اس بے بسانہ شان کا مظاہرہ اس سے پہلے کس سرکار نے کیوں کیا ہوگا!

اناڑیوں کا علاج

پلاننگ کمیشن کے ممبر شری مان نانا ٹی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "بے روزگاری دوسرے پنج سالہ پلان میں بھی ختم ہوتے نظر نہیں آتی۔ پروگرام یہ تھا کہ اس پلان کے تحت ۸۰ لاکھ اشخاص کے لئے روزگار مہیا کیا جائے۔ لیکن یہ منشا پورا نہ ہوا اور صرف ۶۵ لاکھ اشخاص کو روزگار مل سکا۔"

لیکن علاج جب اناڑیوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور ہر اناڑی اپنے زعم و پندار میں اپنے کو طبیب حاذق ہی سمجھے گا تو مرض کے دور ہونے کی صورت ہی آخر کیا ہے؟ روز افزوں بے روزگاری ہو یا ہولناک گرانی، اس کے اسباب قدرتی سے کہیں زیادہ مصنوعی یعنی انسان کے اپنے ہاتھ کے پیدا کئے ہیں۔ جس نظام تمدن و نظام تعلیم میں بے پناہ ہوس کا نام "ترقی" رکھ دیا گیا ہو۔ جہاں ہر قسم کے اسراف کو معیار خوش حالی کا ٹھیرا لیا گیا ہو، جہاں عزت و تکریم صرف زر و مال کی بنا پر ہوتی ہو، اور جہاں کے فلسفۂ اخلاق میں قناعت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو وہاں توقع کس قسم کے نتائج کی کی جا سکتی ہے؟

(۱۲ ستمبر ۵۸ء)

حاصلِ تہذیب لادینی نگر

کیمبرج، ۲۰ اکتوبر۔ کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ کے پرچہ "ورسٹی" نے الزام شائع کیا ہے یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے جرائم خلاف وضع فطری کرنے والوں کو بچانے کی کوشش کی تھی کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یونیورسٹی بدنام ہو جائے گی۔ پرچہ نے اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ اب تو لوگ عام طور سے اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ کیمبرج میں اس عمل کا ارتکاب کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

ذکر کہیں اور کا نہیں۔ خاص الخاص مرکز علم و تحقیق، دانش گاہِ اعظم کیمبرج ہے۔ فطری کے بعد غیر فطری! اس کا نمبر آنا ہی تھا۔

سہرا سے

یہ "سپیشل سروس" کر چرچل نے مسٹر روز ولٹ کی معرفت ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا ہے اور روماں کا مریڈ سٹالین ہیں۔
رست ہی معلوم ہوتی ہے۔ تین چار دن ہوئے علی الصباح ایک صاحب تشریف لائے شکل صورت اور ہیئت کذائی سے "کامریڈ" ہی
علوم ہوتے تھے۔ شانِ نزول پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ فرصت ہو تو کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں۔ ہم نے یہ عرض کی کہ اس وقت تو فرصت نہیں۔ پھر سہ پہر
وسہی۔ جب سہ پہر کو بھی مصروفیت کا عذر کیا تو ایک طرح سے دھرنا ہی مار کر بیٹھ گئے۔ مجبوراً دستہ بستہ پوچھنا پڑا کہ حضور کا نہایت "اہم مشن" کیا
ہے؟ فرمایا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیے۔ ہم نے گزارش کی کہ اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان آزاد ہو تو کیسے؟ نہایت
سادگی سے فرمایا کہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ قائم کیجئے۔ ہم نے ذرا شبہ کا اظہار کیا تو یہ مژدہ سنایا کہ ترقی پسند دنیا آپ کے ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت کو بین الاقوامی مسائل سے بہت۔ دلچسپی ہے اور اس حد تک دلچسپی کہ ان کے خیال میں کم از کم مشرق میں
س وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے ان کے مشورہ سے ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہو گا ان سے پوچھے بغیر نہیں ہو گا۔ سٹالین سے بہت دوستی
ظاہر کی اور کہا کہ سٹالین سے ہیں ملا تھا اور اسے ہندوستان کا مسئلہ اس طرح سمجھایا ہے کہ وہ بالکل ہمارے ساتھ ہے سٹالین نے ایک بیان بھی
بھیج دیا ہے جس میں ہندوستان کے لئے قومی حکومت کا مطالبہ کیا گیا ہے کسی مناسب وقت پر میں اسے شائع کر دونگا۔

ہم نے ان "کامریڈ" صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ سٹالین کا بیان شائع کرنے سے پہلے پروفیسر عبدالمجید صاحب کو ضرور دکھا
لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ڈکشنری کھول کر بیٹھ جائیں۔ سٹالین آخر روسی ہے۔ بیان میں انگریزی کی دو چار غلطیاں ضرور نکل آئیں گی۔ پروفیسر صاحب
ایک بیان دھر گھسیٹیں گے اور ٹریبیون اسے چھاپ دے گا۔ اور خدشہ ہے کہ کہیں اتحادیوں کے تعلقات نہ بگڑ جائیں۔ بات معقول تھی۔
اس لئے انھوں نے یہ مشورہ قبول کیا۔ اب وہ پروفیسر صاحب کی تلاش میں ہیں۔ اور جب تک پروفیسر صاحب بیان کی غلطیاں درست
نہیں کر دیتے ہم محفوظ ہیں۔

ان کامریڈ کی ٹکر صرف ایک "ڈاکٹر صاحب" دیکھے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر کے مسائل میں ذرا کم دخل دیتے

ہیں۔ عرصہ ہوا ان سے ملاقات ہوئی تو زمانہ کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "لنلتھگو سے تو بے تکلفی تھی۔ جب کوئی پیچیدہ مسئلہ ہوتا تھا وہ بلا تکلف بلا بھیجتا تھا اور وہی کرتا تھا جو ہم کہتے تھے۔ ویول سپاہی اور ذرا اکھڑ سا آدمی ہے۔ سخت ضرورت کے بغیر بلاتا نہیں۔ اور بن بلائے جانے کے ہم عادی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملات روز بروز خراب تر ہو رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے پاس بہت سے جنگی نقشے تھے اور ایک پنسل۔ بار بار ان نقشوں کو نکالتے تھے اور پنسل لگا لگا کر بتاتے تھے کہ دو سال بعد ہٹلر یہاں سے حملہ آور ہوگا۔ شاہین یہ چال چلے گا۔ انگریز یہاں سے بڑھیں گے۔ اٹلی یہاں مات کھائے گا۔ اور پھر پانچ منٹ بعد ٹھنڈا سانس بھر کے کہتے تھے کہ افسوس ہماری یہ بصیرت رائیگاں جا رہی ہے۔ اپنی حکومت ہوتی اور اس طرح جنگ درپیش ہوتی تو وہ نقشہ بناتا کہ دشمن ستی بھول جاتا۔

اور بات واقعی افسوس کی ہے کہ ایسے ایسے اہل کمال ہندوستان میں موجود ہیں جو شاہین۔ ہٹلر اور چرچل کو برسوں درس دے سکتے ہیں مگر کسی کی نظر ان کے جوہر گراں مایہ پر نہیں جاتی۔ کوئی کسی ہسپتال میں کمپونڈر ہے تو کوئی بالکل بے کار۔ قومی حکومت ہوتی تو یہ لوگ روس، امریکہ اور انگلستان میں سفیر ہوتے اور سفارت خانے میں نہ سہی کسی اور "خانے" میں تو ضرور ہوتے۔ اس طرح تباہ حال تو نہ پھرتے۔

سہروردی صاحب چین جا رہے تھے تو بڑا شور تھا کہ نون صاحب بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ چین سے ہم چینی کے توسط سے متعارف تھے۔ عام قاعدہ بھی یہ ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان جاتے ہیں تو اپنے ساتھ کوئی میٹھی چیز لے جاتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ان دنوں چینی کی کمی ہے اس لئے سہروردی صاحب نون ہی کو ساتھ لے جا رہے تھے کہ شکر پارے نہ ملے۔ نمک پارہ ہی سہی ع

گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است

لیکن نون صاحب کے چین جانے کے سلسلہ میں یا تو وہ شور اشوری تھی یا یہ بے نمکی کہ سہروردی صاحب نون کے بغیر ہی چین سدھارے۔ کم سے کم منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے نون یہ توشہ ضروری تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں سہروردی صاحب کو خیال آیا کہ پاکستان کی ترکیب میں "ن" ضروری ہے ——— لیکن جس نون کو وہ نون اعلانیہ سمجھ رہے ہیں، بد قسمتی سے وہ نون غنہ ہے۔

نون غنہ اور نون اعلانیہ میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے اور نون سے نقطہ خارج ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نون صاحب وزیر خارجہ ہیں اور وزیر خارجہ کا کام عام طور پر حریفوں کو بے نقط سنانا ہے۔

اس نکتے کو اگر کوئی سمجھا ہے تو سہروردی صاحب نے جب ان کے فارمولے پر نکتہ چینی کی گئی تو وہ چینی کے ساتھ ساتھ نکتہ بھی لے گئے جس سے نون اعلانیہ نون غنہ بن گیا لیکن وہ ہمارے منہ کا مزہ پھیکا کر گئے۔ گویا ہم چینی کو ترس رہے ہیں اور سہروردی صاحب نکتہ چینی کو۔

اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ سہروردی صاحب چین سے لوٹتے ہوئے کچھ چینی اپنے ساتھ لے آئیں۔ کیونکہ تو ایک کامریڈ چین سے درآمد کر ہی لیتے ہیں، چینی آجائے گی تو ملک کا سیاہ و سفید ٹھیک ہو جائے گا۔

سہروردی صاحب کے چین جانے پر ان کے بعض احباب چیں بجبیں ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سہروردی صاحب چین گئے تو ہیں لیکن شاید وہاں انھیں مکمل چین نصیب نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ دعوت ان کے دو پیش رووں کو راس نہ آئی۔ محمد علی بوگرا نے دعوت قبول کی ہی تھی کہ ان کی وزارت کی چولیں ہل گئی اور چودھری محمد علی کی شرافت و دیانت نے انھیں اتنا چین لینے ہی نہیں دیا کہ وہ اطمینان سے چین جا سکتے۔ لیکن سہروردی صاحب بے خطر اس راستہ پر چل پڑے۔

یہ صحیح ہے کہ وزارت عظمیٰ کوئی چھپا گوشہ نہیں ہے کہ کوئی بیٹھے وہ جیک کر ہی رہ جائے۔ لیکن شہید صاحب بھی طفلِ نو پرواز نہیں۔ جب تک وہ صحیح بنیادی اصولوں سے نہیں چلتے نہیں کرتے۔ انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ ادھی ہی چین لکھنا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رہا ہو کر لاہور پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والوں کی تعداد بچاس ہزار بلکہ ایک روایت کے مطابق پچیس ہزار تھی۔ جلوس میں تو ان پر جو گزری سو گزری، ستم یہ ہے کہ گھر پہنچ کر بھی اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ وہ رات کے دس بجے تک معانقے کرتے رہے، اور ابھی جانے کتنے دنوں یونہی مصافحے اور معانقے کرتے رہیں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم کسی بڑی جماعت کے امیر جماعت یا پیر محمد کبھی نہ ہوئے ورنہ ان مصافحوں اور معانقوں میں مرلئے ہوتے۔

بعض پرانے لیڈروں کو جنھوں نے عدم تعاون کی تحریک کا زمانہ دیکھا ہے، جلوس نکلوانے مصافحے اور معانقے کرنے کا کچھ ایسا ڈھب آگیا تھا کہ دن بھر میں دو دو تین تین جلوس نکلوا لیتے تھے، ہزاروں عقیدت مندوں سے مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے اور ماتھے پر بل تک نہیں پڑتا تھا۔ ہم نے ایسے لیڈر بھی دیکھے ہیں کہ بظاہر مدقوق معلوم ہوتے تھے لیکن لیڈری جو ہاتھ آئی تو اچھے لندھور معلوم ہونے لگے۔ جلوس اور جلسے انھیں خوب راس آئے۔ اپنے نام کے ساتھ زندہ باد سن کر سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے تو بجلی سی کوند جاتی تھی۔ مصافحہ تو خیر کیا بری چیز ہے معانقہ کی یہ کیفیت تھی کہ داہنی طرف ذرا جھک کر بائیں پر آئے اور وہاں سے اس طرح صاف نکل گئے کہ بڑے بڑے "پسلی توڑ" بلکہ "گردن توڑ" معانقہ کرنے والے منہ تکتے رہ گئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے

تو وہ ایک حد تک درست ہے لیڈری میں نزاکت کی بجائے پھرتی اور معانقہ کرنے کی مشق کی ضرورت ہے۔

بعض لیڈروں کی تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جلسے یا جلوس کو زیادہ عرصہ ہو جاتا تھا تو یہ مرض "عدم جلوس" میں مبتلا ہو جاتے تھے اور یہ مرض جب مزمن ہو جاتا تھا تو کسی بڑے سے بڑے جالینوس سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا تھا اور معجون اسطوخودوس بھی بالکل بے کار ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس لئے جلسے کثرت سے ہوتے تھے۔ جلوس بھی کثرت سے نکالے جاتے تھے۔ جلسوں کا انتظام بڑے سلیقے سے کیا جاتا تھا۔ یہ بات پہلے طے ہو جاتی تھی کہ اللہ اکبر کا نعرہ کب لگایا جائے۔ زندہ باد کے نعروں کے لئے کون کون سے موقعے موزوں ہیں۔ اس غرض کے لئے جلسہ گاہ کے مختلف حصوں میں نعرہ لگانے والے کھڑے کر دیئے جاتے وہ موقع پا کر اس انداز سے نعرے لگاتے کہ سارے اہلِ جلسہ ان کی پیروی کرتے تھے۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں پنجاب کے ایک مشہور لیڈر نے گجرات کے قومی کارکنوں کو تار دے دیئے تھے لیکن یہ تار وقت پر نہ پہنچے۔ ان کی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو کوئی شخص استقبال کے لئے موجود نہیں تھا۔ انھوں نے قلی سے سامان اٹھوایا اور ویٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ پھر ایک شخص کے ذریعے گجرات کے کانگریسی اور خلافتی کارکنوں کو پیغام بھیجا کہ "مجھے آکے لے جاؤ"۔ گجرات میں سب لوگ بے خبر بیٹھے تھے۔ یہ پیغام پہنچا تو ہڑبڑا کر اٹھے اور جلوس کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ خدا خدا کر کے شام کے وقت جلوس تیار ہوا اور یار لوگوں نے لیڈر کو گجرات پہنچایا اور اس طرح وہ مرضِ عدم جلوس میں مبتلا ہوتے ہوتے بچا۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگرس اور مجلس خلافت کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔ کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو کا جلوس بڑی دھوم سے نکلا۔ مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے خلافت کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی کا جلوس بڑی شان و شوکت سے نکالا۔ اسی زمانے میں پنجاب کے بعض لیڈروں کو خیال آیا کہ ہمارا جلوس بھی نکلنا چاہیئے ورنہ کہیں عارضۂ عدم جلوس لاحق نہ ہو جائے۔ کلکتہ میں پنجابیوں کی دو دو، تین تین کی دو کانیں ہیں۔ امرتسر کے کچھ لوگ شال فروشی بھی کرتے ہیں۔ جب کانگرس اور خلافت کے جلسے قریب الاختتام تھے تو بعض پنجابی لیڈروں کا ایک چھوٹا سا جلوس نکلا۔ کسی نے پوچھا یہ کس کا جلوس ہے؟ جواب ملا پنجاب کے لیڈروں کا۔ اس نے پوچھا اب تک یہ جلوس کہاں تھا؟ پاس سے کسی نے کہا کاریگر کے پاس تھا۔ اس نے وقت پر بنا کر نہیں دیا۔ عید پیچھے ٹر اسی کا نام ہے۔ ایک پر زور قہقہہ بلند ہوا۔ راقم الحروف اگرچہ پنجاب کے لیڈروں کی جرأت اور ہمت کا قائل رہا ہے لیکن کلکتے والوں کی بات سن کر بڑا افسوس ہوا۔

حرف و حکایت

احمد ندیم قاسمی

سنا ہے سابقہ پنجاب کے علاقے میں چینی کی پھر بولی گئی ہے اور مرکزی حکومت کا راوی چین لکھتا ہے یعنی مرکز کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہ جو ہم نے تمہیں دسمبر میں چینی دینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ وعدہ بدستور موجود ہے لیکن چینی موجود نہیں ہے اس لئے چین کی بنسی بجاؤ۔ اور چین بجبیں ہونے یا نکتہ چینی پر اتر آنے کے بجائے چینی کا انتظار کرو۔ کیونکہ چینی ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ چینی کا آنا اسی طرح یقینی ہے جس طرح موت کا آنا یقینی ہے۔

ہم ہفتوں پہلے چینی خوروں کو مشورہ دے چکے ہیں کہ چائے میں چینی ڈالنے کے لئے چمچے کے بجائے "ڈراپر" کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اور مہمان کے لئے چائے بناتے وقت اس سے یہ نہ پوچھئے کہ آپ کتنے چمچے پسند فرمائیں گے۔ چینی سے بھرے ہوئے ڈراپر کو بڑی نزاکت کے ساتھ انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے تھام کر اور گردن کو ذرا سا خم دے کر استفسار فرمائیے۔ "آپ چینی کے کتنے ذرات استعمال کرتے ہیں" مہمان ہزار بے تکلف اور منہ پھٹ ہو مگر وہ ایک سو ذرات سے کیا آگے جائے گا اور ہر ذرہ ہو کہ چینی کے ایک سو ذرات چمچے کا ایک چوتھائی پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔

اس جاہل قاضی کا قصہ تو آپ نے سنا ہو گا جس کا باپ انتقال کر گیا تو دیہات کے لوگ اس کے پاس چاند کی تاریخ پوچھنے آنے لگے۔ حساب کتاب کا کورا تھا۔ اس لئے اس نے مکان کے کونے میں اپنے پلنگ کے ایک طرف کھلے منہ کا ایک برتن رکھ دیا۔ اور جب نیا چاند نکلا تو اس نے برتن میں بکری کی ایک مینگنی ڈال دی۔ دوسرے دن دوسری مینگنی شامل کر دی اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب کوئی اس سے چاند کی تاریخ پوچھنے آتا وہ یونہی روا روی میں انگڑائی لیتا۔ ہاتھ لٹکا کر برتن میں پڑی ہوئی مینگنیاں گنتا اور تاریخ بتا دیتا۔

چند روز کے بعد نہ جانے ایک بکری کو کیا سوجھی۔ کہ وہ اس برتن میں بہت سی مینگنیاں بھر کر چلی گئی۔ شام کو کوئی دیہاتی چاند کی تاریخ پوچھنے آیا تو قاضی نے انگڑائی لے کر ہاتھ لٹکایا۔ اور پھر جیسے مراقبے میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد حیران ہو کر بولا۔ "اٹھانویں، ؟ اٹھانویں کیسے ؟" اور قاضی بولا۔ "یہ تاریخ بھی میں نے خدا کے خوف کے مارے بتائی ہے۔ ورنہ میرے حساب سے تو آج چاند کی پانچ سو

بہتّرویں تاریخ نکلتی ہے۔ ——— دو چمچے چائے پینے والوں کے حساب سے چاہے انھیں آپ کے ڈراپر میں سے تین چار ہزار ذرات چینی
کی ضرورت ہو۔ مگر وہ بھی خدا کے خوف کے مارے ایک سو سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ آزما کر دیکھ لیجئے۔

کچھ دنوں سے چینی کی کچھ ایسی کیفیت ہو رہی ہے کہ اگر ہماری حکومت مانے تو جلدی جلدی سے چینی کا ایک آدھ من
سونا کر کے اسے عجائب گھر میں منتقل کر دے۔ تاکہ آئندہ نسلیں جب کتابوں میں چینی کا ذکر پڑھیں تو اسے گڑ نہ سمجھ بیٹھیں۔ چینی کو فوری طور
نوادرات میں شامل کر لینا بے حد ضروری ہے اور محکمہ آثارِ قدیمہ اس کام کو جتنی جلدی اپنے ہاتھ میں لے لے اتنا اچھا ہے۔ وقت
آنے والا ہے جب اعزہ و احباب خوشی کی تقریبوں پر ایک آدھ چمچہ چینی سونے کی ڈبیوں میں بند کر کے پیش کیا کریں گے اور تحفہ قبول کرنے
والے جب ڈبیا کھول کر اس میں چینی کا حسن ہر ہریں دیکھیں گے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے ان کی آواز بھرا جائے گی اور وہ بڑی
رقت سے کہیں گے "یہ اتنی بڑی قربانی! یعنی آپ میرے لئے چینی ایسی چیز کا پورا چمچہ لے آئے ہیں۔ نہیں میں اس قابل کہاں۔ میری طرف سے
یہ چمچہ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دیجئے گا۔ شکریہ"

یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم "پری کا سراپا" پڑھتے ہوئے ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ نظیر کے محبوب اور عوامی لیگ کے سرکاری
گروپ کے درمیان کافی سے زیادہ مماثلتیں اور مشابہتیں موجود ہیں اور اگر نظیر آج کے محبوب کا مقابلہ اس کے ماضی سے کر رہا ہے تو
عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا مقابلہ پرانی مسلم لیگ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس پر ہم نے اس ساری نظم کا جائزہ لیا۔ بعض تبدیلیاں کیں۔
بعض نئے الفاظ گھڑے۔ اکثر مصرعوں کو یونہی رہنے دیا اور اس طرح عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا سراپا تیار ہو گیا۔ جو آپ
کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضرِ خدمت ہے:-

ویسی ہی فارن پالیسی مغرب کو جھکاوٹ ویسی ہی   غیروں سے لگاوٹ ویسی ہی اپنوں سے کھچاوٹ ویسی ہی
بالوں میں سیفٹی ایکٹوں کی افشاں کی سجاوٹ ویسی ہی   پلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہی
تیور و ویسے ہی بگڑے سے تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہی

بے دردسی اور بے پرواسی چنچل سی اور چلبلی سی   دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ان نرم رسیلی باتوں میں اک شے ہے سخت کٹیلی سی   آنکھیں ہیں کہ مسلم لیگیں ہیں کچھ سرخ سی اب کچھ پیلی سی
نظروں کی چھاوٹ ویسی ہی آنکھوں کی گراوٹ ویسی ہی

بغداد کا پٹکا باندھے ہوئے "سیٹو" میں بیٹھ کے آتی ہے   اپنی ہی زباں کو لہرا کر اپنی ہی زباں کھا جاتی ہے
[illegible] سو سو شکوے کرتی تھی اب ہنستی ہے اور گاتی ہے   اب اس کی سانسوں سے بھی مسلم لیگ کی آواز آتی ہے
زلفوں کی کھلت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہی

اس کافر چینی اور نخرے کے انداز قیامت شان بھرے   اور گھرے جاؤ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ باتوں سے جیبیں لوٹنے سے اور وعدوں سے دامان بھرے   چہرے پر کھوٹو برسے ہوئے آنکھوں میں بہادر خان بھرے
بندے کی لٹک جھلے کی جھمک بالے کی ہلاوٹ ویسی ہی

اب اپنے بیاں سے باہر ہے وہ کافر حسن اہا ہا!   کچھ آپ نئی کچھ حسن نیا کچھ جوش جوانی اٹھنے کا

لیکیں جھپکیں ان باہوں کی یاروں میں آج کہوں کیا کیا   ہلکے سے ہلنا بازو کا دھیرے سے وہ اٹھنا پاؤں کا
دھڑیوں کی سجاوٹ ویسی ہی نیلوں کی چھلاوٹ ویسی ہی

وہ کافر دھج جی دیکھ ہے خود رستم بیگ کا بھی لرزے   پازیب لرزے، پائل گھنگھرو، کڑیاں، جھڑیاں بکھرے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر ایک قدم پر سو جھٹکے   وہ چنچل چال ہوائی سی، اونچی ایڑی، نیچے پنجے
نقشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی رکاوٹ ویسی ہی

اک شور قیامت ساتھ چلے، نکلے کافر جس دم بن ٹھن   ہل اوکر، رفتا غضب، ایک بلا، قدم سو سو گلشن
مذکور کروں کیا اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن   کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، ہر لکیں بازو، نظر کجب تن
بھولی تو نہ ہوگی لیک، تمہیں انگلی کی نچاوٹ ویسی ہی

کیا بات کہی ہے ۔۔ سو بار کہے، جو بات کہوں سب سمجھے   رو بیٹھے چلے سو سو انداز جھڑے باتوں میں لڑ کر کانوں میں
بیٹھی تو ہے اونچی کرسی پہ، اک آن کمر لچکی تو رہے   چنچل اچپل، ملنے جھکے، سر کھولے، ڈھانکے، ہنس ہنس کے
قصوں میں وہی دیو دتا، ہنسی ٹھٹھوں کی اڑاوٹ ویسی ہی

چٹکی لے کر کبھی مارے، جھڑپے، چھیڑ کے پھر روٹھے بھی   ہر آن "بہر خوش" ہر دم "جیب" ہر بات پر کہہ دے "اچھا جی"
تن تن کر جو تقریریں کیں، وہ واپس لے کر بیٹھ رہی   سو کوس پرے ہٹ جاتی ہے بات آتی نہیں ہے مطلب کی
وہ ریلی بھی وہی، نخرے بھی وہی، باتوں کی بناوٹ ویسی ہی

اف اس پہ حکومت کا عالم، وہ عالم بیگ کہاں پاوے   گر پیدا ہو تو سے دور کرے تو نشہ کا بھی چکرا جاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، دل ناب بھلا کیونکر لاوے   وہ ٹکرا اس کا ٹکراسا جو دیکھے رکیہ کے غش کھاوے
گالوں کی دمک، ماتھے کی چمک، زلفوں کی زلاوٹ ویسی ہی

کچھ ناز و ادا، کچھ مغروری، کچھ شرم و حیا، کچھ بانک پنا   کچھ آمد حسن کے موسم کی، کچھ کاف حسن رہا گدرا
کچھ شور جوانی اٹھنے کا، جوں سندر میں سیلاب آیا تھا   اپنا بھی لئے قصور نہیں کیا ہوش تو اس کو دنیا کا
جانے میں وہی کیکر کا مزا، آتے میں ملاوٹ ویسی ہی

جب ایسا حسن کا دریا ہو، کس طور نہ لہروں میں بہیے   ہم جور و جفا سہتے ہی رہے اس جور و جفا کو بھی سہیے
اپنے ہی کیے کی لاج نہیں اب اس سے آگے کیا کہیے   گر دل نہ کبھی دریا کو ملی نکلے بھی پڑ کر سو رہیے
افسوس وطن پر چھائی ہے اب کے بھی تھکاوٹ ویسی ہی

۷ دسمبر ۱۹۵۷ء

ہم نے بعض ارباب کراچی کی زبانی سنا ہے کہ "صاحب ۔ بسوں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آتی ہیں تو آتی ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر نہیں آتیں تو مہینوں تک نہیں آتیں" اور ان ارباب کراچی سے ہم نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ ذرا لاہور تشریف لائیے اور ایک بس پکڑ کر دکھائیے مگر اتنی احتیاط ملحوظ رہے کہ بنیس دعائیں بخشوا کر اور وصیت نامے مرتب کر کے تشریف لائیے کا کیونکہ لاہور میں کراچی کی سی (عام سے) عامی بس نہیں چلتی۔ یہاں آدمی یا ادمی بس چلتی ہے اور اہل لاہور کا کہنا ہے سے

عمر دو روزہ بس ہی پکڑنے میں کٹ گئی   ہم سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا

کراچی میں تو کبھی کبھی ایک ہی بس اسٹاپ پر ہر بس سروس کی ایک ایک نمائندہ بس آ کھڑی ہوتی ہے اور یوں
بھی ہوا ہے کہ ایک مسافر کا داہنا بازو ایک بس میں رکھا ہے تو بایاں دوسری بس میں، سر تیسری بس کی ایک سیٹ پر درج
ہے تو ٹانگیں چوتھی بس میں کھڑی ہیں، اور باقیماندہ دھڑ نے پانچویں بس کے انتظار میں بس سٹاپ کا کھمبا تھام رکھا ہے۔
یہاں لاہور میں تو یہ کیفیت ہے کہ والدین نے بچے کو پرائمری اسکول جانے کے لئے بس اسٹینڈ پر کھڑا کیا مگر جب
تک بس آتی بچے کی داڑھی مونچھیں نکل آئیں اور والدین اسے دولہا بنانے کے لئے گھر بلا لائے۔

کہتے ہیں ایک غریب مسافر کی چادر چوری ہو گئی۔ تلاش بسیار کے باوجود جب چادر دستیاب نہ ہو سکی
تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چادر کے غم میں آئندہ سے داڑھی نہیں منڈوائے گا۔ ایک روز اس نے سر راہے ایک پھٹے حال
بزرگ کو دیکھا جس کی داڑھی اس کی ناف تک پہنچ رہی تھی۔ قریب جا کر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "قبلہ۔ کیا
آپ کا پورا بستر کھو گیا ہے؟" سو بسوں کے معاملے میں کراچی والے صرف ایک چادر سے محروم ہوتے ہیں مگر بے چارے اہل لاہور
تو اپنا اوڑھنا بچھونا سب کچھ کھوئے پھرتے ہیں۔

آج ہی صبح کا واقعہ ہے۔ وہ صبح جس کے بارے میں حضرت جوش نے کہا ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

بس اتنا سا فرق ہے کہ یہ صبح، جولائی کے سورج کی دھوپ میں نہا کر نکلی تھی۔ ہم پون گھنٹے تک ایک بس سٹاپ پر کھڑے
دل ہی دل میں کاتب تقدیر کے سامنے ایک مکالمہ لیتے رہے جب یکایک بس ہمارے سامنے آ کر رکی۔ ہم نے دیکھا بس میں
جتنے آدمی بیٹھے ہیں اس سے زیادہ کھڑے ہیں اور یوں ٹھنس کر کھڑے ہیں کہ اگر دروازے کے پاس کسی مسافر کے چیونٹی کاٹے تو
پچھلی بس کے آخری سرے پر کھڑا ہوا مسافر محسوس کرے۔ غرض پوری بس کے مسافر یک جان و ایک سو کے قریب قالب ہو
رہے ہیں۔

ناگاہ بس کا دروازہ کھلا جیسے علی بابا والی انگریزی فلموں میں "کھل جا سم سم" کہنے پر غار کے دہانے پر رکھی ہوئی چٹانیں
لڑکھڑاتی ہوئی ہٹتی ہیں۔ پھر بس میں سے ایک مسافر اترا اترا کیا، برآمد کیا ہوا ٹپک پڑا اور پکارا "پانی"۔ ہم لپکے اور قریب کے
ایک ہوٹل سے پانی لے آئے۔ اس کے چہرے پر چھڑکا۔ اس کے منہ میں ٹپکایا اور اس سے "مزاج شریف" پوچھے۔ بولا "نانی" ہم
اس شارٹ ہینڈ بولی کو نہ سمجھ سکے۔ مگر قریب ہی کھڑے ہوئے ایک آدمی نے وضاحت کر دی "بے چارے کو نانی یاد آ رہی ہے"
سب نے ہمدردی سے نیم بے ہوش مسافر کی طرف دیکھا تو وہ نہایت نحیف آواز میں بولا "فانی"۔ اس شخص نے اس لفظ کی ترجمانی
کی "یعنی جب انسان اومنی بس پر سوار ہوتا ہے تو اس کے سامنے انسان کی فنا کا نقشہ کھنچ جاتا ہے"۔ پھر کسی نے نیم دراز
مسافر سے پوچھا "کہاں سے چلے تھے آپ؟" مسافر بولا "تھانی" اس لفظ کی شرح یوں کی گئی "یہ کسی پولیس چوکی سے چلے
ہیں۔ پولیس اسٹیشن تھانہ ہوتا ہے تو پولیس چوکی تھانی ہوئی"۔ مگر پھر کسی کی آواز آئی "مدد بھائیو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔ مجھے یقین
ہے کہ انہیں "بس سٹروک" ہو گیا ہے"۔

٥ (روزنامہ امروز، لاہور)

آنکھیں میری باقی اُن کا

جو لوگ پرانے لاہور سے آشنا ہیں انہیں یاد ہوگا کہ یہاں فقیروں کی ٹولیاں پو پھٹنے سے پہلے نظر آتیں یا جمعرات کو فجر کی نماز سے دس بجے دن تک ۔۔ کبھی کبھار کوئی فقیر رات کو بھی آواز دیتا گذر جاتا تھا ۔ ہندو فقیر منگل اور سنیچر کو گلیوں میں صدا دیتے ، مسلمان فقیر جمعرات اور جمعہ کو ـــ صبح آنکھ کھلتی تو فقیروں کے دعائیہ فقرے کانوں میں پڑتے ۔ رنگارنگ دعائیں ، چیدہ چیدہ جملے ، منتخبہ مصرعے نعتوں کے بول ، حمد کے الفاظ ، اللہ و رسولؐ کی صفات ، غرض دعاؤں کی پھلواری کھلی ہوتی ۔۔۔ ایک طرف سے آواز آتی "اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا" دوسری سمت سے بول گونجتا "آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا" ـــ ایک فقیر یکا یک داخل ہوتا "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" دوسری طرف سے کانوں میں قند گھل جاتی "کس شان کی سرکار ہے سرکار محمد" ـــ

پھر یہ فقیر ـــ چہرے مہرے سے فقیر نظر آتے ، اُن کے لب و لہجہ اور ظاہر و باطن سے پتہ چلتا کہ مانگتے اور دن کاٹتے ہیں ـــ

آج فقیروں کا وہ شیرازہ ہی منتشر ہو چکا ہے ، نہ اُن کی آوازیں نہ اُن کے چہرے اور نہ وہ دعائیہ اسلوب زمانہ کے ساتھ گداگری نے بھی ترقی کی ہے ـــ مطلب ہے صبح کو پھیری لگانے والے فقیر روز بروز گھٹتے گئے ، خال خال رہ گئے جو گزر گئے ہیں ـــ انہوں نے اپنے لئے خاص خاص گلیاں اور خاص خاص مکان چن رکھے ہیں ، وہاں صدا دیتے اور خیرات لے کر چلے جاتے ہیں ـــ ان کی جگہ عجیب و غریب فقیروں نے لے لی ہے ۔ آپ اکیلے اپنے مخاطب کے فقیرانہ سوال سے ششدر رہ جائیں گے ۔ اللہ العالمین کس سے واسطہ پڑا ہے فقیر ہے یا دوست ـــ کبھی کبھار مخاطب کے سوال کی ترتیب سے مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ شاید آپ کسی دوست یا عزیز سے ہم کلام ہیں ۔ وہ آپ سے اپنی بپتا کہہ رہا ہے ۔ اور آپ مجبور ہیں کہ اس کا ہاتھ بٹائیں ۔

مثلاً آپ تنہا چلے جا رہے ہیں ـــ سامنے سے یا عقب سے آواز آئے گی ـــ "السلام علیکم" آپ نظریں اٹھا کر یا پلٹ کر دیکھیں گے ـــ "وعلیکم السلام" ـــ فرمائیے مزاج شریف جی ہی جی میں آپ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آپ اس اجنبی چہرے کو جو سنتے کیوں ہیں ـــ

سوال ہوگا ـــ بھائی جان سخت مصیبت میں مبتلا ہوں ، روزگار نہیں ملتا ، گھر میں بیوی بچے بھوکے پڑے ہیں ، سفید پوش ہوں ، ہر شخص کے

سامنے ہاتھ پھیلانے سے طبیعت گھبراتی ہے۔ آپ سے التجا کر رہا ہوں۔ کچھ اعانت کیجئے۔ ایک وقت کی روٹی مل جائے تو کرم ہوگا ——

آگے بڑھئے تو ایک اور راہ گیر سے مڈبھیڑ ہوگی۔ کوٹ پتلون میں ٹائی لگائے ہوئے —— آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں ——
فرمائیے —— جی ذرا سڑک سے ہٹ کر۔ ہاں بھائی کہو۔ کیا بات ہے؟ —— گھربار مشرقی پنجاب میں لٹ گیا۔ ماں باپ دہیں قتل ہوگئے —— بہنوں کا لکھا
کے سامنے ظالم لوگوں نے اُڑ پھوڑ کر لیا —— میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچا۔ بہتری کوشش کی کوئی چیز الاٹ ہو جائے۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ وہاں سے برباد
ہو کر آیا تھا —— یہاں بھی برباد ہوں، دونوں فاقے میں کٹ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی چہرہ جس سے شرافت مترشح ہو سامنے آجائے تو سوال کرتا ہوں۔ آپ کا
چہرہ کہہ رہا تھا کہ آپ سخی ہیں —— بس دو چار روپے کا سوال ہے، دو چار دن گذر جائیں گے —— اس قسم کا فقیر وقتی سے کبھی مل جاتا ہے۔

مال روڈ کے قہوہ خانوں سے باہر —— کوئی دس برس سے ایک لاہنے قد کا فقیر کا ندھوں پر بچہ اٹھائے مانگتا نظر آتا ہے۔ وہ گویا کل ہی
حصار سے آیا ہے۔ آواز میں انتہائی لجاجت۔ باؤجی دو دن سے بچے بھوکے ہیں ہم ریفیوجی ہیں راہِ خدا مدد کیجئے —— خدا آپ کو بہت دے گا —— اللہ
آپ کو چاند سا بیٹا دے گا۔ میرے بیٹے پر رحم کیجئے —— چھوٹے چھوٹے بچے ہیں —— اور یہ صدا مسلسل کانوں میں پڑتی چلی جاتی ہے۔

آپ گھر میں بیٹھے ہیں، ایک متشرع قسم کے بزرگ تشریف لاتے ہیں —— سلام علیکم —— کہو بھائی، میاں، بیٹے، اچھے ہو۔ یہ آغا صاحب کا
مکان ہے۔ جی ہاں فرمائیے۔ مجھے آغا صاحب سے ملنا ہے —— میں بول رہا ہوں۔ مجھے انہی سے ملنا ہے —— حضور میرا نام ہی ...... ہے، آپ ہیں؟
معاف کیجئے پہچانا نہیں، وقت کے ساتھ نظر بھی کمزور ہوگئی ہے۔
خوش رہو بیٹے —— عمر نے تھکا دیا ہے۔ نوکری کے قابل نہیں رہا۔ بڑا لڑکا قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا۔ فلاں محکمہ میں اڑھائی سو روپے ماہوار پر
ملازم تھا —— چھوٹا بچا باقی۔ اسے میں پڑھتا ہے۔ اس کے داخلے کا سوال ہے۔ آپ کی تعریف سُنی، پھر خیال آیا کہ آپ کے والد مرحوم سے بڑے گہرے
تعلقات تھے، ہمیشہ عزت و احترام سے ملتے —— بڑے نیک انسان تھے، کبھی نماز قضا نہیں کی، پابند صوم و صلوٰۃ، باغ و بہار —— سوچ سوچ کر تمہارے
ہاں چلا آیا ہوں، قرض نہ سمجھو، بھائی کی مدد خیال کرو، میری ڈاڑھی کی طرف دیکھو —— جو جی چاہے کہہ لو۔ صرف بچے کے داخلہ کے لئے کل ستر روپے کا سوال ہے۔
—— اگر بچہ نیک رہا تو قرض اتار دے گا —— ورنہ میں تو قبر میں تمہارا یہ احسان ساتھ لے جاؤں گا، اور ہاں —— قیامت کے دن اس نیکی کا اعتراف کروں گا ——!
اب آپ ہی فرمائیے۔ ایک ایسا شخص جو اس سے پہلے کبھی آپ سے نہیں ملا —— آپ کے والد مرحوم کا دوست بنتا اور طنطنے کے ساتھ سوال کرتا ہے۔
—— یہ جان لینے کے باوجود کہ گداگر ہے، آپ کے لئے اس کے سوال کی سطح کتنی بلند اور آپ کے جواب کا لہجہ کتنا مختلف ہو جاتا ہے ——

مزید برآں فقیروں کا ایک اور گروہ بھی عام ہوگیا ہے —— بعض دعا دینے اور صدا لگانے والے فقیر روپوش ہوگئے ہیں۔ ان کی جگہ گونگے
فقیروں نے لے لی ہے۔ کئی فقیر خود زخم کر لیتے ہیں، اور اسے پھیلانے کے بعد راہگیروں کو متاثر کرتے ہیں ——
اس قسم کے فقیر لاہور میں زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ چانک ایک فقیر آٹپکے گا۔ منہ سے رال اور بدن کے لباس سے بدبو آ رہی ہوگی۔ آپ
بور ہوں گے کہ جو کچھ لکھا ہے ہیں، وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ یا پھر اُسے بھی کچھ دیں —— اور رخصت کریں ——

حرف و حکایت

مجید لاہوری

—— یہ دور "سلطانیٔ جمہور" کا ان معنوں میں نہیں ہے کہ ہم ہر اس "نقشِ کہن" کو جو ہمیں نظر آتا ہے مٹا سکیں — لیکن یہ "جمہوری تقاضوں" کا دور ہے۔ اور ہم لوگ مداری کے "بچہ جمورا" کی طرح "بچہ جمورا" بن گئے ہیں۔ ہر بات جمہوری تقاضوں کے لئے ہوتی ہے۔ ہر آدمی کی آواز "پبلک آواز" ہے

"اگر ہم کسی جماعت سے نکلتے ہیں تو —— جمہوری تقاضوں کے لیے۔

ایک نئی جماعت بناتے ہیں تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

جب نئی جماعت نہیں چلتی تو پھر اسی جماعت میں آتے ہیں جس کو ہم کل تک بُرا بھلا کہہ رہے تھے —— تو جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

جماعت کی نئے سرے سے تنظیم کرتے ہیں —— تو جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

انگریز کے دور کو تو ہم خلافِ جمہوریت کہتے تھے اور اُس کے ہر عمل کو ظلم و تشدد قرار دیتے تھے، مگر آج کے دور میں :-

دفعہ ۱۴۴ لگتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے

گولی چلتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے

لاٹھی چارج ہوتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے

سیفٹی ایکٹ لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

مارشل لا لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

دوسری طرف ان تمام اقدامات کی مخالفت اور شہری آزادی کی حمایت ہوتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

غرض یہ ہے کہ ——

ہمارا چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا سب جمہوری تقاضوں کے لیئے ہے۔

دوسری جمہور کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جمہور کم اور منظور زیادہ ہے۔ اور اب تو ہر جلسہ ایک ڈراما ہے جس کا نام ہے "جمہور، عرف منظور!"

کراچی کا "آرام باغ" اور "جہانگیر پارک" "منظور باغ" اور "منظور پارک" ہے۔

لاہور کا "موچی دروازہ" ——— "منظور دروازہ" ہے

پشاور کا "چوک یادگار" ——— "چوک منظور" ہے

راولپنڈی کا "کمپنی باغ" ——— "منظور باغ" ہے

غرضیکہ ہر شہر کا وہ مقام جہاں عموماً جلسے ہوتے ہیں، جلسہ گاہ نہیں۔ بلکہ "منظور گاہ" ہے۔ وہاں سے کوئی کبھی مایوس ہو کر نہیں آیا۔ جو قرارداد پیش کیجئے، لوگ کہتے ہیں :-

"منظور ہے!"

منظور ہے!"

آپ ہر شہر میں دو جلسوں کا انتظام کیجئے۔ ایک جلسہ میں یہ قرارداد پیش کیجئے کہ :-

"اس ملک میں صحیح معنوں میں جمہوری نظام قائم ہونا چاہیئے ———"

اور اس کی حمایت میں تقریریں کرائیے کہ ڈکٹیٹر شپ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے عوام کی بھلائی نہیں ہوتی، اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے، وہ مزے کرتے ہیں، عوام بھوکوں مرتے ہیں، جاگیرداری، سرمایہ داری ختم کرو، زمین، صنعت اور دوسری چیزوں کو قومی ملکیت بناؤ۔ وغیرہ

آپ یقین کیجئے لوگ قرارداد سے اتفاق کریں گے اور جب صدر کہے گا

"منظور ہے؟"

ہر طرف سے آوازیں آئیں گی :-

"منظور ہے"

منظور ہے!"

دوسرا جلسہ آپ ڈکٹیٹر شپ کی حمایت میں کیجئے اور اس میں یہ قرارداد پیش کیجئے :-

"اس ملک میں ڈکٹیٹر شپ قائم ہونی چاہیئے، کیونکہ ہم ابھی جمہوری نظام کے اہل نہیں ہیں"

اور اس قرارداد کی حمایت میں بھی تقریر کرائیے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ ہم جمہوریت کے اہل نہیں ہیں۔ ہمارے معدے صدیوں کی غلامی کے سبب جمہوریت ایسی ثقیل چیز کو ہضم نہیں کر سکے۔ ہمیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے مفاد کے لیے قوم کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ چور بازاری، یہ اسمگلنگ، یہ رشوت ستانی، یہ ذخیرہ اندوزی، یہ ناجائز منافع خوری سب اس وجہ سے پھیل رہی ہیں کہ کوئی مضبوط ہاتھ اس کو روکنے کے لیے نہیں ہے، جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، اگر ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے تو سفارشیں پہنچ جاتی ہیں۔ چونکہ حکومت کرنے والے ان لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں، اس لیے ان کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔ لاہور میں مارشل لا کے دنوں میں سب چیزیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ مہنگائی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آپ یہ کہیئے کہ ترکی میں اتاترک مصطفیٰ کمال جیسا آدمی پیدا ہوا جس نے چند دن میں اس "مرد بیمار" کو زندہ کر دیا۔ سب ڈکٹیٹر شپ کی برکت تھی۔ ہٹلر نے اپنی قوم کو

زندہ کیا، اسٹالن اپنے ملک کا عوامی ڈکٹیٹر تھا، اس نے روس کو زندہ کر دیا۔

پھر صدر جلسہ اعلان کریں :-

"بھائیو! یہ قرارداد آپ کو منظور ہے؟"

اس پر ہر طرف سے آوازیں آئیں گی

"منظور ہے"

منظور ہے!"

صدر جلسہ اگر کہیں گے :-

"کوئی صاحب اگر اس کے خلاف ہوں تو ہاتھ کھڑا کر دیں"

یقین کیجئے کہ ایک ہاتھ بھی اس کے خلاف نہیں اٹھے گا۔ شاید اس ڈر سے کہ جب سب لوگ "منظور ہے" کہہ رہے ہیں تو اختلاف کرنے سے کہیں بھرے جلسے میں "پٹائی" نہ ہو جائے۔ ہاں تو جب جمہور کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہر رہبرو کے ساتھ تھوڑی دور چلے اور رہبر کو نہ پہچانے تو پھر جمہوری تقاضوں کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے، وہ سیٹھ ٹیوب جی "ائرجی کی زبان میں — "سب چلے گا"

کیوں؟

اس لئے کہ — نہ کوئی روکنے والا ہے

نہ کوئی ٹوکنے والا ہے

جمہوری تقاضے — زندہ باد!

(ہفت روزہ نمکدان کراچی)

اُردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مشاہیرِ ادبِ اردو کے بعض نہایت دلچسپ و پرلطف لطائف و ظرائف متعلقہ سوانح عمریوں اور ادبی تاریخوں میں اس کثرت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو تلاش کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو یقیناً ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ مگر اتنی فرصت کس کے پاس رکھی ہے۔ جو کچھ سامنے آیا بغیر کسی ترتیب کے ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ اس مختصر مجموعہ لطائف میں طنز کے نہایت لطیف نشتر بھی ہیں اور پاکیزہ مزاح کے بہترین نمونے بھی۔ ان کے مطالعہ سے جہاں قارئین کرام کو ذہنی حظ حاصل ہوگا وہاں ظرافت و تمسخر کا فرق بھی معلوم ہو جائے گا!

سرسید احمد خاں

جب سرسید احمد خاں نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے خلاف سخت طوفان برپا ہوا۔ اور انہیں کافر، ملحد، بے دین، زندیق اور نیچری وغیرہ خطاب دیئے گئے۔ ان کے مددگاروں اور معاونوں کا بھی برا حال کیا گیا۔ مولانا حالی کے مقابلہ میں خالی خیالی اور ڈفالی جیسے حریف اکھاڑے میں اتارے گئے۔ مسدس حالی کے جواب میں مسدس خیال وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔ مولوی نذیر احمد کو "نیچری چانڈ" کا خطاب عطا فرمایا گیا۔ مکہ اور مدینہ تک سے سرسید اور ان کے رفقا کے لئے کفر کے فتوے بڑی کوشش و کاوش سے منگوائے گئے اور سارے ہندوستان میں شائع کئے گئے۔ انہی علمائے کرام میں سے ایک بزرگ مولوی علی بخش صدر الصدور گورکھپور بھی تھے جنہوں نے محض سرسید کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لئے سفرِ حج کا قصد فرمایا۔ جب فتویٰ لے کر واپس آئے تو سرسید نے ان کے متعلق لکھا۔

"مولوی علی بخش ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے کفر کی بدولت ان کو حجِ اکبر نصیب ہوا۔ سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی کسی کو ہاجی۔ کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ایک مرتبہ چندہ جمع کرنے کے لئے سرسید پنجاب آئے تو ایک جلسہ میں ان کا تعارف حاضرین جلسہ سے کراتے ہوئے پنجاب کے ایک مشہور سرکار پرست اور خطاب یافتہ رئیس نے فرمایا: "یہ صاحب جن کا نام سرسید ہے اور جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں مسلمانوں کی

اتفاق سے منصف مقرر ہو گئے۔ چونکہ عام طور پر یہ عہدہ مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہو گیا تھا اس لئے تمام روبکاروں پر ان کے نام کے ساتھ مولوی حافظ خان بہادر لکھنے کا عام دستور تھا۔ چنانچہ جب منشی بھولا ناتھ منصف مقرر ہوئے تو سررشتہ دار نے حسب عادت ان کے ساتھ بھی لکھا "روبکار از دفتر خان بہادر مولوی حافظ منشی بھولا ناتھ صاحب" منشی صاحب نے روبکار دیکھی تو جھلا کر سررشتہ دار سے کہا "کم بخت تو نے مجھے مسلمان بنا دیا" سررشتہ دار کیوں چوکتا۔ فوراً دست بستہ کہنے لگا "حضور منصف ہو گئے اس لئے آپ کے نام کے ساتھ اور کیا لکھتا؟"

مولانا ذکاء اللہ

خان بہادر شمس العلما مولانا ذکاء اللہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے ٹھیک نو بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ ایک دن جو باہر نکلے تو سر سید کے لڑکے سید محمود بھی گھڑی لئے اپنے مکان کے آگے ان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ مولانا ذکاء اللہ نے پوچھا "میاں یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟" سید محمود نے جواب دیا "جی میں اپنی گھڑی کو کوک دینی بھول گیا اس لئے وہ بند ہو گئی ہے اب آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا کہ اپنی گھڑی کا وقت درست کر لوں۔"

مولانا حالی

سر سید کے گروہ میں مولانا حالی بہت ہی سنجیدہ بزرگ تھے۔ مگر انہوں نے بھی ہمارے لئے خاصا سامان تفریح چھوڑا ہے۔ مولانا نے ۱۹۰۷ء میں ایک الہامہ لکھ کر اپنے ایک دوست کو بھیجا۔ غور سے پڑھئے اس الہامہ میں کتنا لطیف طنز ہے:۔

المذہب:۔ اعلانِ جنگ — الدین:۔ تقلید آبا و اجداد۔
العلم:۔ قصے از جہل مرکب۔ — الامتحان:۔ آزمائش بیانتیں ممتحنان
الیونیورسٹی:۔ کارخانہ کلرک سازی۔ — الکمیشن:۔ وجہ مدحہ براے فیصلہ یک طرفہ
الانجمن ہائے اسلامیہ:۔ سبزۂ بر تنگال — الرئیس:۔ آنکہ از دنیا مست و بے خبر باشند
الامیر:۔ آنکہ تہی دست و قرضدار باشند — المولوی:۔ آنکہ ہمہ مسلمانان را از دائرہ اسلام خارج می کند
الواعظ:۔ آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند۔

غالباً ۱۹۰۹ یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے وکیل میرٹھ نے مولانا کو اپنی شادی میں پانی پت سے بلایا۔ شادی کے بعد مولانا حالی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا سے کہا "اب آپ اپنا تخلص بدل دیں کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے۔" اس پر مولانا حالی نے فرمایا کہ "نہیں مولوی صاحب! یہ بات نہیں۔ تن تنہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں۔" اس پر تمام مجلس مولانا حالی کی جودتِ طبع پر حیران رہ گئی۔

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے پاس ٹھہرے جو بڑے زمیندار بھی تھے۔

طلاق دی تھی۔ اور دت سے کبھی طلاق پڑھی نہیں سکتی۔ سے ملاں نے منہ بنا "محبت کے ساتھ مل بیٹھیں۔ تو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ۔ اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ "میں نے تو سے طلاق دی تھی داسنے ہرگز نہیں دی"

غالب

جب مرزا غالب لکھنؤ گئے تو وہاں ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب نے غالب سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں وہاں اہلِ لکھنؤ "آپ کو" کہتے ہیں۔ آپ بتلائیے کہ فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ اہلِ لکھنؤ بولتے ہیں۔ مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ "میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں" اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ "میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں" تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے اپنی نسبت سمجھ جائیں۔

ایک مرتبہ غالب ایک قضیہ میں قید ہو گئے۔ جب قید سے رہا ہو کر آئے تو کالے صاحب، ایک رئیس کے ہاں آکر رہ کش ہوئے۔ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ کہنے لگے "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

مرزا غالب کے پاس اکثر گمنام خطوط گالیوں سے بھرے ہوئے آیا کرتے تھے جن میں ان کی شاعری پر اعتراض کئے جاتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک روز اسی قسم کا ایک خط آیا جس میں ان کو ماں کی گالی دی گئی تھی۔ پڑھ کر کہنے لگے "اس الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بوڑھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ اسے اپنی بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو ۷۲ برس کے بوڑھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا؟"

ایک دفعہ رمضان کے بعد مرزا قلعہ میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا "پیر و مرشد ایک نہیں رکھا"

ایک پُرلطف شعر و سخن کی محفل میں غالب بیٹھے ہوئے میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق نے کہا "میرے خیال میں تو سودا کو میر پر ترجیح ہے"۔ اس پر غالب نے کہا "واہ شیخ صاحب۔ میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کریں تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے۔ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھو تو بایزید کا۔"

حکیم رضی الدین خاں مرزا کے بڑے دوست تھے مگر ان کو آم بالکل نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر آئے اور برآمدے میں بیٹھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی میں سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے غالب سے کہا "دیکھئے آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا۔" غالب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں گدھا نہیں کھاتا۔"

ایک روز مرزا کے نہایت عزیز شاگرد میر مہدی مجروح اپنے استاد کے پاس بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ مجروح اٹھ کر مرزا کے پاؤں دبانے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے۔ مگر مجروح نے نہ مانا اور کہنے لگے "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دبانے کی اجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا "تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔"

جب میر صاحب پاؤں دبا چکے تو کہنے لگے "لائیے استاد! اجرت دیجئے۔" مرزا نے اس پر فوراً جواب دیا "بھیا! اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہو گیا۔"

ایک رئیس سید سردار مرزا سے ملنے آئے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس جانے لگے تو مرزا ہاتھ میں شمعدان لے کر بسبب پیری کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ اس پر سید صاحب کہنے لگے "قبلہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔" مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا۔ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

۱۲۷۷ھ میں غالب نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر نے کہا "حضرت انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔" مرزا نے کہا "دیکھو صاحب! ایسی فال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادہ بھی غلط نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک دن طوطا پنجرہ میں سر نیچے کئے بیٹھا تھا۔ غالب نے دیکھا تو فرمانے لگے "میاں مٹھو! تمہارے نہ بیوی نہ بچے تم اتنے غمگین کیوں بیٹھے ہو؟"

غالب کی بہن بیمار ہوئیں تو یہ بیمار پرسی کے لئے گئے اور پوچھنے لگے "کیا حال ہے؟" وہ بولیں کہ "مرتی ہوں، قرض کی فکر ہے۔" آپ فرمانے لگے "بہن بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے، خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین (صدر الصدور دہلی) بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا دیں گے؟"

ذوق دہلوی

ایک دفعہ ذوق عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا آئی اور بار بار ان کے سر پر بیٹھ جاتی۔ یہ اڑاتے تو وہ پھر آ کر بیٹھ جاتی۔ آخر ذوق ہنس کر کہنے لگے "اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔" حافظ ویراں ایک شاعر بھی پاس بیٹھے تھے کہنے لگے "ہمارے سر پر تو کبھی نہیں بیٹھتی۔" ذوق نے کہا "بیٹھے کیونکر، جانتی ہے کہ یہ ملا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی الحمد [illegible] کی آیت پڑھ کر کلوا واشربوا کی گردان کرتے ہوئے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گردن پر چھری رکھ دے گا۔ وہ دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے۔"

شیخ امام بخش ناسخ

ایک مرتبہ کوئی صاحب ناسخ سے ملنے آئے اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی چھڑی سے زمین پر پڑے ہوئے ایک ڈھیلے

"ایک مصرع خیال میں آیا ہے چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔" انہوں نے پوچھا "وہ مصرع کیا ہے؟" جرأت کہنے لگے "مصرع تو بڑا عمدہ ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ بن جائے گا بتلاؤں گا نہیں۔ ورنہ تم مصرع لگا کر اسے چھین لوگے۔" جب انشا نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آخر جرأت نے مجبور ہو کر یہ مصرع ان کو سنایا ع

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

اس پر سید انشا کی رگ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے فوراً کہا ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

چونکہ جرأت نابینا تھے اس لئے یہ پھبتی ان پہ چسپاں ہو کر رہ گئی۔ انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ لاٹھی لے کر انشا کو مارنے اٹھے۔ انشاء فوراً دوڑ کر باہر نکل گئے۔

مرزا محمد رفیع سودا

دلی میں جب ان کی شاعری کا چرچا ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ بادشاہ نے کوئی غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ اس کی اصلاح میں دیر ہوئی تو بادشاہ نے تقاضہ کیا۔ اور پوچھا کہ "مرزا! ایک دن میں کتنی غزلیں بنا لیتے ہو؟" مرزا نے کہا "پیر و مرشد! طبیعت حاضر ہو تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔" بادشاہ کہنے لگے "واہ! ہم تو پے خانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔" مرزا نے بادشاہ کا خیال کئے بغیر بڑی بے پروائی سے جواب دیا "حضور! پھر ان غزلوں میں سے بو بھی ویسی ہی آتی ہے۔" یہ کہہ کر چلے آئے اور پھر نہ گئے۔

آخر عمر میں سودا لکھنؤ چلے گئے تھے اور آصف الدولہ کے دربار میں بڑی شان سے رہتے تھے۔ مگر ہجو کہنے سے یہاں بھی نہ چھٹے۔

ایک مرتبہ آصف الدولہ شکار کو گئے۔ اور وہاں بھیلوں کے جنگل میں ایک شیر مارا۔ اس پر سودا نے کہا ـ

یارو! یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ   شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب نے شکایت کی کہ "مرزا تم نے ہمیں شیر خدا کا قاتل بنا دیا؟" ہنس کر کہنے لگے "حضور عالی! جو شیر آپ نے مارا وہ اللہ ہی کا بنایا ہوا تھا اسی لئے میں نے اسے شیر خدا کہا (شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی لقب ہے اور ابن ملجم حضرت امیر کا قاتل تھا۔ اس مناسبت سے سودا نے یہ عجیب شعر کہا)

اشرف علی خاں فغاں

یہ صاحب اپنے زمانہ میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ عظیم آباد کے رئیس راجہ شتاب رائے کی سرکار میں ملازم تھے۔ انہوں نے ایک روز راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تالالیاں اور جالیاں وغیرہ۔ سب حاضرین نے بہت تعریف کی۔ "جگنو میاں" نامی ایک مسخرا راجہ صاحب کا بہت منہ چڑھا تھا وہ کہنے لگا کہ آپ نے غزل میں سارے قافئے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ فغاں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر راجہ صاحب نے فرمایا "فغاں صاحب! سنتے ہو جگنو میاں کیا کہہ رہے ہیں؟" انہوں نے کہا "مہاراج! یہ قافیہ میری نظر میں تھا۔ مگر متانت اور سنجیدگی کے خلاف تھا اس لئے میں نے چھوڑ دیا۔" راجہ صاحب نے کہا اور جگنو میاں

نے بھی اصرار کیا کہ نہیں ضرور کہو۔ جب ہر طرف سے فرمائش ہوئی تو آخر فغاں نے کہا ؎

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو ——— سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

اس پر زور لطیفہ پر تمام دربار چیک اٹھا اور میاں جگنو ہضم ہو کر رہ گئے۔

نواب مرزا داغ دہلوی

ایک صاحب ملنے آئے اور ان کو نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اسی وقت داغ نے
ایک روز داغ نماز پڑھ رہے تھے۔ [illegible] وہ بھاگا بھاگا گیا اور
سلام پھیرا۔ ملازم نے کہا ”فلاں صاحب آئے تھے اور چلے گئے۔“ فرمایا ”دوڑ کر جا۔ ابھی راستے میں ہوں گے۔“
ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ آپ آ کر چلے کیوں گئے؟ وہ کہنے لگے ”آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے میں چلا گیا۔“
داغ نے فوراً کہا ”حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔“

ایک طوائف داغ کی ملازم تھی۔ ایک روز داغ نے اسے کسی آدمی کے ہاتھ بلایا۔ طوائف اس وقت کسی بات پر بھری بیٹھی
تھی۔ آدمی سے کہنے لگی کہ ”جا کر کہہ دے کہ میری بلا بھی نہیں آنے گی۔“ آدمی نے اسی طرح آ کر کہہ دیا۔ بجائے ناراض ہونے کے داغ نے اس
فقرے کا خوب لطف اٹھایا۔ بار بار اس آدمی سے پوچھا کہ ہاں اس نے کیا کہا تھا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی؟ یہ کہتے کہتے یہ شعر تصنیف کیا ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی ——— کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

ایک روز داغ کے پاس عبدالحمید آزاد بیٹھے تھے۔ ان کو اتفاق سے پیاس لگی تو پانی طلب کیا۔ ایک لڑکی پانی لے کر آئی۔ اس
وقت ہوا چل رہی تھی جس سے اس کا دوپٹہ اُڑنے لگا۔ لڑکی بڑی شرم حضور تھی۔ اس نے پانی کا کٹورا آزاد کے ہاتھ میں دیتے ہی فوراً اپنے
دونوں ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ لئے اور اندر بھاگ گئی۔ داغ نے دیکھا تو فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا اس کو بے حجاب ——— سینے پہ ہاتھ رکھ لیا جب شانہ کھل گیا

جب داغ رام پور میں ملازم تھے تو ایک مرتبہ سیر سپاٹے کے لئے لکھنؤ بھی گئے۔ ان ایام میں لکھنؤ میں مشتری نامی ایک
طوائف کی بڑی دھوم تھی۔ داغ نے اپنے رفیق سفر نواب بہادر حسین خاں اکرم سے کہا ”چلو ذرا مشتری سے ملنے چلیں۔“ چنانچہ دونوں
وہاں پہنچے۔ مشتری نے نہایت تعظیم و تکریم سے دونوں معزز مہمانوں کی پذیرائی کی اور اس کے بعد داغ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش
کی جس پر داغ نے یہ شعر سنایا ؎

شبِ ہجراں کے جاگنے والے ——— ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

مشتری خود شاعرہ تھی۔ داغ کا یہ شعر سن کر بے خود ہو گئی اور دیر تک وجد میں آ کر یہ شعر بار بار پڑھتی۔ پھر داغ نے کہا کہ اب
آپ اپنا کچھ کلام سنائیے۔ اس پر وہ بیاض لینے دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں اتفاق سے حقہ بھرا ہوا رکھا تھا۔ کسی آدمی کی ٹھوکر لگنے سے
چلم فرش پر گر پڑی اور سفید چاندنی جگہ جگہ سے جل گئی۔ خیر آدمی دوڑ پڑے اور انہوں نے جلدی جلدی فرش سے انگارے اٹھائے۔
اس کے بعد مشتری بیاض لے کر آئی تو کسی نے پوچھا ”کیا ہوا؟“ داغ نے بے ساختہ کہا ——— ”داغ لگ گیا!“

داغ بہت سیہ فام تھے۔ جب پہلے پہل دہلی سے رام پور آئے تو یہاں پہنچ کر وہ شاہی اصطبل کے داروغہ مقرر کئے گئے

جس پر کسی دل جلے نے پھبتی کہی ؎

شہر دہلی سے آیا ایک مشکی — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

پنڈت برجموہن کیفی دہلوی

۱۸۹۷ء میں کیفی لکھنؤ گئے تو وہاں ایک شعر و سخن کی مجلس میں مسٹر حامد علی خاں بیرسٹرایٹ لا سے جو شعر و ادب کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے کسی غزل یا نظم کی فرمائش کی۔ اُن مرحوم کی طبیعت میں بھی ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ کیفی کے کان کے پاس منہ لے جاکر نعرہ لگایا:

الفتر۔ بفتر۔ نفتر۔ چوہفتر — پچھتر۔ بہتر۔ ستتر۔ اٹھتر

اس مذاق کو سن کر کیفی نے خوب داد دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب محفل خوب جم رہی تھی تو حامد علی خاں نے کیفی سے کچھ سنانے کے لئے کہا۔ اس پر کیفی نے فی البدیہہ اُسی لہجہ میں حامد علی خاں کے کان کے پاس اپنا منہ لے جاکر کہا:

اکیاسی۔ بیاسی۔ تراسی۔ چوراسی — پچیاسی۔ چھیاسی۔ ستاسی۔ اٹھاسی

اس پر ساری محفل کشت زعفران بن گئی اور دیر تک یہ لطیفہ نقلِ محفل بنا رہا۔

کیفی اپنے اشعار میں بھی لطائف و ظرائف سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دفعہ اشعار میں یہ لطیفہ بیان کیا ؎

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھنجھلا کے کہا — "تو پڑھے گا نہ کبھی، ہٹ مِرا بھیجا مت کھا

کُند ہے ذہن ترا، ٹھس ہے طبیعت تیری — کچھ نہ آئے گا تجھے، قوم کا شاعر بن جا"

ایک مرتبہ ان کے لڑکے نے ان کو اُنہی کا ایک مضمون دکھایا جو کسی نے بعینہٖ بغیر کسی رد و بدل کے اپنے نام سے ایک اخبار میں شائع کر دیا تھا۔ اس پر کیفی ہنس کر کہنے لگے "میاں غنیمت سمجھو کہ چور نے چوری کا مال جوں کا توں بازار میں لاکر رکھ دیا ہے۔ اس کا حلیہ نہیں بگاڑا۔"

ڈاکٹر اقبال

جب اقبال کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی اور وہ سکول میں پڑھتے تھے تو ایک دن ان کو سکول پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ "اقبال! آج دیر سے کیوں آئے؟" اقبال نے بیساختہ جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔" (سیرتِ اقبال)

بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز سبق پڑھ رہے تھے، اور ایک بٹیر ہاتھ میں تھی۔ ان کے استاد مولانا میر حسن نے دیکھا تو فرمایا "کم بخت! بھلے ان بٹیروں کو ہر وقت ہاتھ میں تھامے رکھنے میں کیا مزا ملتا ہے؟" اقبال نے برجستہ جواب دیا "حضرت! ذرا سے ہاتھ میں لے کے دیکھئے۔"

نوجوانی کے ایام میں لوگوں پر لطیف چوٹیں کرنے میں اقبال بہت مشہور تھے۔ موچی دروازے میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے مگر ہاتھ میں شفا نہ تھی۔ ان کے متعلق ایک مرتبہ کہا ؎

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں ۔۔۔۔ ان سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

ایک مرتبہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اقبال کی ایک نظم اپنے اخبار میں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان کی ہجو ان الفاظ میں کہی ہے

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت ۔۔۔۔ نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

لندن کا ذکر ہے کہ جون ۱۹۰۷ء میں ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی۔ جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پر تکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے ہوئے چھم چھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں اور آتے ہی اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں تو صرف آپ سے ملنے یہاں آگئی ہوں"۔ اقبال کی ظرافت کا شعلہ چمکا اور انہوں نے فی البدیہہ کہا: "تو یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں سے زندہ سلامت باہر جا سکوں گا یا نہیں؟"

ولایت میں ایک مرتبہ چند انگریز پروفیسر کالج کے طلباء اور طالبات ایک قدیم باغ کی سیر کو گئے۔ جہاں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک مسجد بھی تھی جس کی دیواروں پر جا بجا خدا تعالیٰ کے اسماء عربی رسم الخط میں کندہ تھے۔ سیر کرنے والے انگریزوں نے اقبال سے ان اسماء اور آیات کا مطلب پوچھا۔ اقبال نے اس کے جواب میں کمال سنجیدگی اور بڑی متانت کے ساتھ ان کو یہ قصہ سنایا:-

"ایک تھا بادشاہ۔ اس کو ایک دن جنت کی ایک حور نظر آئی۔ جس پر وہ بُری طرح فریفتہ ہو گیا۔ اور اس سے کہنے لگا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ایک مسجد بنواؤ۔ بس اسی مسجد میں میرا تمہارا نکاح ہو گا۔ بادشاہ نے حور کے حکم کے مطابق یہ مسجد بنوائی اور بادشاہ کا حور سے نکاح ہو گیا۔ اس مسجد کی دیواروں پر یہی قصہ عربی میں لکھا ہوا ہے۔"

جو ہندوستانی اس وقت وہاں موجود تھے وہ تو اس گھڑنت کو سن کر مارے ہنسی کے لوٹ گئے۔ مگر اقبال نے ایسی سنجیدگی کے ساتھ یہ قصہ سنایا کہ سارے انگریز حاضرین کو اس کی سچائی پر یقین آگیا۔

ایک دن ایک پیر صاحب اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاقاً اسی وقت ان کا ایک مرید نہایت بے چین اور مضطرب ہانپتا کانپتا آیا اور پیر صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ اور کہا کہ حضور کی آمد کی اطلاع مجھے ملی تو بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ حضور میری حالت بڑی خراب ہے۔ دو سو روپے کا قرضدار ہو چکا ہوں، حضور میرے لئے دعا فرمائیں کہ یہ قرض ادا ہو جائے۔ اور یہ کہہ کر دو روپے نذر کئے۔ پیر صاحب نے دونوں روپے جیب میں داخل کئے اور ہاتھ اٹھا کر مرید کے لئے دعا کرنے لگے۔

یہ نظارہ دیکھ کر اقبال سے نہ رہا گیا۔ آپ نے بھی فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کی "خدایا! آج کل کے پیر گمراہ ہو گئے۔ انہیں ہدایت دے۔ اور اے خدا! آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ یا الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ دو سو روپے کا نہیں بلکہ دو سو دو روپے کا مقروض ہے۔"

اس پر پیر صاحب بہت برہم ہوئے۔ مگر اقبال نے کہا "میں تو یہ دعا اس وقت تک مانگے جاؤں گا جب تک تم یہ دو روپے مرید کو واپس نہیں دے دو گے"۔ آخر تنگ آکر پیر صاحب نے دو روپے واپس کئے اور اقبال سے اپنی جان چھڑائی۔ بعد میں اقبال نے کہنے سے اُسے کہیں نوکر کروا دیا۔ جس کے بعد اس کی مالی مشکلات دور ہو گئیں۔

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں اکثر اقبال سے ملنے ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اقبال کی رہائش انارکلی بازار میں تھی اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی اور ان کو وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اسی زمانے میں مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن اقبال سے ملنے کئی مرتبہ ان کے ہاں گئے مگر وہ نہ ملے۔ اتفاق سے کئی پھیروں کے بعد مل گئے تو مولوی صاحب نے مزاحاً کہا "ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوا دی گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔"

اقبال نے فی البدیہہ کہا "مولوی صاحب! کیا کیا جائے آخر وہ بھی تو 'وطن' کی بہنیں ہیں۔"

ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ "خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔" اقبال نے ہنس کر کہا "ذرا سنبھل کر رہنا اپنے خدا کی ساری باتیں مان نہ لیا کرو۔ بعض باتیں وہ یونہی بھی کہہ دیتا ہے۔" اس نے اقبال کو یہ خوش خبری سنائی کہ میں ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ اور دہلی کو اپنا پایہ تخت بناؤں گا۔" اس پر اقبال نے کہا "ہم تو اس وقت کہاں ہوں گے مگر آپ مہربانی کر کے میرے لڑکے جاوید کو نہ بھولنا۔ اُسے مہرولی کا علاقہ ضرور بخش دینا۔"

مرض الموت میں وہی شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا "آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔" اقبال تکلیف کے باوجود ہنسنے اور کہنے لگے "واہ! یہ آپ نے کیا بات کہی۔ ہم اور آپ کو نہ پہچانیں۔ ولی را ولی می شناسد۔"

فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ ایک دن فقیر صاحب اپنے اسی عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر اقبال سے ملنے گئے۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ موٹر سے اتر کر اقبال کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ اتنے میں اقبال کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ سے کہنے لگی "ابا۔ ابا موٹر میں کتے آئے ہیں۔" اقبال نے آنے والے اصحاب کی طرف اشارہ کر کے کہا "نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں۔"

چودھری شہاب الدین نہایت کامیاب وکیل، مجلس قانون ساز کے صدر اور کارپوریشن لاہور کے میئر تھے۔ رنگ بالکل کالا تھا۔ سب سے زیادہ ڈاکٹر اقبال کی پھبتیوں کا نشانہ غالباً یہی بنتے تھے۔ اور اگر وہ بُرا مانتے تو کہہ دیتے کہ "بھئی تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے مجھے پھبتی کہنے سے نہ روکا کرو۔" ان میں سے بعض لطیفے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ایک روز چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے ہوئے بار روم میں آئے۔ انہیں دیکھتے ہی اقبال چونک کر بولے "ہائیں چودھری صاحب! آج آپ ننگے ہی یہاں چلے آئے!" (کیونکہ سوٹ کا اور چودھری صاحب کے بدن کا رنگ ایک تھا)

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ پارٹی میں اقبال اور چودھری شہاب الدین بھی موجود تھے۔ چودھری صاحب نے از سر تا پا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار اقبال بول اٹھے "اور دیکھو! کیا و بج کتا بڑ گیا" (یعنی ذرا دیکھو تو سہی کپاس کے کھیت میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا)۔

ایک دن رمضان کے مہینے میں چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار کی دعوت تھی۔ افطار کے وقت چودھری صاحب نے ملازم کو آواز دے کر پانی مانگا۔ اس پر فوراً اقبال نے آدمی سے پکار کر کہا "دیکھو بھئی چودھری صاحب کے لئے بالٹی میں پانی لانا۔"

چودھری شہاب الدین نے اپنی جو کوٹھی لاہور میں بنوائی وہ بڑی عظیم الشان اور لمبی چوڑی تھی۔ اکتالیس کنال زمین پر یہ کوٹھی بنوائی گئی تھی۔ اور ہر چیز اس میں بے حد بڑی رکھی گئی تھی۔ جب بن کر تیار ہوئی تو چودھری صاحب نے اقبال سے کہا کہ اس کوٹھی کا نام

...ا کرتے تھے۔ ان کے ایک ملنے والے خزانے میں کلرک تھے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے اور قابل آدمی تھے۔ جلوہ صاحب
روزمرّہ ان کے پاس چلے جاتے اور اپنے اشعار سُنا کر اُن سے داد چاہتے۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے ایک روز ان کی ذات
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جلوہ صاحب! اگر آپ اپنی شاعری کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتے ہیں تو صاف بات یہ ہے
کہ آپ کے اشعار سے مجھے تو چھچھوندروں کی بُو آتی ہے۔"

جلوہ صاحب اس رائے پر بڑے جھنجلائے اور بڑے غصّہ میں بھرے ہوئے شاہ صاحب کے پاس آئے اور ان کو اپنے
اشعار سنا کر پوچھنے لگے کہ شاہ صاحب سچ سچ بتائیں میرے اشعار کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ فوراً بتائیں اور اسی وقت بتائیں۔"
شاہ صاحب نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے فرمایا "جلوہ صاحب! اگر آپ "فوراً" اور "اسی وقت" اپنے اشعار کے
متعلق میری سچی رائے پوچھتے ہیں تو ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ نے شعروں کا چھچھوندر کر دیا ہے۔" (یہ فقرہ بھی شاہ صاحب نے
جلوہ صاحب کی ذات کی مناسبت سے چست کیا) جلوہ صاحب یہ صاف اور برجستہ طنز سُن کر منہ لٹکائے واپس چلے آئے۔

مولوی ظفر اقبال شاہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے
مولوی ظفر اقبال بھی وہاں پہنچ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد اپنے استاد کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر شاہ صاحب کا جوتا
اٹھا لیا اور لے کر چلے تاکہ مسجد کے دروازے پر ان کو پہنا دیں۔ شاہ صاحب نے جو یہ دیکھا تو جھٹ لپک کر ان کے ہاتھ میں سے
جوتا چھین لیا۔ اور فرمانے لگے "یہ جوتا میرا ہے کہاں لے کے چلے تھے؟"

ایک مرتبہ کالج میں مشاورت میٹنگ تھی۔ شاہ صاحب میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ انگریز پرنسپل نے شاہ صاحب
کو گھڑی دکھا کر کہا "مولوی صاحب! آپ نے پورے دو منٹ انتظار کرایا۔" شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "پھر کیا ہوا ہم نے
بھی تو اس دنیا میں پورے تیس برس آپ کا انتظار کیا" (پرنسپل شاہ صاحب سے عمر میں ۳۰ برس چھوٹے تھے)۔

ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہ بنا تھا۔ اس وقت اس کے پرنسپل ایک انگریز ہیگنس نامی تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا
"آپ کالج کے اوقات سے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کریں۔" شاہ صاحب نے اسے عربی پڑھانی شروع کر دی۔ پرنسپل کے مزاج میں
ظرافت بہت تھی۔ ایک روز اثنائے سبق میں کہنے لگا "شاہ صاحب! ایک بات پوچھوں، بشرطیکہ آپ بُرا نہ مانیں۔" شاہ صاحب نے
فرمایا "ہاں کہئے کیا بات ہے۔" ہیگنس نے کہا "یہ کیا بات ہے کہ جب تک دن میں پانچ مرتبہ آپ کے خدا کو نہ پکارا جائے اس وقت
تک وہ راضی اور خوش نہیں ہوتا۔ اسی لئے آپ کی مسجدوں میں یہ بات لازمی اور ضروری ہے کہ پانچ وقت اذان دی جائے تاکہ اس
سے خدا خوش رہے۔"

شاہ صاحب نے بہت ہی شائستگی اور دلیری کے ساتھ اس کا یہ جواب دیا کہ "ہمارا خدا ایسا نہیں جو صرف آٹھویں دن
کی تھوڑی دیر کی ٹن ٹن سے خوش ہو جائے۔" (اس کے بعد اذان کی حکمت اور اس کے الفاظ کی بلاغت ایسے عمدہ اور دلنشین
پیرائے میں پرنسپل کو سمجھائی کہ بے اختیار وہ بول اٹھا کہ شاہ صاحب آپ گواہ رہیں میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں لیکن مصلحت
یہی ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے)۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری

جس زمانہ میں آپ دہلی میں مقیم تھے تو ایک روز سخت بارش ہونے لگی۔ مولانا اسی حالت میں درس سے فارغ ہو کر گھر کو چلے مگر اس ہیئت سے کہ پائنچے چڑھائے، کتابیں بغل میں دبائیں جوتیاں اتار کر داہنے ہاتھ میں لے لیں۔ پائجامہ کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور بیچ سڑک میں بہتے ہوئے پانی کے درمیان چلنے لگے۔ دلّی کے بے فکروں نے جو مولانا کو اس عجیب ہیئت میں دیکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے مولانا کا مذاق اڑانا چاہا۔ اور سوچا کہ مولانا کے داہنے ہاتھ میں جوتے ہیں۔ جب ہم انہیں سلام کریں گے تو یہ یقیناً اپنے داہنے ہاتھ کو سلام کا جواب دینے کے لئے اوپر اٹھائیں گے اور اس حرکت پر ہم ان کا مذاق اڑائیں گے۔ چنانچہ جب مولانا پانی کی چھینٹیں اڑاتے قریب آئے تو ان بے فکروں نے سوچی ہوئی سکیم کے مطابق بڑی بلند آواز سے کہا "حضرت مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" مولانا جہاں بہت بڑے فاضل اور علامہ دہر تھے وہاں ان کی طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے فوراً بائیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی دایاں ہاتھ جس میں جوتے تھے اٹھا کر اور ہلا کر کہا "مزاج شریف" اس فی البدیہہ جواب پر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ ہوئے اور مولانا آگے بڑھ گئے۔

ایک مرتبہ مولانا کو خود بھی بڑا خفیف ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک مشاعرے میں سے رات گئے مولانا اور مرزا غالب واپس آرہے تھے۔ اپنے اپنے گھر کے لئے دونوں کو ایک تنگ گلی میں سے گزرنا پڑا۔ بیچ گلی میں ایک گدھا کھڑا تھا جس سے راستہ رک گیا تھا۔ غالب نے اپنی [illegible] سے جو اُن کے ہاتھ میں تھی۔ گدھے کو ایک طرف کیا۔ اس پر بطور مزاح مولانا نے کہا "مرزا صاحب! دلّی میں گدھے بہت ہیں۔" غالب اس طنز کو بھلا کب برداشت کر سکتے تھے فوراً جواب دیا "نہیں مولانا! باہر سے آجاتے ہیں۔" اس لطیف چوٹ کا جواب مولانا سے بن نہ آیا اور جھینپ کر چپ ہو گئے۔

ایک دن طلباء کو فلسفہ کا درس دے رہے تھے۔ مضمون یہ تھا کہ انسان کا خیال اضطراری ہے اختیاری نہیں۔ ہر بات اور ہر شئے تک بغیر ارادہ اور خیال کے پہنچ جاتا ہے۔

خیر درس کے بعد طلبا کو لے کر مسجد سے نکلے۔ راہ میں ایک جگہ ناچ ہو رہا تھا اور بہت سے آدمی جمع تھے۔ آپ علم و فضل کے باوجود نہایت رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ طلبا کو چھوڑ کر ناچ دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ طلبہ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے "ہیں مولانا! کہاں یہ علم و فضل اور کہاں یہ ناچ رنگ۔ یہ حرکت آپ کی بلند اور رفیع شان کے شایاں نہیں۔" مولانا نے ہنس کر جواب دیا کہ "ابھی تو پڑھ کر آئے ہو اَلتَّصَوُّرُ يَتَعَلَّقُ بِكُلِّ شَيْءٍ پھر مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے ناچ سے لطف اٹھانے دو۔"

سہارنپور میں عیدن ایک طوائف تھی۔ بڑی باذوق، سخن فہم اور سلیقہ شعار۔ شہر کے اکثر ذی علم اور معززین اس کے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا بھی پہنچے۔ وہ پرانے زمانے کی عورت نئی تہذیب سے نا آشنا بیٹھی نہایت سادگی سے چرخہ کات رہی تھی۔ مولانا اس کو اس ہیئت میں دیکھتے ہی واپس لوٹے۔ اس نے آواز دی "مولانا! آئیے۔ تشریف لائیے۔"

حکماء کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جسم و بدن　　ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے　　(بزمِ خیال)

ریاض خیر آبادی

ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں ریاض کے پاس ہی ایک بزرگ تشریف رکھتے تھے جو اگرچہ خفیہ طور پر داڑھی کی بیت کر چکے تھے۔ مگر صورت بڑی مقطع تھی۔ اور اسی لئے اکثر لوگ ان کو نہایت بزرگ اور واجب التعظیم سمجھتے تھے۔ خود ریاض کے والد ان سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ مگر ریاض کو سب حقیقت معلوم تھی۔ شرارت جو سوجھی تو ان کی شان میں فی البدیہہ ایک شعر تصنیف کر کے حاضرین کو سُنایا ؎

شرماؤ ریاض مے کشی سے　　لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی

چور کی داڑھی میں تنکا۔ یہ شعر سنتے ہی وہ بزرگ صورت اس قدر آپے سے باہر اور برہم ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ بے اختیار اٹھ کر مارنے کو دوڑے۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ مگر اس جھگڑے نے ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی کہ اس سے ڈر کر ریاض نے ہمیشہ کے لئے مشاعرہ میں جانے اور شامل ہونے سے توبہ کر لی۔ اور اس واقعہ کے بعد پھر کبھی کسی پر چوٹ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

(بزمِ خیال)

مولانا ابوالکلام آزاد

جب مولانا نینی جیل الہ آباد میں قید تھے۔ اس زمانہ کا ایک بہت مزیدار لطیفہ خود مولانا کے الفاظ میں سنئے :-

"جیل میں میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا۔ مگر زبان کی بیگانگی کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے تھے ؏

زبانِ یارِ من چینی و من چینی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں۔ غالباً سوچتا رہتا ہوگا۔ آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ لہرانے لگا یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا خاموش رہا۔ تو اس نے پوچھا "اوپیم؟" یعنی کیا افیم کے معاملے میں پکڑے گئے ہو؟ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرا یعنی کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا۔ تو آخر اس نے پوچھا "گاندھی"۔ اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ گویا اس کے نزدیک گاندھی بھی ناجائز افیم اور قتل کی طرح جرائم میں داخل ہے۔"

نقوش
طنز و مزاح نمبر
ادارہ
فروغِ اردو
لاہور